'E DATE

Acc. No.

ary books 25 p. per day, Text Book Re. 1 per day, Over night book Re 1 per day.

یعنی

مسلمانانِ ہند کی سیاست (۱۸۵۷ تا آغاز ۱۹۴۱ء)

کی مکمل و مفصّل تاریخ

مرتّبہ

محمد امین زبیری مارہروی

مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ

مارچ ۱۹۴۱ء

صفر ۱۳۶۰ھ

انتساب

میں اس تاریخ سیاستِ ملیہ کو عالی جناب راجہ امیر احمد خاں صاحب
تعلقدار محمود آباد (اودھ) کے عزیز نام سے منسوب کرتا ہوں جو
سیاستِ ملیہ کے ایک پُرجوش رُکن آل انڈیا مسلم لیگ کے
نشاۃِ ثانیہ اور اس کے استحکام و ترقی میں شریک و سہیم اور
تحریکِ پاکستان کے سرگرم علم بردار ہیں۔

محمد امین زبیری

علیگڑھ۔ ۱۵ / مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

دیباچہ

مقدمہ

ضمیمہ

انگریزی دور میں ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے متعلق جو غفلت و بے پروائی برتی اس کی سزا میں اغیار کی لکھی ہوئی تاریخیں ان کو پڑھنی پڑیں جو مدارس کے ابتدائی درجوں سے یونیورسٹی کی اعلیٰ کلاسوں تک میں داخلِ نصاب ہیں، ان تاریخوں میں جو زہر بھرا ہوا ہے اور مسلمانوں کے جسم میں جس طرح سرایت کر رہا ہے اس کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اب اس کا احساس کسی حد تک پیدا ہو گیا ہے۔ تاہم اس بات کے کہنے میں کوئی طوالت بیان نہیں کہ منجملہ اُن بہت سے بُرے نتائج کے ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان خود اپنی ہی نظر میں حقیر معلوم ہونے لگے یہی حالت ہماری اس سیاسی تاریخ کی ہے جس کا دیباچہ مغل سلطنت کا زوال اور انگریزوں کا آغاز عروج ہے اور جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے شروع ہوتی ہے۔

اس مدت میں مسلمانوں کو سیاست کے بہت سے پُرخار منازل طے کرنے پڑے۔ لیکن ان کے حالات و واقعات تاریخی طور پر مدون نہیں ہوئے اور اس لحاظ سے ہم بالکل تہی مایہ ہیں اس غفلت و تہی مایگی کے مضر نتائج میں سب سے مضر نتیجہ یہ ہوا کہ اغیار کی تاریخ اور پروپیگنڈا نے ہمارے نوجوانوں کے دماغ و اذہان، اور افکار و رجحانات پر قابو پا لیا ہے اور بعض اوقات ان کا رُخ ایسی سیاست کی طرف ہو جاتا ہے جس میں مسلمان ذہنیت اور قومیت کا پرتو نہیں ہوتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہر دور میں ایسی سیاسی تاریخ کی تدوین و ترتیب کا سلسلہ جاری رہے تاکہ نوجوان سیاسیات ملکی میں اپنی قومیت اور قومی مفاد کو قائم اور پیشِ نظر رکھ کر آگے بڑھ سکیں

میں نے اسی نقطۂ نظر سے ۱۹۳۷ء میں "انتخاب جداگانہ کی مختصر تاریخ" اور ۱۹۳۸ء میں "مسلمانانِ ہند کی سیاستِ وطنی" کی اشاعت کی لیکن واقعات و حالات کے لحاظ سے اور وسعت کی گنجائش و ضرورت تھی نیز ۱۹۳۷ء کے بعد سے ۱۹۴۰ء تک جو جدید واقعات رونما ہوئے انھوں نے بھی نہایت اہم تاریخی حیثیت حاصل کر لی اس لئے از سرِ نو اُن تمام واقعات کو منضبط کر کے یہ کتاب **سیاستِ ملیہ** پیش کی جاتی ہے۔

اس جدید دَور میں ہماری سیاسی تاریخ سنہ ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتی ہے تقریباً ۴۰ سال یعنی سنہ ۱۸۹۷ء
کے خاتمہ تک مسلم سیاسیات کا محور سر سید احمد خاں غفرلہٗ کی تنہا ذات رہتی ہے اس کے بعد انکے جانشین
محسن الملک اور وقار الملک ساتھ ساتھ اور یکے بعد دیگر سیاسی رہنمائی کرتے ہیں اور دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء
میں آل انڈیا مسلم لیگ کی جب تاسیس ہو جاتی ہے تو سیاسی تنظیم کا دَور شروع ہوتا ہے۔

سنہ ۱۹۱۱ء کے بعد ایک نئی صبح طلوع ہوتی ہے اور جدید تعلیم یافتہ گروہ کے شانوں پر یہ بار عائد
ہو جاتا ہے اور سنہ ۱۹۱۵ء سے جہاں تک وطنی سیاست کا تعلق ہے مسٹر محمد علی جناح ایک سیاسی رہنما
کی حیثیت سے لیگ کے منظر پر آتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہ رہنمائی روز بروز وسیع اور نتیجہ خیز ہوتی
رہی تا آں کہ آج سنہ ۱۹۴۰ء کی منزل میں ہم اس کی کرشمہ سازیاں دیکھ رہے ہیں۔

اس کتاب میں اس پورے زمانہ کی مفصل تاریخ ہے۔ اور چوں کہ کانگریسی سیاست بھی چولی دامن
کی طرح ساتھ ساتھ رہی ہے اس لئے توضیح واقعات کی غرض سے اس کو حسب موقع بیان کر دیا ہے خود
مسلمانوں میں بھی جو مختلف سیاسی ادارے وقتاً فوقتاً قائم ہوئے ان کے حالات بھی جتنے ضروری ہیں
درج کئے گئے ہیں، اور دیگر سیاسی اداروں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔

غرض حتی الامکان ہندوستان میں مسلم سیاست کی ایک مکمل تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بلا شبہ یہ امر خوشی کا باعث ہے کہ اہلِ قلم اور قابل مسلمانوں میں اپنی سیاسی تاریخ کی تدوین و ترتیب
اور اشاعت کی ضرورت کا احساس ہو گیا ہے اور اس تین سال کی مدت میں متعدد کتابیں اس موضوع
پر شائع ہو چکی ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ مسلمان اب غیروں کے ہاتھوں اپنی سیاسی تاریخ
کو مسخ نہ ہونے دیں گے۔

خاکسار

محمد امین زبیری مارہروی

گزشتہ چند سال کے واقعات کی تدوین میں اردو اخبارات بالخصوص الامان و وحدت، مدینہ، انجام، منشور، زمیندار
اور تیج سے قابل قدر اور قابل شکریہ امداد و سہولت حاصل ہوئی ہے۔

ہندوستان میں ۱۶۰۰ء سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا تجارتی کاروبار سلطنت انگلستان
کی حمایت اور قوانین پارلیمنٹ کی تبعیت میں شروع ہوا جو مغل سلاطین کی مراعات سے
فروغ پاتا رہا لیکن ۱۷۰۷ء کے بعد جب ملک میں خانہ جنگی اور طوائف الملوکی کا دَور دَورہ
ہوا تو کمپنی بھی اس میں شریک ہو گئی اور اس کا سیاسی اقتدار اس نوبت پر پہونچ
گیا کہ ۱۷۶۵ء میں مغل شہنشاہ نے صوبہ بنگال کی سند دیوانی عطا کی جس کے ذریعہ
ایک بڑے حصۂ ملک پر اس کو اقتدارِ حکومت حاصل ہو گیا۔ اس اقتدار سے اس کو مزید
مواقع ملے اور ایک صدی کے اندر اس زمانہ کی تمام قدیم و جدید طاقتوں کو مغلوب کر کے
۱۸۵۶ء تک پورے ہندوستان پر قابض اور عملاً حکمراں بن گئی۔ ریاستیں جو قبضہ
والحاق سے بچیں انھوں نے معاہدات کے ذریعہ سے اس کی سیادت اور زیر دستی
قبول کر لی۔

۱۷۷۳ء میں پارلیمنٹ نے پہلی مرتبہ ہندوستان کے متعلق قانون وضع کیا اور اب تک
جو بنگال، مدراس اور بمبئی کی پریسیڈنسیاں آزاد اور گورنروں کے زیر انتظام تھیں اُن
پر گورنر بنگال کو گورنر جنرل بنا کر فوقیت دی گئی۔ ۱۷۸۶ء میں ہندوستانی مقبوضات
سلطنتِ انگلستان کے مقبوضات قرار دیے گئے اور نظم و نسق کی ذمہ داری تاج اور کمپنی
دونوں پر عائد ہو گئی۔ ۱۸۳۳ء میں گورنر جنرل کو تمام مقبوضات کے لئے وضع قانون سے
اور گورنروں کو اپنے صوبوں میں مقامی ضروریات کے قواعد و ضوابط کی ترتیب کا اختیار
دیا گیا۔ گورنروں کے ساتھ کونسلوں کا طریقہ بھی ابتدا سے تھا اس میں بھی کچھ ترمیم ہوتی رہی۔
اسی سال مغربی تعلیم و تہذیب کی اشاعت حکومت کی مستقل پالیسی قرار پائی اور ہندستانیوں
کو حقوق ملازمت دئیے گئے۔

اس تمام عرصہ میں مغل سلاطین کی جانشینی[2] کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا چنانچہ ۱۸۳۷ء میں آخری وارثِ سلطنت سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ اگرچہ یہ بادشاہت برائے نام تھی تاہم بادشاہ کا نام تھا۔ ۱۸۵۷ء میں کمپنی کی فوجوں نے بغاوت کی اور باغی فوجیں بادشاہ کے گرد جمع ہو گئیں ملک بھر میں بدامنی پھیل گئی لیکن انگریزی قوت غالب رہی اور چند ماہ میں یہ ہنگامہ ختم ہو گیا۔

اس ہنگامہ کے نتیجہ میں بادشاہ کو معزول و قید کیا گیا اور کمپنی کو ختم کر کے ہندوستان براہ راست برطانوی تاج سے متعلق کر لیا گیا اور اب ایک آئینی دَور کی ابتدا ہوئی وزیر ہند (سکرٹری آف اسٹیٹ) بذریعہ گورنر جنرل انتظام ملک کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ ریاستوں کے معاہدوں کی بھی توثیق کی گئی اور ان کے معاملات میں گورنر جنرل کو نائب السلطنت (وائسرائے) بنایا گیا۔

۱۸۶۱ء سے آئینی اصلاحات کا آغاز ہوا مرکزی اور صوبائی کونسلوں میں نامزدگی سے ہندوستانی ممبر لئے گئے۔ ۱۸۸۲ء میں ادارات بلدیہ کے متعلق قوانین وضع ہوئے اور نامزدگی و انتخاب کا طریقہ رائج ہوا پھر ۱۸۹۲ء میں مزید اصلاحات دی گئیں اور وضع قوانین کی کونسلوں میں بھی اصول انتخاب جاری کیا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں کونسلوں کی توسیع کی گئی۔ مرکز اور صوبوں کی اگزکٹو کونسلوں میں ایک ایک ہندوستانی ممبر مقرر ہوا اور اصول انتخاب میں جُداگانہ انتخاب کو دخل کیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں اصلاحی قدم اور آگے بڑھا۔ صوبوں کو جزوی حکومت خود اختیاری دی گئی۔ منتخب ممبروں کی تعداد بڑھی، اور وزرا مقرر کئے گئے حکومت کے بعض صیغے محفوظ کے طور پر گورنروں اور اس کی اگزکٹو کونسل کے اختیار میں رہے اور بعض بطور صیغہائے منتقلہ گورنر اور وزرا کو تفویض کئے گئے۔ صوبوں اور مرکز کی اگزکٹو کونسلوں میں ہندوستانی ممبروں کی تعداد اضافہ کی گئی، گورنر جنرل کی کیبنٹ (گورنمنٹ آف انڈیا) گورنر جنرل، کمانڈر انچیف، تین انگریز اور تین ہندوستانی ممبروں سے ترتیب دی گئی۔ فیصلۂ معاملات کثرت رائے پر رکھا گیا لیکن گورنر جنرل کو اختیار دیا گیا کہ خاص حالتوں میں کونسل کی رائے کے خلاف بھی عمل کر سکتا ہے۔

لیجس لیچر (واضع قوانین) کے دو ایوان گسنٹرل اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ قائم کئے گئے لیکن گورنر جنرل کو ان کے روبرو جواب دہ نہیں بنایا گیا۔

سنہ ۱۹۰۹ء اور بعدہٗ سنہ ۱۹۱۹ء میں اس قسم کی تجاویز بھی کی گئیں کہ والیانِ ملک مرکزی حکومت میں شریک کئے جائیں یا ان معاملات میں جن کا تعلق کل ہند سے ہو ان کا مشورہ اور متحدہ رائے حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نکالا جائے مگر اصلاحات کی منزل آخر تک کوئی تجویز نہ ہو سکی، البتہ فرمانِ شاہی کے ذریعہ ایک ایوان شاہزادگان ہند (پرنسز چیمبر) کی تشکیل ہو گئی جس کا ۸ فروری سنہ ۱۹۲۱ء کو قلعہ معلّی دہلی کے دربار عام میں ڈیوک آف کناٹ نے افتتاح کیا۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے مرحلۂ اصلاحات کے بعد سنہ ۱۹۳۵ء کا دستور بنا۔ مبادیات تجاویز اور مباحث میں ایک وفاقی حکومت (فیڈرل گورنمنٹ) کی طرف خیالات رجوع ہوئے۔

اکثر ممالک میں خود مختار چھوٹی چھوٹی حکومتیں یا صوبے اپنے تحفظ و تقویت کے لئے متحد ہو کر حکومت متحدہ قائم کر لیتے ہیں جس کو وفاق (فیڈریشن) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ نتیجہ میں بصورت قانون ہند (گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ) ایک وفاقی حکومت کی تشکیل کی گئی اور ہندوستانی ریاستوں کو بھی (جو شمولیت پسند کر کے خاص قواعد کے تحت میں وثیقۂ شمولیت پیش کریں) اس میں شامل کیا گیا۔

قانون یا دستور جدید کی رو سے وفاقی قوتِ عاملہ (اگزیکٹو اتھارٹی) کا اختیار ملک معظم کے نائب کی حیثیت سے گورنر جنرل کو ہے۔ محکمہ ہائے محفوظہ یعنی افواج، اُمور خارجہ، دفاع ملکی، امور مذہب عیسوی، معاملات علاقہ ہائے قبائلی، بہ اختیار گورنر جنرل ہیں جو اس کے کونسلرز (مشیروں) کی نگرانی میں ہوں گے اور ان مشیروں کے پسند و تقرر کا بھی اختیار گورنر جنرل کو ہی ہے۔ ان سب معاملات کے متعلق گورنر جنرل کو وزیر ہند اور پارلیمنٹ کے سامنے ذمہ دار رکھا گیا۔

گورنر جنرل کی مخصوص ذمہ داریاں حسب ذیل ہیں :-

(۱) ہندوستان یا اس کے کسی حصہ میں شدید خطرہ بدامنی کا انسداد (۲) ملک کا مالی استحکام (۳) اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ (۴) ریاستوں یا والیانِ ریاست کے وقار و حقوق

کی حفاظت (۵) پبلک سروسز (یعنی شاہی ملازمت)[۴] کے حقوق و مفادات کا تحفظ (۶) تجارتی معاملات (۷) ہر اس معاملہ کی نگہداشت و تحفظ جو ان محکموں سے متعلق ہو جن کو گورنر جنرل کے تحت میں رکھا گیا ہے۔

برطانوی بلوچستان کے متعلق قانون و قواعد کی وضع و ترتیب کا اختیار صرف گورنر جنرل کو دیا گیا۔ باقی شعبہ ہائے حکومت و فاقی حکومت کے تحت میں ہیں اور ان کے متعلق جواب دہی وفاقی ایوان ہائے واضع قانون (فیڈرل اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ) کے سامنے ہے۔ ہر دو ایوان میں ہندوستان کے صوبوں اور ریاستوں کے نمایندے (ممبر) ہوں گے۔ فیڈرل اسمبلی کے ممبروں کی تعداد برطانوی ہند سے ۲۵۰، اور ریاستوں سے ۱۲۵ جملہ ۳۷۵ ہوگی، کونسل آف اسٹیٹ میں ۱۵۰ برطانوی ہند کے، ۱۰۰ ریاستوں کے، اور دس گورنر جنرل کے، نامزد جملہ ۲۶۰ تعداد ہوگی، فیڈرل اسمبلی کے ممبروں کو صوبوں کی اسمبلی کے ممبر منتخب کریں گے یہ انتخاب بھی انتخاب جداگانہ کے اصول پر ہوگا البتہ یورپین، اینگلو انڈین، اور دیسی عیسائیوں کا انتخاب بواسطہ رائے دہندگان ہوگا، کونسل آف اسٹیٹ کے ممبروں کو ووٹر (رائے دہندگان) انتخاب کریں گے۔ ریاستوں کے ممبر دونوں ایوانوں میں ریاستوں کے ہی نامزد ہوں گے۔

گورنر جنرل کے مشورہ کے لئے دس وزیروں کی کونسل رکھی گئی ہے جو منتخب ممبروں میں سے لئے جائیں گے اور اس وزارت میں اقلیتوں اور ریاستوں کے نمایندے بھی ہوں گے، لیکن گورنر جنرل کو اس وفاقی وزارت کے مشورہ کو قبول کرنے اور مسترد کر دینے کا بھی اختیار ہے۔

صوبوں میں قوتِ عاملہ کے استعمال کا حق ملک معظم کی طرف سے گورنروں کو دیا گیا ہے اور ان کی بھی ذمہ داریاں اور خصوصی اختیار ہیں جن میں صوبہ کے اندر قیام امن اور اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ بھی ہے۔

گورنر جنرل اور گورنروں کے اختیارات خصوصی استعمال کرنے اور ذمہ داریوں کے طریقوں کو ضمیمہ قانون بنام وثیقہ ہدایات (انسٹرومنٹ آف انسٹرکشن) میں منضبط کیا گیا ہے۔

وفاقی حکومت کو ریاستوں کے انھیں معاملات پر اختیار ہوگا جن کا والیانِ ریاست اپنے وثیقۂ شمولیت میں حق دیں گے، اور اختلافات کی صورت میں صرف گورنر جنرل کو کارروائی کا اختیار رہے گا۔

صوبائی حکومتوں کو خودمختار بنایا گیا ہے جو گورنروں کے ماتحت ہیں اور ان کی تعداد ۱۹۳۵ء کے قانون نے گیارہ رکھی ہے۔

کمپنی کے ابتدائی دور سے مقبوضات کی صوبہ وار تقسیم جاری رہی ہے اور پھر ۱۸۵۸ء سے اب تک بارہا حدبندیاں اور رقبوں میں کمی بیشی ہوتی رہی صوبے بنتے ٹوٹتے اور ایک دوسرے میں ضم ہوتے رہے اور اب بھی اس دستور میں گنجائش رکھی گئی ہے کہ تاج کے حکم سے بہ اختیار کونسل کوئی جدید صوبہ بن سکتا ہے اور کسی صوبہ کے رقبہ میں اضافہ و تخفیف اور حدود و فاصل میں ردّ و بدل ہو سکتا ہے۔

قانون میں وفاقی حکومت اور صوبوں کے دائرۂ عمل کی تصریح کر دی گئی ہے ان دونوں کے عاملہ (اگزکٹو) شعبے تقریباً یکساں ہیں، ہر صوبہ میں پراونشل اسمبلی لازمی ہے اور چھ صوبوں میں لیجیلیٹو کونسل بھی رکھی گئی ہے، ان ہر دو مجالس میں قوم و فرقہ کے لحاظ سے تعداد ارکان ہے، جن کا ووٹروں کے ذریعہ انتخاب ہے مگر کونسل میں ایک معینہ تعداد کی نامزدگی کا حق گورنر کو دیا گیا ہے گورنر اپنے وزیر اعظم کو منتخب ممبروں میں سے مقرر کرے گا اور وہ اس جماعت کا ہوگا جو اکثریت رکھتی ہوگی، اور پھر وزیر اعظم باقی کو نامزد کرے گا، وزرا تاج کے ساتھ وفاداری کا حلف کریں گے بعض مسائل کے متعلق صرف صوبہ کی حکومت اور بعض کے متعلق صرف وفاقی حکومت کو وضع قانون کا حق ہوگا اور ایک کو دوسرے کے حق میں مداخلت نہ ہوگی، مگر بعض مسائل میں حق مشترک بھی ہے۔

وفاقی حکومت کے ان مسائل و معاملات میں جن کا اثر صوبوں پر مترتب ہو، صوبائی حکومتیں اس کی تابع ہیں اور ان کی پالیسی اور رویہ وہی ہوگا جو مرکزی حکومت کا ہے اگر کسی صوبہ کی حکومت کسی معاملہ میں وفاقی حکومت کی مداخلت کو بے جا تصور کرے اور تعمیل سے انکار کرے تو اس کا فیصلہ اور فیصلہ کی تعمیل و پیروی کرانا بذات خاص گورنر جنرل کا کام ہے، گورنر جنرل کو یہ اختیار بھی ہے کہ اگر کسی وقت وفاقی حکومت قانون کے مطابق نہیں چلائی جا سکتی یا وزرا کے ساتھ

ایسا اختلاف رائے پیدا ہو جائے کہ کسی طرح اتفاق نہ ہو تو وہ اپنے فیصلہ کے مطابق تعمیل کرائے گا اور ایک مدت معینہ تک کے لئے تمام اختیاراتِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ گورنروں کو بھی یہی اختیار حاصل ہے لیکن ان کو یہ اختیار استعمال کرنے کے لئے گورنر جنرل کی تصدیق ضروری ہے۔

صوبائی حکومتیں اگرچہ آزاد اور واضع قانون جماعتوں کے سامنے ذمہ دار ہیں، لیکن خاص خاص صورتوں میں اُن پر مرکزی حکومت کو قابو حاصل ہے اور گورنر جنرل یا گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے مختتم حکم کی پابند ہیں۔

وزرا مجالسِ واضع قانون کے عدم اعتماد کے ووٹ سے خواہ متفقہ ہو یا بہ کثرت رائے مستعفی ہونے پر مجبور ہوں گے اور از سرِ نو وزارتیں قائم ہوں گی۔ اگر وزیر اعظم پر ایسا ووٹ پاس ہو جائے گا تو تمام وزارت مستعفی ہو جائے گی، ہر وزیر کو بطور خود بھی مستعفی ہونے کا حق ہے ان کے استعفے گورنر منظور کرے گا، اور عدم تشکیل وزارت کی صورت میں اپنی مدد کے لئے خود مشیر مقرر کرے گا۔

چیف کمشنر کے ماتحت پانچ صوبوں کو وہ اصلاحات نہیں دی گئیں جو گورنروں کی صوبوں کو ہیں لیکن چار کو وفاقی مجالس وضع قوانین میں قدرے نمایندگی دی گئی ہے۔

اس قانون میں ایک وفاقی عدالت (فیڈرل کورٹ) بھی ہے جو ان تمام نزاعی امور کو جن کا تعلق آئین و قوانین وفاق کے معنی و مطلب سے ہے یا جو شریکِ وفاق ریاستوں اور صوبوں کے مابین ہوں گے فیصل کرے گی لیکن اگر یہ نزاعات انتظامی قسم کے ہوں گے، تو باہمی طور پر کانفرنسوں کے ذریعہ طے کئے جائیں گے اور بعض صورتوں میں گورنر جنرل کے اختیار سے طے ہوں گے۔

جب سے اصلاحات کا آغاز ہوا ہندوؤں نے قومیت (نیشنلزم) کے نام پر مسلمان قومیت کو جذب کر کے اپنے کامل اقتدار کی کوشش کی جو رام راج کی منزل تک پہونچی مسلمان کچھ مدت مقتضیات حالات کے لحاظ سے سیاسیات سے کنارہ کش رہے اور اس وقت کی بہترین سیاست تھی مگر جب اقتضائے حالات ہوا تو وہ اس میدان میں اترے اور اپنی قومیت

کی جداگانہ اور مستقل حیثیت قائم رکھتے ہوئے سیاسی جدوجہد میں شریک ہو گئے ،

۱۹۳۵ء کے قانون نے وفاقی حکومت کا جو قالب تیار کیا ہے وہ عام اور معمولی وفاقی حکومتوں سے مختلف ہے اور اس کی کوئی مثال نہیں ، صوبوں کو آزادی دی گئی لیکن مرکز کا اقتدار و اختیار بھی باقی ہے پھر مسلمانوں کے لئے دوہری مشکلات ہیں جس حد تک قدرے آزادی کا تعلق ہے مسلمان اس سے بھی محروم ہیں ۔

مرکز میں ہندو اکثریت پہلے ہی بہت کافی ہے اور ریاستوں کے نمایندوں کی بڑی تعداد نے اور بھی وسیع و زبردست بنا دیا ہے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں جن میں سندھ اور سرحد تو بہت ہی چھوٹے ہیں البتہ بنگال اور پنجاب وسیع و وقیع ہیں لیکن ان میں مسلم حکومتوں کا دار و مدار دوسروں کے تعاون و امداد پر ہے جیسا کہ ذیل کے نقشوں سے واضح ہوگا :۔

وفاقی اسمبلی اور کونسل کا تناسب تعداد

نمبر شمار	قومیت و فرقہ	تعداد اسمبلی	تعداد کونسل
۱	ہندو مع اچھوت	۱۰۵	۸۱
۲	سکھ	۶	۴
۳	مسلمان	۸۲	۴۹
۴	اینگلو انڈین	۴	۱
۵	یوروپین	۸	۷
۶	دیسی عیسائی	۸	۲
۷	نمایندگان صنعت و تجارت	۱۱	×
۸	زمیندار	۷	×
۹	مزدور	۱۰	×
۱۰	عورتیں	۹	۶
		۲۵۰	۱۵۰
۱۱	ریاستہائے ہند	۱۲۵	۱۰۰
۱۲	نامزد	×	۱۰
		۳۷۵	۲۶۰

اسمبلیوں کا تناسب تعداد

نمبر شمار	صوبجہ	ہندو اچھوت	غیر ترقی یافتہ	سکھ	مسلمان	ہندوستانی عیسائی	اینگلو انڈین	یوروپین	تجارت پیشہ	زمیندار	یونیورسٹیاں	مزدور	میزان
۱	مدراس	۱۵۲	۱	۰	۲۹	۹	۲	۳	۶	۶	۱	۶	۲۱۵
۲	بمبئی	۱۱۹	۱	۰	۳۰	۳	۲	۳	۷	۲	۱	۷	۱۷۵
۳	بنگال	۸۰	۰	۰	۱۱۹	۲	۴	۱۱	۱۹	۵	۲	۸	۲۵۰
۴	صوبہ متحدہ	۱۴۴	۰	۰	۶۶	۲	۱	۲	۳	۶	۱	۳	۲۲۸
۵	پنجاب	۴۳	۰	۳۲	۸۶	۲	۱	۱	۱	۵	۱	۳	۱۷۵
۶	بہار	۸۹	۷	۰	۴۰	۱	۱	۲	۴	۴	۱	۳	۱۵۲
۷	متوسط و برار	۸۷	۱	۰	۱۴	۰	۱	۱	۲	۳	۱	۲	۱۱۲
۸	آسام	۴۸	۹	۰	۳۴	۰	۰	۱	۱۱	۰	۰	۴	۱۰۸
۹	سرحد	۹	۰	۳	۳۶	۰	۰	۰	۰	۲	۰	۰	۵۰
۱۰	سندھ	۱۹	۰	۰	۳۴	۰	۰	۲	۲	۳	۰	۱	۶۰
۱۱	اڑیسہ	۴۹	۲		۴	۱	۰	۰	۱	۲	۰	۱	۶۰

کونسلوں کا تناسب تعداد

نمبر شمار	صوبہ	کل نشستیں	عام ہندو	مسلمان	یوروپین	ہندوستانی عیسائی	لیجسلیٹو اسمبلی	نامزد گورنر
۱	مدراس	۵۴ تا ۵۶	۳۵	۷	۱	۳	۰	۸ تا ۱۰
۲	بمبئی	۲۵ تا ۳۰	۲۰	۵	۱	۰	۰	۳ تا ۴
۳	بنگال	۶۳ تا ۶۵	۱۰	۱۷	۳	۰	۲۷	۶ تا ۸
۴	صوبہ متحدہ	۵۸ تا ۶۰	۳۴	۱۷	۱	۰	۰	۶ تا ۸
۵	بہار	۲۵ تا ۳۰	۹	۴	۱	۰	۱۲	۳ تا ۴
۶	آسام	۲۱ تا ۲۲	۱۰	۶	۲	۰	۰	۳ تا ۴

ابھی تک مسلمانوں کے پُر زور احتجاج سے مرکزی حکومت نئے قانون کے مطابق یعنی فیڈرل گورنمنٹ قائم نہیں ہوئی اور ۱۹۱۹ء کے قانون ہند کے مطابق جاری ہے، لیکن صوبائی حکومتوں میں مسلمانوں کو خود مختاری یا رام راج کا جو تلخ تجربہ حاصل ہوا اس لئے اب ان کا نصب العین "آزاد ہندوستان میں آزاد مسلمان ہے" اور اس نصب العین تک رسائی کا ذریعہ مسلم وطن یا بہ عرفِ عام پاکستان کا قیام ہے جس کے لئے اپنی ہی سعی کی ضرورت ہے۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی

خاکسار

محمد امین زبیری مارہروی
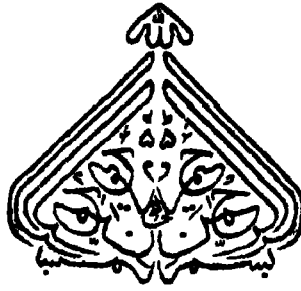
باب اوّل

اٹھارویں صدی کے عشرۂ اوّلین سے مُغل سلطنت کی مرکزی حکومت میں جو اضمحلال شروع ہُوا وہ روز بروز بڑھتا گیا اور دوسری طرف مغرب سے انگلستان کے تاجروں کی کمپنی کا ہلالِ اقبال طلوع ہُوا جو اس صدی کے خاتمہ تک ماہِ کامل بن گیا اور پھر نصف صدی بعد (۱۸۵۷ء تک) یہ کمپنی مغل سلطنت کی جانشیں ہوگئی ؎

انحطاط و زوالِ سلطنت کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کی تباہی و بربادی بھی جاری رہی وہ ہر شعبۂ زندگی میں پست ہوگئے اور سیاسی طور پر تو اُن کی قوت و قیمت باقی نہ رہی، اگرچہ ملک کی عام تباہی کا اثر ہندو اور مسلمان دونوں پر تھا لیکن ہندوؤں کے نقصان کی دوسری شکل میں کچھ نہ کچھ تلافی ہوجاتی البتہ مسلمانوں کا نقصان کسی صورت میں بھی مرہونِ تلافی نہ تھا بلکہ ان کے نقصان سے جو فائدہ ہوتا تھا اس کا معقول حصہ انگریزوں کے اُن ایجنٹوں (ہندوؤں) کو ملتا تھا بہرحال ان تمام اسباب سے جو مسلمانوں کی تباہی کے لئے

(نوٹ) اس موقع پر انگریزی حکومت کے قیام کی نسبت پنڈت مدن موہن مالویہ صدر اجلاس کانگریس ۱۹۱۸ء کے صدارتی ایڈرس کا یہ فقرہ ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ:-

تسلسل واقعات ہی کچھ ایسا تھا کہ انگریز یہاں پر طاقت اعلیٰ (پیرامونٹ پاور) بن گئے اور یہ سب ہندوستانی سپاہیوں اور ہندوستانی ساتھیوں کی مدد سے ہوا۔ ہمارے لوگوں نے ان کو اس لئے مدد دی اور اس لئے خوش آمدید کہا کہ اُنھوں نے یہاں امن و انصاف رائج اور بہترین نظامِ عمل قائم کیا ؎

فراہم تھے سخت ترین نتائج نکلے اور ایک قلیل وقفہ[2] میں ایک بڑی قوم تباہ ہوگئی۔ بنگال میں اس تباہی کے متعلق سر عبدالرحیم صدر اسمبلی نے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت ۱۹۲۵ء میں کہا تھا کہ:۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت میں بھی آج سے تین نسلیں پیشتر بنگال کا زیادہ حصہ مسلمان جاگیرداروں امین داروں اور زمینداروں کے قبضہ میں تھا اور انتظام دیوانی مسلمان آفیسروں کے ہاتھ میں مثلاً دیوان۔ مفتی۔ قاضی۔ مولوی۔ صدر اعلیٰ صدر امین اور کوتوال علاوہ محرروں اور نقل نویسوں کے سب مسلمان ہوتے تھے تعلیم کا رواج عام تھا اور میں یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ اس زمانہ میں زیادہ تعلیم یافتہ افراد کا شمار تھا ہر باوقعت مسلمان اپنے مکان کے ساتھ ساتھ ایک مکتب اور ایک مدرسہ رکھتا تھا۔ ان مدرسوں سے عربی، فارسی کے ماہرین پیدا ہوتے تھے جو عدالتوں میں وکیل اور منصف کی حیثیت سے نمایاں خدمت انجام دیتے تھے میں نے خود اُن مدرسوں کو تباہ شدہ حالت میں دیکھا ہے۔

فوجی اقتدار حاصل کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی اولین پالیسی یہ ہوئی کہ اُس نے مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کرنا بند کر دیا، دیوانی اور پولیس کے انتظامات کی تفصیل پر مسلمان آفیسروں کی مدد سے عبور حاصل کرنے کے بعد کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اختلاف آرا کے باوجود اپنی پالیسی یکایک تبدیل کر دی اور بنگالی و انگریزی کو اردو فارسی کے بجائے عدالتوں میں جگہ دی یہ تبدیلی سیاسی بنا پر ہوئی جس کے لئے انتظامی اسباب بھی موجود تھے۔"

۱۹۳۸ء کے خطبۂ صدارت مجلس استقبالیہ اجلاس مسلم لیگ منعقدہ کلکتہ میں آنریبل مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے بھی اس تباہی کا حسب ذیل الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:۔

۱۷۵۷ء میں پلاسی میں کامیاب ہونے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہ فقط اپنی تجارت کو فروغ دینے میں پورے انہماک سے کام لیا بلکہ اپنا سیاسی اقتدار جمانے میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں جو کارروائیاں عمل میں آئیں اُن میں سب سے مقدم اور سب سے مہتم بالشان یہ کوشش تھی کہ جہاں تک ممکن ہو

مسلمانوں کو دبایا جائے، چنانچہ اس نصب العین کو حاصل کرنے میں جس تشدد اور سختی کے رویہ کو اختیار کیا گیا اور جو بے دردانہ سلوک کامیاب قوم نے ناکامیاب قوم سے کیا تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ کامل استقلال کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی اس پالیسی کو جاری رکھا جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی حالت کو روز بروز بد سے بدتر بنایا جائے اور یہ طرز عمل انیسویں صدی کے ابتدائی دور تک اپنی تمام مصیبتوں اور کوششوں کے ساتھ باقی رکھا گیا یہاں تک کہ مسلمان بحیثیت قوم بالکل ملیامیٹ ہوگئے۔

بھائیو! —— جو کچھ کیا گیا وہ کافی نہ تھا ۱۸۱۹ء میں ایک قانون جاری کیا گیا جسے قانون بازگشت کہا جاتا ہے اس کے ذریعہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ اختیار حاصل کیا کہ تمام لاخراج زمینوں پر جو مغل بادشاہوں نے رعایا کو بخشدی تھیں کمپنی اپنے دخل و تصرف میں لے آئی۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن مبارک سے فراموش نہ ہونے دیجئے گا کہ ۱۷۶۵ء میں کمپنی تین صوبوں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی شہنشاہ دہلی سے حاصل کر چکی تھی لہذا اسے یہ اختیار تھا کہ چھوٹے بڑے ہر درجے کے زمیندار کی رقم مالگذاری معین کرے۔ جب قانون بازیافت پاس ہوا تو اس وقت بنگال میں پچانوے فیصدی مسلمان زمیندار تھے لیکن قوانین مذکور نافذ ہونے کے دس سال کے عرصہ میں تناسب بالکل برعکس ہوگیا اور مسلمان زمینداروں کی تعداد پانچ فی صدی رہ گئی۔

اس کے بعد ایک اور قانون جاری ہوا جس سے مسلمانوں کی حیات قومی پر کاری حربہ لگا جس کے وہ متحمل نہ ہوسکے اور جس نے ان کی سیاسی اقتصادی اور معاشرتی کشتی کو موت کے گھاٹ لگا دیا یعنی ۱۸۳۳ء میں فارسی زبان کو دفتر اور دربار سے خارج کرکے اس کی جگہ انگریزی کو قرار دیا گیا۔ اس تغیر نے جس کی رو سے مسلمان اپنی معاشرتی زبان سے محروم کر دئے گئے قوم کی قوم کو دفعتہً پستی اضمحلال اور کس مپرسی کے آخری حد پر پہنچا دیا۔ انگریزی تعلیم کی جانب مسلمان بالکل

مائل نہ تھے اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ انگریزوں کے وحشیانہ اور بے رحمانہ سلوک
ان کے پیش نظر تھے بلکہ ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ملک بھر میں کوئی تعلیم گاہ ایسی
نہ تھی کہ جہاں وہ اپنے قدیم قومی تمدن اور معاشرت کے ساتھ ساتھ انگریزی
زبان بھی حاصل کر سکتے۔ اسکول اور کالج جو تھے وہ پادریوں کے قائم کئے ہوئے
تھے اور وہاں کے معلّم و مدرس یا تو ہندو تھے یا انگریز۔ ہندوستان کے مشہور و معروف
مورخ سر ولیم ہنٹر نے مسلمانوں کے جذبات کی تصویر ان مختصر مگر جامع لفظوں میں کھینچی ہے۔
"مسلمانوں نے متفقاً اور متحداً بت پرستی کی تعلیم کو جو بت پرستی کے ذریعہ دی جاتی
تھی بدون استثنا ٹھکرا دیا" بھائیو ——— ہماری داستان غم ابھی اختتام کو نہیں
پہونچتی ہے انیسویں صدی کے وسط میں مسلمانوں کے تنزل میں جو کچھ کسر باقی
رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے انگریزوں کے دل میں
ہندوستانیوں کی طرف سے عموماً اور مسلمانوں کی طرف سے خصوصاً جو انتقامی آگ
پیدا کر دی تھی اُس کی چنگاریاں بنگالہ تک پہنچ گئیں۔"

ملک کی حرفتی و اقتصادی تباہی دولت کی حرص و ہوس پر مبنی تھی لیکن مسلمانوں کی بربادی
میں مذہبی تعصب بھی کارفرما تھا۔ کیوں کہ دنیا میں صدیوں سے مسلمان اور عیسائی مذہبی اور سیاسی
حیثیت سے حریف اور رقیب چلے آتے تھے۔ صدیاں گذرنے پر بھی صلیبی جنگوں کی شکست کا غم
مُندمل نہ ہوا تھا اسلام اور مسلمانوں کے متعلق دوسرے مغربی ممالک کی طرح انگلستان میں بھی
کافی لٹریچر موجود تھا۔ اسی ملک کے مشہور شاعر لارڈ بائرن نے ۱۸۲۱ء میں اپنی نظموں سے تعصب
کی آگ بھڑکا کر ٹرکی کے خلاف یونان کی بغاوت کو قوت پہنچائی اور مسیحی یورپ کو ترکوں
کی مخالفت اور یونان کی حمایت میں متحد کر دیا۔ اب کہ انگریزوں کی حکمت عملی اس ملک میں
کامیاب ہو گئی تو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ منتقمانہ جذبات سے کام لیا اور ان کو اپنا دشمن
تصوّر کیا ہندوؤں کی حالت مختلف تھی ان کی غلامی کا پٹّہ صرف ایک سے دوسرے ہاتھ میں
منتقل ہو گیا تھا ورنہ تجارتی کاروبار اور سرمایہ داری کی یکساں ذہنیت نے دونوں میں ایک قسم
کا اتحاد عمل پیدا کر دیا تھا۔ جو کچھ مذہبی اور سیاسی کاوش تھی وہ مسلمانوں ہی سے مخصوص تھی لارڈ

"ایلنبرا گورنر جنرل ۱۸۴۲ء میں اس پالیسی کا آغاز کر چکا تھا کہ مسلمانوں کو ہرگز ابھرنے نہ دیا جائے
کمپنی کے اس حاکم اعلیٰ نے کابل و غزنی کے معرکے کے بعد ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھا تھا:۔

"مجھے اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ وہ خاص لوگ جن کی گذر ہمارے ہی ٹکڑوں پر ہے
وہ دل سے ہمارے بدخواہ تھے۔ بخلاف اس کے ہندو ہماری فتح پر اظہار مسرت کر رہے ہیں
جب ہمیں ان مسلمانوں کی دشمنی کا یقین کامل ہے جن کی تعداد ۱/۱۰ ہے تو پھر کیوں نہ ہم اس قوم
کا ساتھ دیں جس کی تعداد ۹/۱۰ ہے جو ہماری وفادار ہے"

پھر ۱۸۴۳ء میں لکھتا ہے کہ:۔

"میں اس عقیدہ کے خلاف کیسے آنکھیں بند کر لوں کہ مسلمانوں کی یہ نسل دیوانہ وار
ہماری دشمن ہے اور اس لئے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ مہربانی کی جائے"

تقریباً ایک صدی تک مسلمان اسی پالیسی کے ماتحت تباہ کئے جاتے رہے مگر اس
کے علاوہ بھی کمپنی نے اس ملک میں جو عام پالیسی اختیار کی وہ بالآخر ایک بڑے انقلاب
کا سبب بن گئی اور ۱۸۵۷ء میں وہ ہنگامہ برپا ہوا جس نے کمپنی کا بھی خاتمہ کر دیا۔

یہ ہنگامہ جس کو اب جنگ آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے چند ماہ سے زیادہ نہ رہا
اور ہندوستانی سرداروں اور ہندوستانی فوجوں کے ہی ذریعہ سے فرو کر دیا گیا۔ شورش کے
خاص خاص مرکزوں میں بھی سپاہی اور عام آدمی وفادار رہے۔ باہمی خون ریزی اور غارتگری
کی معصیت نے آزادی کا خیال بھی نہ آنے دیا، جو درحقیقت سرغنہ تھے ان کے سامنے کوئی
واضح مقصد نہ تھا اور جو کچھ تھا وہ نفرت و انتقام کا ایک طوفانی ہنگامہ اور فوج کے ایک حصہ
کا محض غصہ اور لوٹ مار سے جیب و دامن بھرنے کا جذبہ تھا۔

غدر فرو ہوتے ہی سزا و جزا کا وہ بازار گرم ہوا جس میں رحم و انصاف کی جنس نہ تھی
اگرچہ غدر کرنے والوں اور باغی فوج میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی مگر غصہ زیادہ تر مسلمانوں
پر تھا اور وہ ہی ہندوؤں کو بہکانے والے قرار دیئے گئے۔ چنانچہ جب فوجی عدالت میں
بہادر شاہ ظفر آخری وارث سلطنت مغل کو ایک مجرم کی حیثیت سے لایا گیا اور مقدمہ کی کارروائی
شروع ہوئی تو وکیل سرکار نے جابجا ہندوؤں کو بچا کر مسلمانوں اور ان کے مذہب پر حملے کئے مثلاً:۔

"ایشیائی طرز معاشرت کی جو کوئی بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہو گا فی الفور اس بات کو تسلیم کرے گا اور خصوصاً ہندوؤں کی نسبت کہ ان کے بہت تھوڑے برائی کی طرف راغب ہوتے ہیں یہ کارروائی (چپاتیوں کی تقسیم جو زمانہ غدر میں بطور اطلاع کی گئی) اور آٹے میں ہڈیاں ملانے کی افواہ بلا شبہ ایک ہی جڑ سے نکلی ہیں اور دونوں کو اسلامی سازش کی گڑھی ہوئی فطرت کی طرف منسوب کرنا صاف بیانی یا استدلال قطعی کی حد سے باہر نہیں ہونے دیتا...

ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو سپاہی اپنی پہلی لغزش جذبات پر نادم ہوتے ہیں اور مسلمان سپاہیوں پر ملامت کرتے ہیں کہ انھوں نے بلا وجہ ہمیں گمراہ کیا....

گو ہم اسلامی سازشوں کے کھوج میں جہاں تک ہماری تحقیقات لائی پہونچ گئے ہیں ہمیں ایسا کوئی کاغذ دستیاب نہیں ہوا جس سے یہ معلوم ہو کہ ہندوؤں نے بھی جماعت بنکر ہمارے خلاف سازش کی یا ان کے برہمنوں اور پنڈتوں نے بھی عیسائیوں سے جہاد کی تبلیغ کی ہو، ان کے پاس کوئی بادشاہ تخت نشین کرانے کو نہ تھا کوئی مذہب تلوار سے اشاعت کے لئے نہ تھا... معلوم اسلامی تعصب پہلے سے حملہ آور تھا اور اس خاص مذہب کا کینہ در تعصب حکومت کے لئے جد و جہد کر رہا تھا.... صرف مسلمان ہی خلش وار پیکاں ہیں جو باہم جُڑے ہوئے ہیں... ہندوؤں کی نسبت ضرور کہوں گا کہ یہاں ذرا غور کیا جائے اور روشنی ڈالی جائے کیوں کہ وہ تو ہمیشہ اپنے پیش قدم ہمسایہ کے حکم بجا لاتے رہے ہیں۔"

اسی طرح بعد کے تمام مصنفین نے مسلمانوں کو ہی غدر کا بانی اور ملزم گردانا اور یہی جذبات تھے کہ مسلمانوں سے شدید انتقام لیا گیا جس سے زیادہ شاید ہی تاریخ عالم میں کوئی اور ہولناک انتقام نظر آئے مگر یہ بدبختی ان بیمانہ سزاؤں پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ منافرت و تعصب کی جڑیں اس طور پر مضبوط کی جاتی ہیں کہ اخبارات و رسائل میں ہی نہیں مستقل تصانیف میں مسلمانوں پر بروئے مذہب غدر کی تمام ہولناکی عائد کی جاتی ہے۔

سید احمد خاں جو اس زمانہ میں ضلع بجنور میں صدر امین تھے اور انھوں نے ان مصائب کو جھیلا تھا لکھتے ہیں کہ:-

کوئی آفت ایسی نہیں جو اس زمانہ میں ہوئی ہو گو وہ رام دین اور ماتا دین نے ہی کی ہو

اور یہ کہا گیا کہ مسلمانوں نے کی۔ کوئی بلا آسمان سے نہیں چلی جو اس نے پہونچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔ ان دنوں جو میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گذرے اور جو کتابیں اس ہنگامہ کی بہت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں اور ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان، مسلمان، مسلمان۔

کوئی کانٹوں دار درخت اس زمانہ میں نہیں اُگا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشین بھولا نہیں اُٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اُٹھایا تھا۔۔۔۔۔۔
ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ متکلمین و مصنفین کتب بغاوت نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے مذہب کا بہت بڑا واقف کار ظاہر کیا ہے اور یوں جانتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے مذہب کے بھی بڑے مولوی ہیں حالانکہ وہ مسلمانوں کے مذہب کے احکام مطلق نہیں جانتے۔ میں نے فلاں اخبار اور فلاں کتاب میں دیکھا کہ منجملہ متکلمین و مصنفین کتب ہمارے کلام اللہ کی بہت سی آیتیں متضمن فضائل جہاد و قتل کفار جمع کیں اور ان کو عجیب عجیب رنگ برنگ کی عبارتوں میں چھاپا اور نتیجہ یہ نکالا کہ مسلمانوں کے مذہب میں عیسائیوں کا قتل کرنا اور ان پر جہاد کرنا فرض تھا اور بہت سی تہمتیں مذہب مسلمانی پر لگائیں۔[1]"

اگرچہ ان خیالات و توہمات کو سر سید اور دیگر ہمدرد مسلمانوں نے ہر طریقہ پر دور کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی جڑیں بھی بہت مضبوط تھیں اور مسلسل مسلمان پستے ہی رہے،
تمام خطرات کو نظر انداز کر کے سر سید احمد خاں نے باوجود سرکاری ملازم ہونے کے محض حب وطن کے جوش میں رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا اور چوں کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کا بدترین اثر ان کی قوم پر تھا اس لئے انھوں نے لائل محمڈنز آف انڈیا کی اشاعت کی جس کا مقصد اس اثر کا ازالہ تھا، انہوں نے اس امر پر پورا غور کیا تھا کہ ہندوستان کی ترقی محض تعلیم کی ترقی پر منحصر ہے اور اس غور کے نتیجہ میں ۱۸۶۳ء میں ایک التماس بخدمت ساکنان ہندوستان درباب ترقی تعلیم اہل ہند شائع کر کے ملکی زبان و علوم کی ترقی کے لئے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جو ہندو مسلمانوں اور انگریزوں کا مشترک ادارہ تھا۔ پھر سیاسی ترقی کے لئے ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن

---

[1] دیباچہ لائل محمڈنز آف انڈیا مطبوعہ ۱۸۶۰ء

کی تاسیس کی۔

ان تمام کوششوں میں انھوں نے اپنے ہموطن ہندوؤں کے ساتھ اتحاد و اشتراک عمل رکھا مگر ۱۸۶۷ء میں شمال و مغرب (یو۔ پی) کی اکثر ہندو انجمنوں نے اُردو زبان اور فارسی حروف کے برخلاف سخت کوشش کی اور اُردو کو اپنی غلامی کی یادگار سے تعبیر کیا، ان انجمنوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے اتحاد میں بھی رخنہ پیدا کر دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے صد سالہ دور میں مسلمانوں کی تباہی تغیر حکومت کے ساتھ ماضی کی داستان ہو چکی تھی، لیکن تاج کی حکومت بھی اُن کے لئے خطرہ سے خالی نہ تھی اُن کی حالت ہر ملک میں دنیا کی اُن قوموں سے جو فاتح اور مفتوح رہی ہیں بالکل مختلف حیثیت رکھتی ہے ان کو اپنی قوم کے سیاسی تسلط اپنے مذہب کے سادہ اصول اپنی وحدت قومی اور اعلےٰ تہذیب پر ہمیشہ فخر رہا مگر وہ اب ایک ایسی برباد شدہ قوم تھی کہ اس پر مذہبی و سیاسی رقابت کی وجہ سے نہ تو اس قوم کو اعتماد تھا جو اپنی سیاسی چالوں سے اس کی حکمراں ہو گئی تھی اور نہ اس قوم میں ہمدردی و لیگانگی تھی جس کے ساتھ باوجود صدیوں حکمراں رہنے کے مساویانہ برتاؤ رکھا اور ملک کے عام و خاص مفاد میں اشتراک و تعاون اور اتحاد رہا اور نہ وہ اب مسلمانوں کے ساتھ عام ملکی مفاد میں اشتراک کی خواہاں تھی۔ علاوہ بریں سیاسی اقتدار کے انحطاط و زوال اور مصائب متواترہ نے مسلمانوں میں تنزل پذیر قوموں کی خصوصیات بھی پیدا کر دی تھیں۔

ان مایوس کن حالات میں سر سید نے اپنی ساری کوششیں اپنی قوم کی اصلاح و ترقی کے لئے وقف کر دیں۔ انھوں نے اپنے کام کی بنیاد مقتضیاتِ زمانہ کے لحاظ سے تعلیم اور اس قوم سے جس کو خدا کی حکمت بالغہ نے اب حکمراں بنا دیا تھا۔ اتحاد و دوستی پیدا کرنے پر رکھی مگر ۱۸۷۰ء میں جب کہ ان کوششوں کی بنیادیں بھی استوار نہ ہوئی تھیں کہ بنگال و بہار کے مسلمان ایک تازہ مصیبت میں مبتلا ہو گئے اور اس کی لپیٹ میں ساری قوم آ گئی۔

مسلمانانِ سرحد و پنجاب پر سکھوں نے اپنے زمانہ عروج میں جو مظالم کئے تھے ان سے متاثر ہو کر مولانا سید احمد بریلوی اور اُن کے خلیفہ مولوی محمد اسمٰعیل (رحمہم اللہ) نے ۱۸۲۶ء میں جو سلسلہ جہاد شروع کیا تھا وہ سلسلہ ۱۸۴۹ء تک جاری تھا۔ تا آں کہ انگریزوں نے پنجاب

پر قبضہ کیا اور اس وقت کے سوار مجاہدین[5] مولوی عنایت علی و مولوی ولایت علی معہ رفقا کے
اپنے وطن کو واپس بھیجے گئے اور ان سے سرحد کو نہ جانے کے میعادی مچلکے لئے گئے لیکن میعاد
گذرنے پر یہ دونوں سرحد پہونچے اور ایک لڑائی میں شہید ہو گئے۔ ان علمائے کرام کے باعث
بعض سرحدی مقامات علمی مرکز بھی بن گئے جہاں اکثر طالبانِ علم حصولِ علم کے لئے جاتے ا نیز
ہجرت کا سلسلہ بند نہیں ہوا تھا بہار و بنگال وغیرہ سے ان طلبا و مہاجرین کی امداد میں بڑی
بڑی رقوم بھیجی جاتیں۔ بعد غدر تعداد مہاجرین میں اور اضافہ ہو گیا اور جس طرح کہ اکثر مفسد آدمی
اور مفرور سپاہی نیپال کی ترائی اور راجپوتانہ کے بیابانوں میں سزا سے بچنے کے لئے منتشر ہو گئے
اسی طرح ان سرحدی مقامات پر بھی پہونچے مگر حکومت ہند نے چونکہ ۱۸۶۲ء سے سرحدی
محاربات کا آغاز کر دیا تھا لہٰذا ان کا استیصال بھی ضروری تصور کیا۔ چنانچہ ۱۸۶۲ء اور ۱۸۷۲ء
کے درمیان جن لوگوں پر اس خالص مذہبی خیرات دینے اور جمع کرنے کا شبہہ ہوا ان کو سیاسی
مقدمات میں ماخوذ کیا گیا اور ۱۸۶۵ء میں متعدد اشخاص ایکٹ ۳ ۱۸۱۸ء کے ماتحت نظر بند
کئے گئے۔

یہ لوگ اہل حدیث تھے ان کو وہابی کہا گیا اور وہابیت بالخصوص بنگال میں بغاوت
کے مرادف قرار دی گئی جسکا نتیجہ یہ تھا:۔

"بنگال میں وہابی تحریک کے بعد انگریزوں نے جو طرز عمل اختیار کیا اس
سے مسلمان جاگیرداروں اور امین داروں کی تمام املاک جو وسعت میں
تمام بنگال کی ایک چوتھائی تھیں گورنمنٹ انگلیشیہ نے ضبط کرلیں اس پالیسی
کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری ملت کے سیکڑوں شریف آدمی اور خوشحال خاندان
نان شبینہ کو محتاج ہو گئے اور ہماری قوم کے ہزاروں افراد عالم بیکسی و
مفلسی میں دربدر پھرنے لگے۔ سیکڑوں گھرانوں نے شہروں کو خیرباد کہکر

---

[5] اس داستان کا یہ عبرتناک باب ہے کہ خود ان مجاہدین اور سرحدیوں کے فروعی تعصبات حنفیت و وہابیت
کے اختلافات اور بعض مواقع پر غداری اور حرص و آز نے اور زیادہ تر سیاسی ذہنیت و قابلیت کے فقدان
نے ان نتائج سے محروم رکھا جو اس عزم و جوش اور مالی و جانی قربانی سے حاصل ہوتے۔

دیہات میں سکونت اختیار کرلی اور کاشتکاری پر قناعت کی۔[۱]

یہ زمانہ مسلمانوں کے لئے نہایت پُرآشوب تھا اور اُن کے خلاف ایسا سخت پروپگنڈا تھا جو کبھی اُنکو اُبھرنے نہ دیتا۔ اخبارات میں مسئلہ جہاد ایک خاص موضوع بحث تھا مسلمانوں پر الزام لگایا گیا کہ اُنہوں نے ہی سرحدیوں کو انگریزوں کی مخالفت پر برانگیختہ کر رکھا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جو لڑائیاں ہوئیں وہ اسی سازش کا اثر سمجھی گئیں۔ تقریباً چودہ کتابوں کے غلط ترجمے کئے گئے اور تاریخی واقعات میں تدلیس کرکے اشاعت کی گئی۔ عین اسی دوران میں ایک سرحدی پٹھان نے بماہ فروری ۱۸۷۲ء بمقام انڈمان لارڈ میو کو اور دوسرے نے کلکتہ میں مسٹر نارمن چیف جسٹس کو قتل کردیا جو محض دو افراد کا جنونانہ جوش تھا۔ مگر ان واقعات پر مذہبی تعصبات کا گہرا رنگ چڑھایا گیا۔

یہی وقت تھا کہ ایک ممتاز انگریز ڈاکٹر ہنٹر نے ایک کتاب شائع کی جس میں مسلمانوں کی دوستی کے پردہ میں اسلامی تعلیمات کو ایسی تدلیس و تاویل کے ساتھ دکھایا کہ خواہ مخواہ مسلمان عیسائیوں کا دشمن نظر آتا تھا۔

اس کتاب نے نہ صرف ہندوستان کے انگریزوں کو بھڑکایا بلکہ انگلستان میں بھی اسکی اشاعت نے بہت بڑا اثر ڈالا اور مسلمانوں، خاصکر وہابیوں کے متعلق اخبارات میں بحث چھڑ گئی۔ کتاب کا عنوان ہی فساد انگیز تھا کہ:۔

"کیا ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر از روئے ایمان کے ملکہ معظمہ سے بغاوت کرنا فرض ہے"

ایک موقع پر لکھا تھا کہ "ہندوستان کے مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لئے موجب خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے باعث خطر چلے آتے ہیں۔ مگر سرسید نے اس زہر کے دفعیہ کے لئے ایک سلسلہ مضامین شائع کیا جس کے ساتھ انگریزی ترجمہ بھی ہوتا تھا۔ اور ایک بزرگ حافظ احمد حسین صاحب وکیل ٹونک نے جو ان دنوں لندن میں مقیم تھے ان مضامین کا مجموعہ انگلستان میں کتابی صورت میں طبع

---

[۱] خطبہ صدارت آنریبل سر محمد عبدالرحیم صدر اجلاس مسلم لیگ ۱۹۲۵ء

کرا کے شائع کر دیا جس کا بہت اچھا اثر ہوا۔ بعض اخبارات نے بھی سرسید کی تائید میں پرزور مضامین لکھے اور اس طرح ڈاکٹر ہنٹر کا زہر اُتارا گیا۔

سرسید نے جن کوششوں کو شروع کیا تھا ان میں وہ باوجود مزاحمتوں اور مخالفتوں کے کامیاب ہو رہے تھے۔ یہ مخالفتیں اور مزاحمتیں سول سروس کے بعض عہدہ داروں کی طرف سے مختلف صورتوں میں ہوتی تھیں اور ان صورتوں میں مہیب صورت بعض عہدہ دار مولویوں کی مخالفت تھی جو مذہب کے پردہ میں کی جاتی تھی تاہم ۱۸۷۵ء[1] میں ایک قومی مدرسہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جو ۱۸۷۷ء میں کالج کے درجہ پر پہونچ گیا اور وسیرائے ہند نے اس کا سنگِ بنیاد نصب کیا۔

اگرچہ سرسید کی پوری جد وجہد مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی اشاعت اور انگریزوں کی متعصبانہ ذہنیت کی تبدیلی پر مبذول تھی لیکن اُنہوں نے ملکی و سیاسی معاملات میں بھی حصّہ لیا اور ۱۸۷۸ء میں جب وہ گورنر جنرل کی کونسل کے ممبر نامزد کئے گئے تو متعدد قوانین کے مباحث میں شریک ہوئے۔ ہندوستانیوں میں وہ ہی پہلے ممبر تھے جنہوں نے مفاد ملکی و قومی کے مسودات قانون[2] (بل) کونسل میں پیش کئے۔

لارڈ رپن کے زمانہ میں جب جنوری ۱۸۸۳ء میں صوبہ متوسط کی لوکل سیلف گورنمنٹ کا بل پیش ہوا تو اُنہوں نے اپنی تقریر کے ضمن میں کہا تھا کہ:-

"میں اس بات کے خیال سے خوش ہوں کہ میں اس قدر عرصہ تک زندہ رہا کہ میں نے اس دن کا آغاز دیکھ لیا جبکہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سیلف ہیلپ اور سیلف گورنمنٹ کے وہ اصول سیکھنے کو ہے جنہوں نے انگلستان میں ریپریزینٹیٹو انسٹی ٹیوشن پیدا کئے ہیں اور اسکو دُنیا کی قوموں میں بڑا بنا دیا ہے۔

اس صوبہ کی حالت کے لحاظ سے لوکل بورڈوں میں دو ثلث ممبر انتخاب سے

---

[1] مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا اندازہ ان اعداد سے کرنا چاہیے کہ ۱۸۵۷ء سے یعنی جب سے کہ یونیورسٹیاں قائم ہوئیں مسلمان گریجویٹوں کی کل تعداد (۹۲) بمقابلہ (۱۹۵۲) ہندوؤں کے تھی۔
[2] لیکچرز و تقریر قانونیاں۔

اور ایک ثلث نامزدگی سے قرار دئے گئے تھے۔ سر سید نے اسکی تائید کرتے ہوئے زور دیا کہ یہی اُصول پورے ہندوستان پر جاری رکھا جاوے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ:-

"ہندوستان فی نفسہ ایک بڑا عظم ہے اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں۔ اور مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جُدا رکھا ہے اور ذات کا قاعدہ ابتک بڑے زور سے جاری ہے ممکن ہے کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف فرقوں کے باشندے ہوں اور جس حالت میں کہ باشندوں کا ایک گروہ دولت مند اور صاحب تجارت ہو تو دوسرا گروہ با علم اور ذی رعب ہو۔ ممکن ہے کہ ایک گروہ بلحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہو۔ اور روشن ضمیری کے جس درجہ پر ایک گروہ باشندوں کا پہونچ گیا ہو وہ بہ نسبت اسکے جہاں تک کہ باقی باشندے پہنچے ہوں، بہت اعلیٰ ہو، ایک قوم اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کونسلوں میں اِن کی طرف سے ممبروں کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے دوسری قوم کو اس قسم کے معاملات کی مطلق پرواہ نہ ہو۔ پس ان صورتوں میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہے کہ ہندوستان میں رپرزینٹیٹو انسٹی ٹیوشنوں کے جاری کرنے سے بڑی مشکل اور سوشیل و پولیٹیکل خطرات پیدا ہونگے ایک ایسے ملک میں جیسا کہ انگلستان ہے جہاں قومی امتیاز اب باقی نہیں رہا اور جہاں مذہبی معاملات میں تفرقہ و اختلاف تحمل کی ترقی کے سبب سے کم ہو گئے ہیں اس معاملہ میں اس اس قسم کی مشکلات پیش نہیں آتی ہیں۔ قوم اور مذہب کے متحد ہونے سے انگریزی قوم ایک قوم ہو گئی ہے اور تعلیم کی ترقی سے خفیف اختلاف ان معاملات میں جو بیشتر ملک کی بہبودی سے متعلق ہیں بالکل ناچیز ہو گئے ہیں۔"

عیسائیوں کو پارلیمنٹ میں اپنے مطلب کی حمایت کرنے کے واسطے یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ عذر نہیں ہوتا اور در حقیقت سوشل اور پولیٹیکل مقاصد کے واسطے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگلستان کی کل آبادی ایک ہی قوم ہے بلا شبہ

بہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی نسبت ایسا نہیں کہا جا سکتا الیکشن کے ذریعہ ممبروں کے
مقرر کرنے سے رعایا کا ایک حصہ کی رائے اور مطالب کی حمایت کرنے سے مراد
ہے اور ان ملکوں میں جہاں کہ آبادی صرف ایک قوم اور ایک مذہب سے مرکب
ہوتی ہے یہ قاعدہ بلاشبہ سب سے عمدہ ہے جو جاری کیا جا سکتا ہے لیکن
میرے لارڈ ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے جہاں کہ ذات کے
اختلافات ابتک موجود ہیں اور جہاں مختلف قومیں خلط ملط نہیں ہوئی ہیں
اور جہاں کہ مذہبی اختلافات اب تک زور شور پر ہیں اور جہاں کی تعلیم نے
اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی
مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی ہے۔ مجھکو یقین ہے کہ لوکل بورڈوں اور
ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الیکشن کے
خالص اور سادہ اصول کے جاری کرنے سے محض تمدنی خیالات کی بہ نسبت زیادہ
تر بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہونگی۔ جب تک قوم اور مذہب کے اختلافات اور
ذات کا امتیاز ہندوستان کی سوشیل اور پولیٹیکل حالت میں ایک جزو اعظم
رہیگا اور ان معاملات میں جو ملک کے انتظام اور بہبودی سے بیشتر تعلق
ہیں۔ انکے باشندوں پر اثر ڈالے گا۔ اسوقت تک الیکشن کا خالص قاعدہ
طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا جا سکتا بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب
پر غالب آوے گی اور جاہل آدمی گورنمنٹ کو اس قسم کی تدابیر جاری کرنے کا
جوابدہ سمجھیں گے جنکے باعث سے قوم اور مذہب کے اختلافات بہ نسبت
سابق کے اور بھی زیادہ سخت ہوجاویں گے۔ میرے لارڈ میں نے اس معاملہ
کی نسبت اس قدر تفصیل کے ساتھ اس امر کی تشریح کرنے کی غرض سے گفتگو
کی ہے کہ میں نے ریپریزینٹیٹو طریقہ کا سچا حامی ہوکر کس وجہ سے اس مسودہ
کے ان احکام کی دلی تائید کی ہے جو الیکشن کے خاص طریقہ کے برخلاف معلوم
ہوتے ہیں گورنمنٹ نے جو لوکل اور ضلع کی کونسلوں کے ایک ثلث ممبروں کے

مقرر کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اس سے گورنمنٹ نے وہی تدبیر اختیار کی ہے
جو ہندوستانی رعایا کے مختلف فرقوں کی طرف سے ممبروں کے تقرر میں اس قسم کی
مناسب اور اچھی مساوات قائم رکھنے سے جو الیکشن کے خالص قاعدہ کے ذریعہ
سے حاصل نہ ہوگی لوکل سیلف گورنمنٹ کی کامیابی کی کفالت کے واسطے اختیار کی
جا سکتی ہے"

پھر تیسرے مہینہ جبکہ مارچ میں ضابطہ فوجداری کی ترمیم (البرٹ بل) پیش تھی۔ اینگلو انڈین اور یورپشین طبقات کا اصرار تھا کہ انکے مقدمات کی سماعت ہندوستانی مجسٹریٹوں کے اجلاس میں نہ ہو۔ اور اس اصرار پر ایک ہنگامہ برپا تھا تو سرسید نے اس اصرار کے خلاف نہایت زبردست تقریر کی اور آخر میں کہا کہ:۔

"مجھ کو یقین واثق ہے کہ جب تک قومی امتیازات کو ملک کے عام قانون میں دخل ہوگا اسوقت تک دونوں قوموں کے درمیان اصلی دوستانہ خیالات کی ترقی کے باب میں مزاحمتیں قائم رہیں گی۔ زندگی کی سوشل خوشی اور موافقت پولیٹیکل ہمسری سے اور ایک ہی قانون کے زیر حکم رہنے اور ایک ہی عدالتوں کے تابع رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ذات کا سلسلہ شاید اس عرصہ تک ہرگز قائم نہ رہتا۔ اگر زمانہ قدیم کے مقنن برہمن کے واسطے ایک قانون اور شودر کے واسطے دوسرا قانون نہ بناتے گو زمانہ سابق کی ضرورتیں کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن میرے لارڈ میں اُمید کرتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے ڈیڑھ سو برس گذر جانے سے ہم اب شائستگی کے اُس درجہ کو پہنچ گئے ہیں۔ جبکہ قومی امتیازات کو بہر کیف ملک کے عام قانون میں کم کرنا ہر ایک وجہ سے مناسب ہے میرے لارڈ مجھکو اپنی طرف سے تو مستحکم یقین ہے کہ وہ زمانہ آگیا ہے جبکہ ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ یورپین ہوں یا یوریشین اس بات کو سمجھنے لگے کہ وہ ہم سر رعایا ہیں اور ان کے پولیٹیکل حقوق یا کانسٹی ٹیوشنل رتبہ میں قانون کی نگاہ میں کوئی فرق نہیں"

۱۸۵۳ء سے اسطے ملازمت ہند (انڈین سول سروس) میں انگریزوں کے لئے امتحان مقابلہ

لازمی ہوگیا اور کچھ مدت بعد ہندوستانیوں کو بھی انگریزوں کے ہم رتبہ عہدوں پر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا لیکن عرصہ تک تعلیم کی کمی اور بحری سفر کے مذہبی تعصبات کی وجہ سے ہندوستانی یعنی تعلیم یافتہ ہندوان عہدوں کو حاصل نہ کرسکے کیونکہ امتحانِ مقابلہ انگلستان میں ہوتا تھا مگر تعلیمی ترقی کے ساتھ تعصبات میں بھی کمی آتی گئی اور ۱۸۶۴ء سے ہندوستانیوں کا تقرر بھی ہونے لگا تاآں کہ ۱۸۸۳ء تک وہ سیشن جج کے عہدوں تک پہنچنے لگے۔ مگر مسلمان جن کی نسبت ۱۸۵۷ء تک یہ اعتراف کیا جاتا تھا کہ:۔

”عزم، تعلیم، ذہنی صلاحیت کے لحاظ سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور نسبتہً ہندوان کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں“

اب اس نوبت پر تھے کہ ۱۸۸۲ء میں انڈین ایجوکیشن کمیشن نے اپنی تحقیقات کے نتیجہ میں یہ رائے ظاہر کی کہ:۔

مُسلمان پولیٹیکل سوشیل اور مذہبی خیالات کی بنا پر اُن تعلیمی اداروں کے فوائد سے متمتع نہوے جو حکومت اور مشنری سوسائٹیوں نے قائم کئے نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تمول اور اخلاقی و عقلی عروج میں رفتہ رفتہ زوال پذیر ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ سلطنت انگریزی کے بعض وسیع حصص میں نہ تو جوڈیشل محکموں میں اور نہ انتظامی صیغوں میں مسلمان کسی معزز عہدہ پر مامور تھے بلکہ قانون کے پیشہ میں بھی جس سے سلطنت کو کوئی تعلق نہیں ان کی ترقی برابر گھٹتی چلی گئی اور بحیثیت زمیندار و تاجر کوئی علامت ترقی نمایاں تھی“

علاوہ بریں ایک اور وجہ بھی تھی کہ ہندوؤں کی اعلیٰ ذاتوں نے جو تعلیم میں نسبتہً بہت آگے تھیں تمام محکموں میں اجارہ داری قائم کرلی تھی۔

بہر حال ۱۸۸۵ء میں لارڈ ڈفرن کی گورنمنٹ نے مسلمانوں کے متعلق ایک ریزولیوشن صادر کیا تو ان کو حکومت کے سررشتوں میں کچھ داخلہ کا موقع ملا لوکل گورنمنٹوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں جہاں مسلمانوں کی حالت ایسی ہو کہ کمیشن کی تجاویز پر عمل کیا جائے وہاں مناسب تدابیر کی جائیں لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی جتائی گئی کہ:۔

مُسلمانوں کو انصافانہ طور پر سرکاری اعلیٰ عہدوں پر مامور ہونے کی توقع صرف جب ہی رکھنی چاہیئے کہ جب وہ سرکاری انتظام تعلیم کے ذریعے سے مستفید ہو کر اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم حاصل کرکے ہندوؤں کے مساوی اپنے آپ کو ثابت کریں۔ ..... گورنمنٹ آف انڈیا۔

جتاتی ہے کہ ہر صوبہ میں اعلیٰ درجہ کی سرکاری ملازمت میں عہدہ داروں کا تقرر امتحانات میں اونچا رہنے پر ہوتا ہے یا امیدواروں کی ایسی لیاقتوں پر جن کو قومی و ملی خصوصیت سے کوئی سروکار نہیں، پس اگر مسلمانوں کو بمقابلہ دیگر اقوام ہند کے کم عہدے ملے ہیں تو اس بات کا الزام گورنمنٹ پر عائد نہیں ہو سکتا اور نہ اس کو سرکاری افسروں کے قصور پر محمول کیا جا سکتا ہے۔"

ان حالات میں مسلمانوں کی رفتار تعلیم میں ترقی کی اور زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور مسلمان مدبرین نے اپنی کوششوں کا محور اسی مقصد تعلیم کو بنایا خصوصاً سرسید کی ہر کوشش اس کے لئے وقف ہو گئی۔

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام ۱۶۰۰ء میں ایک برطانوی تاجدار ملکہ ایلزبتھ کے اجازت نامہ سے اور اس کا عروج برطانوی سلطنت کے زیر سایہ ہوا تھا اور برطانوی پارلیمنٹ ہی اس کے متعلق وقتاً فوقتاً حسب ضرورت قوانین بناتی رہتی تھی چنانچہ ۱۷۷۳ء سے ۱۸۵۳ء تک متعدد قوانین نافذ ہوچکے تھے، گویا کمپنی کی حکومت برطانیہ کی ایک ضمنی حکومت ہو گئی تھی اور اس نگرانی کے لئے ایک مجلس یا "بورڈ آف کنٹرول" کے نام سے قائم تھی مگر ۱۸۵۸ء میں پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کر کے کمپنی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور اس کے تمام مقبوضات براہ راست تاج برطانیہ کے زیر نگیں آ گئے۔

اس دستوری تغیر یا انقلاب کا آغاز ملکہ وکٹوریہ کے ایک اعلان مورخہ یکم نومبر ۱۸۵۸ء سے ہوا جس میں آئندہ حکومت کی پالیسی واضح کی گئی اور یہ بات بھی بیان کی گئی کہ :-

"ہر کوئی شخص اپنی ذات نسل، مذہب یا رنگ کی وجہ سے سرکاری عہدوں سے محروم نہ کیا جائے گا، بشرطیکہ وہ اپنی تعلیمی قابلیت اور دیانت کے لحاظ سے اس کی اہلیت رکھتا ہو، حکومت کسی کے عقائد میں بھی دخل اندازی نہ کرے گی۔"

ملکہ معظمہ کی رعایا میں سے ہر شخص کو سول سروس کے امتحان میں شرکت کا حق دیا گیا، کمپنی کی افواج بحری و بری علیٰ حالہ تاج برطانیہ کی ملازمت میں منسلک ہو گئیں۔

برطانوی مجلس وزراء میں وزیر ہند (سکریٹری آف اسٹیٹ) کا اضافہ کیا گیا اور بورڈ آف کنٹرول کی جگہ انڈیا کونسل قائم ہوئی اور وزیر ہند تمام حقوق و واجبات کا ذمہ دار قرار پایا جو کمپنی کے جانشین کی حیثیت سے اس پر عائد ہوں۔

۱۸۳۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان میں وضع قوانین کا حق و اختیار گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو دیا تھا مگر یہ کونسل تمام تر انگریزوں پر ہی مشتمل تھی اور ظاہر ہے کہ ایسی کونسل کے بنائے ہوئے قوانین کسی طرح ہندوستان کے مناسب حال نہ ہو سکتے تھے، سر سید احمد خاں نے اپنے رسالہ اسباب بغاوت ہند[1] میں اس بات کو بھی ایک بڑا سبب بغاوت قرار دیا تھا، مثلاً :-

"سب لوگ تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ واسطے اسلوبی اور خوبی اور پائداری گورنمنٹ کے مداخلت رعایا کی حکومتِ ملک میں واجبات سے ہے . . . . . یہ بات گورنمنٹ کے لئے بہت اچھی اور پُر ضرور تھی اور اس کے نہ ہونے کے سبب یہ فساد برپا ہوئے۔"

اب ۱۸۶۱ء میں فرسٹ انڈین کونسل ایکٹ (ہندوستانی مجلس آئین ساز کا پہلا قانون) وضع ہوا اور گورنر جنرل کی کونسل میں نامزدگی سے ہندوستانی ممبروں کو شامل کیا گیا۔ اس موقع پر سر چارلس ووڈ وزیر ہند نے ہاؤس آف کامنس (دار العوام) میں مسودہ قانون پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

"مجھے اِس سے پہلے اپنی ذمہ داری کا احساس اتنا نہیں ہوا جتنا کہ اس تجویز کو پیش کرتے وقت ہو رہا ہے جو کہ بہت اہم ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ پندرہ[2] کروڑ آدمیوں کے لئے ہم کو وضع قانون کا انتظام کرنا کس قدر مشکل اور اہم کام ہے اور جن لوگوں نے کبھی ہندوستانی معاملات کے متعلق معلومات حاصل کی ہیں ان پر یہ مشکلات ظاہر ہیں کیوں کہ ہم کو ایسی مختلف قوموں کے لئے وضع قانون کا طریقہ بتاتا

---

[1] سر سید نے یہ رسالہ ۱۸۵۸ء میں ہی تالیف کیا تھا جس میں وہ تمام اسباب بوضاحت بیان کئے جن سے بغاوت ہوئی اور کمپنی کی حکومت کی غلط کاریاں اور غلطکاریاں کھول کھول کر دکھائی ہیں، اس آتشیں زمانہ میں سر سید کا یہ اقدام نہایت خطرناک تھا مگر انھوں نے ہر خطرہ کو نظر انداز کر دیا اور جرات کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کیا البتہ اس کی اشاعت ہندوستان میں نہیں کی بلکہ تمام نسخے لندن بھیج دیئے کیونکہ اس کام کا مقصد برطانوی حکام اور مدبروں کو توجہ دلانا تھا، وہاں اس کے متعدد تراجم کئے گئے اور پارلیمنٹ میں موضوع بحث رہا۔

[2] اس زمانہ میں آبادی کا تخمینہ یہی تھا۔

ہے جن کی زبان مذہب تہذیب اور روایات سب میں اختلاف ہے جیسے کہ کٹر مسلمان جو یہ سمجھتا ہے کہ ہم نے اس کا اصلی حق یعنی حکومت ہند کو غصب کر لیا ہے اور ڈرپوک ہندو جو ہر فاتح کے سامنے جھک جانے کا عادی ہے مگر اپنے مذہب قوانین رسم و رواج اور نسلی امتیازات سے بہت سختی کے ساتھ وابستہ ہے کیوں کہ بے شمار نسلوں سے یہ باتیں اس میں چلی آ رہی ہیں اس کے علاوہ ہندوستان میں انگریز بھی بستے ہیں جو وہاں کی آبادی سے بالکل مختلف ہیں۔ چست اور باہمت ہیں اور ان میں نسلی فتحمندی کا غرور بھی موجود ہے اور اپنی قوم کے با اختیار ہونے کے باعث دوسروں کو پست سمجھتے ہیں اور بسا اوقات ہندوستانی آبادی کے جذبات کو بُری طرح پامال کرتے ہیں، لہٰذا جو قوتیں کہ قانون ساز جماعت سے پیدا ہوں وہ ان پر بھی اسی طرح اثر ڈالیں جس طرح کہ ہندوستانی آبادی پر موثر ہوں گی۔

کمپنی کی حکومت نے جو تعلیمی پالیسی قائم کی اس کی حقیقی غرض یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو مغربی علوم و خیالات سے آشنا کر کے ایک ایسی نسل پیدا کی جائے جو مغربی تہذیب و تمدن کی ترقی کا باعث ہو اور نظم و نسق ملکی کے انگریزی طریقوں کو بہ آسانی اختیار کر سکے چنانچہ کلکتہ اور برطانوی ہند کے خاص خاص شہروں میں اس تعلیم نے قبولیت عام حاصل کی مگر جن لوگوں میں یہ قبولیت ہوئی ان میں ہندوؤں کی وہ اعلیٰ ذاتیں تھیں اور زیادہ تر برہمن جن کے یہاں صدیوں سے تعلیمی اجارہ داری تھی پھر تعلیمی وسعت کے ساتھ ساتھ ان ذاتوں کی رفتار ترقی بھی بڑھتی گئی تا آں کہ ۱۸۳۱ء میں سیاسیات کی طرف بھی ان کا رجحان ہوا اور انگریزوں نے اس کو ابھار دیا چنانچہ ۱۸۴۳ء میں ایک انگریز ہی نے کلکتہ میں متعدد تقریریں کر کے بنگال انڈین سوسائٹی قائم کی ازاں بعد برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے ایک اور جماعت ظہور پذیر ہوئی جس نے سیاسی تحریکوں میں حصّہ لینا شروع کیا اور جس کا بڑا مقصد زمینداروں کے مفاد کی حفاظت تھا، ۱۸۵۳ء میں مسٹر جان برائٹ نامی انگریز کی صدارت میں ایک نئی جمعیت انڈین ریفارم سوسائٹی قائم ہوئی جس کا مدعا مرکزی حکومت کا خاتمہ اور صوبائی آزاد حکومتوں کا قیام تھا تاکہ نفاذ اصلاحات میں آسانی ہو، غرض اس قسم کی سیاسی تحریکات

پیدا ہوتی اور نشوونما پاتی رہیں، غدر کے بعد ان کی رفتار و تعداد میں اور ترقی و اضافہ ہو گیا۔ شیبی حصہ ملک میں بھی سر سید کی کوششوں سے ۱۸۶۶ء میں بمقام علیگڑھ ایک جمعیت برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ :-

ہندوستان کی گورنمنٹ کو ہر جائز وسیلہ سے روز بروز بہتر اور کار آمد بنائے اور اس کے عمدہ مقاصد کو اس غرض سے ترقی دے کہ اس ملک کے اصلی باشندوں اور دیگر اشخاص کو جو اس میں مستقل طور سے سکونت اختیار کریں فائدہ پہنچے تاکہ ہندوستان اور برطانیہ عظمیٰ دونوں ملکوں کے مشترک اغراض کو ترقی ہو۔ اس نظریہ سے یہ ایسوسی ایشن گورنمنٹ کی توجہ کو ایسے موجودہ انتظاموں اور تدبیروں کی ترمیم و اصلاح پر جس سے غالباً ملک کے اغراض کو مضرت پہونچنی متصور ہو مائل کرتی رہے گی یا جن سے ان اغراض کی ترقی متصور ہو خواہ وہ تدبیریں قانون سے متعلق ہوں یا سیاست یا تجارت یا کاشتکاری یا لوگوں کی عام حالت سے لگ

ایسوسی ایشن کی ممبری کے لئے مذہب و قومیت کا کوئی امتیاز نہ تھا حتیٰ کہ ملازمین سرکار بھی اس کے ممبر تھے۔

ایسوسی ایشن نے اس اصول کو کہ تعلیمی انتظام و نگرانی میں ٹیکس دینے والوں کی مداخلت ضروری ہے۔ لہٰذا ہر ضلع میں ایک کیمٹی قائم کی جائے جس میں حکام ضلع اور افسران سررشتہ تعلیم کے علاوہ ضلع کے زمیندار بھی شامل ہوں، زمینداران علیگڑھ کی امداد سے تسلیم کرا لیا اور صوبہ شمال و مغرب کے تمام اضلاع میں ایسی کیمٹیاں قائم ہو گئیں، ۱۸۶۷ء میں ایسوسی ایشن کی جانب سے دیسی زبان کی یونیورسٹی قائم کئے جانے کی تحریک ہوئی جو اصولاً گورنمنٹ نے بھی منظور کی لیکن بعض مشکلات جن میں تعلیمی کتابوں کی کمی سب سے بڑی مشکل تھی یہ تحریک عملی صورت میں نہ آسکی لیکن کچھ مدت بعد جب کہ سر سید کا تبادلہ علیگڑھ سے ہو گیا تو ایسوسی ایشن بھی ختم ہو گئی کیوں کہ دراصل ان اطراف ملک میں کمی تعلیم کی وجہ سے ابھی تک پورے طور پر سیاسی شعور پیدا نہ ہوا تھا۔

بنگال میں جس رفتار سے کہ تعلیمی ترقی ہو رہی تھی اور مغربی خیالات ذہن و دماغ پر

مسلط ہوتے جارہے تھے۔ وہی رفتار سیاسی جذبات ورجحانات کی بھی تھی تا آں کہ ۱۸۸۲ء میں ایک جمعیت موسوم بہ "نیشنل لیگ" قائم ہوئی اور اس کی طرف سے ایک گمنام پمفلٹ (ستارہ مشرق) کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے شروع میں چند انگریزی اشعار تھے جن کا مضمون یہ تھا کہ:۔

"اے آسمان کیا امید اور انصاف دونوں مرگئے کیا کبھی کوئی نیا دن نمودار نہ ہوگا
آہ اے بچو کیا تمہاری ماں (ہندوستان) ہمیشہ ایسی عبث منتوں پر منتیں کئے جائیگی
ایک ستارہ (نیشنل لیگ) مشرق کے شفاف افق پر چمک رہا ہے۔ اور اے ہندوستان
تیرے بچے جو جادو کے زور سے ایک مدت تک سوتے پڑے خواب دیکھ رہے تھے
تیرے جگانے کی آواز ان کے کان تک پہونچ گئی ہے"

یہ پمفلٹ اس درجہ مغویانہ تھا کہ اس کی نسبت بابو امبکا چرن موزمدار صدر اجلاس کانگرس ۱۹۱۶ء نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ:۔

"آج بھی اگر کوئی شخص اس کی تقلید کرے تو اسے سخت مشکل پیش آجائے"

اس طرح اور بھی متعدد رسائل اور پمفلٹ شائع ہوتے رہے اور بنگال میں سیاسی شعور و رجحان روز بروز بڑھتا رہا۔

بابِ دوم

۱۸۸۳ء میں سول سروس کے ایک رکن مسٹر اے ہیوم کو خیال پیدا ہوا کہ اگر ہندوستان کے مشہور مدبر سال میں ایک بار جمع ہو کر تمدنی حالات پر بحث مباحثہ کریں اور آپس میں دوستانہ تعلقات رکھیں تو ملک کے حق میں یہ بات بھی بہت مفید ہوگی، ان کی یہ تجویز بھی تھی کہ جس صوبہ میں ایسا جلسہ منعقد ہو وہاں کے گورنر سے درخواست صدارت کی جائے تاکہ سرکاری وغیر سرکاری مدبرین میں معاشرتی ارتباط پیدا ہو، مگر ان کا منشاء یہ نہ تھا کہ ان مباحث میں سیاسیات کو بھی شامل کیا جائے۔

لیکن جب یہ تجاویز لارڈ ڈفرن کے سامنے پیش ہوئیں تو اُنہوں نے اختلاف کیا اور اپنی رائے ظاہر کی کہ اس ملک میں کوئی جماعت ایسی نہیں جو انگلستان کی (اپوزیشن پارٹی) فریقِ مخالف کا کام کرتی ہو۔ اخبارات اگرچہ رعایا کے خیالات ظاہر کرتے ہیں تاہم وہ قابلِ اعتبار نہیں، چوں کہ انگریزوں کو علم نہیں ہوتا کہ ہندوستانی اُن کی اور اُن کی پالیسی کی نسبت کیا خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر ہندوستانی مدبّر سال میں ایک مرتبہ جمع ہو کر اس کے نقائص سے مطلع کریں اور ان کو دُور کرنے کی تدابیر پیش کریں تو یہ امر گورنمنٹ اور رعایا دونوں کے حق میں مفید ہوگا اور ایسے جلسے گورنر کی صدارت میں نہ ہوں ورنہ آزادی کے ساتھ اظہارِ خیالات میں تامل ہوگا۔

اس رائے سے مسٹر ہیوم نے اتفاق کیا اور اُنہوں نے کلکتہ و مدراس اور بمبئی کے مدبرین کے سامنے جب یہ رائے پیش کی تو سب متفق ہو گئے اور اس بِنا پر اس طرح عمل شروع ہو گیا، کہ یہ پارٹی نیشنل کانگریس کے نام سے قائم ہو گئی، لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم سے وعدہ لے لیا تھا کہ ان کا نام جب تک وہ ہندوستان میں ہیں ظاہر نہ کیا جائے چنانچہ انتہائی رازداری برتی گئی کانگریس نے پہلے ہی سال اس امر پر زور دیا کہ تمام ابتدائی تقررات بھی (بجز چپراسیوں وغیرہ کے) ——— مقابلہ سے کئے جائیں اور بقول سر سریندر ناتھ بنرجی کے کہ ہمارے

قومی لیڈروں کی کوششیں اس پر موقوف تھیں کہ حکومت کے ماتحت ذمہ داری اور اعتماد کے عہدے حاصل کئے جائیں۔ دوسرے سال کے اجلاس میں گورنر جنرل اور صوبہ کی کونسلوں میں انتخابی طریقہ کو جاری کرنے کی تجاویز پاس ہوئیں۔

اس کے بعد دو چار سال کے اندر انگلستان میں بھی ایک مجلس قائم ہوگئی اور اہم مقامات پر ماتحت مجالس کا قیام شروع ہوگیا، برطانوی تاجر، قانون پیشہ اور سیاست داں غرض کہ ہر وہ شخص جو کسی سرکاری عہدہ پر مقرر نہ تھا کانگرس میں شریک ہوتا گیا اور بتدریج مطالبات میں ترقی اور زبان میں تیزی پیدا ہوتی گئی حکومت ہند پر ہندوستانیوں سے زیادہ انگریزوں نے سخت نکتہ چینیاں کیں اور بہت جلد یہ سرگرمیاں اتنی زیادہ ہوگئیں کہ حکومت کو اپنی حمایت آہستہ آہستہ واپس لینی پڑی مگر باایں ہمہ انگریزی حکومت کی تعریف تخت و تاج برطانیہ کی وفاداری کا بھی مسلسل اظہار ہوتا رہا۔ مگر دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ کانگرس اس قسم کا لٹریچر شائع کرتی تھی جس سے حکومت کے خلاف جذبات برانگیختہ ہوتے تھے۔ دو تین سال میں ہی لارڈ ڈفرن جو دراصل کانگریس کے بانی تھے اپنی پبلک اسپیچ میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:۔

"کانگریس کے ممبر لاکھوں ناواقف اور زود اعتقاد لوگوں کے درمیان ان رسالوں کی تقسیم کے جوابدہ ہیں جو نہایت مشتبہ نیت کے ساتھ لکھے گئے تھے اور جس کا صریح مقصد سرکاری آفیسروں کے برخلاف لوگوں کی عداوت کا برانگیختہ کرنا تھا"

اسی طرح لارڈ موصوف نے اہل کلکتہ کے الوداعی ایڈریس کے جواب میں بنگالی اخبار نویسوں کی نسبت بھی کہا تھا کہ:۔

"گورنمنٹ کے برخلاف رعایا کے بھڑکانے کی کوشش مت کرو جیسا کہ تیس برس کا عرصہ ہوا اس قسم کی غلط بیانیاں اس بات کا زبردست سبب ہوئیں کہ اس ملک میں خون کی ندیاں بہنے لگیں"

چوں کہ اہل برطانیہ کو نیشنل کانگرس کا مفہوم سمجھانے کے لئے ضروری تھا کہ ہندوستان کے کل باشندے بحیثیت قوم کے اس کانگریس میں شریک ہوں اور اس کی آواز میں ایک مفروضہ متحدہ قومیت کی قوت پیدا ہو۔ اس لئے مسلمانوں کو بھی شریک کرنے کی ضرورت کا شدید

احساس پیدا ہوا اور کلکتہ و بمبئی میں جو معدودے چند مسلمان تعلیم یافتہ اور بیرسٹر ہو گئے تھے انکو اپنے دام میں پھانس لیا چنانچہ ۱۸۸۷ء کے تیسرے اجلاس کا صدر مسٹر بدرالدین طیب جی کو منتخب کیا، ورنہ اس وقت بھی زعمائے کانگریس کے ذہن میں ہندوستانیوں سے صرف ہندو قوم مراد تھی، جیسا کہ (سر) سریندرناتھ بنرجی نے جو کانگریس کے بانیوں میں سے ایک بانی اور ایک سرگرم لیڈر تھے۔ آکسفورڈ یونین کے ایک مباحثہ میں جو ہندوستان میں نمائندہ ادارات کے متعلق تھا کہا تھا کہ:۔

"مجھے یہ بتا دینے کی اجازت دیجئے کہ وہ ہندوستانی یعنی ہندوستان کے ہندو وہ قوم جس سے کہ میں خود ہوں قدیم اور زبردست نسل سے ہیں ایسے وقت جب کہ موجودہ یوروپین قوموں کے آبا و اجداد جنگلوں اور بیابانوں میں مارے مارے پھرتے تھے ہمارے آبا و اجداد نے بڑی بڑی عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں بڑے بڑے شہر تعمیر کئے، اور اخلاق کا ایک اصول وضع کیا اور مذہب کا سسٹم بنایا اور ایسی شریف زبان[1] بنائی جو کہ اب تک تمام مہذب دنیا کی نظروں میں قابل تعریف ہے . . . خود حکومتی ادارے آرین نسل کی تہذیب کا جزو لاینفک ہیں"

بعض بعض مسلمانوں کو کراہ یہ دیکر اور خوشامد و چاپلوسی سے اجلاس میں شریک کیا جاتا جس میں زیادہ تعداد ایسی ہوتی کہ وہ اجلاس کی کارروائیوں کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتے کیوں کہ قاعدہ کی رو سے تمام کارروائی انگریزی زبان میں لازم تھی۔ مسلمانوں کی اس مفروضہ شرکت اور ان سیاسی حالات سے جو اس صدی کے نویں عشرہ میں گذرے تھے اور جبکہ ۱۸۸۵ء میں ہی سرحد پر روسی خطرہ نمودار ہوا تھا اور مہدی سوڈانی کے واقعات مصر میں پیش آئے تھے جن کی وجہ سے مسلمانان ہند پھر ایک مرتبہ بدگمانیوں کی لہروں میں پھنس گئے۔ سرسید کو تردد پیدا ہو گیا کہ مبادا مسلمان جواب ذرا سنبھلنا چاہتے ہیں پھر کسی خطرہ میں نہ پڑ جائیں اور بنگالیوں کی لبرٹی (آزادی) ان کی بغاوت بن جائے۔

---

[1] سنسکرت سے مطلب ہے۔

علاوہ ازیں جو توجہ تعلیم کی طرف ہوئی ہے [۲۴] اس سے ہٹ کر سیاسی شور و شغب کی طرف مائل ہو جائیں اور ان کا تعلیم یافتہ گروہ جو ابھی تک اتنی قلیل تھا حکومت کی ان مراعات سے فائدہ نہ اٹھا سکے جو اب حاصل ہوئے ہیں تاہم دو تین سال تک اس خیال سے خاموش رہے کہ دونوں قوموں میں زیادہ اختلافات نہ ہو جائیں۔ مگر جب کانگریس کے مطالبات مسلمانوں کی پولیٹیکل حالت کے لحاظ سے مُضر ترین پائے گئے۔ مثلاً امتحانِ مقابلہ کا ہندوستان میں ہونا، غیر شعہد عہدوں کو امتحان سے مشروط کرنا۔ لیجسلیٹو کونسل میں طریقہ انتخاب وغیرہ وغیرہ اور نیز مسلمانوں کو جس طرح شریک کیا جا رہا تھا تو انہوں نے بلا خوفِ ملامت ارادہ کر لیا کہ مسلمانوں کو ان نتائج سے متنبہ کریں جو ان کے نزدیک کانگریس میں شرکت سے پیدا ہونے والے تھے انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل [۱] کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں جب کہ مدراس میں کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا ایک نہایت مفصل لکچر دیا [۲] جس میں کانگریس کے مطالبات اور اپنی قوم کے حالات پر زبردست بحث کی۔ اس لیکچر پر بنگالی اور ہندو پریس نے سخت ناراضی کا اظہار کیا اور مختلف قسم کے اعتراضات کا طومار باندھ دیا جن میں سرسید پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی دوستی کے خیالات ترک کرنے کا الزام بھی تھا۔ سرسید نے فوراً ہی فروری ۱۸۸۸ء میں ان اعتراضات کے جواب میں ایک بیان شائع کرایا جس میں ہندو مسلم اتحاد کے متعلق اپنی زبردست خواہش کا اظہار کر کے صفائی کے ساتھ کہا کہ :-

"مگر جب ہمارے ہندو بھائی یا ہمارے بنگالی دوست ایسی چال چلنا چاہتے ہیں جس میں ہمارا نقصان اور ہماری قوم کے لئے ذلت ہے تو بے شک پھر ہم آشنا نہیں رہتے۔"

بے شک ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی قوم کو ہندوؤں اور بنگالیوں کے اُن حملوں سے بچائیں جن سے ہکو یقین ہے کہ ہماری قوم کو نقصان پہونچنے والا ہے۔ . . . . .

---

[۱] یہ جمعیت سرسید کی تحریک سے ۱۸۸۶ء میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر غور کرنے اور عملی تدابیر کے لئے قائم ہوئی
[۲] یہ لکچر سرسید کے لیکچروں کے مجموعہ میں طبع ہو چکا ہے۔

بے شک ہماری قوم ذلت کے گڑھے میں گر پڑی ہے۔ لیکن اگر ہمارے دوست بنگالی یہ چاہیں کہ وہ اس از پا افتادہ قوم کو اپنی جوتیوں کے تلے مل ڈالیں تو ان کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ ہم اسکی برداشت کریں گے ان کو خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری مثال ایک ایسی رسی کی ہے جو بے شک جل گئی ہے مگر اس کا بل نہیں جلا وہ بدستور اس میں باقی ہے اور ابھی وہ بالکل ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی اس میں گرمی بھی باقی ہے سمجھ کر اسکو ہاتھ لگانا چاہیئے ایسا نہو کہ ہاتھ جل جائے۔ کانگریس درحقیقت بن ہتھیاروں کی ایک سول وار ہے، سول وار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کی حکومت کس کے ہاتھ میں رہے۔ نیشنل کانگریس کا بھی یہی مقصود ہے کہ انگلش گورنمنٹ برائے نام ہندوستان کی گورنمنٹ رہے مگر ملک کی اندرونی حکومت انکے ہاتھ میں آوے، وہ علانیہ اپنا خاص نام نہیں لیتے مگر خوب سمجھتے ہیں کہ مسلمان تو اس لائق نہیں ہیں پھر ملک کی اندرونی حکومت انہیں کے ہاتھ میں ہے۔"

ہم بھی سول وار کو پسند کرتے ہیں مگر بن ہتھیاروں کے سول وار کو نہیں بلکہ ہتھیاروالی سول وار کو۔ اگر گورنمنٹ اندرونی ملک کی حکومت اپنے ہاتھ سے منتقل کرنا پسند کرتی ہے تو ہم اس سے درخواست کریں گے کہ قبل اس کے وہ ایک قانون کا پیٹیشن (مقابلہ) کا پاس کرے اور جو قوم اس کا پیٹیشن کے امتحان میں پاس ہو اُس کے ہاتھ میں اندرونی ملک کی حکومت سپرد کردے مگر اس کا پیٹیشن میں دوسرے قسم کے قلم کے کام میں لانے کی اجازت دے جو ہمارے باپ داداکے لکھنے کا قلم تھا، اور جو حقیقت میں ملک کی حکومت کے لکھنے کا قلم ہے۔ پھر جو پاس ہو وہ ہی ملک کی حکومت کرے اگر ہمارے دوست بنگالی پاس ہوں تو بے شک انکی جوتیاں اٹھادیں گے اور اپنے سر پر رکھیں گے، مگر بغیر ایسی سول وار کے تو ہم اپنی قوم کو ان کی جوتیوں کے تلے روندوانا پسند نہ کریں گے۔"

ہمارے ہموطنی ہندو اور بنگالی بھائیوں کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ ہماری عین خواہش ہے کہ ہندوستان کی تمام قومیں آپس میں محبت اور دوستی سے ہندوستان میں رہیں مگر وہ دوستی اس وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک کہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی چال نہ چلے۔ بنگالیوں نے اور نیز ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ ہندوؤں نے یہی چال

اختیار کی ہے اور پھر اس پر توقع رکھتے ہیں کہ ہم مسلمان ان کے شریک ہوں۔ این خیال است و محال است و جنوں"

مارچ ۱۸۸۸ء میں میرٹھ کے ممتاز اصحاب نے سر سید کو مدعو کیا۔ اور ایک عظیم الشان جلسہ میں جو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ تھا سر سید نے پھر ایک طولانی لیکچر دیا۔ اس مہینہ کے دوران میں ہی مسٹر بدرالدین طیب جی کا ایک خط صدر کانگریس کی حیثیت سے پانیر میں شائع ہوا جس میں انہوں نے یہ بیان کر کے کہ میں نے اپنی صدارت میں اُن مسائل کو پیش نہیں ہونے دیا جو کسی صوبے سے مخصوص تھے یا جن پر تینوں[1] پریسیڈنسیوں کا عملی طور پر اتفاق نہ تھا یا جس میں ہندو مسلمانوں کے اور مسلمان ہندوؤں کے خلاف تھے لکھا تھا کہ:۔

"مجھکو اس بات کا خیال تھا کہ کانگریس صحیح طور پر نیشنل کانگریس نہیں کہی جا سکتی اگر اس میں کوئی ایسا رزولیوشن پاس ہو جس کے کل ہندو یا کل مسلمان ڈیلیگیٹ مخالف ہوں"

پھر انہوں نے شرکت کانگریس میں مسلمانوں کے تامل کرنے کی یہ وجہ کہ مد ممکن ہے کہ ہندوؤں کی کثرت کی وجہ سے ایسے رزولیوشن پاس ہوں جو مسلمانوں کے منشاء کے خلاف ہوں" ظاہر کر کے لکھا کہ میں نے یہ قاعدہ منظور کرا لیا ہے کہ وہ کسی مضمون پر جس کے مسلمان ڈیلیگیٹ (نمائندہ) عموماً یا قریب قریب عموماً مخالف ہوں گے کانگریس میں بحث نہ ہوگی" اس کے بعد مسلمانوں کو شرکت کے لئے پرزور طور پر مشورہ دیا۔ سر سید نے بھی اس کے متعلق فوراً ایک بیان شائع کرایا جس میں طیب جی کی کوشش سے قاعدہ مذکورہ کا شکریہ ادا کر کے لکھا کہ:۔

"میں اُن کے اس خیال سے بھی مگر کسیقدر ریمارک کرنے کے بعد متفق ہوں کہ کانگریس ٹھیک طور سے قومی کانگریس نہیں کہی جا سکتی اگر اس میں کوئی ایسا رزولیوشن پاس ہو جس کے کل ہندو یا کل مسلمان ڈیلیگیٹ مخالف ہوں" اول تو لفظ ڈیلیگیٹ پر مجھکو عذر ہے میں اپنے دوست کو یقین دلاتا ہوں کہ جسقدر مسلمان ہمارے صوبہ اور اودھ

---

[1] بنگال، بمبئی، مدراس۔

سے مدراس گئے، ان میں سے کسی ایک پر بھی لفظ ڈیلیگیٹ صادق نہیں آتا۔ مجھے اپنے صوبہ کا حال بذات خود معلوم ہے۔ جو مسلمان وہاں گئے ان کو دس مسلمانوں نے بھی مل کر منتخب نہیں کیا جس ضلع سے وہ گئے اُس ضلع کے رئیس اور ذی وقعت اور ذی رعب مسلمان بلکہ مڈل کلاس کے دس مسلمان بھی واقف نہیں ہیں کہ نیشنل کانگریس کیا ہے اور کس نے کس کو ڈیلیگیٹ بنایا۔ چار روز کا ذکر ہے کہ ایک ضلع کے مسلمان اور فیاض طبیعت شخص نے جو مسلمان ڈیلیگیٹ کے نام سے مدراس گیا تھا فخریہ طور پر بیان کیا کہ مجھے اس پر فخر ہے کہ مجھکو مسلمانوں نے نہیں بلکہ ہندوؤں نے ڈیلیگیٹ منتخب کیا ہے پس ایسی حالت میں لفظ ڈیلیگیٹ کا اُن مسلمانوں پر اطلاق کرنا کیسا بیجا اور ناواجب ہے۔

دوسرے میں اس بات سے مختلف ہوں کہ انہوں نے کانگریس کو قومی کانگریس نہ ہونا صرف اس حالت میں قرار دیا ہے جبکہ "اس میں کوئی ایسا ریزولیوشن پاس ہو جسکے ہندو یا مسلمان ڈیلیگیٹ مخالف ہیں" مگر کانگریس میں کسی ریزولیوشن کا بالاتفاق پاس ہونا کانگریس کو قومی کانگریس نہیں بناتا بلکہ کوئی کانگریس قومی کانگریس اُسوقت ہوتی ہے جبکہ اس قوم کے جنکی کہ وہ کانگریس ہے کل مقاصد اور اغراض بلا کسی استثناء کے متحد ہوں۔ میرے معزز دوست خود تسلیم کرتے ہیں کہ ہندو اور مسلمانوں کے کچھ اغراض و مقاصد مختلف بھی ہیں اور کچھ متحد بھی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ جو مختلف اغراض اور ایک دوسرے کے مخالف ہیں اُن کو چھوڑکر صرف اغراض متحدہ کانگریس میں پیش ہوں۔ مگر اُس حالت میں وہ کانگریس نیشنل کانگریس کیونکر ہو سکتی ہے اور پھر ہمارے دوست نے ہمکو یہ نہیں بتایا کہ جو مختلف اغراض ہندو مسلمانوں کے باقی رہ گئے، فریقین کو انکے حاصل کرنے کے لئے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہئیے۔ کیا ہمکو یہ کرنا چاہئیے کہ ہم مسلمان ایک اور جدا کانگریس اپنے ان مختلف اغراض کے پورا کرنے کے لئے قایم کریں اور جبکہ ان دونوں کے اغراض باہم متضاد اور متناقض ہوں تو وہ دونوں کانگریسین آپس میں خوب مقابلہ بلکہ مقاتلہ کرتی رہیں۔

خود ہمارے دوست کو انصاف کرنا چاہئے ۲۸ کہ ایسی قومیں جنکے اغراض و مقاصد ایک دوسرے کی ضد ہیں گو کہ کوئی جزوی امر متحدہ بھی ہو کوئی نیشنل کانگریس قائم کرسکتی ہیں۔ مگر میں پھر غور کرتا ہوں کہ اگر ان اصولوں پر جو میرے دوست نے اپنی اس چٹھی میں قرار دئے ہیں اور جنکو انہوں نے بروقت پریسیڈنٹ ہونے کے برتا تھا اور ان مسئلوں کو "جن میں مسلمان ہندوؤں کے برخلاف تھے یا ہندو مسلمانوں کے" کانگریس میں پیش ہونے نہیں دیا تھا اگر پورا پورا عمل کیا جاوے تو کانگریس میں باقی کیا رہ جاتا ہے؟

یہ امر واجب ہو یا نا واجب مگر ایک مسلمان موچی سے لیکر ایک مسلمان رئیس تک اس بات پر راضی نہ ہوگا کہ ہماری حالت ایسی ہو جاوے کہ ہم دوسری قوم کے جو ہمارے ساتھ رہتی ہے حلقہ غلامی میں آجائیں گو زمانہ نے ہمکو نہایت پست درجہ پر پہنچا دیا ہے اور غالباً روز بہ روز اور زیادہ پست درجہ پر پہنچاتا جاتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ ہمارے دوست بدرالدین طیب جی بھی کانگریس کے پریسیڈنٹ ہونے کو اپنی عزت سمجھتے ہیں اور ضرور ہم اپنی قسمت پر شاکر رہیں گے مگر خود ہم اس پر راضی نہیں ہو سکتے؟

میرے دوست بدرالدین طیب جی ان جزوی اور ناچیز مسئلوں کو چھوڑ کر جو ہندو اور مسلمان دونوں میں مشترک ہیں (کیونکہ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں کچھ نہ کچھ کوئی مشترک چیز نہیں ہو یہاں تک سوروں میں اور انسان میں بھی بہت سی چیزیں مشترک ہیں) ہمکو بتائیں کہ وہ کونسا پولیٹیکل اصولی مسئلہ ہے جو کانگریس میں پیش ہو سکتا ہے اور مسلمانوں کے برخلاف نہیں ہے؟

سب سے مقدم مسئلہ وائسرائے کی کونسل میں الیکشن کا ہے جس پر حال ہی میں مدراس کانگریس میں بھی ہمارے دوست بدرالدین طیب جی کی صدارت میں بہت زور دیا گیا ہے میں نے لکھنؤ کی تقریر میں ثابت کیا ہے کہ کوئی طریقہ بھی الیکشن کا اختیار کرو ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے چوگنی ہوگی۔ اور جو ان کی خواہش

ہوں گی وہ کامیاب ہوں گی اور کل ملک کی قانونی حکومت بنگالیوں کے ہاتھ میں یا ہندو بنگالی نما کے ہاتھ میں ہوگی اور مسلمان نہایت ذلّت کی حالت میں پڑ جاویں گے۔

بہت لوگوں نے لکھنؤ کی تقریر کے سبب مجھ پر لعنت ملامت کی مگر کسی نے اور نہ ہمارے دوست بدرالدین طیّب جی نے اسکا جواب دیا۔ بنگالیوں کے دعوے واجب ہوں یا ناواجب مگر ہم اپنی قوم کا اس ذلّت میں پڑنا پسند نہیں کرتے اور کم سے کم یہ کہ ہم ایسے امور میں جن کے سبب ہماری قوم ذلت میں پڑے شریک ہونا نہیں چاہتے"

قطع نظر اسکے کہ جس طرح پرنیشنل کانگریس کی کارروائی ہوتی ہے اور پولیٹیکل مباحثوں کے لئے جابجا مجلسیں کیجاتی ہیں اور عام لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ گورنمنٹ رعایا کے واجبی حقوق ادا نہیں کرتی اور اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نالایق اور جاہل آدمیوں کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت ظالم یا کم از کم نامنصف ہے ایسے مجمعوں میں مسلمانوں کا شریک ہونا ہماری قوم کے لئے نامناسب ہے اور ان کو نسبت ہندوؤں اور بنگالیوں کے زیادہ نقصان پہنچانے والا ہے غدر میں کیا ہوا ہندوؤں نے شروع کیا مسلمان دل چلے تھے وہ بیچ میں دوڑ پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمان اور مسلمانوں کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے، یہی نتیجہ مسلمانوں کے پولیٹیکل ایجی ٹیشن میں شریک ہونے سے حاصل ہوگا"

اس سلسلہ مباحث میں یہ لطیفہ بھی بہت دلچسپ ہے کہ الہ آباد کے مشہور کشمیری وکیل پنڈت اجودھیا ناتھ نے ایک مضمون میں لکھا کہ "چوں کہ مذہب اسلام کے پہلے چار خلفا موروثی قاعدہ کے علاوہ ایک دوسرے قاعدہ سے منتخب کئے گئے تھے اس لئے اس زمانہ میں ایک ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ موجود تھی اور اس لحاظ سے تمام مسلمان جو نیشنل کانگریس کی مخالفت کرتے ہیں یزید کے پیرو ہیں"

اسی طرح ایک بنگالی اخبار نے چند انعامی سوالات شائع کئے ان میں ایک سوال یہ تھا کہ:۔

"ہندوستان میں ہندوستانیوں کی ترقی کا سب سے بڑا دشمن کون ہے!"

دو ہزار جواب میں سات آدمیوں کے نام آئے[40] اور سر سید احمد خاں کو ملک میں سب سے عزیز ہندوستانی قرار دیا گیا۔

اسکے بعد بمقام علیگڑھ ہندو مسلمانوں کی ایک متحدہ جماعت موسوم بہ یونائیٹیڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے نام سے قائم ہوئی، جس کا مقصد کانگریس کی غلط بیانیوں کی تردید اور اس امر کا اظہار تھا کہ جملہ اقوام ہند اس میں شریک ہیں نیز یہ کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی جو انجمنیں ملک میں قائم ہیں ان کے خیالات سے پارلیمنٹ کے ممبروں اور انگلستان کے لوگوں کو اطلاع دی جایا کرے اور حکومت برطانیہ کے استحکام کی کوشش کی جائے، اس جمعیت میں اگرچہ ہندو مسلمان دونوں شریک تھے مگر ہندوؤں نے ایک جداگانہ جمعیت انڈین لائل ایسوسی ایشن کے نام سے لکھنؤ میں قائم کی۔

یونائیٹیڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے قیام سے بنگال کے کانگریسی اخبارات بہت برافروختہ ہوئے اور انھوں نے نہایت تند و تیز مضامین لکھے۔ یہ جمعیت ایک دو سال تو نہایت مستعدی سے کام کرتی رہی لیکن پھر اندرونی مخالفتوں سے جن میں تعصبات بھی شامل تھے پژمردہ ہو کر ختم ہو گئی۔

اگرچہ ہندو مسلمانوں میں ۱۸۶۳ء سے اردو ہندی کی کشمکش جاری تھی لیکن اس نے تصادم کی صورت اختیار نہ کی تھی اب ذبیحہ گاؤ کے انسداد کی تحریک خطرناک تصادم کا سبب بنی اس تحریک کے علم بردار وہی لوگ زیادہ تھے جو کانگریس کے لیڈر تھے وہ جا بجا جلسے کرتے مذہبی جذبات مشتعل کرتے رہتے۔ یہ جذبہ دراصل اس صدی کے آغاز میں ہی پیدا ہو چکا تھا چنانچہ اکتوبر ۱۸۰۹ء میں بنارس میں ایک شدید فساد ہوا۔ ہندو عوام نے مسجد پر حملہ کیا اور آس پاس کا جو مسلمان ملا اس کو قتل کر دیا۔ تمام شہر قتل و غارت کا منظر بن گیا اور جب تک پچاس مسجدیں برباد اور سیکڑوں انسان تہ تیغ نہ ہو گئے اس وقت تک فوج بھی امن قائم نہ کر سکی ہنگامہ غدر سے کچھ ہی پہلے دہلی میں بھی بقرعید کے موقع پر ایسا ہی ہنگامہ برپا ہوا۔ غرض اس صدی کے آخری چار عشروں میں جا بجا ایسے ہی ہولناک فساد ہوتے رہے جن میں اعظم گڑھ اور بمبئی کا فساد نہایت خوں ریز تھا۔

۱۸۹۲ء میں بمقام الہ آباد جہاں کانگریس کا اجلاس بھی ہونے والا تھا اور ان اطراف کے مسلمانوں کو بلطائف الحیل شرکت کی ترغیب دی جارہی تھی مسلمانوں نے بھی تحریک انسداد ذبیحہ گاؤ کے جواب میں ایک عظیم الشان جلسہ کیا اور ساتھ ہی شرکت کانگریس کے عدم جواز کا فتوے شائع ہوا۔ حامیان کانگریس نے بھی اس حربہ کا استعمال کیا۔ بعض علما کی خدمات حاصل کی گئیں جن میں لدھیانہ کے ایک عالم عبدالقادر نامی بہت نمایاں تھے حسن اتفاق یہ تھا کہ سرسید جو کانگریس کے مخالفین میں ممتاز تھے اپنے مذہبی اجتہادات وعقائد کی وجہ سے پہلے ہی سے فتاوائے کفر کا نشانہ تھے اب ایک استفتا بہ ایں مضمون مرتب ہوا کہ

"ایک جماعت قومی مسمےٰ نیشنل کانگریس ہندو اور مسلمان وغیرہ سکنائے ہند کی رفع تکالیف اور جلب منافع دنیاوی کے لئے چند سال سے قائم ہوئی ہے اور اس کا اصل اصول یہ ہے کہ بحث انھیں امور میں ہو جو کل جماعت ہائے ہند پر موثر ہوں اور ایسے امور سے گریز کیا جائے جو کسی ملت یا مذہب کو مُضر ہو تو ایسی جماعت میں شرکت کرنا درست ہے یا نہیں"

اس استفتا پر جابجا سے جوابات حاصل کئے گئے جن میں جواز ہی جواز تھا۔ مدینہ طیبہ اور بغداد کے علماء سے بھی ان جوابات کی توثیق وتصویب کرائی گئی اور ان کا ایک مجموعہ نصرۃ الابرار کے نام سے شائع ہوا۔

تشریح جواب میں سرسید کو بھی لپیٹا گیا کہ "نیچری کو اپنا مقتدا دینی یا دنیوی امور میں ٹھہرانا ہرگز درست نہیں" اسی پر اکتفا نہیں ہوا بلکہ یہ حکم بھی دیا گیا کہ "سرسید کی ایسوسی ایشن میں شرکت کرنا حرام اور کفر ہے۔ کیوں کہ ان کی ایسوسی ایشن میں بڑے بڑے متعصب ہندو مثل راجہ بنارس جو کمال دشمن اسلام کا ہے داخل ہیں"

لیکن کانگریس کے لئے یہ تائید کچھ موثر نہ ہوئی اور کانگریس والوں کو یہ کہنا پڑا کہ باوجودیکہ مسلمانوں کو کرایہ دئے گئے اور وہ آسانیاں بہم پہونچائی گئیں جو دوسرے ڈیلیگیٹوں کو نہیں دی جاتی تھیں لیکن مسلمانوں سے مدد نہیں ملی"

اب ذبیحہ گاؤ کے انسداد کی تحریک روز بروز بڑھتی رہی۔ جون ۱۸۹۳ء میں ضلع اعظم گڑھ

یں اگست میں محرم کے موقع پر بمبئی میں نہایت خوں ریز فسادات ہوئے تھے کہ بعد مسٹر تلک نے جو مرہٹوں پر نہایت اثر و رسوخ رکھتے تھے راسخ العقیدہ برہمن اور برہمنیت کے علم بردار اور مسلمانوں سے نفرت کرنے میں مشہور تھے پونا میں گنپتی کے طویل المدت میلے کی بنا ڈالی، ہر سال سیوا جی کے یوم ولادت اور تاجپوشی کی یادگار میں میلوں کا آغاز کیا اور اس کو قومی ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا۔ اخبارات میں اشتعال انگیز مضامین کا سلسلہ شروع ہوا اور مسٹر تلک نے اسی جذبہ سے انجمن مخالفین ذبیحہ گاؤ قائم کی اور منظم طور پر مسلمانوں اور برطانوی حکومت کے خلاف زبردست پروپاگنڈا شروع کیا جس کا مقصد محض ہندوؤں کے جنگ جویانہ جذبات کا ابھارنا اور ہندوستانی سیاسیات پر ان کو مسلط کرانا تھا، انہوں نے اپنی قوت کی بنیاد سیاسی اور مذہبی روایات پر رکھی۔ ذبیحہ گاؤ کی مخالفت ان کے پاس ایک زبردست ذریعہ تھا جو روز بروز ہندوؤں میں جوش کے ساتھ استعمال ہونے لگا چنانچہ بنارس میں بھی گئو رکھشنی سبھا قائم ہو گئی اور اس کے اہتمام سے ایک ایسا مرقع تیار کرایا گیا جو انتہائی اشتعال انگیز تھا یعنی ایک گائے ہے جس کے جسم میں بکثرت دیوتا بیٹھے ہوئے ہیں اور تھنوں کے قریب مختلف اقوام و مذاہب کے آدمی ہیں، ایک برہمن دودھ تقسیم کر رہا ہے، دو صورتیں گائے کے منہ کے سامنے ہیں۔ ایک کی تھوتنی خنزیر کی اور جسم ایک وحشی کا اور تلوار سے گائے پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ دوسری تصویر ایک برہمن کی ہے جو حملہ آور اور گائے کے درمیان حائل ہے دم اور پشت پر کچھ اشلوک سنسکرت میں لکھے ہوئے ہیں اور ایک رشی ہاتھ اٹھائے جپ رہا ہے گائے کے پاؤں کے نیچے قرآن مجید کی ایک آیت لکھی ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "خدا کے پاس کچھ قربانی اور خون نہیں پہونچتا بلکہ اس تک تمہارا تقویٰ پہونچتا ہے"

یہ مرقع خاص طور پر جرمنی میں تیار کرایا گیا تھا جس کی ملک میں بہ کثرت اشاعت ہوئی ادھر یہ حالات جاری تھے ادھر حکومت دستوری اصلاحات میں ترقی کی جانب مائل تھی چنانچہ اس نے ۱۸۹۲ء میں اور ایک قدم بڑھایا اور مرکز و صوبوں کی کونسلوں میں ایک معین تعداد سے ممبروں کے انتخاب کا اصول رائج کیا، نیز کانگریسی مطالبات میں

روز بروز مجارٹی (اکثریت) کے اصول قائم کئے جانے اور سرکاری ملازمت کے تمام صیغوں میں امتحان مقابلہ جاری کرنے کے مطالبے زور باندھتے جاتے تھے جن کا مُدعا حکومت میں کامل طور پر دفتری اقتدار کا حصول اور سروس میں مخصوص جماعتوں کی اجارہ داری کی استواری تھا۔

کانگریس کی قوت ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ سے تھی اور اسی کے ہاتھوں میں پریس تھا اور وہی ماتحت سول سروس پر قابض تھا اس طرح اس کو عوام الناس پر بھی قابو حاصل ہوگیا تھا ان میں ۱۸۵۷ء تا ۱۸۹۳ء اعلیٰ ڈگری یافتوں کی تعداد ۱۰۰۵۱ تھی جن میں ۲۵۲۷ قانون پیشہ تھے اور یہی کانگریس کے روح رواں تھے۔ بالمقابل مسلمانوں کی مجموعی تعداد (۶۴۵) تھی جس میں (۱۱۰) قانون پیشہ تھے؛

کانگریسی مطالبہ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اکثریت کی حکومت ہو، اور حکام و ملازم اپنی متعصبانہ ذہنیت سے ہمیشہ مسلمانوں کو کچلتے رہیں؛

اس وقت پراونشل سروس میں (۲۳۵) آسامیاں تھیں اور ۹۰ فیصدی ہندوستانی مامور تھے اگر تناسب ہی رکھا جاتا تو مسلمان پانچ فیصدی رہ جاتے اور چھوٹی آسامیاں جو تقریباً پچاس ہزار تھیں ان میں سے تو مسلمان بالکل ہی خارج ہوجاتے۔ ہندو حرص ملازمت کے لئے صرف یہ ایک مثال کافی ہوگی کہ اسی زمانہ میں ممالک مغربی و شمالی (یو پی) کے کالجوں سے ڈپٹی کلکٹری کی تین آسامیوں کے لئے طلبا کی نامزدگی طلب کی گئی۔ اتفاق محض تھا کہ نامزد طلبا میں مسلمانوں کا تناسب زیادہ ہوگیا بس اب تو بنگالی پریس نے ایک شور مچا دیا اور انگریزوں پر جو سب پرنسپل تھے الزام لگایا کہ "انہوں نے اس بے انصافی کے اصول کو کہ تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو برتا ہے" حالانکہ صوبہ بنگال میں ۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۲ء تک ایسی ہی آسامیاں جو مقابلہ کے امتحان سے دی گئیں ان کی تعداد چھیاسٹھ ۶۶ تھی اور ایک بھی مسلمان نہ تھا؛

"سر سید کی اگرچہ یہ رائے تھی کہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ ضرورت اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کی ہے اور پولیٹیکل بحثوں میں پڑنے سے اعلےٰ تعلیم کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا زیادہ مفید ہے مگر وہ اس سے غافل نہ تھے کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم ہونے کے خاص خاص حاجتیں رکھتے ہیں اور ان کی حاجتیں اکثر امور میں اس ملک

کی دیگر قوموں سے مختلف ہیں اور بعض حالات میں متناقض ہیں اور بوجہ کمی تعلیم اور ناواقفیت
انگریزی لٹریچر اور انگریزی اصول سیاست کے مسلمان اپنے حقوق اور مقاصد کی حفاظت
کی کم اہلیت رکھتے ہیں اور اس سئے ان کے پولیٹیکل حقوق اور قومی مقاصد کی حفاظت
کے لئے کوئی خاص طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے اسلئے انہوں نے اس سوال پر خود بہت
غور کیا اور ایسے شخصوں سے جو کسیقدر اس نازک مسئلہ پر رائے دینے کی قابلیت رکھتے
تھے مشورہ بھی کیا اور خاص خاص مجالس میں اس مسئلہ کو پیش کرکے اس پر بحث کرنے کا
موقع دیا اور بالآخر ۳۰ر دسمبر ۱۸۹۳ء کو اسی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک جلسہ کیا جس
میں اسی مسئلہ کی مختلف صورتوں پر غور کرنے کے بعد یہ تجویز قرار دی کہ مسلمانوں کے پولیٹیکل
حقوق کی حفاظت کے لئے ایک کمیٹی قائم کی جائے" (بیان نواب محسن الملک ۱۹۰۶ء)

چنانچہ ایم۔اے۔او ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی گئی اور اس کے مقاصد میں معقول طور سے اور
وفاداری کے ساتھ مسلمانوں کی بہبودی اور خیر خواہی میں کوشش کرنا اپنے حقوق کو حکومت میں پیش
کرنا عام ایجی ٹیشن کو روکنا داخل کیا گیا مگر آخری مقصد کے متعلق یہ شرط بھی تھی کہ پاپولر (عام پسند)
ایجی ٹیشن کی مخالفت نہ کی جائے جو ہندوستانی ضروریات پر معقولیت کے ساتھ ہو"

صرف نقصان رساں ایجی ٹیشن سے اختلاف تھا جو بنگالی اور مرہٹی اخباروں میں زور و شور
سے ہو رہا تھا جس میں نہ صرف حکومت کو ڈرایا جاتا تھا بلکہ مسلمانوں کے خلاف عام تعصبات
برانگیختہ کئے جاتے تھے خاص کر گئو رکھشنی سبھاؤں کی اہمیت پر زور دیا جاتا تھا"

مسلمانوں کو بڑا اختلاف امتحان مقابلہ سے تھا کیونکہ باعتبار تعلیم کے بجز بنگالیوں کے
کوئی بازی نہیں لیجا سکتا تھا اور دوسری انتظامی قابلیتیں نظر انداز ہو جاتیں خود وزارت ہند
کو بھی اختلاف تھا اور اس کے نزدیک اس مسئلہ انتخاب پر بھی ڈیفنس ایسوسی ایشن نے
توجہ کی کیونکہ اس کے ممبر سمجھتے تھے کہ کس طرح اقلیت اکثریت کی محکوم جماعت بن جاتی ہے
اور اختیار و غلبہ اسی کے دست قدرت میں ہوتا ہے اور وہ بغیر روک ٹوک کے ظلم کر سکتی
ہے، اس کی مثال امریکہ میں موجود تھی جہاں ریپبلکن اور ڈیموکریٹ دو جماعتیں تھیں اور
باوجود ہم قومی جب کسی ایک کی مجارٹی ہو جاتی تو وہ ہر ایک عہدہ کو بھی اپنے لئے ایک

غنیمت خیال کرتی پھر خود اپنے ملک کے لوکل سیلف اداروں میں اس انتخابی طریقوں سے جو تجربات حاصل ہوئے سامنے تھے۔ ہر جگہ جہاں یہ حق حاصل ہوا اکثریت نے ہی فائدہ اٹھایا مسلمان اپنی اقلیت اور اکثریت کے تعصبات کی وجہ سے محروم رہے۔

ان حالات میں ڈیفنس ایسوسی ایشن نے اس کے متعلق پورا غور کیا اور سید محمود اور مسٹر بیک نے ایسوسی ایشن کی درخواست پر مسئلہ انتخاب کے متعلق ایک یادداشت تیار کی جس میں انہوں نے بتایا کہ:۔

ریپریزنٹیشن (نمایندگی) کا اصلی منشاء یہ ہوتا ہے کہ منتخب شدہ شخص انتخاب کرنے والوں کو ریپریزنٹ کرے موجودہ حالت میں لیجسلیٹو کونسل کے لئے بھی منتخب کرنے والے کثرت سے ہندو ہیں۔ پس اگر ہندوؤں کو قانوناً مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ممبروں کو منتخب کریں تو وہ مسلمان ممبر جن کو ہندو منتخب کرتے وہ اپنے منتخب کرنے والوں ہی کی طرف سے ہوتے نہ کہ مسلمانوں کی طرف سے، نفس الامر میں یہ بات ہر طرح قرین قیاس ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کی طرف سے ٹھیک ٹھیک ریپریزنٹیشن نہ ہوگا کیونکہ مسلمانوں کی کثیر تعداد میں سے ہزاروں اشخاص ایسے ہونگے جو مختلف پولیٹیکل رائے رکھتے ہوں اور ہندو انتخاب کرنے والے اگر وہ کافی عقل رکھتے ہوں گے تو وہ انہیں مسلمانوں کو منتخب کرینگے جن کے خیالات اُن سے بالکل یا تقریباً ملتے جُلتے ہوں گے اور اس طرح مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ ان کے فرضی وکلاء جو درحقیقت ہندوؤں کی وجہ سے منتخب ہوئے تھے۔ ایک ایسی پالیسی کی تائید کررہے ہیں جس کو تمام مسلمان ناپسند کرتے ہیں اس بات کی مثال ہمکو سینکڑوں دفعہ نیشنل کانگریس کی سلسلہ جنبانی سے ملی ہے جسنے یہ عجیب ترکیب اختیار کی ہے کہ ایک مسلمان ممبر کو پریسیڈنٹ اجلاس بنایا جائے گو کہ اس موقعہ پر صرف وہ ہی ایک مسلمان ہال میں موجود ہو اور اسکی لیاقت اور مرتبہ خود مسلمانوں میں ایسا نہ سمجھا جاتا ہو کہ وہ اسے کسی ایسے اجلاس کا پریسیڈنٹ بناتے لیجسلیٹو کونسل کے انتخاب میں اگر ہندوؤں کو مسلمان ممبر منتخب کرینگے اور مسلمان اس بات کا خیال کرکے کہ ان کو کونسل میں ممبر ہونے کا افتخار حاصل ہو دھوکہ کھا جائیں گے اور ایسی پالیسی کو ترک کر دینگے جو انکی جماعت کیلئے

نہایت مفید ہے۔ انتخابی طریقہ کے ابتدائی اصول اس بات کو چاہتے ہیں کہ مسلمان ممبروں کے انتخاب کے لئے مسلمان ہوں اور ہندو ممبروں کے انتخاب کے واسطے ہندو۔ ورنہ مسلمانوں کا ایسا ہی انتخاب ہوگا جیسا کہ اسکاٹ لینڈ کے کیتھلک عیسائیوں کو پراٹسٹنٹ عیسائی منتخب کریں۔ اس کا انتظام نہایت آسانی سے یوں ہو سکتا ہے کہ ایسا قاعدہ بنایا جائے جس کی رُو سے کسی خاص انتخاب میں میونسپلٹیوں کی ایک خاص جماعت کے ہندو میونسپل کمشنر کسی ہندو ممبر کو منتخب کریں اور دوسرے انتخاب میں مسلمان میونسپل کمشنر کسی مسلمان ممبر کو یہی اصول امپریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبروں کے انتخاب میں اختیار کرنا چاہیے۔"

مسلمان پولیٹیکل لحاظ سے ایسی جماعت ہیں جنکے تاریخی حالات جنکے اغراض جنکی ملکی مصلحتیں اور مذہب بالکل جدا ہیں۔ یہ بات ظاہر اور روشن ہے اور کوئی منصف مزاج آدمی اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ آئرلینڈ کی رومن کیتھلک اور پراٹسٹنٹ عیسائیوں میں اسقدر اختلاف نہیں جسقدر کہ مسلمان اور ہندوؤں میں ہے۔ اس بات کی کچھ حاجت نہیں کہ ہم اُن کے تاریخی واقعات کا حوالہ دیں۔ ان کے اغراض کی نسبت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے صرف ایک کو مدنظر رکھنا چاہیے یعنی انکو ملازمت میں ایک بڑا حصہ ملنا چاہیے۔ یہ ایسا معاملہ ہے جس کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں بہت بڑی خواہش رکھتے ہیں کہ انکو جس قدر زیادہ ممکن ہو ملازمت میں حصہ ملے۔"

انگلستان کے لبرل اور کنسرویٹو فریقوں کا اختلاف بمقابلہ ہندوستان کے مسلمان اور ہندوؤں کے اختلاف اغراض کے ہیچ ہے ....

اسی زمانہ میں سرسید نے مسلمانوں کے مسئلہ اقلیت سلطنت جمہوری کے لوازم اور ہندوستان کی حالت پر اپنے ایک بیان میں تفصیل کے ساتھ بحث کی اور آخر میں اُنہوں نے کہا کہ۔

"اس سے بہت پہلے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا خیال بھی پیدا ہو میں نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا کہ آیا ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ ہندوستان کے مناسب حال ہے اور جان اسٹوارٹ مل کی آرا متعلق ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کے (جو آرا غالباً نہایت عمدہ توضیح سے بیان کی گئی ہیں) پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ چونکہ اول لازمی امر ایسے طریقہ حکومت کے لئے جس کا انتظام

صرف کثیر رائے پر چلتا ہو یہ ہے کہ وہ طرز (رائے دینے والوں) میں ہم جنسیت ہو۔ بلحاظ قوم کے اور مذہب کے اور عادات و معاشرت کے اور رسومات کے اور تمدنی حالات کے اور بلحاظ تاریخی ملکی روایات کے، یعنی ریپرزینٹیٹو طریقہ سے رائے دینے میں یہ مسلم امر ہے کہ رائے دینے والوں اور ملک کی آبادی میں ہم جنسیت یا مشابہت کا خیال نہ کیا جائے تو ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے کہ جہاں کہیں کسی امر بالا میں ہم جنسیت نہیں سوائے ملک کے امن اور بہبودی کو نقصان پہونچنے کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا، اور میں دل سے امید کرتا ہوں کہ خواہ کنسرویٹیو یا لبرل یا یونینسٹ یا سپریٹسٹ بلحاظ آئرلینڈ کے یا زیادہ سے زیادہ ریڈیکل کو بھی جب پارلیمنٹ میں قوت حاصل ہو تو وہ اس امر کو نہ بھلادیں گے کہ:۔

ہندوستان براعظم ہے اور مثل انگلستان یا اسکاٹ لینڈ یا ویلز یا آئرلینڈ کے ایک چھوٹا سا ملک نہیں ہے اور اس میں وسیع مختلف آبادیاں ہیں جن کی تمدنی اور اخلاقی اور سوشیل اور پولیٹیکل اور مذہبی اور طبعی اور تاریخی حالات بہت مختلف ہیں اور جن میں اسلامی سلطنت کے زوال کے بعد سے کبھی اتفاق نہیں ہوا اور بجائے اس کے کوئی اور طریقہ حکومت اسلامی طریقے کے بدلے قائم کرتے ہمیشہ آپس میں لڑتے رہے اور لوٹ مار اور خوں ریزی اور طوائف الملوکی کو قائم رکھا۔

سلطنت جمہوری کی کامیابی کے لئے سب سے پہلی اور ضروری شرط یہ ہے کہ اس آبادی میں ہم جنسیت ہو اور جتنے وہ زیادہ تر مشابہ ہوں اتنا ہی بہتر ہے کیوں کہ جمہوری حکومت میں ضروری اور خیال کر لیا جاتا ہے کہ افراد ایسے ہی مشابہ ہیں جیسے مٹر کے دانے..................

لیکن بایں ہمہ انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد مبنی ہیں تاریخی واقعات زمانہ گذشتہ و حال کے بھلا دینے پر اور ہندوستان کی مختلف اقوام کا لحاظ نہ کرنے پر اور یہ فرض کر لینے پر کہ مسلمان اور مرہٹہ، برہمن اور چھتری، بنیا اور شودر، سکھ اور بنگالی، مدراسی اور پشاوری سب سے ایک قوم کی طرح برتاؤ کیا جا سکتا ہے اور سب ایک ہی قوم سے ہیں اور ان کا

مذہب اِن کی زبان، اِن کی عادات اور مراسم اور ملکی اور تاریخی روایات بالکل ایک ہیں اور ان سے اس طرح بحیثیت مجموعی برتاؤ کیا جا سکتا ہے گویا وہ انسانوں کے ایک گلہ میں؛ میں اس خیال کو وہم سے کم نہیں سمجھتا کہ جمہوری طریقہ کل اقوام اور مذاہب اور ممالک اور ازمنہ کے لئے یکساں موزوں ہے میری رائے میں یہ طریقہ عقلاً بھی نامکمل ہے کیونکہ یہہ ضروری بات ہے کہ ایسے طریقہ میں کثرت رائے سے انتظام ہو اور اس لئے یہ مان لیا جاتا ہے کہ انسان کی مجارٹی اس قابل نہیں کہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ نا رضامند مینارٹی پر بھی کیوں کر حکومت کی جائے!

کل دُنیا کے ممالک سے ہندوستان جہاں مختلف الجنس اقوام ہیں ایسا ملک ہے جو سب سے کم جمہوری طریقہ کے لئے موزوں ہے۔ اس تجربہ کو جو انڈین نیشنل کانگریس کی کوشش کرنا چاہتی ہے ایک ایسا تجربہ سمجھتا ہوں جو خطرناک اور مصائب سے بھرا ہوا ہے۔ کل اقوام ہند کے لئے اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے کیوں کہ اگرچہ مسلمان مینارٹی میں ہیں لیکن سب سے بڑی مینارٹی ہیں اور کم سے کم روایتہً اس بات کے عادی ہیں کہ جب مجارٹی ظلم کرے تو تلوار ہاتھ میں لیں جو طریقہ کہ ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں سے بھی زیادہ تر ہے"

مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسید کی وفات سے مسلمانان ہند کی سیاست وطنی کا پہلا باب ختم ہو گیا ان کی وہ سیاسی پالیسی جس کی چالیس سال تک مسلمانوں نے پیروی کی دراصل اس پر آشوب زمانہ میں نہایت کامیاب ثابت ہوئی مولانا محمد علی مرحوم نے اپنے خطبہ صدارت کانگریس منعقدہ ۱۹۲۳ء میں اس پالیسی کے متعلق کہا تھا کہ:-

"اگرچہ سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد سید احمد خاں کی پبلک زندگی اپنی قوم کی ترقی کے مساعی میں صرف ہوئی تاہم وہ ویسے ہی اچھے ہندوستانی رہے جیسے مسلمان تھے انکی بہت سی تقریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بڑے سرگرم محبّ وطن تھے اور اُن کا سینہ اتحاد ہند کے جذبہ محبّت سے لبریز تھا جو لوگ اُن سے ذاتی طور پر واقف ہیں وہ اسکی تصدیق کر سکتے ہیں کہ اکثر ہندوؤں سے ان کی گہری دوستی تھی جو اس تعصب کی موجودگی میں قطعی ناممکن تھی جسکا بعض وقت

ان پر الزام لگایا جاتا۔

یہ الزام بھی کسی طرح صحیح نہیں کہ وہ ہر زمانے کے لئے مسلمانوں کے سیاسیات میں حصّہ لینے کے خلاف تھے اپنی ان دو تقریروں میں جن کا میں نے ذکر کیا انہوں نے جو دلائل بھی پیش کئے ہوں ان سے قطع نظر کرکے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے وہ صرف دو ہی دلیلیں پیش کرتے تھے۔ جن کی بنا پر خود سید احمد خاں کو بھی یقین تھا کہ اُس وقت مسلمانوں کی شرکت کانگریس قطعی نامناسب تھی۔ وہ اس امر کا اچھی طرح اندازہ کرتے تھے کہ انکے زمانے کے مسلمانوں کی طبیعت و مزاج کو اس سے زیادہ کوئی شغل و فعل نہ تھا کہ وہ اپنے برطانوی غاصبین حکومت پر سخت سے سخت نکتہ چینی کریں اور وہ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ یہ فعل جیسا آسان تھا ویسا ہی آخرکار کانگریس جیسی امن پسند سیاسی تحریک کی بقاو ترقی کے لئے بہت ہی خطرناک ثابت ہوگا۔ یہ پہلی دلیل تھی جس نے سید احمد خاں کو مجبور کیا کہ اپنی قوم کو سیاسیات میں خاص خاص حدود سے آگے نہ بڑھنے دیں۔

دوسری دلیل بھی کچھ کم مضبوط نہ تھی ان کی رائے یہ تھی کہ مسلمان اگر اپنی ترقی چاہتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے اشاعت تعلیم میں کوشش کرنی چاہیئے اور مغربی تعلیم کے حصول کے لئے مسلمانوں کو راضی کرلینا آسان نہ تھا خواہ اپنی اس درسگاہ میں ہی کیوں نہو جس میں بہ خلاف سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے مذہبی تعلیم بھی دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دیجاتی ہے۔

مسلمانوں کے لئے یہ آسان تر تھا کہ غاصب نفرت حکومت کافرہ کی تخریبی نکتہ چینی کے مزے لیتے رہیں بہ مقابلہ اس کے کہ ماہرین کے خشک و بے مزہ تعمیری پروگرام سے دلچسپی لیں لہٰذا سید احمد خاں نے اپنی تمام تر توجہ اس پر صرف کردی کہ مسلمانوں کے مساعی کو سیاسی راستے کی طرف رُخ کرنے سے روکیں جو زیادہ دلکش لیکن ساتھ ہی اسکے کم سوُدمند تھا۔

پچھلی نسل کے اعمال و افعال پر نظر ڈالتے ہوئے آج جبکہ وقوع واقعہ کے بعد عقلمند

جتنا زیادہ آسان ہے سید احمد خاں کا یہ طرز عمل میری رائے میں نہایت دانشمندی پر مبنی تھا۔ اور اگرچہ میرا جی چاہتا ہے کہ بعض باتیں جو اُنکی زبان سے نکل گئیں۔ کاش کہ وہ نہ کہتے۔ تاہم میں اس اعتراف پر مجبور ہوں کہ مسلمانوں کا' بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کا کوئی خیر طلب/ مسلمانان ہند کی رہنمائی کے لئے بغیر اسکے اور کوئی راہ اختیار کر ہی نہیں سکتا تھا لہذا یہ بھی پیش نظر رہے کہ جس شخص نے مسلمانوں کا مفاد اسی میں سمجھا کہ وہ نظر بحالات موجودہ کانگریس سے علیحدہ رہیں۔ وہ شخص مسلمانوں کے حصہ غالب کا محبوب نہ تھا۔"

سید احمد خاں چونکہ تعلیمات قرآنی کی تفسیر عقل انسانی کے مطابق کرنے اور اُن عام پسند وہمیات کے شدت سے مخالف تھے جو راسخ العقیدہ مسلمانوں میں مسلمات مذہبی سمجھی جاتی تھیں۔ اور نیز اُن رسوم اور روایات کے بیخ کنی میں معروف رہے جو "ٹھیٹ اسلام" کی نظر میں تو مستند نہ تھیں۔ مگر جنہیں مرور ایام نے مذہبی شان دے رکھی تھی۔ اسلئے اُنہیں ملحد و کافر قرار دیا گیا۔ لکھوکھا مسلمان انہیں سخت سست کہتے بلکہ سب و شتم کرتے اور مدت دراز تک اس کالج کو جو اُنہوں نے علیگڑھ میں قائم کیا تھا۔ ہوّا سمجھتے رہے۔ لیکن حیرت کی کوئی انتہا نہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود الزام کفر والحاد اور باوجود شدت سب و شتم سیاسی پالیسی میں ساری قوم کی قوم نے بے چون وچرا اسی شخص کی پیروی کی ظاہر ہے کہ کسی منطقی مغالطہ یا سیاسی سبز باغ میں اتنی قوت نہیں ہوسکتی اور میرا یقین ہے کہ سید احمد خاں کو محض اس وجہ سے کامیابی ہوئی کہ انکی سیاسی رائے صائب تھی۔"

سر سید کے مخالفین نے ان پر اکثر و بیشتر فرقہ پروری بزدلی مرعوبیت حکومت کی خوشامد اور رجعت پسندی کا الزام لگایا ہے۔ مگر حقائق و شواہد سے قطع نظر کرکے صرف قیاس آرائی اور تاویل سے کام لیا ہے۔

مولانا محمد علی نے ۵ جنوری ۱۹۲۸ء کے ہمدرد میں سر سید کے دور پر ایک زبردست افتتاحیہ لکھا تھا جس کا حسب ذیل فقرہ ان کے کردار پر اور زیادہ روشنی ڈالتا ہے:۔

"جب ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا آغاز ہوا تو اُن کو فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ مسلمانوں کو کیا مشورہ

دیں۔ یہ سراسر غلط ہے کہ انھوں نے کبھی بھی آزادی ہندوستان کی یا ہندو جاتی کی مخالفت کی۔ لیکن وہ ایسے بھی کبھی جائز نہیں سمجھتے تھے کہ ہندو جاتی سے اپنے لئے آزاد خیالی، بے تعصبی اور فراخ دلی کا سرٹیفکٹ ملت اسلامیہ کے مفاد کو نظرانداز کرکے حاصل کریں جیسا کہ چند کانگریسی مسلمانوں نے کانگریس کی ابتدا میں کیا تھا اور ایک دو آج بھی کر رہے ہیں۔ ان کی سیاست اور ان کے کیریکٹر دونوں کے جانچنے اور پرکھنے کے لئے بہترین کسوٹی وہ فتنہ ہے جو "غدر" کے بعد برپا ہوا۔"

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ کانگریس کے ارباب اقتدار نے اپنے انگریز آقاؤں سے ہی سیاست کا سبق حاصل کیا انہیں کی رہنمائی میں ملکی مطالبات کی ترتیب کی گئی اور سب سے زیادہ کانگریس کے صدر نشینوں نے وفاداری کا راگ گایا مثلاً ڈبلیو سی بینرجی جو کانگریس کے بانیوں میں سے ایک نہایت پرجوش بانی اور عرصہ تک اس کے رہنما رہے اپنے صدارتی ایڈریسوں میں کہتے ہیں کہ:۔

"جو کچھ ہم کو نصیحت ملی ہے وہ برٹش گورنمنٹ کی بدولت ملی ہے ہم کو مردانہ وار برسر عام کہنا چاہیے کہ ہم راج بھگت ہیں اور حکومت کے وفادار ہیں۔ ہماری رگ رگ میں راج بھگتی بھری ہوئی ہے۔ ہم انگریزی سلطنت کے فائدوں کو سمجھتے ہیں اور ہم اس علم کی تعریف کرتے ہیں جس کی بدولت ہم اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آگئے ہیں۔ یہ علم ہمیں اس وقت ملا ہے جب کہ ایشیا کے راجہ ہمارے دیس میں اپنی [illegible] کر رہے تھے۔" (۱۸۸۶ء)

پھر کہتے ہیں کہ:۔

"برٹش راج نے ہم کو تجارت کرنا سکھا دیا اور ہم ہندوستانیوں کو اس قابل بنا دیا کہ ہم دور دراز کے سفر کر سکیں اور اسی سلطنت نے ہم کو زراعت کے نئے طریقے سکھائے۔" (۱۸۹۲ء)

تاریخ ہندوستان میں ایسی کانگریس کا انعقاد ایک نہایت اہم واقعہ ہے، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم ہندو راج کے درخشاں زمانہ میں اور وکرم جیسے بڑے راجہ

کے دور میں کبھی ایسی مجلس کا خیال بھی کر سکتے تھے، کیا یہ ممکن تھا کہ تمام صوبوں کے صرف ہندو
ہی ایک قوم کی طرح ہم آواز ہو کر بولیں۔ پھر ہم کو اپنے دوستوں کے عہد حکومت کو دیکھنا چاہئے
یعنی مسلمانوں کے دور کو جنہوں نے بہ یک وقت اتنے بڑے رقبہ پر حکومت کی جس پر کبھی کوئی
ہندو راجہ بھی نہ کر سکا تھا، کیا یہ اکبر کے زمانہ تک ممکن تھا کہ اس طرح تمام قومیں اور فرقے
یک جا مجتمع ہوں جو ایک زبان بولتے ہوں اور جن کی تمناؤں میں ایک قسم کی یکسانی اور
بلندی ہو۔

آخر وہ بات کیا ہے جس کے لئے ہم اس موقع پر جمع ہوئے ہیں ہم یہاں اُن مسئلوں پر
غور کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جن پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے خواہ شاندار ہو یا غیر شاندار۔
یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم ایسی حکومت کے زیر اقتدار ہیں جس میں ہمارا ایسا اجتماع ممکن
ہے۔ یہ ملکہ معظمہ اور برطانی لوگوں کی تہذیب پرور حکومت کے ماتحت ہی ممکن ہے کہ ہم بے
روک ٹوک اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کریں یہ بات صرف برطانوی راج کے ہی اندر
ممکن ہے...... ہم کو مردوں کی طرح اعلان کرنا چاہئے کہ ہم پورے طور پر وفادار ہیں (۱۸۸۶ء)
کانگریس کی بنیاد برٹش راج کے ساتھ وفاداری کے لئے ڈالی گئی ہے جس سے ہمارا ملک
خوش حال ہے۔ کانگریس نے کبھی یہ اجازت نہیں دی کہ ذرا بھی شبہ پیدا ہو کہ برطانوی
راج الٹ دیا جائے (۱۹۰۹ء)

"تمام سوچنے سمجھنے والے برطانوی راج کو اللہ کی جانب سے سمجھتے ہیں" (۱۹۱۱ء)

"عجب سے کہ ہندوستان کا برطانوی تاج سے بلا واسطہ تعلق ہوا ہے ہم ہمیشہ بادشاہ کے
وفادار رہے اور ہماری وفاداری غیر متزلزل ہے" (۱۹۱۱ء)

اسی طرح اور بہ کثرت اعتراف برکات و اظہارات وفاداری ہیں، علاوہ اس کے جب
کانگریس عروج پر پہونچی اور عدم تعاون بڑی بہادری کا کام اور کانگریس کا طرہ امتیاز تھا جب
اس کے سلسلہ میں معمولی تشدد کی نوبت آئی جو اس تحریک کا قدرتی نتیجہ تھا اور چورا چوری
ضلع گورکھپور میں صرف ایک تھانہ میں دیہاتیوں کی آتش زنی اور چھ سات پولس کانسٹبلوں
کے جلائے جانے سے گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک کا ہی خاتمہ کر دیا جس کے

متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کہتے ہیں کہ:۔

"اس میں شک نہیں کہ اگر یہ تحریک جاری رہتی تو بہت جگہ تشدد کے انفرادی واقعات ظہور میں آتے حکومت انہیں خونخوار طریقہ سے کچلتی اور خوف و دہشت کا دور دورہ ہوتا جس سے لوگوں کی ہمتیں پست ہوجاتیں اور دوبارہ اُبھرنے کی طاقت بھی نہ رہتی"

دوسری جگہ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں کہ:۔

"میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے ذرا بھی زیادتی ہوئی تو نہایت ہی ہولناک مصیبت پیش آئے گی اور ہم میں سے ہزاروں آدمی گولیوں سے ہلاک کردیئے جائیں گے"

سنہ ۱۹۳۱ء میں سول نافرمانی کے التوا پر تحریر کرتے ہیں۔ کہ

"سول نافرمانی کی تحریک کم سے کم اس وقت ختم ہوچکی تھی اور اُسے پھر سے اُٹھانا خود ورکنگ کمیٹی کے بس کی بات نہ تھی اس لیے کہ حکومت یہ اعلان کرسکتی تھی کہ مسٹر گاندھی تصفیہ پر راضی ہوگئے ہیں۔ مجھے اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں کو اس میں مطلق عذر نہ تھا کہ سول نافرمانی ملتوی کردیجائے اور حکومت سے کوئی عارضی تصفیہ کرلیا جائے ہمارے لئے یہ سہل بات نہ تھی کہ اپنے رفیقوں کو دوبارہ جیل بھیجدیں یا ان ہزاروں آدمیوں کی رہائی میں مانع ہوں جو اب تک قید میں تھے۔ جیل کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ہم آرام سے رات دن گذار سکیں"

سوال یہ ہے کہ ان افکار و خیالات کو بزدلی و مرعوبیت کہا جائیگا یا مصلحت بینی و دوربینی کیا سید احمد خاں کے لئے سہل تھا کہ کانگریس کی ابتدائی اشتعال انگیز تحریک میں مسلمانوں کو شامل کرکے گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا اور جیل کی آبادی اُن سے بسائی جاتی جبکہ حکومت ہر ہر قدم پر سخت نگراں تھی اور کم از کم سنہ ۱۸۵۷ء کا زمانہ تو فوراً ہی واپس آجاتا۔

اسی زمانہ میں جس طرح موپلا کی بہادر قوم کچلی گئی، اس کی مثال کانگریس کی پوری

تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

آزادی کامل کے ادعا کے ساتھ ۱۹۳۵ء میں جدید گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے مطابق وزارتی عہدوں کی قبولیت اور وفاداری کے ساتھ حکومت کی مشنری کو چلانا بھی بصیرت و عبرت کی داستان ہے۔

علاوہ بریں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نے جمہوریت ہند کا جو دھندلا سا خاکہ کھینچا ہے اور جو کچھ ابتدائی حق برائے نام حاصل ہو گیا تو ہندوستان میں اقلیت کے لئے جو خطرات کہ سر سید کے پیش نظر تھے آج ان سے بہت زیادہ اور خوفناک طور پر نمودار ہوئے۔ کانگریسی صوبے بے چینی بدامنی اور خوں ریز فسادات کا جہنم بن گئے۔ پس ان تمام حقیقتوں کو دیکھتے ہوئے سر سید کی سیاسی پالیسی کی عظمت و راستی میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔

ہندوؤں میں اُردو کی جگہ ترویج ہندی کا جو جذبہ ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوا تھا وہ روز بروز ترقی پذیر رہا صدہا انجمنیں اور سبھائیں اسی مقصد کے لئے قائم ہوگئیں۔ چنانچہ بنگال کے حصہ بہار میں چند حکام کی سرپرستی سے وہ کامیاب ہوگئیں صوبہ متحدہ میں بھی یہ مہم بڑی شدت سے جاری تھی یہاں بھی متعدد مرتبہ ناکامیوں کے بعد کامیابی ہوئی۔

سر انٹونی میکڈانلڈ کی گورنمنٹ نے ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو ایک ایسا رزولیوشن صادر کیا جس کا بظاہر مفاد تو سرکاری دفاتر میں ترویج ہندی تھا لیکن درحقیقت مسلمانوں کی تعلیم وسیع و ترقی پذیر ادب عدالتی و تجارتی اور تمدنی کاروبار اور ہندو مسلم اتحاد سب ہی پر اس کا مضر اثر تھا۔

اس رزولیوشن سے نہ صرف صوبہ متحدہ میں بے چینی پھیلی بلکہ دوسرے صوبوں کے مسلمان بھی متاثر ہوئے۔ غیر متعصب ہندو اور بالخصوص وہ بنگالی جو اس صوبہ میں عرصہ سے مقیم تھے اس رزولیوشن کے خلاف تھے ۱۳ مئی کو علیگڑھ میں اور پھر اگست میں بمقام لکھنؤ عظیم الشان احتجاجی جلسے منعقد ہوئے۔

حکمراں صوبہ کے مزاج کا پارہ انتہائی ڈگری پر پہونچ گیا۔ پبلک اور پرائیوٹ طور پر اظہار ناراضی ہوا۔ بعض بزدل رئیس خوفزدہ اور لرزہ براندام ہوگئے مگر دو سال بعد سر جیمس لاٹوش نے جو سر انٹونی کے جانشین ہوئے رزولیوشن کی وضاحت میں حامیان اُردو کی کچھ اشک شوئی کر دی۔

۱۹۰۹ء کی اصلاحات کے نتیجہ سے ہی مسلمان بہت متاثر اور اپنے سیاسی و تمدنی حقوق کی محافظت کے لئے متردد تھے اور اس قضیہ نے ان میں اپنی سیاسی تنظیم کا زبردست احساس پیدا کیا۔ اخبارات میں بہ کثرت مضامین شائع ہوئے اور ہر صحبت میں یہی خیال موضوع

بحث ہو گیا؛

نواب محسن الملک نے جو آپ سرسید کے جانشین اور اردو ہندی اتحاد کے بانی تھے اور نواب وقار الملک دونوں نے اس صورت حال پر سنجیدگی سے غور کیا اور بالآخر بہت سے مشوروں کے بعد ایک سیاسی جمعیت کی تاسیس پر اتفاق کیا گیا اور اس کی تکمیل کی ذمہ داری نواب وقار الملک کے شانوں پر عائد کی گئی۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں بمقام لکھنؤ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک جلسہ منعقد ہوا اور اس میں وقار الملک نے واضح طور پر بتایا کہ۔

تمام ہندوستان میں مسلمانوں کا درجہ روز بروز کس طرح تنزل کرتا جارہا ہے اور کس طرح ان کے پولیٹیکل حقوق پر حملے ہوتے ہیں۔ سرکاری عہدوں کی تعداد میں کیونکر کمی ہو رہی ہے اور وہ کیوں مرکزی اور صوبجاتی کونسلوں میں اپنے ممبروں کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اپنی طویل تقریر میں موجودہ سیاسی حیثیت پر پوری روشنی ڈالی اور آخر میں اپنے تحفظ حقوق و مطالبات کے لئے ایک سیاسی جمعیت کو قائم کرنے کی اسکیم پیش کی جو بحث و ترمیم کے بعد منظور کی گئی اور یہ جمعیت پولیٹیکل ارگنائزیشن کے نام سے وجود پذیر ہوئی؛

اس کے بعد وقار الملک نے اسکیم کو کامیاب بنانے اور رائے عامہ پیدا کرنے کے لئے مختلف مقامات کے دورے کئے اور ہر جگہ جلسے منعقد کرائے۔ اگرچہ یہ تحریک نہایت معتدل اور وفادارانہ بنیاد پر تھی۔ مگر حکومت کی نظروں میں شک و شبہ سے بھری ہوئی تھی۔ پھر اردو ہندی کے تصفیہ میں یہ تجربہ بھی ہو چکا تھا کہ کس طرح انتشار پیدا کیا گیا اس لئے ہر قدم نہایت احتیاط سے اٹھایا گیا تاکہ کہیں آغاز کار میں ہی رکاوٹیں نہ ڈالی جائیں؛

ان واقعات کے سلسلہ میں تقسیم بنگال ہی ایک نہایت اہم کڑی بنگئی۔ صوبجات بنگال اور بہار و اڑیسہ جس کی آبادی سات کروڑ آٹھ لاکھ تھی ایک لفٹنٹ گورنر کے ماتحت تھے۔ لارڈ کرزن اور ان کے مشیروں نے محسوس کیا کہ اُس وقت کی نسبت جب یہ انتظامات کئے گئے تھے۔ اب حالات بہت کچھ تبدیل ہو چکے ہیں اسلئے اب جدید نظام و تقسیم کی ناگزیر ضرورت ہے مگر کلکتہ کے سیاسی لیڈر سخت مخالف تھے جب گورنمنٹ نے اس

ضرورت پر بہت زور دیا تو ہندو مدبروں اور اخبارات نے دور و نزدیک یہ مشتہر کرنا شروع کر دیا کہ اس تقسیم سے بنگالیوں کے مفاد کو نقصان پہنچے گا اور ان کی قومیت کا شیرازہ بکھر جائے گا اس پر لارڈ کرزن نے اضلاع مشرقی کا معائنہ کرنا ضروری سمجھا مگر بعد میں بھی وہ اسی نتیجہ پر پہنچے کہ یہ اعتراض وزن دار نہیں ہے اس لئے تصفیہ ہوا کہ مجوزہ تقسیم بنگال عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۰۵ء میں اس کا اعلان ہوا اور اکتوبر ۱۹۰۵ء سے اس پر عمل ہونے لگا اس صوبہ میں مسلمان زیادہ آباد اور انتہائی پست حالت میں تھے۔ پہلے تو حکومت نے ان کو پیسا تھا اور بنگالی ہندوؤں نے ان کو ابھرنے نہ دیا۔ اب صورت حال بدلنے سے کچھ ابھرنے اور ترقی کرنے کی امید ہوئی اس لئے انہوں نے اس تقسیم کا خیر مقدم کیا؛

تمام صوبہ پر بنگالی ہندو چھائے ہوئے تھے وہ بڑے بڑے زمیندار تھے سرکاری عہدوں دفاتر کی اعلیٰ اور نئی آسامیوں ریلوے اسٹیشنوں اور آزاد پیشوں پر ان ہی کا قبضہ تھا۔ کوئی سرکاری ادارہ ایسا نہ تھا جہاں ان کا اقتدار نہ ہو غرض اس صوبہ پر ان کا عملی طور پر تسلط تھا اس تسلط اور قبضہ و اقتدار کا اثر صرف مشرقی بنگال کے مسلمانوں پر ہی نہ تھا بلکہ حصہ بہار کے ہندو بھی شاکی تھے۔ چوں کہ اس تقسیم سے بنگالیوں کے اقتدار و مفاد کو نقصان ناگزیر تھا۔ اس لئے انہوں نے مختلف طریقوں سے ایجی ٹیشن شروع کیا اور ۱۹۰۲ء سے جو سودیشی تحریک جاری تھی اس کو زبردست تقویت حاصل ہو گئی جا بجا والنٹیر بنائے گئے اور فوجی مظاہرے کئے گئے باغیانہ لٹریچر شائع کیا گیا خفیہ کلب اور انجمنیں قائم ہو گئیں انقلاب پسند نوجوان گروہوں کی ذہنی تربیت کی گئی انگریز حکام کے قتل اور ریلوے ٹرینوں کو الٹنے کی وارداتیں شروع ہوئیں رہزنی ڈاکہ اور قتل بھی اس تحریک[۲۹] میں شامل تھا۔ انقلابیوں کی سازشوں اور کوششوں کے علاوہ چوں کہ کانگریس پر بھی بنگالی ہندوؤں کا اقتدار تھا یہ تقسیم اس کے مسائل مہمہ میں داخل ہو گئی اور اس نے آئینی ایجی ٹیشن کی سربراہی کی؛

ان شورش اور انقلاب پسندوں نے باوجودیکہ مسلمانوں کی طرف سے کوئی اشتعال انگیز کارروائی نہیں ہوئی مگر ان کو بھی اپنے غصہ کا نشانہ بنا لیا اور عوام کو مشتعل کر دیا؛

تمام مشرقی بنگال میں درگا دیوی کی تصویریں شائع کی گئیں اور مشہور کیا گیا کہ مسلمانوں نے اس کو توڑ ڈالا ہے۔ اس کے نتیجہ میں متعدد مقامات پر ہندو مسلمانوں میں تصادم اور فساد ہوا۔ اسی زمانہ میں بندے ماترم کا گیت سنائی دیا جو بنگال کی تعریف میں ہے۔ اس کے بعض مصرعے نہایت شر انگیز اور مشرکانہ عقائد و جذبات سے معمور ہیں۔ یہ گیت حکومت اور مسلمان دونوں کے خلاف نفرت پیدا کرتا ہے اور بطور ایک نعرۂ جنگ کے ہے چند ہی دن میں کانگریس نے بھی اس کو قومی ترانہ کا درجہ دے کر اختیار کر لیا۔

مشرقی بنگال میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا تھا اس سے ہندوستان کے تمام مسلمان متاثر ہوئے اور قدرتی طور پر اُن کے دلوں میں اپنی قوم کی ہمدردی پیدا ہو گئی، ساتھ ہی اُن کے دلوں میں سیاسی احساسات کا نشو و نما ہونے لگا اور سیاسی حقوق کے حصول اور تحفظ کی جو تحریک سنہ ۱۹۰۱ء سے شروع ہوئی تھی اس میں تیزی آگئی۔

اسی رفتار حالات میں بماہ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء وزیر ہند نے دارالعوام میں ایک تقریر کی جس میں نظام حکومت کی اصلاحات اور مجالس واضع قوانین کی توسیع کئے جانے کے ارادہ کا اظہار تھا، اور اس تقریر نے مسلمانوں کے سیاسی احساسات اور قوی کر دئے اور بالآخر نواب محسن الملک و نواب وقار الملک اور دیگر اعیان قوم کے مشورہ سے اپنے سیاسی حقوق و مطالبات کو ویسرائے کے سامنے ایک وفد اور میموریل کے ذریعہ پیش کرنے کی تجویز کی گئی۔

اس ابتدائی کارروائی میں ویسرائے ہند سے وفد اور میموریل کو پیش کرنے کی منظوری حاصل کرنے کے لئے ایم۔اے۔او کالج کے پرنسپل مسٹر آرچبولڈ کو جو اس عرصہ میں شملہ میں مقیم تھے واسطہ بنایا گیا۔ اگرچہ اس کی اجازت مل گئی لیکن چونکہ بنگالی ایجی ٹیشن اور باغیانہ تحریک سے حکومت کو ترد تھا کہ مبادا مسلمان بھی کوئی ایسا رویہ اختیار کریں جو اس کو مزید مشکلات میں ڈالدے اس لئے اطمینان بھی مطلوب تھا۔ چنانچہ مسٹر آرچبولڈ نے کرنل ڈنلاپ اسمتھ پرائیویٹ سکریٹری کی وساطت سے اس امر کا یقین دلایا

کہ مجوزہ ڈپوٹیشن کا جو ایڈریس پیش ہوگا اس میں کوئی ایسی بات نہ ہوگی کہ جس میں عدم وفاداری کا شائبہ ہو اور مسلمانوں کی سلطنت ایسی خواہش نہیں کہ وہ کوئی بھی ایسا کام کریں جس سے گورنمنٹ کو مشکلات میں ڈالیں۔ نیز نواب صاحب کو یہ اطلاع دی کہ ہز اکسلنسی نے ڈپوٹیشن منظور کرلیا ہے اور اب باضابطہ درخواست اور میموریل کی نقل بھیجدی جائے۔ مسٹر آرچبولڈ نے اپنی جانب سے چند تجاویز بھی بھیجیں جو میموریل میں درج کرنے کے قابل سمجھیں۔ یہ تمام مراحل ستمبر تک طے ہوگئے۔ مولوی سید حسن (نواب عماد الملک) نے بمبئی میں نواب محسن الملک کے پاس مقیم رہ کر مسودہ تیار کیا۔ ۱۶ر ستمبر کو لکھنؤ میں ممتاز اور قابل مسلمانوں کے ایک جلسہ نے اس پر غور کیا بحث و تمحیص کے بعد اس کی تکمیل ہوئی۔ ممبران وفد منتخب کئے گئے اور رئیس وفد ہز ہائنس آغاخاں قرار پائے جو اس وقت سیلون کا سفر کر رہے تھے۔ تار کے ذریعہ سے ان کو اطلاع کی گئی۔ یکم اکتوبر وفد اور میموریل پیش کئے جانے کی تاریخ قرار پائی۔ اور تاریخ معینہ پر پیش ہوئے۔ میموریل یا ایڈریس میں ایک تمہید کے بعد عرض کیا گیا کہ:۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد از روئے مردم شماری ۱۹۰۱ء چھ کروڑ بیس لاکھ سے اوپر ہے گویا ملک معظم کی قلمرو ہند کی کل آبادی کے ایک خمس اور ایک ربع کے درمیان ہے اور اگر آبادی کے اس وحشی اور غیر مہذب حصہ کو قلم انداز کردیا جائے جس کی تفصیل جنگلی اور وحشی فرقوں کے عنوان سے کی گئی ہے اور نیز اگر اُن فرقوں کو شمار سے خارج کیا جاوے جو عام طور سے ہندوؤں کے گروہ میں شامل کئے جاتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت ہندو نہیں ہیں تو مسلمانوں کی نسبت بہ اعتبار شمار کے ہندوؤں کی کثیر جماعت کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔ نظر براں ہماری یہ عرض ہے کہ "ریپریزینٹیشن (نیابت اور قائم مقامی) کا محدود یا وسیع جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے اسکی رو سے مسلمان جو باستثنا روس یورپ کی ہر دولت عالیہ کی آبادی سے زیادہ ہیں۔ اس امر کا انصافاً استحقاق رکھتے ہیں کہ امور مملکت میں انکی وقعت و اہمیت پورے طور سے تسلیم کیجائے بلکہ ہم حضور کی اجازت سے اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھنے کی جرأت کرتے ہیں اور اس امر پر زور دینا چاہتے ہیں کہ طریقہ قائم مقامی (یعنی ریپریزینٹیشن) میں خواہ وہ بالواسطہ

ہو یا بلا واسطہ اور تمام ان امور میں جو انکی وقعت و شان پر موثر ہوں مسلمانوں کو جو درجہ عطا کیا جائے وہ نہ صرف انکی تعداد سے بلکہ ان کی سیاسی حیثیت کی اہمیت و وقعت سے اور نیز سلطنت کی حفاظت میں جو ان کا قیمتی حصہ ہے اس سے بھی کافی نسبت رکھتا ہو اور نیز آخر پر نظر ڈالتے وقت ہمیں حضور کی عنایت سے امید ہے کہ حضور اس امر کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں گے کہ آج سے کچھ اوپر ایک ہی صدی پہلے مسلمانوں کا رتبہ ہندوستان میں کیا تھا؟ جس کی یاد ظاہر ہے کہ ان کے دل سے ابتک محو نہ ہوئی ہوگی........

ہندوستان کے مسلمانوں کو اب تک اپنے فرمانرواؤں کی حق پسندی اور عدل گستری پر جو انکے خصائل کا جزو اعظم ہے اعتماد رہا ہے اسی لئے انھوں نے اپنے حقوق و دعاوی کو اس طور پر پیش کرنے سے احتراز کیا ہے جو باعث تکدر سرکار ہو۔ اور ہماری تمنا ہے کہ مسلمانان ہند اپنی اسی پسندیدہ اور قدیم وضع پر قائم رہیں مگر مجبوری یہ آپڑی کہ بعض واقعات جو حال میں پیش آئے ہیں اور عام طور پر اور خصوصاً نوجوان مسلمانوں میں ایک جوش پیدا کر دیا جس سے اندیشہ ہے کہ بعض صورتوں اور مجبوریوں میں وہ جوش حد اعتدال سے گذر جائے اور بزرگوں کا نیک مشورہ اور معتدل ہدایت جس کا وہ ابتک اتباع کرتے آئے ہیں انکے قلوب پر موثر نہ ہو سکے......

ہمیں امید ہے کہ حضور والا ہمیں معاف فرمائیں گے اگر ہم پیش از پیش اس امر کا اظہار کریں کہ جو طریقہ نیابت و قائم مقامی رعایا کا یورپ میں رائج ہے وہ اہل ہند کے لئے بالکل نیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم کے بعض دور اندیش افراد کا خیال ہے کہ اس طریقہ کو ہندوستان کی موجودہ تمدنی اور سیاسی حالت پر کامیابی کے ساتھ منطبق کرنے کے لئے نہایت حزم و احتیاط و تامل اندیشی سے کام لینا پڑے گا جو اگر نہ لیا گیا تو منجملہ اور خرابیوں کے ایک بہت بڑی خرابی یہ پیش آئیگی کہ ہمارے قومی اغراض کا سیاہ و سفید ایک ایسی جماعت کے حوالے ہو جائے گا جسے ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے تاہم ایسی حالت میں جبکہ ہمارے فرمانرواؤں نے اپنے قومی اصول اور قدیم رسوم و عادات

کے لحاظ سے مناسب تصور فرمایا ہے کہ ان اصولوں کو ہمارے ملک کے نظم و نسق میں روز بروز زیادہ رواج دیا جائے ہم مسلمان اپنے قومی مفاد کو مد نظر رکھ کر آئندہ اس پالیسی کی اغراض سے کنارہ کشی کسی طرح نہیں کر سکتے.....

لہذا ضرور ہے کہ اول ہم اس احسان کا اعتراف کریں جو حضور نے اور گذشتہ جلیل القدر ویسراؤں اور لوکل گورنمنٹوں کے اعلیٰ حکام نے اس بارہ میں ہم مسلمانوں پر محض اپنی منصف مزاجی و حق پسندی سے کیا ہے۔ چنانچہ لیجسلیٹو کونسلوں میں مسلمان ممبر بہت قلیل استثناء کے ساتھ گورنمنٹ ہی کی طرف سے نامزد ہوتے رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عرض کرنا بھی ضرور ہے کہ جو حصہ قائم مقامی اور نیابت کا ہمیں عطا ہوتا رہا ہے وہ ہماری ضروریات کے لئے ناکافی تھا۔ اس کے علاوہ جو لوگ کونسلوں کی ممبری کے لئے منتخب ہوئے وہ اس گروہ میں ہمیشہ مقبول نہ تھے جنکے اغراض کی حمایت کے لئے انکا انتخاب عمل میں آیا تھا اور غالباً موجودہ حالت کے لحاظ سے کوئی دوسری صورت ممکن بھی نہ تھی۔ کیونکہ ایک تو ان ممبروں کی تعداد جنکی نامزدگی حضور والسرائے یا لوکل گورنمنٹوں کے اختیار میں تھی۔ بالکل محدود تھی اور دوسرے ایسی حالت میں جبکہ عام لوگوں کی مرضی اور پسند کے دریافت کرنے کا کوئی صحیح عملی طریقہ موجود نہ تھا۔ ایسے اشخاص کا منتخب ہونا نہایت دشوار امر تھا جو مقبول خاص و عام مسلمانان ثابت ہوں۔ الیکشن کے نتائج کی حالت یہ ہے کہ موجودہ قاعدوں کی رو سے یہ امر بعید از قیاس ہے کہ ان جماعتوں کی طرف سے جنکو انتخاب کا اختیار دیا گیا ہے۔ کسی مسلمان کا نام انتخاب کے لئے پیش کیا جائے تاوقتیکہ وہ اہم معاملات میں مجارٹی کے ساتھ ہمدردی کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہمارے ہندو ہموطنوں کی یہ خواہش قابل اعتراض نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی قوت سے پورا فائدہ اٹھا کر صرف اپنی قوم کے افراد کے حق میں ووٹ دیں یا غیر قوم کے ایسے کسی فرد کے حق میں جنکی نسبت یقین ہو کہ وہ ہندوؤں کی کثیر جماعت کی خواہش کے موافق رائے دیا کرے گا۔ اور اسکے بغیر اسکو چارہ بھی نہ ہوگا کیونکہ آئندہ بھی دوبارہ انتخاب اس کا ہندوؤں کی رضامندی پر موقوف ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے اور ہمارے ہندو بھائیوں کی بہت سے اغراض و مصالح مشترک ہیں اور ہمارے

سلئے ہمیشہ یہ امر نہایت اطمینان و مسرت کا باعث ہوگا کہ لیجسلیٹو کونسلوں میں قابل قابل اصحاب بلا لحاظ مذہب و ملت ان اغراض و مصالح کی حمایت کے لئے موجود رہیں تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قومی حیثیت سے ہم مسلمانوں کی ایک جداگانہ جماعت ہے جو ہندوؤں سے بالکل الگ ہے اور ہمارے بعض اغراض و مصالح ایسے ہیں جن کا تعلق بلا مشارکت غیرے ہماری ذات سے ہے۔ اور جن میں کسی دوسری قوم کو دخل نہیں ہے اور چونکہ ان کی حفاظت و حمایت اس وقت تک پورے طور پر نہیں کی گئی۔ اسلئے ہم مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ حتیٰ کہ ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد بلحاظ آبادی بہت زیادہ ہے۔ وہاں ان کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کیا گیا کہ گویا پولیٹیکل لحاظ سے وہ بالکل بے وقعت ہیں اور گویا داعیۂ انصاف ان کے ساتھ بے اعتنائی کئے جانے کا مانع نہیں ہے۔ پنجاب میں ایک حد تک یہی حال رہا ہے مگر سندھ اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔

انتخاب وکلاء کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرنے سے پہلے ہم بہ ادب عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ کسی قوم کی پولیٹیکل وقعت کا بڑھنا یا گھٹنا زیادہ تر اس قوم کے ان ارکان کی تعداد پر منحصر ہوتا ہے جو سرکاری ملازمت میں داخل ہیں۔ اگر بدقسمتی سے کسی قوم کی تعداد جیسی کہ مسلمانوں کی حالت ہے سرکاری ملازمت میں قلیل ہو۔ تو اس قوم کی جائز وقعت اور اصلی سیاسی اثر کو نقصان پہونچتا ہے۔ لہٰذا ہماری سب سے پہلی التجا یہ ہے کہ گورنمنٹ از راہ نوازش یہ انتظام فرمائے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں خدمات مندرجہ گزٹ و نیز خدمات ذیلی و خدمات متعلقہ دفاتر وغیرہ پر ہمیشہ ایک مناسب نسبت کے ساتھ مسلمانوں کا تقرر کیا جائے اگرچہ اس قسم کے احکام بعض صوبوں میں لوکل گورنمنٹوں نے گاہ بگاہ شائع کئے ہیں مگر افسوس ہے کہ ان کا نفاذ کبھی بہ تقیّد عمل میں نہیں آیا۔ جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ قابل مسلمان نہیں ملتے یہ بیان ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں صحیح ہو۔ مگر ہمکو امید ہے کہ آجکل یہ عذر ہرگز صحیح متصور نہ ہوگا۔ اور ہم حضور کو بمسرت تمام یقین دلا سکتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کی تعداد مانگ سے ہرگز کم نہ پائی جائے گی۔ اگر حکام متعلقہ ان کے لینے سے منکر نہ ہوں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ جب سے

لائق اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کی درخواستیں صرف اس بناء پر رد کر دی جانے لگی ہیں کہ ان اشخاص کا حق مرجح سمجھا جائیگا جو بالاضافہ ان سے زیادہ لائق ہوں۔ اس طرح پر گویا اصول مقابلہ کی بدترین شکل کو ملک میں رواج دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم نہایت ادب سے حضور والا کی توجہ اُن پولیٹیکل قباحتوں کی طرف مائل کرتے ہیں جو ایسی حالت میں پیدا ہوتی ہیں۔ یعنی یہ کہ عمل مذکور سے وہ اثر و رسوخ و وقعت جو ملازمت سرکار سے حاصل ہوتی ہے ایک ہی فریق کا حصہ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ حامیان تعلیم نے مسلمانوں میں تعلیمی تحریک کے آغاز ہی سے اس کے لئے سخت کوشش کی ہے کہ اخلاقی تربیت کا بہت زیادہ لحاظ رکھا جائے اور ہمارے خیال میں اعلٰے اخلاق کی درستی سرکاری ملازمین کے لئے زیادہ ضروری ہے بہ نسبت بیش از ضرورت علمی قابلیت کے ہم اس امر کے عرض کرنے کی جرات کرتے ہیں کہ عام طور پر ہندوستان کے تمام مسلمان اس بات سے آزردہ خاطر ہیں کہ ہائیکورٹوں اور چیف کورٹوں میں مسلمان جج بہت کم مقرر کئے جاتے ہیں۔ جب سے یہ عدالتیں قائم ہوئی ہیں صرف تین مسلمان اس معزز خدمت پر مقرر کئے گئے ہیں اور تینوں نے نمایاں طور پر اپنے آپ کو اس اعزاز کے قابل ثابت کیا۔ اسوقت ان عدالتوں میں سے ایک میں بھی کوئی مسلمان جج نظر نہیں آتا۔ حالانکہ بنگال کے ہائی کورٹ میں تین ہندو جج ہیں جہاں کہ مسلمان آبادی کا ایک بڑا جزو ہیں اور پنجاب کے چیف کورٹ میں جہاں کی مردم شماری کا جزو غالب مسلمان ہیں دو ہندو جج مقرر ہیں اور تمام ہندوستان میں اس وقت دیکھا جائے تو مختلف ہائیکورٹوں، اور پنجاب کے چیف کورٹ میں ملکر آٹھ ہندو جج مقرر ہیں اسلئے مسلمانوں کی یہ درخواست ناقابل پذیرائی نہیں ہے کہ ہر ہائی کورٹ اور چیف کورٹ میں ایک مسلمان جج مقرر کیا جایا کرے۔ قابل مسلمان وکیل اور قانون داں ان عہدوں کے لئے بخوبی مل سکتے ہیں جو اگر ایک صوبہ میں نہیں تو دوسرے صوبہ سے ضرور دستیاب ہو سکتے ہیں۔ علاوہ بریں ہر ہائی کورٹ میں ایک مسلمان جج کے ہونے سے جو مسلمانوں کی شرع سے واقف ہو۔ انصاف و عدالت گستری میں مدد ملے گی۔

چونکہ تمام اہم معاملات کا تعلق میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے ہوتا ہے جس کا اثر بہت کچھ وہاں کے باشندوں کی صحت اور راحت اور ضروریات تعلیمی بلکہ فرائض مذہبی پر پڑتا ہے۔ اسلئے ہمیں امید ہے کہ حضور ہمیں معاف فرمائیں گے۔ اگر ہم معاملات پر بحث کرنے سے پہلے ہم حضور کی توجہ تھوڑی دیر کے لئے مسلمانوں کی اُس حیثیت کی طرف منعطف کریں جو انہیں ان مجالس میں حاصل ہے یہ مجالس سیلف گورنمنٹ کا ابتدائی زینہ ہیں اور یہیں سے طریقہ نیابت و قائم مقامی کے اصول پورے طور پر لوگوں کے دل نشین ہوتے ہیں مگر مسلمانوں کی حیثیت ان مجالس میں بھی کسی ایسے مقررہ اصول پر مبنی نہیں ہے جنکا عملدر آمد ہر جگہ ہو سکے کیونکہ مختلف مقامات میں مختلف قواعد کی پابندی کیجاتی ہے۔ مثلاً علیگڈھ کی میونسپلٹی چھ محلوں پر منقسم ہے اور ہر محلہ سے ایک ہندو اور ایک مسلمان ممبر منتخب ہوتا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ یہی اصول پنجاب اور دوسری جگہوں کی بعض اور میونسپلٹیوں میں بھی رائج ہے لیکن بہت سے مقامات میں مسلمان ممبروں کی تعداد جسقدر کہ ہونی چاہیے منتخب نہیں ہوتی۔ اسلئے ہم نہایت ادب سے التماس کرتے ہیں کہ مقامی حکام کو ہدایت کی جائے کہ ہر جگہ پر مسلمان اور ہندو ممبروں کی تعداد جس نسبت سے وہاں کی میونسپل اور لوکل بورڈز میں ہونی چاہیے صاف طور سے بتائی جائے۔ اور ہر قوم کے ممبروں کی نسبت کا تعین اس قوم کی مردم شماری اور ممبروں کی ذاتی حیثیت و وقعت اور مقامی اثر اور ضروریات کے لحاظ سے کیا جائے۔ جب اس امر کا تعین کیا جا چکے کہ ہر قوم کے اسقدر ارکان کو ممبری کا استحقاق ہو گا۔ تو ہماری رائے میں مناسب ہوگا کہ ہر قوم کو اپنے اپنے وکلاء کے منتخب کرنے کی اجازت دیجائے جیسا کہ پنجاب کے اکثر شہروں میں عمل درآمد ہے۔

ہم اب اپنی رائے اس بارہ میں ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ملک کی لیجسلیٹو کونسلوں میں ہمارا حصہ کس قدر ہونا چاہیے اوّل ہم پراونشل کونسلوں کا ذکر کرتے ہیں اسکے متعلق ہماری گذارش یہ ہے کہ جس طرح میونسپل کمیٹیوں اور لوکل بورڈوں میں مسلمان ممبروں کی تعداد کا تعین کیا جائے اسی طرح یہاں بھی تعداد مقرر کر دیجائے اُن تمام امور کا پورا لحاظ رکھکر جنکا ذکر ہمنے اس عرضداشت کی دفعہ (۵) میں کیا ہے اور سربرآوردہ مسلمان جاگیرداروں، تعلقداروں، زمینداروں، تجار یا

اور بڑے بڑے شہروں کے معزز باشندوں، میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے مسلمان ممبروں اور یونیورسٹیوں کے مسلمان رجسٹرڈ گریجویٹوں کو جنکے پاس کئے ہوئے کچھ عرصہ مثلاً پانچ سال گذر چکے ہوں حق انتخاب عطا کیا جائے اور انکو اختیار دیا جائے کہ ان قواعد کی رو سے جو حضور اس بارہ میں نافذ فرمائیں۔ اس قدر تعداد مسلمان ممبروں کی منتخب کریں جو قرار پا چکی ہو۔

امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے متعلق جہاں مسلمانوں کی اغراض کی حفاظت اور حمایت کے لئے کافی تعداد مسلمان ممبروں کی ہونی نہایت ضروری اور بہت ہی اہم ہے ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ:۔

(۱) اس کونسل میں مسلمان ممبروں کی تعداد ان کی قوم کی مردم شماری کی نسبت سے نہ قرار دی جائے۔ اور کسی صورت میں انکی تعداد اسقدر کم نہ ہو کہ ان کا کوئی اثر ہی نہ پڑ سکے۔ اور عدم وجود برابر ہو جائے۔

(۲) حتی الوسع طریقہ انتخاب کو طریقہ نامزدگی پر ترجیح دیجائے۔

(۳) مسلمان ممبروں کے انتخاب کے لئے مسلمان جاگیرداروں۔ تعلقہ داروں۔ زمینداروں قانون دانوں، تجارتوں اور بڑے بڑے شہروں کے سربرآوردہ باشندوں کو (جنکی حیثیت کا تعین گورنمنٹ کیطرف سے ہوگا) اور پراونشل کونسل کے مسلمان ممبروں اور یونیورسٹی کے مسلمان فیلوؤں کو انتخاب کرنے کا حق دیا جائے جو اپنے اختیارات کو ان قواعد کے موافق عمل میں لائیں جو حضور والا اس بارہ میں نافذ فرمائیں۔

کچھ دن سے ہم سنتے ہیں کہ ایسا بھی خیال ہے کہ حضور والا ئسرائے کے ایگزیکٹیو کونسل میں ایک یا زیادہ دیسی ممبر مقرر کئے جائیں۔ اگر ہندوستانیوں کو اس قسم کی خدمات کا دینا مناسب خیال کیا جائے تو ہم التجا کرتے ہیں کہ اس بارے میں مسلمانوں کے حقوق نظرانداز نہ کئے جائیں۔ ہم یہ عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ ملک میں ایک سے زیادہ مسلمان ایسے مل سکیں گے جو ان خدمات کی عمدگی کے ساتھ انجام دہی کی قابلیت رکھتے ہوں"۔۔۔۔۔۔ ۱۲

ہز اکسلنسی نے اپنی پرمغز و پرمعنی جوابی تقریر میں مسلمانان مشرقی بنگال کے ضبط و تحمل کی تعریف کی اور کہا کہ "

"میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ جو طریقہ[59] ویسرائے اور گورنمنٹ نے صوبہ جدید کے
معاملات میں اختیار کیا ہے (جس صوبہ کی آئندہ بہبودی کی نسبت میں امید کرتا ہوں کہ
وہ مستقل ہے) بہمہ جہت و بحیثیت مجموعی بلا لحاظ قوم و مذہب وہاں کے باشندگان
حال و آئندہ کی صلاح و فلاح پر مبنی ہے، اور یہ کہ مسلمانان صوبہ مشرقی بنگالہ و آسام
اپنی وفاشعاری کی قدردانی اور اپنے حفظ حقوق کی نسبت برطانیہ کی معدلت و نصفت
شعاری پر حسب عادت مستمرہ پورا بھروسہ رکھ سکتے ہیں"

اس کے بعد سیاسی مطلع پر نئے رنگوں کی شفق کے پھولنے جدید توقعات پیدا ہونے
اور سیاسی رجحانات کو برطانوی حکومت کے بڑھانے اور مغربی طریقہ اصول قائمقامی کو ہندوستان
میں رواج دینے پر اظہار خیال کرنے کے بعد کہا کہ:۔

"حضرات اب میں آپ کے اصلی مدعا کی طرف آتا ہوں یعنی یہ کہ آپ مسلمانوں
کو آئندہ سیاسی معاملات میں کیا حصہ ملنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ خود
تسلیم کریں گے کہ میں آپ کے ساتھ ان واقعات وحالات پر تفصیلی بحث نہیں
کر سکتا جن سے امور مملکت میں آپ کی شراکت کی کمیت و کیفیت معین و مشخص
ہو سکتی ہے اس وقت میں عام الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کر سکتا ہوں آپ نے
اپنے ایڈرس میں جن ابواب پر زور دیا ہے ان پر وہ کمیٹی غور کرے گی جس کو میں
نے حال میں (جیسا کہ آپ کو علم ہے) اصول قائمقامی پر غور کرنے کے لئے مقرر
کیا ہے، میں آپ کا ایڈرس اس کمیٹی میں ضرور پیش کر دوں گا تاہم میں امید کرتا
ہوں کہ سر دست عام طور پر آپ کے خلاصہ مطالب کا جواب دے سکتا
ہوں، بغیر اس کے کہ کمیٹی کی کسی تجویز سے قبل از وقت پیش روی کی جائے
جہاں تک میں سمجھتا ہوں خلاصہ مطالب آپ کا یہ ہے کہ کسی طریقہ قائمقامی
میں جس کو جاری کرنا یا ترقی دینا حکومت کے مرکوز خاطر ہو خواہ وہ میونسپلٹی سے
متعلق ہو یا لوکل بورڈ سے یا قانونی کونسل سے، مسلمانان ہند کو بحیثیت قومی حصہ
دیا جائے۔ آپ نے اشارہ کیا ہے کہ انتخاب کے لئے اس وقت جو جماعت معین

ہے اس سے بمشکل امید ہو سکتی ہے کہ کسی مسلمان کا انتخاب کرے، اور اگر اتفاقاً کوئی
منتخب ہو تو ایسی صورت میں وہ اپنی رائے پر ایسی مجارٹی کی رائے کو ترجیح دے گا
جو خود اُس کی اپنی قوم کے مخالف ہے، اور اس طرح کا منتخب شدہ مسلمان ہرگز
اپنی قوم کا قائمقام یا وکیل متصور نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ آپ مسئلہ تعداد پر
بھی زور دیتے ہیں کیا بہ لحاظ وقعت قومی اور کیا بہ لحاظ اُن خدمات کے جو مسلمانوں
سے ظہور میں آتی رہتی ہیں میں آپ کے ساتھ پورے طور پر متفق ہوں مگر براہ مہربانی
میرے مدعا کی تعبیر میں غلطی نہ کیجیے، مجھے اس وقت یہ بتانا مقصود نہیں کہ خاص
خاص اقوام کی قائمقامی کس طریقہ سے ہونی چاہیے مگر جیسے آپ لوگوں کو یقین ہے
ویسے ہی میں بھی یقین کرتا ہوں کہ بلالحاظ ان قوموں کے مذہب وملت اور حالات
سلف کے جن سے ملک آباد ہے شخصی آزادی انتخاب نہ فقط نتیجہ میں ناکام ہوگا
بلکہ فساد انگیز ہوگا۔ عام رعایائے ہندوستان طریقہ قائمقامی سے بالکل ناآشنا
ہے مجھے آپ کے ساتھ اتفاق ہے کہ ملکی انتظام میں حصہ لینے کا ابتدائی زینہ
میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ ہے اور یہی وہ مدارس ہیں جن میں اہل ملک کو سیاسی تعلیم
حاصل ہوتی ہے۔

سردست میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب تک میرا تعلق اس ملک کے انتظامی
امور سے ہے مسلمانانِ ہند مطمئن رہ سکتے ہیں، ان کے قومی حقوق ومقاصد کا پورا
لحاظ کیا جائے گا، آپ اور تمام رعایائے ہند پورا بھروسہ کر سکتے ہیں کہ جس طرح
انگریزی راج کو زمانہ ماضی میں ان تمام مختلف مذاہب وملل اور اقوام کے ساتھ
کہ جن سے ہندوستان کی بے شمار آبادی مرکب ہے نظر مراعات ومدارا رکھنے
کا فخر رہا ہے اور اسی طرح ہمیشہ رہے گا۔

اس اجتماع کے موقع پر شملہ میں ہی سیاسی تنظیم (پولیٹیکل آرگنائزیشن) سے متعلق مسلمان
رہنماؤں نے باہمی مشورے کیے، نواب سلیم اللہ خاں نے پہلے سے ہی اس موضوع پر
چند نوٹ ممبرانِ وفد کے پاس بھیجے تھے جن پر غور کیا گیا اور یہ قرار پایا کہ آئندہ دسمبر میں

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر جس کا اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہونے والا تھا اس مسئلہ کا تصفیہ کیا جائے اور سردست یہ نوٹ دیگر کاغذات کے ساتھ مختلف ایسوسی ایشن اور مسلم اہل الرائے اصحاب کے پاس مشورہ کے لئے ارسال کئے جائیں۔

نواب سلیم اللہ خاں نے اپنے نوٹ "آل انڈیا مسلم کانفیڈریسی" قائم کئے جانے کی اسکیم کی صورت میں شائع کئے اور نواب وقارالملک نے ڈھاکہ میں سیاسی اجتماع کے متعلق فوراً کارروائی شروع کر دی۔ کانفرنس کا جلسہ ختم ہونے کے بعد ۳۰ دسمبر کو ایک خاص جلسہ محمڈن پولیٹیکل ایسوسی ایشن قائم کرنے کے لئے منعقد ہوا، نواب وقارالملک ہی صدر منتخب ہوئے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کی موجودہ سیاسی پوزیشن پر توجہ دلا کر ایک سیاسی ایسوسی ایشن کی ضرورت پر زور دیا اور نواب ڈھاکہ کی اسکیم بھی پیش کی گئی نتیجہ میں طے ہوا کہ :-

"یہ جلسہ جس میں ہندوستان کے ہر حصہ کے مسلمان بمقام ڈھاکہ شریک ہیں فیصلہ کرتا ہے کہ ایک پولیٹیکل ایسوسی ایشن بنام آل انڈیا مسلم لیگ حسب ذیل مقاصد کے لئے قائم ہونی چاہیے۔

(الف) مسلمانوں میں وفاداری سلطنت برطانیہ کی خیالات کو ترقی دینا اور گورنمنٹ کے کسی ارادے کی جانب سے اگر غلط فہمی پیدا ہو تو اس کے دفعیہ کی کوشش کرنا۔

(ب) مسلمانوں کے پولیٹیکل حقوق کو ترقی دینا اور ان کی حفاظت کرنا اور ان کی ضروریات اور خواہشات کو گورنمنٹ میں پیش کرنا۔

(ج) دیگر اقوام ہند سے بہترین برتاؤ کی ترقی میں اس حد تک عملی پہلو اختیار کرنا جہاں تک کہ مسلمانوں کے حقوق کو نقصان نہ پہونچے۔"

اس اجلاس کی روئداد (مولانا) محمد علی نے تحریر کی جو (   ) کے نام سے مشہور ہے اور تمام سلطنت برطانیہ میں مشتہر کی گئی، محسن الملک اور وقارالملک جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے مگر آخرالذکر کی ذمہ دارانہ حیثیت رہی اور دفتر بھی امروہہ (ضلع مرادآباد) میں قائم ہوا جو ان کا وطن اور مستقر تھا۔

اس کے بعد لیگ کا دستور اساسی دوسرے اجلاس منعقدہ کراچی دسمبر ۱۹۰۷ء میں مکمل ہوا اور لیگ نے تقسیم بنگال کے مسئلہ پر بھی کافی توجہ کی کیوں کہ اب اس کی اہمیت بہت زیادہ ہو چلی تھی۔

مارچ ۱۹۰۸ء کے اجلاس علیگڈھ میں عہدہ دار منتخب ہوئے۔ نواب محسن الملک کا اکتوبر ۱۹۰۷ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ اور نواب وقار الملک ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے سکریٹری منتخب ہو گئے تھے، انھوں نے دونوں کام اپنے ہاتھ میں رکھنے مناسب نہ جانے اور ڈاکٹر میجر سید حسن بلگرامی سیکریٹری اور ہز ہائنس سر آغا خاں پریسیڈنٹ مقرر کئے گئے، صوبوں میں شاخیں قائم کرنے کی تجاویز پاس ہوئیں، پنجاب میں پہلے سے ایک لیگ قائم تھی اس کا الحاق کیا گیا، صدر دفتر عارضی طور پر علیگڈھ میں منتقل ہوا، ایک سنٹرل کمیٹی بنائی گئی، جس میں تمام صوبوں سے ممبر انتخاب کئے گئے۔

انتظامی و عدالتی اختیارات کو علیحدہ کرنے اور شملہ ڈپوٹیشن کے مطالبات پر حکومت کو متوجہ کرنے کے رزولیوشن پاس ہوئے۔ چوں کہ مسودہ اصلاحات مشتہر ہونے والا تھا، اس پر غور کر کے رپورٹ پیش کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی۔

انھیں کوششوں کے دوران میں سید امیر علی (رائٹ آنریبل) کی زیر صدارت مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق کی حفاظت کی غرض سے لندن میں ایک کمیٹی قائم ہوئی تھی اس کی تائید اور مالی امداد منظور کی گئی جو بعد کو برٹش کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے موسوم ہوئی، ۶ رمئی کو اس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ سید امیر علی صدر سی۔ اے لطیف آنریری سکریٹری ڈاکٹر (سر) محمد اقبال، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور دیگر اصحاب مقیم انگلستان ممبر منتخب ہوئے۔ کمیٹی میں مسٹر ہیرلڈ کاکس (سابق پروفیسر ایم۔ اے۔ او کالج) حال ممبر پارلیمنٹ سر ہنری سیمور کنگ سر ریمنڈ ویسٹ بلحاظ اپنی ہمدردی کے وائس پریسیڈنٹ بنائے گئے۔

اگست ۱۹۰۸ء میں حکومت ہند کے ہوم ڈپارٹمنٹ نے عام خیالات و آرا معلوم کرنے کے لئے مجوزہ اصلاحات کا مسودہ شائع کیا جس میں ایک تاریخی تبصرہ کے بعد اعداد

سے بتایا گیا کہ اس طریقہ انتخاب سے بہت زیادہ فائدہ قانون پیشہ طبقہ کو ہوا اور وہی
انتخابی ادارات میں زیادہ داخل ہوئے اور اب گورنمنٹ آمادہ نہیں کہ کونسل کی پوری
طاقت انہیں کے ہاتوں میں منتقل ہوجائے۔

امپیریل لیجس لیٹو کونسل کے نظام ترکیبی اور جماعت زمینداران کی نمایندگی پر بحث کے
ساتھ قلیل التعداد جماعتوں اور دیگر اہل حقوق کے متعلق بحث تھی مسلمانوں کی نسبت
وسیرائے کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ:۔

"گورنمنٹ ہند ایڈریس پیش کرنے والوں سے اس امر میں متفق ہے کہ پراونشل
کونسلوں میں نیز امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں مسلمانوں کو اب تک اتنا حصہ جو ان کی
مردم شماری اور سیاسی و تاریخی اہمیت کے مطابق ہو نہیں ملا اور گورنمنٹ
ہز اکسیلنسی کی تقریر کے اس حصہ پر زور دیتی ہے کہ ہندوستان میں "نیابت بہ
انتخاب" کا ہر ایک طریقہ جس کا منشا بلا لحاظ اس براعظم کی قوموں اور باشندوں
کی روایات و معتقدات کے آزادانہ رائے دینے کا ہو یقیناً ناکامی کے بُرے
انجام پر منتہی ہوگا، رائج الوقت طریقہ انتخاب میں رائے دہندوں کی تمام یا تقریباً
تمام جماعتوں میں ہندوؤں کی تعداد غالب ہے جس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ نسبتاً بہت
ہی کم تعداد مسلمان ممبروں کی منتخب ہوسکی، اس کمی کو گورنمنٹ نے کسی قدر نامزدگی
کے طریقہ سے پورا کیا، تاہم کل مقدار نیابت جو ہر دو طریق سے حاصل ہوئی
اس مقدار کے موافق نہ ہوسکی جس کا مسلمانوں کو استحقاق ہے۔ مزید براں نہایت
زور کے ساتھ یہ بات پیش کی گئی ہے کہ نامزدگی کے طریقہ سے بھی اس درجہ کے
مسلمانوں کا تقرر نہیں ہوسکا جن کے تقرر کی مسلمان قوم کو خواہش تھی"

اس کے بعد صوبجات کی مجالس واضع قوانین اور ممبروں کے معیار قابلیت کے سلسلہ
میں ان جماعتوں کے حق نیابت پر توجہ دلائی گئی جن کی نسبت بالفعل دیگر کثیر التعداد فرقہ یا
آبادی سے مغلوب و پامال ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

اسی سلسلہ میں اس اسکیم کا بھی ذکر کیا گیا جو لوکل بورڈوں اور کونسلوں میں ان جماعتوں

کو ابھی حقِ نیابت دینے کی تجاویز کے طور پر گورنمنٹ کے سامنے پیش ہے۔

اس مسودہ اصلاحات پر لیگ کمیٹی نے غور کر کے ایک مفصل میمورینڈم پیش کیا۔
انگلستان میں لندن لیگ نے ۱۵ر جنوری ۱۹۰۹ء کو میمورینڈم نائب وزیر ہند
کے پاس بھیجا اور ۲۷ر جنوری کو سید امیر علی کی قیادت میں ایک مقتدر وفد لارڈ مارلے
وزیر ہند کی خدمت میں پیش ہوا۔ اس موقع پر دیگر ارکان انڈیا کونسل بھی موجود تھے قائد
وفد نے ایک تقریر بھی کی جس میں اس امر پر زور دیا کہ:-

"۶۲ ملین مسلمانوں کے نظریہ میں عمومیت ہے اور ان کی نسلی روایات اور مذہب میں
اُن لوگوں سے علیحدگی ہے جو ہندوستان میں آباد ہیں، ہم جو کہ ایک قومیت کی تشکیل کرتے ہیں تو ہمارا
قومیت اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ اور قوموں کی، ہماری خواہشیں ہمارے جذبات اور پالیسی
قائم کرنے میں ہمارے مفادات کے لحاظ اتنے اہم عناصر ہیں جتنے کہ دوسروں کے۔
ہم محسوس کرتے ہیں کہ مخلوط انتخاب میں جو نمائندگی ہوگی وہ مسلمانوں کے لئے نقصان
دہ ثابت ہوگی، مسلمانانِ ہند خیال کرتے ہیں کہ ان کی نمائندگی دوسروں کی
خواہش پر نہ ہو بلکہ آزادانہ ہو اور صرف اسی صورت میں ہم ان مراعات سے
مستفید ہو سکتے ہیں جو ہندوستان کو دی جا رہی ہیں۔"

میجر سید حسن نے بھی جو ممبر وفد کی حیثیت سے موجود تھے ایک مفصل و مدلل تقریر
میں اپنے مطالبات کا اعادہ کیا، ازاں بعد لارڈ مارلے نے جواباً کہا کہ:-

"مسٹر امیر علی اور مسٹر بلگرامی نے جو تقریریں کی ہیں اُن کو اصلاحات کا مخالف
نہیں سمجھتا بلکہ ان کا موئد خیال کرتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اصلاحات فی الجملہ
اچھی نظر سے دیکھی گئی ہیں اور یہ بات قابلِ اطمینان اور حوصلہ افزا ہے یہ صرف
۵ ہفتہ کی بات ہے کہ اصلاحات شائع کی گئی ہیں۔ اس عرضی پر غور کرنے سے میں
کہہ سکتا ہوں موجودہ حالت خاطر خواہ اور امید افزا ہے، گو کہ ابھی بہت سے امور
پیچیدہ اور قابلِ تصفیہ ہیں۔ عام حالت کو دیکھنے سے مجھے کامل یقین ہوتا ہے
کہ ہندوستان اور انگلستان میں اسکیم کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے، نیز مدائے

اور امرتسر کی کارروائیوں سے میں نے معلوم کیا ہے کہ ہندوستان میں سچی پولیٹیکل رُوح پیدا ہوگئی ہے اور مجھے بعض اوقات یہ آرزو ہوتی ہے کہ میرے بعض انگریز دوست بھی اس کی تقلید کریں، میں نے ٹائمس کا وہ مضمون بھی پڑھا ہے جو آج اس کے بمبئی کے نامہ نگار نے اصلاحات کے متعلق اس غرض سے لکھا ہے کہ اس سے ہندوستانیوں اور ہندوستانی حاکموں کی رائے کا اظہار ہو، میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ اگر اصلاحات کو ہندوستان کے افسران سول سروس پسند کریں تو سمجھنا چاہیئے کہ ان میں کچھ نقص ہے یا کم سے کم ان پر عمل ہونا مشکل ہے سبب مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر مجوزہ اصلاحات ہندوستان کے حکام سے جبراً منوائی گئیں تو اُن کو اصلاحات سے کوئی ہمدردی نہ ہوگی، مگر اس اندیشہ کی نہ کوئی وجہ ہے نہ کوئی اس بات کی علامت ہے کہ ذمہ دار اشخاص جو انگلستان میں ہیں یا ہندوستان میں اس اسکیم کو صدمہ پہنچانا چاہتے ہیں۔ بیرون ملک کے اربابِ سیاست بھی اس اسکیم کو غور و فکر کی نظر سے دیکھ رہے ہیں، اور ہماری کامیابی کی آرزو رکھتے ہیں، چنانچہ ۱۹ر جنوری کو مسٹر بوزویلیٹ نے جو تقریر کی ہے وہ نہایت قابل غور ہے اگر یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ انگریزوں کا برتاؤ ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ انصاف کے خلاف ہے تو اسکا اثر قسطنطنیہ میں نہایت مضر پڑیگا۔ سلطنت برطانیہ اس امر کی خواہاں ہے کہ نہایت نیک نیتی کے ساتھ ان تجویزوں پر عمل ہو، اصلاحات کا مسودہ پارلیمنٹ میں پیش ہونے کے لئے تیار ہے اور ایڈریس کے بعد وہ فوراً ہی پیش ہوگا اور اس کے بعد ہندوستان میں فوراً اسکا اجرا کیا جائیگا، اصلاحات کے مراسلہ میں مخلوط انتخابی حلقوں کے اصول میڈیا والوں اور ایرانیوں کے قانون کی طرح پیش نہیں کئے گئے ہیں گورنمنٹ کی خواہش ہے کہ مسلمانوں کی نمایندگی اور نیابت ہندوستانی مجلسوں میں اصلی اور موزوں ہو اور مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے انتخابات خالص اسلامی انتخابی حلقوں کے ذریعہ سے ہوں گے

گورنمنٹ کا مقصد یہ ہے کہ قانون سازی کی مجلسوں میں نمائندگی اصلی اور موثر ہو
اور اصلی تمدنی قوموں اور مختلف جماعتوں کی خواہشوں اور ضرورتوں کا لحاظ رہے
یہ مقصد جبر و مقابلہ حساب یا منطق کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ صرف
وسیع النظری سے حاصل ہو سکتا ہے، میں اس امر میں کوئی نقصان نہیں دیکھتا
کہ نمایندگی اور نیابت کی حدود کے لحاظ سے اصلی بنیاد تو تعداد ہو مگر نمائندوں
کی تعداد میں بعض دیگر اسباب سے بھی تغیر و تبدل ہو سکے یہ بات کچھ زیادہ
موزوں نہیں ہے کہ وائسرائے کی انتظامی مجلس میں ایک مسلمان ایک ہندو
نمایندہ شامل کیا جائے کیوں کہ اسکے معنی یہ ہیں کہ مجلس مذکور کے ایک تہائی
ممبر ہندوستانی ہوں حالانکہ یہ طرز عمل مضرت رساں ہوگا، میں نے جو یہہ
سفارش کی ہے کہ وائسرائے کی انتظامی مجلس میں ایک ہندوستانی ممبر
ہو اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ ممبر ہندو ہی ہو یا مسلمان ہی ہو بلکہ مجھے اس
سے یہ امر ظاہر کرنا مدنظر تھا کہ ہندوستانی محض ہندوستانی ہونے کے سبب
سے کسی اعلےٰ سے اعلےٰ سرکاری عہدہ کے لئے ناقابل نہیں ہو سکتے، اس کے
علاوہ ہمارا یہ مقصد بھی تھا کہ ہم ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے اعلان کے اس مشہور وعدہ
کو عملی طور پر پورا کر دکھلائیں کہ جس شخص میں کسی عہدے کے حاصل کرنے کی کافی
قابلیت اور لیاقت موجود ہو، وہ رنگ یا مذہب کے اختلاف کے لحاظ سے
اس عہدے پر پہونچنے سے محروم نہیں ہو سکتا، میں مسلمانوں کی اس درخواست
کو منظور کرنے کا کوئی موقع نہیں دیکھتا کہ ویسرائے کی انتظامی مجلس میں ان کی
قوم کا ایک نمائندہ ضرور موجود ہو، آخر میں مجھے آپ کو یہ بات جتانی ضروری ہو کہ
اگر اس دفعہ یہ تجویزیں ناکام رہیں تو پھر عرصہ دراز تک یہ موقع آنے والا نہیں ہے
اور شاذ و نادر ہی یہ بات ممکن ہوگی کہ ایسا وزیر ہند اور ایک ایسا ویسرائے برعہدہ
ہو جو باہم ملکر ہندوستانیوں کی خواہشوں اور ضرورتوں پر انصاف سے نظر
ڈالنے میں اس درجہ تک مستعد اور آمادہ ہو گا"

اس کے بعد ۲۳ فروری کو لارڈ موصوف نے ہاؤس آف لارڈز میں ایک تقریر کی جس کے ضمن میں مسلمانوں کے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار اور ان کے مطالبات کی صداقت کا اقرار کیا لارڈ کرزن نے کہا کہ :-

"ہندو مسلمانوں کے مخلوط حلقوں کا اصول ہندوستان کی حالت کے بالکل نامناسب ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چند ہی سال میں کُل انتخابی نظام ہندوؤں کے قبضہ میں چلا جائیگا"

لیکن اکثر ہندو سیاسئیین کی مخالفت برابر جاری تھی چنانچہ ۳ اپریل کو ہندو سبھا نے وائسرائے کی خدمت میں جو ایڈریس پیش کیا اس میں سخت احتجاج تھا اور یہاں تک دھمکی دی کہ ان انتخابی جزئیات کی خاطر وہ تمام اصلاحات سے دست برداری کے لئے تیار ہیں ادھر انگلستان میں بعض ذمہ دار عہدہ داران سلطنت کے ایسے بیانات ہوئے جن سے لارڈ مارلے کے ایفائے وعدہ میں شبہ اور تردد نظر آنے لگا اس لئے مسلمانوں نے احتجاجی جلسے کئے اور مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں (محمود آباد) نے اپریل میں وائسرائے کے سامنے ایک میمورینڈم پیش کیا جو ابتک کے تمام مباحث پر حاوی ہے"

"رعایائے ہند کی جانب سے جو کوشش کہ حضور والا نے فرمائی ہے اور اس کے نتیجہ میں جو اصلاحات کہ مرتب ہوئی ہیں وہ یقیناً ہمارے لئے ایک نعمت ہیں، ان میں یہ بھی تجویز ہے کہ ہندوستانیوں کو حکومت میں زیادہ اختیارات دیے جائیں جس کا نتیجہ میں راعی و رعایا قریب تر ہو جاویں گے اور اس سے ہندوستان کے مفاد کو بہت تقویت ہوگی"

لیکن حضور والا میری رائے ہے کہ اس نتیجہ کے حصول کا جو ہم سب کا مُدعا ہے صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے اور میرے نزدیک اگر یہ نہ کیا گیا تو پوری اصلاحی اسکیم ناکامیاب ہو جائے گی، اور اسی لئے میں حضور والا کی توجہ اپنی قوم کی طرف مبذول کرا رہا ہوں"

مسلمان قوم جو سب سے بڑی اقلیت ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ اس کا کس قدر

قابلِ فخر اور مسلسل حکومت کا کارنامہ ہے نیز یہ کہ وہ ہندوؤں سے نسل و روایات اور مذہب میں بالکل علیحدہ ہیں اس لئے اکثریت کو یہ احساس ہے کہ مسلمانوں کو سخت نقصان اُٹھانا ہی چاہیے اور اگر اُن کے حقوق اور جائز مطالبات کا تحفظ نہ کیا گیا اور اُن کو نظر انداز کر دیا گیا تو ان کو واقعی دیگر اقلیتوں کے مقابلہ میں سخت نقصان اُٹھانا پڑے گا، ابھی ڈھائی سال قبل حضور والا کی خدمت میں مسلمانانِ ہند کا ایک نمایندہ وفد بھی حاضر ہوا تھا جس نے بتایا تھا کہ اس ملک میں مسلمان قوم کی کیا پوزیشن ہے اور کیا اس کی سیاسی و تاریخی اہمیت ہے اور حکومتِ ہند پر اس کے حقوق کیا ہیں، حضور والا نے اس وفد کو یقین دلایا تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کو ضرور ملحوظ رکھا جائے گا اور ان کا تحفظ کیا جائے گا، آج وہ حضور والا سے چاہتے ہیں کہ اس بات کو طے فرما دیں۔

میں مودبانہ عرض کروں گا کہ وہ مطالبات کیا ہیں؟

مسلمانوں کے حق نمایندگی کو ان کے تناسب تعداد کی بجائے ان کی تاریخی و سیاسی اہمیت کی بنا پر مانا جائے، تمام ہندوستان میں مسلمانوں کو جداگانہ نمایندگی دی جائے یعنی ہر انتخاب میں جہاں بھی ممکن ہے مثلاً امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں صوبجاتی کونسلوں، میونسپلٹیوں ڈسٹرکٹ بورڈوں اور یونیورسٹیوں میں، اور جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں اصول نامزدگی سے کام لیا جائے اور بعد کو جداگانہ حلقہ انتخاب بنا دیا جائے اور جوں ہی کہ یہ حلقہ بن جائے فوراً مشترک انتخاب کے اصول کو جو کسی حصہ ہند میں مسلمانوں پر عائد ہوتا ہو کلیتہً ترک کر دیا جائے۔

اس مطالبہ کے دلائل کو حضور والا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت نہیں، چونکہ ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہ کامل طور پر پیش کئے جا چکے ہیں اور میں یقین رکھتا ہوں کہ حضور والا پورے طور پر ان سے واقف ہیں اور میں نے دیکھا ہے کہ حضور والا نے ان کی صداقت محسوس کر کے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کے

مراسلہ میں بسلسلہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل تحریر کیا ہے کہ ”سب لوکل گورنمنٹیں مسلمانوں کے لئے خاص نمایندگی کی تجاویز کو تسلیم کرتی ہیں اور یہ کہ مسلمان واقعتہً ایک جدا قوم ہیں اور ان کو بیاہ شادی کھان پان رواج اور بہت سی چیزوں میں ہندو قوم سے امتیاز و اختلاف ہے“ اور بھی بہت سے باتوں سے ان کا مختلف القوم ہونا معلوم ہوتا ہے“

اسی مراسلہ میں صوبجاتی کونسلوں کے سلسلہ میں ارقام کیا ہے کہ ”ہماری رائے یہ ہے کہ جن صوبوں میں کہ مستقل مسلم حلقہائے انتخاب کے ذریعہ انتخابات قابل عمل ہوں وہاں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور یہ کہ ان صوبوں میں مسلم ایسوسی ایشن MUSLIM ASSOCIATION. بنائی جائیں اور حکومت کی طرف سے نامزدگی کا طریقہ صرف ایسی جگہ ہونا چاہیے جہاں پہلے کے دونوں طریقوں پر عمل نہ کیا جاسکے اور یہ لوکل گورنمنٹوں کا کام ہوگا کہ وہ مسلمان لیڈروں سے مشورہ کرکے یہ بات طے کریں کہ کونسا طریقہ اختیار کیا جائے“

حضور والا۔ آپ کے مراسلہ کے متذکرہ بالا اصول سے مسلمان قوم بالکل مطمئن تھی چوں کہ اس میں مسلمانوں کے لئے انتخاب جداگانہ کی ضرورت کو محسوس کیا گیا تھا اور تناسب تعداد سے زیادہ حق نمایندگی کا اعادہ تھا، لیکن بعد کو وزیر ہند کا جو مراسلہ آیا اس میں انتخابی حلقوں اور مشترکہ انتخاب کا اصول درج تھا،

مسلمانان ہند نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ذریعہ سے اس اصول کے خلاف احتجاج کیا اور جو اصول یعنی مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا حضور والا کے مراسلہ میں تھا اس کا مطالبہ کیا اور اس مقصد کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کی شاخ لندن کے صدر سید امیر علی لارڈ مارلے کی خدمت میں ایک وفد لے کر گئے جس کی ملاقات کے بعد لارڈ موصوف نے ایوان عام میں گذشتہ ۲۳ فروری کو جبکہ انڈین کونسل میں (ہندوستانی کونسلوں کا مسودہ قانون) کی دوسری خواندگی ہو رہی تھی حسب ذیل بیان دیا کہ:-

”مسلمان کونسلوں اور دیگر انتخابی اداروں میں اپنے نمایندوں کا انتخاب اسی

طرح طلب کرتے ہیں جیسا کہ ساعیرس میں ہوتا ہے جہاں میرا خیال ہے کہ مسلمان ہی
مسلمان کو ووٹ دیتے ہیں...... نیز یہ کہ وہ متناسب تعداد سے زیادہ نشستیں
چاہتے ہیں ہم ان دونوں مطالبوں کو پورا کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

مسلمانوں سے جداگانہ انتخاب کا اور متناسب تعداد سے زیادہ نمایندگی دینے کا جو وعدہ
کیا گیا تھا اس کی مسٹر لنکاٹن نے بھی اپنے بیان سے تصدیق کی اور کہا "ہم اپنے وعدہ سے
پیچھے نہیں ہٹ سکتے اور نہ ہٹنا چاہیئے اور نہ ہم میں جرات ہے کہ پیچھے ہٹیں۔"

اس پر مسلمان بہت خوش ہوئے تھے اور جا بجا جلسے کر کے حضور والا اور وزیر ہند کا
شکریہ ادا کیا گیا، چوں کہ آپ دونوں نے ان کے سچے مطالبات کو مان لیا تھا اور
یقین دلایا تھا کہ اس اصلاحی اسکیم میں ان کے حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے اور وہ انڈین کونسل
بل کے پاس ہونے کا بہ اطمینان انتظار کر رہے تھے جس میں حضور والا کی عاقلانہ اور
منصفانہ اصلاحی اسکیم کا نفاذ ہونے والا تھا مگر گذشتہ ۱۹ اپریل کو ایوان عام میں مسٹر
ہاب ہاؤس نے مسلمانوں کی نمایندگی کے متعلق جو طریقہ ریفارم اسکیم میں درج تھا اس
پر ایک بالکل صاف بیان دیا کہ "میونسپلٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور صوبجاتی
کونسلوں میں سب فرقے مشترکہ ووٹ دیں گے اس سے مسلمانوں کی نمایندگی کچھ
حد تک کم ہوگی اس لئے مسلمانوں کی کچھ نشستیں مخصوص کر دی جائیں گی جن کو وہ پُر کریں
گے اب چاہے وہ انتخاب، یا ایسوسی ایشن یا انتخابی حلقوں یا نامزدگی کے ذریعہ سے
کی جائیں۔ بہرحال مختلف صوبوں کی حالتوں اور اسباب کے لحاظ سے طریقہ اختیار کیا
جائے گا۔"

حضور والا میں مبالغہ نہیں کر رہا اور آپ یقین کریں کہ یہ تقریر ہمارے درمیان بم کی
طرح گری اور ہم تحفظ کا جو خواب دیکھ رہے تھے اس سے چونک پڑے اور جیسے کہ پہلے
حضور والا اور لارڈ مارلے کے وعدہ تحفظ کے شکریہ میں جلسے کئے گئے اسی طرح اب اس
ترمیم و تنسیخ کے خلاف احتجاجی جلسے ہوئے اور ہو رہے ہیں اور اس وقت مسلمان غم و غصہ
کے جذبات سے بھرے ہوئے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ مسٹر ہاب ہاؤس کا اعلان بر خلاف

آپ کے اور لارڈ مربیک، وعدوں کے جو جداگانہ انتخاب کے متعلق تھے مسلمانوں کے لئے مشترکہ انتخاب کے اصول کی تصدیق کرنا ہے اور حقیقتاً ان کے لئے کوئی اور نتیجہ اخذ کرنا بھی بہت مشکل ہے اور ان کے جذبات غم و غصہ ابھی فرو نہیں ہوئے ہیں۔

حضور والا! باوجود اس اعلان کے جو حکومت ہند نے ۲۲ر اپریل کو شائع کیا جس میں بطور تشریح درج تھا کہ" اگر نامزدگی سے کم از کم نمائندگی زیادہ سے زیادہ ہو جاوے بایں صورت کہ انتخابی نشستیں اُن کو متناسب طور پر حاصل نہوں تو حکومت ہند اس توازن کو درست کر سکتی ہے کہ وہ اس قسم کی عدم مساوات کی خواہاں نہیں "

اس تشریح سے یہی مطلب لیا جا رہا ہے کہ مسٹر ہاب ہاؤس نے جو اصول مسلمانوں کے لئے مشترکہ انتخاب کا پیش کیا ہے وہ اس کی ضروری حمایت میں ہے، اس اصول کے ماتحت جو نمائندے منتخب ہوں گے وہ مسلمانوں کے نمائندے نہیں کہے جا سکتے، کیونکہ ہندو اکثریت اُنھیں کو منتخب کرے گی جو ان کے مطلب کے ہوں گے "

اس کے بعد ۲۲ر اپریل کو ایک اعلان شائع کیا گیا " کہ حکومت ہند کا ارادہ ہے کہ جو تجاویز اُس نے مسلمانوں کی نمائندگی کے متعلق ابتدا میں کی تھیں ان پر عمل کرے گی " مگر ساتھ ہی یہ ریمارک بھی ہے کہ " وہ بالکل وہی ہیں جو کہ مسٹر ہاب ہاؤس کی ہیں " حضور والا! میں مودبانہ عرض کرونگا کہ مجھے اس نظریہ سے کلّی اختلاف ہے کہ جو اسکیم گذشتہ ۱۱ر اکتوبر کو آپ کے مراسلہ میں پیش کی گئی تھی وہ ہاب ہاؤس کی اسکیم ۱۹ر اپریل کی مطابقت میں تھی، حضور والا کی اسکیم میں مسلمانوں کی جداگانہ نیابت کی تائید کی گئی تھی (اسی لئے مسلمانوں نے باطمینان اس کو قبول کیا) لیکن مسٹر ہاب ہاؤس نے صاف کہہ دیا کہ " جزوی طریقہ پر مسلمانوں کے لئے مشترکہ انتخاب کو رکھا جائے "

اس دوسرے اعلان کے بعد مسٹر ہاب ہاؤس نے (۲۶ر اپریل کو ایوان عام میں) بیان کیا ہے کہ " جہاں ممکن ہوگا مسلمانوں کے جداگانہ نمائندگی کی بنا پر انتخابات ہوں گے لیکن رسم و رواج " روایات اور معاشرتی طریقوں کے اختلاف کی بنا پر انتخاب جداگانہ کے اصول " کو ایک خاص طریقہ پر چلانا بہت دشوار ہو گیا ہے، یہ مشکلات ضرور نہیں کہ مستقل

لازمی ہوں اور حکومت ہند اور ہوم گورنمنٹ ہر کوشش کریں گی کہ اگر ان کے وعدوں کے ایفا میں کوئی چیز حائل ہو تو اُس کو ہٹائیں ۔"

حضور والا! ان باتوں نے تو مجھے اور الجھن میں ڈال دیا ہے اور سمجھوتے کے لئے کوئی راستہ بھی تلاش کرنا دشوار ہے اور میں بہ وثوق کہہ سکتا ہوں کہ اس دور میں اس اصلاحی اسکیم کے ماتحت مسلمانوں میں اپنے تحفظ حقوق کے سوال اور خاص کر انتخاب جداگانہ کے معاملہ سے بہت بے چینی ہے، اُن کو اندیشہ ہے کہ ان کے ساتھ ایک بڑی غلطی کی جانے والی ہے اور جس بے انصافی کے وہ اہل نہیں اور نہ اُنہوں نے کبھی اس کا خیال کیا وہ ان کے ساتھ کی جائے گی ۔ اس بات سے وہ سخت مایوس ہو چکے ہیں، وہ سیاست داں نہیں اور نہ ڈپلومیسی کی باتیں سمجھتے ہیں، وہ صابر وفادار اور خدا پرست ہیں اس لئے حکومت نے جو وعدے کئے اُنہوں نے ان پر اعتماد کیا اور اب وہ ان کی تصدیق چاہتے ہیں جب کہ ان کا ایفا کا وقت ہے۔

حضور والا! وہ تصدیق کیا ہے، میں بہ ادب کہوں گا کہ حکومت ہند کی طرف سے ایک سادہ اور کھلا بیان جس میں وہ اپنے ارادوں کا سچا اور صاف اظہار کر دے جو کہ وہ اس ریفارم اسکیم میں ان کے متعلق رکھتی ہے، ملک کی مختلف کونسلوں میں مسلمانوں کی نمایندگی کا فیصلہ ہو جانا چاہیئے اور میں حضور والا سے پھر مودبانہ التماس کروں گا کہ آپ ایسا بیان شائع کریں اور مجھے یقین ہے کہ حضور والا میری نمایندگی پر توجہ کریں گے اور میں متیقن ہوں کہ جو وعدے وزیر ہند نے آپ کے نظریہ کی مطابقت میں کئے تھے یعنی مسلمانوں کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا اور ان کا مطالبہ انتخاب جداگانہ نیز زیادتی نمایندگی بغیر لحاظ تناسب تعداد کو اس بیان میں شامل کیا جائے گا ۔"

یہ میمورینڈم مسلمانوں کی رائے عامہ کا ایک شفاف آئینہ تھا اور اس کی تائید میں ہر حصہ ہند سے وئسرائے کے پاس بکثرت تار بھیجے گئے مگر اس ہم آہنگی میں ایک بہت ہی قلیل گروہ ایسا نمودار ہوا جس نے ہندوؤں کے جلسوں میں ان رزولیوشنوں کی تائید کی جو اُن مطالبات کے برخلاف تھے، ایسے ہی اشخاص نے اخبارات میں بھی

مضامین تحریر کئے ؛

سر سید علی امام نے بھی جو ابھی تک مسلم لیگ کے ہم نوا تھے اپنی رائے بدل دی اور بہار کی مقامی شاخ مسلم لیگ میں اس مضمون کا رزولیوشن بھی پاس کرا لیا جس کی رو سے کچھ جداگانہ اور کچھ مشترک انتخاب تھا ساتھ ہی ایک طویل بیان بھی اخبارات میں شائع کرایا ان حالات میں یہ خطرہ تھا کہ مبادا مسلمانوں کی یک جہتی اور اتحاد رائے میں انتشار پیدا ہو لہٰذا نواب وقار الملک نے اس مسئلہ پر اخبارات میں اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا جو گویا سر سید علی امام کا جواب تھا۔

انہوں نے پہلے مضمون میں اس گروہ کی مفروضہ باتوں کا جواب دیا اور پھر ہندوؤں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنے پر زور دیتے ہوئے لکھا کہ :

"ہمارے ہندو دوست ہمارے ہمسایہ ہیں اور ہم کو اپنے مذہب کے مطابق ان کے ساتھ کامل ہمدردی اور سلوک کے ساتھ بسر کرنا چاہیئے۔ اور چوں کہ میری ذاتی رائے ہے کہ مسلمان اگر مشترک انتخاب میں شریک ہوں گے تو ان میں اور ہندوؤں میں جھگڑے اور قضیے پیدا ہوں گے اور ہمارے قدیمی تعلقات میں ان کی وجہ سے خرابی پیدا ہوگی۔ لہٰذا میں مشترک انتخاب میں مسلمانوں کو شریک ہونے کی صلاح نہیں دے سکتا . . . .

اب اس مسئلہ کو ایک دوسری نگاہ سے بھی دیکھنا چاہیئے۔ مشترک انتخاب میں ہم نے اپنے آپکو شریک کیا تو آیا ہمکو اس میں کوئی کامیابی ہوگی؟ میں نہایت زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ ناکامیابی یقینی ہے اور ذلت و رسوائی مزید برآں مشترک انتخاب کے وقت ظاہر ہے۔ اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ مجارٹی ہندوؤں کی ہوگی ہم کتنی ہی دوڑ دھوپ کریں۔ اور جنکے سامنے ہم کبھی اپنی ذاتی حاجت پیش کرنا نہ چاہتے تھے انکے دروازے پر بار دوڑے جاویں، اور ہمارے کارندے اور عزیز انکی خوشامد و منت کریں۔ مگر ہم ہندوؤں کی مجارٹی پر غالب نہ آسکیں گے۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ناکامیاب ہوں گے اور دست گدائی دراز کرنے کی ذلت و رسوائی جو حاصل ہوگی وہ اس پر مستزاد۔

اور اگر کسی مقام پر کوئی کامیابی ہوئی بھی تو وہ ہماری کوششوں کی وجہ سے نہ ہوگی۔ بلکہ وہ دوسرے غالب گروہ کی محض مہربانی کی وجہ سے ہوگی جس کی نسبت کیا خوب کہا گیا ہے ؎

حقّا کہ با عقوبت دوزخ برابر است رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

اور پھر وہ مہربانی معلوم نہیں کہ کس قسم کے معاوضوں اور اقراروں پر مبنی ہوگی اور اس کے بدل میں کس کس مضمون کے خطوط غلامی تحریر ہوں گے، اور کس کس قسم کے اقرار کئے جاویں گے۔ اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ نیشنل کانگریس بعض مسلمانوں کو اپنی پریسیڈنسی کے عہدہ تک سے سرفراز فرماتی ہے۔ لیکن پھر کیا وہ مسلمان بزرگوار مسلمانوں کے کسی کام کے ہوتے ہیں؟ ہمارے وہ ایک دفتری کام کے بھی نہیں ہوتے۔ اس طرح اگر اپنی قوم کی اور اپنے قومی حقوق کی قربانی کر کے کسی نے کوئی ممبری حاصل بھی کی تو ایسی ممبری انہیں کو مبارک رہے۔ قوم کو ان سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ بلکہ ایسے ممبر قوم کے حق میں بعض اوقات سخت مضرت کا موجب ہوں گے چوں کہ جب وہ ظاہر میں مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ کونسل میں نشست کریں اور ووٹ وہ دیں جو مسلمانوں کے قومی حقوق کو پامال کرنے والا ہو، تو ایسے ووٹوں سے مسلمانوں کو بہ نسبت خالص ہندو صاحبوں کے بہت زیادہ نقصان پہونچ جاویگا۔

جن مقامات میں مردم شماری میں مسلمان بہ نسبت ہندوؤں کے زیادہ ہیں۔ کیا وہاں ہم ہندوؤں سے بازی لیجا دینگے آج کے زمانہ میں تو یہ خیال بھی قریباً قریباً صحیح ثابت ہونا مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں کوئی فوج اپنی کثرت تعداد کے لحاظ سے غلبہ نہیں پا سکتی، آج فتح حاصل کرنے کے لئے عمدہ ترین اسلحہ اور سامان کی ضرورت ہوتی ہے اور اس زمانہ کی سلاح جنگ میں اعلیٰ تعلیم ہے۔ دولت ہے پولیٹیکل قوت اور اتحاد ہے اور جد و جہد ہے۔ اور ان سب باتوں میں ہم اپنے دوسرے گروہ سے بہت زیادہ کم ہیں۔ لہٰذا کوئی امید نہیں کہ صرف ہماری مردم شماری ان مقامات میں بھی ہم کو کچھ مدد دے سکے؛

گورنمنٹ کی پالیسی اب یہ ہے کہ کونسل ہائے قانون کی ممبریوں کے متعلق ایک حصہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے مشترک بھی چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ دونوں گروہ صلح سے

یا جنگ سے جس طرح مناسب سمجھیں، اپنی اپنی کامیابی کے لئے کوشش کریں۔ اس پالیسی
سے گورنمنٹ کو ایک فائدہ تو یہ ہو گیا ہے کہ ہندوؤں کا کثیر گروہ جو گورنمنٹ سے یہ شکایت
کرتا تھا کہ مسلمانوں کو مردم شماری سے زیادہ جو کچھ ان کی پولیٹیکل عظمت کے لحاظ سے
دینا تجویز کیا گیا وہ انکے نزدیک خلاف انصاف ہے اب اس شکایت کے جواب میں
بجائے اس کے کہ نہایت مضبوط اور صاف آواز سے کہہ دیا جاتا کہ گورنمنٹ کا یہ فیصلہ
واقعات و واجبیت پر مبنی ہے۔ اب ان شکایت کرنے والوں کو یہ کہکر مطمئن اور ساکت
کر دیا جاوے گا کہ مسلمانوں کا وہ زائد حصہ اب تمہاری ہی مجارٹی کے اختیار میں ہے
چاہے انکو دو یا نہ دو تم جانو اور تمہارا کام جانے۔۔۔۔۔

خیر وجہ کچھ ہی ہوں گورنمنٹ نے جب یہ پالیسی اختیار کر لی ہے کہ ملک میں ایک
حصہ مشترک انتخاب کا بھی قائم رکھا جائے تو اب افسران گورنمنٹ کی طرف سے بھی یہ
لازمی امر ہے کہ وہ کم از کم درپردہ اس بات کی سعی کریں کہ ہندو اور مسلمان دونوں مشترک
انتخاب میں شریک ہوں۔ جہاں تک ہندوؤں کا اس سے تعلق ہے وہاں تک چونکہ
مجارٹی اُن کی ہے، لہذا ان کی نسبت مجارٹی کا لفظ ایک فرضی لفظ ہے، دراصل جہاں
تک اشتراک اور عدم اشتراک سے بحث ہو سکتی ہے وہ مسلمانوں ہی سے متعلق ہے
مسلمان رؤسا امرا کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جنہوں نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے یا انکی خداداد
دماغی قوت نے انکو ضروریات زمانہ سے بخوبی آگاہ کر دیا ہے۔ اور وہ عزت کے اصل
مفہوم کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہیں اور دوسرے پرانی وضع قطع کے نئے تعلیم یافتہ حضرات
ان میں سے اول الذکر تو گورنمنٹ سے صاف صاف ملک کی موجودہ حالتوں اور
ضرورتوں کو بیان کرکے مشترک انتخاب سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھیں گے مگر اس
گروہ کی تعداد بھی بہت کم ہے اور دوسرا گروہ جنکی تعداد بھی زیادہ ہے انکو گورنمنٹ
کے اعلیٰ افسران کے ایما سے گریز کرنا ناممکن کے قریب ہوگا اور گو وہ اپنے دل میں
کیسا ہی پیچ و تاب کھائیں اور مشترکہ مقابلہ کی مشکلات اور ادنےٰ ادنےٰ لوگوں کے سامنے
التجا لیجانے کو وہ کیسا ہی معیوب اور اپنے قدیمی وضع کے خلاف سمجھیں لیکن طوعاً و

کرنا اُنکو مشترک انتخاب میں شریک ہونا پڑے گا۔ نتیجہ یہ ہے اگر وہ کامیاب ہوئے تو مختلف قسم کے ایسے اسباب پر مبنی ہوگا جسکو اول الذکر گروہ برداشت نہ کرسکتا تھا۔ اور نہ گورنمنٹ دوسرے طریقہ سے اُن کی اشک شوئی کریگی اور اُن کو عزتوں سے سرفراز کرے گی جن کو وہ گروہ غلطی سے عزت سمجھے ہوئے ہے۔ اس دوسرے گروہ کی نسبت میں بلا تامل یہ کہوں گا کہ چاہے مقابلہ کے وقت اُنکو کیسی ہی ندامت برداشت کرنی پڑی ہو لیکن ان کی خیرخواہی اور وفاداری میں جس کو گورنمنٹ وفاداری سمجھتی ہے اس ناکامی کی وجہ سے کوئی فرق نہ آئے گا اور وہ گورنمنٹ کے ایسے ہی خیرخواہ اور وفادار رہیں گے جیسے کہ پہلے تھے؛

لیکن اوّل الذکر تعلیم یافتہ مسلمان گروہ میں سے اگر کوئی مشترک انتخاب کا حامی بنا تو اُس کی حالت بالکل دوسری ہوگی۔ امارت اور بڑی بڑی تعلقہ داریوں اور زمینداریوں سے قطع نظر کرکے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان گریجوئیٹوں میں سے اگر کسی نے یہ رائے قائم کی کہ مشترک انتخاب میں حصہ لینا ملک کے لئے مفید ہے تو اس قسم کے اہل الرائے سے جو گروہ بنے گا وہ ایک ایسا گروہ ہوگا جس کی قوت کو آخرالامر گورنمنٹ اس خوشی اور اطمینان سے نہ دیکھ سکے گی۔ جس طرح کہ آج دیکھتی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص اپنی یہ رائے اُسی وقت قائم کرے گا جب کہ یا تو وہ کانگریس کا مرید بن چکا ہے یا وہ ملکی محبت میں اس درجہ سرشار ہوگیا ہے جس نے قوم قوم کی صدا کو اپنے لئے موجب ننگ سمجھ لیا ہے اور "بندہ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم" اس کی رگ و پے میں سرایت کرچکا ہے۔ وہ صرف اس زاد بوم کی آزادی چاہتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے گو کہ اس کی قوم پامال ہی کیوں نہ ہو جائے'' (انتہیٰ)

یہ زمانہ ایک عجیب کشمکش کا رہا مخالفین کی جانب سے ایسی کوششیں مسلسل جاری رہیں کہ جو مسلمانوں کی خواہشوں کے برخلاف تھیں اور ویسرائے کے ایک تار کے کچھ الفاظ سے بھی یہہ مفہوم لیا جانے لگا کہ گورنمنٹ کا یہہ ارادہ نہیں ہے کہ ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں میں مسلمانوں کو جداگانہ حق انتخاب دیا جائے مگر ۲۱ ر جولائی کی چھٹی سکریٹری ہوم ڈپارٹمنٹ سے یہ غلط فہمی رفع ہوگئی اس سے

لوکل سیلف گورنمنٹ جماعتوں کے متعلق تو اطمینان ہوگیا لیکن کونسلوں کے انتخابات کے بارے میں جو وعدے کئے گئے تھے اُن سے منحرف ہونے کی اطلاع سے ایک بے چینی پیدا ہوگئی اور لیگ اور اُس کی تمام شاخوں نے ہندوستان کے ہر حصہ میں اس مضمون کی تجاویز پاس کیں کہ جب تک مسلمانوں کو بالکل جُدا انتخابات کے ذریعہ سے اور ان کی پولیٹیکل اعتبار سے نشستیں نہ ملیں گی، تو ہندوستان کے مسلمانوں کی نیابت مکمل نہیں ہوگی اور اگر اسکیم کی آخری منظوری میں وہ وعدے پورے طور پر لفظاً و معناً ایفا نہ ہوئے جو گورنمنٹ نے کئے ہیں تو ریفارم اسکیم بالکل ہی ناکام رہے گی۔

لہذا لیگ نے بھی ۴ ستمبر کو پھر ایک مفصل و مدلل میمورنڈم وزیر ہند کی خدمت میں پیش کیا اور آخر میں اس امر پر زور دیا کہ جداگانہ انتخاب اور تعداد سے زیادہ قائم مقامی کی نسبت جو وعدے ہوئے ہیں لفظاً و معناً پورے کئے جائیں۔

اگرچہ عام طور پر ہندو سیاسیین ان مطالبات سے مخالفت کر رہے تھے مگر بعض اصحاب نے مثلاً ہندو کانفرنس پنجاب کے پریسیڈنٹ سر پرتول چندر چٹرجی نے نہایت صفائی سے اپنی تائیدی رائے کا اظہار کیا آنریبل سر (لارڈ) سنہا نے بحیثیت پریسیڈنٹ بھاگلپور کانفرنس کہا کہ:-

"میری پختہ رائے ہے کہ مسلمانوں کو علیحدہ حق انتخاب ملنا چاہیے جو ہر صوبہ اور تمام ملک میں ان کی آبادی اور ان کے اثر اور ان کی اہمیت کے لحاظ سے کافی اور مناسب ہو"

ان کے علاوہ سر فیروز شاہ مہتہ مشہور کانگریسی لیڈر بھی موئید تھے۔

یہ اسکیم تمام مراحل سے گذر کر ۱۵ نومبر کو غیر معمولی گزٹ میں شائع ہوگئی اور انڈین کونسلز ایکٹ ۱۹۰۹ء نافذ ہوگیا اور توسیع شدہ کونسلوں کے قواعد و ضوابط بھی مرتب ہوگئے، جماعت ہائے پیشہ ور، زمیندار، یوروپین، ہندوستانی تجار اور مسلمانوں کی قائم مقامی کے خاص قواعد ترتیب دے گئے، لیکن مسلمانوں کے مطالبات کی حکومت کے مواعید اور دیگر معترض جماعتوں کے مابین ایک سمجھوتہ کی سی شکل رکھی گئی، ان کو امپیریل کونسل

میں صرف (۸) نشستیں دی گئیں، اور اس میں صوبجات شمال اور مغرب، بلوچستان پنجاب اور ممالک متوسط کو اپنے قائمقام منتخب کرنے کا حق نہیں ملا۔ پنجاب کو تو صوبہ کی کونسل میں بھی جداگانہ قائمقامی نہیں دی گئی نہ برما میں مسلمانوں کی کوئی نشست مخصوص کی گئی، گویا جو صاف و صریح وعدے کئے گئے تھے اُن کو مکمل طور پر ایفا نہیں کیا گیا۔ بہرحال یہ جدید کونسلیں جنوری ۱۹۱۰ء سے قائم کی گئیں۔

باب چہارم

گذشتہ صدی کے اواخر میں مسٹر تلک نے مسلمانوں سے نفرت کا جو بیج بویا تھا وہ بہت جلد ایک پودا بن گیا اور ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال نے اس کی جڑوں کو مضبوط کر دیا پھر ۱۹۰۶ء میں اس کو شملہ ڈیپوٹیشن کی کامیابی نے مزید قوت پہنچائی مگر ہندو سیاسیین کا ایک طبقہ تھا جو ہندو مسلم اتحاد کو سیاسی ترقی کے لئے نہایت ضروری تصور کرتا تھا، چنانچہ آنریبل مسٹر گوکھلے نے جو اس وقت کے زبردست لیڈر تھے ۱۹۰۷ء میں باہمی اتحاد کے لئے ایک دورہ کیا۔ لکھنؤ علیگڈھ میں اُنکی زبردست تقریریں ہوئیں، ایک تقریر میں اُنہوں نے اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا کہ چونکہ مسلمانوں کا گروہ تعداد میں ہندوؤں سے کم ہے لہذا ان کو خوف ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم انگریزوں کی حکومت سے نکلکر ہندوؤں کی حکومت میں آجائیں، یہ خیال ایسا نہیں کہ اسکو مذاق میں اُڑا دیا جائے جو حالت بلحاظ مردم شماری وغیرہ اس وقت مسلمانوں کی ہے اگر یہی حالت ہندوؤں کی ہوتی تو کیا عجب ہے کہ یہی اعتراض ہمارے دلوں میں خطور کرتا اور ہم بھی اس خیال کو پیش نظر رکھتے اور اسی پالیسی پر عمل کرنے کو تیار ہوتے جس پر کہ اس وقت مسلمان عمل کر رہے ہیں۔

نواب محسن الملک نے بھی ایک دعوت میں مسٹر گوکھلے کے جام صحت کی تجویز

پر تائیدی تقریر میں ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر اظہار خیال کیا، اور مغربی تعلیم سے قبل ہندو مسلمانوں کی یگانگی اور اتحاد کے تذکرہ کے بعد کہا کہ:-

"لیکن جب سے مغربی تعلیم ہندوستان میں پھیلی ہے روز بروز اختلاف بلکہ مخالفت پیدا ہوتی جاتی ہے اور دوستی کی جگہ باہمی نفرت بڑھتی جاتی ہے اتحاد و ارتباط کی خوبی اور ضرورت پر بڑے بڑے لکچر دیئے جاتے ہیں بہت پر جوش تقریریں کی جاتی ہیں میں نہیں سمجھتا کہ یہ مقصد فصیح و بلیغ لیکچروں کے دینے اور اتحاد و ارتباط کی خوبی پر پُر زور تقریریں کرنے سے حاصل ہوگا جب تک کہنے والے خود ان باتوں کو دور نہ کریں جو باعث اختلاف اور ذریعۂ مخالفت ہیں، میں دیکھتا ہوں کہ جو غار ہندو اور مسلمانوں کے بیچ میں حائل ہے، بعض نیک دل اور ملک دوست اسپرٹیں باندھنے اور اس کو ہموار کرنے کی ضرورت سمجھتے ہیں اور اس کے لئے نصیحت کرتے ہیں مگر افسوس ہے کہ روز بروز وہ غار زیادہ گہرا زیادہ چوڑا ہوتا جاتا ہے۔ زبان سے کہا جاتا ہے کہ اینٹ لاؤ چونہ لاؤ اور اس غار کو برابر کرو مگر ہاتھ میں پھاوڑے اور کدال ہیں اور بجائے بھرنے کے وہ غار اور وسیع و عمیق کیا جاتا ہے، ......

اُن لوگوں کو جو درحقیقت اتحاد کے خواہاں ہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اس مہلک بیماری کا علاج زبان سے نہیں ہو سکتا بلکہ ہاتھ سے، یہ اختلاف پلیٹ فارم میں فصیح و بلیغ لیکچر دینے سے دور نہیں ہو سکتا، بلکہ وجوہ اختلاف پر غور کرنے اور اُس کے دفع کرنے کی تدبیروں کے عمل میں لانے سے ہو سکتا ہے۔"

اس کے بعد اُنھوں نے تمثیلاً صوبہ متحدہ میں اُردو کے مٹانے کی جو کوششیں مدعیان اتحاد کی طرف سے ہو رہی تھیں اُنکو بیان کرکے کہا کہ:-

"آپ فرمائیے کہ اگر اتحاد کے وعظ کہنے والے یہ چاہیں کہ ہم اُن کی کوشش کا مقابلہ نہ کریں اور اپنی زبان کے قائم رکھنے کے لئے بھی اُن کے حملوں کو دفع

نہ کریں، اور اگر ایسا کریں تو ہم اتحاد کے دشمن اور مخالفت کے پیدا کرنے والے سمجھے جاویں، تو اس میں قصور ہمارا ہے یا ہمارے دوستوں کا ایسا اتحاد تو وہی شخص چاہے گا جو اپنے قومیت کی مخصوص علامت کے ترک کرنے کی پروا نہ کرے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اپنی قوم کو دوسری قوم میں جذب ہوجانے کو اتحاد سمجھے ہم اسکو اتحاد نہیں سمجھتے۔"

پھر دونوں اقوام میں نااتفاقی کی ترقی پذیر حالت کا بیان کرکے اتحاد کی تدبیر یہ بتلائی کہ:۔

"ایسی حالت میں ایک دو نیک دل اور راست باز ہندو مسلمانوں کے روکنے اور سمجھانے سے کیا ہوسکتا ہے، پھر جو لوگ سمجھاتے ہیں وہ دوسری قوم کو نہ اپنی قوم کو حالانکہ سمجھانا چاہیئے اپنی قوم کو اور ہر قوم کے لیڈر کو اپنا رسوخ اور اپنا اثر ڈالنا چاہیئے اپنے ہی ہم قوم پر تاکہ اُسکے دل پر نصیحت کا اثر ہو اور اُس کے سمجھانے سے کچھ فائدہ حاصل ہو مسلمان لیڈروں کو چاہیئے کہ وہ اپنی قوم کو ان باتوں کے کرنے سے روکنے کی کوشش کریں جن میں ان کا کوئی بڑا مذہبی یا قومی نقصان نہ ہو اور جن کے کرنے سے اُن کے ہموطن ہندو بھائیوں کو رنج ہوتا ہو۔ اسی طرح ہندو لیڈروں پر لازم ہے کہ وہ اپنی قوم کو نصیحت کریں کہ جو کام اُن کے لئے بہت سخت نقصان پہنچانے والے نہ ہوں اور مسلمانوں کو اس سے فائدہ ہو۔ اس میں مسلمانوں کی مدد کریں مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا کہ مسلمان ہندوؤں کو اور ہندو مسلمانوں کو ہدایت اور نصیحت کریں اور صرف اپنے اپنے فائدوں ہی کا خیال رکھیں۔"

آخر تقریر میں اُنہوں نے اپنا یقین ظاہر کیا کہ:۔

"باہمی اتحاد کی جو کوشش مسٹر گوکھلے کرتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہونگی اور ہر ایک نیک دل مسلمان ان کی کوششوں میں مدد دے گا اور ہندو بھائی مسلمانوں کی طرف ایک انچ بڑھینگے تو مسلمان دو گز بڑھکر ان کا خیر مقدم

کریں گے۔"

مگر یہ کوشش بے نتیجہ رہی بلکہ ۱۹۰۹ء کی منٹو مارلے ریفارم اسکیم میں مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لینے اور اسی اصول کے تحت میں ان کو چند نشستوں کے مل جانے سے اور زیادہ اشتعال ہو گیا چنانچہ اسی سال کانگریس سشن میں جہاں تقسیم بنگال موضوع مخالفت تھا وہاں ریفارم اسکیم کے نقائص پر بحث کے ساتھ بر بنائے مذہب جداگانہ انتخابی حلقوں کے قیام اور مسلمانوں کے ساتھ جزوی مراعات پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا لیکن مسلم لیگ بھی روز بروز طاقتور ہوتی جاتی تھی اور عام ملکی مفاد کا جہاں تک تعلق تھا اس میں اور کانگریس میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

لیگ کے دوسرے سالانہ اجلاس میں ہی صدر نے صاف طور پر اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ عدالتی اور انتظامی اختیارات کی علیحدگی ان قوانین کے منسوخ ہونے کی خواہش جو ہندوستانیوں کے لئے باعث ذلت ہیں ابتدائی تعلیم کی ترقی حفظان صحت کی تجاویز۔ ہندوستان کے تمام گروہوں کے باشندوں کا سرکاری ملازمت سے اعلےٰ محکموں میں بہت زیادہ تعداد میں داخل کیا جانا۔ مقامی سیلف گورنمنٹ کے معاملات میں سرکاری مداخلت کا جاری نہ رہنا فوجی اخراجات میں بغیر اس بات کے کہ فوج کی عمدگی خطرہ میں ڈالی جائے معقول تخفیف ہونا، ہندوستان کی جنگی قوموں کو والنٹیر بننے کی اجازت ملنا ہندوستانیوں کو فوج میں کمیشن دیا جانا ہوم چارجز کا باقاعدہ موازنہ کیا جانا دیہاتی پنچایتوں کو چھوٹے چھوٹے دیوانی اور فوجداری مقدمات کے فیصل کرنے کا اختیار عطا ہونا۔ ملکی صنعت وحرفت کی حفاظت کرنا اور اسکو ترقی دینا حاکموں اور محکوموں کے درمیان اخلاقی تعلقات کا اصلاح پر لانا۔ یہ ہیں وہ عام اغراض جن کا تعلق ہندوستان کے تمام گروہوں سے ہے میں اس الزام سے انکار کرتا ہوں کہ ہندوستانی مسلمان ان اصلاحات پر عمل کرنے میں اتفاق کی قدر وقیمت نہیں جانتے اور ان میں سرکاری ناپسندیدگی کا مقابلہ کرنے کی جرات نہیں ہے۔

اسی ضمن میں دیگر اکابر لیگ نے جو خیالات ظاہر کئے تھے وہ بھی نہایت اہم تھے

اور پھر اس اجلاس میں ملکی مفادات کے متعلق تمام رہنماؤں نے باہمی اتحاد اور اشتراک پر زور دیا۔
۱۹۱۱ء میں حالات بہت نازک ہوگئے تقسیم بنگال کا ایجی ٹیشن کانگریس کی حمایت میں جاری تھا اور مذہبی
مخالفت بڑھ رہی تھی اس سال کانگریس کی صدارت پر سر ڈبلیو ویڈربرن کا انتخاب ہوا تھا انھوں نے اور ہز ہائنس
سر آغا خاں نے انگلستان میں ہی ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا اور ایک اتحاد کانفرنس قائم کرنے کی تجویز
کی چنانچہ الہ آباد میں اس کا انعقاد ہوا چالیس مسلمان اور ساٹھ ہندو سیاسئین مجتمع ہوئے
جن میں سر سریندر ناتھ بنرجی، مسٹر گوکھلے، سر سندر لال، پنڈت مدن موہن
مالویہ، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت موتی لال نہرو (لارڈ) سنہا، مہاراجہ دربھنگہ،
ہز ہائنس آغا خاں، نواب وقار الملک، سر ابراہیم رحمت اللہ، مسٹر محمد علی جناح
مسٹر حسن امام، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں قابل ذکر اکابر تھے۔

حسب ذیل امور برائے تصفیہ پیش کئے گئے اور اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی قائم
ہوگئی (۱) صلح کرنے والی پنچایتوں اور عدالتوں کا قیام (۲) مقدمہ بازی کو کم کرنے کی
کوشش (۳) طرفین سے بائیکاٹ کی بندش (۴) اس کوشش کو روکنا کہ ہندو یا
مسلمانوں کو کسی خاص محکمہ میں داخل ہونے سے روکا جائے (۵) اردو ہندی کا نزاع (۶)
میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مسلمانوں کے حق نیابت کو تسلیم کرنا (۷) شرح سود
کی کمی (۸) رہن شدہ جائدادوں کی جبریہ فروخت کا انسداد (۹) قومی تعلیم (۱۰) آریہ سماج
کی اشتعال انگیز تحریک (۱۱) گاؤکشی اور باجہ کے متعلق مسلمانوں اور ہندوؤں کی احتیاط
(۱۲) بوجہ اقلیت مسلمانان کسی ایسے مسئلہ پر زور دینا جو مسلم لیگ کی رائے میں مسلمانوں
کے لئے مفر ہو، پریسیڈنٹ نے ایک جوش انگیز تقریر کی ہز ہائنس سر آغا خاں نے مسلمانوں کی
جانب سے اور بابو سروداچرن متر نے ہندوؤں کی طرف سے تقریریں کیں اور مسائل
زیر غور پر نیک نیتی و فراغ دلی اور ہمدردی سے بحث کرنے کی ضرورت ذہن نشیں
کرائی گاؤکشی اور باجہ کے مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک مستند کمیٹی قائم ہوگئی لیکن
اس کمیٹی اور کانفرنس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا ایک زیر غور مسئلہ اردو اور ہندی کا بھی تھا،
مگر دوسری طرف ناگری پرچارنی سبھا کے جو عرصہ سے ناگری پرچار اور اردو کی مخالفت

کے لئے قائم تھی اپنی کوشش کو تیز کر رہی تھی اور اسی زمانہ میں مہاراجہ بڑودہ نے اس کے ایڈریس کے جواب میں ایک نہایت حوصلہ افزا تقریر بھی کی تھی اور ہنوز اس کانفرنس کی روئداد کی روشنائی بھی خشک نہ ہوئی تھی کہ یونائیٹیڈ پراونسنز کانفرنس کے اجلاس منعقدہ بریلی میں پنڈت بشن نرائن ور نے بحیثیت صدر جو ایڈریس کیا اس میں مسلمانوں کے جداگانہ نیابت کے اصول وحق پر نہایت سخت اعتراض کرتے ہوئے سرسید کی نسبت کوتاہ نظر پالیٹشن کے الفاظ بھی استعمال کئے جن سے مسلمان لیڈروں کو ہندو سیاسئین کی نیتوں پر جو شکوک تھے اور بھی قوی ہو گئے پھر بھی ور صاحب جب کانگریس کے صدر ہوئے تو انہوں نے اپنے ایڈریس میں اگرچہ ہندو مسلم کشیدگی کو زہر سے تعبیر کرتے ہوئے ہندوستان پر مسلمانوں کے احسانات اور تاریخ عالم میں ان کے کارہائے نمایاں کا اعتراف کیا اور یہ بھی کہا کہ ہندو مسلمانوں کے ہمیشہ خوشگوار تعلقات رہے ہیں اور سیاسی ماحول سے باہر اب بھی ہیں لیکن شملہ ڈیپوٹیشن اور حقوق نمائندگی پر نہایت تلخ بحث کے ساتھ مقامی اداروں میں قومی نمایندگی کی سخت مخالفت کی اور ہندو بھائیوں کے قیام کی درستی پر زور دیا۔

غرض ہندو سیاسئین کی اکثر جذبے کے ان ہی جذبات سے اتحاد کی یہ کوشش بار آور نہ ہو سکی۔

۱۸۹۳ء سے جو انقلابی تحریک شروع ہوئی اس میں روز بروز ترقی ہوتی رہی اور تقریباً ہر صوبہ میں سازشوں کا جال پھیلا دیا گیا اور خفیہ انجمنیں قائم ہوگئیں انگریز حکام پر قاتلانہ حملے کئے گئے لفٹنٹ گورنر مشرقی بنگال کی ٹرین اُلٹنے کی سازش کی گئی لارڈ منٹو پر بمب پھینکا گیا انگریزی مال کے مقاطعہ اور سودیشی کی تحریک وجود پذیر ہوئی بعض اخبارات نے بقول ایک جج کے "برطانوی قوم کے خلاف منافرت اور مغویانہ خیالات کی اشاعت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا"۔

ان تحریکوں کے انسداد کی غرض سے سخت قوانین نافذ کئے گئے، تمام قوموں سبھاؤں اور انجمنوں نے اظہار نفرت کیا۔

۱۹۰۹ء کے صدر کانگریس نے اپنے صدارتی ایڈریس میں کہا کہ:-

"کانگریس کی بنیاد برٹش راج کے ساتھ وفاداری کے لئے ڈالی گئی ہے جس سے ہمارا ملک خوش حال رہے۔ کانگریس نے کبھی یہ اجازت نہیں دی کہ ذرا سا شبہہ بھی انگریزی راج الٹ دئے جانے کا پیدا ہو"

یہ تحریکیں عموماً ہندوؤں میں تھیں باغیانہ لٹریچر کے مصنف خوفناک جرائم کے مرتکب اور سزا پانے والے اکثر ہندو ہی تھے، مسلمانوں نے اپنا دامن بالکل پاک و صاف رکھا کہ ہندو سیاسیین ان تحریکات پر تو نفرت کا اظہار کرتے مگر تقسیم بنگال کی تنسیخ پر بھی زور دینے اور کانگریس نے تو اس کو ایک اہم مسئلہ بنا لیا تھا، حکومت ہند اور حکومت انگلستان اس کو ایک طے شدہ مسئلہ کہتی تھی اور تنسیخ کا وہم و گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ لیکن بالآخر ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو دربار تاجپوشی میں ہز امپیریل مجسٹی کی زبان سے ہی اس اس کا اعلان ہوا۔ مشرقی و مغربی بنگال ملا دیئے گئے۔ بہاریوں کے مفاد میں بہار و اڑیسہ کا البتہ ایک جدید صوبہ بنا دیا گیا اس شاہی اعلان کا جو اثر ہندو سیاسیین پر ہوا اس کی جھلک صدر کانگریس کے ایڈریس میں یہ نظر آتی ہے کہ:-

"حضرات! آج ہم ایک بہت ہی مبارک موقع پر جمع ہوئے ہیں جبکہ بادشاہ سلامت اس شہر (کلکتہ) میں آنے والے ہیں۔ اور جس سے کہ کانگریس کا یہ جلسہ ایک یادگار جلسہ ہو جائیگا اس سے پہلے کہ میں سیاسی حالت پر تبصرہ کروں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ بلاشبہ ہم اور آپ سب صاف طور سے یہ دیکھتے ہیں کہ برطانوی راج کے اندر ہم کو لاتعداد نعمتیں حاصل ہیں اور خاص طور سے گزشتہ پچاس سال سے جبکہ ہندوستانی رعایا کا تاجدار برطانیہ کے ساتھ بالواسطہ تعلق رہا ہے اس وقت سے ہمکو بہت بڑے فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ انگریزوں کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہیں ان کے قابل مثال انصاف اور حق پرستی پر میرا ایمان ہے ہمیں اس راج میں آتنا امن و امان ملا ہے جو روم اور دیگر ممالک میں بھی نصیب نہ ہوا تھا اور اس قسم کا امن و امان

سوائے انگریزی راج کے دوسری جگہ نظر نہیں آتا اور عوام کی فلاح و بہبودی میں بہت خاص دلچسپی لیتے ہیں جیسا کہ قحط و طاعون کے زمانہ میں اس حکومت کے اقدامات سے پتہ چلتا ہے۔ اس لئے حکومت نے سب کو مذہبی آزادی دی اور ریل۔ تار۔ ڈاکخانہ اور ہزاروں طرح کی مشینیں ہم کو عطا کی ہیں جس سے ہمارا گذر ہو رہا ہے اور ہم ترقی کر رہے ہیں۔ سب سے بڑا تحفہ ہمکو تعلیم کا عطا کیا ہے۔ ہم کو وہ حکومت ملی ہے جس کی مثال وہ آپ خود ہی ہو سکتی ہے اور دنیا میں ایسی مثال نہیں مل سکتی اور خدا کا شکر ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں برطانوی راج کی رعایا ہوں۔ اور میں بے لاگ کہہ سکتا ہوں کہ گو انگلستان کی حکومت ہندوستان میں بہت کافی نقائص کی حامل ہے اور اس میں اصلاح کی ضرورت ہے مگر میری قوم کے لئے پھر بھی یہ خدا کا بہت بڑا عطیہ ہے۔ چونکہ انگلستان ہی ایک ایسا ملک ہے جو ان لوگوں پر حکومت کرنا جانتا ہے جن میں حکومت کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔ . . . .

باوجود ان سب خرابیوں کے برطانوی راج دن کی طرح صاف اور روشن ہے وہ امن اور ترقی علم اور آزادی کا نشان ہے اور ایک وعدہ اور ایک ضمانت ہے۔ اس کو کمزور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم مسئلہ تہذیب کو کمزور کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عطیہ ہے جس کے لئے نہ صرف بنگال بلکہ تمام ہندوستان حضور شہنشاہ کا احسان مند ہے۔ چوں کہ بنگال کا مسئلہ تمام ہندوستان کا مسئلہ ہے اور اس کی فتح پرسٹیج (وقار) کے اوپر انصاف کی فتح ہے اور اس نے ہمارے یقین کو اور بھی مضبوط کر دیا ہے کہ اگر برطانوی راج کے اندر وفادارانہ اور قانونی اسپرٹ میں قانونی ایجی ٹیشن کیا جاوے تو وہ ضرور کامیاب ہوگا . . . . . . تمام سوچنے سمجھنے والے برطانوی راج کو خدا کی جانب سے سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ اس لئے ہے کہ ان کی سیاسی و اخلاقی اور مادی سطح کو بلند کر دے۔ ایک اور سیاسی لیڈر مسٹر امبکا چرن موزمدار کے تاثرات یہ تھے کہ:۔

ہر شخص کا دل برطانوی تاج کی وفاداری اور عزت کی خوشی میں رقص کر رہا ہے اور برطانوی سیاست کی انصاف پسندی سے لبریز ہے اور ہم بعض تاریک اور مایوس ترین ایام میں بھی برطانوی انصاف کے عقیدہ سے متزلزل نہیں ہوئے۔"

مگر دوسری جانب یہ اعلان شاہی مسلمانوں کے قلوب پر بجلی بنکر گرا ان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی نواب وقار الملک نے اس موقع پر جنوری ۱۹۱۲ء کے علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں جو بیانات شائع کئے وہ مسلمانوں کے جذبات و احساسات کا آئینہ تھے انہوں نے کہا کہ :-

"سب سے زیادہ معرکتہ الآرا مضمون دونوں بنگالوں کا الحاق ہے جہانتک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ عام رائے سمجھنی چاہیئے کہ یہ الحاق عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے اور بعد اس کے وزرائے سلطنت نے یکے بعد دیگرے الحاق کے خلاف امیدیں دلائی تھیں۔ الحاق کا عمل میں آنا گورنمنٹ کی کمزوری اور آئندہ قول و فعل کی بے اعتباری کی ایک وجہ قرار دی جائے گی اور اس لئے اگر ایسا نہ ہوتا تو بہتر تھا لیکن جب کہ بدقسمتی سے ایسا ہو گیا ہے تو اب سوال یہ ہے کہ آئندہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے ! بات یہ ہے کہ اب جو کچھ ہو گیا اور شہنشاہ معظم کی زبان مبارک سے نکل گیا اس کے خلاف ایجی ٹیشن کا جاری رکھنا نہ مفید ہوگا اور نہ مناسب، اب جس بات کی ضرورت ہے اس کی طرف ہم کو بھی اور گورنمنٹ کو بھی کوشش کرنی چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ جو فوائد مسلمانوں کو مشرقی بنگالہ کی علیحدگی سے حاصل ہوئے تھے (اور حاصل ہو رہے تھے) ان میں کوئی فرق نہ آئے اور ایسا ہونا اگر گورنمنٹ چاہے تو مطلق دشوار نہیں ہے اور گورنمنٹ جس قدر جلد اس قسم کے انتظاموں کا اعلان کرے گی اسی قدر ملک میں عام اطمینان کا موجب ہوگا اور ایجی ٹیشن رک جائے گا اور مسلمانوں میں عام ناراضگی پیدا نہ ہونے پاوے گی۔ ان اعلانوں کا ہونا اسی وقت میں ضروری ہے جب کہ شہنشاہ معظم ہندوستان میں تشریف رکھتے ہیں ورنہ ایجی ٹیشن بہت ترقی کر جائیگا"

اور مسلمان جو طرابلس[1] اور ایران کے معاملات[2] سے پہلے ہی شکستہ خاطر ہو رہے ہیں اُن کے خیالات اور بھی مایوسانہ ہو جائیں گے ہماری دلی خواہش اب یہی ہے کہ حضور شہنشاہ معظم اس ملک سے رخصت ہوتے وقت اپنے پیچھے نعرہ ہائے مسرت اور شکر گذاری کے سوا اور کچھ نہ چھوڑیں۔

اس کارروائی سے گورنمنٹ نے مسلمانوں کی طرف سے نامناسب بے پروائی برتی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بھی ابھی تھوڑے دنوں میں یہ فیلنگ پیدا ہو چلی ہے کہ ہندوؤں سے علیحدہ رہنے میں مسلمانوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مسلم لیگ کو اب خیرباد کہنا چاہیے اور ہم کو نیشنل کانگریس کے ساتھ مل جانا چاہیے جس کے واسطے کانگریس مدتوں سے کوشش کرتی چلی آرہی ہے ہم اس سے تو متفق ہیں کہ گورنمنٹ کی طرف سے ضرور ایسی کارروائی ہوئی ہے جس سے مسلمانوں کے دلوں کو واجبی طور پر صدمہ پہنچا ہے لیکن اس سے ہم کو قطعی اختلاف ہے کہ قومی شیرازہ کو منتشر کر کے ہم دوسرے زبردست گروہ کے ساتھ اسی طرح شامل ہو جائیں جس طرح کوئی دریا سمندر میں شامل ہو کر اپنی ہستی کو معدوم کر دیتا ہے۔ ہماری علیحدگی کانگریس وغیرہ سے اس بنا پر نہیں ہے کہ ہم کو گورنمنٹ کے ساتھ وفادار رہنا چاہیے۔ وفاداری عرض ہے وہ جوہر نہیں ہے اس کی بنیاد بھی اور کسی چیز پر قائم ہوتی ہے اور جس قدر اس بنیاد کو تنزلزل ہوگا وفاداری بھی متنزلزل ہوگی۔ پس مسلمان جو من حیث القوم نیشنل کانگریس سے ابتک علیحدہ رہے ہیں اس کی بنیاد یہ ہے کہ کانگریس کے بعض اہم دعاوی مسلمانوں کے حق میں مضرت بخش ہیں ان کا سوراج مسلمانوں کے حق میں تباہ کن ہے، برٹش گورنمنٹ کا سایہ ہندوستان سے اُٹھنا یا اس کا اثر بہت زیادہ کم ہو جانا مسلمانوں کے حق میں بربادی بخش ثابت ہوگا یعنی ایک

---

[1] ملاحظہ ہوں اوراق آئندہ باب ہذا۔

ہی چیز جو ہمارے ابنائے وطن کے حق میں خوش سمجھی جا سکتی ہے، مسلمانوں کے حق میں (جن کا شمار اس ملک میں کم ہے) وہ سمِ قاتل ہے۔ شرقی اور غربی بنگال کے الحاق کا جو نتیجہ بھی نکلے اُس سے مذکورہ بالا کلیہ باطل نہیں ہوتا۔ اگر ہمیں ہندوستان میں رہنا ہے تو برٹش گورنمنٹ سے بگاڑ کر رہنا یہ ہمارے لئے ٹھیک نہ ہوگا۔ گورنمنٹ کے استحکام میں کوشش کرنا اور اس کے ساتھ شریک رہنا یہ خود ہم کو اپنے استحکام میں کوشش کرنا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے خیالات سے ہم کو احتراز کرنا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ بسا اوقات مایوسیاں انسان کو خودکشی پر آمادہ کر دیتی ہیں اور یہ خیال کہ ہم کو کانگریس کے ساتھ شامل ہونا چاہیئے اسی قسم کی مایوسیوں کا نتیجہ ہے جس کی خاص ذمہ دار موجودہ گورنمنٹ ہے لیکن خودکشی کی صلاح کسی وقت میں بھی نہیں دی جا سکتی لا محالہ ہم کو سوچنا پڑتا ہے کہ ہم کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

یہ تو آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد جو اسوقت مشاہدہ میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہیئے لاحاصل مشورہ ہے۔ اب زمانہ اس قسم کے بھروسوں کا نہیں رہا خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر بھروسہ کرنا چاہیئے وہ ہماری اپنی قوتِ بازو ہے اور اس کی نظیر جو ہمارے قابل احترام ابنائے وطن نے پیش کی ہے ہمارے سامنے موجود ہے:

ہندوستان کے مسلمان اب بھی خواب غفلت سے ہوشیار ہوں تو کچھ زیادہ زمانہ نہ گذرے گا کہ باوجود اپنی مردم شماری کی کمی کے دنیا کی ممتاز قوم شمار ہونے لگیں گے اور گورنمنٹ بھی (جس کو آج یہ جرات ہوئی کہ مسلمانوں کو کافی اطمینان دلائے بغیر اُس نے ایک زبردست گروہ رعایا کو خوش رکھنا کافی سمجھا) آئندہ کسی کارروائی کے وقت لازمی طور پر ہمارے حقوق اور ہماری فیلنگوں کا بھی کافی خیال رکھنے پر مجبور ہوگی اس وقت گورنمنٹ نے جو

پالیسی اختیار کی، ممکن ہے کہ مسلمانوں کو غفلت سے ہوشیار کرنے کی غرض سے
ایک تازیانہ کا کام دے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔
اس وقت جو اہم تبدیلیاں گورنمنٹ نے کی ہیں ان کے ساتھ جو تجویزیں
مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی غرض سے بیان کی گئیں وہ ان حقوق کی
حفاظت کے واسطے کافی نہیں ہیں اور اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ان تجویزوں
کے متعلق گورنمنٹ نے شرقی بنگال کے مسلمان لیڈروں سے کوئی مشورہ کرنا
ضروری نہیں سمجھا اور دوسری شکایت مسلمانوں کو یہ بھی بجا طور پر ہو سکتی ہے
کہ وزرائے سلطنت کو چاہیے کہ حضرت شہنشاہ معظم کو یہ بھی مشورہ دیتے کہ ایک
بڑی قوم کی صدا اور ہٹ پوری کرتے وقت کم از کم اشک شوئی کے طور پر جن
کے منہ سے نوالہ چھینا جا رہا تھا ان کے حقوق کی حفاظت کی غرض سے زبان
مبارک سے ارشاد فرماتے جاتے مگر خیر برگذشتہ صلواۃ۔ جو کچھ ہوا وہ ہوا۔
لیکن گورنمنٹ کو ایک منٹ بھی ضایع نہ کرنا چاہیے کہ مسلمانان صوبہ شرقی
کے سرگروہوں سے مشورہ کرکے جو کچھ تجویزیں مسلمانوں کے مفید مطلب
گورنمنٹ کے نزدیک واجبی ہوں، ان کا تمام و کمال اعلان مین اسوقت
میں کر دیا جائے جب کہ حضور شہنشاہ معظم ہندوستان میں تشریف رکھتے ہیں۔
پھر وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :۔
" کم از کم مسلمانوں کا یہ کام تو ضرور ہے کہ ایک مضبوط کوشش کرکے بتلادیں
کہ گورنمنٹ کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ یہ بے اعتنائی مسلمانوں میں نہایت
مایوسانہ خیالات سے دیکھی گئی ہے کہ دونوں بنگالہ کے الحاق کے ساتھ
گورنمنٹ نے مطلق بھی اسکی ضرورت نہ سمجھی کہ ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو
اطمینان دلایا جاتا کہ ان کی ترقی پذیر حالت اور حقوق کی حفاظت فلاں فلاں
ذریعہ سے کی جائے۔ گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانہ تھی جو مسلمانوں
کی مردہ لاشوں پر سے گزر گیا بدون اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں

سے کسی میں کچھ جان باقی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

مارچ ۱۹۱۲ء میں بمقام کلکتہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس کے صدر ڈھاکہ کے سر خواجہ سلیم اللہ خاں تھے انھوں نے مشرقی بنگال کے ایک با اثر اور ممتاز مگر زخم خوردہ لیڈر کی حیثیت سے اس تقسیم اور تنسیخ تقسیم کے متعلق اپنے خطبۂ صدارت میں جو روشنی ڈالی اس کا مختصر اقتباس یہ ہے کہ :-

تقسیم بنگال نے ہم کو ایک موقع دیا تھا کہ ہم اپنی بگڑی ہوئی حالت کو سنبھال سکیں اور ایک نئی قومی زندگی بسر کر سکیں۔

مجھے یقین ہے اور آپ بھی یہی یقین رکھتے ہوں گے کہ مشرقی بنگال کے مسلمان نہ تو برادران ہنود کی مخالفت کی وجہ سے تقسیم کے طرفدار تھے اور نہ اس لئے کہ حکومت نے ان کو اکسایا تھا بلکہ صرف اس لئے کہ مشرقی بنگال کے نئے طرزِ حکومت سے ہم کو ترقی کے کافی موقع مل سکیں۔

ہم نے (جہاں تک کہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کا تعلق ہے) اپنی تاریخ میں پہلی بار اس چیز کو محسوس کیا کہ برطانوی رعایا کی حیثیت سے ہمارے بھی کچھ حقوق ہیں اور یہ کہ ہم کو موقع ملا ہے کہ تقسیم سے پہلے ایک ایسی قوم جو کہ ہمارے اوپر غالب تھی اس سے اب آزادی حاصل کر سکیں گے۔

مشرقی بنگال کے چھ ضلعوں میں جب کہ تقسیم کا دور دورہ رہا اور جو ہماری تاریخ کا جزو لاینفک بن چکا ہے، ہمارے بدخواہوں نے فوراً یہ بات محسوس کر لی کہ اس سے مسلمانوں کو ان کے وہ حقوق جو عرصہ دراز سے پس پشت پڑے ہوئے تھے مل جائیں گے۔ حالانکہ ہم کو اپنے حق سے کچھ زیادہ نہیں ملا مگر ان کا اسی تناسب سے نقصان تھا۔

ان کو مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ ہمارے حقوق جو عرصہ دراز سے غصب کر رہے ہیں اب چھوڑ دیں، اس لئے انھوں نے ایک سخت یورش برپا کی تاکہ ان کو

پھر وہی قدیم باتیں حاصل ہو جائیں۔ اُس شورش میں گورنمنٹ پر اپنے احساسات
ظاہر کرنے کے لئے جو جو حرکات اور جرائم کئے اُن کے متعلق میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ
سب لوگ خوب جانتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک بنگال ایک انقلاب میں مبتلا رہا
یہاں تک کہ ملک میں امن ختم ہو گیا سیاسی قتل اور سیاسی ڈاکے پڑنے لگے
اور جو افسران کہ لا اِن آڈر کے ذمّہ دار تھے ان کو بہت تنگ کیا گیا اس سب
شورش کی وجہ بہت صاف تھی جو کہ بنگالیوں نے ظاہر کر دی کہ ان کو دو مختلف
حرز حکومت میں رکھ کر حکومت نے ان کو اقلیّت بنا دیا جس سے اُن کے مفاد
کو بہت نقصان پہنچا۔ مجھے افسوس ہے کہ اتنی سخت شورش اور بغاوت کی
یہ وجہ حکومت نے مان لی اور ہز ہائنس آغا خاں جیسے سیاست دانوں نے بھی
اس کو تسلیم کر لیا حالانکہ اس کی وجہ اس سے کہیں بہت زیادہ سخت تھی۔
مسلمانوں نے اس شورش میں حصّہ لینے سے اس لئے انکار کر دیا کہ وہ حکومت
کے ایسے اقدام کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے جس نے ان کو بہت فائدہ پہنچایا
تھا شورش والوں نے اپنی کوئی کوشش ایسی نہ چھوڑی کہ مسلمان وفاداری
کے راستہ سے ہٹ کر اُن کے ساتھ شامل ہو جائیں اور اُن کو اس میں کوئی کامیابی
حاصل نہ ہوئی۔

حکومت نے اپنے مراسلہ میں اس کا اظہار کیا ہے کہ دونوں قوموں میں تعلقات
بہت خراب ہو گئے ہیں لیکن جیسا کہ حکومت نے کہا ہے کہ یہ تقسیم بنگالہ کے
سبب سے ہیں یہ غلط ہے کیوں کہ تعلقات کی خرابی کی اصل وجہ یہ ہے
کہ مسلمانوں نے حکومت کے خلاف بغاوت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔
حکومت نے بظاہر اس شورش کو دبا دیا لیکن ایک طرف تو یہ دہشت انگیزیاں
تھیں اور دوسری طرف وہ ہندو و مسلمان تھے جنھوں نے اس شورش میں شامل
ہونے سے انکار کر دیا لیکن بعد کو حکومت نے انتظام کی ضروری وجوہ بتلا کر تقسیم
بنگال کی تنسیخ کا اعلان کر دیا جس سے کہ حکومت کا خود بہت نقصان ہوا، چونکہ

بعد کو عوام کے سامنے یہ کہا گیا کہ یہ ہماری فتح ہے اور حکومت کی شکست۔ جس سے
عام طور پر تمام ہندوستان اور خاص طور پر مشرقی بنگال میں برطانوی اثر کو سخت
دھکا پہنچا اور عوام کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ دہشت انگیزی سے حکومت
کو بہت آسانی سے جھکایا جا سکتا ہے اور جیسا پہلے کہا جاتا تھا کہ حکومت اپنے
حکم کو اٹل سمجھتی ہے اور خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ اپنے احکامات کی واپسی کے
لئے تیار نہیں ہے اب یہ اثر بھی ختم ہو گیا ہے۔

ہم مسلمانوں کے لئے اس تنسیخ کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو اپنی ترقی کے جو مواقع
ملے تھے وہ ختم کر دئے اور اس نقصان نے ہم کو بہت رنج پہنچایا ہے اور خاص
طور سے اس لئے کہ یہ تبدیلی جو کچھ بھی ہوئی ہم کو نہ تو اس کا وہم و گمان تھا اور
نہ ہم کو بتلایا گیا اور نہ ہم سے پوچھا گیا اگر مشرقی بنگال کے مسلمان بھی اس قسم
کی ایک شورش پیدا کر دیتے تو بادشاہ معظم کا یہ اعلان بیکار ہو جاتا لیکن ہم نے
حکومت کو تنگ کرنا اچھا نہیں سمجھا اور اس خیال سے اپنے احساسات کو
دبا دیا کہ چاہے یہ ہمارے لئے کتنا ہی نقصان دہ ہو لیکن وفاداری کا مطلب
یہ ہے کہ جو بات کہ بادشاہ کے منہ سے نکلی ہو اس پر عمل کریں گے ہماری وفاداری سے
ظاہر ہے کہ ہم سخت سے سخت امتحان میں بھی کامیاب ہو سکتے ہیں"

یہ تاثرات تو ان لوگوں کے تھے جن کو فائدہ وضرر پہونچا تھا، اب ایک سابق
وبسرائے پر جس نے اپنی پنجسالہ میعاد میں اس تقسیم کو ہمیشہ ناقابل تنسیخ کہا اور ان باغیانہ
وانقلابی اور دہشت انگیزی کی تحریکات کا مقابلہ کیا اس پالیسی اور تنسیخ کا جو اثر ہوا وہ
بھی دیکھنا چاہیے۔

لارڈ منٹو نے فروری میں دار العوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"ہم نے مسلمانوں سے کہا کہ تقسیم بنگالہ ایک مستقل چیز ہے اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً
ہم نے انہیں یقین دلایا کہ یہ اسی حالت میں رہے گی ہم نے مشرقی بنگال کے مسلمانوں
کو اپنی طرف سے ان کی وفاداری کی قدر کرنے اور ان کے مفاد کی حفاظت کرنے

کا یقین دلایا میں خیال نہیں کرتا کہ تمام ہندوستان میں اراکین سول سروس کا کوئی بھی ایسا فرد ہوگا جو یہ یقین نہ کرتا ہو کہ برطانوی حکومت کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے اس فیصلہ کو منسوخ کرے۔ ہندوستانی ماہرین سیاست میں سے کسی ایک شخص نے بھی تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کا خیال نہ کیا ہوگا مگر تقسیم بنگال نے ثابت کر دیا کہ یہ بھی انسانی امکان میں تھا۔"

بہر حال بنگال کی تنسیخ سے جو شاہی اعلان کے ذریعہ ہوئی مسلمانوں نے عام شورش سے تو اجتناب کیا لیکن ان کے دماغوں میں ایک ہیجان برپا ہو گیا اور سیاسیین کے اذہان اپنی سیاسی پالیسی کے بدلنے پر رجوع ہو گئے۔

ہنوز یہ سال ختم نہ ہوا تھا کہ لیگ کے دستور اساسی میں ترقی و اصلاح کی طرف عام رحجان پیدا ہو گیا اور آنریری سکریٹری نے ایک گشتی مراسلہ جاری کیا جس میں توجہ دلائی تھی کہ :-

باشندگان ملک کی پولیٹکل اولی العزمیوں کے متعلق گورنمنٹ ہند کی پالیسی میں جو تغیر عظیم واقع ہوا ہے۔ جس کی نظیر گذشتہ دس برس کے آئینی اصلاحات اور حال کے تغیرات اور ان امیدوں میں جو صوبجات میں سیلف گورنمنٹ قائم ہونے کی نسبت دلائی گئی ہیں پائی جاتی ہے۔ زیادہ زمانہ نہیں گزرے گا کہ مقامی جماعتوں کو اس سے بہت زیادہ اختیارات ملیں گے جس قدر کہ ان کو زمانہ سابق میں حاصل تھے۔

سیاسی حقوق تعلیمی ترقی اور قومی وجوہ کے بارے میں ہمارے جو خیالات پائے جاتے ہیں۔ اُن پر سب سے زیادہ اثر یہ پڑا کہ ہم لوگوں میں برٹش گورنمنٹ کے وعدوں کی نسبت جو غیر متبدل یقین پایا جاتا تھا۔ اسکو تنسیخ بنگال سے سخت صدمہ پہونچا۔ شاید ہم نے بے عقلی سے اپنی امیدیں ملند پروازی کی حد تک قائم رکھی تھیں اور اس زود یقینی نے ہکو مار ڈالا۔ یہ وہ حالتیں تھیں کہ کل قوم لیگ کی جانب نظر کرنے لگی۔ کیونکہ روشنی اور رہبری حاصل کرنے کے لئے یہی لیگ مسلمانوں کی پولیٹکل انجمن ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض نے اس پر اظہار

اطمینان کیا اور بعض نے لیگ کے دستور العمل پر سختی سے اعتراض کیا۔ میں یہ خیال کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ جماعت کثیر کی رائے پائی جاتی ہے کہ لیگ کے دستور العمل میں اصلاح و ترمیم کی بہت گنجائش ہے۔

ہندوستان کی بہبودی کے لئے ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد کی بنیاد ڈالی جائے اور مخالفت دور کرنے کی کوشش کیجائے تاکہ دونوں قومیں باہم ملکر ملک کی خدمت انجام دیں اور مسلمان اپنے تئیں ہندوؤں کی پولیٹیکل سطح کی بلندی تک پہنچائیں۔ اس غرض کے لئے تمام غیر اختلافی مسائل میں مسلمان ہندوؤں کی تائید کرتے رہیں۔

لوکل جماعتوں میں جداگانہ قائمقامی کی نسبت ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بار بار ایجی ٹیشن کیا جائے۔ اور یہ بات گورنمنٹ کے ذہن نشین کی جائے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ جائز ہے اور اس باب میں ان کا احساس شدید ہے۔"

مارچ ۱۹۱۳ء میں لیگ کونسل نے اس سیاسی نصب العین کو تسلیم کر لیا اور سالانہ اجلاس پر طے ہوا کہ "ایک ایسی سیلف گورنمنٹ کا حاصل کرنا جو ہندوستان کے مقاصد کے مطابق ہو لیگ کے مقاصد میں داخل کیا جائے"۔ مگر ایک جماعت ایسی بھی تھی جو سیلف گورنمنٹ کی یہ تعریف کرتی تھی کہ "برطانوی سنگینوں کے ذریعہ مسلمانوں کی غلامی" بہرحال اب مسلمانوں کا نصب العین بھی سیلف گورنمنٹ ہو گیا۔ مسلم لیگ کے اس ریزولیوشن کے متعلق کانگریس میں مسٹر بھوپندر ناتھ باسو کی تحریک سے حسب ذیل ریزولیوشن پاس ہوا:۔

"یہ کانگریس آل انڈیا مسلم لیگ کے نصب العین دربارہ سیلف گورنمنٹ کی پرجوش تعریف کرتی ہے اور اس کے اس یقین کے ساتھ اتفاق کلی رکھتی ہے کہ ملک کا سیاسی مستقبل یہاں کی مختلف اقوام کے باہمی اتفاق و اتحاد پر منحصر ہے جو کانگریس کا بنیادی اصول رہا ہے یہ کانگریس لیگ کی ظاہر کردہ امید کا دلی خیر مقدم کرتی ہے کہ مختلف جماعتوں کے لیڈر، قومی اغراض و مفاد کے تمام مسائل کے متعلق متفقہ و مشترکہ کارروائی کرنے کے لئے عملی طریقہ ڈھونڈنے

کی کوشش کریں گے اور ملک کے باشندوں کے تمام طبقوں سے سرگرمی کے ساتھ اپیل کرتی ہے کہ وہ اس مقصد میں امداد کریں جو ہم سب کے دل میں ہے"

اس ریزولیوشن کو پاس کرتے ہوئے محرک نے ایک دلچسپ تقریر بھی کی جس میں کہا کہ مغل بادشاہوں نے اتحاد ہند کا خواب پہلے سے دیکھ لیا تھا۔ لہٰذا اب انگریزی عہد حکومت کی سرپرستی میں ہمیں خواب کو عملی صورت میں لے آنا چاہیئے"

بعض دیگر مقررین نے بھی پرجوش تائید کی لیکن ایک بازو نے اس ریزولیوشن کو کانگریس کے لئے باعث تذلیل کہا تاہم کثرت رائے سے پاس ہو گیا۔

ہندو مسلم نااتفاقی نے حقیقتاً حکومت کے لئے بھی مشکلات پیدا کر دی تھیں، ملک معظم نے بھی روانگی ہند کے وقت یہ پیغام دیا تھا کہ:۔

"ملک معظم قیصر ہند کی دلی تمنا ہے کہ ہندوستان کی دونوں قومیں ایک دوسرے کے ساتھ محبت وہمدردی سے پیش آئیں اور نفاق و پرخاش کو یک قلم خیرباد کہدیں کیونکہ دونوں قوموں کی ہنگامہ آرائیاں ہندوستان کی ترقی کے لئے سم قاتل اور خود سلطنت کے لئے تشویش ناک ہیں"

یہ اسی پیغام کا اثر تھا کہ ۱۹۱۳ء کے صدر کانگریس نے کہا کہ:۔

"بعض دفعہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے حکام کی پالیسی تفرقی حکومت ہے لیکن گذشتہ بحث پر مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے جو تقریر کی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ کم از کم موجودہ گورنمنٹ آرزومند ہے کہ ہندوستان کی مختلف جماعتوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو لہٰذا ہماری خوش قسمتی سے موجودہ گورنمنٹ کی پالیسی ملکر حکومت کرنے کی پالیسی ہے اگر ہم اس سے پورا فائدہ نہ اٹھائیں تو یہ ہماری سخت غلطی ہوگی کیونکہ اس طرح ہم نہ صرف اپنے ہی ملک کو ترقی دیں گے بلکہ برطانوی حکومت کو بھی استوار اور محکم بنائیں گے۔ تفریق حکومت کا نہایت ہی خطرناک اصول ہمارے نصاب سیاست میں کوئی جگہ نہیں رکھتا"

صوبہ متحدہ میں سرجیمس مسٹن نے بھی اپریل ۱۹۱۳ء میں ایک اتحاد کمیٹی بنائی گورنمنٹ ہاؤس

میں ہندو مسلم نمایندے مجتمع ہوئے اور حسب ذیل مسائل متنازعہ پر غور کیا گیا۔

(۱) مذہبی تہواروں کے جلوس۔

(۲) سرکاری ملازمت میں تقررات۔

(۳) زبان۔

(۴) میونسپل بورڈ میں جداگانہ نیابت۔

(۵) گاؤکشی۔

آٹھ گھنٹہ تک جلسہ جاری رہا اور بالآخر ان تمام مسائل کے تصفیہ کے لئے سر مہاراجہ محمود آباد کی قیادت میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ لیکن بے نتیجہ ثابت ہوئی۔

۱۹۱۱ء میں طرابلس پر اٹلی کے حملہ سے مسلمانان ہند متردد و مضطرب تھے اور دوسری طرف شمالی ایران کے واقعات بھی جہاں روس ہر قسم کے بہیمانہ مظالم کر رہا تھا کچھ کم اضطراب انگیز نہ تھے روسیوں نے بہت سے ممتاز اہل ایران کے ساتھ (جن میں علماء مجتہدین بھی تھے) سب سے بڑے مجتہد ثقتہ الاسلام کو پھانسی پر لٹکا دیا اور مشہد مقدس پر گولہ باری کی ان واقعات نے جو صدمہ پہنچایا اُس میں لندن ٹائمز کی اس خبر نے حد درجہ بیچینی کے ساتھ اضافہ کر دیا کہ اگر ترکوں نے اٹلی سے اب بھی صلح نہ کی تو اٹلی کے ہوائی جہاز خانہ کعبہ اور روضہ مطہرہ پر گولے برسا کر ان کو منہدم کر دیں گے۔ اس سے قبل اٹلی نے دیگر سلطنتوں کو اطلاع دی کہ ایام حج کے بعد وہ جدہ وینبوع کی بندرگاہوں کا محاصرہ کریں گے اور اُن کے آنے جانے والوں پر بند کر دیں گے۔

ان حالات میں سلطنت انگلستان کی پالیسی بھی مسلمانوں کے لئے مزید وجہ تردد تھی ترکوں نے اٹلی کی مدافعت کے لئے براہ مصر فوج اتارنی چاہی تو لارڈ کچنر کو مصر بھیجا گیا۔ اور ترکوں کا انہیں کے ملک سے راستہ مسدود کیا گیا۔

تحفظ کے نام پر ایران میں برطانوی مفاد کے لئے برطانوی فوجیں بھیجی گئیں اور شیراز کو مستقر بنایا گیا اور اس طرح چکی کے دو پاٹوں میں ایران کے پس جانے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا۔

ہنوز یہ تردّدات موجود تھے کہ سال کے آخر ماہ میں تقسیم بنگال کی تنسیخ ایک دوسرے اضطراب و بے چینی کا سبب بن گئی۔ ۱۹۱۲ء میں مسلم یونیورسٹی کے قیام میں وزیر ہند اور حکومت ہند نے جو قیود و شرائط لگائے اس سے پوری قوم کے ہاتھ سے دامان صبر چھوٹ گیا اور احتجاج کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہنوز یہ سلسلہ جاری تھا کہ اسی سال کے موسم خزاں میں ریاست ہائے متحدہ بلقان نے ترکوں کے ساتھ جنگ چھیڑ دی۔ آغاز جنگ سے کچھ قبل مسٹر ایڈورڈ گرے وزیر خارجہ نے دار العوام میں کہا کہ :-

"نقض صلح کے انسداد کے لئے دول عظام جد و جہد کر رہی ہیں اور یہ کہ ان کی طرف مشکلات کے دور کرنے کے لئے متحدہ طور پر دول متحدہ بلقان اور ٹرکی کو یادداشت روانہ کی جائے اور ہم سب نے دیگر دول سے اتفاق رائے کیا۔........

اگر باوجود اس کے ترکی اور ریاست ہائے متحدہ میں جنگ جاری ہوئی تو ہم نتیجہ جنگ کے طور پر یورپین ترکی کی جو حالت تھی اس میں کسی تغیر و تبدل کو منظور نہ کریں گے نیز وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ خواہ نتیجہ جنگ کچھ بھی ہو لیکن ملک کے حدود میں کوئی تغیر نہیں ہوگا۔"

یہ جنگ نہایت زور شور کے ساتھ جاری ہوئی اور ریاست ہائے متحدہ کی فوجیں جہاں موقع ملتا وہیں بہیمیت و شقاوت، سفاکی اور قتل عام میں کوئی کسر اُٹھا کر نہ رکھتیں۔ لیکن دول یورپ اور خاص کر انگلستان کی طرف سے سرد مہری اور چشم پوشی ہی نہیں ہوتی بلکہ ان مظالم پر بلقانیوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔

اب مسلمانان ہند نے ترکی کے ساتھ پورے طور پر اظہار ہمدردی کیا۔ مولانا محمد علی مرحوم نے ڈاکٹر انصاری (مرحوم) کی قیادت میں چند نوجوانوں کا ایک طبی مشن مرتب کیا اور اس کے لئے ہر حصہ ہند سے چندہ فراہم ہوا اس نے ترکی میں جاکر بہترین خدمات انجام دیں اور ترکوں کے قلوب پر مسلمانان ہند کی اخوت اسلامی کا نہ مٹنے والا نقش قائم کر دیا۔

اس زمانہ میں ایم۔اے۔او کالج کے طلبا نے مجروحین و یتامیٰ کی امداد میں قابل مثال ایثار دکھایا انھوں نے چندے کئے، گوشت چھوڑا تقلیل غذا کی فاقے کئے اور اس طرح

جو بچت ہوئی وہ ہلال احمر فنڈ میں دیدی، و وطلبا نے ترک تعلیم کر کے انصاری مشن میں شرکت کی اور اس مشن کو بھی مالی امداد دی گئی، اس مدد کا اندازہ کم و بیش پچاس ہزار روپیہ تھا۔ مگر یہ جوش و ایثار حکومت صوبہ کو پسند نہ آیا اور ہز آنر لفٹننٹ گورنر سر جیمس مسٹن نے کالج کے پیٹرن کی حیثیت سے فوراً علیگڈھ کی وزٹ اور ٹرسٹیوں کو اپنا مشورہ پیش کرنا ضروری سمجھا اور ایک تاریخی تقریر فرمائی جس میں ترکوں کی بہادری کی بھی تعریف تھی لیکن طلبار کی اس حالت کے بدلنے کا بھی مشورہ تھا۔

اس بلقانی جنگ میں حکومت انگلستان نے ریاست ہائے متحدہ بلقان کی صاف اور غیر مبہم طرفداری کی، باوجودیکہ خود انگلستان میں انگریزوں کا یہ خیال تھا کہ:۔

"دول یورپ کا برتاؤ ترکی کے ساتھ دوستانہ نہیں اور نہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اسلامی حکومت کو آزاد رکھنا چاہتی ہیں، ان کو معلوم ہے کہ اسلام ایک قوت بن گیا ہے اور وہ ایک غیر یورپی مذہب ہے اور یورپ نے ارادہ کر لیا ہے کہ تمام غیر یورپی اقوام کو اپنے جلب منفعت کی خاطر تاراج کر دیں بایں لحاظ ان کے خیال میں ان کی اغراض اس وقت تک محفوظ نہیں جب تک کہ ترک یورپ کی مجالس شورے سے یک لخت علیحدہ نہ کر دئے جائیں"

اسی کے ساتھ بلقانی مظالم اور ان کی سخت بے رحمیوں کا بھی اعتراف تھا مگر حکومت کا طرز عمل اتنا مخالفانہ تھا کہ جب لڑائی کا رنگ بدلا اور ترک فوجی بد انتظامی کی وجہ سے پسپا ہوئے تو وزیر اعظم انگلستان دوسرا اعلان کرتے ہیں کہ "اس جنگ کے فاتحین کو فتح کے ثمرات سے محروم نہیں رکھا جا سکتا" اور جب التوائے جنگ ہوتا ہے اور فریقین کے نمائندے وزیر خارجہ کی زیر صدارت لندن میں جمع ہوتے ہیں تو یہ صدر پورے طور پر زور دیتا ہے کہ "ایڈریا نوپل بلغاریہ کو دیدیا جائے" مگر ترک راضی نہیں ہوتے اور اسکو دوبارہ تسخیر کر لیتے ہیں تو پھر بھی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اَدرنہ کو خالی کر دے۔

حکومت برطانیہ کی اس پالیسی نے ہندوستانی مسلمانوں کو زیادہ بے چین بنا دیا اور

وہ پورے جوش کے ساتھ ترکوں کی امداد ہلال احمر میں کرتے رہے ہر گوشہ ملک میں جلسے منعقد ہوئے۔ مولانا شبلی کی نظموں وقار الملک کے بیانوں، زمیندار، ہمدرد اور دیگر اسلامی اخبارات کے مضامین اور مقررین کی تقاریر نے تمام اسلامی ہند میں ہمدردی کا ایک پرجوش سمندر پیدا کر دیا۔ چوں کہ اٹلی کے اقدامات نے طرح طرح کے ترددات پیدا کر دئے تھے اس لئے پرجوش مسلمانوں نے انجمن خدام کعبہ کی تاسیس کی۔ ۶ مئی ۱۹۱۳ء کو بمقام دہلی اس کا افتتاح ہوا اور چھ مہینے کے اندر ۲۱۴۴ ممبر ہوگئے، جولائی میں انصاری مشن بھی واپس آگیا اور ڈاکٹر انصاری نے ترکی تمسکات قرضہ کی فروخت کا انتظام کیا چنانچہ لاکھوں روپے کے تمسکات فروخت ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ اور مسلم لیگ شاخ لندن نے ہر موقع پر احتجاج کیا اور مسلمانوں کے مطالبات اور ترکوں کی حمایت میں جد وجہد کی اور ایک اپیل نائب وزیر محکمہ خارجہ کی خدمت میں بلغاری مظالم کی طرف توجہ کرنے کے لئے پیش کی، لبرل وزارت اور وزارت خارجہ نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس امر کا ثبوت دیا کہ برطانیہ کو مسلمانوں کے جذبات کی پرواہ نہیں، یہ تنبیہ بھی کی جاتی تھی کہ خارجی پالیسی میں ان کو دخل دینے کا حق نہیں ہے، ابتدائے جنگ طرابلس سے لندن کا پریس عموماً مسلمانوں کی اس ہمدردی کو خطرناک سمجھا اور سمجھاتا رہا چنانچہ لندن ٹائمز نے تو اس خطرہ کو صحیح ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کی۔

یہ بے چینی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء کو ویسرائے نے لیجس لیٹو کونسل میں اپنی تقریر بلقان اور ایران کے معاملات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ "زمانہ جنگ میں برٹش [illegible] گورنمنٹ نے جنگ جویوں کے مقابلہ میں جس حد تک اس مرتبہ مسلمانوں کی طرف سے نمایندگی کی ہے، ایسی کبھی اس سے پہلے نہیں کی گئی" نیز آیندہ برطانیہ اور ترکی کے خوشگوار تعلقات رہنے کی بھی امید ظاہر کی، ایران کے متعلق بھی اطمینان دلایا کہ افواج کو شیراز سے واپس بلا لیا جائے گا۔

داخلی بے چینی میں ۲۹ جون ۱۹۱۳ء کو کانپور کے مچھلی بازار کی مسجد کے واقعہ نے سخت اضافہ کر دیا۔ میونسپل حکام نے لوکل گورنمنٹ کی منظوری سے مسجد کے والان وضو خانہ کو شریک

سیدھی کرنے کے لئے شہید کر دیا اس کاروائی پر زبردست احتجاج کیا گیا اور ۳ اگست کو جب کہ غیور مسلمان مسجد کی گری ہوئی اینٹوں کو اُٹھانے گئے تو پولس طلب کی گئی اور جب مجمع پر وہ قابو نہ پا سکی تو فوج بلائی گئی اور مسلمانوں پر فائر کئے گئے، سرکاری بیان ہی کے مطابق ایک چھوٹے سے غیر مسلح مجمع پر کامل پندرہ منٹ تک گولیاں برسائی گئیں۔ ۲۰۰ کارتوس استعمال ہوئے پولس کے سواروں نے برچھیوں سے حملے کئے ۲۰۰ اشخاص گرفتار کر کے جیل میں ڈالے گئے، سو سے زیادہ سشن سپرد ہوئے۔

اس واقعہ نے جذبات مشتعل کر دئے، ملزمین کی طرف سے ڈیفنس کا انتظام کیا گیا، ایک امدادی فنڈ جاری ہوا، مسٹر مظہر الحق بیرسٹر پٹنہ کی قیادت میں ممتاز مقننین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ موثر نظموں ور دانگیز مضمونوں نے تمام مسلمانان ہند میں ہمدردی کا جوش پیدا کر دیا۔

ستمبر میں مولانا محمد علی اور (سر) وزیر حسن سکریٹری مسلم لیگ ایک ڈیپوٹیشن کی حیثیت میں لندن گئے تا کہ وزرائے سلطنت، ممبران پارلیمنٹ اور برطانیہ کے بارسوخ اصحاب کے سامنے ہندوستان اور بیرونی دُنیا کے مسلمانوں کے صحیح اور سچے واقعات اخبارات اور دیگر ذرائع سے پیش کریں لیکن وزرائے سلطنت نے ملاقات سے انکار کر دیا تاہم برطانوی پبلک کے سامنے اُنھوں نے اپنے مقصد اور فرض کو بوجہ احسن انجام دیا۔

کان پور کے ماخوذین کے مقدمات ہنوز زیر سماعت تھے کہ ۱۴ اکتوبر کو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند خود کان پور آئے اور بعض معمولی شرائط پر تمام ماخوذین کو رہا کر دیا منہدمہ عمارت کے متعلق طے کیا گیا کہ ایک مسقف راستہ بنا کر اُس پر ٹھیک اُسی طرح دالان کی تعمیر کر دی جائے جس طرح کہ پہلے تھا۔

یہی حالات اور احساسات و جذبات تھے کہ ۱۹۱۳ء کا اجلاس مسلم لیگ نہایت شان سے منعقد ہوا اور صدر اجلاس سر ابراہیم رحمۃ اللہ نے اپنے ایڈریس میں ان تمام مسائل پر نہایت آزادی اور دلیری کے ساتھ بحث کی۔

ان کا خطبہ صدارت اس زمانہ کے تمام واقعات و حالات پر محتوی تھا۔ کانپور

کی مسجد اقتدار حکومت فائرنگ (گولیاں چلانا) جنگ بلقان، مسلمانان ہند اور برطانیہ کا مخمصہ خارجہ ترکی و بلقان کے معاملات میں حکومت کی پالیسی و اعلانات کا انحراف، مسئلہ جنوبی افریقہ اور ہندوستانیوں کے ساتھ سلوک، عدالتی و انتظامی اختیارات کی علیحدگی، قانون مطابق مسلمانوں کا سیاسی دستور العمل اور نصب العین برطانیہ کے ساتھ تعلقات ملک معظم کا پیغام تعلیم حاصل کرو، متحد ہو جاؤ، اور آئندہ کی توقع رکھو، اسلامی دستور العمل سب ہی پر واقعات کی روشنی میں نہایت مدلّل بحث تھی۔

ایک موقع پر نہایت صفائی سے کہا کہ ”ملک جیسا کہ یہ ہندوستان ہے ہمیشہ کے لئے اجنبی حکومت نہیں رہ سکتا اور اگرچہ بلا شبہ حکومت برطانیہ کی بنا رفاہ خلق اور نیکی پر مبنی ہے، تاہم ابدی طور پر یہاں نہیں رہ سکتی، ہندوستان ہمارا آبائی ملک ہے اور قابل فخر وراثت، اور آخر کار ہمارے محافظین کو ہمارے سپرد کرنا ہوگا“

اُنہوں نے ہندو مسلم اتحاد پر ان دونوں قوموں کو بڑے اور چھوٹے بھائی سے تعبیر کرکے مختلف عنوان و دلائل سے بحث کی، اس بحث میں ایک موقع پر کہا کہ ”ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی صورت کی سیلف گورنمنٹ ہندوستان میں ممکن نہیں بغیر اس کے کہ دو بڑی بڑی قومیں ہندو اور مسلمان مخلصانہ طور پر شیر و شکر ہو جائیں...... اگر یہ دونوں اپنی قوتیں اور کوششیں ایسے نصب العین کے حصول میں معقول مصالحت سے صرف کریں تو ہماری تمام مشکلات رفع ہو جائیں گی“

اُنھوں نے شملہ ڈیپوٹیشن کے مطالبات کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ ”ہم نے خواہش کی کہ خدمت ملک کی ذمہ داریاں اور بار اُٹھانے میں ہم بھی حصّہ لینا چاہتے ہیں، ہم نے درخواست کی کہ ان مواقع کا کچھ حصّہ ہمیں بھی ملے جو رعایائے ہند کو دیا گیا تھا جس سے ہمارے بڑے بھائی ہماری مدّت صغر سنی میں بہرہ یاب تھے، محافظ (حکومت) نے ہمارے صحیح مطالبات کا اعتراف کیا اور مرضی ظاہر کی کہ جس چیز کے ہم مستحق ہیں وہ ہم کو دی جانی چاہیے، کس ہٹ دھرمی سے ہمارے بڑے بھائی ہمارے سچے حقوق کے اعتراف کئے جانے سے چراغ پا ہوئے ہیں اس کا بیان تو ایک جزو تاریخ ہوگیا ہے“

پر بھی انہوں نے قلیل التعداد قوموں کے حقوق پر کانگریس کمیٹی کے اس اُصول کا کہ اس میں مسلمانوں کو خاص حق انتخاب ہونا چاہیئے" ایک پُرزور بحث کرتے ہوئے کہا کہ کیا میں یہ سوال کر سکتا ہوں کہ مجلس وضع قوانین میں مسلمانوں کے قائمقام ملک کی خدمت کرنے کے جوش میں اور آزادی میں کسی طرح کم ثابت ہوئے ہیں اور کیا وہ ملکی بہبودی کے پیش رفت میں دوسری قوموں کے قائمقاموں کے ساتھ مخلصانہ طور پر شامل نہیں ہوئے"

اس عرصہ میں مسلمانان ہند کا جو سیاسی رویہ رہا اور ہندوستانی سیاسیات میں کانگریس سے اشتراک عمل کا جو رجحان نمایاں ہوا اس پر انگریزی اخبارات روز بروز شکوک و شبہات کی تہ چڑھاتے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں نیشنل ریویو نے لکھا کہ "اب ہندوستانی مسلمان ویسے صلح جُو اور خاموش نہیں رہے جیسے کہ اب سے چند سال پہلے تھے، حکومت ان کے خیالات کی موجودہ رو کو دیکھکر خاموش نہیں رہ سکتی"

سر ولیم ہنٹر کی کتاب کا بھی حوالہ دیکر یہ بات دکھلانی چاہی کہ "مسلمانوں میں پھر اسی قسم کے باغیانہ خیالات اور گورنمنٹ سے ناراضی پھیل رہی ہے جیسا کہ اس زمانہ میں جب کہ کتاب مذکور لکھی گئی تھی"

۱۹۱۴ء کے آغاز میں مسلمانوں کو اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان شکوک و شبہات کو دُور کیا جاوے۔ چنانچہ مارچ میں بمقام دہلی مختلف حصص ہند کے مسلمانوں کا ایک مقتدر ڈیپوٹیشن وائسرائے ہند کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے ایک اڈریس پیش کیا جس میں مسلمانوں کی موجودہ سیاسی تحریک کی تاریخ اور مسلم یونیورسٹی کے قیام کی کوشش کا تذکرہ کرکے نہایت صریح اور حیرت انگیز تواتر کے ساتھ جو واقعات پیش آئے اُن کی طرف اشارہ کرکے بیان کیا گیا کہ:۔

"**حضور والا**! یہ امید نہیں کیجا سکتی کہ اس ملک کے مسلمانوں پر ان کا گہرا اور درد انگیز اثر نہیں ہوگا۔ تمام مشاہدہ کرنے والوں پر یہ بات روشن ہوگی کہ ایسے افسوسناک واقعات کے اجتماع کی مثال گزشتہ زمانہ میں بالکل نہیں مل سکتی۔ خود حضور جن کی ہمدردی ہمارے کثرت مصائب میں ہمارے ساتھ

تھی ہمارے اس تاریک زمانہ کے احساسات کی تیزی اور حدت سے بخوبی واقف ہیں، لیکن کوئی آدمی ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کرسکتا جو اس طرف دور کا اشارہ بھی کرتی ہو کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس غیر معمولی دشواری کے موقع پر اپنی قوت تمیزی اور ضبط کو ہاتھ سے جانے دیا ہو یا تخت برطانیہ اور ہز مجسٹی کی ہندوستانی قانونی حکومت کے ساتھ اپنی محکم اور مضبوط روایتی وفاداری سے ایک سرمو بھی تجاوز کیا ہو، ہم نے نہایت تکلیف اور معاندانہ نگاہوں سے ان قابل افسوس کوششوں کو دیکھا ہے کہ جو باوجود ان مسلمہ واقعات کے حال میں بعض حلقوں میں ہماری قوم کو بدنام کرنے اور گورنمنٹ کے ساتھ جو ہمارے تعلقات ہیں اُن کے غلط معنے پہنانے اور حضور ملک معظم کی تمام مسلمان رعایا کی نیتوں اور چال چلن کو دھبہ لگانے کے لئے اس غرض سے کی گئی ہیں تاکہ گورنمنٹ اور برطانوی رعایا کی نگاہوں میں تحقیر کی جائے۔ یہ بات کھلم کھلا بیان کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے لیڈر مذہبی جذبات کو مشتعل کرتے ہیں، قومی مناقشت کو بڑھاتے ہیں اور برطانوی حکومت کی بدگوئی کرنے اور عیسائی مذہب کو بدنام کرنے کا کوئی موقع اُٹھا نہیں رکھتے، اور ایک نئی جماعت یہ خیال کرنے لگی ہے کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ یہ بیان بھی کیا گیا ہے کہ اس نئی مسلم تحریک کا ایک شر انگیز پہلو یہ ہے کہ علی گڈھ کے گریجویٹ پیش پیش ہیں اور حکومت برطانیہ کی مخالفت علانیہ پھیلانے اور مسلمان افواج کی وفاداری کو کمزور کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

حضور والا! بڑے بڑے عام جوش کے موقعوں پر متواتر امتحان میں پورے اُترنے کے بعد ایسے وقت میں جب کہ ہم ایک بڑی مصیبت میں مبتلا ہو رہے تھے اور اس ہمدردی اور خلوص کے محتاج تھے جس کے کہ ہم مستحق تھے ہم کو ایسے بے رحمانہ حملوں کی ہرگز امید نہ تھی، حضور ملک معظم کی سات کروڑ وفادار مسلمان رعایا کی نیک نامی پر جس بدنیتی کے ساتھ حملے کئے گئے، اگر ہم اس کی تردید میں

کوئی تیز فقرہ استعمال کرنے پر مجبور ہوں تو ہم کو اعتماد ہے کہ حضور ہم کو معذور تصور فرمائیں
گے، ہم اپنی قوم کی طرف سے بلا تامل ان الزامات کو غلط اور بے بنیاد اتہامات
قرار دیتے ہیں جو سلطنت کی بہترین اغراض کے لئے سخت مضر ہیں، معمولی صورتوں
میں قوموں یا افراد پر غیر ذمہ دارانہ حملوں کے ساتھ حقارت آمیز خاموشی کا برتاؤ
ہو سکتا ہے، لیکن جن لوگوں نے ہماری قوم کو بدنام کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں
لیا ہے وہ وسیع ذرائع رکھنے والے اور اپنی بات پر اڑنے والے لوگ ہیں اور
ان کی شر انگیز کوششوں کو اس کثیر اشاعت سے اور بھی زیادہ مدد پہونچی
ہے جو ان کے الزامات کو انگلستان اور ہندوستان میں حاصل ہوئی ہے، ہم
لوگوں نے اس لئے یہ خیال کیا کہ جب تک ہم کو کوئی ایسا موقع نہ دیا جائے
جیسا کہ یہ ہے اس وقت تک کسی قوم کے لئے جس کے حالات ہمارے
جیسے ہوں یہ بات ناممکن ہے کہ اس قسم کے الزامات کی تردید بااثر مستند
اور کافی طریقہ پر کر سکے . . . .

ہم اس موقع پر پورے زور کے ساتھ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان
کے مسلمان اپنے اس اصول کو آج بھی اتنا عزیز رکھتے ہیں جتنا کہ گذشتہ
زمانہ میں رکھتے تھے ؛

ہم کو یقین ہے کہ حضور ہمارے اس یقین دلانے کو تسلیم کریں گے کہ ہم اسکے
سوا اور کچھ نہیں چاہتے کہ رعایا اور گورنمنٹ کے درمیان پورا اعتماد اور ہندوستان
کی مختلف جماعتوں میں باہم گہرے دوستانہ تعلقات ہونے چاہئیں، لیکن
ہم کو اس بات سے سخت رنج معلوم ہوتا ہے کہ ان کوششوں کو جو ہندوستان
کی دو بڑی ہمسایہ قوموں کے تعلقات کو زیادہ دوستانہ اور ہموار بنانے کے
لئے کی جا رہی ہیں۔ بعض حلقوں میں بُرے معنے پہنائے جا رہے ہیں۔"

وائسرائے نے نہایت دوستانہ طرز و لہجہ میں جواب دیا اور مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا
ہونے کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی وفاداری کی پالیسی کا اعتراف کیا اس کے بعد

کہا کہ:-

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حال کے واقعات بیرون ہند کی وجہ سے مسلمانوں کے جذبات میں بہت بڑی حرکت پیدا ہوئی اور کچھ زمانہ تک ایک ایسی بے چینی کی حالت غالب تھی جس کو وہ لوگ جنہوں نے صرف پانی کے متموج سطح پر نظر ڈالی تھی ایک خطرناک علامت سمجھے تھے، لیکن جو لوگ سطح سے نیچے بھی دیکھ سکتے تھے وہ بخوبی اس بات سے آگاہ تھے کہ ان کی وجہ سے گورنمنٹ اور آپ کی قوم کے درمیان کوئی واقعی مخاصمت نہیں ظاہر ہوئی یہ سچ ہے کہ لوگوں کے دل زخمی ہو رہے تھے اور کہیں کہیں اس تکلیف کا اظہار تلخ اور گرم الفاظ میں ہو گیا ہے جن کے لئے بہتر ہوتا کہ نہ کہے جاتے، بدقسمتی سے یہ بھی صحیح ہے کہ انگریزی اور غیر ملکی اخباروں کو اس قسم کے اظہار خیال سے دھوکہ ہوا اور مسلمانوں کے سلسلہ خیالات کو سطحی طور پر سمجھنے کی وجہ سے انہوں نے آپ کی قوم کے رویہ کو غلط طور پر بیان کیا اور ایسے افعال و خیالات ان کی طرف منسوب کئے جن کو وہ لوگ سرتاسر غلط فہمی سمجھتے ہیں جو آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں جو الزامات آپ پر اور آپ کی قوم پر مجموعی طور سے لگائے گئے ہیں ان سے مخالفت کے خیال کے ساتھ میں پوری ہمدردی کر سکتا ہوں لیکن اس کے جواب میں میں آپ کو صرف اس بات کا یقین دلا سکتا ہوں کہ نہ تو میں نے اور نہ میری گورنمنٹ نے کبھی آپ کی مستحکم وفاداری میں شبہ کیا جس کے متعلق ہم بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کی قوم کی شریف ترین اور مقدس روایات میں سے ہے اس موقع پر مجھے بمشکل ان الفاظ کے دہرانے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے جو میں نے ۱۷ ستمبر کو لیجسلیٹو کونسل کے اجلاس میں بمقام شملہ کہے تھے اور جن کا منشا یہ تھا کہ برطانوی گورنمنٹ عرب کے مقدس مقامات کو علیٰ حالہ قایم رکھنے کی اشد ضرورت کو محسوس کرتی ہے لیکن میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کی قوم اور ہمارے ملک معظم کی گورنمنٹ کے درمیان یہ ایک اہم اور ضروری کڑی ہے اس لئے کہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کو مذہبی اغراض کے لحاظ سے اور مذہبی آزادی اور مقدس مقامات پر اسلامی حکومت

کے قایم رہنے کو گورنمنٹ جو اہمیت دیتی ہے ۱۰۳ اُس کے لحاظ سے برطانیہ عظمیٰ پر اس قسم کی ذمہ داری عاید ہوسکتی ہے اب جب کہ یورپ اور ایشیا میں خوش قسمتی سے امن کی حالت پیدا ہوگئی ہے تو میں آیندہ اعتماد اور امید کے ساتھ مسلمانوں کی ایک بڑا امن ترقی کے زمانہ کی توقع کرتا ہوں جب کہ مسلمان اپنی اصلاح اور تعلیم کی طرف متوجہ ہونگے اور اس سلطنت کی فلاح اور ترقی کی طرف جو ہم سب کے دل میں لگی ہوئی ہے تمام وفادار و معتدل اور سنجیدہ اہل الرائے گورنمنٹ کے ساتھ مل جل کر کام کرنے اور متحد ہونے کی پالیسی کو اختیار کرینگے"

اگرچہ یورپ کا سیاسی مطلع تو عرصہ سے مکدر تھا لیکن ۱۹۱۴ء کے آغاز میں جنگ کے آثار نہایت صاف و واضح نظر آنے لگے اور بالآخر پہلی ششماہی ختم ہوتے ہی جنگ چھڑ گئی اور سلطنت برطانیہ بھی اس میں شامل ہوگئی، تمام والیان ملک نے رؤسا و تعلقہ داروں نے تمام سیاسی اور سماجی لیڈروں نے سلطنت کی اخلاقی و مالی اور فوجی امداد و معاونت میں زبردست حصہ لیا، اور اس موقع پر تمام اختلافات بھلا دیے گئے یا ملتوی کردیے گئے، غرض ہر طرف ہندوستانی وفاداری کا ایک موجزن سمندر نظر آنے لگا۔

اس سال آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس سالانہ منعقد نہیں ہوا لیکن کانگریس کا اجلاس بمقام مدراس ہوا اور صدر کانگریس نے صدارتی ایڈریس میں مشورہ دیا کہ:۔

> "تمام اختلافات ختم کرکے صرف وہ ڈراما دیکھنا چاہیے کہ جو انسانی تاریخ میں کھیلا جارہا ہے، ہم کو چاہیے کہ دنیا کے سامنے ایک متحدہ سلطنت کی حیثیت سے پیش ہوں، تخت و سلطنت کے ساتھ انتہائی وفاداری کا پیغام بھیجیں ۔ ۔ ۔ ۔ برطانوی راج ہندوستان کے لیے چیلنج نہیں اس سلطنت کو حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلا اور سب سے بڑا اقدام جو کیا وہ خود یہاں کے باشندوں کی دعوت پر تھا جو کہ ایک زوال یافتہ حکومت میں گھبرا گئے تھے"

مولانا محمد علی نے تو جنگ چھڑتے ہی یعنی ۱۰ اراگست کو اپنے مشہور اخبار کامریڈ میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور ذمہ دار گروہ کے خیالات کی اس طرح ترجمانی کی کہ:-

"اب بھی بعض ایسے سنجیدہ لوگ خود ہندوستانیوں میں موجود ہیں اور اگرچہ وہ اپنی سرکاری خدمات کی تشہیر نہیں کرتے وہ جو کچھ بھی اثر لوگوں پر رکھتے ہیں اُسے وہ گورنمنٹ کی دشواریوں کے کم کرنے میں استعمال کریں گے نہ کہ بڑھانے میں ان سب سے بڑی قوی دلیل یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی موجودہ منزل ارتقا میں اس کا تعلق برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ رہنا لازمی وضروری خیال کرتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ یہ خودغرضی کا خیالی پست جذبہ بجائے خود جی حضوریوں کے زبانی وفاداری سے کہیں زیادہ حالات مخالف کے مقابلہ میں مضبوط اور بہتر ثابت ہوگا"

اس کے بعد انگلستان کی وعدہ خلافیوں اور غلط پالیسیوں کو گنا کر لکھا کہ:-

"ہم کہتے ہیں کہ ان سب سے قطع نظر کرکے یا زیادہ صحیح طور پر ان سب سے موازنہ کرکے ہم نے اس خیال کو سب پر مقدم پایا ہے کہ ہمارے لئے اپنی جماعتی و قومی ارتقا کی موجودہ منزل میں انگلستان کے زیر تربیت رہنا لازمی ہے اور یہ دیکھ کر کہ انگلستان نے ہمارے ساتھ جو برائیاں کی ہیں ان سے کہیں بھاری پلہ اس کے احسانات کا ہے ہم بصدق نیت اور بطیب خاطر اس کے وفادار رہیں گے عام اس سے کہ وہ جرمنی کی بحری قوت کو توڑ کر یورپ کا مطلق العنان حکمراں ہو جائے یا بحر شمالی میں اس کے عظیم الشان بیڑے کا آخری جہاز بھی غرق ہو جائے اور اس کا آخری سپاہی بیچ یا لندن میں کام آئے"

اگر انگلستان کو ہماری ضرورت نہ بھی ہو تو بھی ہمیں تو اس کی ضرورت باقی ہے ہم چونکہ سیاسی مکائد کے نہیں سیاسی خلوص کے قائل ہیں اس لئے زمانہ امن میں ہم نے انگلستان کے بڑے سے بڑے حکام سے نبرد آزمائی کی ہے لیکن زمانہ جنگ میں خانگی مناقشات میں ہتھیاروں کی جھنکار اور صدائے مخالفت

بند ہو جانی چاہئے۔ اگر ہم دوسروں میں اس جنگ کے لئے وہ جوش و سرگرمی پیدا نہیں کرسکتے جسے ہم خود بھی محسوس نہیں کر رہے ہیں تو بھی ہم گورنمنٹ کو یقین دلاتے ہیں کہ جہاں تک ہمارا اور ہمارے حلقہ اثر کا تعلق ہے وہ مطمئن رہ سکتی ہے صوبہ کے سرکاروں اور ان سے بھی بڑی سرکاروں یعنی خداوندان اضلاع تو الگ رہے اگر خانگی شورش رفع کرنے کی ضرورت ہوگی تو ادنے سے ادنے اور چھوٹے سے چھوٹا پولس کا پیادہ اپنے اشارہ پر ہمیں حاضر و آمادہ پائے گا ہم اس سے بڑھکر کوئی دعوی نہیں کرتے اور اس سے گھٹ کر کوئی توقع نہیں دلاتے یہی ہمارا مسلک اب تک رہا ہے، اب بھی ہے اور آیندہ بھی رہے گا"

اور جب آثار یہ پیدا ہوئے کہ ترک انگلستان کے خلاف اور جرمن کے رفیق بنکر میدان جنگ میں اتریں گے تو مولانا نے حکومت ہند کے ایما سے اپنی اور ڈاکٹر انصاری کی طرف سے طلعت پاشا کو اس مضمون کا تار دیا کہ "لڑائی میں شریک ہونے سے قبل ترکوں کو اچھی طرح غور کر لینا چاہیے"

اس کے بعد کامریڈ میں ترکوں کو چارہ کار کے عنوان سے ایک طویل مضمون شائع کیا جس کے خاتمہ بحث پر لکھا تھا کہ:۔

"ان سب لوگوں نے جو حقیقی وفادار ہیں کام کے ساتھ عمرانی بحث و مباحثہ کے باب کا خاتمہ کر دیا اور اب اسے پھر نظر بھر کر بھی نہ دیکھیں گے جو کچھ ہماری شکایات ہوں جو اصلاحات ہم چاہتے ہوں ہر چیز وقت مناسب کے لئے ملتوی رہے اگر گورنمنٹ بھی ہمیں وہ سب کچھ دیدے جو ہمیں محبوب و مطلوب ہے، مثلاً اگر یونیورسٹی ہمارے ہی شرائط پر دیدی جائے یا قانون مطابع کی منسوخی کا اعلان کیا جائے یا حکومت خود اختیاری تک ہمیں دیدی جائے تو ہم گورنمنٹ سے با ادب کہیں گے کہ یہ وقت اس کا نہیں ہے اور بالفعل ہم ان عطیات کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیں گے مراعات صلح کے زمانہ میں مانگی اور دی جاتی ہیں ہم روسی پولینڈ کی رعایا نہیں ہیں ہم رشوت نہیں

چاہئے ۔"

لیکن پھر بھی اسی مضمون کی اشاعت پر کامریڈ کی ضمانت ضبط کی گئی، اور جب ترک جنگ میں شریک ہو گئے تو مولانا نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ "اپنی روح خدا کے تفویض کریں اور ملک میں قیام امن کے لئے اپنی خدمات گورنمنٹ کے سپرد کریں"

اس تمام عرصہ میں انقلابی تحریکات برابر جاری رہیں اور لارڈ ہارڈنگ تک پر جنہوں نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کرائی تھی ۱۹۱۲ء میں جب کہ وہ جلوس کے ساتھ چاندنی چوک دہلی سے گذر رہے تھے خطرناک بم پھینکا گیا جس سے عرصہ تک اُن کی زندگی ہی خطرے میں رہی ۔"

۱۹۱۴ء کے موسم سرما میں پنجاب میں خوفناک وارداتیں ہوئیں، بنارس اور صوبہ متوسط میں بنگالی انقلاب پسندوں نے نئی سازش کی بنیاد ڈالی، آخر سال میں امریکہ سے بہت سے تارکان وطن سکھ واپس آئے جن کی آمد کے بعد ڈاکہ اور قتل کے واقعات کا سلسلہ تیزی سے بڑھ گیا اور فروری ۱۹۱۵ء میں فوجی بغاوت کی سازش کا انکشاف ہوا، ۱۹۱۴ء میں ان انقلاب پسندوں نے جو یورپ کے ملکوں میں تھے جرمن کے ساتھ سازشوں کی تھیں مگر چونکہ اُنھوں نے حالات سے بڑھ کر امیدیں باندھی تھیں اور جرمن والے جو مسلح بغاوت کے لئے اسلحہ بھیجنے والے تھے اس تحریک سے پورے واقف نہ تھے اس لئے ان کی سازش ناکام رہی پر آئیں بھی سازشوں کا سلسلہ جاری تھا جس کا مقصد غدر کے ذریعہ ہندوستان کو برطانوی حکومت سے نجات دلانا تھا۔ یوپی صوبہ ان سازشوں کا بڑا مرکز تھا جو ہندوستان سے باہر کے ممالک میں تھیں ساتھ ہی فوجی بھرتی اور روپیہ جمع کرنے کے متعلق عام بے چینی تھی صوبہ پنجاب کی حالت بہت خطرناک ہو گئی تھی، نظر بندیوں اور گرفتاریوں کا دور دورہ بھی تھا۔ مسلمانوں کی خاص حالت یہ تھی کہ ۱۹۱۰ء تک سازشوں میں ہی نہیں بلکہ کسی بے چینی میں بھی ملوث نظر نہیں آئے ۔"

البتہ ۱۹۱۱-۱۲ء کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اُنہوں نے مسلمانوں میں زبردست

بے چینی پیدا کر دی۔ ۱۹۱۲ء کے موسم سرما میں مولانا ظفر علی خاں اڈیٹر زمیندار نے بچشم خود معائنہ حالات کے لئے ترکی کا سفر کیا اسی دوران میں ترکی ہلال احمر کا مشن بسر کردگی ڈاکٹر عدنان بے ہندوستان آیا ۱۹۱۴ء کے اوائل میں ترکی جنرل قونسل خلیل خالد بے نے ہندوستان کے مشہور مقامات کا دورہ کرکے اس امداد کا شکریہ ادا کیا جو مسلمانان ہند نے دی تھی ترکی کے ساتھ ساتھ ایران کے حالات بھی وجہ اضطراب تھے کیوں کہ اسی زمانہ میں برطانیہ نے روس کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کیا جس سے کلیتہً ایران کو تباہ کرنا مقصود تھا با ایں ہمہ مسلمانوں نے ان نازک حالات میں نہایت محتاط طرز عمل رکھا اور ترکی سے برطانیہ کے خلاف شرکت سے باز رہنے کی درخواست کی۔

ترکی کی شرکت جنگ کے بعد برطانیہ اور اس کے اتحادیوں نے اعلان کیا کہ وہ عرب اور مقامات مقدس پر ہرگز حملہ نہ کریں گے تا وقتیکہ ہندوستانی حاجیوں کو کوئی تکلیف نہ پہونچائی جائے، مسلمان والیان ملک نے بھی مختلف پیرایوں سے مسلمانوں کو بہت کچھ اطمینان دلایا۔ آغاز جنگ کے بعد ہی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ (قانون تحفظ ہند) نافذ ہوا۔ مرکزی مجلس واضع قوانین میں جب اس کا مسودہ پیش ہوا تو ممبروں کو یقین تھا کہ اس کا استعمال نہایت صحیح طور پر کیا جائے گا مگر اس کے نافذ ہوتے ہی مئی ۱۹۱۵ء میں علی برادران نظر بند کر دیے گئے اور پھر ابو الکلام آزاد مولانا فضل الحسن حسرت اور مولانا ظفر علی خاں کی باری آئی۔

ان کے علاوہ چند علما پر بھی شبہات کئے گئے اور ان کی وجہ سے بعض کو سخت تکالیف کا سامنا ہوا، دیوبند کے مشہور محدث مولانا محمود حسن (رح) کی تمام زندگی درس و تدریس میں گذری تھی اور وہ مدرسہ دیوبند میں درس حدیث دیتے تھے۔ اس وقت تک انکو سیاسیات سے دور کا لگاؤ نہ تھا البتہ جب سے بلقان وار شروع ہوئی وہ اس کا مطالعہ اخبارات میں کرتے رہتے تھے اور ان کے وہی جذبات و احساسات تھے جو اس درجہ کے مسلمان کے ہونے چاہئیں، ستمبر ۱۹۱۵ء میں اپنے چند رفقا کے ساتھ حج کے لئے مکہ معظمہ چلے گئے۔

دوسرے قابل الذکر عالم مولوی عبیداللہ سندھی ہیں اُنہوں نے ۱۹۱۳ء میں بمقام دہلی فتحپوری کی مسجد میں مسلمان گریجویٹوں کی عربی تعلیم اور درس قرآن و حدیث کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس کی عرصے سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی ان کی تعلیم میں خاص کشش تھی چند ہی دن میں طلبا کی معقول تعداد ہوگئی ساتھ ہی ساتھ عربی و مذہبی فارغ التحصیل طلبا کی انگریزی تعلیم کا بھی ایک شعبہ تھا، اس مدرسہ کی ہر طرف سے تائید کی گئی اور جا بجا سے امدادیں بھی مقرر ہوگئیں، آغاز جنگ ہوتے ہی ان پر مشتبہ نظریں پڑنے لگیں اسلئے اُنہوں نے ہندوستان سے ہجرت مناسب سمجھی اور کابل کی طرف رُخ کیا۔

ان ہر دو علما اور ان کے رفقا پر اس سازش کا الزام لگایا گیا کہ وہ برطانیہ کی شکست کے بعد ہندوستان میں ایک عارضی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا محمود حسن مکہ معظمہ میں مقیم تھے، شریف حسین ترکوں سے غداری کرکے برطانوی سایہ میں آچکا تھا، اُس نے مولانا کو انگریزوں کے سپرد کردیا اور وہ مع رفقا مالٹا میں نظر بند کردیے گئے، مولانا عبیداللہ سندھی ہاتھ نہ آئے اور وہ مختلف ممالک میں سیر و سیاحت کرتے رہے۔

ہندوستان اور بالخصوص پنجاب میں جو بے چینی اور جو صورت حال تھی اس کے لحاظ سے گورنر جنرل لارڈ چیمسفورڈ بہ اجلاس کونسل یعنی حکومت ہند نے بمنظوری وزیر ہند انقلابی تحریکوں کے متعلق مجرمانہ سازشوں کی اصلیت اور وسعت کی تحقیقات کے لئے سر سڈنی رولٹ کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی جس میں پانچ انگریز اور دو ہندوستانی (مدراسی و بنگالی ہندو) ممبر مقرر کئے، ان انگریزوں میں ہائیکورٹوں کے تین جج بھی تھے۔

کمیٹی نے تین مہینہ کے اندر اپنی رپورٹ پیش کردی اس کی تحقیق خفیہ پولس کی رپورٹوں اور بعض مجرموں کے بیانوں اور اقبالوں پر مبنی تھی، اس میں ایک خاص عنوان متذکرہ صدر

(**نوٹ**) مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے متعلق کئی سال کی خاموشی کے بعد مسٹر محمد علی جناح کے سوال کے جواب میں حکومت نے صرف اتنا بتایا کہ "چونکہ ان کو ملک معظم کے دشمنوں کے ساتھ بہت ہمدردی تھی اسلئے نظر بند کئے گئے۔"

مولانا عبیداللہ سندھی کو ۱۹۳۸ء میں ہندوستان واپس آنے کی اجازت ملی۔

ہر دو علما اور مسلمانوں کے متعلق بھی حسب ذیل ہے۔

ریشمی خطوط والے سازشی

اگست ۱۹۱۶ء میں اس سازش کا انکشاف ہوا جو گورنمنٹ کے کاغذات میں ریشمی خطوط کی سازش کہلاتی ہے۔ یہ ایک تجویز تھی جو ہندوستان میں ہی تیار کی گئی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شمالی مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو اور ہندوستان کے مسلمان اُٹھ کھڑے ہوں اور سلطنت برطانیہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس تجویز پر عمل کرنے اور اس کو تقویت دینے کے لئے ایک شخص مولوی عبید اللہ نے اپنے تین رفقا عبداللہ فتح محمد اور محمد علی کو ساتھ لیکر اگست ۱۹۱۵ء میں شمالی مغربی سرحد کو عبور کیا۔ عبید اللہ سکھ سے مسلمان ہوا ہے اور صوبجات متحدہ کے ضلع سہارن پور میں مسلمانوں کے مذہبی مدرسہ دیوبند میں اس نے مولوی کی تعلیم پائی ہے وہاں اس نے اپنی جنگی اور خلاف برطانیہ خیالات سے عملہ مدرسہ کے بعض لوگوں اور کچھ طلبا کو متاثر کیا اور سب سے بڑا شخص جس پر اس نے اثر ڈالا وہ (مولانا) محمود حسن تھا جو اسکول میں بہت دیر تک ہیڈ مولوی رہ چکا ہے۔ عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے تمام ہندوستان بھر میں ایک عام اسلامی جوش اور برطانیہ کے خلاف تحریک پھیلائے لیکن اس کی تجاویز کی راستہ میں مدرسہ کے مہتمم اور انجمن کے لوگ سدّراہ ہوئے، انھوں نے اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو مدرسہ کی ملازمت سے برخاست کر دیا۔ اس امر کا بھی ثبوت مل چکا ہے کہ وہ بعض حالات میں مصیبت میں گرفتار رہا پھر بھی وہ (مولانا) محمود حسن کے پاس عام طور پر آتا رہا اور مولانا کے مکان پر خفیہ جلسے ہوتے رہے اور اس بات کی بھی اطلاع ملی ہے کہ سرحد سے بھی کچھ آدمی وہاں آئے تھے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولانا محمود حسن نے بھی ایک شخص محمد میاں اور اور دوستوں کے ساتھ عبید اللہ کی مثال کی پیروی کی اور شمال کی طرف جانے کے لئے نہیں بلکہ عرب کے صوبہ حجاز میں مقیم ہونے کی غرض سے ہندوستان چھوڑ دیا، روانہ ہونے سے پہلے عبید اللہ

نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا اور دو ایسی کتابیں معرض اشاعت میں لایا جن میں ہندوستانی مسلمانوں کو جنگی اور مذہبی جوش کی ترغیب دی گئی تھی اور انکو جہاد کے فرض ادا کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا۔ اس شخص کا اور اس کے دوستوں کا جن میں (مولانا) محمود حسن بھی شامل ہیں عام مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک زبردست حملہ ہندوستان پر ہو اور مسلمانوں کی بغاوت سے اسکو تقویت پہونچے ۔

اب ہم ذیل میں ان کوششوں کا ذکر کریں گے جو ان لوگوں نے اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لئے کیں۔

عبیداللہ اور اس کے دوست پہلے ہندوستانی مجنونان مذہبی کے پاس گئے اور اس کے بعد کابل پہونچے وہاں وہ ترکی جرمن مشن کے ممبروں سے ملے اور ان سے تبادلہ خیال کیا اور تھوڑے عرصے کے بعد ان کا دیوبندی دوست مولوی محمد میاں انصاری بھی آن ملا یہ آدمی (مولانا) محمود حسن کے ساتھ عرب گیا تھا اور ۱۹۱۶ء میں وہ اعلان جہاد لیکر آیا جو حجاز کے ترکی فوجی حاکم غالب پاشا نے (مولانا) محمود حسن کو دیا تھا اثنار راہ میں محمد میاں اس تحریر (جو غالب نامہ کے نام سے مشہور ہے) کی نقلیں ہندوستان اور سرحدی قوموں میں تقسیم کرتا ہوا آیا۔ عبیداللہ اور اس کے ساتھی سازشی لوگوں نے ایک تجویز تیار کی تھی کہ جب سلطنت برطانیہ کو مٹا دیا جائے تو ہندوستان میں ایک عارضی حکومت قائم کی جائے۔ ایک شخص مہندر اپرتاب اس کا پریسیڈنٹ ہونے والا تھا یہ شخص ایک اچھے خاندان کا ہندو اور خود رائے وہمی سیرت کا آدمی تھا اور ۱۹۱۴ء سے اٹلی سوٹزرلینڈ اور فرانس میں سفر کرنے کا پروانہ راہداری دیا گیا تھا وہ سیدھا جنیوا کو گیا وہاں ہردیال سے ملا اور ہردیال نے اس کا جرمن قونسل سے تعارف کرا دیا اس کے بعد وہ برلن چلا گیا۔

ایک شخص جو عبیداللہ کو اچھی طرح جانتا ہے اس کی نسبت وہ لکھتا ہے کہ وہ شخص تجویزیں تیار کرنے میں بہت عجیب اور غیر معمولی آدمی تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑی سلطنت کا حکمراں ہے مگر جہاں کام کرنے کا وقت آجائے تو وہ بہت سست تھا اور کام کرنے میں جی چراتا تھا اور وہاں سے کسی خاص مشن کے لئے بھیج دیا گیا تھا کیوں کہ

اُس نے جرمنوں پر اپنی اہمیت کا اثر مبالغہ آمیز طریق پر ڈالا تھا"

خود عبید اللہ ہندوستان کا وزیر ہونے والا تھا اور کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر برکت اللہ جس نے برلن کے راستہ کابل کا سفر کیا تھا وزیر اعظم ہونے والا تھا۔ یہ شخص ریاست بھوپال کے ایک غلام کا بیٹا تھا اور انگلستان، امریکہ اور جاپان ہو آیا تھا۔ یہ شخص ٹوکیو میں ہندوستانی کا پروفیسر ہوا تھا اور وہاں اُس نے برطانیہ کے خلاف ایک نہایت تیز اخبار اسلامک فیٹرنٹی کے نام سے جاری کر رکھا تھا۔ اس اخبار کو بعد میں جاپانی حکام نے بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے عہدے سے موقوف کر دیا گیا۔ اور پھر امریکہ جاکر وہ اپنی غدری دوستوں سے مل گیا"

وہ جرمن جو افغانستان میں اپنے مقاصد کے لئے آئے تھے جب ناکام رہے تو ۱۹۱۶ء میں واپس چلے گئے مگر ہندوستانی وہیں رہے اور حکومت عارضی والوں نے روسی ترکستان کے حاکم اور زار روس کو اس مضمون کے خطوط لکھے کہ روس کو چاہیے کہ برطانیہ کلاں کے اتحاد کو خیرباد کہکر سلطنت برطانیہ کو مٹا دینے کی کوشش میں امداد کرے ،، ان خطوط پر مہندر پرتاب کے دستخط تھے، آخر خطوط برطانیہ کے ہاتھ آگئے، شہنشاہ روس کے نام جو خط تھا وہ سونے کے پترے پر لکھا گیا تھا جسکی عکسی تصویر ہم کو دکھائی گئی ہے"

حکومت عارضی نے ترکی گورنمنٹ کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی تجویز کی اور اس مقصد کے حصول کے لئے عبید اللہ نے اپنے پرانے دوست (مولانا محمود حسن) کو خط لکھا۔ یہ خط ایک اور خط مورخہ ۸ رمضان مطابق ۹ جولائی ۱۹۱۶ء کے ساتھ جو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا بند کر کے اُس نے حیدرآباد سندھ کے شیخ عبد الرحیم کے نام ایک نوٹ لکھکر بھیجدیا یہ شخص اُس وقت مفقود الخبر ہے، شیخ عبد الرحیم سے اس نوٹ میں یہ التجا کی گئی تھی کہ وہ کسی معتبر حاجی کے ہاتھ وہ خطوط مکہ میں مولانا محمود حسن کو پہونچا دے وہ خطوط زرد ریشمی کپڑے پر بہت صاف اور خوش خط لکھے ہوئے ہیں۔ محمد میاں کے خط میں یہ باتیں لکھی تھیں ———— جرمن اور ترک وفود کا آنا

جرمنوں کا واپس چلے جانا۔ ترکوں کا بغیر کسی کام کے رہ جانا۔ غالب نامہ کی اشاعت حکومت عارضی کی تجویز اور خدائی فوج کی ساخت۔

اس فوج کی نسبت یہ تجویز تھی کہ اس کے لئے ہندوستان سے رنگروٹ بھرتی کئے جائیں اور مسلمان حکمرانوں کے درمیان اتحاد پیدا کیا جائے۔ محمود حسن ان تمام معاملات کو عثمانی حکومت تک پہونچانے پر مقرر تھا۔ عبیداللہ کے خط میں خدائی فوج کی تجویز کا ایک نقشہ تھا اس فوج کا ہیڈ کوارٹر مدینہ اور اس کا جنرل ان چیف محمود حسن ہونے والا تھا، دوسرے ہیڈ کوارٹر مقامی جنرلوں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم ہونے والے تھے، کابل میں خود عبیداللہ جنرل مقرر ہونے والا تھا، اس نقشہ میں تین سرپرستوں، بارہ فیلڈ مارشلوں اور بہت سے اور اعلےٰ فوجی افسروں کے نام تھے۔ لاہور کے بھاگے ہوئے طالب علموں میں سے ایک میجر جنرل، ایک کرنل اور چھ لفٹیننٹ کرنل ہونے والے تھے جو اشخاص ان اعلےٰ عہدوں کے لئے منتخب کئے گئے تھے ان میں سے اکثر ایسے تھے جن سے ان کے تقرر کی نسبت مشورہ نہیں لیا گیا تھا لیکن ریشمی خطوط سے جو اطلاعات ملیں اُن میں بعض تدارک ضروری تھے اور وہ کئے گئے۔

دسمبر ۱۹۱۶ء میں اور ان کے چار رفقا برطانیہ کے ہاتھ آگئے اور وہ اس وقت جنگی قیدی ہیں اور برطانیہ کی سلطنت کے ایک حصّہ میں نظر بند ہیں، غالب پاشا بھی جس نے غالب نامہ پر دستخط کئے تھے آج کل جنگی قیدی ہے، اور وہ اس امر کا اقبال کرتا ہے کہ اس نے اس کاغذ پر دستخط کئے تھے جو محمود حسن پارٹی نے اس کے روبرو پیش کیا تھا اس کے ضروری حصّوں کا ترجمہ یوں ہے۔

ایشیا، یورپ اور افریقہ کے مسلمان ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ ہو کر خدا کی راہ میں جہاد کے لئے اوٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ خدائے قادر و قیوم کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین دشمنان اسلام پر غالب آگئے ہیں اس لئے اے مسلمانو اس ظالم عیسائی حکومت پر حملہ کردو جس کی قید میں تم پڑے ہوئے ہو بہت جلد عزم صمیم سے اپنی تمام کوششوں کو دشمن کے مار ڈالنے کے لئے وقف کردو اور ان سے نفرت اور دشمنی

ظاہر کرو، تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ مولوی محمود حسن افندی (جو پہلے ہندوستان کے مدرسہ دیوبند میں تھے) ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم سے مشورہ لیا۔ ہم نے اس خیال میں ان کی تائید کی اور انہیں ضروری ہدایات دیدی ہیں، اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو تم اُن پر اعتماد کرو اور آدمیوں اور روپے اور ہر چیز سے جو وہ طلب کریں ان کی امداد کرو۔"

اس باب میں جو واقعات لکھے گئے ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ چند مسلمان مذہبی مجنون ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کی کس قدر خواہش مند تھے اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لئے انھوں نے برطانیہ کے دشمنوں کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، جنگ برپا کرنے کے لئے ان کے طریقے یہ ہیں کہ پہلے خفیہ اور پُراسرار سازشیں اور تجاویز کی جائیں اور پھر آشکارا طور پر فساد کھڑا کیا جائے کبھی وہ رنگروٹ بھیجتے کبھی چندے جمع کرتے پھرتے ہیں کبھی روپیہ جمع کرتے ہیں کبھی وہ خود جاتے ہیں وہ ہمیشہ بغاوت کے وعظ کرتے ہیں، ان کی تجاویز سے محفوظ رہنے کے لئے عام مسلمانوں کی وفاداری اور گورنمنٹ کی طاقت کا رعب واثر ہی دو ذریعے ہیں۔"

اسی افسانہ کے سلسلہ میں غدر پارٹی کے مسلمانوں کا بھی ایک باب ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ برما میں جو غدر پارٹی تیار ہوئی تھی اس میں کہیں کہیں مسلمانوں کا نام آتا ہے ایک ترکی اخبار جہان اسلام کے نام سے قسطنطنیہ سے ۱۹۱۴ء میں جاری ہوا جس کا اردو حصہ ایک پنجابی ابوسعید نامی تیار کرتا تھا جس میں ہندوستان میں غدر برپا کرنے کی ترغیب ہوتی تھی یہ ترغیب ہر دیال کے اثر سے تھی جو ستمبر ۱۹۱۴ء میں قسطنطنیہ گیا اور ابوسعید کے پاس ٹھہرا، کہا گیا ہے کہ ابوسعید کی تجویز پر ینگ ٹرکش پارٹی کا ایک ممتاز ممبر توفیق بے ۱۹۱۳ء میں رنگون آیا اور اس نے رنگون کے ایک تاجر احمد ملا داؤد کو ترکی قونصل کا عہدہ پیش کیا، چنانچہ زمانہ جنگ میں وہ اس عہدہ پر تھا۔ ترکی کے داخلہ جنگ کے وقت انجمن ہلال احمر کے دو ہندوستانی ممبر حکیم فہم علی اور علی احمد صدیقی رنگون آئے یہ جنگ بلقان کے زمانہ میں ہندوستان سے ترکی کی امداد کے لئے گئے تھے۔

رنگون کے بعض مسلمان اس وقت غیر مطمئن اور بگڑے ہوئے سے تھے ماہ نومبر

۱۳۰ بلوچی پلٹن بمبئی سے وہاں پہونچی جس میں زیادہ تر مسلمان تھے اور جو اس جرم کی سزا میں رنگون بھیج دی گئی تھی کہ اس کے سپاہیوں نے اپنے ایک افسر کو مار ڈالا تھا۔ کچھ مدت کے بعد رنگون کے مسلمانوں نے ان کو اخبار غدر کے مضامین سنائے جن سے متاثر ہو کر جنوری ۱۹۱۵ء کے قریب ان کی پلٹن بگڑ گئی اور غدر کے لئے بالکل تیار ہو گئی۔ لیکن فوجی حکام نے اس سازش کا راز معلوم کر لیا اور دو سو سازشیوں کو سزائیں دی گئیں۔

۲۸ دسمبر ۱۹۱۵ء کے قریب ایک گجراتی مسلمان قاسم منصور کے چند خطوط پکڑے گئے جو اس نے اپنے بیٹے کے نام رنگون کے پتہ پر لکھے تھے، ان خطوط میں سے ایک میں ملایا .MALAYA اسٹیٹ گائڈس پلٹن کی طرف سے ملا احمد داؤد سے التجا کی گئی تھی کہ ہماری پلٹن حکومت برطانیہ کے خلاف غدر کرنے اور ترکوں کی طرف سے لڑنے کے لئے تیار ہے اس لئے آپ ایک ترکی جنگی جہاز سنگاپور بھیج دیں، اس کی اطلاع فوراً حکام کو ہوئی اور مذکورہ بالا پلٹن کو کسی اور جگہ بھیج دینے کا حکم دیا گیا۔ تاہم سنگاپور کی ایک اور پلٹن ۵ کے سخت غدر کو حکام نہ روک سکے جو ان ہندو اور مسلمانوں کی سازشیوں نے پھیلایا تھا جو امریکہ کی غدر والی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اس اثناء میں علی احمد اور حکیم فہم علی ایک خفیہ انجمن بنا رہے تھے جس کا مقصد حکومت برطانیہ کو اُڑا دینے کی کوشش تھا، انھوں نے پندرہ ہزار روپیہ چندہ جمع کیا۔ میمن مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی فہرست خدمات بنائی ایک بڑے مشہور چور کو پستول جمع کرنے پر مقرر کیا اور اپنی انجمن کو راز میں رکھنے کے لئے قواعد بنائے مگر یہ سب سازشیں پکڑی گئیں۔ اُس وقت یہ کوشش بھی کی گئی جو پندرہ ہزار آدمیوں کی جمعیت سے ہے اور سکھ اور پنجابی مسلمانوں پر مشتمل ہے متاثر کیا جائے۔ برما کی سازش بھی ناکام رہی اور بڑے بڑے سازشی جن میں مسلمان بھی تھے نظر بند کر دیئے گئے۔

بابِ پنجم

اقتضائے حالات کی بنا پر ۱۹۱۴ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد نہ ہو سکا لیکن ۱۹۱۵ء کے حالات مختلف اور اجلاس کے متقاضی تھے۔ البتہ ایک جماعت التوا کی ہی موید تھی اس کے نزدیک جنگِ عظیم میں ترکی کی شرکت برخلاف برطانیہ نے مسلمانانِ ہند کی پوزیشن نازک بنادی تھی اور جنگ کے متعلق کسی قسم کا اظہار خیال حکومت کے راستہ میں جنگ کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے ایک مزاحمت کے مرادف سمجھا گیا۔ لیکن دوسری بڑی جماعت اس امر پر اتفاق کرتے ہوئے کہ حکومت کی پریشانی میں ذرہ برابر اضافہ نہ ہو اور مادّی و اخلاقی امداد میں پوری کوشش کی جائے سالانہ اجلاس کا انعقاد چاہتی تھی، اس کا خیال تھا کہ جنگ آیندہ موسم بہار میں ختم ہو جائے گی اور نئے حالات اور نئے مسائل پیدا ہوں گے جن کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے طے کرنا ہوگا، نیز بحالات موجودہ مسلمانوں کی خاموشی کے مخالف اور شرارت آمیز معنی سلئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ یہ وہ قوم تھی کہ جس نے حکومت کے حق میں کوئی آواز بلند نہیں کی اور اُس نے پریشانی کے وقت کوئی ساتھ نہیں دیا ہمارے ماضی کو بھلا دیا جائے گا اور ہماری حالیہ خاموشی ہمارے منہ پر ماری جائے گی، ان احساسات و خیالات کے ساتھ (جن کو مسٹر مظہرالحق صدر اجلاس نے اپنے خطبہ صدارت میں بیان کیا تھا) کہ بمبئی میں ماہ دسمبر انعقاد اجلاس کا مسئلہ طے ہو گیا لیکن ایک مخصوص جماعت جس کے لیڈر سردار سلیمان حاجی قاسم مٹھا، سی، آئی۔ ای تھے نہیں چاہتی تھی کہ بمبئی میں یہ اجلاس ہو، لیکن جب مسٹر محمد علی جناح اور دیگر ممتاز اصحاب نے اسی مقام کو طے کر لیا تو یہ مخالفت جماعت جو ایوان حکومت میں با اثر تھی آمادۂ فساد ہو گئی اور حالات نے نازک صورت اختیار کر لی، نیشنل کانگریس کا اجلاس بھی یہیں منعقد ہونے والا تھا، بالآخر اجلاس سے کچھ ہی قبل گورنر بمبئی نے مداخلت کی اور فریقین کو بلا کر سمجھوتہ کر دیا، اور جو رزولیوشن لیگ میں پیش ہونے والے تھے وہ بھی متعین ہو گئے؛

۳۰؍دسمبر کو اجلاس شروع ہوا، اجلاس کے لئے مزین لائن پر سمندر کے کنارہ ایک خوشنما پنڈال بنایا گیا تھا تقریباً ہر حصہ ہند سے ڈیلیگیٹ شریک ہوئے تھے، پانچ ہزار سے زیادہ کا مجمع تھا۔

پہلے اجلاس میں مسٹر ایس۔ پی سنہا پریسیڈنٹ کانگریس، مسٹر ڈنشا واچہ صدر مجلس استقبالیہ کانگریس، بابو سریندر ناتھ بنرجی، سرپی، ڈی پٹانی۔ راؤ بہادر مسٹر مدہولکر پنڈت مدن موہن مالویہ، مسٹر ایم۔ کے گاندھی، مسٹر ہارنیمن اڈیٹر بمبئی کرانیکل مسٹر اینی بسنٹ مسز سروجنی نائڈو زعمائے کانگریس بھی وزیٹر کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ مسلم لیگ کے والنٹیروں کے ساتھ ساتھ کانگریس کے والنٹیر بھی کام کر رہے تھے، اُس وقت کا نظارہ ہندوستان کی نئی سیاسی زندگی کا نظارہ تھا۔

مسٹر مظہر الحق پریسیڈنٹ نے ایک معرکۃ الآرا خطبہ صدارت پڑھا جس میں تمام مسائل وقت پر پُرجوش مگر سنجیدہ بحث تھی، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے فرائض پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ "**اب** ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہماری قومیت اور مذہب کے ہم پر کیا فرائض ہیں"

"ہمارا پہلا فرض خدا کی عبادت ہے جو کہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور تمام ممالک اور قوموں کی قسمت کا مالک ہے۔ ہم مسلمان تو قرآن اور رسول خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ اور صرف ایک ہی راستہ سے اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ ؕ اسی سلسلہ میں اور قوموں کے متعلق جو فرائض ہیں ان کے متعلق کہا کہ "سب **فرقوں** کو ایک دوسرے کی بہبودی کا خیال رکھنا چاہیئے اور اپنی مادر وطن کی ترقی کے لئے باہمی تعاون کرنا چاہیئے انھوں نے انتخابات جداگانہ پر بحث کرتے ہوئے تجویز کی کہ تمام فرقوں کے مقتدر لیڈروں کو ایک گول میز کانفرنس منعقد کرکے دوستانہ طریقہ سے اس مسئلہ کا حل سوچ لینا چاہیئے اور دیگر مسائل کو بھی دادوستد کی اسپرٹ میں طے کر لینا چاہیئے۔

ایڈریس کے بعد تعزیتی رزولیوشن پیش ہوا اور جلسہ ختم ہو گیا۔

دوسرے دن ۲ بجے پھر جلسہ شروع ہوا لیکن آج اور ہی رنگ تھا جلسہ سے نصف

گھنٹہ پہلے مسٹر ایڈورڈ پولس کمشنر اپنے ماتحت ۱۱۷ اسٹاف کے ساتھ پنڈال کے سامنے گھوم رہے تھے پچاس لاٹھی بند کانسٹیبل بھی حاضر تھے پریسیڈنسی مجسٹریٹ بھی آئے گئے خفیہ پولس کے متعدد ہندوستانی اور انگریز افسر وزیٹری کے ٹکٹ لے کر پنڈال میں داخل ہوئے اور دیگر مسلمان بھی وزیٹر گیلری میں تھے۔

اب یہ رزرلیوشن پیش ہونے والے تھے (۱) مسلمانوں کی وفاداری کا اظہار (۲) لارڈ ہارڈنگ وسیرائے ہند کی توسیع میعاد (۳) ریفارم اسکیم کمیٹی کا انعقاد،

ایک رزولیوشن "ادارات بلدیہ میں فرقہ وارانہ انتخاب کا بھی تھا، جس سے مولانا حسرت موہانی کو اتفاق نہ تھا اور انہوں نے آغاز کارروائی سے پہلے اپنا ارادہ ظاہر کردیا تھا کہ وہ تحریک التوائے اجلاس پیش کریں گے ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ ان رزولیوشنوں کے سوا اور کوئی رزولیوشن نہ لیا جائے جو مجلس مصالحت میں طے ہوچکے ہیں، کارروائی شروع ہونے پر مولانا نے اپنی تحریک پیش کرنی چاہی لیکن صدر کے حکم کے اتباع میں خاموشی اختیار کی اور دو رزولیوشن پاس ہوگئے۔ جب تیسرے رزولیوشن کی نوبت آئی تو پھر مولانا حسرت نے تحریک التوائے اجلاس پیش کرنی چاہی مگر صدر نے اجازت نہ دی، مولانا نے تو سکوت اختیار کیا لیکن ایک مولوی عبدالرؤف نامی جو ایک انجمن کے سکریٹری تھے وزیٹر گیلری میں کھڑے ہوئے اور باندازِ خاص غیر متعلق اعتراضات شروع کردئے۔ جب صدر ان کو فہمایش کرنے لگے تو ایک اور صاحب نے وزیٹر سیٹ کی جگہ سے صدر کی صورت اور وضع قطع پر اعتراض شروع کردیا۔ یہ ابھی خاموش نہوئے تھے کہ بمبئی کے پٹھانوں کا سرغنہ جس کا پولس کمشنر سے خاص تعلق اور واسطہ ہوتا ہے ان کی تائید میں کھڑا ہوگیا اور کہا کہ جلسہ کی کارروائی اردو فارسی کے سوا کسی اور زبان میں نہ ہو تاکہ جن معاملات پر بحث ہو اس کو سب مسلمان سمجھ سکیں اسی دوران میں سردار قاسم مٹھانے بھی ایک پریشان تقریر شروع کردی صدر نے سرغنہ کو ڈائس پر بلا کر سمجھایا اور وعدہ کیا کہ باقی کارروائی اردو میں ہوگی۔ اس کے بعد مولانا حسرت نے بہ اجازت صدر نہایت سنجیدہ اور مصلحانہ تقریر کی اور رزولیوشنوں کے متعلق اپنا نقطہ

نظر پیش کیا گیا مگر پھر شور و شغب جاری ہو گیا، ہمیں میں سردار مطّا اور مولوی عبدالرؤف پیش پیش تھے سردار نے اس امر پر بہت زور دیا کہ یہ کانفرنس لیگ کو کانگریس میں ضم کرنا چاہتی ہے اور جو مقصد کہ اس کے قیام کا مسلمان رہنماؤں کا اور ہمارا تھا اس کو پامال کیا جارہا ہے لیگ کو تاریکی میں ڈالدیا ہے اور صفحہ ہستی سے مٹا کر کانگریس میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں بالآخر اس شور و شغب کے باعث جلسہ ملتوی کرنا پڑا پولس کمشنر سے جو مدد مانگی گئی نہیں ملی البتہ لاٹھی چارج کرنے پر آمادگی ظاہر کی گئی لیکن لیگ کے کارکن کوئی موقع ایسا پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے کہ فساد ہو اور پولس دست اندازی کرے یا سورت کے اجلاس کانگرس کا نظارہ پیش آجائے وہ تو سب سمجھتے تھے مگران شرارت پسندوں اور شرانگیزوں کے سوا اور ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ اس شہر میں پس پردہ کس کا ہاتھ ہے، اس لئے التوا ہی مناسب تھا، مگر اس افسوسناک ڈرامے سے سب ہی متاثر تھے۔

دوسرے دن تاج ہوٹل میں ممبران لیگ کی میٹنگ ہوئی۔ مسٹر محمد علی جناح نے ریفارم اسکیم کے متعلق ایک رزولیوشن اپنی تمہیدی گفتگو کے ساتھ پیش کیا جس کا مفاد یہ تھا کہ "جدید اصلاحات کا مسئلہ سامنے آرہا ہے لہٰذا ایک کمیٹی ذمہ دار مسلمانوں کی بنائی جائے جو اصلاحات کا فارمولا مرتب کرے اور وہ کمیٹی مختار ہو کہ وہ اپنی اسکیم کے متعلق دوسری سیاسی جماعتوں مثلاً کانگریس سے بھی مشورہ کرے لیگ اور کانگریس ہی ہندوستان کی دو بڑی سیاسی اور نمائندہ جماعتیں ہیں اور کمیٹی کو چاہئے کہ مسلمانوں کے منشا اور ضروریات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اسکیم بنائے اور بحدامکان کانگریس اسکیم کے مطابق ہو جب ایسی متفقہ اسکیم مرتب ہو جائے تو حکومت سے کہا جاسکے گا کہ یہ وہ اصلاحات ہیں جو متحدہ ہندوستان کو مطلوب ہیں"

یہ رزولیوشن مولوی فضل الحق (پریمیر بنگال) مولانا ابوالکلام آزاد، نواب غلام محمد مدراس اور دیگر اصحاب کی رائے سے پاس ہوا۔ بعض ترمیمیں بھی پیش ہوئیں مگر کسی نے زور نہیں دیا اور واپس لے لی گئیں اور رزولیوشن بلا اختلاف پاس کیا گیا اور کمیٹی میں مختلف صوبوں سے ممبر منتخب کئے گئے۔

دوسرا رزولیوشن "ادارات بلدیہ میں جداگانہ انتخاب" تھا جس کے محرک آگرہ کے سید آل نبی (مرحوم) اور سوئیدّ مدراس کے سیٹھ یعقوب حسن (وزیر مدراس گورنمنٹ) تھے، یہ بھی کسی قدر اختلاف کے بعد پاس ہوگیا، اور پھر کمیٹی تجاویز مرتب کرنے میں مصروف رہی تا آں کہ نومبر ۱۹۱۶ء میں بمقام کلکتہ (سر) سریندر ناتھ بنرجی کی صدارت میں کانگریس اور لیگ کی کمیٹیوں کی ایک مشترکہ میٹنگ ہوئی، چاروں کے غور وخوض اور باہمی سمجھوتہ کے بعد ایک اسکیم مرتب کی گئی جس میں مسلمانوں کے حقوق کا پورا تحفظ رکھا گیا اور جو میثاق لکھنؤ کے نام سے بھی مشہور ہے،

دسمبر ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کانگریس کا اجلاس زیر صدارت مسٹر امبکا چرن مجمدار اور لیگ کا اجلاس زیر صدارت مسٹر جناح منعقد ہوا۔

لیگ کے صدر نے اپنے خطبہ صدارت میں اس میثاق یا اسکیم کے متعلق کہا کہ:۔

میں اپنی پبلک زندگی میں ہمیشہ پکّا کانگریسی رہا ہوں اور فرقہ وارانہ شوروغل کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کا جو الزام مسلمانوں کے سر تھوپا جاتا ہے وہ نہایت نامناسب اور غیر متعلق ہے جب کہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ عظیم الشان قومی نظام سرعت کے ساتھ متحدہ ہندوستان کی پیدائش کا ایک طاقتور آلہ بنتا جاتا ہے، ایک قلیل جماعت کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کو اپنی حفاظت کا کامل اطمینان ہو قبل اس کے کہ قومی کاموں میں اس کے وسیع تر سیاسی احساس کو باہمی امداد اور متحدہ کوشش پر آمادہ کیا جائے مسلمانان ہند کو یہ طمانیت بہ حیثیت ایک جماعت کے اپنی سیاسی ہستی کے کامل اور موثر تحفظ ہی کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے۔ میری ذاتی رائے جو کچھ بھی ہو لیکن یہاں میرا یہی فرض ہے کہ مسلمانوں کی کثیر التعداد جماعت کی رائے کی ترجمانی کروں۔ جس کا آل انڈیا مسلم لیگ سیاسی آلہ ہے۔ یہ امر میرے لئے اور ہر محبّ وطن کے لئے نہایت طمانیت بخش ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کی جماعتی حیثیت کو ہندو جماعت کے لیڈروں نے تسلیم کیا ہے اور اس کے ساتھ فراخدلی کا برتاؤ کیا ہے، انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا

مسلم لیگ کی کمیٹیوں نے گذشتہ نومبر میں کلکتہ میں ملکر جو عہد اور متفقہ فیصلہ کیا تھا وہ اس کی بین دلیل ہے، دونوں فریقوں میں چند ایسے نفوس جنکا رضامند ہونا محال ہے اب بھی ممکن ہے کہ کہیں کہیں موجود ہوں لیکن بہ حیثیت مجموعی فرقہ وارانہ ابر کے خوف سے مطلع صاف ہو گیا ہے اور مستقبل کے مناظر ان علامات سے چمک اٹھتے ہیں جو ہندوستان کے وفادار فرزندان کے دل خوشی سے معمور کر دیتے ہیں۔

جس طرح میں اپنی قوم کے اس رکن سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا۔ جو باوجود قومی ہستی کی توثیق کے اپنے ہندو بھائی کی طرف دست مروت نہیں بڑھاتا۔ اسی طرح میں ہندو محب وطن کے رویہ کی بھی تعریف نہیں کر سکتا۔ جو اپنے ایک پونڈ گوشت پر مصر ہے۔ خواہ اس کشمکش میں کسی ایک فریق کے جزوی نفع کے لئے تمام ملک کا مستقبل ہمیشہ کے لئے برباد ہی کیوں نہ ہو جائے مثال کے طور پر میں حال کے افسوسناک نزاع کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو میونسپل ایکٹ کے منظور ہو جانے کی وجہ سے پیدا کی گئی لیکن یقیناً ہم میں سیاسی عقل و دانش کی کمی نہیں ہے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے خواہ ہم ہندو ہوں یا مسلمان کہ جدید ہندوستانیوں کو بالکل دوسری قسم کے قومی کارکنوں کی ضرورت ہے جو زیادہ فیاض دل اور فراخ حوصلہ ہوں جو فرقہ کی انانیت اور تعصب کی تنگدلی سے مبرا و منزا ہوں جو کمزور کو کچل ڈالنے کی خواہش کو دبا سکیں اور جو اٹھ سکے باوجود طاقتور کی چیرہ دستیوں کے سامنے ہمت نہ ہاریں۔ جو آجکل کے چھوٹے چھوٹے تعصبات سے اپنے آپکو بالا رکھکر خلوص اور خدمت کی بلند سطح تک پہنچ سکیں اور صرف یہی چیز ہے جو کسی قوم کو یقین امید آزادی اور قوت دے سکتی ہے۔۔۔۔۔

سیاسی اتحاد و اتفاق کی جانب بڑھنے کے لئے ہندوستان کی ترقی کے راستہ میں جو نہایت مہیب مسئلہ حائل تھا۔ اس کے قابل اطمینان حل کی وجہ سے ہماری آئینی جنگ قبل ازیں گویا نصف ختم ہو چکی ہے۔ ہندوستان کا متحدہ مطالبہ جو ملک کی حقیقی ضروریات پر مبنی ہے اور جو وقت و حالات کا لحاظ رکھکر وضع کیا گیا ہے وہ آخر کار اپنے آپکو ناقابل مقابلہ ثابت کر کے رہیگا۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ جو لوگ حکومت ہند کے ذمہ وار

ہیں۔ اُنہوں نے باشندگان کی موجودہ شکایات کے ساتھ معاملت و ہمدردی کے زیادہ فیاضانہ طریقہ سے سلوک کرنے کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا ہے صلح ہوتے ہی مسئلہ ہند کو دلیرانہ اور فیاضانہ طریق پر حل کرنا ہوگا اور ہندوستان کو سلطنت برطانیہ کے آزاد ذمہ دار اور ہم مرتبہ رکن کی حیثیت سے اس کا پیدائشی حق دینا ہوگا یہ تبدیلی کس طرح عمل میں آنی چاہیئے اور اس حل کے لئے کیا طریقے اور تدابیر ہونی چاہئیں۔ یہ وہ امور ہیں جنہوں نے ہندوستانی جمہوریت پسندی کے خیالات کو گذشتہ دو سال سے گھیر رکھا ہے۔ جدید حل کے متعلق تجاویز تیار ہو چکی ہیں اور انکو امپیریل کونسل کے انیس منتخب نمائندوں نے گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ آپ کو یہ معلوم ہے کہ گذشتہ سال آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اور اُس کو مجاز کیا گیا تھا کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کی کمیٹی کے مشورہ سے اصلاحات کی ایک اسکیم مرتب کرے۔ اور اس سال استصواب اور غور کے لئے آپ کی خدمت میں پیش کی جائیگی جب آپ **اصلاحات** کی سکیم منظور کر لیں۔ تو آپ کانگریس اور لیگ کے ذریعہ سے واضعان آئین سے ایک مسودہ قانون تیار کرائیں جو قانون حکومت ہند کے لئے جس پر ہمارے ملک کا موجودہ نظام قائم ہے ایک ترمیمی مسودہ کی حیثیت رکھے گا۔ جب یہ مسودہ قانون تیار ہو جائے تو انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کو چاہیئے کہ وہ اس کی تصدیق کریں اور پھر دونوں جماعتوں کے سربرآوردہ اور قائم مقام اصحاب کا ایک وفد مقرر کیا جائے جو اس مسودہ کو پارلیمنٹ میں پیش اور منظور کرائے “

کانگریس کے ایڈریس میں پریسیڈنٹ نے کہا کہ:۔

اس وقت ہندوستان میں ہندو مسلم اختلاف ایک بہت اہم سوال ہے لیکن یہ کھیل تقریباً کھیلا جا چکا ہے اور ہندو مسلمان اس سوال کو تقریباً حل کر چکے ہیں پانچ سال سے کچھ زیادہ کا عرصہ ہوا کہ ہم نے ایک خواب دیکھا تھا جو اب معلوم ہوتا ہے کہ خواب نہ تھا کانگریس اور لیگ اب ایک جگہ مل رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب کہ باوجود اس کھیل کے جس نے ہمارے راستے جُدا جُدا کر دئے تھے اب پھر وہ دونوں

ایک ہی پولین کے اندر اور ایک ہی وقت میں ملنے والے ہیں ہندو اور مسلمان بہت جلد ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں اور واقعی یہ ایک معجزہ ہوگا کہ اگر باوجود اس کشش کے جو دونوں قوموں کو ایک ہی مرکز پر کھینچ رہی ہے آپس میں نہ ملیں۔ اس کشش کے سامنے وہ چھوٹے چھوٹے اختلافات جو پیدا ہوتے رہتے ہیں کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور وہ صرف چھوٹے طبقات تک محدود ہیں اور ان کو اہمیت دینا قرین انصاف نہیں ریاستوں میں ہندو مسلمان ساتھ ساتھ رہتے ہیں حیدرآباد کی مسلمان ریاست میں ستر فیصدی ہندو آباد ہیں اور کشمیر کی ہندو ریاست میں جہاں ساٹھ فیصدی مسلمان ہیں ہم کو کہیں گاؤکشی اور محرّم کے جھگڑے نظر نہیں آتے اور دونوں میں تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ برطانوی علاقوں میں یہ مختلف صورت کیوں ہے...... میں سمجھتا ہوں کہ میں کسی راز کو ظاہر نہیں کر رہا جب کہ میں آپ کے سامنے یہ کہوں کہ ہندو مسلم سوال حل ہو چکا ہے اور ہندو مسلمان سیلف گورنمنٹ کے لئے متحدہ مطالبہ پیش کرنے پر متفق ہو چکے ہیں۔"

مندرجہ بالا اسکیم مرتب کی اس میں یہ میثاق ہی جزو اعظم تھا کہ انتخابات میں اہم قلیل التعداد اقوام کی نمائندگی ہو سکے، صوبہ کی کونسلوں میں مسلمانوں کی نمائندگی خاص نشستوں کے ذریعہ سے کی جاوے گی۔ اور انہیں حسب ذیل حساب سے صوبوں کی کونسلوں میں حق نیابت حاصل ہونگے۔

پنجاب۔ منتخب شدہ ہندوستانی ممبران کا۔				نصف
بنگال	"	"	"	چالیس فیصدی
صوبہ متحدہ	"	"	"	تیس فیصدی
بہار	"	"	"	پچیس فیصدی
صوبہ متوسط	"	"	"	پندرہ فیصدی
مدراس	"	"	"	پندرہ فیصدی
بمبئی	"	"	"	ثلث

اس کے ساتھ یہ شرط ہوگی کہ لیجس لیٹو کونسل کے کسی دوسرے انتخاب میں مسلمان حصّہ نہ لے سکیں گے علاوہ بریں یہ شرط بھی ہوگی کہ کوئی **مسودہ قانون** یا اس کا کوئی جزو یا کوئی تجویز جو کسی غیر سرکاری ممبر کی طرف سے پیش کی گئی ہو اگر اس مسودہ قانون یا اسکے کسی جزو یا کسی تجویز سے متعلق جماعت کے ۳/۴ ممبران مخالفت کرینگے تو وہ مسودہ یا اس کا کوئی جزو یا تجویز کونسل میں پیش نہ ہو سکے گی۔

جس طرح صوباتی کونسلوں میں مسلمانوں کا انتخاب ہے اسی طریقہ سے امپیریل لیجسلیٹو کونسل کا ہونا چاہیئے، اور ساتھ ہی جتنا بھی ممکن ہو اس کے طریقہ انتخاب (فرنچائز) کی توسیع کی جائے اور صوباتی کونسلوں کے منتخب ممبر بھی انتخاب کرنے والے (الیکٹریٹ) ہوں گے جو امپیریل لیجس لیٹو کونسل کے ممبر منتخب کر سکیں گے۔

منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں کی تعداد کا ۱/۳ حصّہ مسلمان ہوں گے اور مختلف صوبوں میں مسلمانوں کے جداگانہ حلقہ انتخاب سے ہی مسلمان ممبروں کا انتخاب عمل میں آئے گا اور اسی تناسب سے ہر صوبہ میں انتخاب ہوگا جس تناسب سے کہ وہ صوباتی کونسلوں میں نمایندگی کرتے ہیں لیگ کے اس اجلاس میں بہ کثرت کانگریس کے لیڈر شریک ہوئے اور مسلم لیڈر کانگریس کے اجلاس میں[۱] اور اُس وقت یقین ہوگیا کہ دونوں قوموں کے اتحاد و اشتراک عمل سے کامیابی بہت قریب ہے۔

اس سکیم پر کچھ دن بعد مسلمانوں کے بعض حلقوں میں اعتراضات کئے گئے اور طرح طرح کے اوہام پیدا کرائے گئے۔ ان کے متعلق مسٹر عبداللطیف احمد ذکریا صدر مجلس استقبالیہ مسلم لیگ نے بمقام کلکتہ اپنے اجلاس میں جو روشنی ڈالی ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

"کہا گیا ہے کہ مختلف مجالس واضع قوانین میں مسلمانوں کی نیابت کا سامان کرنے میں ہماری اسکیم مسلمانوں کو قلت تعداد میں رکھدینے کا باعث ہوئی ہے اور اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر ہماری اسکیم منظور کرلی گئی تو مسلمان ایک غالب ہندو

---

[۱] مہاراجہ محمود آباد نے کانگریس کی مجلس استقبالیہ کو کافی امداد بھی عطا کی تھی۔

اکثریت کے قبضہ میں رہیں گے۔ لیکن ادنیٰ غور وتامل سے یہ بات معلوم ہوجائے گی کہ یہ اعتراض بالکل خلاف انصاف ہے کیونکہ اس قسم کے اندیشے سب بے بنیاد ہیں ہماری اسکیم کی رو سے پنجاب میں مسلمانوں کی کامل اکثریت ہوگی اور تمام صوبجات میں باستثنائے بنگال کے مسلمانوں کی نیابت ان کے تناسب آبادی سے بہت زیادہ رکھی گئی ہے صرف بنگال میں ہم نے مسلمانوں کی تناسب آبادی سے کم نیابت قبول کرلی ہے لیکن ہم نے کامل غور وخوض کے بعد ایسا کیا۔ یہ عام طور پر معلوم ہے کہ تمام غیر مسلم اقوام ہند کے لیڈر زور کے ساتھ جداگانہ قومی نیابت کے اصول کی مخالفت کرتے رہے ہیں ہم کو صرف یہ واقعہ یاد کرلینا چاہیئے کہ کانگریس کے مختلف اجلاسوں میں اور تمام عام جلسوں میں برابر رزولیوشن پر رزولیوشن اس کے خلاف پاس ہوتے رہے ہیں، اوروں کا ذکر جانے دیجئے۔ ہندوؤں کے تمام ممتاز لیڈروں نے ہنوز اصول جداگانہ قومی نیابت کی زور کے ساتھ مخالفت کی تھی صرف شاید مسٹر گوکھلے اس کلیہ سے مستثنیٰ تھے جنہوں نے ہندوستان کی موجودہ سیاسی حالت کے لحاظ سے اصول جداگانہ قومی نیابت کو آخر میں بادل ناخواستہ منظور کرلیا تھا۔ مسٹر آر۔ سی دت آنجہانی نے کمیشن تقسیم اختیارات کے ممبر کی حیثیت سے سیلف گورنمنٹ کے سلسلہ میں مقامی جماعتوں میں مسلمانوں کی جداگانہ نیابت کے خلاف ایک پرزور نوٹ لکھا تھا جس میں درج کیا تھا کہ مختلف قوموں میں غیر جنبہ داری ملحوظ رکھنے کا جو وعدہ برٹش گورنمنٹ نے کیا ہے اس کے یہ بالکل منافی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ منٹو مارلے اسکیم اصلاحات میں مسلمانوں کی جداگانہ نیابت ایک اہم شکل میں موجود ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ لارڈ مارلے نے پارلیمنٹ میں اس اصول کو نہ صرف مناسب بلکہ مبنی برحق جتایا اور اس کی حمایت کی۔ تاہم اس واقعہ سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ ہنوز گورنمنٹ نے مسلمانوں کی جو نیابت تسلیم کی بالکل ہی ناموزوں اور غیر موثر ہے اور مزید

یہاں کوئی ضمانت اس بات کی نہیں ہے کہ اس اصول پر کچھ عرصہ تک استقلال کے ساتھ عملدرآمد ہوتا رہے گا جداگانہ قومی نیابت کی مسلسل مخالفت اور اس کے مخالف رایوں کا لحاظ کرکے ہم نے خیال کیا کہ ممکن ہے کہ مسلمانوں کی جداگانہ نیابت کا حق ان سے دفعتاً چھین لیا جائے اس لئے ہمارے لیڈروں نے محسوس کیا کہ نہایت ضروری ہے کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کے حقوق و فرائض کے بابت باہمی سمجھوتہ کی بنا پر ایک صلح ہوجائے تاکہ ہماری قوم کے لئے ایک ایسا اہم مسئلہ محض برطانوی مدبرین کے تخیلات و رحم پر نہ منحصر رہے اس لئے آل انڈیا مسلم لیگ نے بتوسط انڈین نیشنل کانگریس تمام دیگر اقوام کو یہ الٹی میٹم (آخری نوٹس) دیا ہے کہ متحدہ باشندگان ہند کی جانب سے مطالبہ باہمی سمجھوتہ اور تمام لوگوں میں ایک مشترکہ قرارداد کی بنا پر ہونا چاہئے اور یہ کہ ہندوستان میں سلیف گورنمنٹ (حکومت خوداختیاری) کی ہر اسکیم میں مسلمانوں کی قومی نیابت کا اصول صراحت و وضاحت کے ساتھ تسلیم کیا جانا چاہئے اور اس کا پورا سامان ہونا چاہئے غیرمسلم اقوام کے لیڈران نے بعد کامل غور و بحث کے لیگ کی پیش کردہ شرائط کو کانگریس میں منظور کرلیا اور اسی بنا پر کانگریس کی کمیٹیوں نے اصلاحات کی ایک مشترکہ اسکیم کی تکمیل و تیاری شروع کردی، بغیر لحاظ دیگر اقوام کے حقوق کے ہم اپنی خاص اسکیم مرتب کرسکتے تھے اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ ہم اپنی قوم کی جانب سے تقسیم حصص کے وقت اس حصہ کے طلبگار ہوسکتے تھے جو کسی خاص شکار میں شیر کا حصہ ہوتا ہے لیکن اس صورت میں یہ اسکیم دیگر اقوام کے لئے قابل پابندی نہ ہوتی اور ہماری جداگانہ نیابت کے متعلق تنازعہ بالکل غیرفیصل شدہ رہجاتا۔ ان حالات میں گورنمنٹ کو آزادی حاصل ہوتی کہ اصول جداگانہ نیابت کو تسلیم کرے خواہ نہ کرے اور اگر تسلیم بھی کرے تو ہماری نیابت کو

ایک بے معنی و بے وقعت قلت تعداد پر محدود کر دے۔ تجربہ شاہد ہے
کہ جب مسلمانوں کے اغراض محض حکام کے قبضۂ و اختیار میں دے دیے گئے
ہیں تو ان پر مناسب لحاظ نہیں کیا گیا ہے اور ان کے متعلق مسلمانوں کو موزوں
نیابت کا حق نہیں دیا گیا ہے میں موجودہ مجالس واضع قوانین میں مسلمانوں
کی ناموزوں نیابت کا ذکر کر ہی چکا ہوں، کلکتہ یونیورسٹی میں جس میں گورنمنٹ
کو اسی فی صدی اراکین کو نامزد کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ سینٹ میں مسلمانوں
کی نیابت ۲ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے مجوزہ کلکتہ میونسپل ایکٹ میں مسلمانوں
کو نیابت دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ حتیٰ کے حال میں لیڈروں نے جو یقین کیا
کیا کہ جداگانہ نیابت کا مسئلہ غیر فیصل شدہ رہنے میں بہت خطرہ ہے وہ
بیجا نہ تھا۔ چنانچہ وہ ہمارے اور دیگر اقوام ہند کے مابین ایک صاف اور
صریح سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہوئے، اگر مسلمان اور غیر مسلمان مسئلہ جداگانہ
قومی نیابت پر متفق الرائے نہ ہوتے (خواہ اصولاً یا فروعاً) تو یہ مسئلہ ایک
تیسری جماعت یعنی گورنمنٹ کو فیصلہ کے لئے سپرد کیا جاتا۔ گذشتہ تجربہ سے
سبق حاصل کر کے اس قسم کے فیصلہ ثالثی کا نتیجہ مسلمانوں کے لئے بالعموم مضر
ہوا ہے ہم نے خیال کیا کہ بہتر اور زیادہ محفوظ طریقہ یہ ہے کہ فیصلہ ثالثی کا کوئی
موقع ہی نہ رہنے دیا جائے۔ کانگریس مسلم لیگ اسکیم اصلاحات کی یہ اصلی
خوبی ہے اور سارے لیڈروں نے خیال کیا ہے کہ مقصد زیر نظر کے حصول
کے لئے ہم کچھ قربانیاں بھی کر سکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ہم نے فی الحقیقت
کوئی قربانی کی ہے۔ پنجاب میں ہم نے کامل اکثریت رکھی ہے اور تمام دیگر صوبوں
میں مجوزہ نیابت تناسب آبادی سے زیادہ ہے کہا جاتا ہے کہ باوجود اس
زیادہ نیابت کے مسلمان ان تمام صوبوں میں قلت میں ہیں لیکن ہمارے
نکتہ چیں حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک قلت تعداد میں جس کے ووٹ موثر
طریقے سے کسی اہم مسئلہ کی نسبت پلٹے کا وزن تبدیل کر سکتے ہیں اور ایک ایسی

قلت تعداد میں جو اتنی بے وقعت ہو کہ اس کا بالکل ہی لحاظ نہ ہو اور اس کی رائے کا شمار نہ ہو زمین و آسمان کا فرق ہے بنگال میں ۰ ۴ فیصدی نیابت کی منظوری پر بہت نکتہ چینی کی گئی ہے اور کانگریس لیگ کی اسکیم پر نہایت زوردار الفاظ میں اظہار تنفر کیا گیا ہے - آیئے ہم اس معاملہ پر ذرا غور کریں تجویز کی گئی ہے کہ کل ہندوستانی ممبروں کے ۰ ۴ فیصدی مسلمان ممبر ہونگے اور جب ہم یاد کرتے ہیں کہ بقیہ ۰ ۶ فیصدی میں نہ صرف ہندو ہی ہونگے بلکہ دیگر اقوام اور خاص خاص اغراض کے نمائندہ بھی ہوں گے، مثلاً میونسپل بورڈ ڈسٹرکٹ بورڈ یونیورسٹیاں - زمینداران تجار وغیرہ کے نمائندے، تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ آیا ہنود کو ۰ ۴ فیصدی سے زیادہ حق نیابت نصیب ہوگا - علاوہ ازیں اینگلو انڈین اور عمال سرکاری کی کل جماعت بھی ہوگی تاکہ تمام اقوام میں توازن قائم کریں -

میں خیال نہیں کرتا کہ سوائے اس صورت کے فرض کرلے جانے کے کونسل میں تمام دوسرے اجزاء مسلمانوں کے خلاف ہوجائیں گے مسلمانوں کے مفاد کو کسی دوسری طرح صدمہ نہیں پہونچ سکتا - حضرات یہ وہ حالت ہے جو مشکل ہی سے پیدا ہوگی - اگر کبھی ایسا ہو بھی جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان اس خاص مسئلہ پر سخت غلطی میں مبتلا ہیں کیوں کہ اس قسم کی شکست زیادہ قابل خیال نہیں ہوسکتی ہم دعوے کرتے ہیں کہ کانگریس کی اسکیم میں جو بظاہر مسلمانوں کی نیابت تھوڑی معلوم ہوتی ہے اس سے قومی مفاد کو کچھ نقصان نہیں پہونچ سکتا اور اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال غلط ہے -

حضرات! میں نے عرض کیا ہے کہ کانگریس لیگ اسکیم سے مسئلہ انتخاب میں ہم کو فائدہ ہی پہونچانے کی امید ہے اور بنگال میں بھی نقصان پہونچانے کوئی خطرہ نہیں ہے ان فوائد کے علاوہ جو ہماری قوم کو پہونچنے والے

ہیں ہم نے ہندوستان کے غیر مسلم قوموں سے یہ بھی قبول کرا لیا ہے کہ ہندوستان
کی آیندہ حکومت میں جو کچھ بھی اصلاحیں ہوں اُن میں مسلمانوں کی نمایندگی
کافی ہوگی یہ کہنا کہ کانگریس نے لیگ پر قبضہ کر لیا صحیح نہیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا
کہ لیگ نے کانگریس پر قبضہ کر لیا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ یہ لیگ کی جیسی کم عمر انجمن
کی بہت بڑی فتح ہے۔"

یہ واقعہ بھی قابل بیان ہے کہ جس وقت کانگریس اور لیگ کے اجلاسوں میں یہ میثاق
ہو رہا تھا، اسی وقت لکھنؤ میں ہندو مہا سبھا کا بھی اجلاس تھا اس کے سکریٹری نے
کانگریس کو اطلاع دی کہ جب تک ہماری سبھا کے قائم مقام شریک نہ ہوں گے یہ
اسکیم ہندوؤں کے لئے قابل پابندی نہ ہوگی۔ چنانچہ وہ شریک ہوئے اور اُنہوں نے
مسلمانوں کے حقوق جداگانہ کی زبردست مخالفت کی اور بالآخر خفا ہو کر چلے گئے اور
اپنے جلسہ میں ریزولیوشن پاس کر دیا کہ کانگریس لیگ کا میثاق ہندو قوم کے لئے قابل
پابندی نہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہندو مہا سبھا کے اجلاس میں وہ ہی ہندو مخالف تھے جنہوں
نے کانگریس میں اتفاق کیا تھا جن میں خود صاحب صدر بھی شامل تھے اور ان کا ایڈریس
بھی "بندے ماترم" پر ختم ہوا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ کانگریس کے صدر کی زبان سے یہ
نعرہ بلند ہوا۔

بہرحال کانگریس اور لیگ کے زعما پنڈت مالویہ، مسٹر راما سوامی آئر مسٹر جناح
اور سر مہاراجہ محمود آباد (سر) وزیر حسن اور دیگر ہندو مسلم سیاست داں مشترکہ جلسوں میں
آیندہ اصلاحات اور واقعات حالیہ پر مصروف کار رہے۔

۲۷ و ۲۸ر جولائی ۱۹۱۷ء کو ایک مشترکہ جلسہ میں علاوہ دیگر امور کے اس بات پر
زور دیا گیا کہ جنگ ختم ہوتے ہی سیلف گورنمنٹ دی جائے۔

اس کے بعد ہی ۲۰ر اگست ۱۹۱۷ء کو جب لکھنؤ کے اجلاسوں کے بعد کانگریس اور
لیگ کی متعدد مشترکہ کانفرنسیں ہوئیں اور جب ۲۰ر اگست ۱۹۱۷ء سے آنریبل مسٹر مانٹیگو

وزیر ہند نے دار العوام میں آیندہ اصلاحات اور اپنے دورہ ہند کا اعلان کیا تو سیاسیات ہند میں ایک تموّج پیدا ہو گیا اور ۶ راکتوبر کو مشترکہ کانفرنس نے وائسرائے اور وزیر ہند کے سامنے ایک ایڈریس اور میموریڈم پیش کرنے کے لئے ایک ڈپوٹیشن تجویز کیا جس میں ہر صوبہ سے ہندو مسلم زعمائے کانگریس و لیگ کا انتخاب کیا گیا (۲۵) کانگریس کے اور (۱۰) لیگ کے نمایندے تھے، جن میں سر سریندر ناتھ، سر ڈنشا واچہ، سر تیج بہادر سپرو، مسٹر گاندھی، مسٹر تلک، پنڈت مالویہ، پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر سرینواس شاستری کانگریس سے مولوی فضل الحق، سیٹھ یعقوب حسن، سر فضل حسین، سر مہاراجہ محمود آباد، اور مسٹر محمد علی جناح لیگ سے ممتاز شخصیتیں تھیں۔

۱۴ ر نومبر کو نواب محمد اسحاق خاں سکریٹری ایم۔اے۔او کالج علیگڈھ کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کا مقصد کانگریس لیگ اسکیم پر عام مسلمانوں کا نظریہ معلوم کرنا تھا، علیگڈھ سے ایک معقول جماعت مخالفت کے لئے آئی تھی، خان بہادر شیخ عبد اللہ نے سخت اختلاف کیا مگر بہت بڑی کثرت رائے سے اسکیم منظور ہو گئی، دوسرے دن پھر مسلم لیگ کے جلسہ میں اس کی توثیق و تصدیق کی گئی ساتھ ہی دیگر معاملات کے متعلق بھی رزولیوشن پاس ہوئے جن میں پٹنہ آرہ، گیا اور جونپور وغیرہ میں ذبیحہ گاؤ پر جو فسادات ہوئے تھے اظہار ملامت کرتے ہوئے ہندو لیڈروں کی خاموشی پر بھی اظہار افسوس کیا گیا، نیز ایک آل انڈیا مسلم ڈپوٹیشن کی تجویز بھی کی گئی تاکہ جداگانہ طور پر بھی مسلم مطالبات پیش کئے جائیں، ان میں علی برادران کی رہائی کا بھی ایک مطالبہ تھا مگر ہوم گورنمنٹ نے ڈپوٹیشن پیش ہونے کے لئے اس مطالبہ کو خارج کرنے کی شرط لگا دی جس کو مسلم لیگ نے نامنظور کیا اور ڈپوٹیشن پیش نہوا البتہ اس مطالبہ کے متعلق لاکھوں مسلمانوں کی طرف سے تقریباً ۲۰ ہزار تار وزیر ہند کے پاس بھیجے گئے ۲۶ ر نومبر کو کانگریس اور لیگ کا متحدہ ڈپوٹیشن باریاب ہوا جس نے اصلاحات کی مشترکہ اسکیم پیش کی جو نہایت جامع اور مدلّل تھی،

چند اور ڈپوٹیشن بھی باریاب ہوئے جو جدید قائم شدہ انجمنوں کے تھے ان کے بھی یہ

عموماً اس مشترکہ اسکیم کی ہی بنیاد پر تھے۔ البتہ جدّت پیدا کرنے کے لئے کہیں کہیں تبدیلی پیدا کر لی گئی تھی۔[130]

۱۹۱۷ء میں بمقام کلکتہ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس منعقد ہوئے، لیگ کی صدارت پر مولانا محمد علی کا انتخاب ہوا تھا، جن کی کرسی صدارت ان کی نظر بندی کی وجہ سے خالی رکھی گئی تھی۔ سر مہاراجہ محمود آباد نے نیابتاً ایک درد انگیز تقریر کی جس میں واقعات حالیہ پر تبصرہ کے ساتھ ملک و قوم کے مطالبات کو نہایت پر زور استدلال کے ساتھ پیش کیا۔

نظر بندان اسلام علی برادران مولانا محمود حسن (رح) مولانا حسرت موہانی اور مولوی ابوالکلام آزاد کی رہائی کے رزولیوشن پیش ہوئے ان پر گاندھی جی اور مسز نائڈو نے بھی تقریریں کیں۔ مشترکہ اسکیم کو مسودہ اصلاحات میں شامل کئے جانے پریس ایکٹ کی تنسیخ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے غلط استعمال کی تحقیقات وغیرہ پر زور دیا گیا، نیز جن صوبوں میں کہ لوکل باڈیز کی جداگانہ نمایندگی نہ تھی ان میں اس کے اجرا اور اصلاحات میں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ، پبلک سروس اور یونیورسٹیوں میں متناسب نمایندگی فارسی رسم الخط اور اردو زبان کو دفتری زبان اور ابتدائی تعلیم کا ذریعہ بنانے اور بقر عید و محرم میں مسلمانوں کے تحفظ حقوق کی تجاویز پاس ہوئیں۔

یہ زمانہ سیاسئین کے لئے بڑے امید و بیم کا تھا اور سب کی نظریں وزیر ہند کے دورے کے نتیجہ پر لگی ہوئی تھیں ۲۲ اپریل ۱۹۱۸ء کو وزیر ہند اور ویسرائے کی متفقہ رپورٹ پیش ہو گئی اور ۲۴ مئی کو وزیر ہند کے پانچ رفیقان کار نے جن میں ایک ہندوستانی مسٹر بھوپندر ناتھ باسو بھی تھے اس رپورٹ کی تصدیق کر دی اور ۲۴ مئی کو حکومت ہند کی بھی توثیق ہو گئی۔

۱۵ جون کو انڈیا کونسل نے اپنی یادداشت لکھی اور رپورٹ شائع کر دی گئی۔ رپورٹ کے باب اوّل میں ہندوستان کے تازہ واقعات و حالات پر رائے زنی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کس طرح مختلف اثرات نے مل کر کانگریس اور لیگ کی متفقہ یادداشت

پیش کرائی۔ نیز تسلیم کیا کہ یہ تازہ ترین یادداشت بہت ہی مکمل اور باقاعدہ عرضداشت ہے جو ہندوستان کی سب سے بڑی جماعتوں کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔۔۔ اور کہ جس قدر دیگر تجاویز پیش ہوئی ہیں ان کو اس کے مقابلہ میں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔
اس کے بعد بعض اہم حصص پر اعتراضات بھی ہیں۔
ہندو مسلم اتحاد کے متعلق بھی بہت سے فقرات ہیں اور اس کو ان داخلی و خارجی واقعات کا نتیجہ قرار دیا ہے جو براہ راست مسلمانوں پر موثر ہوئے۔

اس بیان میں بتایا ہے کہ "آگے بڑھی ہوئی پارٹی مسلم لیگ کے مشورے میں غالب آئی، ۱۹۱۳ء میں اس نے ہندوستان کے مناسب حال وضع کی کالونیل سیلف گورنمنٹ کے مقصد کو اختیار کرنے کا اعلان کیا اور کانگریس نے اس کو گرم جوشی کے ساتھ سراہا۔ جس حد تک پان اسلامک (عالمگیر اتحاد اسلامی) احساس حالت پر موثر تھا وہ بلا شبہ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کا میلان پیدا نہیں کرتا تھا لیکن اس وقت زیادہ قوی اسباب دونوں طرف کی آگے بڑھی ہوئی پارٹیوں کو اکٹھا کر دینے کے لئے کام کر رہے تھے ان کے ساتھ بہرحال جدید خیال قومیت بھی جو جنگ سے پیدا ہوا تھا غالب آیا اور ۱۹۱۶ء کے بڑے دن کے ہفتہ میں لکھنؤ کے جلسوں میں کانگریس اور مسلم لیگ اکٹھے ہو گئے اور اسلامی رائے کا قدامت پسند حصہ جو اتحاد سے خارج رہا اس کی پروا نہیں کی گئی۔"

پھر قلیل التعداد فرقوں کی نیابت و تحفظ حقوق اور انتخابات پر طویل الذیل بحثیں کر کے مسلمانوں کے مخصوص معاملہ پر لکھا ہے کہ:۔

اس لئے ہم فرقہ وارانہ انتخاب کے طریقہ کو سیلف گورنمنٹ کے اصول کی ترقی میں ایک بہت ہی خطرناک روک خیال کرتے ہیں اس طریقہ کی توسیع کی خرابیاں بالکل صاف ہیں۔ مدراس میں ایک کثیر التعداد قوم کے فوائد کے لئے واقعی فرقہ وار نیابت کی تجویز کی جا چکی ہے اسی کے ساتھ ہم کو کھرے واقعات کا سامنا بھی کرنا چاہئے مسلمانوں کو ۱۹۰۹ء میں جداگانہ انتخاب کے ذریعہ سے مخصوص نیابت دی گئی

ہندوؤں کی رضامندی اس حال کے معاہدہ میں موجود ہے جو دونوں اقوام کے سیاسی لیڈروں میں ہوا تھا مسلمان ان باتوں کو طے شدہ واقعات سمجھتے ہیں اور انہیں مسترد کرنے کی کسی قسم کی کوشش سخت مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دے گی اور اس قوم کی وفاداری پر بہت سخت دباؤ ڈالے گی جس نے ایک سخت مشکل کے زمانہ میں نمایاں وفاداری کا اظہار کیا ہے اور جو ہمیں معلوم ہے۔ نظام حکومت عامہ کے ماتحت اپنی فلاح کے متعلق بہت سخت تشویش محسوس کر رہی ہے۔ مسلمان صرف جداگانہ نیابت اور فرقہ وارانہ انتخاب ہی کو اپنا معقول محافظ خیال کرتے ہیں لیکن اس عہد و پیمان کے علاوہ جس کی ہم اس وقت تک عزت کریں گے جب تک کہ اس سے آزاد نہ ہو جائیں۔ ہم اس کا لحاظ کرنے پر مجبور ہیں کہ یہ قوم جدید کونسلوں میں معقول نیابت حاصل کرے ہم یہ ان سے کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ ہم ۱۹۰۹ء کے فیصلہ کو غلط تصور کرتے ہیں اور اس کو قائم رکھنا ذمہ دار گورنمنٹ کی طرف ترقی کے منافی ہے اور اسے بدل دینے میں انہیں کا فائدہ ہے اور اس وجہ سے ہم نے اسے مسترد کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟ گو ہم اس ضرورت پر افسوس کرتے ہیں تاہم ہمیں یقین ہے کہ بہر صورت جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے موجودہ طریقہ اس وقت تک قائم رہنا چاہئے جب تک حالات میں تغیر نہ ہو گو اس کی وجہ سے مشترک نیت کے حصول کی طرف ترقی میں دیر لگے لیکن ہمیں اس کی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایسے صوبہ میں بھی مسلمانوں کے لئے فرقہ وارانہ نیابت رکھیں جہاں انہیں ووٹ دہندگان کی کثرت حاصل ہے۔"

رپورٹ میں دیگر قلیل التعداد جماعتوں کے اصرار مطالبہ ورعایت پر بھی بحث کر کے صرف پنجاب کے سکھوں کو ان کی قومی اہمیت اور ہندوستانی فوج میں قیمتی عنصر بہم پہنچانے کے لحاظ سے اور اس تجربہ سے کہ ہر جگہ قلت کے باعث ان کی نمائندگی نہیں ہوتی اس نظام کو جو مسلمانوں کے معاملہ میں اختیار کیا گیا ہے وسعت دی گئی۔

یہ رپورٹ اگرچہ تاریخی اور ادبی حیثیت رکھتی تھی اور اس میں اصلاحات کی

ارتقائی شکل بھی تھی لیکن سیلف گورنمنٹ ۱۹۲۱ء سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا اور مصنفین رپورٹ کے اس نقطہ نظر سے کہ "انہیں ہندوستانیوں کے بالآخر سیلف گورنمنٹ کی قابلیت پیدا کرنے میں کوئی شبہ نہیں لیکن وہ اس وقت اس کے لئے تیار نہیں" رپورٹ میں صرف چند جزوی اصلاحات ہی مراعات عظیم تصور کی گئیں مگر اس پر کانگریس اور لیگ نے ہی نہیں بلکہ اور جماعتوں نے بھی اظہار بیزاری کیا۔

۱۹۱۸ء کے غیر معمولی اجلاس میں لیگ نے اپنے رزولیوشن میں رپورٹ کو ترقی کا اقدام سمجھتے ہوئے تو خیر مقدم کیا لیکن اس کی چند سفارشوں کو مکمل طور پر ناقابل اطمینان تبلایا اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ اسکیم میں مسلمانوں کی خاص پوزیشن کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھا گیا اور نہ ان کے مفاد کو مدنظر رکھا گیا یہ درخواست بھی کی گئی کہ ترمیمات و تغیرات سے اس کو ذمہ دار حکومت کے لئے ایک صحیح اقدام بنا دیا جائے اور مرکز و صوبہ کی کونسلوں میں مسلمانوں کا تناسب وہی رکھا جائے جو کانگریس لیگ اسکیم میں ہے اور اس پروویژن (رعایت) کا بھی لحاظ رکھا جائے جو ان کے تحفظ مفاد کے لئے ضروری ہے۔

مگر انجام کار یہی رپورٹ قانونی صورت میں آئی اور کوئی احتجاج قبول نہیں کیا گیا۔

باب ششم

میثاق لکھنؤ کے بعد امید تھی کہ ہندو مسلم نزاعات و فسادات کا خاتمہ ہوجائے گا اور تعلیم یافتہ جماعت عوام کو امن و آشتی کی جانب مائل کرنے کی سعی کرے گی لیکن ہنوز میثاق کی روشنائی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ ذبیحہ گاؤ پر آرہ و بہار اور کٹارپور میں سخت خونریز فسادات ہوئے ہندو سیاسئین میں سے کچھ تو خاموش رہے اور کچھ نے بے جا حمایت و طرفداری کی تاہم مسلم زعمائے سیاست اس آگ کو بجھانے کی ہی کوشش کرتے رہے۔

بیرونی سیاست میں اب ترکی مسئلہ زبردست بے چینی کا سبب ہو رہا تھا۔ جس سے مسلمانوں کی توجہ ملکی سیاست سے زیادہ ترکی معاملات کی طرف مبذول ہوگئی کیونکہ یہ ایک عالمگیر مذہبی سوال تھا۔

۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دہلی میں مدعو کیا گیا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے کوشش بلیغ کی کہ علمائے اسلام بھی سیاست میں اشتراک کریں۔ ہندوستان میں دراصل یہ ایک نیا تجربہ تھا کہ وہ علماء جن کی عمریں فروعی اختلافات اور مسلمانوں کی تکفیر و تفسیق میں گذری ہوں اور جو کبھی کسی ایک قومی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک جگہ مجتمع نہ ہوسکے ہوں جن کی مساجد تک کی تقسیم ہو اور جنہوں نے ملت اسلامیہ کا شیرازہ اس طرح بکھیرا ہو کہ خونریزیوں تک نوبت پہونچی ہو اور پھر سیاست سے بیگانگی فطرت ثانیہ بن گئی ہو اپنی مسندوں کو چھوڑ کر اور حجروں سے نکل کر ایسے میدان سیاست میں رونق افروز ہوں جہاں بلا لحاظ اختلافِ عقائد تمام مسلمان جمع ہوں اور سب کا متحدہ مقصد اور نصب العین ہو مگر ڈاکٹر صاحب اور حکیم صاحب اپنی کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہوئے اور علماء کے ایک طبقہ نے اس اجلاس میں شرکت منظور کی۔

۳۰ دسمبر کو مولوی ابوالقاسم فضل الحق[1] (وزیر اعظم بنگال) کی صدارت میں یہ اجلاس شروع ہوا۔ ڈاکٹر انصاری صدر مجلس استقبالیہ نے اپنے خطبہ صدارت میں مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:۔

گورنمنٹ کے نام نہاد زاویہ نگاہ میں جو تبدیلی واقع ہوئی اس کی مزید شہادت اس امر سے حاصل ہوتی ہے کہ مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ نے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ان کے اس خاص حق کی مخالفت کی ہے جو زمانہ موجودہ میں ہماری سیاسی تحریکات کا روح رواں ہے۔ ان قیمتی وعدوں پر جو گورنمنٹ کر چکی ہے اس سمجھوتہ پر جو ہمارے اور اہل ہنود کے درمیان ہو چکا ہے اور خود اپنے قومی مفاد پر نظر کرتے ہوئے ہم حکومت کو اپنے وعدوں سے روگردان ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے علاوہ بریں مسلمانان ہند کے نمائندوں کا امپیریل کانفرنس اور مجلس جنگ کے مباحث میں نہ شریک کیا جانا مسلمانوں کے اس احساس میں اضافہ کرتا ہے کہ ان کے ساتھ لاپرواہی برتی جا رہی ہے۔ یہ احساس اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مجلس صلح میں جہاں ایسے سوالات زیر بحث آئیں گے جن کا تعلق مسلمانوں کی موت و زیست سے ہے ہمارا کوئی نمائندہ موجود نہ ہوگا ایک غیر مسلم خواہ وہ ہمارا کیسا ہی ہمدرد اور دوست ہو اسلامی مسائل پر نہ اس وثوق کے ساتھ زبان کھول سکتا ہے نہ اس جوش و تیقن کے ساتھ بولنے کا دعویٰ کر سکتا ہے جس کی ایک مسلمان نمائندہ سے امید ہو سکتی ہے۔

حضرات بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی وہ اخوت اسلامی جو ان کے اور تمام مسلمانوں کے درمیان خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں رہتے ہوں رشتہ محبت قائم کرتی ہے، درحقیقت اس وطن پرستی کے خلاف ہے جس کا تعلق صرف ہندوستان

---

[1] ہندوستان سے مہاراجہ بیکانیر ایک لفٹیننٹ گورنر اور ایک ہندو سابق ممبر کونسل کو نمائندگی کے لئے بھیجا گیا تھا۔

رہے ہیں میں نے بعض دوستوں کو کہتے سنا ہے کہ "ہندوستان کا مسلمان جزیرہ نمائے گیلی پولی کی ایک انچ زمین کے بدلے سارے ہندوستان کو قربان کر دینے کو تیار ہے" حضرات اس قسم کی باتوں سے جن کی تصدیق واقعات ہرگز نہیں کرتے حقائق کے چہرے کو مسخ کیا جاتا ہے ہندوستان کے ہر معرکے میں ہم اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ایک ہی صف میں شانہ بشانہ رہے ہمارا سیاسی مطمح نظر اب اہل ہنود کے واسطے دُور نہیں ہندو مسلمانوں کا وہ سمجھوتہ جس نے لکھنؤ میں عملی شکل اختیار کی تھی ہر سال تقویت حاصل کرتا جاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جتنا زمانہ گذرتا جاویگا ہمارے باہم مراسم بہتر ہوتے جائیں گے اور اگر اس وقت افتراق کے کچھ اسباب موجود ہیں تو وہ بھی رفع ہو جائیں گے میرا غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ ایک سچا مسلمان ہمیشہ سچا وطن پرست ہوگا اگر ہم مسلمانان ترکی و ایران کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو ساتھ ہی ہمارے طرز عمل نے ثابت کر دیا کہ ہم اپنے ان ہم وطنوں کے حقوق کی حمایت کرنے میں جو غیر ممالک میں مقیم ہیں کسی سے کم نہیں وہ حق پرست یعنی احمد محمدؐ کچالیہ ہندوستان ہی کا ایک مسلمان تھا جو جنوبی افریقہ میں عرصہ تک لڑتا اور آخر تک اس شیر دل علم بردار مسٹر گاندھی جی کی جانشینی کا پورا حق ادا کرتا رہا لیکن جہاں ایک مسلمان دونوں قوموں کے متفقہ حقوق کے لئے لڑنے کو تیار ہے وہاں وہ اس ملک میں اپنی سیاسی حالت کو برقرار رکھنے کا عزم بالجزم کر چکا ہے اور نہایت استقلال کے ساتھ اپنے تمام جائز حقوق کی حفاظت کرے گا۔

بیجا نہ ہوگا اگر اس جگہ کٹارپور کے اندوہناک واقعات کا ذکر کیا جائے جہاں ہنوؤں نے بے قصور اور صلح جو مسلمانوں کے ساتھ بغیر اشتعال کے وحشیانہ سلوک کیا ہے ان ہولناک واقعات کو پڑھکر مجھے جو صدمہ ہوا وہ بیان سے باہر ہے ناراضگی اور غصہ کے جو جذبات ہم سب کے دلوں میں ہیں ان کا اظہار کرنے سے الفاظ قاصر ہیں اس قسم کے واقعات دونوں قوموں کے تعلقات کو خراب کرتے ہیں اور اس باہمی اتحاد کی بنیاد پر تیشہ چلاتے ہیں جس کے ہم سب آرزومند ہیں میں اپنے ہندو بھائیوں سے درخواست

کرتا ہوں کہ وہ ایسی موثر تدابیر اختیار کریں کہ آئندہ اس قسم کے واقعات کا سدباب ہو جائے حالات کے ہر پہلو پر نظر کرنے کے بعد میرا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا سیاسی مطمع نظر حاصل کرنے کے لئے ہندو کے ساتھ مل کر کام کریں تو یقیناً ہندو بھی مسلمانوں سے جدا رہکر اپنی منزل مقصود تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے رواداری نہ کہ انتقام ہم دونوں کا مطمع نظر ہونا چاہئے۔

آنریبل مولوی ابوالقاسم فضل الحق (حال وزیر اعظم بنگال) نے اپنے خطبہ صدارت میں ترکوں کے متعلق مسلمانوں کو جو اندیشے تھے انھیں تفصیلاً بیان کرکے ہندوستان کی عام اقتصادی و سیاسی حالت پر ایک تاریخی تبصرہ کیا اور تمام خرابیوں کا علاج سیلف گورنمنٹ کو قرار دیکر کانگریس لیگ اسکیم پر سرکاری اعتراضوں کی تردید کرتے ہوئے ہندوؤں کے تعلقات پر دوستانہ اسپرٹ میں بحث اور خلافت اسلامیہ اور اماکن مقدسہ کے تحفظ پر موجودہ واقعات کی روشنی میں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی۔

دوسرے دن اجلاس میں مولانا عبدالباری مع چند علمائے فرنگی محل (لکھنؤ) مولانا عبدالوفا ثناءاللہ امرتسری مع دیگر علمائے پنجاب مفتی کفایت اللہ اور مولوی احمد سعید اور متعدد علمائے دہلی تشریف لائے۔ تقریباً تئیس۲۳ عالم تھے، مولوی محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند نے شرکت سے معذوری کا اظہار کیا مگر مسائل زیر بحث کے متعلق جن کی بنا پر علما مدعو کئے گئے تھے اپنی رائے لکھکر بھیجی" یعنی سلطنت ترکی کا بحیثیت سابقہ اسی اقتدار و سیاست و حفاظتِ مقامات مقدسہ کے ساتھ رہنا ضروری ہے یہ مسلمانوں کا بحیثیتِ اشتراک مذہبی احساس ہے جس کو گورنمنٹ برطانیہ بھی محسوس کرتی ہے اور گورنمنٹ اپنے اصولوں کے موافق مسلمانوں کے مذہبی احساسات کا پورا وقار کرتی اور کرنے کے لئے آمادہ ہے..... مسلمانوں کے ان جذبات و احساسات کو اپنی گورنمنٹ کے کانوں تک متفق آواز سے پہونچا دیا جائے۔"

صدر جلسہ نے علما کو خوش آمدید کہا اور اسی سلسلہ بیان میں اس طرف توجہ دلائی کہ "ایک زمانۂ دراز کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ قدیم وجدید خیالات کے لوگ اہل دنیا

و اہل دین عام اور خاص اپنے مذہب کی حمایت کے لئے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہماری متفقہ کوششوں کا نتیجہ اسلام اور اہل اسلام کے حق میں نہایت مفید اور بارآور ثابت ہوگا۔"

ڈاکٹر انصاری نے ان علما کی تشریف آوری کے شکریہ کا رزولیوشن پیش کیا جو بڑے جوش سے پاس ہوا۔

علمائے دہلی نے ایک دن قبل مسجد فتح پوری میں ایک جلسہ بھی منعقد کیا تھا جس میں چوبیس حضرات شریک تھے۔ مفتی کفایت اللہ نے انعقاد جلسہ کی غرض بیان کی اور ضرورت ظاہر کی کہ علما کو ان تجاویز میں جن کا مذہب اسلام سے گہرا تعلق ہے مسلم لیگ کی آواز کے ساتھ آواز بلند کرنی چاہیئے، چنانچہ مقامات مقدسہ، خلافت، ایران و ترکی حدود کی بحالی اور گورنمنٹ بنگال کے مستبدانہ طرز عمل پر اظہار افسوس اور تحقیقاتی کمیشن کے تقرر کتارپور کے مظالم کی تحقیقات کئے جانے اور ملزمین کو قرار واقعی سزائیں دئے جانے علمائے کرام اور دیگر نظربندوں کی رہائی کے سات رزولیوشن پاس ہوئے اور ایک رزولیوشن کے ذریعہ اجلاس لیگ میں شرکت کے لئے اپنے نمایندوں کو انتخاب کیا تاکہ وہ مذکورہ بالا رزولیوشن کی نقول پیش کریں اور لیگ حکومت میں پیش کرے مسلم لیگ کے اس سالانہ اجلاس میں سب سے اہم رزولیوشن کامل ذمہ دار حکومت کے مطالبہ کا تھا اور خواہش تھی کہ جس طرح برطانیہ عظمیٰ کی سلطنت میں اور قومیں زندگی بسر کرتی ہیں ہندوستانی بھی کریں اور قومی حکومت میں ان کو حصہ حاصل ہو۔

اس سے قبل لیگ اور کانگریس کے مشترکہ جلسوں میں یہ مطالبہ چھ سال بعد کی شرط کے ساتھ تھا۔ مگر نتیجہ جنگ اور اس نقشہ کے لحاظ سے جو یورپ میں آزادی اقوام کا کھینچا جا رہا تھا اس شرط کو منسوخ کرکے فوری مطالبہ پیش کیا گیا۔ اس مسئلہ پر بڑی بڑی مخالف و موافق بحثیں ہوئیں۔ فریق مخالف کا اصرار تھا کہ جدید اصلاحات میں پہلے کثیر التعداد قوم کے اس رویہ کا تجربہ کرلینا چاہیئے جو وہ قلیل التعداد قوموں کے ساتھ اختیار کرے گی۔ موید فریق ان تمام خدشات کو تسلیم کرلینے کے بعد جو کثیر التعداد قوم کے رویہ سے

ہو سکتے تھے اس امر پر مُصر تھا کہ اگر ہندوستان میں عزت و آزادی کے ساتھ رہنا ہے تو کامل اعتبار کے ساتھ ہندوؤں سے مل کر رہیں۔ اور انگریزوں کے مقابلہ میں ان کو ترجیح دیں، اسلام کا بڑا اصول محبت ہے، ہندو ہم پر غالب نہیں آ سکتے۔

چنانچہ کثرت رائے سے رزولیوشن پاس ہو گیا۔

اسی رزولیوشن کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ کانگریس سے خواہش کی جائے کہ وہ جلد ایک کمیٹی بنا دے جو لیگ کونسل سے مشورے کرے اور صوبوں کی کامل ذمہ دار حکومت کے متعلق جو سوالات پیدا ہوئے ہوں ان کی نسبت باہمی سمجھوتہ کرے۔

ٹرکی اور دیگر ممالک اسلامیہ کے متعلق بھی رزولیوشن پاس کئے گئے۔ بیت المقدس نجف اشرف و دیگر مقامات مقدسہ پر ہز مجسٹی کی افواج کے قبضہ پر احتجاج کیا گیا۔ مسئلہ خلافت میں جس کی نسبت احتمال تھا کہ کوئی اتحادی حکومت مداخلت کرے گی ایسی مداخلت سے باز رہنے کی پرزور تنبیہ کی گئی۔ مقامات مقدسہ اور جزیرۃ العرب پر سلطان ترکی خلیفۃ الرسول کی کامل آزاد حکومت برقرار رہنے پر زور دیا گیا۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کے قلوب کی جو حالت تھی اس کو جناب صدر نے اپنے خطبہ صدارت میں نہایت قابلیت سے دکھایا اور اس ضمن میں کہا کہ:۔

"مسلمانوں کے لئے ساری دنیا میں موجودہ ایام نہایت تشویش انگیز ہیں جنگ جو اتحادیوں کے لئے ایسی مسرت و شادمانی کے ساتھ ختم ہوئی ہے وہ بدقسمتی سے مسلمانوں کی طبائع کے لئے نہایت گہرے افکار اپنے ساتھ لائی ہے دنیا کی اسلامی مملکتیں یورپ کی سبھی طاقتوں کی جوع الارض کی شکار ہوئیں باوجودیکہ وہ طاقتیں چھوٹی چھوٹی قوموں کی آزادی کے احترام کی بابت ایسے لمبے چوڑے دعوے کرتی رہتی ہیں، مراکو تونس الجزائر اور مصر تک سب ملک، کمزوروں پر زبردستیوں کی بے وجہ دست برد کے غم انگیز فسانے سنا رہے ہیں ابھی کل ہی کا ذکر ہے کہ ایران کا گلا گھونٹنے سے ساری اسلامی دنیا میں ہول پیدا ہوا تھا اور اب یورپ کی سبھی طاقتیں ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے پر تلی ہوئی ہیں ہم مسلمانان ہند کے لئے ترکی کی قسمت گہری فکرمندی کا موجب ہے کیوں کہ اس سے

خلافت اور اماکن مقدسہ اسلامیہ کی نگہداشت کا مسئلہ مضبوطی کے ساتھ وابستہ رہے گا"

دوسری طرف صدر کانگریس پنڈت مدن موہن مالویہ نے اپنے خطبہ صدارت میں جنگ عظیم کی فتح کے متعلق جن جذبات کا اظہار کیا وہ بھی پڑھنے کے قابل ہیں انہوں نے کہا کہ:۔

"میرے ہم وطنو تم کو حق ہے کہ اس فتح پر خوب خوشیاں مناؤ اور تم فخر کر سکتے ہو کہ ہمارے ملک نے اس جنگ عظیم میں بہت شریفانہ حصہ لیا ہے اور اس کے شاندار انجام تک قابل تعریف مدد کی ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہندوستان کو انگلستان سے بہت کافی شکایتیں تھیں لیکن ساتھ ہی اس کو برطانیہ کے انصاف پسند اور آزاد پسند ہونے پر کامل اعتماد تھا اس لئے جوں ہی کہ ملک معظم کا پیغام ملا جس میں کہ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ حضور نے اس لڑائی میں حقوق معاہدے اور آزادی کی حفاظت کے لئے شرکت کی ہے۔ ہندوستان نے وفاداری کے ساتھ اپنی شکایتوں کو ختم کر دیا اور اپنے اختلاف کو مٹا دیا اور ہمارے والیان ملک اور لوگوں نے انگلستان کی مدد کے لئے اپنا سب کچھ پیش کر دیا۔ چونکہ یہ جنگ سچائی اور آزادی کے لئے تھی اس لئے فوراً ہی تا انجام تمام طبقوں اور قوموں نے ملک معظم کی خدمت میں اپنی غیر متزلزل وفاداری کا یقین دلایا ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ ہم نے اپنی وفاداری کو پورے طریقہ سے دکھلایا اور ہم نے پوری پوری مدد آدمیوں سے روپیہ سے اور ہر چیز سے کی۔ ہمارے قابلِ عزت والیان ملک سے لیکر کسانوں تک نے جو کچھ بھی کہ وہ کر سکتے تھے اور اپنی استطاعت سے زیادہ کیا اور جس روز سے کہ ملک معظم کا پیغام ہم کو ملا تھا تمام ہندوستان نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہمارے بہادر سپاہیوں کو فرانس بھیجا جائے تاکہ وہ جنگ میں سب سے آگے آگے رہیں ہماری پوری مدد جو کہ عوام نے کی اور والیان ملک نے اس کا اندازہ دو صد ملین یا تین صد کرور روپیہ سے زیادہ ہے ہم کو سب سے زیادہ فخر اس بات کا ہے کہ اس سخت امتحان کے چار سالوں میں جب کہ ساری فضا بدلی ہوئی تھی ہندوستان ملک معظم کی وفاداری اور سلطنت کی حتی الوسع مدد میں غیر متزلزل رہا اس سے پہلے کہ میں کچھ آگے کہوں حضرات و خواتین آپ لوگ جو ہر مذہب کے ہیں اور سب ایک خدا کی مختلف ناموں کے ساتھ عبادت کرتے

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ سب اُس خدا کا شکرانہ ادا کریں کہ اس جنگ کا انجام بہت اچھا ہوا اور پھر آپ کی اور اپنی طرف سے میرا فرض ہے کہ وفادارانہ مبارک باد ملک معظم کی خدمت میں پیش کروں کہ جنگ اچھے طریقے سے ختم ہوگئی۔ یہ ہم ہندوستانیوں کے لئے خاص طور پر قابل اطمینان ہے کہ جب کہ تمام ظالم بادشاہ مٹ چکے ہیں ہمارا شریف اور نیک دل شہنشاہ اپنی جگہ پر ہے ہم سلطنت متحدہ کے لوگوں کو بھی مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے بھی حق و آزادی کے لئے قربانیاں کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی"

"جب سے کہ ہندوستان کا برطانوی تاج سے بالواسطہ تعلق ہوا ہے ہم ہمیشہ بادشاہ کے وفادار رہے ہیں اور ہماری وفاداری غیر متزلزل ہے اور جب کہ ملک معظم اپنی تاجپوشی کے بعد ۱۹۱۱ء میں ہندوستان تشریف لائے تو ہم نے اپنی وفاداری کا پھر اعادہ کیا اور اب بھی ہماری خواہش ہے کہ تاج برطانیہ کی وفادار رعایا رہیں"

جنگ عظیم اگرچہ انگلستان اور اس کے اتحادیوں کے حق میں ختم ہو رہی تھی لیکن ۱۹۱۸ء میں اندیشہ تھا کہ جرمن موسم بہار کے جارحانہ حملے کی تیاری میں معروف ہے۔ اس اندیشہ کے بنا پر وزیر اعظم انگلستان نے ۵ ار جنوری ۱۹۱۸ء کو ایک تقریر کی جس میں انھوں نے اغراض جنگ کا خاکہ کھینچا۔ اور جو بسلسلہ کہ اور مدبرین وغیرہ سے ہوئے اُن کا ذکر کرکے کہا کہ:۔

"ان سب مباحث کے نتیجہ کے طور پر میں خوشی کے ساتھ اب یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگرچہ گورنمنٹ خود تنہا ان الفاظ کی ذمہ دار ہے جو میں استعمال کرنا چاہتا ہوں لیکن ہمارے جنگی اغراض اور شرائط صلح کی نوعیت و مدعا کے متعلق ایک قومی اتفاق رائے ہے اور میں یہ دعوے کرنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ جو کچھ میں آپ سے اور آپ کی معرفت دنیا سے کہہ رہا ہوں اس میں نہ صرف گورنمنٹ بلکہ قوم اور بحیثیت مجموعی سلطنت کے دل کی بات کہہ رہا ہوں"

اس سے آگے انھوں نے جنگی اغراض کی تشریح کی اور توسیع سلطنت اور جارحانہ ارادوں کی نسبت جو کچھ جرمن مشہور کر رہا تھا اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ:-

"اور نہ ہم اس لئے لڑ رہے ہیں کہ ..... ترکی کو اس کے دار السلطنت یا ایشیائے کوچک اور تھریس کی زرخیز اور مشہور سرزمینوں سے جو نسل میں غلبہ کے ساتھ ترکی ہیں محروم کر دیں۔"

ہم سلطنت ترکی سے ترکی کے زادبوم میں کوئی تعرض نہیں کرتے بحیرہ روم اور بحیرہ اسود کا درمیانی راستہ بین الاقوامی اور غیر جانب دار ہوگا۔ عرب آرمینیا، عراق و عرب، شام و فلسطین ایک حکم میں ہیں اور اس کے مستحق ہیں کہ جداگانہ ان کی شرائط قبول کی جائیں۔"

امریکہ کے صدر جمہوریہ ولسن نے بھی چودہ اصول قائم کئے تھے جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ ترکی کے اصلی علاقوں پر ترکوں کا شاہی اقتدار قائم رہے گا اور ان حصص ملک کو جو ترکی کے ساتھ وابستہ ہیں، اندرونی آزادی ترکی کے زیر نگرانی دلائی جائے گی۔

متحاربوں میں ترکوں نے عرب غداروں کی وجہ سے پوری شکست پائی۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو انہوں نے معاہدہ التوائے جنگ پر دستخط کئے اور فوراً موصل پر انگریزوں نے پیشقدمی بھی کر دی اور قسطنطنیہ پر ایک گونہ فوجی قبضہ ہوگیا۔ اب ترکوں کے متعلق نہایت تشویش ناک صورت حال رونما ہوئی۔ یکم جنوری ۱۹۱۹ء کو انگلستان کے مسلمانوں نے وزیر خارجہ برطانیہ کو ایک عرضداشت پیش کی جو صرف قسطنطنیہ، تھریس اور ترکی قوم کی وطنی سرزمین کے متعلق تھی مگر جب پیرس کی صلح کانفرنس میں یہ طے ہوا کہ ان دیگر حصص کو کسی اتحادی یا شریک حال سلطنت کے زیر سیادت حکومت خود اختیاری کی صورت میں قائم کیا جائے تو پھر ۲۰ مارچ کو ایک مفصل یادداشت ان حصص کے متعلق پیش کی اور یہ بھی جتا دیا کہ:-

"اس حالت سے نہ صرف ہندوستان وسیع اسلامی آبادی میں بلکہ افغانوں اور سرحدی قبائل میں بھی جو ہندوستانی فوج کے اسلامی عنصر کا سب سے بڑا جزو ہیں گہرے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔"

لیکن ان عرضداشتوں پر کوئی توجہ نہ ہوئی اور یہ تازہ تجویز کی گئی کہ ان ترکی علاقوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے جن کی حفاظت کے بارہ میں وزیر اعظم نے اطمینان دلایا تھا۔ نیز قسطنطنیہ اور تھریس کو بھی چھین لیا جائے۔"

۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو یونان کی فوجیں سمرنا اور اس کے ملحقہ علاقوں پر اُتریں۔ ترکوں سے اسلحہ لے لئے گئے اور اُن کی فوجوں کا بڑا حصہ منتشر کر دیا گیا اس لئے یونانی فوجوں نے مسلمانوں پر نہایت شدید مظالم کئے۔ اب پھر ۱۴ جون ۱۹۱۹ء کو وزیر اعظم کی خدمت میں بھی ایک عرضداشت پیش کی گئی اور اس میں کہا گیا کہ:-

"اس تجویز سے دنیا کے مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا ہے۔ سپاہی جو جنگ سے واپس آئے ہیں سول اور شہری آبادی جس نے اتحادیوں کو فتح حاصل کرنے میں مدد دینے کے لئے اپنا بہترین متاع دیا ہے اور والیان ریاست جنہوں نے اپنے وسائل اپنے بادشاہ کے حضور میں پیش کر دئے تھے وہ سب۔ ہم بہت ادب کے ساتھ کہتے ہیں کہ ایسی تجویز پر خوف زدہ اور متحیر ہیں جو اگر عمل میں لائی گئی تو ہم عرض کرتے ہیں وہ ایک نقض عہد ہو گی اور حد درجہ کی پریشانی پیدا کرے گی"....

ہم کو یہ امید تھی کہ اس عظیم الشان اور مخلوط سلطنت میں جہاں مسلمان کل آبادی کے پورے ⅓ حصہ پر مشتمل ہیں اور سوائے ہندوؤں کے جملہ مذاہب کے لوگوں سے زیادہ ہیں مسلمانوں کے احساس سے لاپروائی نہ برتی جائے گی۔ ان کے مذہبی جذبات کا احترام کیا جائے گا اور ان کی اپنی تہذیب و روایات کو قائم رکھنے کے متعلق ان کی جو تمنائیں ہیں اور جو برطانوی سلطنت کے فوائد کے خلاف نہیں ان کے متعلق ایسے طریقے جن میں سے بعض مذہبی جنون پر اور بعض عمداً کینہ توزی پر مبنی ہیں اور یہ مسلمانوں کے جذبات کو باطل کرنے یا ذلیل کرنے کے لئے اختیار کئے گئے ہیں ان کے مذہبی اور نہایت عزیز انسٹی ٹیوشنوں کی بدگوئی اور مذمت کی گئی ہے ان کی بعض متبرک مساجد کے چھین لینے کی علانیہ تائید کی گئی ہے اور اسلامی حکومت کو تھریس اور قسطنطنیہ سے جہاں مسلمان آبادی کا غالب حصہ ہیں خارج کئے جانے اور اُن کے قدیم تاریخی

شہروں مثلاً سمرنا عدلیہ اور قونیہ کو کسی اور سبب سے نہیں بلکہ صرف دوسری اقوام کی حرص و آز کو پورا کرنے کے لئے ہتھیا لینے کو مغربی ایشیا کے بندوبست میں ضروری جتایا گیا ہے ہم ادب کے ساتھ التماس کرتے ہیں کہ مذہبی ناروا داری کا یہ جوش ان منتظمین کے کام کو نہایت مشکل کر دے گا جو سلطنت کے مختلف عناصر کو تاج برطانیہ کی عقیدت مندی وپائداری کے مشترک رشتہ اتحاد میں جکڑنے کے شائق ہیں۔"

مندرجہ بالا عرض داشت جس وقت پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد تمام اطراف سے شہادت جمع ہو رہی ہے کہ تقریباً تمام مسلمان قوموں میں جو چین سے بحراوقیانوس تک پھیلی ہوئی ہیں اور جزیرہ نماسے ملایا اور جنوبی افریقہ میں ترکی کی آیندہ قسمت کے متعلق عام اضطراب اور خوف پھیلا ہوا ہے اس گہرے احساس کو یہ کہہ کر بے اعتبار ٹھہرایا جاتا ہے کہ یہ جرمن یا ترکی ریشہ دوانیوں کے باعث ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ جوش خود بخود پیدا ہوا ہے اور عام ہے، اب ہم بھی یہ امید باندھتے ہیں کہ ترکی کا تصفیہ اس عہد کے مطابق ہوگا جو آپ نے حضور ملک معظم کی گورنمنٹ کے صدر اعظم اور سلطنت کے وسیع فوائد کے ایک محافظ کی حیثیت سے دنیائے اسلام سے کیا تھا اور اس طرح مایوسی و تلخی کی تمام وجوہ رفع ہو جائیں گی۔ ہم اس موقع پر معاصرانہ تاریخ کے ایک سبق کی حیثیت سے بیان کریں گے کہ ترکی کی تقسیم کی جو دھمکی دی گئی ہے اس کو ہندوستان کے ہندو بھی اسی طرح مذموم ٹھہراتے ہیں جس طرح مسلمان ٹھہراتے ہیں۔"

پھر یکم جون کو سکریٹری وفد مسلم لیگ سیٹھ یعقوب حسن نے وزیر اعظم کے سامنے ایک مطول و مدلل عرض داشت پیش کی جس میں ہندوستان کی اسلامی آبادی کے احساس رنج و تشویش، مسئلہ ترکی کی عالمگیر حیثیت، قسطنطنیہ کی اہمیت ترکی سیادت کی بقا، مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت تذلیل، غیروں کی حکم برداری اسلامی ریاستوں کے باہمی تعلق اور مسئلہ خلافت پر بحث تھی۔

ان عرض داشتوں کے علاوہ مسٹر تھیوڈر ماریسن سابق پرنسپل علیگڈھ کالج نے

ایک معرکتہ الآرا مضمون شائع کرایا جس میں انہوں نے پوری قابلیت سے مسلمانان ہند کے جذبات کی ترجمانی کی تمہید میں اُنہوں نے برطانوی پبلک کو متنبہ کیا کہ:۔

"اب وقت آگیا ہے کہ برطانوی پبلک اس نزاکت کو پہچانے جو کچھ مشرق میں ہو رہا ہے۔ ترکی کی مجوزہ تقسیم پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک آتش غیظ و غضب بھڑک رہی ہے ایسے مرکزوں میں جو ایک دوسرے سے اس قدر دُور ہوں جیسے کابل وقاہرہ شدائد کا پھوٹ پڑنا اس دور دور تک پھیلے ہوئے رنج و غصہ کا ایک نشان ہے۔ اب تک اخبارات نے اس بحث پر بہت ہی کم معلوم ہونے دیا ہے اور مسلمان جو ہمیشہ سے خاموش اور آگاہی عوام کے جدید طریقوں کو استعمال کرنے میں سست ہیں اُنھوں نے اپنا معاملہ کمزوری کے ساتھ اور نامکمل طور پر پیش کیا ہے لیکن فوجی اصحاب و منتظمین جو مشرق کو جانتے ہیں۔ وہ اس طریقہ پر جو اسلام کے جائز فوائد و اغراض کے ساتھ پیرس میں برتا گیا ہے بڑی تشویش محسوس کر رہے ہیں اور صاحب وزیر ہند نے علانیہ ان خطرات کا اظہار کر دیا ہے جو مستقبل کو دیکھ کر ان کے دل میں بھرے ہوئے ہیں۔ میں تقریباً تیس سال تک ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ رہا ہوں اور اس لحاظ سے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ برطانوی پبلک کو مسلمانوں کے اُن جذبات و احساسات سے آگاہ کروں جو اُن کے دلوں میں تجزیہ ترکی کے متعلق ہو رہے ہیں۔ کانفرنس صلح میں جہاں بدقسمتی سے کوئی مسلمان نمائندہ نہیں تھا یہ خیالات پھیلے ہوئے ہیں کہ سلطنت ترکی سے باہر اس سے کوئی ہمدردی رکھنے والا نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک تباہ کن غلطی ہے۔ آپ ذرا انھیں مسلمانوں سے مل کر دیکھیں جو لندن میں موجود ہیں اور اندازہ کریں کہ ان کے دلوں میں اس مسئلہ کے متعلق کیسی آگ لگی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں پشاور سے لیکر ارکاٹ تک مسلمان جوش سے بھرے ہوئے ہیں زنان خانہ میں عورتیں ترکی کے حشر پر آنسو بہا رہی ہیں۔ سوداگری پیشہ لوگ جو معاملات عامہ سے لگاؤ نہیں رکھتے اپنا کاروبار چھوڑے ہوئے ہیں۔ ان مسائل میں منہمک ہیں۔ دیوبند اور ندوۃ العلماء کے علماء جن کو سیاسی معاملات سے کوئی تعلق نہیں اپنے حجروں سے باہر آگئے ہیں اور صفوں

احتجاج بلند کرتے ہیں۔ مسلمان اس غم میں سب کچھ بھول گئے ہیں۔[46] چند روز قبل ایک مسلمان نے کہا کہ میں بحیثیت ایک ہندوستانی کے سکیم اصلاحات سے غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا لیکن جس دن مسٹر مانٹیگو نے اس کی دوسری خواندگی کے متعلق دارالعوام میں تحریک کی تو مجھے خبر بھی نہ ہوئی کیونکہ تباہی اسلام کا خوف سب سے تمام خیالات پر چھایا ہوا تھا۔"

ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکوں کے ساتھ ہمدردی ہے، وہ سب سے پہلے تو اسلامی اخوت پر مبنی ہے۔ چنانچہ تمام اسلامی دنیا میں جذبات کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے اور یہ اتحاد باہمی کچھ مستحکم نہیں ہے کیونکہ یہ یورپ کی عام درجہ بندی میں نہیں لایا جاسکتا۔ یہ جذبۂ وطن پرستی نہیں ہے کیونکہ یہ کسی ملک اور نسل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک عقیدہ سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ ایک مکمل اجتماعی نظام رکھتا ہے۔ یہ ایک تہذیب اور شائستگی کا مالک ہے اور اس کے پاس اپنے ذاتی علوم و فنون ہیں۔ اس تہذیب کے ساتھ مسلمان گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ وہ اپنے شاندار ماضی پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اُن فتح مندیوں پر نازاں ہیں جو زمانہ امن و جنگ دونوں میں اُن کو حاصل رہی ہیں۔ ان کو بغداد و قرطبہ کی یونیورسٹیاں یاد ہیں جہاں مسلمان فضلا نے پھیلی ہوئی تاریکی میں علوم کی مشعلیں روشن کی تھیں، ان کو وہ پل اور نہریں وہ عام عمارات فراموش نہیں ہوئی ہیں جن سے اسلامی سلطنتیں معمور تھیں۔ وہ مساجد و مقابر اور وہ مقامات ان کے پیش نظر ہیں جنہوں نے اسلامی شہروں کی رونق بڑھا رکھی ہے۔ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ یہ تہذیب فنا ہو چکی ہے، اس میں ترقی کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے۔ وہ یہ پہچانتے ہیں کہ وہ نحوست ایام میں مبتلا ہو گئی ہے اس نے ماضی کی حد سے زیادہ تعظیم سے تنگ خیالی و تعصب سے اور تنگ دائرہ میں رہنے والی علمیت دین سے نقصان اٹھایا ہے۔ ایسی علمیت دین جو اس سے ناموافق نہیں ہے، جس نے یورپ کے خیال کو ازمنہ وسطیٰ میں مکدّر کر رکھا تھا۔ لیکن وہ یقین رکھتے ہیں کہ اسلام کے بھی عروج ثانی کا وقت آئے گا اور مغربی علوم سے اسکو ایسی قوت بخش غذا مل رہی ہے جو اس میں تازہ سرگرمی پیدا کر دے گی اور اس نئی زندگی کی شہادتیں ہر جگہ نمایاں ہیں۔[48]

مسلمانوں کے جب ایسے تخیلات ہیں تو یہ امر فطرتی ہے کہ وہ اسلامی سلطنتوں اور ایسی تمام ریاستوں پر جو اُن کے اظہار تخیل کا ذریعہ ہیں اپنے دل کا جوش ظاہر کریں دنیا سے کوئی مسلمان سلطنت ناپید ہو جائے گی تو ان کے مقصد کو نقصان پہونچے گا۔ اس زمانہ میں جس کو بہت زیادہ عرصہ نہیں گذرا مسلمان سلطنتوں کا ایک زنجیرہ جاوا سے بحراوقیانوس تک پھیلا ہوا تھا اور اُس وقت اگر کوئی ایک اسلامی سلطنت تباہ ہو جاتی تھی تو اُس کو بہت بڑی اہمیت نہیں دی جاتی تھی مگر جب سے عیسائیت کی ٹکرنے مسلمان سلطنتوں کو پامال کر دیا ہے اُس وقت سے باقی ماندہ سلطنتوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ایک عظیم الشان مسلمان نے ربع صدی قبل مجھ سے کہا تھا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری حالت یہودیوں کی سی ہو جائے گی اور ہمارا کوئی ملک نہیں رہے گا۔ ایسی حالت میں یہ امر ناگزیر ہے کہ ان کی اُمیدوں اور ہمدردیوں کا مرکز ترکی بن جائے گا جو اسلام کی اکیلی باقی ماندہ عظیم الشان سلطنت ہے۔ ایک مسلمان دوست نے ۱۹۱۵ء میں مجھے لکھا تھا کہ ترک اتنے عرصہ دراز سے اسلام کا پشتہ بنے ہوئے ہیں اور ہم ان کی تباہی برداشت نہیں کر سکتے۔ طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں کے زمانہ میں وہ ترکوں کی زوال پذیر حالت کو یاس انگیز تشویش کے ساتھ برابر دیکھتے رہے کیوں کہ اُن کے نزدیک اسلام کا یہ آخری مقابلہ تھا۔"

اس کے علاوہ ہز ہائی نس سر آغا خاں، سید امیر علی، لارڈ ہیڈلے (نومسلم) سر عباس علی بیگ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں۔ سر کرشن گپتا اور دیگر مسلمانوں انگریزوں اور ہندوؤں نے دستخط کر کے ایک اور عرضداشت وزیر اعظم کو بھیجی۔ اس میں ترکی میں دو صد سالہ مسیحی و روسی سازشوں کا تاریخی تذکرہ کر کے ترکی کی ان خدمات کو جو اُس نے انگلستان کی کی تھیں یاد دلایا کہ:-

ایک صدی پہلے جب برطانوی فرانس سے ہندوستان کی حکومت کے متعلق لڑ رہے تھے اُس وقت سلطان ٹرکی نے ٹیپو سلطان والئی میسور کو ایک نامہ لکھا ان پر انگریزوں سے مل جانے کے لئے زور دیا۔ مرحوم امیر عبدالرحمٰن کی تزک سے ایک

بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ انگریزوں کی جانب سے ترکی مداخلت نے اس خوفناک تحریک جہاد کو روک دیا جو سرحد ہندوستان پر برطانیہ کے برخلاف نشوونما پا رہی تھی۔ ایک دوسری شاندار مثال یہ بھی موجود ہے کہ ترکوں نے اجازت دیدی کہ مصر کے راستہ سے برطانوی سپاہ ہندوستان میں داخل کی جائے اور اس سے انگریزوں کو عظیم فتنہ ۱۸۵۷ء کے دبانے کا موقع مل گیا۔ جنگ کریمیا کا حوالہ دینے سے اُن خدمات کی اہمیت اور زیادہ واضح ہوجائے گی جو خلیفۃ المسلمین نے سلطنت برطانیہ کے لئے انجام دی ہیں کیوں کہ جیسا کہ آخری سالوں میں خیال کیا جا رہا ہے اگر صیح گھوڑا (روس) جیت جاتا تو اگر مصر بالکل انگریزوں کے لئے بند نہ ہوجاتا تھا تو بھی ہماری گورنمنٹ کو برطانوی سپاہ ہندوستان میں تیزی کے ساتھ لے جانے میں بڑی پریشانی لاحق حال ہوتی۔

پھر مسلمانان ہند کی وفاداری کا بیان کرکے برطانوی انصاف سے اپیل کی کہ:۔

آخر میں ہم جناب کی خاص توجہ اس واقعہ کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں کہ ایشیا میں اتحادیوں کو جو بڑی فتوحات حاصل ہوئیں اور جن کی وجہ سے دول وسطیٰ کو عظیم ترین نقصان برداشت کرنا پڑے وہ ہندوستانی سپاہیوں کی بہادری کی بدولت حاصل ہوئیں۔ ان ہندوستانی سپاہیوں میں بہترین مسلمان شامل تھے جیسا کہ ابھی حال میں خود صاحب وزیر ہند نے دارالعوام میں اعتراف کیا ہے، ابتدائے جنگ میں ان ہی سپاہیوں نے فلینڈرس میں جرمن فوجوں کو روکنے میں بہت ہی شاندار اور بیش بہا خدمات انجام دی تھیں اس لئے کہ وہ وقت ایسا تھا کہ جب حالت بے انتہا نازک اور خطرناک ہوچلی تھی، اب ہم یہ دریافت کرنے کی جرات کریں گے کہ کیا یہ درست ہے کیا یہ مبنی بر عقل و انصاف ہے کہ وہ مسلمان سپاہی اور ان کے ابنائے ملک جنہوں نے فتح حاصل کرنے میں اتنی قیمتی خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی آواز سلطنت ترکی کی قسمت کا فیصلہ کرتے وقت مطلق نہ سنی جائے اور بمقابلہ ان کے ایسے لوگوں کی آواز سنی جائے جن کی ہوس ملک گیری کے خفیہ معاہدوں سے بھڑک اٹھی ہے اور جن کا ترکی کی شکست میں بہت ہی معمولی حصہ رہا ہے۔ ہم کو اس کا پورا یقین و اعتماد ہے کہ یہ واقعہ برطانوی قوم

کے عدل و انصاف سے اپیل کرے گا جس کی آپ ایسے نازک موقع پر سربراہی کر رہے ہیں جب کہ ہندوستان نہایت شدید تکلیف و انتشار کے ساتھ گورنمنٹ برطانیہ اور اتحادیوں کے اس طریق عمل کو جو ان کا خلافت کے ساتھ ہے دیکھ رہا ہے۔

جناب عالی! ہم پھر آپ سے یہ اپیل کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ دنیائے اسلام اور خصوصاً حضور ملک معظم کی ہندوستانی رعایا کے پورے جذبات کا لحاظ کر کے آپ معاملات کا تصفیہ کرانے میں اپنے معاہدہ کے مطابق ایک زبردست اثر استعمال کریں اس لئے کہ آپ کے معاہدہ کو ہندوستان اور اسلامی دنیا نے حضور ملک معظم کی گورنمنٹ کا ایک پائدار معاہدہ سمجھا تھا۔"

ہندوستان میں ان واقعات اور مخالفانہ خیالات و تجاویز سے انتہائی غم و غصہ کی لہر پیدا تھی۔ وائسرائے نے بھی ستمبر ۱۹۱۹ء میں اطمینان دلایا کہ انہوں نے مسلمانوں کی جس قدر ممکن نمائندگی تھی کی اور اچھی طرح ان کی آواز کو وزیر ہند اور انگلستان کی گورنمنٹ تک پہونچا دیا۔

نیز اس کے بعد ۱۴ر نومبر کو مدراس میں ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ:-

"میں ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ پریشانی کو محسوس کرتا ہوں اور اس پریشانی کے متعلق ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں جو انھیں ترکی صلح کے نامہ و پیام سے نتیجے کے متعلق محسوس ہو رہی ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کے احساسات کس قدر طاقتور ہیں میں نے ہوم گورنمنٹ اور صلح کانفرنس کے ممبروں کے سامنے ان کے خیالات کی حتی الامکان پوری نمائندگی کر دی ہے۔ صلح کی کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے خاص مسلم نمائندے بھی بھیجے گئے تھے۔ ان باتوں کا نتیجہ خواہ کچھ بھی نکلے اس لئے کہ اس کا دارومدار ان باتوں پر رہے گا جو ہندوستان اور انگلستان کے علاوہ دوسروں کے مفاد پر بھی اپنا اثر ڈالتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس امر کا یقین رکھنا چاہیے کہ ان کے جذبات کی پوری نمائندگی کر دی گئی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ مسٹر بونر لا نے ہاؤس آف کامنز میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ برٹش گورنمنٹ ترکی کے مستقبل کے متعلق ہندوستانی

مسلمانوں کی دلچسپی سے واقف ہے اور یہ کہ ان کے جذبات کا پورا احترام اور وزن کیا جائے گا۔
ہندوستانی مسلمانوں کی بے چینی سے حکومت ہند نے حکومت انگلستان کے سامنے
مطالبات پیش کرنے کے لئے سرکاری مصارف سے ایک وفد روانہ کیا جس کے ارکان
ڈاکٹر انصاری، مسٹر حسن امام، قاضی عبدالغفار، ہز ہائی نس آغا خاں اور بمبئی کے سیٹھ
چھوٹانی تھے۔ یہ وفد تقریباً ڈھائی مہینہ انگلستان میں مقیم رہا اور اس نے وزرا سے ملاقاتیں
کرکے مسلمانان ہند کے مطالبات و نقطہ نظر کو پیش کیا لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی اور یہ
حقیقت بہت جلد آشکارا ہو گئی کہ مدبرین سلطنت کو مسلمانوں کے جذبات و احساسات
اور جنگی خدمات و امداد کا کوئی لحاظ نہیں کیوں کہ وہ مسیحی تعصب جو صدیوں سے عیسائی
حکومتوں کے دل میں جاگزین تھا۔ ان میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

چنانچہ جب انگلستان کے وزیراعظم نے جنرل ایلنبی کے سینہ پر فتح فلسطین کا تمغہ لگایا
ہے تو اس جنگ کو کروسیڈ (صلیبی جنگ) قرار دیا۔

۱۹۱۹ء کے شروع سے ہی دہلی اور پنجاب میں نہایت دل دوز اور خونیں واقعات
پیش آئے، معاہدہ التوائے صلح کے بعد سرکاری طور پر جشن صلح منایا گیا مگر مسلمانوں
کو اس میں شرکت سے باز رکھنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کی کوششوں کے نتیجہ میں
اس جشن کو بائیکاٹ کیا گیا۔ بعض مقامات پر ہندو بھی مسلمانوں کی ہمدردی کے لحاظ سے
اس میں شریک نہیں ہوئے۔

دہلی میں ایک ہڑتال کے موقع پر پولس اور فوج کا عوام سے تصادم ہو گیا جس سے
اسٹیشن اور چاندنی چوک فائرنگ سے خونی منظر بن گیا۔

پنجاب میں جو عرصہ سے بے چینی تھی وہ روز بروز بڑھ رہی تھی اور حکومت فوجی نقطۂ نظر
سے اس صوبہ کو زیادہ محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ خاتمہ جنگ کے بعد تارکان وطن سکھوں
پر سازشی مقدمات چلا کر سخت سزائیں دینے سے اس جنگی عنصر میں اور بے چینی بڑھ گئی۔
مسلمان بھی مسئلہ ترکی سے بہت بے چین تھے۔ ان ہی حالات میں رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے
نتیجہ میں رولٹ بل مرتب ہوا جس کی ہر طرف سے مخالفت کی گئی لیکن حکومت نے قانون

بنا ہی دیا، اس میں اصول انصاف کو کہیں دخل نہ تھا اور نہ اس کے خلاف کوئی اپیل ہو سکتا تھا۔ آئینی ضوابط کی ہوا تک نہ تھی۔

اب اس کی مخالفت ہڑتالوں اور مظاہروں کے ذریعہ سے ہوئی۔ اس ضمن میں بمقام امرتسر ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو حکومت پنجاب نے گرفتار کر کے کسی غیر معلوم جگہ روانہ کر دیا، اس سے پبلک میں ہیجان و اشتعال ہوا اور نتیجہ میں امرتسر کے وہ تمام واقعات پیش آئے جن میں بے دردی اور سفاکی اپنی تمام خدوخال کے ساتھ نمایاں ہوئی۔ بلاشبہ عوام نے اشتعال جذبات میں سرکاری عمارات کو کچھ نقصان پہونچایا لیکن حکومت نے مارشل لا جاری کر کے انتقام کی آگ اتنی بھڑکائی کہ جو صدہا بیگناہوں کے خون سے بھی ٹھنڈی نہ ہوئی، امرتسر کے علاوہ اور مقامات میں بھی ایسے ہی واقعات رُونما ہوئے اس مشترکہ مصیبت نے ہندو مسلم اتحاد کو بڑی تقویت پہنچائی۔ اگرچہ تھوڑے عرصہ بعد ہی نظر بندوں کے متعلق شاہی اعلان معافی ہو گیا۔ مگر زخموں کے اندمال کے لئے یہ مرہم کافی نہ تھا۔ آخر دسمبر میں امرتسر ہی میں کانگریس اور لیگ کے سالانہ اجلاس منعقد ہوئے۔ ۲۵ دسمبر کو باہمی قرارداد کے مطابق دونوں اجلاسوں کے صاحبان صدر پنڈت موتی لال نہرو اور حکیم محمد اجمل خاں صاحب کا مشترکہ جلوس نکلا جو اپنی عظمت و شان کے ہی لحاظ سے نہیں بلکہ کیفیت کے اعتبار سے بھی شاندار و دل آویز تھا۔ دونوں اجلاسوں میں دونوں قوموں کے اصحاب نے شرکت کی لیگ کی مجلس استقبالیہ کے نائب صدر ابوالوفا مولوی ثناءاللہ صاحب تھے انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں تمام مسلم معاملات پر مذہبی نقطہ نظر سے بحث کی اور سلسلہ بیان میں مسلم قومیت کی اس طرح تعریف کی کہ:۔

"حضرات! مسلمانوں کی قومیت دراصل ملک یا نسل یا پیشہ پر نہیں بلکہ مذہب پر ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اسلام کے لحاظ سے ایک مسلم کا یہ دعوےٰ بہت صحیح ہے۔

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

صدر اجلاس نے خلافت و مقامات مقدسہ ترکوں کے متعلق انگلستان کی پالیسی

وعدوں مسلوک مسلمانان ہند کی درخواستوں سے بے اعتنائی نیز ایران کے ساتھ ظالمانہ معاہدہ، مظالم پنجاب، رولٹ ایکٹ، ریفارم اسکیم اور جوائنٹ کمیٹی کی سفارشوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا، درمیان میں ہندو مسلم اتحاد پر نظر ڈالی اور یہ فرمایا کہ:-

"پولیٹکل حقوق کا مسئلہ گذشتہ کئی برس تک ان دونوں برادریوں میں کشمکش کا سبب رہا تھا جسے مسلم لیگ اور کانگریس نے بڑی حد تک ۱۹۱۶ء میں طے کر دیا اس سلسلہ میں لیگ اور کانگریس کو اور جو کچھ بھی طے کرنا ہے امید ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ کسی وقت مناسب پر طے ہو جائے گا۔"

مسئلہ خلافت میں ہندوؤں کی ہمدردی کا تذکرہ کرتے ہوئے گاؤکشی کے مسئلہ پر ایک عالمانہ بحث کی اور قربانی کے لئے بھیڑ بکری کے انتخاب پر زور دیا۔

کرسی صدارت کی طرف سے ہز مجسٹی کی ذات اور تخت کے ساتھ اطاعت اور مسلمانان ہند کی مستحکم اور مسلسل وفاداری کا رزولیوشن بھی پیش ہوا۔

دیگر رزولیوشنوں میں ایک رزولیوشن آئندہ اصلاحات میں مسلم مفاد کے تحفظ کا مستقل طریقہ اختیار کئے جانے کی نسبت بھی تھا یعنی سرکاری ملازمتوں اور یونیورسٹیوں میں مناسب ومعقول نیابت، اردو ابتدائی ذریعہ تعلیم، جن صوبوں میں کہ اردو زبان اور فارسی رسم خط کا رواج ہے وہاں اس کا برقرار رہنا مذہبی رسم ورواج میں بلا کسی قیود کے سہولت امداد اور حمایت کا۔

اسی رزولیوشن کے سلسلہ کا دوسرا رزولیوشن یہ تھا کہ:-

آل انڈیا مسلم لیگ تجویز کرتی ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے ایک کمیٹی جلد از جلد قائم کرنے کے لئے کہا جائے جو کمیٹی قائم کردہ کونسل مسلم لیگ سے باہم مشورہ کرے تاکہ اُن مسائل کے متعلق ایک سمجھوتہ ہو جائے جو قانون اصلاحات ۱۹۱۹ء سے اور مکمل ذمہ دار حکومت کے مطالبہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر انصاری نے ایک پرجوش تقریر کے ساتھ حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا جو بالاتفاق پاس ہوا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اہل ہنود نے جس

نیک رویہ کا اظہار کیا ہے اس کے اعتراف میں اور ہندوؤں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اتحاد کو زیادہ مضبوط کرنے کی غرض سے بقرعید کے موقع پر جہاں تک ممکن ہو سکے گائے کی بجائے دوسرے جانوروں کی قربانی کی جائے۔"

زاں بعد قانون مطابع، ہنٹر کمیٹی[1]، جنرل ڈائر کی برطرفگی[2] لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند کی جبریہ واپسی مسئلہ خلافت، جزیرۃ العرب و دیگر مقامات مقدسہ ہندوستانی بنے ہوئے کپڑے کے استعمال شاہی اعلان معافی[3] کی وسعت کے متعلق قرار دادیں پاس ہوئیں اس کے علاوہ تین ریزولیوشن اور تھے جن میں پہلے میں ملک معظم کی ذات اور تخت کے ساتھ وفاداری اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر فرمان منظوری کے صدور پر تشکر کا اظہار کر کے اس تیقن کو بیان کیا گیا کہ:۔

"عام معافی تمام سیاسی قیدیوں کو عطا کرنے کا شہنشاہی عمل رحم ایک بڑی حد تک اس تلخی کو دور کر دے گا جو باشندگان ہند اور اُن اشخاص کے درمیان ہے جو ملک کی حکومت کے ذمہ دار ہیں۔

مسلم لیگ حضور شہنشاہ معظم کو یقین دلاتی ہے کہ باشندگان ہند نہایت اخلاص اور دلی مسرت کے ساتھ حضور ولی عہد بہادر کا خیر مقدم کریں گے جب حضور ممدوح آئندہ موسم بہار میں رونق افروز ہوں گے۔"

دوسرے رزولیوشن میں سلطان المعظم کے حضور میں بحیثیت خلیفۃ الرسول و پیشوائے اسلام عمیق و غیر متزلزل ارادت و عقیدت کا ہدیہ پیش کیا گیا۔

تیسرا ریزولیشن یہ تھا کہ:۔

"رائٹ آنریبل سیموئل مانٹیگو کی محنت کا اعتراف کرتے ہوئے جو انھوں نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کے متعلق کی ہے آل انڈیا مسلم لیگ

---

[1] فسادات پنجاب کی تحقیقات کے لئے یہ کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔

[2] امرتسر کا فوجی افسر جس نے جلیانوالہ باغ امرتسر میں سفاکانہ گولی چلوائی۔

[3] سیاسی قیدیوں کے رہائی کا فرمان۔

بہت افسوس کرتی ہے کہ مکمل ذمہ دار حکومت جس کی صلاحیت ہندوستان رکھتا ہے صوبہ و نیز مرکزی حکومت میں نہیں دی گئی اور یہ کہ انتخاب حکومت کا اُصول اس کے مطالبہ کے بہ موجب اس کے ساتھ نہیں برتا گیا اس لئے وہ اصلاحات کو ناکافی اور ناقابل اطمینان تصور کرتی ہے۔ اور اُمید کرتی ہے کہ پارلیمنٹ جلد سے جلد مکمل ذمہ دار حکومت ہندوستان میں قائم کرے گی۔ اس درمیان میں لیگ ہندوستانیوں سے چاہتی ہے کہ اپنی صلاحیت کی بابت کامل حکومت خود اختیاری کا ثبوت دیں اس طور پر کہ پاس شدہ اصلاحات سے جو مکمل ذمہ دار حکومت کی سمت میں ایک ممیز قدم ہے جو موقع حاصل ہوا ہے اُس سے فائدہ حاصل کریں۔"

اسی اجلاس میں ڈاکٹر انصاری کی تحریک سے لیگ کی مستقل صدارت پر مسٹر محمد علی جناح کا باتفاق عام انتخاب ہوا۔

کانگریس کے اجلاس میں بھی مسئلہ خلافت سے گہری ہمدردی کا اظہار کیا گیا اور صدر کانگریس نے ترکی مسائل کی اہمیت پر بحث کی۔

انگلستان کا جو رویہ ترکی کے معاملات میں رہا اس سے جو بے چینی مسلمانان ہند میں تھی اس کے نتیجہ میں جا بجا مضطربانہ جلسے منعقد کئے گئے۔ اسی سلسلہ میں بمقام دہلی مولوی فضل الحق (وزیر اعظم بنگال) کی صدارت میں ۲۳ر نومبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کانفرنس کے نام سے ایک عظیم الشان جلسہ ہوا تھا اور اُس میں تجویز کی گئی تھی کہ:-

(۱) ایران اور ترکی کے مقدس مقامات میں جو زیادتیاں کی گئی ہیں اُن پر اظہار رنج کے لئے مسلمانان ہند جشن صلح میں شریک نہ ہوں اور اس کے خلاف جلسے منعقد کریں۔

(۲) مسلمان حکومت سے ترک موالات کریں۔

(۳) اگر حسب منشا معاملات ترکی کا فیصلہ نہ ہو تو ولایتی مال کا مقاطعہ کیا جائے۔

آخر دسمبر میں جب شاہی اعلان معافی کی رو سے علی برادران رہا ہو کر براہ راست امرتسر پہونچے جس وقت کہ کانگریس اور لیگ کے سالانہ جلسے بھی ہو رہے تھے تو

مولانا شوکت علی کی صدارت میں خلافت کانفرنس کا بھی اجلاس ہوا اور اس نے طے کیا کہ ۵ ارجنوری ۱۹۲۰ء تک انگلستان کو ایک وفد روانہ کیا جائے اور خلافت فنڈ قائم کرکے دس لاکھ روپیہ جمع کیا جائے۔

گذشتہ اجلاس لیگ منعقدہ دہلی میں شرکت کے بعد چند علما نے اس امر کی ضرورت محسوس کی یا ان کو محسوس کرائی گئی کہ وہ خود اپنی ایک جمعیت قائم کریں، یہ احساس ۲۴ ارنومبر کے جلسہ خلافت سے اور تیز ہوگیا تو امرتسر کے اجتماع کے موقع پر مولانا ثناء اللہ صاحب کی دعوت پر جمعیت العلما کا اجلاس بھی منعقد ہوا۔ پہلے جلسہ کے صدر مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور دوسرے کے مفتی کفایت اللہ دہلوی منتخب ہوئے۔

ان جلسوں میں قرار دیا گیا کہ مسجدوں میں سلطان المعظم کا خطبہ پڑھا جائے اور مسائل خلافت طے کرنے کے لئے صلح کانفرنس میں مسٹر قدوائی مسٹر غلام محمد بھرگری بارایٹ لا اور مسٹر اصفہانی کو جانے کی اجازت دی جائے۔

(۱) غیر مسلم برادری کے ساتھ ہمدردی اور اتفاق (۲) مذہبی حقوق کی نگہداشت اور (۳) مسلمانوں کی رہنمائی۔ جمعیت کے مقاصد قرار دیئے گئے۔

۶ ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں ایک غیر معمولی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریک اور مولانا مظہرالدین (شہید) کی تائید سے حسب ذیل ریزولیوشن پاس ہوا کہ :-

"جمعیت العلمائے ہند کا یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ چوں کہ ترکی کے ساتھ صلح کرنے میں دول یورپ نے صریح طور پر ناانصافی کی ہے اور اسلامی جذبات کو پامال کیا ہے اور وزرائے برطانیہ نے اپنے صاف و صریح وعدوں کی علانیہ خلاف ورزی کی ہے اور خلافت کے اقتدار کو زائل کرنے اور خلیفۃ المسلمین کی مذہبی طاقت کی بیخ کنی کرنے میں اسلام کے ساتھ صریح طور پر مذہبی تعصب کا ثبوت دیا ہے۔ اس لئے مسلمانوں پر بحیثیت تبع اسلام ہونے کے لازم آگیا ہے کہ وہ ان اعدائے اسلام سے ترک موالات کریں"

اس تحریک کی دیگر پچاس علمار نے بھی تائید کی۔

اس کے بعد ترک موالات کا فتوے شائع ہوا جس پر پانچ سو دستخط علما نیم علما اور برائے نام علمار کے ثبت تھے۔ جس کی رو سے کونسلوں کی ممبری، وکالت، سرکاری کالج سرکاری گرانٹ، انگریزی مال، آنریری مجسٹریٹی، فوجی وغیر فوجی ملازمت پیروی مقدمات اور خطابات کو موالات میں داخل کرکے ممنوع قرار دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس جو ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا اس نے بھی ترک موالات کا رزولیوشن پاس کیا۔

اب تک کانگریس میں کوئی رزیولیوشن تحریک عدم تعاون کے متعلق نہیں پاس ہوا تھا۔ چنانچہ کارکنانِ کانگریس کو ضروری معلوم ہوا کہ اس اہم مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے کانگریس کا خاص اجلاس طلب کریں جس کا انعقاد ستمبر ۱۹۲۰ء میں بمقام کلکتہ قرار پایا، اس جلسہ نے نہایت تفصیل کے ساتھ عدم تعاون کا پروگرام مرتب کرکے ملک کے سامنے پیش کیا اور جیسے جیسے کہ ملک تیار ہوتا جائے درجہ بدرجہ اس پروگرام پر عمل کرنے کی تحریک کی، چوں کہ کونسلوں کا انتخاب بہت ہی قریب تھا اس لئے سب سے زیادہ زور مقاطعہ کونسل پر دیا گیا اور یہ تحریک کی کہ جو لوگ ممبری کونسل کے امیدوار ہیں وہ اپنے نام واپس لے لیں اور جو لوگ کانگریس کے اس مشورے کے خلاف ممبری کے لئے کھڑے ہوں اُن کو کوئی ووٹر رائے نہ دے۔

جب ناگپور کی کانگریس دسمبر ۱۹۲۰ء میں ہوئی تو انتخاب ہو چکے تھے اور باوجود کلکتہ کانگریس کے رزولیوشن کے جس میں کونسلوں کا بائیکاٹ تجویز ہوا تھا کونسل کی نشستیں خالی نہیں رہیں، ناگپور کانگریس نے عدم تعاون کے رزولیوشن کا اعادہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ جو لوگ کونسلوں میں شریک ہوئے ہیں وہ ملک کے حقیقی نمائندے نہیں ہیں اور اُن کے لئے مناسب ہے کہ وہ مستعفی ہو جائیں۔ اُس دفعہ سے کانگرس کی تمام جماعتیں متفقہ طور پر عدم تعاون کے پروگرام پر عامل اور دوسروں کو اس پر عمل کرنے کی محرک رہیں،، اسی سال تحریک ہجرت بھی مولانا ابوالکلام آزاد اور

بعض دیگر علماء کے دماغ سے نکلی۔ ہزار دس مسلمان گھر بار بیچکر اور نوکریاں چھوڑکر تنہا بھی اور اہل وعیال کو ساتھ لیکر بھی گرمی اور برسات کے موسم میں افغانستان کی طرف روانہ ہوگئے۔ جہاں داخلہ بند ہونے کے بعد وہ طرح طرح کے مصائب میں مبتلا ہوئے۔ صدہا مہاجر درہ خیبر میں بے گور وکفن رہگئے اور اکثر طعمہ زاغ وزغن بنے لیکن ان مفتیان ہجرت میں سے کسی نے ہجرت کی سعادت حاصل نہ کی۔

خلافت فنڈ جو امرتسر میں قائم ہوا تھا غریبوں کی مدد سے روز بروز بڑھنے لگا اور روزانہ ہزارہا روپیہ اطراف ہند سے صدر دفتر خلافت (بمبئی) میں پہونچنے لگا خلافت نوٹ بھی جاری کیا گیا اور لوگوں نے بڑے شوق سے خریدا۔

علی برادران نے ملک میں جذبات مشتعل کردئے۔ ان کے ساتھ ہند و لیڈر بھی خلافت فنڈ سے سفر کرتے اور ہر جگہ اپنی ہمدردیاں نمایاں کرتے رہے۔

خلافت کا وفد وائسرائے سے ملا اور دوسرا یورپ روانہ ہوا اور آٹھ ماہ مقیم رہکر اور ۶۵ ہزار صرف کے بعد بے نیل مرام واپس آیا۔

اسی سال مالابار کا حادثہ پیش آیا جہاں عربی النسل موپلاؤں کی بہت بڑی آبادی ہے۔ یہاں خلافت کے جلسوں پر دفعہ ۱۴۴ عائد کی گئی اور سیٹھ یعقوب حسن مرحوم (وزیر گورنمنٹ مدراس) کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان وجوہ سے سخت بے چینی شروع ہوگئی اس کے بعد ہی جب اور لیڈر بھی گرفتار ہوئے تو موپلاؤں کی ایک کثیر تعداد کالیکٹ میں مجتمع ہوگئی پولیس نے مزاحمت کی ان کو زدوکوب کیا گیا خلافت والنٹیروں کی وردیاں چھین لی گئیں جو لوگ مسجد میں جمع تھے ان کو محاصرہ کرکے گرفتار کیا گیا جن میں ان کے ایک امام بھی تھے جو سب سے بڑے مذہبی پیشوا تھے۔

جب ان گرفتاروں کی رہائی کے لئے لوگوں نے اصرار کیا تو ان پر گولیاں برسائی گئیں اور ایک ہی موقع پر چار سو آدمی ہلاک ہوئے۔ چوں کہ مدراس میں ہر حصہ زندگی پر ہندو چھائے ہوئے ہیں اور یہ بے دردیاں اور ہولناک مظالم انہیں کے ہاتھوں سے ہوئے اس لئے جب موپلے مجبور ہوکر تشدد پر آترے تو قدرتی طور پر یہ ہندو ہی تاک گئے

مقابل تھے بہت جلد ایک عام بدامنی کی حالت پیدا ہو گئی، تار کاٹے گئے، ریل کی پٹریاں اکھاڑی گئیں، بعض مندر بھی توڑے گئے اور مکان بھی جلائے گئے مگر حکومت کے مقابلہ میں یہ غیر منظم اور غیر مسلح جمعیت کب تک قائم رہتی۔ اُس نے بہت جلد حالات پر قابو پا لیا گیا۔

حکومت نے قابو پانے کے بعد ان کے ساتھ انتہائی بے رحمی کا مظاہرہ کیا، موسم گرما میں ایک سو موپلے مال گاڑیوں کے ڈبوں میں بند کرکے بھیجے گئے جن میں سے (۷۰) دم گھٹ کر مر گئے اور تیس کی حالت بُری ہو گئی، پھر مختلف سزائیں دی گئیں اور اور اقتصادی طور پر وہ عرصہ دراز تک کے لئے تباہ کر دیئے گئے، اس واقعہ میں یہ بات نہایت نمایاں ہے کہ بعض مقامات پر ہندو بھی اُن کے رفیق تھے اور جو کچھ موپلوں نے کیا وہ جابر حکومت اور ظالم حکام کے مقابلہ میں تھا، ان کو عام ہندوؤں سے کوئی عداوت نہ تھی بہرحال یہ خونی واقعہ اس زمانہ کی تاریخ کا سب سے زیادہ ہولناک باب ہے۔ مگر اس واقعہ کو مہاسبھائیوں نے مسلمانوں کے خلاف ہندو جذبات مشتعل کرنے میں بطور ایک نوحہ و مرثیہ کے استعمال کیا۔ اور مسلمانوں سے ناراضی کا مستقل سبب بنا لیا۔ حالاں کہ اصل واقعہ اور اس کی حقیقت پر غور نہیں کیا گیا، جس کو مولانا حسرت موہانی نے اپنے خطبہ صدارت مسلم لیگ (۱۹۲۱ء) میں صاف طور پر نمایاں کیا ہے کہ:۔

آپ سب جانتے ہیں کہ ہندوؤں کو موپلوں سے خاص طور پر اور عام طور پر ہم سب سے یہ شکایت ہے کہ موپلے اپنے ہندو پڑوسیوں کو خوب لوٹ رہے ہیں لیکن آپ کو یہ بھی جاننا چاہیئے کہ موپلے اس کے متعلق کیا کہتے ہیں کہ ایسے موقعہ پر جب کہ ہم انگریز کے خلاف جنگ میں مشغول ہیں ہندو ہمارے ساتھ ہونے یا خاموش رہنے کی بجائے ہمارے خلاف انگریزوں کی ہر ممکن مدد کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب کہ وہ اپنے مذہب کی خاطر انگریزوں سے لڑ رہے ہیں اور اپنے گھروں اور اپنی جائدادوں کو چھوڑ کر اُنہوں نے جنگلوں اور پہاڑوں میں بسیرا لے رکھا ہے تو اگر وہ اپنی ضروریات کے لئے انگریزوں اور ان کے مددگاروں سے روپیہ یا اور ضروری

چیزیں لے جاتے ہیں تو اس کو لوٹ مار سے کیوں تعبیر کیا جاتا ہے۔

حضرات! جہاں تک میں نے تحقیقات کی ہے اس کا اصل سبب صرف یہ ہے کہ تیسری طاقت ہندوؤں اور موپلوں کے درمیان میں ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی انگریزی فوج کا دستہ موپلوں کی رہائش کے علاقہ میں آجاتا ہے اور موپلوں کا قتل ہو جاتا ہے تو یہ خبر فوراً ہی اُڑ جاتی ہے کہ اس جگہ کے ہندوؤں نے اس دستہ کو اپنی حفاظت کے لئے بلایا تھا جس کے جواب میں پھر موپلے بھی ہندوؤں پر چھاپہ مارتے ہیں اور ان کا روپیہ اور چیزیں لڑائی کا مالِ غنیمت سمجھ کر لے جاتے ہیں چونکہ وہ دشمن کے مددگار خیال کئے جاتے ہیں اور جہاں یہ واقعات نہیں ہوتے وہاں اب بھی ہندو اور موپلے مل جل کر رہتے ہیں اور ہندو ان کی حتی الوسع مدد کرنے میں دریغ نہیں کرتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں علی برادران نے گاندھی جی کی قیادت میں ایم۔اے۔او کالج پر حملہ کر کے طلبا اور اسٹاف سے ترک موالات کے پروگرام کا مطالبہ کیا مخالفین و موافقین نے پوری طاقت آزمائی کی اور اس کے بعد ہی کالج کی مسجد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح ہوا جس میں طلبائے کالج کا بہترین عنصر شامل ہوگیا۔ مولانا محمود حسن صاحب اعلان شاہی سے رہا ہو چکے تھے مگر علیل تھے اور دہلی میں موجود ہونے کے باوجود جمعیت العلما کے اجلاس تک میں شریک نہ ہو سکے۔ ان کے خطبۂ صدارت کا فرض بھی دوسرے صاحب نے انجام دیا لیکن اس موقع پر جب کہ وہ دو قدم بھی چلنے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور بعض نے قریب سے دیکھا کہ حواس و ہوش بھی برجا نہ تھے، گو دوں میں اُٹھا کر لائے گئے۔ اور اگرچہ وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے مگر ان کی افتتاحی تقریر سنائی گئی۔

ترک موالات کی نسبت صرف علما اہل سنن کے ایک طبقہ نے فتوے دیا تھا اور جمعیت العلما بھی ایک ہی طبقہ کی جمعیت تھی۔ خانقاہ امدادیہ، تھانہ بھون سے جو اسی طبقہ کے علماء کا ایک بہت بڑا مرکز ہے اس کے خلاف فتاوے شائع ہوئے۔ علماء ندوۃ العلماء بھی اس سے الگ تھے بریلی کے علماء بھی موید ین میں نہ تھے، غرض سُنّی علماء کا

سواد اعظم ترک موالات او ہجرت کی تائید میں تھا۔[120] بعض نے ہندوؤں کے ساتھ ایسے
اتحاد کے خطرات سے بھی آگاہ کیا اور ان فتاوے کے خلاف رائیں ظاہر کیں مگر مسائل
ترکی سے مغلوب ایسے متاثر تھے کہ عواقب و نتائج پر نظر ہی نہ تھی، ہندوؤں میں بھی تعلیمی
و سیاسی ماہرین نے تعلیمی مقاطعہ کی علانیہ مخالفت کی چنانچہ ایک طرف علیگڈھ میں
روز محشر کا سماں تھا تو دوسری طرف بنارس میں موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی، پنڈت
مالویہ نے یونیورسٹی کے حدود میں نہ صرف علی برادران کو بلکہ گاندھی جی کو بھی تقریر
تک نہ کرنے دی اور وہ زور شور جو علیگڈھ میں دیکھا گیا یہاں قطعی سرد تھا، گاندھی جی
نے صرف یہ کہہ کر "مالوی جی نہیں مانتے" ہونٹوں پر مہر سکوت لگالی۔
ہندو مسلم اتحاد کے متعلق جو تجاویز و تقاریر ہوئیں ان کا یہ اثر مرتب ہوا کہ ہزارہا
مسلمانوں نے قربانی گاؤ سے احتراز کیا، مسلمانوں نے مسلمانوں سے گائیں چھین کر
ہندوؤں کو دیدیں۔ قصابوں کو ذبیحہ گاؤ سے روکا گیا، رضاکاروں نے چھری کے
نیچے سے قربانی کی گایوں کو چھڑایا اور اگر ہو چکی تو اس کو بیکار کر دیا۔ مسلمانوں نے ماتھوں
پر تلک اور قشقے لگائے، گنگا جی پر پھول اور بتاشے چڑھائے گئے۔ رامائن کی پوجا میں
شریک ہوئے، جامع مسجد دہلی کے ممبر پر شردہانند سے تقریر کرائی گئی مندروں میں
دعائیں مانگی گئیں، ستیا گرہی روزے رکھے گئے، وید کو الہامی کتاب اور حضرت موسیٰ
کا لقب کرشن تسلیم کیا گیا۔ رام لچھمن کو تاج پہنایا گیا۔ گاندھی جی مثیل امام مہدی کہے
گئے۔ فرنگی محل کے ایک عالم نے گاندھی جی کو اپنا رہنما تسلیم کرکے کہا کہ "میرا حال
تو سر دست اس شعر کے مطابق ہے کہ

عمرے کہ بہ آیات و احادیث گذشت — رفتی و نثار بت پرستے کردی

اسی جوش مواخات میں گاندھی جی کے دست راست پنڈت ستیا دیو نے
۲۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو متھرا میں تقریر کے دوران میں کہا کہ:۔
جب ہمارے ہاتھ میں اختیار ہوگا جس قدر قوانین ہم بنا سکیں گے بنائیں
گے، گاؤکشی کا مسئلہ ہندوستان میں نہایت اہم مسئلہ ہے۔ ہماری متواتر درخواستوں

کے باوجود اس بارہ میں گورنمنٹ نے کچھ نہیں کیا۔ تنہا کاٹھیاواڑ میں ہی بہت سی گائیں ذبح ہوتی ہیں جب قانون سازی کی قوت ہمارے ہاتھ میں آئے گی تو ہم فوراً یہ طے کر دیں گے کہ ہندوستان کے اندر گائے کی قربانی نہ ہو اور اگر تم ہماری مدد کرو تو ہم دنیا بھر میں روک سکتے ہیں، تم میں یہ قوت ہے کہ جو چاہو کر ڈالو، اگر تم اپنے لیڈروں پر بھروسہ کرو تو تم ضرور ہندوستانیوں کا راج حاصل کر لوگے۔"

خود گاندھی جی نے اسی اثناء میں بمقام بنارس کہا کہ "ہندو مذہب کے نقطۂ نگاہ سے گایوں کی حفاظت کس قدر ضروری ہے، صرف نان کوپریشن (ترک موالات) ہی ان کو سوراج حاصل کرنے میں مدد دے سکتا ہے اور سوراج کے ذریعہ وہ گایوں کی حفاظت کر سکیں گے۔"

۱۹۲۱ء کے آغاز میں جدید اصلاحات کا نفاذ اور جدید اسمبلی کا افتتاح کرنے کے لیے ڈیوک آف کناٹ ہندوستان آئے ۹ر فروری کو ڈیوک نے افتتاح کرتے ہوئے ملک معظم کی طرف سے ان اصلاحات کو سوراج کی ابتداء سے تعبیر کیا اور ان وسیع اور اعلےٰ ترین مواقع ترقی سے آزادی و نوآبادیات یا ڈومینین اسٹیٹس کا خواب دکھلایا گیا۔ سر ایس۔ پی سنہا سابق پریسیڈنٹ کانگریس لارڈ بنائے گئے اور بہار کے گورنر مقرر ہوئے، بابو سریندرناتھ بنرجی بانی کانگریس سر ہو کر وزارت بنگال کے عہدہ پر فائز ہوئے، لالہ ہرکشن لال جن کو حبس دوام اور ضبطی جائداد کی سزا ملی تھی وزیر پنجاب کئے گئے۔

اپریل میں گاندھی جی اور لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند میں ملاقات ہوئی اور لارڈ موصوف نے کہا تھا گاندھی کی وفاداری اور صداقت کو فوراً سمجھ لیا اور یقین دلایا کہ وہ ان کی پُرامن تحریک ترک موالات میں بالکل حائل نہ ہوں گے" نیز انھوں نے علی برادران کی ان تقریروں کی طرف توجہ دلائی جن سے تشدد پیدا ہو سکتا ہے، ساتھ ہی وعدہ کیا کہ وہ خلافت کے اقتدار کی بحالی اور ہندوستان کی آزادی میں مدد کریں گے اگر علی برادران اپنی یہ خطرناک پالیسی ترک کر دیں۔"

گاندھی جی سے یہ بیان بھی کیا گیا کہ علی برادران نے افغانستان کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی ہے۔

اب گاندھی جی نے علی برادران سے خواہش کی کہ ان واقعات کے متعلق تردیدی بیان شائع کریں۔ لیکن انہوں نے جب تقریروں کے اقتباسات پر نظر ثانی کی تشدد کا شائبہ بھی نہ تھا تاہم غلط فہمی دور کرنے کے لئے ایک بیان شائع کر دیا جس کو لارڈ ریڈنگ نے فتح مبین تصور کر کے اپنی ایک تقریر میں اس بیان کو معافی نامہ سے تعبیر کیا۔

ابھی تک مسائل ترکی حل نہ ہوئے تھے اور روز بروز اس امر کے آثار نمایاں ہو رہے تھے کہ دول یورپ اس کے خاتمہ پر تلی ہوئی ہیں اور سلطان المعظم یا خلیفہ اسلام کو ایک ماتحت حکمراں کی حیثیت میں رکھنا چاہتی ہیں۔ اتحادیوں نے بمقام سیورے کانفرنس کر کے سمرنا اور تھریس کا ایک بڑا حصہ یونان کو بخشدیا اور استنبول کا بندرگاہ اتحادیوں کی نگرانی میں رکھا۔ ترکی کو کل ۱۵ ہزار فوج رکھنے کا حکم دیا گیا۔ سلطان المعظم یا خلیفہ اسلام نے اس فیصلہ کو منظور کر لیا مگر ترک قوم زندہ تھی اور مصطفےٰ کمال (غازی اتاترک) نے تین ماہ پہلے انگورہ میں جدید قومی حکومت کا اعلان کر دیا تھا۔

جولائی میں بمقام کراچی خلافت کانفرنس کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ہزاروں آدمی شریک تھے۔ مولانا محمد علی نے ایک رزولیوشن پیش کیا کہ کوئی مسلمان نہ تو فوج میں ملازم رہے نہ بھرتی ہو اور نہ بھرتی میں مدد دے۔ مولانا حسین احمد (دیوبند) ڈاکٹر سیف الدین کچلو (امرتسر) پیر غلام مجدد (موتیہاری) مولوی نثار احمد (کانپور) مولانا شوکت علی اور بھارتی کرشنا (مدراس) نے اس رزولیوشن کی تحریک و تائید میں تقریریں کیں اس کے بعد مولانا محمد علی نے ۱۰ر جولائی کو عیدگاہ میں ایک جوشیلی تقریر کی جس میں حصول آزادی کا ولولہ پیدا تھا۔

اگست میں حکومت نے مذکورہ بالا چھ اصحاب پر مقدمہ چلائے جانے کا حکم دیا اور نتیجہ میں پانچ کو عام مجرموں کی طرح سزا دی گئی جس میں قید بامشقت تھی البتہ کرشنا جی (ہندو ملزم) کو بری کر دیا گیا۔

اس سزا سے جو آگ بھڑک رہی تھی اس پر اور تیل پڑ گیا۔ جمعیت العلما اور خلافت کانفرنس نے قرار دیا کہ حکومت نے اس اسلامی حکم کی تبلیغ کو چوں کہ جرم قرار دیا ہے اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے اعلان میں جان لڑا دے چنانچہ جس ریزولیوشن پر سزا ہوئی تھی اس کو ملک کے گوشہ گوشہ میں دوہرایا گیا اور مسٹر گاندھی نے بھی بمبئی سے اس کی تائید میں ایک بیان شائع کیا۔

نومبر میں شہزادہ ویلس ہندوستان میں آئے ترک موالات کی تحریک سے پہلے جب ان کے آنے کی اطلاع شائع ہوئی تو مسلم لیگ کی جانب سے ان کو خوش آمدید کہا گیا تھا۔ لیکن اب حالت ہی منقلب تھی۔ ساحل ہند پر قدم رکھتے ہی باب الہند (بمبئی) میں خیر مقدم کی جگہ بائیکاٹ کیا گیا اور شدید فساد ہو گیا جس میں فائرنگ کی نوبت پہونچی۔

اسی طرح کی حالت اور بھی بعض مقامات پر رونما ہوئی۔

شہزادہ کے پروگرام میں بنارس اور علیگڈھ یونیورسٹیوں کی وزٹ بھی تھی، بنارس میں شاندار استقبال ہوا اور شہزادہ کو آنریری ڈگری پیش کی گئی، ایڈریس اور جواب کی رسم بھی ادا ہوئی، مگر علیگڈھ قدوم شاہی سے محروم رہا کیوں کہ لکھنؤ اور بنارس میں چند طلبا نے احترام شاہانہ کے خلاف رویہ اختیار کیا تھا جس کا علیگڈھ میں بہت زیادہ امکان تھا۔

یہ زمانہ خلافت کے شباب کا تھا، اس کے کارکن اور والنٹیر تمام ملک پر چھائے ہوئے تھے، کانگریس کی تحریک کو خود بخود تقویت ہوتی جا رہی تھی۔ حکومت کے ایک نوٹ میں خلافت والنٹیروں کے متعلق بیان کیا گیا تھا کہ "وہ باقاعدہ وردیاں پہنکر مارچ اور ڈرل کرتے ہیں اور کانگریس والنٹیر خانگی ملازموں کی حیثیت سے میلوں وغیرہ میں خدمات انجام دیتے ہیں"۔

ہندو مسلمان سیاسیین کے ایک طبقہ نے ترک موالات اور عدم تعاون کی تحریک سے سیاسی پیش بینی کی وجہ سے اختلاف بھی کیا لیکن یہ اختلاف حکومت کی خوشامد

اور خوف سے تعبیر کیا گیا ہے

مولانا حسرت موہانی نے بھی اپنے خطبہ صدارت مسلم لیگ ۱۹۲۱ء میں بالآخر اس تحریک کے ناکامیاب ہونے پر نہایت صاف روشنی ڈالی انہوں نے حصول سوراج کے طریقوں پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ :-

"پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ تلوار ہاتھ میں لی جائے جو دنیا میں ہوتا آیا ہے کہ اگر ایک حکومت کی جگہ دوسری حکومت لانی ہو تو تلوار سے ہی حکومت کو بدلا جاتا ہے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت سے اپنے تمام تعلقات کو منقطع کر لیا جائے اور خود ایک متوازی حکومت قائم کر دی جائے حتیٰ کہ پرانا نظام نئے نظام کے آگے ختم ہو جائے جس کے لئے ہم کو اپنے اسکول، صنعت، فوج، پولیس، عدالتوں اور قومی پارلیمنٹ کا فوری انتظام کرنا ہوگا اور عدم تشدد کے ساتھ عدم تعاون صرف اسی وقت تک ممکن ہوگا جب تک کہ ہم اپنی اسکیم شروع کریں۔ لیکن اس کے قیام کے لئے نہیں کیونکہ موجودہ حکومت اس میں دخل دے گی۔ لیکن ایک وقت ایسا آئے گا کہ پھر اس طریقہ پر یہ چیز نہ ہو سکے گی اور اس وقت ہم کو ماننا ہوگا۔ ایک متوازی حکومت ہم بنا تو سکتے ہیں مگر عدم تشدد سے چلا نہیں سکتے جیسا کہ مقدمات کراچی کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں جہاں مسلمانوں کے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں بھی مداخلت کی جا رہی ہے اس صورت میں لوگ حکومت کے فیصلہ کے خلاف جد و جہد کر رہے ہیں اور لارڈ ریڈنگ کے اس اعلان کی مخالفت میں ہزاروں جیل اس طرح جا رہے ہیں جس طرح کہ پروانے جلتی ہوئی شمع کے ارد گرد جانیں قربان کر دیتے ہیں اور یہ مثال ایسی ہے جو مہاتما گاندھی پر ایک خوشی کا دورہ ڈال دے گی لیکن آخر ایک وقت ایسا آ جاتا ہے جب کہ حکومت کے مظالم کے سامنے لوگ اپنے صبر کو خیرباد کہہ دیتے ہیں کچھ دن کے جیل کو تو وہ ہنستے ہوئے کاٹ دیتے ہیں لیکن مارشل لا کے نفاذ کے بعد عدم تشدد اور عدم تعاون بیکار ثابت ہوتے ہیں چوں کہ جب مسلمان بندوق کی نال کے سامنے آ جاتا ہے تو وہ لڑائی سے بھاگتا نہیں اور نہ یہ کہ وہ ہنستے ہوئے دشمن کی گولی کا

نشانہ بن جاتا ہے یہ چیز یا تو مہاتما گاندھی اور ان کے معتقدین یا بجز ہم خیال کر سکتے ہیں مگر میرا خیال یہ ہے کہ مسلمان کے پاس مارشل لا کا جواب یا تو جنگ گوریلا ہوتا ہے یا پھر جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ "تم جہاں ان کو پاؤ قتل کر دو" لیکن اس سب کشت و خون کی ذمہ داری حکومت کے سر ہوگی اور اس لئے آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ فرض ہے کہ وہ یا تو عدم تعاون اپنا کریڈ نہ بنائے اور اگر بنائے تو اس میں تشدد یا عدم تشدد کی شرط نہ ہو۔ چوں کہ یہ ہماری طاقت سے باہر ہے کہ عدم تعاون کو پر امن یا اس کے برخلاف رکھا جائے۔ چوں کہ جب تک حکومت بیڑیوں اور جیلوں تک اپنی سزائیں کو محدود رکھے تو یہ ممکن ہے کہ عدم تعاون پُرامن رہے جیسا کہ آج کل ہے لیکن معاملات اس سے آگے بڑھ جائیں۔ اور حکومت نے اگر پھانسی اور مشین گن کے ذرائع اختیار کئے تو پُرامن عدم تعاون بالکل ناممکن ہو جائے گا"

مگر ان اختلافات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور جوش کے ساتھ یہ تحریک ترقی پذیر رہی۔ خلافت تحریک نے دو تین سال میں مسلمانان ہند کی سعی و جہد کا میدان وسیع سے وسیع تر کر دیا جس میں خواص کے ساتھ عوام نے اتنا زبردست اشتراک کیا کہ اس سے پہلے کوئی مثال نہ تھی، اسی تحریک نے کانگریس کو بھی عوام کی قوت اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت محسوس کرائی اور آزادی و سوراج کی تحریک میں جان ڈال کر کانگریس کے نظام عمل میں تبدیلی پیدا کر دی۔ اسی نے ترک موالات کا نظام عمل منظور کرا کے اس کا موضوع عمل بنا دیا، اسی نے ہندو مسلم اتحاد کے دل چسپ مناظر دنیا کے سامنے پیش کئے۔ اس نے ایثار قربانی کا جذبہ قید و بند اور دار و رسن کا حوصلہ پیدا کیا۔ اس نے خلافت اسلامیہ کے تحفظ اور خانماں برباد مردوں عورتوں اور لاوارث بچوں اور اور یتیموں اور مظلوموں کی امداد کے لئے قوم کو مالی ایثار سکھایا، اس نے اپنے کارکنوں کو مالی امدادیں[1] کر کے قومی کام کرنے والوں کی کفالت کی اہمیت جتائی؛

---

[1] مثلاً مسٹر (سیٹھ) یعقوب حسن کو ۵۰ پونڈ ماہانہ ملتے تھے اور دوسرے لوگوں کو جو جیل میں تھے امداد دی جاتی تھی، لٹریچر کی اشاعت کے سلسلے میں ڈاکٹر سید محمود (وزیر بہار) کو ۱۰ ہزار روپیہ ان کی کتاب "خلافت اور انگلستان" کی اشاعت میں دیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ انخلائے سمرنا اور ترکوں کی آخری فتوحات مجاہدین و جانفروشان انگورہ کی شجاعت اور بہادری کے کارناموں سے حاصل ہوئیں تاہم مجلس مرکزیہ خلافت نے بھی مجاہدین اسلام کے ہاتھوں کو مضبوط کر دیا، چنانچہ کراچی کے تاریخی مقدمہ کے بعد مسٹر لائڈ جارج اور اُن کے ہمنواؤں کو جنگ یونان کے دوران میں ہندوستان سے فوجی امداد کی اپیل کرنے کی ہمت نہ ہوئی ورنہ خفیہ امداد کے علاوہ مدبرین برطانیہ علانیہ طور پر بھی یونان کی فوجی اعانت کے لئے تیار بیٹھے تھے، صرف خلافت ہی کی آواز تھی جس نے وزارت برطانیہ کو اس جنگ میں ترکوں کے خلاف حصہ لینے سے باز رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجاہدین انگورا نے اپنی شجاعت اور ہمت کے جوہر دکھا کر یونانی درندوں کو سمرنا سے خارج کر دیا۔

مجلس خلافت کی صدائیں مختلف ممالک اسلامیہ میں بھی جا پہونچیں اور تمام مسلمانان عالم کو رشتہ اخوت قائم کرنے اور انھیں یورپ کی ریشہ دوانیوں سے خبردار اور آگاہ کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوئیں، مسلمانان ہند کو ایسے ذرائع حاصل نہ تھے کہ وہ اپنے نمایندے براہ راست مختلف ممالک اسلامیہ کو بھیج سکیں، سمرنا، عراق عرب، شام، فلسطین حجاز وغیرہ کو وفود بھیجنے کی تجاویز بھی کی گئیں مگر حکومت ہند نے وفود کو روانگی کی اجازت نہ دی تاہم اس اہم کام کو وفد خلافت نے اپنے قیام دوران یورپ میں سرانجام دیدیا اور ممالک اسلامیہ کے نمایندوں سے ملاقات کر کے ان کے اور مسلمانان ہند کے درمیان رشتہ اخوت قائم کر دیا لیکن تحریک کی یہ تمام قوت بہت جلد کانگریس میں منتقل ہو گئی اور تمام داخلی تحریکات اس نے اپنے دامن میں لے لیں، خلافت کا کام محض مظلومین سمرنا کی امداد رہ گیا۔

کانگریس کا ایک نہایت با اثر حصہ ابتدا سے ترک موالات کا مخالف تھا اور اس کے خلاف اپنا اثر استعمال کرتا رہتا تھا۔ فروری ۱۹۲۲ء میں چورا چوری واقع صوبہ متحدہ میں عوام کے مشتعل ہجوم سے پولس کا تصادم ہوا۔ تھانہ جلا دیا گیا اور چند سپاہی مارے گئے اب مخالفین کو ایک نادر موقع ہاتھ آگیا، ہر طرف سے گاندھی جی

پراس تحریک کو ختم کرنے پر زور دیا گیا اور سات دن کے اندر یعنی ۱۲ر فروری کو بارددلی میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے خاتمہ کردیا۔ ساتھ ہی خلافت اور جمعیت العلما نے بھی حاشیہ برداروں کی طرح اسکو قبول کرلیا اور اب تمام جلسے جلوس بند اور تمام پروگرام ختم ہوگئے، اس وقت علی برادران مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر زعمائے اسلام قید و بند میں تھے، جب ان کو یہ اطلاع ملی تو وہ نہایت مضطرب ہوئے اور انھوں نے تحریک کے رہنماؤں کو خطوط لکھے، یہ خطوط جب ۲۴ر فروری ۱۹۲۲ء کو گاندھی جی کے سامنے پیش ہوئے تو اُن کا صرف یہ جواب تھا کہ :-

"جو لوگ جیل میں ہیں وہ سول حیثیت سے مُردہ ہیں اور اُن کو کوئی حق نہیں کہ وہ باہر والوں کو مشورہ دیں"

اس کے بعد ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی کہ جو ملک کا دورہ کرکے اس امر کی رپورٹ پیش کرے کہ آیا ملک سول نافرمانی کے لئے تیار ہے یا نہیں اور تشدد کے جذبات تو عام نہیں ہوگئے، چنانچہ یہ رپورٹ اکتوبر میں پیش ہوگئی۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں مقاطعہ کونسل کی مخالفت دہلی کے اجلاس خاص میں شروع ہوئی اس وقت سوراجیوں کی علیحدہ جماعت قائم ہوچکی تھی۔ اراکین کانگریس نے مقاطعہ کونسل میں یہ ترمیم منظور کرلی کہ جن اراکین کانگریس کے خیال میں مجلس واضعان قانون کی شرکت مذہب یا ضمیر کے خلاف نہیں وہ آئندہ انتخابات میں امیدوار ہوسکتے ہیں اور رائے بھی دے سکتے ہیں، مسلم لیگ نے بھی داخلہ کونسل کی اجازت دیدی۔ جمعیت العلما نے بھی تاویل شرعی سے اپنے مشہور فتوے میں جواز کی شق نکال دی اور پھر عملاً معاملات میں اس حد تک جواز آگیا کہ ۱۹۲۶ء میں جب بمقام پشاور جمعیت کا اجلاس ہوا تو وہ سرکٹ ہاؤس میں سرکاری مہمان بنی"

بابِ ہفتم

ترک موالات کے سلسلہ میں ایک بااثر گرو سوامی شردہانند جیل میں تھے مگر گاندھی جی کی سزا یابی کے بعد وہ انقضائے مدت سے قبل غیر مشروط طور پر رہا کردئے گئے اور انہوں نے راجپوتانہ کو اپنی معروفیتوں کا مرکز بناکر نومسلم ملکانہ قوم کو شدھی کرنا شروع کردیا۔

اسی زمانہ میں مختلف مقامات پر مذہبی فسادات ہوئے اور اتحاد کا مطلع خوفناک طور پر مکدر ہوگیا۔ اس لئے ہر دو قوم کے رہنماؤں نے ضروری تصور کیا کہ اپنی اپنی قوم کو تنبیہ کریں۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے مسلمانوں کو تنبیہاً قصوروار ٹھہرایا لیکن پنڈت مالویہ نے اس تنبیہہ سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور سراپا غلط داستانیں سُناکر جذبات مشتعل کئے۔ مالابار کے واقعات ہندو پریس میں مبالغہ کے ساتھ شائع کئے گئے۔ کوہاٹ اور ملتان میں نہایت سخت خونریز فساد ہوئے اور پھر پنجاب میں "ملتان کا بدلہ" ایک قومی نعرہ ہوگیا۔ اور ہر جگہ مسلمان ہی قصوروار مجرم اور گردن زدنی قرار دئے گئے۔ پنڈت مالویہ اسی اثنا میں امرتسر آئے۔ وہاں ہندو مسلمانوں نے ان کا آنا غنیمت سمجھا اور ان سے صلح واتحاد کی تدابیر اختیار کرنے کی درخواست کی گئی۔ ایک قرارداد کے مطابق ۱۴ ستمبر کو انہیں کی زیر صدارت ایک مشترکہ جلسہ جلیانوالہ باغ میں ہوا۔ انہوں نے ایک طویل تقریر کی فسادات ملتان میں ہندوؤں کو بری الذمہ قرار دیکر ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالی۔ ہندوؤں کی مظلومیت کی داستان نہایت دردانگیز پیرایہ میں بیان کی اور نصیحت کی کہ "میرے بھائیو! عورتوں کی زندگی بسر نہ کرو۔ بلکہ جب آپ پر جبر ہو تو اپنی طاقت استعمال کرو"

اِس کے بعد ۱۵ ستمبر کو لاہور میں کانگریس کمیٹی کے زیر اہتمام ہزارہا لوگوں کے سامنے ایسی ہی تقریر کی اور غیرت دلائی اور مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا۔ جتھہ بندی اور

ڈنڈوں کی تعلیم کے بعد کہا کہ:۔

"ہمارے یہاں گرگو ہار اور تریا گو ہار بہت مشہور ہے جب کسی گئو یا دیوی پر مصیبت آئی اس نے پکار کی فوراً تمام گاؤں اکٹھا ہو گیا اور پاجی دشمنوں کو بھگا دیا......

مردوں کی نسبت تو نہیں کہہ سکتا لیکن اگر میں زندہ رہا تو کم از کم بہو بیٹیوں کو تو پستول اور بندوق چلانا سکھا دوں گا۔ وہ کالی کی مورتی اپنی حفاظت آپ کر سکیں گی۔ لیکن مردو تم اُن کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ اگر مرد ہو تو تم کو اپنی حفاظت کے حق میں آگاہی ہونی چاہیئے"

شریفو، جب تک بدمعاش غنڈوں سے ڈرتے ہو تب تک وہ تم پر وار کرتے ہیں یہ ڈنڈوں سے ڈرتے ہیں اس لئے سامنے ڈٹ جاؤ۔ سب بہن بھائی بوڑھے بچے اپنی حفاظت میں شامل ہو کر ایک آواز آنے پر سو دو سو باہر نکل آؤ......

سوراجیہ کا پہلا پوسٹ یہ ہے کہ قانون اور انتظام کا کام آپ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے"

اس کے بعد گیا کے اجلاس مہاسبھا میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"ہندوؤں کی موجودہ نسل بڑی کمزور اور بزدل پیدا ہو رہی ہے۔ ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ اپنی حفاظت آپ کر سکیں......... اگر ہندو خود طاقتور اور مضبوط بن جائیں گے اپنے دہرم کی حفاظت آپ کریں گے تو ہندو مسلم فسادات ناممکن ہو جائیں گے"

اب نومبر میں ہندو سنگھٹن کی تحریک بڑے زور شور سے اٹھائی گئی اور اپنے میں طاقت پیدا کرنے کی نصیحت میں آریہ دیویوں کی عصمت دری وغیرہ پر غیرت دلائی گئی پبلک پلیٹ فارم اور اخبارات کے صفحے ایسے ہی اشتعال انگیز تقریروں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے۔

امرتسر میں مالویہ جی نے ایک سٹینرن گارڈ کی تحریک کرتے ہوئے اگرچہ اس میں ہندو مسلمان اور سکھوں کو یکساں دعوت دی تھی مگر مسلمان الگ رکھے گئے اور سری رام کے نعروں میں سنگھٹن کی بنیاد پڑ گئی اور امرتسر میں ایک خاص جوش لہریں مارنے لگا۔

نہایت اشتعال انگیز اشعار پڑھے جاتے تھے۔ اور بالآخر اسی مقام پر ایک سخت خوں ریز آزمائشی فساد کیا گیا۔

مہاسبھا کی بعض کارروائیوں نے ان مسلم زعما کو بھی جو اتحاد کے انتہائی ساعی تھے بے انتہا بدگمان کر دیا مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے اس طرز عمل پر کانگریس کے بعض لیڈران کو متنبہ کیا۔ لیکن انہوں نے مہاسبھا کے خلاف ایک لفظ کہنے سے بھی انکار کر دیا ان سخت معرکہ آرا فسادات میں جو اس زمانہ میں ہو رہے تھے مسٹر گاندھی نے خاموشی اختیار کر لی مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی اور دیگر مسلم زعما نے ان سے درخواست کی کہ اپنے اثر سے اس فضا کو صاف کریں مگر ان کی مہر سکوت نہ ٹوٹی۔ مولانا محمد علی نے مجبور ہو کر کانگریس میں ڈاکٹر مونجے اور پنڈت مالویہ کے رویہ پر سخت نکتہ چینی کی جس کا اور ناگوار اثر ہوا۔ مسیح الملک کو بھی جب پنڈت موتی لال نہرو سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے جتا دیا کہ وہ اب مسلمانوں سے بھی کچھ توقع نہ رکھیں۔ یہی زمانہ انتخابات کا تھا۔ اور انتخابات ہی کی وجہ تھی کہ کانگریس مہاسبھا سے مرعوب ہو گئی تھی اور اسکو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی انتخابات کے موقع پر جب مسٹر آصف علی بیرسٹر ایٹ لا کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تو مالویہ جی اور شردہانند جی نے ایک مہاسبھائی وکیل کو کھڑا کر کے شکست دلوا دی۔ اور پنڈت موتی لال نہرو کو کہنا پڑا کہ مالویہ جی نے مشترک حلقہ انتخاب سے قابل مسلمانوں کی مخالفت کر کے مخلوط انتخاب کو گہرا دفن کر دیا ہے۔

اب شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں نے ایک نظام کے ساتھ ترقی کی اور گذشتہ دو سال کے اتحاد کا تیزی سے رد عمل بھی شروع ہو گیا، بالآخر ستمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے اسپیشل سیشن دہلی میں ایک اتحادی کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس نے ڈاکٹر انصاری اور لالہ لاجپت رائے کو فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل تجویز کرنے کے لئے مامور کیا اور انھوں نے بمقام سولن ایک حل تجویز کیا۔ اس حل میں جداگانہ انتخاب کے اصول اور پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو تسلیم کر لیا گیا، مذہبی تنازعات میں گاؤکشی کی اجازت بھی دی گئی۔ قبل ازیں

کہ یہ سولن پیکٹ اجلاس سالانہ میں پیش ہوئے

مولانا محمد علی نے بھی صدر اجلاس کی حیثیت سے اپنے ایڈریس میں بحث ائی سنگھٹن کی نسبت انھوں نے کہا کہ:۔

"اپنے رویہ کے متعلق اس تفصیل سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے سنگھٹن کے متعلق کچھ زیادہ باتیں کہنے کی ضرورت نہیں میں نے یقیناً کبھی اس کی مخالفت نہیں کی اور اگر کسی نے ایسا سمجھا ہے تو بہت ممکن ہے کہ یہ غلطی میری کسی تقریر یا ملاقات کی مسخ شدہ رپورٹ سے مرتب ہوئی ہو۔ اس معاملہ کا تعلق صرف میرے ہندو بھائیوں سے ہے اور اگر وہ اسکی ضرورت محسوس کرتے ہوں تو ہمیں اس میں مطلقاً دخل دینے کی ضرورت نہیں، ہر قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جماعت کے لئے جس اصلاح کو مناسب سمجھتی ہو اختیار کرے اور اگر سنگھٹن سے ہندوؤں کا مقصد صرف چھوت کا تدارک اور نیچ ذاتوں کو جس قدر جلد ہو سکے ہر طرح سے اپنی جماعت میں شامل کر لینا ہے تو اسلام اور کانگریس دونوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے میرے لئے اس سے زیادہ اور کیا مسرت ہو سکتی ہے۔ جب سے ناگپور کانگریس نے ہندو نمائندوں سے اس امر کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ ہندو مذہب کو چھوت کے الزام سے پاک کرنے میں سرگرمی سے کام لیں اور اس غرض سے ان کے مذہبی پیشواؤں سے بھی بزور درخواست کی ہے کہ وہ ہندو جماعت کی اس روز افزوں خواہش کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ وہ اچھوت اقوام کے متعلق اپنے رویئے کو بدل دینا چاہتے ہیں انھیں اس اصلاح کا موقع دیں، یہ مسئلہ براہ راست کانگریس کا مسئلہ بن چکا ہے مجھے خوب یاد ہے کہ سنہ ۱۹۲۱ء کے آخری ایام میں مہاتما گاندھی چھوت کو ہندوؤں کی خواہش آزادی کا امتحان سمجھتے تھے اور اگر اب ہندوؤں کی مذہبی جماعتوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس معاملہ میں اپنی جماعت کی اصلاح کریں تو یقیناً ہر فراخ دل ہندو اور اس کے پیروؤں کو اس پر اظہار مسرت کرنا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جہاں یہ معاملہ مدت سے نظر انداز تھا اس میں اس وقت تک کوئی خاص سرگرمی پیدا نہیں ہوئی جب تک کہ مالابار کے افسوسناک حادثات کے بعد

پنجاب کے بعید گوشوں میں ناراضگی اور منافرت کی ایک عام لہر نہیں دوڑ گئی اور اس سے
ملتان کے ہندوؤں نے مغلوب الغضب مسلمان بلوائیوں کے ہاتھوں نقصان نہیں اٹھایا
یہ حالات ہیں جو اس طرح باہم مل کر ہر ایسے ہندوستانی کے دل میں اضطراب پیدا کرتے
ہیں جو ہندوستان کو متحد دیکھنا چاہتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان واقعات کے مقابلہ میں
اُن کا سابقہ اتحاد کس قدر کمزور ثابت ہوا ہے۔ لیکن ایک عام مادّے پر جو ابھی اپنی پختگی
کو نہیں پہونچا اس قدر زور دینا غلطی ہے بہت ممکن ہے کہ ہم ہر افواہ اور بدگمانی پر توجہ
نہ کریں لیکن ہمیں خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر ان افواہوں یا بدگمانیوں کا فوراً ازالہ نہیں کر دیا جاتا
تو اس سے فتنہ انگیزی کا کافی موقع مل سکتا ہے۔ بلاشبہ بعض لوگ بڑی سرگرمی کے
ساتھ یہ بدگمانی کر رہے ہیں کہ چھوت کو دور کرنے سے ہندوؤں کا یہ مقصد نہیں ہے کہ
وہ نیچ ذاتوں کو اپنے اندر جذب کر لیں بلکہ آیندہ ہنگاموں میں اُنھیں مسلمانوں کے
خلاف استعمال کیا جائے گا........ سنگھٹن کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ
جسمانی صحت و ترقی کی طرف زیادہ دلچسپی پیدا ہو۔ یہ سب بہت مناسب ہے اور اگر
کمزوری و بزدلی ہندوستان کے کسی طبقہ سے دور ہو سکتی ہے تو یقیناً یہ باعث مسرت ہے
یہاں بھی پھر وہی اصل نیت کا سوال پیدا ہوتا ہے اور میں دل سے مسرور ہوں کہ گذشتہ
ستمبر میں دلی میں صاف صاف مباحث نے پنڈت مدن موہن مالوی کو دنیا کے سامنے
یہ اعلان کرنے کا موقع دیا کہ وہ خود بھی مشترکہ اکھاڑوں کے موئید ہیں جس میں ہر فرقہ کے
نوجوان شریک ہو سکیں جہاں تک تحفظ جان و مال کا تعلق ہے اور بہنوں کے حفظ ناموس
کی بھی ضرورت ہے اُنہوں نے وہی اپنا اصلی مقصد ظاہر کیا کہ آبادی وار مشترکہ "شہری
محافظ" جماعتیں قائم کی جائیں، مالوی جی نے اگر اپنے کو صرف ہندوؤں" بناکر رکھا تو اس کی
وجہ محض یہ تھی کہ ہندو سبھا جس کے سامنے یہ تجویز پیش تھی دوسرے فرقوں پر اس کے
نفاذ سے معذور تھی لیکن اب جب کہ ہندو لیڈران کی پوری تائید کے ساتھ ہندو مسلم
اتحاد کمیٹی، ان تمام مسائل پر چند قرار دادیں قبول کرنے کے لئے سفارش کانگریس
سے کر چکی ہے اور جب کہ کانگریس اُنھیں منظور بھی کر چکی ہمارا کام صرف اُن پر عمل کرنا رہ گیا

نفاق کے مٹانے کے لئے سب سے پہلے ہمیں ہر ضلع میں ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹیوں
کے زیر نگرانی اور خلافت کمیٹیوں ہندو سبھا اور دیگر ذمہ دار انجمنوں کے مشورہ سے مشترکہ
کمیٹیاں تمام ضلع کے اندر امن و حفاظت کے قیام کے لئے بنائی چاہئیں۔ ایسے مواقع پر
جب کہ کوئی واقعہ اس قسم کا پیش آجائے جس سے امن و حفاظت میں خلل پڑنے کا اندیشہ
ہو تو یہ کمیٹیاں اس کے مضر اثرات کو کم کرنے کی کوشش کریں اور جلد سے جلد اطمینان
وہ تصفیہ کی فکر کریں اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتے رہیں اشتعال کی حالتوں میں ضبط
سے کام لیں اور بجائے خود آمادۂ انتقام ہو جانے کے ان کمیٹیوں کی جانب رجوع
کریں۔ اس کے بعد سے میں نے اُسے کمال رنج و افسوس کے ساتھ معلوم کیا ہے
کہ اکثر ضلعوں میں کانگریس کمیٹیاں بالکل مُردہ ہو گئی ہیں اور اکثر کارکنان کانگریس نے
ان فرقہ وار جھگڑوں میں سرغنائی کی اس لئے ضروری ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے نگران
کار جماعتیں بنائی جائیں جو ضلع کی کمیٹیوں کی جانچ کریں اور ایسی جگہوں میں جہاں کہ
اس قسم کی کمیٹیاں نہ ہوں یہی جماعتیں کام کریں۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ ایک مستقل
مجلس مفاہمت ہر ہر صوبہ، نیز پورے ملک کے لئے ہونا ضروری ہے اگر اس قسم کے
بورڈ قبل سے موجود ہوتے تو اکثر مقاموں پر جو فرقوں کا آپس میں ناگوار تصادم ہوا
ہے روکا جا سکتا تھا اگر باوجود ہمارے ان تمام کوششوں کے پھر بھی آئندہ کہیں اس
قسم کا واقعہ پیش آجائے تو اسی بورڈ سے تحقیقات کا کام بھی لیا جا سکے گا اور اگر
ضرورت ہوئی تو فریقین کے مدارج جرم کا فیصلہ بھی بورڈ کر سکے گا۔ غرض ہمیں اپنے
تمام سامان سے تیار ہو جانا چاہیے۔ اور اگر لوگوں نے اچھی طرح یہ سمجھ لیا کہ ہم اس
قسم کی بے عنوانیوں کو جڑ سے اکھیڑنا چاہتے ہیں اور امن و حفاظت اور باہمی محبت دل
سے قائم رکھنی چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی ضرورت ہی کیوں پیش آنے لگی کہ لڑنے والے
فرقوں کا فیصلہ کرنے بیٹھیں دوسری چیز جو دلی میں کانگریس نے طے کی تھی وہ یہ
تھی کہ وہ اپنے ماتحت تمام مقامی کمیٹیوں کو اس کی ہدایت کرے کہ وہ براہ راست
اپنی ماتحتی میں اور اپنی نگرانی میں مقامی شہری محافظوں کی جماعت کا جس میں ہر فرقے

کے لوگ شامل ہوسکیں گے انتظام کرے اور قائم رکھے تاکہ وہ اطمینان کو برقرار رکھے اور دیگر شہری خدمات کو بھی انجام دے۔ کانگریس کی مقامی کمیٹیوں کو بھی ہدایت کی گئی کہ وہ عوام کو اپنی جسمانی تربیت کی طرف متوجہ ہونے کی رغبت اور ہمت دلائیں اور اس مقصد کے واسطے وہ ان کے لئے ضروری سہولتیں بہم پہونچائیں تاکہ ہماری قوم اپنی حفاظت آپ کرسکے۔"

شدھی کے اصل مقصد یعنی تبلیغی رجحان پر اشارات کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"اگر ملکانہ راجپوت حقیقتاً اسلام سے اس درجے ناواقف ہیں کہ وہ ہندو قرار دیے جاسکتے ہیں تو ہندو مبلّغین کا شکرگذار ہونا چاہیے کہ انھوں نے مسلمانوں کو جھنجوڑ کر جگادیا اور اُن کا فریضۂ مذہبی یاد دلایا کہ وہ ان لاکھوں مسلمانوں کی خبر لیں جن کا علم وعمل دونوں برائے نام ہیں چاہیئے یہ کہ مسلمان اور ہندو دونوں اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ اور احکام مذہب کی تعمیل میں مطلق آزاد ہوں۔"

لیکن جب وہ سولن پیکٹ اجلاس میں پیش ہوا تو سخت شور مچایا گیا لالہ لاجپت رائے کی لیڈری سے انکار کیا گیا۔ مختلف حصص ہند سے تین سو احتجاجی تار آئے نتیجہ میں مہاسبھا کی ذہنیت غالب آگئی اور کانگریس گھٹنوں کے بل گر پڑی۔

مگر دوسری طرف بنگال میں بھی فرقہ وارانہ حل زیر غور تھا۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس صدق دل سے مفاہمت کے لئے ساعی تھے چنانچہ وہ کامیاب ہوگئے اور فرقہ وارانہ نمائندگی کے ساتھ کونسلوں اور ملازمتوں میں تناسب قبول کیا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں پھر صلح واتحاد کی کوششیں کی گئیں مگر دوسری طرف فضا یہ تھی کہ مہاسبھا نے فرقہ وارانہ نیابت کی پوری مخالفت کی اگرچہ وہ ایک مذہبی ومعاشرتی اصلاحات کا ہندو ادارہ تھا لیکن اس سال اس کے مقاصد میں سیاسیات کو بھی داخل کیا گیا اور سمجھا گیا کہ وہ ہندوؤں کی صحیح نمائندگی کرے گی۔

لکھنؤ کے میثاق کو وہ تسلیم نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ مسٹر ستیامورتی نے اس پلیٹ فارم پر بیان کیا کہ ہندوستان کے لئے یہ نہایت ناخوشگوار موقع تھا کہ

اس نیابت پر اتفاق کیا گیا لکھنؤ کی مفاہمت ایک فاش غلطی تھی ضرورت ہے کہ ہندو مہاسبھا نیابت کے معاملہ میں ہندوؤں کی رائے کا اظہار کرے گی کانگریس نہ تو خالص ہندوؤں کی نمائندگی کرسکتی ہے اور نہ خالص مسلمانوں کی ۔

گائے کے مسئلہ نے تو اپنی اہمیت میں برابر اضافہ ہی کیا بلگام کے اجلاس کانگریس کے ساتھ جب کہ ایک زبردست ردعمل کے بعد دوبارہ اتحاد کی تجاویز پیش تھیں گئو کانفرنس بھی منعقد ہوئی اس میں زبردست تقریریں کی گئیں (مثلاً) گاندھی جی نے کہا کہ گائے کی حفاظت کا مسئلہ سوراج کے مسئلہ سے کم نہیں اور ہم سوراج حاصل نہیں کرسکتے جب تک کہ گائے کی محافظت نہ کرسکیں ۔"

"پکا ہندو وہ ہے جو گائے کی حفاظت کرے ۔"

پنڈت مالویہ نے کہا کہ :۔

"اگر ہندو مسلمان سمجھوتہ کرلیں تو حکومت بھی ذبیحہ گاؤ بند کرنے کا حکم دے دیگی مسلمان گائے کو ذبح کرنا چھوڑ دیں گے ۔ ہر گاؤں میں ہندو مہاسبھا اور گاؤ سبھا قائم کی جائیں جو گایوں کو قصابوں کے ہاتھ پڑنے سے روکیں انہیں مسلمانوں کو رضامند کرکے گائے کو ذبح کرنے سے روکنا چاہیئے ۔"

اسی کانفرنس میں تحفظ گاؤ کی تدابیر سوچنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کے ممبروں میں گاندھی جی لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردہانند بھی تھے نہ صرف گائے کی حفاظت سے متعلق یہ جذبات تھے بلکہ عامتہ مسلمانوں کے متعلق گاندھی جی کی حقیقی ذہنیت کا اندازہ کرنے کے لئے اُن کے وہ مضامین جو انہیں کے ذاتی اخبار میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے پورے طور پر کافی ووافی ہیں ۔ مثلاً انہوں نے ایک مرتبہ ینگ انڈیا میں لکھا کہ :۔

"مسلمان یا تو عرب حملہ آوروں کی اولاد ہیں یا ہمیں سے جدا کئے ہوئے افراد اگر ہم اپنا وقار رکھنا چاہتے ہیں تو تین علاج ہیں ۔

ایک تو یہ کہ اسلام سے ہٹا کر انہیں اپنے دھرم میں واپس لوٹایا جائے اور اگر

یہ نہیں ہو سکے تو پھر ان کو ان کے آبائی وطن میں لوٹا دیا جائے اور اگر یہ بھی دشوار ہو تو اُن کو ہندوستان میں غلام بنا کر رکھا جائے۔"

گاندھی جی کے ضمیر کی یہ وہی آواز ہے جس کی ڈاکٹر مونجے اور دیگر ہندوستانی زعما کی زبان سے مختلف طور پر بازگشت ہوتی رہی ہے۔

خلافت کانفرنس منعقدہ ۱۹۲۴ء میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے تنظیم کا ایک پروگرام پیش کیا اور بالآخر اُنہوں نے جماعت تنظیم قائم کرلی علی برادران نے اس کی سخت مخالفت کی کیونکہ وہ اس جوابی پروگرام کو ہندو مسلم اتحاد کے لئے نہایت خطرناک جانتے تھے اور ڈاکٹر کچلو کو صدارت خلافت سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ شدھی کے مقابلہ میں انجمن تبلیغ قائم ہوئی جس نے جابجا مبلّغین کو مامور کیا فروری ۱۹۲۳ء میں جمعیت علمائے ہند کی جمیعت منتظمہ نے یہ تجویز پاس کی کہ واقعات وضروریات کی بنا پر شعبہ تبلیغ وحفاظت اسلام کا افتتاح ضروری ہے اس لئے تبلیغ وحفاظت اسلام بالخصوص مسلم راجپوتوں کی اصلاح کا کام جمیعت فوراً شروع کردے۔

چنانچہ پنجاب آگرہ اور اودھ میں ۵۲ شعبے قائم ہوئے (۱۴۱) کارکن مقرر کئے گئے فنڈ کی بھی کچھ کمی نہ تھی دو ماہ دس یوم میں بیس ہزار روپیہ سے زیادہ جمع ہوگیا لیکن کام کے لحاظ سے کچھ بھی نہ ہوا، تنظیم بھی ختم ہوگئی البتہ تبلیغ کا نام کبھی کبھی کانوں میں پڑ جاتا ہے۔

ترکی کے مسائل کو غازی مصطفےٰ کمال اور اُن کے رفقا نے اپنے زور بازو اور تدبیر سے حل کرلیا قسطنطنیہ سے اتحادی فوجوں کو نکالا سمرنا پر پھر قبضہ کیا اواخر ۱۹۲۳ء تک انگورہ کو دارالسلطنت بنا کر جمہوریت قائم کردی اور خلافت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا۔

عرب ممالک اگرچہ حکومت ترکی سے آزاد ہوگئے لیکن فرانس اور انگلستان کی غلامی کا خاردار طوق اُن کے گلے میں پڑ گیا البتہ امیر ابن سعود نے شریف حسین

کی حکومت ختم کر کے ایک آزاد عربی حکومت قائم کی۔

اوائل ۱۹۲۴ء تک بیرونی سیاست کی کشمکش سے مسلمانوں کو یک گونہ یکسوئی ہو گئی اور وہ داخلی سیاست کی طرف پورے طور پر متوجہ ہوئے۔

شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کے باوجود اب کانگریس نے دہلی میں ایک آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد تجویز کیا جس میں دیگر معاملات کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد کا معاملہ بھی شامل تھا۔

اس کے اجلاس سے قبل مئی ۱۹۲۴ء میں بمقام لاہور مسلم لیگ کا ایک غیر معمولی اجلاس ہوا مسٹر جناح نے اپنے خطبہ صدارت میں ۱۹۲۰ء سے جو بہت غیر معمولی واقعات پیش آئے تھے مثلاً رولٹ بل، حادثہ پنجاب خلافت، ترک موالات سیول نافرمانی کی تحریکات اور ان کا انجام، کانگریس کیمپ میں نا اتفاقی اور سوراج پارٹی کا قیام مجالس واضع قوانین میں شرکت کی اجازت وغیرہ ان سب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:-

"اس کا نتیجہ خواہ برا ہو یا اچھا لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ میری رائے سے اتفاق کریں گے کہ اب اس وقت ہمکو اچھائی سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے اور برائی کو ختم کر کے بھول جانا چاہیئے اور اسی روح کو رکھکر ہم کو آئندہ کام کرنا چاہیئے، بہت سی غلطیاں ہوئیں اور ان سے نقصان بھی پہونچا مگر اس سے ہم کو کافی فائدہ بھی ہوا ہے۔ اس تین سال کے جھگڑے کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ ہم کو معلوم ہو گیا کہ ہندوستان میں سوراج حاصل کرنے کی عام تحریک ہے اس وقت جو سب سے بڑی اور اہم خواہش ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ذمہ دار ڈومینین گورنمنٹ ہو، سڑک پر چلنے والے عام آدمی نے بھی اپنی سیاسی ذمہ داری کو محسوس کر لیا ہے اور وہ یہ خیال کرتا ہے کہ ملک کی عزت اسی میں ہے کہ اس کی حکومت سوائے اس کے آدمیوں کے اور کسی کے ہاتھ میں نہ ہو اور جب کہ یہ خواہش انصاف پر مبنی ہے اور یہ جذبہ قدرتی ہے اور ضرورت ہے کہ اس کی ہمت افزائی کی جائے، ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ سوراج

حاصل کرنے کے لئے سب سے اہم شرط ہندو مسلم اتحاد ہے۔ غیر حکومت کے قیام جاری رہنے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی اور خاص طور سے ہندو اور مسلمانو میں اتحاد نہیں اور وہ کافی طور سے ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے اور یہ حکومت کا غلبہ اس وقت تک جاری رہے گا جبتک کہ ہندو اور مسلمان ایک معاہدہ نہ کرلیں اور متحد نہ ہوجائیں اور میں تو یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ جس روز ہندو اور مسلمان متحد ہوگئے اُسی روز ہندوستان کو ذمہ دارڈومینین حکومت مل جائے گی، سوراج ہندو مسلم اتحاد کا تقریباً دوسرا نام ہے، اور اگر ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں تو ہم کو متحد ہونا چاہئے اور اگر ہم غلام رہنا چاہتے ہیں تو ہم کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنا چاہئے جن میں انگریز ثالث کا کام کرے۔

حضرات! مسلم لیگ کے ۱۹۱۶ء کے اجلاس میں جیسا کہ میں نے اپنی تقریر میں مسٹر لائڈ جارج کی تقریر کا اقتباس دیا تھا اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اس کو پھر دُہرا دوں، مسٹر لائڈ جارج نے کہا کہ:-

وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ یہ ایک غلط فہمی تھی جو کچھ مذہبی اور کچھ نسلی تھی اور دونوں کا فائدہ اسی میں تھا کہ یہ غلط فہمی دور ہوجائے۔ لیکن جب کبھی تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی گئی تو کوئی نہ کوئی بُرائی بیچ میں حائل ہوگئی، خود اُنہوں نے بھی ایک بار کوشش کی مگر وہ ناکام رہے لیکن یقینی طور پر قصور یک طرفہ تھا اُنہوں نے محسوس کیا تھا کہ ہم سب بے اعتمادی کے ماحول میں رہتے ہیں اُن کو اس کا احساس تھا کہ اگر ایک انگریز دوسرے آئرش پر شبہ کرے یا آئرش انگریز پر تو بھی بُرا ہے۔ لیکن جب آئرش دوسرے آئرش پر شبہ کرے تو وہ مہلک ہے اور صرف بے اعتمادی ہی ایسی چیز ہے جو ترقی کی راہ میں مانع ہے اور یہی آئرلینڈ کا اصلی دشمن ہے اور اگر یہ ختم ہوجائے تو اُن کو یقین تھا کہ آئرلینڈ اور برطانیہ دونوں زبردست ہوجائیں گے اور متحدہ سلطنت اور امپائر ہمیشہ سے بھی بڑی ہوجائے گی۔"

حضرات! ۱۹۱۶ء میں جب میں نے یہ الفاظ کہے تھے تو وہ آئرلینڈ کی صورت

حال کے مطابق تھے لیکن اب وہ ہندوستان کی حالت کے مطابق ہیں اگر ہم انگریز اور آئرش کی بجائے ہندو اور مسلمان کے لفظ رکھدیں تو وہ ہماری موجودہ حالت پر منطبق ہوتے ہیں اور اب ان کا اطلاق آئرلینڈ پر نہیں ہو سکتا اس لئے آزادی حاصل کرلی ہے لیکن ہم ابھی تک لڑ رہے ہیں۔ اب یہ کام آپ لوگوں کا ہے جو ہندوستان کے مختلف حصّوں سے آئے ہیں کہ ہندوستان کے اس سب سے بڑے دشمن یعنی ہندو اور مسلمان کے اختلاف کے لئے کوئی حل تلاش کریں۔ میں بلاشُبہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہندو مسلمان دلی اور ایماندارانہ کوشش کریں تو ہم ضرور اس کا حل تلاش کرلیں گے جیسا کہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کیا تھا اور صرف اسی وقت جب کہ ہندوستان متحد اور مضبوط ہوگا کہ وہ برٹش پارلیمنٹ اور برٹش قوم کو عمل کی طرف جانے پر مجبور کردیں گے کہ وہ ذمّہ وارڈومینین گورنمنٹ ہندوستان کو دیں۔ اب دیکھیے کہ مصر اور آئرلینڈ نے کس طرح برٹش پارلیمنٹ اور برٹش قوم سے اپنی آزادی حاصل کرلی ہے لیکن جب کہ ہمارا یہ نصب العین ہے جس پر ہمارے ملک میں تمام بہترین کوششیں اور ہماری ساری قوتیں دماغی وجسمانی جمع ہونی چاہئیں۔ ہم کو لازم ہے کہ اِس عرصہ میں ہم اپنے ملک کی صنعت و تجارت وزراعت میں ترقی کی ہم کو کوشش کرنا چاہیئے کہ فنانس اور کرنسی کا ایک بہترین طریقہ حاصل کریں نیز یہ کہ ملک میں محنت (لیبر) کو بھی منظم کریں ہم کو چاہیئے کہ زراعت اور صنعت میں ترقی کی کوشش کریں اور ان کے مفاد کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کی اقتصادی حالت کو ترقی دیں تاکہ ہم ان کو اس قابل بنا سکیں کہ ملک کے لئے سوراج حاصل کرنے کی کشمکش میں اپنی جگہ لے سکیں ہم کو چاہیئے کہ ان کو اتنا سکھادیں کہ وہ ہندوستان کی ذمّہ وارڈومینین گورنمنٹ کے قانون اساسی میں اپنا پورا اور ٹھیک حصّہ حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں۔"

اس کے بعد انھوں نے اُن فرائض پر بحث کرتے ہوئے جو ملک کی تعلیمی و اقتصادی حالت درست کرنے اور ملک میں رائے عامّہ پیدا کرنے کے لئے ضروری

ہیں کہا کہ :-

"ہندوستان میں حال کی مشکلات کا جو ایک سبب تھا وہ رولٹ ایکٹ تھا لیکن اب وہ ختم کر دیا گیا ہے دوسرا سبب معاہدہ سیورے تھا وہ بھی ختم ہو چکا ہے ترکی قوم ایک بار پھر طاقتور اور منظم ہو چکی ہے اور اناطولیہ میں وہ دوبارہ پھر پیدا ہوئی ہے اور وہاں پر سلطنت کی تعمیر کر رہے تھے نہ کہ ایشیائی قالین بیچ رہے تھے جس سے کہ لارڈ کرزن زیادہ مانوس معلوم ہوتے تھے، ترک اب پھر اپنے پرانے شاندار روپ میں ہے مصطفیٰ کمال پاشا اور وہ سب لوگ جنہوں نے اپنے ہم وطنوں کو دوبارہ زندگی بخشنے کے لئے کام کیا اور کوشش کی انگورہ کے جنگلوں میں واپس آگئے ہیں انھوں نے بڑے اور بے مثال نتائج حاصل کئے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں اور خوش ہیں کہ وہ اپنے وطن میں پھر ایک بار مضبوطی سے ساتھ موجود ہیں خدا ان کو کامیابی عطا فرمائے اور آئندہ ان کے پھولنے پھلنے اور خوش حالی میں بہت جلد ترقی دے ۔

حادثہ پنجاب نے بہت تلخ یاد چھوڑی ہے اور اس کی صدائے باز گشت ابھی تک ختم نہیں ہوئی اس نے عام طور پر انگریز کے تعصب کا پردہ فاش کیا اور برطانیہ کی انصاف پسندی اور غیرت کو جو نقصان پہونچا ہے مجھے شبہ ہے کہ وہ کبھی اس کو پورا کر سکے گا ۔

مصطفیٰ کمال پاشا اور عصمت پاشا کی زیر ہدایت انگورہ اسمبلی کے فیصلے سے خلافت کے مسئلہ میں موجودہ وقت میں کچھ ایسی تبدیلی ہو گئی ہے کہ اس وقت اس کے فوری حل کے لئے کوئی تجویز پیش نہیں کی جا سکتی لیکن ہم کو امید رکھنا چاہئے جیسا کہ خیال ہے کہ مسلمانان عالم کی ایک کانگریس ہو اس وقت ایسے لوگ جمع ہوں گے جو اس مضمون پر کافی علم رکھتے ہوں اور ایسے علماء جو اسلامی قانون اور مذہب کے ماہر ہوں۔ یکجا ہوں گے تو اس مسئلہ کا جو اس وقت بہت دقت طلب معلوم ہوتا ہے ایک حل بہت آسانی سے مل سکے گا ۔"

پھر اُنہوں نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی ترمیم کے متعلق اس بحث کا جو گذشتہ فروری میں مرکزی اسمبلی کے اندر ہوئی تھی حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ :-

" اَب ہم کو ایک مختصر سی تنقیح اس بات پر کرنی چاہیئے کہ ہندوستان میں حکومت کیوں کر ہوتی ہے اور یہاں کا انتظام کیسے کیا جاتا ہے ۔ پہلی چیز تو پارلیمنٹ ہے جو سب سے بڑی اور فائنل اتھارٹی ہے ۔ لیکن نہ تو اس کے پاس وقت ہے اور نہ رجحان طبع ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو ہندوستان جیسے بڑے ملک کے لیئے جس کی آبادی ۳۵۰ ملین ہے محسوس کرے جس کا اظہار وہ کرتی ہے اور اُس پر ہے ، ہم بعض وقت ایوان عام یا ایوان امراء میں کبھی کبھی ہندوستان کے متعلق مباحث کا ذکر سنتے ہیں جہاں ہمارے دوستوں کو یہ وقت پیش آتی ہے کہ یا تو توانین یا قاعدے اجازت نہیں دیتے یا پھر وہ ہندوستان کے معاملات سے ناواقف ہوتے ہیں ہمارے مخالفین جو یہاں کی آبادی کا اپنے کو ٹرسٹی اور کارعین سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے کہ وہ یہاں کے امن وامان اور خوشحالی کے محافظ ہیں ان کے متعلق یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جب ہندوستان پر مباحثہ ہوتا ہے تو آگے پیچھے کی بینچیں خالی نظر آتی ہیں اور اراکین کی اکثریت یا تو ایوان کی لائبریوں اور یا ریسٹورنٹس میں نظر آتی ہے ، نائب وزیر ہند کے لیئے یہ (فیلڈ ڈے) بے کار سا کام خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایوان عام کی خالی نشستوں کے سامنے اپنی تقریر کا مسودہ پڑھے اور قاعدہ کے ماتحت وقت بہت محدود ہوتا ہے اور بحث کبھی دو گھنٹے سے زیادہ نہیں بڑھتی نیز یہ کہ اس کا مسودہ یا تقریر کی تیاری ان اطلاعات کی بنا پر ہوتی ہے جو حکومت ہند اور انڈیا آفس سے ملتی ہے زمانہ حال میں لارڈ پیل جیسے وزیر ہند اور لارڈ ونٹرٹن جیسے نائب وزیر ہند رہے ہیں اور یہ ایسے اشخاص ہیں جن کو ہندوستان کے معاملات کے متعلق کوئی خاص معلومات نہیں ہیں نیز یہ کہ متوسط العقل آدمی ہیں حالاں کہ لارڈ ونٹرٹن جتنے دن برسرعہدہ رہے اُنہوں نے کوئی موقع نہیں چھوڑا جس پر کہ اُنہوں نے اپنے ہندوستانی تجربات کا ذکر

نہ کی ہو لیکن یہ تجربات ان کے چار ہفتہ کے قیام ہندوستان پر مبنی تھے اور لارڈ پیل کا وزیر ہند کے عہدہ پر سوائے اس کے کوئی حق نہ تھا کہ وہ کنسرویٹو پارٹی کے رکن تھے اور وہ ہندوستان کے معاملات میں بالکل معصوم تھے اور لارڈ ونٹرٹن نے جب کبھی تقریر کی تو انھوں نے ہمیشہ ہندوستانی نظریہ کو غلط طریقہ سے پیش کیا، صرف یہ واقعہ کہ ممکن ہے کہ حکومت ہند کی عنان ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے جو کہ ہندوستان کے معاملات پر اختیار رکھنے کا کوئی حق نہیں رکھتے اس کے لئے بہت کافی ہے کہ ہندوستان کے معاملات پہ پارلیمنٹ کی نگرانی کو ناقابل قرار دیا جائے۔

اب دوسری چیز وزیر ہند کی کونسل ہے جس میں زیادہ تر ریٹائرڈ اینگلو انڈین ہوتے ہیں جن کی نہ تو نظر وسیع ہوتی ہے اور نہ وہ کوئی پالیسی بنا سکتے ہیں اور نہ وہ فن سیاست میں تجربہ کار ہوتے ہیں۔ اور یہ کونسل اپنے فرائض وزیر ہند کی صدارت میں انجام دیتی ہے جو عام طور سے ہندوستان کے معاملات سے بے بہرہ ہوتا ہے جو ہندوستانی ممبر کہ وزیر ہند کی کونسل میں نامزد کئے جاتے ہیں اوّل تو اقلیت میں ہوتے ہیں پھر ان کے انتخاب کا یہ قاعدہ ہے کہ سرکاری دنیا کی سفارش پر ہوتا ہے اس کے بعد حکومت ہند اور اس کے آئین و دستور پر زبردست تنقیح کرکے کہا کہ:۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ موجودہ حالت کو جاری رہنے دیا جائے، میرا خیال ہے کہ صورت حال اب بہت سنجیدہ ہو چکی ہے اور مجھے امید ہے کہ حکومت ہند نے اس چیز کو محسوس کر لیا ہے اور اس میں دیر نہیں کرے گی کہ جو عام مطالبہ ملک کے ہزاروں پلیٹ فارموں پر سے کیا جا رہا ہے اس کو منظور کرے چوں کہ اس میں دیر خطرناک ثابت ہوگی اور اسے چاہئے کہ فوری اقدامات کرے کہ جلد از جلد اس کانسٹی ٹیوشن کو ختم کر دیا جائے۔ اور ایک کانسٹی ٹیوشن تیار کیا جائے جو ہمارے نمائندوں کے مشورہ سے ہو اور جس کے ذریعہ سے ان کو اپنے معاملات پر صحیح کنٹرول اور اقتدار حاصل ہو جائے اور وہ اپنے وسائل اور ذرائع کو ترقی دے سکیں جب کہ ان کو

بھی ذمہ دار ڈومینین حکومت مل جائے تو وہ آزاد قوم کی حیثیت سے دنیا کی قوموں کی صف میں کھڑے ہوسکیں اس وقت یہ کام آل انڈیا مسلم لیگ اور تمام ملک کے سامنے ہے۔

اس لئے پیارے ہم وطنو! میں اپیل کرتا ہوں کہ آپ لوگ متحد ہو جائیں اور ایسے وسائل معلوم کریں جن سے ہم اپنے نصب العین یعنی ہندوستان کی آزادی کو حاصل کرسکیں"

اس اجلاس کے بعد دوسرا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا اور مسٹر جناح نے ایک قرارداد میں طے کرایا کہ ایک کمیٹی بنائی جائے جو مجالس وضع قوانین اور دیگر نمائندہ مجالس میں مسلمانوں کی نیابت اور ملازمتوں میں ان کے لئے مناسب حصہ حاصل کرنے کے لئے مطالبات مرتب کرے۔ اسکو یہ بھی اختیار دیا گیا کہ وہ دوسری سیاسی انجمنوں کے ساتھ گفتگو کرکے مسلم لیگ کے سامنے اپنی روداد پیش کرے۔

"مسٹر جناح نے قرارداد پیش کرتے ہوئے اس الزام کی پھر ایک مرتبہ تردید کی کہ وہ لیگ کے پلیٹ فارم پر فرقہ پرست کی حیثیت سے آئے ہیں انہوں نے حاضرین کو یقین دلایا کہ۔

میں ویسا ہی قوم پرست ہوں جیسا کہ پہلے تھا —— ذاتی طور پر مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میں فرقہ وار نیابت کا مخالف ہوں میں چاہتا ہوں کہ مجالس قانون میں ملک کے بہترین اور قابل ترین افراد نمائندگی کریں۔ لیکن بدقسمتی سے دوسرے محبان اسلام اس انتہا تک جانے کو تیار نہیں جہاں تک میں تیار ہوں، میں موجودہ حالت سے اپنی آنکھیں بند نہیں کرسکتا حقیقت یہ ہے کہ اکثر مسلمان مجالس قانون اور ملازمتوں میں علیحدہ نیابت چاہتے ہیں اور اسی جذبہ کی وجہ سے جماعتی اختلاف پیدا ہوئے ہیں۔ ہم فرقوں کے اتحاد کی باتیں کر رہے لیکن اس قسم کا اتحاد کہاں ہے —— میں جانتا ہوں کہ برادران ملت سوراج کے لئے معرکہ آرائی کرنے کو تیار ہیں، لیکن انہیں چند ضمانتوں کی ضرورت ہے۔ جہاں تک میری رائے کو تعلق ہے میں حالت کا جائزہ لونگا۔

آپ لوگ جانتے ہیں کہ میں عملی سیاست داں ہوں، اتحاد کی راہ میں فرقے حائل نہیں بلکہ اُن کے چند افراد ہیں جو شر انگیز ہیں"
پھر مقرر نے اُن کے عیارانہ پروپاگنڈے کی پیچیدگیوں کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا اور بالآخر کمیٹی بن گئی"

اسی مہینہ میں **گاندھی جی** نے جو فروری میں بیماری کے باعث رہا کردیئے گئے تھے لاہور میں ایک جلسہ صلح منعقد کیا، علی برادران مسیح الملک، ڈاکٹر انصاری اور پنڈت مالویہ بھی شریک تھے. بحث میں کشیدگی کے سیاسی وجوہ مرکز گفتگو بنے جو پنجاب کی تعلیمیافتہ قوموں میں کشیدگی کے پورا سبب نہیں تو غالب سبب نظر آتے تھے۔ لکھنؤ میثاق پر بھی نظر ثانی کی گفتگو ہوئی، مسلمانوں کا خیال تھا کہ اگر اس میں ابتدا سے ہی غلطی نہ تھی تو وہ اب ناکافی رہ گیا اُن کے نزدیک فرقہ وارانہ خیالات کی افزونی اور باہمی اعتماد کے فقدان میں دونوں قوموں کی نیابت تناسب آبادی کے لحاظ سے ضروری تھی۔ خواہ انتخاب مشترکہ ہو یا جداگانہ، سکھوں نے بھی مراعات طلب کی تھیں۔ ہندوؤں کی خواہشیں متعین نہ ہوسکیں گاندھی جی نے یہ بات صاف طور پر محسوس کرکے ظاہر بھی کی کہ پنجابی ہندوؤں کو اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کی تجویزیں کوئی فریب پوشیدہ ہے اُن کے دل میں درحقیقت ایک دہشت سی موجود ہے کہ اگر مسلمانوں کو پنجاب کی کونسلوں اور نظم و نسق میں قطعی کثرت رائے اور کثرت تعداد حاصل ہوگئی تو مسلمان جنگ جو اور شجاع قوموں کا قربت و ہمسائگی[1] نہ صرف پنجاب کے لئے خصوصیت سے بلکہ ہندوستان کے لئے عمومیت سے ایک مہیب خطرہ کا موجب ہوگی"

اسی زمانہ میں لالہ لاجپت رائے نے اس اتحاد کے لئے ۱۳ شرطیں قرار دیں۔

۱۔ اپنے دلوں کو قطعی حقوق کے عقیدۂ فاسدہ سے پاک کرو۔

۲۔ سیاست کو مذہب سے پاک کرو۔

---

[1] یہی خطرہ خود گاندھی جی کے دل میں موجود ہے جسکی وجہ سے وہ سرحدی پٹھانوں کی روح عسکریت کو مختلف تدابیر سے فنا کرنے میں کوشاں ہیں۔

۳۔ جہانتک ممکن ہو مذہب کو معقولیت پر مبنی بناؤ اور صرف لوازم و فرائض پر زور دو۔
۴۔ تمام مجلسی رکاوٹوں کو جو ایک قوم کو دوسری قوم سے جدا کرتی ہیں دُور کرو۔
۵۔ دنیا بھر کے ہر ایک ملک کی بہ نسبت ہندوستان سے زیادہ محبت کرو۔ اور اوّل تا آخر ہندوستانی رہو۔
۶۔ تمام کوششیں اپنے وطن میں خیالات بہتر بنانے پر مبذول کرو۔ یہ بات اپنے بیرونجات کے ہم مذہبوں کے ساتھ ہمدردی کرنے اور گاہے گاہے مدد کرنے سے نہیں روکتی بشرطیکہ اپنے ہم وطنوں کے متعلق آپ کا فرض اسکی اجازت دیتا ہو۔
۷۔ تحریک شدھی سے نہ بھڑکو یہ قائم رہنے کے لئے وجود میں آئی ہے۔
۸۔ آپ سنگھٹن اور تنظیم کی کوشش کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ اس کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے خلاف جذبات سے پاک رکھیں، لیکن میری رائے میں یہ سخت ترشکل ہے۔
۹۔ اگر آپ چاہیں تو بعض پیچر میں متناسب نیابت حاصل کر سکتے ہیں، مگر علیحدہ رائے دہندگی پر اصرار نہ کریں۔
۱۰۔ اکثریت کی حکومت موثر بنانے کے لئے پنجاب کو دو صوبوں پر تقسیم کیا جائے۔
۱۱۔ آبادی کو لوکل باڈیز میں نیابت کی بنیاد بنانے پر اصرار نہ کیا جائے اگر آپ کے لئے ایسا کرنا لازمی ہے تو خیر کیجئے مگر یہاں بھی علیحدہ رائے دہندگی پر اصرار نہ کیا جائے۔
۱۲۔ چند عام وسیع اصولوں کی بناء پر سرکاری عہدوں کے پُر کرنے کے کام کو باقاعدہ بنانے کے لئے پبلک سروس کمیشن مقرر کیا جائے۔
۱۳۔ یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں میں کوئی فرقہ وارانہ نیابت نہو، لیکن پس ماندہ جماعتوں کے لئے خاص سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور سرکاری محاصل میں سے انکے فائدہ کے لئے خاص مالی امداد دی جائے۔

لالہ جی نہ صرف پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت سے خائف تھے بلکہ وہ اس خوف میں بھی مبتلا تھے کہ مسلمان اسلامی ممالک سے ساز باز کرینگے۔

آخر جنوری ۱۹۲۵ء میں آل پارٹیز کانفرنس کا دہلی میں اجلاس ہوا گاندھی جی صدر

جلسہ میں ہندو مسلم مفاہمت اور مطالبات پر[186] مسٹر جناح نے ایک مفصل تقریر میں کہا کہ:-

"ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو اختلافات مجالس آئین ساز اور دوسری انتخابی مجالس میں اُنکی نمایندگی اور ملازمتوں میں اُنکے حصّہ کے متعلق ہیں وہ ملک کی ترقی کی راہ میں سخت رکاوٹ پیدا کرنے والے ہیں۔ نہ تو یہ مسلمانوں کا کام ہے نہ ہندوؤں کا کہ وہ یہ بتائیں کہ وہ کیا مانگتے ہیں۔ بلکہ یہ تو ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ اس سوال کا حل تلاش کریں جس وقت تک یہ رکاوٹ راستہ سے دُور نہیں ہوتی اُسوقت تک ہم کسی طرح بھی ترقی نہیں کر سکتے۔ ہم لوگ جو اپنے طبقوں میں ذمّہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں آج یہاں اِس لئے جمع ہوئے ہیں کہ سمجھدار انسانوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ طریقہ سے تبادلہ خیالات کریں"

کل پنڈت مدن موہن مالوی نے کہا کہ فرقہ وارانہ نیابت ایک ایسی بُرائی ہے جو قومیت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اور چونکہ ہندوؤں نے اسے معاہدہ لکھنؤ میں تسلیم کر لیا ہے۔ اسی لئے وہ اس کی پابندی کریں گے۔ لیکن اگر مسلمان اس میں کوئی تبدیلی چاہتے ہیں تو اُنکو وضاحت کرنی چاہیئے کہ آخر وہ کیا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ معاہدہ لکھنؤ میں ایک مکمل سیلف گورنمنٹ کے حصول کی اسکیم کے سلسلہ میں پہلا ضروری قدم اُٹھایا گیا۔ اس سے پہلے قدم کو اُٹھانے کے لئے ہم نے ایک نظام مرتب کیا تھا جسے کانگریس نے منظور کر لیا تھا۔

اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمام جماعتوں کی نمایندگی کے متعلق ایک فیصلہ ہو جائے۔ معاہدہ لکھنؤ کبھی بھی مستقل تو نہ تھا بلکہ اس معاہدہ میں قلیل تعداد جماعتوں کے حقوق کی حفاظت کرنے کا (جہاں کہیں بھی ایسی حفاظت کی ضرورت ہو) اصول تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ وہی اصول ہے جسے پنڈت موتی لال نہرو نے اپنی اس تجویز میں قبول کیا تھا جو آپ نے اسمبلی میں ذمّہ دار حکومت قائم کرنے کے متعلق پیش کی تھی۔ . . . .

پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہ اسوقت بنگال میں ۵۴ فی صدی

میں مسلمانوں کی عام پستی کا خیال کرتے ہوئے ۱۹۰۶ء یہ کہا گیا کہ اگر مسلمانوں کو ان کی آبادی کے
لحاظ سے نیابت دی گئی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ناقابلیت اور جہالت کا دور دورہ
ہو اور اس لئے تجویز کی گئی کہ ان صوبوں میں مسلمان مشترکہ انتخاب کو تسلیم کر لیں، لیکن مسلمانوں
نے کہا کہ اگر مشترکہ حلقہ انتخاب کو ہم تسلیم کر لیں تو ہماری رائے دینے کی قوت بالکل بے معنی
سی ہو جائے گی اور ہمیں دس پندرہ فیصدی نشستیں بھی حاصل نہ ہو سکیں گی۔ اگرچہ آج
ہمارے ملک نے ترقی کر لی ہے، لیکن اس کے باوجود بھی رائے دیتے وقت جذبات اور
خیالات ساری ہوتے ہیں اور رائے دینے والا اپنے ہم مذہب ہی کو رائے دیتا ہے جب
یہ کہا گیا کہ قابلیت کا خیال ضرور رکھا جائے تو قرار پایا کہ بنگال کے مسلمانوں کو ۴۰ فیصدی
اور پنجاب کے مسلمانوں کو ۵۰ فی صدی حق نیابت دیا جائے۔ لیکن جب قانون اصلاحات
پارلیمنٹ میں زیر غور تھا تو گورنمنٹ ہند نے ایک مراسلہ کے ذریعہ اس سے اختلاف
کیا کہ بنگال میں جہاں مسلمانوں کی تعداد ۵۶ فی صدی ہے وہاں انہیں صرف ۴۰ فیصدی
کا حق نیابت حاصل ہو لیکن ہندو اور مسلمانوں نے اسوقت معاہدہ لکھنؤ کی تائید کی اور
آخر اصلاحات کے سلسلہ میں پارلیمنٹ کی جو کمیٹی تھی اس نے معاہدہ لکھنؤ کو تسلیم کر لیا
اس کے بعد بنگال اور پنجاب سے آواز بلند ہوئی اور کانگریس نے ایک کمیٹی بنائی جس
میں لالہ لاجپت رائے اور ڈاکٹر انصاری اور ایک سکھ صاحب تھے
کہ وہ معاہدہ لکھنؤ پر نظر ثانی کرے اور جب کہ یہ کمیٹی اپنا کام کر رہی تھی مسٹر سی۔ آر
داس نے بنگال کا معاہدہ شائع کیا۔ لیکن بنگال کے معاہدے کو کوناڈا میں نظر انداز
کر دیا گیا۔ اسلئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ معاہدہ لکھنؤ ایک مستقل چیز نہیں ہے اب یہ کانفرنس
سوراج کے قائم کرنے کے مسئلہ کو طے کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس لئے ہندوؤں اور
مسلمانوں دونوں کو اس معاہدہ پر نظر ثانی کرنے کے لئے آمادہ ہونا چاہیے۔ ہندو اور
مسلمان دونوں طبقوں میں کچھ قوم پرور حضرات ایسے ہیں جو یہ خیال رکھتے ہیں کہ جداگانہ
نیابت کو اڑا دینا چاہیے۔ لیکن ایسے بھی لوگ ہیں جو اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں
لیکن بہر حال واقعات واقعات ہیں اور ہمیں ان کا مطالعہ کرنا چاہیے دونوں قوموں کا

بڑا حصہ ایک دوسرے پر اعتماد نہیں رکھتا، پنجاب اور بنگال کے مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ ان کو ان کی آبادی کے مطابق نمائندگی حاصل ہونی چاہیے۔ معاہدہ لکھنؤ میں قلیل التعداد اقوام کے حقوق کی حفاظت کے دونوں طریقے طے کئے گئے تھے اول یہ کہ اُنکو ان کی آبادی سے قدرے زیادہ حقوق نیابت دیا جائے۔ یہ اس کی بدولت تھا کہ بمبئی کے مسلمانوں کو جن کی تعداد ۲۰ فی صدی ہے۔ ۳۳ فی صدی نمائندگی کا حق ملا تھا۔ صوبجات متحدہ کے مسلمانوں کو ۳۰ فی صدی کا حق ملا حالانکہ ان کی تعداد صرف ۱۴ فی صدی ہے۔ صوبجات متوسط اور مدراس کے مسلمانوں کو باوجودیکہ وہاں مسلمانوں کی آبادی صرف ۷ فی صدی ہے۔ ۱۵ فی صدی کا حق نمائندگی دیا گیا اور تعداد کو قانون اصلاحات میں تسلیم کر لیا گیا۔ قلیل التعداد اقوام کے حقوق کے تحفظ کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کوئی ریزولیوشن جو کسی ایک قوم سے تعلق رکھتا ہو اُس وقت تک پاس نہیں ہو سکتا جس وقت تک کہ اس قوم کے نمائندوں کا ¾ حصہ اس کے مخالف ہو۔ لیکن یہ قاعدہ بہرحال بیکار سا رہا، ایک قوم سے تعلق رکھتا ہو

میں مسلمانوں کی طرف سے یہ کہتا ہوں کہ بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کی کثرت قلت سے نہ بدلنی چاہیے اور دوسرے صوبوں میں قلیل التعداد اقوام کے حقوق کی حفاظت کے جو دو اصول معاہدہ لکھنؤ میں طے کئے گئے ہیں وہ قائم رکھے جائیں۔

ملازمتوں میں نمائندگی کا مسئلہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے اور اسے علیحدہ طے کرنا چاہیے۔"

چونکہ **لالہ لاجپت رائے** کے زاویہ نظر میں تبدیلی ہو چکی تھی اُنہوں نے مخالفت میں طولانی تقریر کی اور صاف طور پر کہا کہ فرقہ وارانہ نیابت قوم پروری کے منافی ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ملک کو فرقہ در فرقہ اور طبقہ در طبقہ تقسیم کرنا پڑے گا۔ اُنھوں نے اپیل کی کہ اس موقع پر ہندو یا مسلمان کے مفاد کا خیال کرتے ہوئے نظر نہ ڈالی جائے بلکہ صرف ملک کے مفاد کا خیال ہونا چاہیے،

غرض مختلف نمائندوں کی تقریروں کے بعد ایک کمیٹی بنائی گئی جو (الف) ایسی سفارشیں مرتب کرے جن سے تمام پارٹیاں کانگریس میں شریک ہو جائیں۔

(ب) تمام فرقوں اور طبقوں کی مجالس واضع قوانین اور دیگر انتخابی مجالس میں سوراج کے ماتحت نمایندگی کے متعلق ایک اسکیم مرتب کرے اور سفارش کرے کہ ملازمتوں میں کام کی خوبی اور عمدگی کا خیال رکھتے ہوئے تمام فرقوں کی بہترین نمایندگی کس طرح ہو سکتی ہے (ج) سوراج کی ایک ایسی اسکیم مرتب کرے جو موجودہ حالت میں ملک کی تمام ضرورتوں کو پورا کرسکے۔ اس کمیٹی میں ۱۷ مسلمان اور ۱۸ ہندو تھے[1]۔

گاندھی جی جو اسوقت ہندو مسلم اتحاد کے بڑے خواہشمند تھے انھوں نے اپنے دوروں میں جا بجا گفتگوئیں کیں اور بطور ماحصل فروری ۱۹۲۵ء میں اپنے اخبار میں ایک مضمون لکھکر اس اصل بے اعتمادی کو جو ان دونوں فرقوں (ہندو مسلمان) میں ہے اس طرح ظاہر کیا کہ:۔

"مسلمان ہندو اکثریت سے صرف اس لئے خائف ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہندوؤں نے اُن کے ساتھ ہمیشہ غیر منصفانہ برتاؤ کیا اور اُنکے مذہبی جذبات کا احترام نہیں کیا وہ اس خطرہ کا کسی قدر سدباب بعض حالات میں تناسب آبادی سے بھی زیادہ جداگانہ انتخاب اور خاص نیابت سے چاہتے ہیں۔

ہندو مسلمانوں سے اس لئے خائف ہیں کہ جب کبھی مسلمانوں کے ہاتھ میں قوت آئی اُنہوں نے ہندوؤں کے ساتھ نہایت سختی کا برتاؤ کیا، اگرچہ ہندوؤں کی اکثریت تھی لیکن مٹھی بھر حملہ آوروں نے ان کو مغلوب کر دیا، اور اس ملک میں اسی تجربہ کے دوبارہ پیش آنے کا خطرہ ہے اور مسلمان لیڈروں کی سچائی اور خلوص کے باوجود عام مسلمانوں کا بیرونی مسلمان حملہ آوروں سے ملجانا یقینی ہے[2]۔"

دراصل یہی بے اعتمادی تھی جس نے لالہ لاجپت رائے کے زاویہ نظر میں تبدیلی پیدا کر دی تھی اور اس کا بڑا ثبوت ان کا وہ[3] خانگی خط ہے جو اُنہوں نے اسی زمانہ

---

[1] مسلمانوں میں ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، مسٹر جناح، سر شفیع، سید رضا علی، محمد یعقوب، علی برادر مولانا ابو الکلام آزاد صاحبان اور ہندوؤں میں پنڈت امنی سبے گار، لالہ لاجپت رائے، مالویہ جی، سر تیج بہادر سپرو، آئنگر، مسٹر نائیڈو صاحبان قابل ذکر ہیں نیز دوسری جماعتوں کے بھی چیدہ نمایندے تھے۔ [2] اخبار مرہٹہ ۲۰ فروری ۱۹۲۵ء

میں مسٹر سی آر داس کو لکھا تھا جس میں وہ ہندو مسلم اتحاد کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔
"ایک اور نکتہ ہے جو حال میں مجھے بہت زیادہ ستا تا رہا ہے اور جو ایک ایسا نکتہ ہے جس پر میں چاہتا ہوں کہ آپ احتیاط کے ساتھ غور فرماویں اور وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے۔ پچھلے چھ مہینہ کے دوران میں میں نے اپنا بیشتر وقت مسلمانوں کی تاریخ اور مسلمانوں کی شریعت کے مطالعہ پر صرف کیا اور میں یہ خیال کرنے پر مائل ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد ممکن ہے نہ قابل عمل ہے۔ مسلمانوں کے جو لیڈر تحریک عدم تعاون میں شریک ہیں اُن کے خلوص کو مانتے ہوئے اور تسلیم کرتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ ان کا مذہب ہندو مسلم اتحاد کی قسم کی ہر چیز کے لئے موثر رکاوٹ موجود کرتا ہے آپ کو وہ گفتگو یاد ہوگی جو میں نے حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر کچلو کے ساتھ کی تھی اور آپ کو کلکتہ میں سنائی تھی۔ ہندوستان میں حکیم صاحب سے زیادہ عمدہ مسلمان نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا وہ یا کوئی دوسرا مسلمان لیڈر قرآن کے خلاف کوئی کام کر سکتا ہے۔ میں بس یہی اُمید قائم کر سکتا ہوں کہ اسلامی شریعت کے متعلق میرا مطالعہ غلط ہے اور مجھے اس چیز سے زیادہ اور کسی چیز سے سکون حاصل نہ ہوگا کہ مجھے یقین دلایا جائے کہ اسلامی شریعت کے متعلق میرا مطالعہ غلط ہے لیکن اگر اسلامی شریعت کے متعلق میرا مطالعہ صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اگرچہ ہم برطانیہ کے خلاف متحد ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہم جمہوری اصولوں پر ہندوستان کی حکومت کے لئے متحد نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ میں سات کروڑ مسلمانوں سے نہیں ڈرتا بلکہ یہ سوچتا ہوں کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے ساتھ افغانستان وسط ایشیا، عرب، عراق اور ترکی کے مسلح غول ایسے ہوں گے جن کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا میں ایمانداری اور خلوص کے ساتھ اس کا قائل ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت ہے یا ہندو مسلم اتحاد مناسب ہے۔ میں مسلم لیڈروں پر بھروسہ کرنے کے لئے بھی پورے طور پر تیار ہوں لیکن قرآن اور حدیث کے احکام کا کیا ہوگا؟
مسلم لیڈر ان احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے تو کیا ہمارا انجام تاریک ہے؟ میں

اُمید کرتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے مجھے امید ہے کہ آپ کا فاضلانہ ذہن اور عاقلانہ دماغ اس دشواری سے نکلنے کے لئے کوئی راستے تلاش کرے گا۔"

مولانا حسرت موہانی نے بھی اپنے خطبہ صدارت میں ان خطرات کی طرف اشارہ کرکے اُن کو دور کرنے کی تدبیر صرف آزادی کامل بتائی تھی اُنھوں نے کہا کہ:۔

"ہندو اور مسلمانوں میں چند سخت غلط فہمیاں موجود ہیں۔ ہندو تو یہ خیال کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ باہر کے مسلمان کسی وقت ہندوستان پر حملہ کریں تو ہندوستان کے مسلمان ان کے ساتھ ہوجاویں گے اور مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ہندوستان میں خود اختیاری حکومت قائم ہوگئی تو ہندوؤں کو اپنی زیادتی تعداد کے سبب زیادہ سیاسی حقوق حاصل ہوں گے اور وہ اپنے ان حقوق کو مسلمانوں کی پامالی کے کام میں لائینگے اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ یہ کہ کسی ہندوستانی سیاست داں نے سوائے تلک کے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے اور ہمیشہ ان اندیشوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور چونکہ عامتہً مسلمان ہندوؤں کی زیادتی تعداد سے خوفزدہ ہیں اس لئے وہ نہیں چاہتے کہ مکمل آزادی کی بجائے ہمارا نصب العین صرف اصلاحات کی کوئی اسکیم ہو اس کا اصل سبب ظاہر ہے کہ ایک آزاد حکومت کی بجائے اگر ایک ایسی حکومت ہوگی جو اصلاحات کی کسی اسکیم کے ماتحت بنی ہو تو مسلمانوں کو دوہری مشکل کا سامنا ہوگا چوں کہ ایک طرف تو حکومت ہند کی غلامی جس سے ہندو اور مسلمان دونوں کو دوچار ہونا پڑے گا۔ دوسری طرف ہندو اکثریت جس سے ان کو حکومت کے ہر شعبہ میں مقابلہ کرنا ہوگا اور برخلاف اس کے اگر انگریز کا خطرہ نکل جائے گا تو صرف ایک ہندو اکثریت کا خطرہ رہ جائے گا لیکن یہ خطرہ بھی خود بخود ہندوستانی جمہوریت کے قیام میں ختم ہوجائے گا کیونکہ گو مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں مگر تمام صوبوں میں نہیں ہیں وہ کشمیر، پنجاب، سندھ، بنگال اور آسام میں بہت زیادہ ہیں اور اس طرح چوں کہ ایک توازن قائم رہے گا اس لئے ہندو اکثریت کے لئے یہ ناممکن ہوگا کہ وہ مدراس، بمبئی اور صوبہ متحدہ وغیرہ میں

مسلمانوں پر ظلم کر سکیں اور جب تک کہ ہندوستان مکمل طور پر آزاد نہ ہو جائے اُس وقت تک ہندوؤں کے دل میں مذکورہ بالا خطرہ مسلمانوں کی طرف سے رہے گا لیکن چوں کہ ریپبلک کی ذمہ داری دونوں قوموں پر ہوگی اس لئے کوئی مسلمان یہ نہیں چاہے گا کہ اس کے وطن پر بیرونی مسلمان کا قبضہ ہو جائے لیکن ان سب کے لئے انگریز کا ہمارے راستہ سے ہٹنا نہایت ضروری ہے ورنہ سب بیکار ہے۔"

مگر آزادی کامل تو مطمع نظر ہی نہ تھا اس لئے صرف ادنیٰ تدابیر اتحاد پر ساری توجہ مرکوز رہی اور اسی سلسلہ میں اتحادی کمیٹیاں بنتی رہیں۔ جن میں حقیقی طور سے کسی نتیجہ پر پہونچنے کا خیال نہ تھا۔ چنانچہ جب مارچ ۱۹۲۵ء میں مذکورہ بالا کمیٹی کا انعقاد ہوا تو لالہ لاجپت رائے نے شرکت تک نہ کی اور دوسرے اہم ممبروں میں سے صرف چندہ شریک ہوئے مگر مسٹر جناح جو دل سے مفاہمت کے متمنی تھے برابر حاضر رہے انجام کار اس مفاہمت کا خاتمہ ہو گیا۔

باوجودیکہ ۱۹۱۶ء میں فرقہ وارانہ انتخاب و نیابت کو ہندو سیاسیئن تسلیم کر چکے تھے لیکن اب اس قدر زور و شور سے اختلاف کی وجہ صرف یہ ہو گئی کہ آغاز ۱۹۲۴ء میں وزیر ہند نے ایک پرائیویٹ خط میں جو مسٹر ستیا مورتی سوراجی ممبر مدراس کے نام تھا اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ "فرقہ وارانہ نظام جمہوری ادارات کی ترقی کے منافی ہے۔" مسٹر ستیا مورتی نے اسکو کاتب سے اجازت لئے بغیر شائع کر دیا اور مہا سبھا ئیوں نے ایک حربہ مسلمانوں کے خلاف بنا لیا انکو یہ امید ہو گئی کہ چونکہ لیبر گورنمنٹ انتخاب جداگانہ کی مخالف ہے۔ لہٰذا ان کو پوری قوت سے مخالفت کرنی چاہیئے۔

۱۹۲۱ء کے بعد جب تحریک خلافت نے زور باندھا تو مسلم لیگ میں اضمحلال پیدا ہو گیا ۱۹۲۲ء میں کوئی اجلاس نہ ہو سکا مگر پھر مسلسل اجلاس ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں بھی ایک اہم اجلاس مسلم یونیورسٹی جوبلی کے موقع پر ہوا جس کی صدارت آنریبل سر عبدالرحیم (صدر اسمبلی) نے کی اُنہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں تمام سیاسی حالات پر ایک پُر معنیٰ اور بسیط تبصرہ کیا جو اُن کے وسیع تجربات کا نچوڑ ہے۔ اس تبصرہ میں اُنہوں نے شدھی مہا سبھا اور سنگٹھن

کی تحریکات، ہندوؤں کے پروپیگنڈے کی قوت اور اسلام و مجالس اسلامی پر حملوں کی جانب توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ:-

دوسری جماعت تاریخ کے صفحات کو مسخ کر رہی ہے اور یہ ثابت کرنے کی جستجو میں ہے کہ اسلام سے ہندوستان کو کبھی کوئی نفع نہیں پہنچا اور یہ لوگ حضرات یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلم قوم نہایت ناکارہ ہے اور ایسے افراد سے مرکب ہے جو متبذل ترین ہندوؤں کے بھی ہم پلّہ نہیں ہیں۔ وہ ہمارے بہتر سے بہتر پبلک افراد کی تذلیل کرنے پر کمربستہ نظر آتے ہیں، سوائے ان چند حضرات کے جو سیاسی عقائد میں اُن کے ہم نوا ہیں، اس تبلیغ اور سیاسی ریشہ دوانیوں کا لازمی نتیجہ کیا ہے، فسادات اور تنازعات اور وہ حضرات رنجیدہ ہونے کے بجائے خوش ہوتے ہیں جب کوئی مسلمان غصہ سے مجبور ہو کر دیوانہ وار بدلہ لیتا ہے، کیونکہ اُن کو ایسا زرین موقعہ ہاتھ آجاتا ہے کہ وہ مسلمان کی مذہبی دیوانگی اور مذہبی جوش و خروش کو بدنام کر سکیں۔ اس طریقہ سے ابنائے وطن نے کونسی سُرخروئی حاصل کر لی ہے۔ یہ سرخروئی صفر سے زیادہ بے وقعت اور حقیر ہے اُنہوں نے اپنے جارحانہ طرز عمل سے صاف ظاہر کر دیا کہ مسلمان کبھی انکو اپنی قسمت کا فیصلہ سپرد نہیں کر سکتے ہیں، چنانچہ ہمکو مدافعت اور تحفظ کی ہر ممکن تدابیر اختیار کرنا چاہیئے، ہم مسلمانوں کو ان مدبّروں سے نہایت وضاحت اور صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہیئے۔ کہ اُن کا یہ دعوےٰ کہ ہندوستان محض ہندوؤں کی ملکیت ہے سراسر باطل اور بے بنیاد ہے "

پھر مسلمانوں کی بے تعصبی تہذیب و تمدن کی سرپرستی و ترقی کا تاریخی حوالہ دیکر کہا کہ:-

"ملک کے وہ رہنما جو ہماری پبلک پیش قدمی پر سدِّ راہ ہوتے ہیں یقین کرلیں کہ اُن کا سیلف گورنمنٹ قائم کرنا بغیر ہماری امداد کے ایک امر موہوم ہے۔ ہندوستان کا مستقبل اُسوقت روشن ہو سکتا ہے جب ہم تمام ان مختلف اقوام کو جو یہاں بستی ہیں پوری آزادی سے کام کرنے دیں اور اُن غیر ملکی اقوال سے اُنکو

سراسیمہ نہ کریں جو تھوڑے عرصہ قبل یہاں کبھی سنے بھی نہ گئے تھے۔

اس گروہ کے ہندو رہنما خیال کرتے ہیں کہ ہم ان دیگر ممالک سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں، جہاں مسلمان آباد ہیں، اور یہیں ہمارا جذبہ حبِ وطن ایک بڑی حد تک ناقص ہے۔ اگر ایک مشترکہ تہذیب۔ تاریخ۔ روایات۔ زبان اور قومیت ہمدردی اور برادرانہ محبت اُن اقوام میں پیدا کر سکتی ہے جن کے سوشیل خیالات یکساں ہوں تو کیا جائے تعجب ہے اگر کوئی ہندوستانی مسلمان افغانستان، ایران وسط ایشیا۔ ٹرکی و عرب میں سفر کر رہا ہو۔ تو وہ ان میزبانوں کی طرزِ معاشرت اور اخلاق و عادات میں کوئی زیادہ فرق نہ پائے گا اور بے تکلف ہو کر وقت گذار سکے گا۔ ان کے برخلاف ہندوستان ہی میں اور بالخصوص ایک ہی شہر میں جہاں ہم رہتے ہیں ہمارے سوشیل طریقے ہمارے ہمسایہ سے بالکل مختلف ہیں علاوہ انیں بعض اسلامی ممالک ہمارے مذہبی مرکز بھی ہیں۔ مثلاً حجاز۔ فلسطین۔ عراق۔ ٹرکی۔ ایران اور سائبیریا جن کا گوشہ گوشہ تاریخی اور مذہبی روایات کا مخزن ہے۔ ہم اپنی بین الاقوامی وسیع النظری پر نازاں ہیں اور ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہندوستان ایک بڑا خوشحال خطہ ہوتا، اگر اس کی سرزمین میں ذات اور چھوت چھات کی قیود رائج نہ ہوتیں، جہاں تک واقعات کا تعلق ہے ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ بیرونی ممالک سے سازش کرنے میں؛ ہندو قوم کے بعض نمایاں افراد ہی ملوث ہیں، اور جس حد تک اُن کی ریشہ دوانیاں کامیاب ہوں گی اُسی قدر ہندوستان کی سیاسی منزلِ مقصود بعید تر ہوتی جائے گی۔ وہ مدبر جو انگریزوں کو ہندوستان سے خارج کرنا چاہتے ہیں، خیال کرتے ہیں کہ ہم مسلمان اس حالت میں ایک بیرونی مسلم فرمانروا کو ہندوستان میں حکومت کرتا ہوا پسند کریں گے یہ اسی قدر صحیح ہے جسقدر یہ کہ انگریزوں کے بعد ہندو یہ پسند کریں گے کہ ہندوستان کی سرزمین ہندوؤں کے زیرنگین ہو۔ مسلمان خاموشی کے ساتھ ان تمام واقعات کو مطالعہ کر رہے ہیں اور میں پرزور الفاظ میں عرض کروں گا کہ ہم ہندوستان میں ایک خود مختار حکومت اپنی

وقت دیکھنا پسند کرتے ہیں جب وہ مسلمانوں کے حقوق کے لئے اسی قدر پاسبانی کرے جسقدر ہندوؤں کی، دراصل یہ وہ مطمح نظر ہے جو ہم ابنائے وطن کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں اور دل سے خواہش کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف زبانی بلکہ عملی طور پر ہماری معاونت کریں ورنہ سوراج ہوم رول سلف گورنمنٹ جیسے پرشکوہ الفاظ ہمارے لئے مطلق دلکش نہیں ہیں۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ چند ہندو رہنما دونوں قوموں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لئے بہت کوشاں ہیں اور مسلمان درحقیقت اس جدوجہد میں پیش پیش ہیں اور ہم یہ واقعہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ بعض مسلمانوں نے ہندو رہنماؤں کو مساجد کے ممبر پر جگہ دی ہے اس خیال سے کہ ان سے اخلاص و محبت کی پوری توقع تھی، مگر نتائج اسقدر حوصلہ شکن ہیں کہ ہم انکو بیان بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے باوجود یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کا حل کرنا ناممکن ہو مگر ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم ان ریشہ دوانیوں کا سدباب کریں جو بعض ہندو مدبّر انگریزوں کے صبر و تحمل سے فائدہ اُٹھا کر حصول سوراج کی کوشش میں کر رہے ہیں اور جو اپنے منزل مقصود کی مشکلات و مصائب کی تاب نہیں لا سکتے۔ غالباً عرصہ دراز کے بعد ان دو قوموں میں کوئی اتحاد پیدا ہو سکے، جس کے دور حاضرہ میں اسباب مفقود ہیں۔ اس مسئلہ کا حل بظاہر اس طریقہ سے ہو سکتا ہے کہ ہم ہندوستان کی پوری آبادی کو ایک ہی نوعیت کی شرائط بود و باش عطا کریں جو یقیناً اقتصادی اور دماغی نشو و نما کا باعث ہوگا اور ایک خاص گروہ سے وہ سیاسی طاقت و اہمیت فنا کر دے گا جس کی وجہ سے ملک میں فتنہ و فساد برپا ہو رہے ہیں۔ کیا ہمارے ابنائے وطن اس مقصد میں ہمارے شریک ہو سکتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اس مقصد کی تکمیل لڑائی سے نہیں ہو سکتی، یہ دراصل ایک اہم ترین سوال ہے جس کا غیر خوشگوار اثر دنیا کے گوشہ گوشہ میں محسوس کیا جا رہا ہے اور وہ سوشل تحریک جو فطرت انسانی پر مبنی ہے ضرور اپنا کرشمہ دکھا کر رہے گی، یہ ہمارا کام ہے کہ ہم ہندوستان میں اس کا خیر مقدم کریں اور ملک کے خصوصی حالات کے موافق اس میں ترمیم و تنسیخ کریں وہ

محض جذبہ سائنس کا ساختہ سراب نہیں ہے جس کا حاصل کرنا دائرہ امکان سے باہر ہے وہ ایک ایسا آئیڈیل ہے جو اسلام کی بنیادی اصول پر مبنی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں کسی گروہ یا جماعت کو غیر معمولی اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ وہ انفرادی حقوق کا محافظ اور سرمایہ داروں کا سخت ترین مخالف ہے۔"

ہمارے ملک میں اکثریت اور اقلیت میں اس وجہ سے جلد تمیز کی جاسکتی ہے کہ ان کے مذہب اور گذشتہ تاریخ میں اختلاف اور تمدن و تہذیب زندگی کی رسوم اور معاشرتی فرائض میں نمایاں فرق ہے اور ان کا کوئی سیاسی اصول جس طرح کہ انگلستان کے قدامت پسند آزاد خیال اور معاشرتی جماعتوں میں پایا جاتا ہے اس کا باعث نہیں قرار پاسکتا۔ ہندو اور مسلمان قومیں جو خاص طور پر آبادی کے اجزائے ترکیبی ہیں بحیثیت مجموعی ہندوستان میں چار اور ایک کی نسبت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ بنگال اور پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے یہ دونوں قومیں تقریباً مساوی طور پر تقسیم کی گئی ہیں۔ گو کہ مسلمان کچھ زیادہ ہیں۔ پھر آپ چاہیں سو کریں، ووٹ بڑی حد تک لوگوں کے مختلف النوع اثرات اور ملک کے مختلف انتظامات سے متاثر ہوتے ہیں، اس لحاظ سے بھی ہندو کل ہندوستان میں ایک رفیع مرتبہ پر ہیں۔ کہ وہ ساہوکار وکیل اور زمیندار ہیں، اور کل پبلک اختیارات جو نہ صرف گورنمنٹ کے مختلف محکمہ جات مثلاً مالگذاری محکمہ انتظامی، پولیس اور عدالت میں بلکہ میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ، لوکل بورڈ یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں محکمہ صحت عامہ اسپتالوں، شفاخانوں، یہاں تک کہ ہر شعبہ کے سرکاری طبقہ کے اجزائے ترکیبی بنے ہوئے ہوں، اس کے علاوہ ان کی انتظامی حالت بھی بہت عمدہ ہے۔"

ہماری سیاسی حالت کی کمزوری خصوصاً بنگال میں زیادہ ہے، جہاں مسلمان ہندوستان کی مجموعی آبادی کے ۱/۴ حصہ سے زیادہ ہیں اور اس صوبہ کی کل آبادی کا ۵۵ فی صدی ہیں، بنگال کی انجمن وضع قوانین کے نصف سے زیادہ

اراکین ہندو مدبرین کی ایک جماعت کے انتظام رہنمایانہ امداد اور اثر کی وجہ سے اپنے عہدہ پر مقرر رہیں اور اسی لئے اپنی ذات کو انکے لئے وقف کر رکھا ہے میں اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ کونسل میں بعض سیاسی تفرقہ اندازیوں کی وجہ سے دو مسلمان وزیر ہو گئے تھے اور جنہیں محکمہ جات منتقلہ تفویض کئے گئے تھے۔ لیکن وہ اپنے عہدے سے ووٹوں کی ایسی مجموعی تعداد کی وجہ سے جس میں ۴۰ مسلمانوں کے ووٹ بھی شامل تھے علیحدہ ہوئے تھے، یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی وجہ ان کی کوئی ایسی نامقبول پالیسی نہ تھی جسے وہ اپنے مفوضہ محکمہ جات میں استعمال کر رہے تھے، اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ مسلمان اراکین کا طرز اُن بعض اہم مسائل کے متعلق کیا تھا جو موجودہ کونسل میں پیش کئے گئے تھے، آپ بنگال کے ہندو مسلم معاہدہ کے متعلق سن چکے ہیں جس نے کتنے مسلمان ممبروں کو ایسی سیاسی جماعت میں شریک ہونے کے لئے متاثر کیا جو چالاک ہندو دماغوں کے زیر اثر تھی اور انھیں کے سرمایہ انتظام سے چلائی جاتی تھی، جب کونسل میں اس معاہدہ پر بحث کی گئی تو اراکین نے ایک ایسے اہم مسئلہ کی جسنے نہ صرف بنگال بلکہ کل ہندوستان میں تفرقہ اندازی کی ہے۔ بنگال کونسل میں اس کی عقدہ کشائی کو اپنے ووٹوں کی مدد سے ایک نامحدود مدت تک ملتوی کر دیا۔

کل ہی رات کی بات ہے کہ گورنمنٹ کی جانب سے ایک بل پیش کیا گیا تھا کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے اخراجات کے لئے ایک مستقل امداد فراہم کیجائے، ایسے سرمایہ کی اہم ضرورت تھی کیونکہ یونیورسٹی جس کا مستقبل نہایت خوش آیند معلوم ہوتا تھا اور جو پہلے ہی سے اپنی شاندار کارگذاری فضاء امن و حفاظت میں دکھلا رہی تھی یہ یونیورسٹی بنگال کے مشرقی حصہ کی ضروریات پورا کرتی ہے۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہ گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ کی کافی تعداد پیدا کرتے ہیں۔ وہ مجموعی تعداد کے ½ حصہ کے مالک ہوتے ہیں اور یونیورسٹی کے با اختیار طبقہ میں

مسلمانوں کی نمایندگی نصف سے زائد ہوتی ہے۔ اس کا مسلم ہال ان بنگالی مسلمانوں کے لئے ایک شاندار مستقبل رکھتا ہے جو ابھی تک تعلیمی لحاظ سے پیچھے ہیں اور یہاں یہ کونسل کے مسلمان سوراجی ممبروں نے اس مسئلہ کی مخالفت میں ووٹ دیا اور کسی نے اسکی مخالفت میں تقریر کرنے کی جرأت نہیں کی۔ انہیں میں سے ایک نے اس مسئلہ کی تائید میں جبے مناسب موقعہ پر یقینی طور پر اسکے ووٹ دہندگان تک پہنچایا جائے گا تقریر کی، لیکن پھر بھی ووٹ دیتے وقت اپنے مخالفوں کا ساتھ دیا۔

بہرحال مخالفتوں کے باوجود بل قانون کی صورت میں منظور کرلیا گیا، اور ڈھاکہ یونیورسٹی نقصان سے بچ گئی۔

ان لوگوں اور ان کی جماعت کا آخری کارنامہ چند روز قبل معرض عمل میں آیا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بنگال میں نوّے فیصدی آبادی زراعت پیشہ ہے اور ان کاشتکاروں کی محنت پر جو روزمرہ بخارات (وبا) کی متاثرہ دلدلوں میں کام کرتے ہیں۔ صوبہ کی دولت اور خوشحالی کا انحصار ہے، کونسل کے آخری اجلاس میں ایک اہم لیکن حد درجہ معتدل مسئلہ پیش کیا گیا تھا، جسکا مقصد موجودہ قانون مزارعان بنگال کی کارروائی کو ترقی دینا اور اُسکے ساتھ ہی رعیت کو کچھ اطمینان بخشنا تھا۔ کونسل کی مجوزہ منتخبہ جماعت کے طبقہ میں مقتدر کافی اثر رکھنے والے زمینداروں کی کثرت تھی اور انجمن واضع قوانین کے چند اراکین نے تین یا چار ناموں کے اضافہ کی تحریک کی جو ان لاکھوں بے زبان کاشتکاروں کی حالت کو جن میں مسلمانوں کی کثرت ہے پیش کرنے کے قابل ہوتے، بنگال کی سوراج پارٹی نے جس میں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، چالیس میں بیس مسلمان اراکین ہیں اسی تاریخ پہلی مرتبہ اس تحریک کو شکست دینے کے لئے گورنمنٹ کا ساتھ دیا، دوسری تحریک جو ان کی مدد سے منظور ہوئی مجوزہ تعداد (کورم) کی توسیع کے متعلق تھی تاکہ منتخبہ جماعت کے بااثر زمیندار اگر چاہیں تو کمیٹی وقت پر رپورٹ دینے کے ناقابل، اور بل خود بخود نامنظور ہو جائے گا جبکہ اس کونسل کی زندگی

ایک سال کے اندر ختم ہو جاتی ہے، بنگال کی سوراج پارٹی میں نہ صرف اکثر دولتمند زمیندار ہیں بلکہ اس سے کافی مدد حاصل کرتی ہے، پس اس طرح یہ امر حد درجہ مشکوک ہے کہ آیا وہ کبھی ایسی پوزیشن میں ہو سکتے ہیں کہ ان مزدوروں اور رعایا کی ایک ذمہ داری کو بھی پورا کر سکیں جنکے وہ نمایندہ ہیں۔

سب سے پہلی مثال جس میں دو سال کی تحصیل لاحاصل کے بعد اُنہوں نے ایک نئی اسپرٹ پیدا کی جسے "اہم ذمہ دارانہ اتحاد" کہا جاتا ہے۔ ایسی امید کے لئے تباہ کن ہے، سوراجی سیاسی جماعت کی حیثیت میں کم از کم بنگال کی مجلس قوانین میں ناکارہ حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے مسلمان مددگار ایک فریب ہیں جو بنگال کے مسلمان انتخاب کنندگان کے مجرم ہیں۔ اس امر کے معلوم کرنے کے لئے کسی غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان کی سیاسی حالت مشکلات اور پیچیدگیوں سے لبریز ہے، اس میں ایسے کارکن موجود ہیں جو کافی تفریق آرا اور کام کی وسعت پذیری میں کوشاں رہنے کے لئے پابند ہیں۔

ہمیں وزیر ہند کی طرف سے اس امر کی دعوت دی گئی ہے کہ ہم حکومت کے سامنے ایک ایسا آئینی نظام پیش کریں، جس کے متعلق عام طور پر اتحاد پایا جائے میرے خیال میں اس عام اتحاد رائے سے خاص طور پر ہندو اور مسلم اتحاد رائے مقصود ہے، اس مقصد کی تکمیل کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں جماعتوں کے سربرآوردہ نمایندوں کی ایک مجلس شورےٰ منعقد کیجائے۔ اور مجھے امید ہے کہ اس مجلس کا انعقاد جلد سے جلد ہوگا تاہم کچھ ایسے عام مسائل موجود ہیں، جنکے متعلق عملاً مسلمانوں میں اتحاد رائے موجود ہے۔ میں ان کی طرف پہلے اشارہ کر چکا ہوں اور انہیں پھر عرض کئے دیتا ہوں۔ جس شخص نے کہ ہندوستان کے انتخابی نظام کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، خواہ یہ انتخابات مجالس وضع قوانین کے ہوں یا میونسپلٹیوں یا ڈسٹرکٹ بورڈوں، یونیورسٹیوں یا دوسری خود انتظامی جماعتوں کے، اس امر کا یقین ضرور ہو گیا ہوگا کہ باستثناء ان چند مقامات کے جہاں مسلمانوں کو نمایاں طور پر تعدادی غلبہ

حاصل ہو۔ دوسرے مقامات پر مشترک حلقہ ہائے انتخاب کے توسط سے مسلمانوں کا منتخب کیا جانا ناممکن ہے اگر آپ اس طرز عمل کو پیش نظر رکھیں جو ان دونوں جماعتوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ہے تو یہ امکان بالکل قرین قیاس اور فطری نظر آتا ہے لہٰذا اس امر کی توقع تو کوئی نہیں رکھ سکتا کہ موجودہ حالت میں مسلمانوں کے لئے ایک عام اور مشترک حلقہ انتخاب قابل قبول ہوگا۔ باقی رہی یہ تجویز کہ حلقہ ہائے انتخاب تو مشترک ہوں لیکن خاص مسلمانوں کے لئے چند نشستیں محفوظ کر دی جائیں، تو یہ پہلی تدبیر سے زیادہ قابل اعتراض ہے اگر مجلس وضع قوانین اور دوسری خود انتظامی جماعتوں میں مسلمان قطعاً منتخب نہ کئے جائیں تو اس صورت میں وہ قطعاً آزاد ہونگے اور اس امر کے مجاز کہ ہر ممکن طریقہ سے ان کارروائیوں کی مخالفت کریں جو اُن کے اغراض کے لئے مضر ہیں، لیکن فرض کرو کہ متحدہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ سے مسلمان منتخب کئے گئے، ایسی صورت میں یہ امر قطعی ہے کہ یہ منتخب شدہ افراد تمام وکمال اپنے انتخاب کے بارہ میں با اثر ہندوؤں کے مرہون منت ہوں گے اور ایسی صورت میں جہاں خود اُنکی اپنی جماعت کے آرا اور خواہشات کے پیش کرنے کا سوال یا اس کے اغراض کی حفاظت کا مسئلہ درپیش ہوگا، تو یہ بالکل عاجز ہونگے جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں خود علیحدہ قومی حلقہ ہائے انتخاب میں بھی یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ کمزور انتخابی حلقے خواہ وہ تمام وکمال مسلمانوں ہی پر مشتمل کیوں نہوں زمینداروں اور ساہوکاروں، وکیلوں اور خود مقامی عہدہ داروں کے اثرات میں آجاتے ہیں اور اُن کا بڑا حصہ ہندوؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔

موجودہ نظام کے ماتحت مجالس وضع قوانین میں کچھ ایسے مسلمان اراکین پائے جاتے ہیں جنکی حیثیت خود مختارانہ ہے اور جو آزادی کے ساتھ اپنے حلقہ ہائے انتخاب کی ضرورت اور خواہشات کو پیش کر سکتے ہیں اگر حلقہ ہائے انتخاب مشترک کر دیئے جائیں تو ایسے اراکین کا انتخاب قطعاً ناممکن ہوگا۔ مسلمانوں ہی پر موقوف نہیں ہے، خود یورپینوں کے لئے بھی علیحدہ انتخابی حلقہ رکھنے کی ضرورت محسوس کی جا چکی ہے۔ پس ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ موجودہ حالت میں کوئی شخص اپنے دل پر ہاتھ رکھکر مسلمانوں کو علیحدہ انتخابی حلقے

سے محروم کرنا چاہتا ہے، جو شخص ایسا کرے یقین مانئے کہ اُس کی خواہش اصلی یہی ہے کہ یہ جماعت قوم کی قانونی انجمنوں سے قطعاً خارج کر دی جائے۔"

چونکہ وائسرائے ہند نے ۲۰ اگست ۱۹۲۵ء کو لیجسلیٹو اسمبلی میں جو تقریر کی تھی اس میں وزیر ہند کی تقریر کے حوالہ سے کہا تھا کہ قانون ہند پر ۱۹۲۹ء سے پہلے بھی دوبارہ غور ہو سکتا ہے بشرطیکہ حکومت برطانیہ کو یہ تجربہ ہو جائے کہ ذمہ دار ہندو سیاسی لیڈروں نے موجودہ صورت حال میں تعاون کیا ہے اور یہ صورت ان کے سلئے اس امر کی بنیاد ہو سکے کہ وہ آئندہ کی تجاویز پر بہت ہی غور و خوض کے بعد فیصلہ کر سکیں جو کامل اعتماد کے ساتھ ہو۔"

اس لئے فروری ۱۹۲۶ء میں سوراجیہ پارٹی کی طرف سے اسمبلی میں ایک رزولیوشن پیش کیا گیا کہ مکمل ذمہ دار حکومت کے خیال سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں اصلاح کی جائے اور اس مقصد کے لئے جلد از جلد ایک بڑی نمائندہ گول میز کانفرنس منعقد کی جائے، جو ہندوستان کے لئے ایک نئے کانسٹیٹیوشن کی اسکیم کی سفارش کرے۔ لیکن سالہائے گذشتہ کے فسادات و رجحانات نے ہندو مسلمانوں کے مابین عام بدگمانی و بے اعتمادی پیدا کر دی تھی اور مسلمانوں کو اندیشہ تھا کہ اب حکومت خود اختیاری میں جو ترقی ہونے والی ہے وہ ہندو راج کے مترادف ہوگی، مسلمان اس ہندو راج کے تو خلاف تھے جس میں ان کی اقلیت کے جذب و فنا ہونے کا صاف خطرہ تھا، لیکن دستوری ترقی کی زبردست خواہش اور ملکی و سیاسی اتحاد کی تمنا رکھتے تھے، دسمبر ۱۹۲۶ء میں **سر عبدالقادر** نے اپنے خطبہ صدارت مسلم لیگ میں اتحاد و شکست اتحاد اور مسلم حقوق پر مبسوط بحث کی ہے اس میں وہ کہتے ہیں کہ:-

"**خود کانگریس** نے جب یہ دیکھا کہ خلافت ترکی کی حفاظت کا سوال ذرا زیادہ اہمیت پکڑ گیا ہے اور مسلمانوں میں دو نئی جماعتیں پیدا ہو گئی ہیں یعنی خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلماء تو اس نے ان دونوں کے ساتھ شرکت عمل کرنے کو زیادہ مفید سمجھا لیکن اس اتحاد کی بنیاد استوار نہ تھی، مسلمانوں کو خلافت کے مسئلہ کا بہت زیادہ احساس تھا

اور انھوں نے یہ سمجھا کہ تحفظ خلافت میں کانگریس سے اُن کو مدد مل سکے گی۔ ادھر بہت سے ہندو سیاست دانوں نے جنہوں نے مسئلہ خلافت سے اظہار ہمدردی کیا تھا اس امر کی کوشش کی کہ اپنی اغراض کے لئے مسلم جذبات کے تلاطم[۱] سے فائدہ اُٹھالیا جائے اور ان کی یہ خواہش ہرگز نہ تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی پائدار اور اصلی اتحاد قائم رکھا جائے۔ ہندوؤں کو عام طور پر اس بات کا یقین تھا کہ ٹرکی کی طاقت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور دول دنیا میں اس کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔ اس بنا پر ہندو سیاست داں آزادی سے اس مسئلہ سے ہمدردی ظاہر کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک ترکی کی ترکی تمام ہو چکی تھی۔ لیکن جب ترکی اس کشمکش کے بعد نئی قوت لئے ہوئے جاں بر ہوئی اگواس کی مملکت کا رقبہ بہت کم ہو گیا تھا، تو ہندو کے جذبات میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور اُنہوں نے پھر مسلمانوں کے متعلق وہ مخالفانہ طرز عمل اختیار کر لیا، جو مہاتما گاندھی جی کے قومی اثر کی بدولت چندے معطل ہو گیا تھا۔ میرے خیال میں مہاتما گاندھی کو حقیقت میں مسلمانوں کے احساسات سے ہمدردی تھی، اور ان کو اس بات کا یقین تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر کوئی سیاسی ترقی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کے بہت سے ہم مذہب اصحاب کو ان خیالات سے اتفاق نہ تھا، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک کا ایک نہایت پر زور ردِ عمل واقع ہوا جس میں نہ صرف مہاتما گاندھی کی ہی پالیسی کی مخالفت ہونے لگی بلکہ شدھی اور سنگٹھن جیسی تحریکات وجود میں آئیں۔

مہاتما جی نے کچھ عرصہ تک ہندوؤں کی ناخوشگوار بڑھتی ہوئی رَو کو روکنے کی کوشش کی جس میں فرقہ واری شامل تھی، لیکن بجائے اسکے کہ ان کو کامیابی ہوتی ان کی

---

[۱] اس تلاطم جذبات کا نشان ہنوز موجود ہے ۱۹۳۶ء میں ہی سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں نے بنارس کے بھارت مندر کی افتتاحی رسم میں قرآن مجید کی تلاوت کی اور یہ فتوےٰ بھی دیا کہ اسلام کے ماننے میں غیر مسلموں کو مساجد کے اندر اپنی عبادت کرنے کی اجازت تھی، نیز کراچی کے مندر پر کانگریسی جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی۔ مدرسہ دیوبند کے شیخ الحدیث کے گھر پر جو مدرسہ کی ملکیت ہے کانگریس کا جھنڈا لہراتا ہے اور جناب موصوف ان تمام غیر شرعی کام میں شرکت کرتے ہیں جو کانگریس میں ہوتی ہیں۔

مقبولیت[1] جاتی رہی اور انہیں پبلک زندگی سے قبل از وقت علیحدہ ہونا پڑا۔"
مہاتما گاندھی کیطرح مسٹر داس آنجہانی کا بھی یہ خیال تھا کہ ہندوستان
ن دو بڑی جماعتوں کا اتحاد ضروری ہے، پس جو کام یہ دونوں عالی ظرف اصحاب
ہے تھے وہ رُک گیا، اس کی جگہ ایک اور مخالفانہ تحریک پیدا ہو گئی، جس کے حامی
ضرت مدنموہن صاحب اور جناب لالہ لاجپت رائے جیسے صاحبان
، جو ہمیں پھر اس فضائے سیاسی میں واپس لے جانا چاہتے ہیں، جس کو ہمنے اپنی دانست
ہمیشہ کے لئے خیر باد کہدیا تھا، ہندو سبھا کی رجعت پسند پالیسی کے حامیوں کی طرف
مسلمانوں کے ساتھ جو مخالفت ہو رہی ہے وہ نہایت کوتاہ بینی پر مبنی ہے اور ملک کے
بحیثیت مجموعی نقصان دہ ہے۔ یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ جبتک یہ طرز عمل جاری
ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی حقیقی اشتراک عمل کی توقع نہیں کیجا سکتی مجھ کو امید ہے
صورت دیر تک قائم نہیں رہیگی۔ لیکن جبتک موجودہ شکل قائم رہے ہندوستان
مسلمانوں کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ حقوق کی منظم حفاظت
ں۔"

اسکے بعد اُنھوں نے ۱۹۱۶ء کی طرح ایک کانفرنس کے انعقاد میثاق لکھنؤ کی ترمیم
س اصول پر زور دیا کہ:۔
"ہر ایک صوبہ کی قلیل التعداد اور کثیر افراد جماعتوں کے ساتھ خواہ ہندو کی ہوں
مسلمانوں کی یکساں سلوک رہے جب بہت سے صوبوں میں غیر مسلم اکثریت کو اپنے
کے امور پر موثر انداز میں اثر ڈالنے کا موقعہ دیا گیا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ دیگر صوبجات
انہیں مراعات کو روا نہ رکھا جائے، جہاں مسلمانوں کی تعداد کثیر ہو۔ البتہ ہر جگہ قلیل التعداد
وں کے حقوق کی مناسب حفاظت کا انتظام ہونا چاہیئے تا کہ کثیر التعداد جماعت کو اس
کا موقع نہ مل سکے، کہ وہ اپنی تعداد سے ناجائز فائدہ اُٹھالے یا اپنی طاقت کا غلط

---

[1] فاضل صدر کو ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے زمانہ شناس اصحاب کو گاندھی جی کی نسبت اس وقت تک
ہی رہا جب تک کہ اُنہوں نے اپنی ریائی چادر نہ اُتار پھینکی۔

استعمال کرے، میرے خیال میں اس تجویز کی موزونیت کے متعلق کسی کو بھی بجا اختلاف نہیں ہو سکتا، اور اگر دونوں اقوام اسس اصول کو مدنظر رکھیں تو نہایت مناسب ہے لیکن اس راہ میں ایک مشکل حائل ہو گئی ہے جس سے عہدہ برآ ہونا ضروری ہے۔ ہندو اصحاب اس بات پر زور دیتے ہیں اور یہ زور دینا بجا نہیں کہ اگر مذکورہ بالا طریق پر نیابت قومی کی نظرثانی کی جائے گی تو ان صوبوں میں سے جہاں مسلمانوں کی تعداد قلیل ہے اور جہاں ان کی نیابت میں اضافہ کیا گیا تھا، اس اضافہ کو واپس لینا پڑے گا، میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی مجموعی فیصلہ میں جو سارے ملک کے لئے ہو یہ امر قرین انصاف نہیں ہو گا کہ ہم مذکورہ بالا اضافہ مانگتے رہیں اس صورت میں جب ہم ان صوبوں میں جہاں ہماری تعداد کثیر ہو اپنے جائز تناسب کا مطالبہ کریں اس وجہ سے اب بہت سے اصحاب متفق ہوتے جاتے ہیں کہ بمبئی، مدراس اور صوبجات آگرہ و اودھ جیسے صوبوں میں ہماری جو نیابت قومی میں قلیل اضافہ ہوا ہے، اس کے باوجود بھی ہماری اقلیت بدستور رہتی ہے اور اس سے کچھ عملی فائدہ نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے بنگال اور پنجاب میں ہماری تعداد عملاً قلیل التعداد جماعتوں کے برابر پہنچ گئی ہے۔ اب اس بات کا فیصلہ ان صوبوں کے مسلمانوں پر ہے کہ آیا وہ اپنے اضافہ کو قربان کرنے کے لئے تیار ہیں جو انہیں ۱۹۱۶ء کے سمجھوتے کے مطابق حاصل ہوا۔ اس غرض کے لئے ان کے دیگر بھائیوں کو جن کی دوسرے صوبوں میں تعداد زیادہ ہے اس سے کچھ امداد ملے اور اپنی تعداد سے کچھ فائدہ اٹھا سکیں۔ یا وہ اس مضر اثر کے باوجود جو مسلمانوں کی آبادی کے ایک حصہ کثیر پر پڑ رہا ہے، موجودہ صورت حالات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اگر وہ موجودہ تناسبات کی نظرثانی پر مائل ہوں۔ تو اس سے تمام قوم کو بہ حیثیت مجموعی نفع پہنچ سکتا ہے، لیکن اگر وہ اس برائے نام فائدہ کو ترک نہیں کرنا چاہتے جو انہیں حاصل ہے تو پھر ہمیں اس فیصلہ پر مردانگی کے ساتھ قائم رہنا چاہیے جو ۱۹۱۶ء میں طے پایا تھا۔ اور موجودہ شکل سے حتی المقدور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ . . . .

مشترک انتخاب کے خطرات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:۔

بعض انگریز حضرات بھی جنہیں ہندوستانیوں کی خواہشات سے ہمدردی ہے،

اس نظریہ کو زیادہ قابل قبول سمجھتے ہیں۔ اور اگر یہ کہہ دیتے ہیں کہ جداگانہ حلقہ انتخابات کے حق میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ناگزیر عیب ہے، ان کے اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ انہیں ہندوستان کے حالات کا کافی علم نہیں ہے وہ یہاں کے حالات کا اندازہ انگلستان کے معیار سے لگاتے ہیں۔ جہاں صدیوں سے مشترکہ قومیت کا مطمح نظر موجود ہے اور اسی مطمح نظر میں وہاں کی مشترکہ زبان اور تہذیب سے مزید پختگی اور استواری پیدا ہو گئی ہے، لیکن ہندوستان میں ابھی حقیقی معنوں میں قومیت کی تشکیل ہونی باقی ہے، اور اس تشکیل سے پہلے ہمیں ان بے شمار عقدوں کا حل کرنا ہوگا جو ذات پات کے اختلاف اور مذہب و تہذیب کے تضاد اور رہنے سہنے اور کھانے پینے کے جداگانہ طریق کے باعث موجود ہیں، یہاں نہ صرف کئی زبانیں مروج ہیں بلکہ ہر ایک زبان کے شیدائی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کی محبوب زبان کو ہر جگہ اور کل اغراض کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس قسم کے حالات میں یہ توقع فضول ہے کہ یورپ کے نظریات ہندوستان کے لئے مفید ثابت ہوں گے، جہاں مختلف قومیں آباد ہیں۔ میں مغربی صاحبان کو یقین دلا سکتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان اس خواہش میں کسی سے پیچھے نہیں کہ مغربی سیاسیات کی بہترین چیزوں کو حاصل کریں اور اپنے ہاں صحیح معنوں میں نیابت قومی کے اصولوں پر یہ سوچے بغیر عمل نہیں کر سکتے کہ آیا وہ اس ملک کے مخصوص حالات کے موافق ہیں یا نہیں۔

میں ان میں سے نہیں ہوں جن کا یہ خیال ہے کہ یہ طریق ہمیشہ کے لئے لازمی اور ضروری ہے۔ مگر یقیناً میری رائے یہ ہے کہ اس طریق انتخاب کو اس وقت تک ضرور بحال رکھا جائے جب تک شک و شبہ اور بے اعتمادی کی موجودہ فضا موجود ہے، جس کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ مختلف قوموں میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے جداگانہ طریقہ انتخاب کو جاری رکھا جائے، بعض حلقوں میں اس رائے کا اظہار کرنا معمول ہو گیا ہے کہ یہاں کی تمام مشکلات اور موجودہ ہندو مسلم کشیدگی کا باعث جداگانہ انتخاب میں ہے، اس سے زیادہ کوئی بات گمراہ کن نہیں ہو سکتی ہے۔

حضور والسرائے بہادر کی تازہ تقریروں سے مسلمانوں میں ایک قسم کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ شاید وہ جداگانہ طریق انتخاب کے خلاف ہیں۔ میں اس موقعہ پر یہ امر حکومت ہند اور حکومت انگلستان کے ذہن نشین کردینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ موجودہ حالات میں اُنکے حقوق کی حفاظت صرف اس طرح ہوسکتی ہے کہ ان کے لئے جداگانہ حلقہ جات انتخابات کو قائم رکھا جائے تاوقتیکہ انکے ہندو بھائی اُن کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار نہ کریں جو ازروئے انصاف موزوں ہو، اس قسم کی حفاظتی تدابیر اور دیگر امور تحفظ موجودہ حالات میں ناگزیر ہیں۔ کونسلوں اور دیگر جماعتوں میں مسلمانوں کی نیابت سے ملتا جلتا ایک اور مابہ النزاع مسئلہ ہے جسکے لحاظ سے مسلمانوں کی حیثیت کا بعض اوقات سرکاری افسران اور بعض اوقات ہمارے ہندو ہم وطن اور بعض اوقات دونوں کے دونوں بہت کچھہ غلط اندازہ لگاتے ہیں مسلمانوں کا یہ دعوے ہے کہ ہمارا یہ حق ہے کہ ملک کے نظم ونسق میں مناسب حصہ انہیں دیا جائے حقیقت میں یہ وہی مطالبہ ہے جو ایک مدت سے کانگریس تمام ہندوستان کی طرف سے پیش کرتی رہی ہے۔ جب اس قسم کا مطالبہ یورپین افسروں کے مقابلہ میں پیش کیا جاتا تھا تو اس ہندوستانی مطالبہ کا جواب سرکاری طبقہ کی طرف سے یہہ دیا جاتا تھا کہ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر یوروپین اصحاب کے زیادہ تناسب کی وجہ رنگ یا قوم کا امتیاز نہیں بلکہ اس کا یہ سبب ہے کہ ان میں اعلیٰ قابلیت پائی جاتی ہے اور وہ فرائض مفوضہ کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں کانگریس نے اس خیال کی صحت پر اعتراض کیا چنانچہ اب یہ تسلیم کیا جارہا ہے کہ ہندوستان میں قابل با ذہن افراد کی قلت نہیں ہے۔ اور ہر ایک محکمہ کی ملازمت کے لئے لائق اور قابل اشخاص مل سکتے ہیں یہ عجب بدقسمتی ہے کہ تقریباً پچاس سال تک ہندوستانیوں کی قابلیت کو تسلیم کرانے کی کوشش کے بعد ہمارے بعض ہندو ہموطن جو کانگریس کے رکن بھی ہیں یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ ہندوستان میں صرف انہی کی قوم کے افراد قابل ہوتے ہیں اور حکومت کے عہدوں پر ہنود کی کثرت اس بنا پر چاہتے ہیں کہ مسلمان لیاقت نہیں رکھتے۔

یہ درست ہے کہ مسلمانوں کی نسبت تعلیمیافتہ ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور جب کسی سرکاری محکمہ میں آسامی خالی ہوتی ہے تو ہندو امیدواروں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہوتی ہے اس کے اسباب ظاہر ہیں ہندوؤں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ ان کے یہاں بہت سے لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں اور جہاں تک مغربی تعلیم کا تعلق ہے انہوں نے اس کے حصول کی بہت پہلے سے ابتدا کی ہے۔ لیکن بایں ہمہ اکثر یونیورسٹیوں میں مسلمانوں نے اس بات کا ثبوت پیش کر دیا ہے کہ اگر کسی فرد واحد کا کسی دوسرے سے مقابلہ کیا جائے تو مسلمان ذہن اور دماغی قابلیت کے لحاظ سے اپنے کسی ہندو ہموطن سے کم نہیں، اور مختلف مضامین کے مطالعہ میں مسلمانوں نے انکی برابری کا بھی ثبوت دیا ہے، پس اگر ان کے ساتھ انصاف برتنے کے اصول کو کھلے دل سے تسلیم کر لیا جائے۔ تو بہت سی ناراضگی اور رشک و رقابت کا سدِ باب ہو جائے گا جو آجکل موجود ہے اور جو موجودہ شکر رنجی کے سببوں میں سے ایک سبب ہے۔ آپ کسی خاص سرکاری عہدہ کے لئے کوئی خاص معیار قابلیت قائم کر لیجئے اور ہندو مسلم اقوام اور دیگر اقوام کے تناسب کو کسی خاص صوبے کی ملازمت کے لحاظ سے مقرر کیجئے، جو محکمہ یا صوبے کی ضروریات کے مطابق ہو، اس کے بعد اس امر کی سرگرم کوشش کی جائے کہ ہر قوم کو حصہ مناسب ملے بشرطیکہ وہ مطلوبہ قابلیت کے امیدوار مہیا کر سکے، امیدواروں کی قابلیت کا اندازہ لگانے میں صرف یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے کس درجہ میں امتحان پاس کیا ہے، گو اس میں شک نہیں کہ امتحانوں سے ان کی قابلیت کا اندازہ لگانے میں معقول مدد مل سکتی ہے، بلکہ انکے دیگر اوصاف کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے جو عملی زندگی میں کچھ کم نہیں ہوتے مثلاً چال چلن، خاندانی روایات اور جسمانی قابلیت وغیرہ۔۔۔۔۔۔

اس سلسلے میں اگر میں ایک اور عام غلط فہمی کا جو سرکاری ملازمت کے متعلق پائی جاتی ہے ذکر کر دوں تو بیجا نہ ہوگا، بعض اخبارات نیز بعض سیاست داں یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سرکاری ملازمتوں میں مختلف اقوام کے تناسب

نیابت پر زور دیا جب الوطنی سے بعید ہے۔ اور یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ملازمت سے ملک کی آبادی کے ایک فیصدی حصہ کو بھی روزگار نہیں مل سکتا، اور ہمکو چاہیئے کہ ۹۹ فیصدی کے مفاد کو مدِ نظر رکھیں جو گورنمنٹ کی ملازمت کئے بغیر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

سرکاری ملازمت کا سوال محض روٹیوں کا سوال ہی نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ بلکہ قوت، موقعہ اور تربیت کا ہے، اس ملک میں سرکاری ملازمتوں کو عموماً بہت زیادہ اقتدار حاصل رہا ہے، اور اب بھی باوجودیکہ زمانہ بدل گیا ہے ان کو بہت سے اختیارات حاصل ہیں جنہیں وہ کسی قوم کے نفع کے لئے یا کسی قوم کے نقصان کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اس قسم کے موقعوں پر متعلقہ جماعتوں کے لئے یہ دیکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے کہ کسی خاص وقت پر یا کسی خاص مقام پر ذی اختیار اشخاص کس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، ان ذی اختیار حضرات کو اس بات کا موقعہ ملتا ہے کہ جسے چاہیں مدد دیں اور اگر اس قسم کے مددگاروں کی تعداد کسی جماعت میں زیادہ ہو تو اس کا اثر نہ صرف موجودہ حالت پر پڑتا ہے۔ بلکہ اس سے مستقبل بھی اثر پذیر ہوتا ہے۔ مزید براں اگر یہ سوال محض روٹیوں ہی کا ہو تو بھی اسکو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے، کہ اس کا اثر صرف چند لوگوں پر پڑے گا۔ ہندوستان میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص جو اپنے خاندان کے لئے روزی کماتا ہے، اپنے دیگر عزیز اور متعلقین کا بھی کفیل ہوتا ہے، پس آپ دیکھ لیں کہ اگر ملازمت میں ہزار آدمی ہیں تو ان سے کئی ہزار آدمیوں کو نفع پہنچ سکتا ہے، اور اگر مسلمانوں کی حالت کو دیکھا جائے تو یہ مسئلہ ان کے لئے اور بھی زیادہ اہم نظر آئے گا، کیونکہ ان کے لئے تجارت اور سوداگری کے راستے بہت کچھ مسدود ہیں، ایک تو ان کے پاس کافی سرمایہ نہیں ہے اور دوسرے زندگی کے ان شعبوں سے ہندوؤں کو باعتبار تربیت زیادہ مناسبت ہے، پس یہ ضروری بات ہے کہ گورنمنٹ اور ہمارے ہموطن ہمارے اس مطالبہ کو کہ ہمیں سرکاری عہدوں میں مناسب حصہ دیا جائے۔ ازروئے انصاف جائز اور مناسب خیال

کریں "

۱۹۱۵ء، ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۷ء میں ہندو مسلم فسادات کے بعد جن میں کٹارپور صوبہ متحدہ کا فساد تو انتہائی خوفناک تھا چند سال تک یک گونہ امن رہا لیکن ۱۹۲۱ء میں ملابار (مدراس) میں موپلا اور حکومت کے مابین جو تصادم ہوا اور اس میں حکومت کے حمایتی ہندوؤں کو جو نقصان پہنچا اس سے اس تصادم کو فرقہ وارانہ رنگ دیدیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں بمقام ملتان محرم کے موقع پر اور ۱۹۲۳ء میں پھر اسی موقع پر متعدد فسادات ہوئے جن میں سہارنپور کا سب سے سخت تھا تین سو سے زیادہ مقتول و مجروح ہوئے۔ اسی طرح ۱۹۲۴ء میں اٹھارہ فسادات ہوئے (۸۶) جانیں ضائع ہوئیں اور مجروحین کا شمار (۷۷۶) تھا۔ اس سال کے فساد کا بہت بڑا مرکز کوہاٹ تھا۔ جہاں ایک ہندو شاعر نے ایک ایسی نظم شائع کی جو مسلمانوں کے لئے اہانت آمیز اور اشتعال انگیز تھی۔ صرف دو دن کے اندر (۳۶) آدمی مارے گئے اور (۱۴۵) زخمی ہوئے۔

۱۹۲۵ء تک مسلمانوں کے سیاسی لیڈروں نے انتہائی ضبط سے کام لیا اور جس اتحاد کو انھوں نے بڑی بڑی قربانیاں ادا کر کے خریدا تھا اس کو نہایت عزیز رکھتے تھے اور اسی کے لئے تنظیم و تبلیغ کی مخالفت کی گئی، کٹارپور کے ظالموں کی رہائی کے لئے حکومت سے سفارش کی گئی، مگر ہندو لیڈروں نے ان مظالم پر خاموشی اختیار کی اور دوسرے درجہ کے لیڈر حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ سوامی شردھانند، بھائی پرمانند، لالہ لاجپت رائے اور پنڈت مالویہ نے کانگریس کی تائید سے سنگٹھن کو مضبوط بنانے پر اپنی کوشش مبذول کر دی تاہم یہ سال ایک حد تک ساکن رہا، جولائی میں وزیر ہند نے دارالامراء میں تقریر کرتے ہوئے ان فرقہ وارانہ اختلافات کے متعلق کہا کہ :-

"سب سے بڑی تشویش جس سے آج ہندوستان کو سابقہ ہے وہ فرقہ وارانہ اختلاف ہے جو سات کروڑ مسلمانوں کو کثیر ہندو آبادی سے جدا کرتا ہے۔ ان اختلافات میں ہم اپنے ہاتھوں کو آلودہ کرنا نہیں چاہتے۔ اگر کل ہم ہندوستان

سے چلے آئیں تو اس کا فوری نتیجہ یہ ہوگا[۲۱] کہ ہندو مسلمانوں میں جنگ شروع ہو جائے گی۔ تین کروڑ جنگی قبائل جو سرحد افغانستان اور ہندوستان کے درمیان رہتے ہیں، ان سے جو خطرات ہیں، انھیں میں ایک طرف کر دیتا ہوں، واقعی حالات مجھے بلا شبہ ایسے معلوم ہوتے ہیں جنھیں میں نے بیان کر دیا ہے۔

میرا دماغ ہمیشہ اس طریقہ استدلال کو سمجھنے سے عاجز رہا ہے جو چالاک لوگوں کے قلوب سے نکلتا رہتا ہے، جنہوں نے ہندوستان میں اپنے آپ کو ہمارا دشمن بنا دیا ہے، ایسے بہت سے اشخاص ہیں، میں نے اُن کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، میں نے اُن سے دریافت کیا کہ آیا وہ خیال کرتے ہیں کہ برطانوی فوج جلد سے جلد ہندوستان سے نکل جائیگی، مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملا، جس نے ایسے طریقہ عمل کی حمایت کی ہو، درحقیقت ہندوستان میں کسی جماعت کا کوئی ایسا ذمہ دار لیڈر نہیں ہے، جو کل یہ کہے کہ ہمیں فوراً کامل ذمہ داری دیدو اور ہم ہندوستان سے برطانوی فوج کی واپسی پر رضامند ہیں۔ ...... مجھے اس موقعہ پر سرسری حوالہ اس ناگوار فرقہ وارانہ اختلافات کا دینا ہے جس سے ہندوستان کے مختلف حصص میں روز افزوں تشویش پیدا ہو رہی ہے۔ ان فسادات نے بعض اضلاع میں نہایت نازک اور ناگوار صورت اختیار کی اور یہ یاد دہانی کر دی کہ مسائل ہند اسقدر سہل سلجھے ہوئے نہیں ہیں جیسا کہ بعض وقت اصلی واقعہ سے بہت دور ہو کر خیال کئے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں ان سات کروڑ مسلمانوں کی موجودگی نے جنگی روایات و خصوصیات میں جنگ جویانہ اسپرٹ اور جوانمردی ہے۔ اور صورت حال کی اس نزاکت و دشواری میں مزید اضافہ کر دیا جو خود ہی پہلے سے زیادہ تھی، اس صورت حال کا حکومت ہند اور خود ہمارے دفتر سے نہایت توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا جا رہا ہے۔"

مگر یہ سال صلح وصلحت جنگ ثابت ہوا اور ۱۹۲۶ء نہایت خوفناک نکلا۔ ہندو مسلم[۱۳۸]

تو پورے طور پر مسلمانوں کے کچلنے پر آمادہ تھی اُس نے ہر جگہ دھمکایا اور اپنی عظیم اکثریت و تنظیم سے مرعوب کیا جگہ جگہ دیہات و قصبات میں آشرم کھولے گئے اور ہزاروں آدمیوں کو والنٹیر بنا کر تربیت کی گئی ۱۵ر جولائی ۱۹۲۶ء کو ڈاکٹر مونجے نے کلکتہ میں ہندو مہاسبھا کی صدارت کرتے ہوئے جو تقریر کی اس میں بہانگ دہل کہا کہ:۔

"ہندو مہاسبھا کا مقصد یہ ہے کہ تمام ہندوؤں کو متحد کر دے اور ہندو دھرم کو اتنی ترقی دے کہ ہندوستان صحیح معنوں میں ہندوستان کہلایا جا سکے یعنی ہندوؤں کا ملک۔"

مسلمانوں کا پیمانہ صبر بھی لبریز ہو گیا اُنہوں نے ہندو سیاسئین سے اپیلوں پر اپیلیں کیں اور جب ناکامی کی حالت میں اپنی قوم کے ساتھ کچھ ہمدردی کی تو نشانہ ملامت بنایا گیا حتےٰ کہ مسیح الملک حکیم اجمل خان اور مولانا محمد علی کی شخصیتیں محفوظ نہ رہیں۔ مارچ ۱۹۲۶ء میں جمعیت العلمائے ہند نے اپنے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں ایک تنظیمی رزولیوشن کے ضمن میں طے کیا کہ:۔

"چونکہ برادران وطن کے مخالفانہ طرزِ عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے اسلئے مسلمان اپنی تنظیم کر کے اپنے بل بوتہ پر ملک کو آزاد کرائیں البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارہ میں اتحادِ عمل کرنا چاہیں ان کے ساتھ اتحادِ عمل کیا جائے۔"

پھر دسمبر میں جمعیت کے رُوحِ رواں مولانا احمد سعید نے ایک تقریر میں کہا کہ:۔

"صاف اور سچی بات یہ ہے کہ ہندوؤں کے معاندانہ اور مخاصمانہ طرزِ عمل سے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ہندوؤں کی جانب سے مایوس ہو گیا ہے ان چند سالوں میں ہندوؤں نے جو جو مظالم ڈہائے اور جس جس بیدردی کے ساتھ مسلمانوں کے مذہب کی توہین کی ہے اور ان کے جائز حقوق کو پامال کیا ہے پھر باوجود مسلمانوں کی انتہائی خوشامد اور رواداری کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے مطالبات کو جس طرح ٹھکرایا ہے اور ہندو لیڈروں نے باوجود ان مظالم کی اور خون ریزی پر نہ صرف پردہ پوشی کی ہے بلکہ حمایت کی ہے ان تمام باتوں نے ہندوؤں کے اعتماد کو کھو دیا ہے۔

اور اب مسلمان آنکھیں بند کر کے ہندوؤں کے ساتھ کوئی کام بھی کرنے کو تیار نہیں۔ ۔ ۔
میں تو صاف صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہند و اکثریت موجودہ ذہنیت کے ساتھ ہرگز اس قابل نہیں کہ اقلیت کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے ؎
...... انگریز سے حقوق حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انگریز کی جگہ ہندو کو بھی وہی حقوق دئے جائیں جواب انگریز کو حاصل ہیں لیکن انگریز کو ہم بدیسی ہونے کا طعنہ دے سکتے ہیں۔ اسے اجنبی کہہ کر ظالم اور غاصب کا لقب دے سکتے ہیں وقت پڑے تو خوشامد کرکے عیسےٰ مسیح کا واسطہ دے کر اور اگر کچھ نہ ہو تو امریکہ اور فرانس کی آزادی کا گیت دیکر کچھ نہ کچھ لے سکتے ہیں لیکن ہندو کا بیٹ جس طرح دوزخ ہے اس کے خصائل بھی اہل دوزخ کی طرح نہایت سخت ہیں۔ یہ مسلمان پر اس کی اولاد پر اس کے مال پر کسی طرح بھی رحم کرنے کو تیار نہیں، ...... ایسے سوراج کو سلام، ایسی آزادی کو ڈنڈوت، ایسے اتفاق کو پرنام جس کا نام ہندو راجیہ ہو یا بنیوں کی غلامی، یہ مسلّم ہے کہ انگریز بھی بہت زیادہ اچھا نہیں (گو برے اچھا) لیکن وہ غیر تو ہے کہنے سننے سے تین اور ایک کا سرکلر تو جاری کر دیتا ہے۔ معقول بات کو مان تو لیتا ہے چاہے کرنا وہی ہے جو اس کی پالیسی ہوتی ہے۔ لیکن ہندو تو بہترے بہتر اور بھلی سی بات کو بھی سننا گوارا نہیں کرتا۔ اپنی ہنڈیا تو چھوڑتا ہی نہیں، غضب تو یہ ہے کہ جس ہنڈیا کا رخ ہماری طرف کو ہوتا ہے راستہ میں ہی اُسے لپک لیتا ہے، بھلا ایسے موذی کو اگر سوراج مل گیا تو پڑوسیوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گا ؟

اسی سال کے آخر میں سوامی شردہانند کو ایک شخص عبدالرشید نامی[۱۰۵] نے ان کے مکان پر قتل کر دیا اگرچہ یہ افسوسناک واقعہ محض شخصی اشتعال طبع کا ایک ذاتی معاملہ ضروری پر مبنی تھا مگر اس کو فوراً ہندو مسلم سوال بنا دیا گیا اور نہایت زبردست بنائے فساد ہو گیا

---

۱۰۵ عبدالرشید پریس کے لئے اُجرت پر کتابت کرتے تھے اور اسی پر مدار معاش تھا ترک موالات کے زمانہ میں انہوں نے معہ اہل و عیال افغانستان کو بھی ہجرت کی تھی واپسی پر ان کو بڑی تکلیفات کا سامنا کرنا پڑا وہ اپنی ساری کمائی برباد کر چکے تھے اور اس کا اثر ان کے دماغ پر بھی تھا ؎

ہندوؤں نے فوراً اس واقعہ کو مسلمانوں کی سازش سے منسوب کر کے تمام ملک میں پوری قوم کے ساتھ جذبات انتقام مشتعل کر دیئے دہلی کے چھ مسلمان اسی وقت ان کی آتش انتقام میں جھونک دیے گئے جن میں ایک معمر بزرگ بھی تھے۔

اس واقعہ قتل پر مسلمانوں کے تمام طبقات نے بلا استثنیٰ اظہار بیزاری کیا مگر اس کے عوض جو ظلم کئے گئے ان پر کسی ایک ہندو نے بھی اظہار بیزاری نہیں کیا اور اسی پر منحصر نہیں بلکہ اب تک جتنے وحشیانہ اور سفاکانہ مظالم کئے گئے تھے خواہ کٹار پور میں ہوئے ہوں یا پٹنہ گیا، آرہ، شاہ آباد کہیں بھی افسوس ظاہر نہیں کیا گیا۔ خود گاندھی جی کے مضامین پانی کی صورت میں سفید تیل ثابت ہوئے عام ہندو سیاسئین نے مصالحانہ طریقہ چھوڑ کر معاندانہ رویہ اختیار کیا حتیٰ کہ کانگریس کے صدر سری نواس آئنگر نے جو ہندو مسلم اتحاد کی کوشش میں ممتاز تھے شدھی کانفرنس کی صدارت کی اور اس کی توجیہ ہندو پریس نے یہ کی کہ " اگر سوامی شردھانند کے قتل کا واقعہ نہوا ہوتا تو صدر کانگریس نے یہ قدم نہ اٹھایا ہوتا اور کہ یہ واقعہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کو چیلنج ہے اور جو ہندو کہ اب تک اس مذہبی تنازعہ کے تماشائی تھے انھیں بھی اس معقول و منطقی نتیجہ پر پہونچنا پڑتا ہے کہ اس چیلنج کو قبول کئے بغیر چھٹکارا نہیں ہے"

سنہ ۱۹۲۶ء کو فرقہ وارانہ فسادات سے تمام فضا خطرات سے معمور تھی اور حقیقت یہ ہے کہ وائسرائے ہند لارڈ ارون دل سے امن و امان کے متمنی تھے انھوں نے جولائی میں دونوں قوموں کے رہنماؤں سے مذہب کے نام پر اپیل کی کہ وہ امن و امان قائم کرنے کی کوشش کریں اور اس فرقہ وارانہ کشمکش کو ختم کر دیں جو قومی زندگی کو ایک رسنے والے ناسور کی طرح تباہ کر رہی ہے۔

ہز اکسلنسی کی اپیل کے بعد چند مہینے ہی تعطل رہا تھا کہ پھر مجنونانہ جوش تازہ ہوا غرض یہ سال گذشتہ سالوں سے بازی لے گیا یعنی (۳۶) شدید فساد ہوئے اور مقتولین و مجروحین کی تعداد دو ہزار تک پہونچی اور معمولی سا واقعہ بھی ایک بڑے فساد کی بنیاد بننے لگا۔

۱۹۲۷ء بھی تقریباً ایسا ہی سال رہا اس میں بھی (۲۱) فسادات کی اور (۱۶) سو مقتولین و مجروحین کی تعداد تھی۔

اگست میں پھر لارڈ ارون نے دوبارہ اپیل کی اور ستمبر و اکتوبر میں اتحاد کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔

یہ حالات جو گذشتہ چار پانچ سال میں رونما ہوئے اتحاد کے لئے نہایت حوصلہ شکن تھے اور نرم سے نرم مسلمان بھی مایوس تھا۔

۱۹۲۶ء کے آخر میں سیٹھ یعقوب حسن (جو کانگریس وزارت کے دوران میں ممبر وزارت مدراس بھی مقرر ہوئے تھے) نے پراونشل مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے ہندو مسلم کشیدگی پر کہا کہ:۔

جب تک مسلمان اور ہندو اپنے کو دو مختلف قومیں سمجھتے رہیں گے اور نہ صرف مذہب بلکہ تہذیب اور روایات میں بھی جدا جدا ہیں اس وقت تک ان دونوں کے درمیان ایک دیوار حائل رہے گی، اور موجودہ حالت کے تحت میں جس چیز کی امید کی جا سکتی ہے وہ الائنس (اشتراک) ہے جو اس ملک میں بسنے والی اصلی قوموں کے درمیان ممکن ہے، الائنس کو کسی صورت میں یونٹی نہیں کہا جا سکتا،......

مسلمانوں کی شرکت سے پہلے کانگریس ایک ہندو جماعت تھی اور مخصوص نام کے لحاظ سے ایک قومی جماعت اسلئے ہندوؤں کو اپنی ارگنائزیشن الگ بنانے کی ضرورت نہ تھی یہی نام نہاد قومی جماعت فرقہ وارانہ جماعت کا کام دیتی تھی۔

اب فرقہ وارانہ باتوں کے لئے ہندو ذمہ دار ہیں جیسے کہ مسلمانوں کو علیحدگی کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا، ہندو سبھائیں، ہندو مہا سبھائیں، ہندو کانفرنسیں تمام ملک میں پھیل چکی ہیں، اگر یہ سبھائیں ہندوؤں کی سماجی حالت اور ان برائیوں کو جو ان کی سیاسی جماعتوں میں جڑ پکڑ چکی ہیں اصلاح کا کام ہاتھ میں رکھتیں تو مسلمان ان فرقہ وارانہ جماعتوں کے متعلق کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ لیکن ان ہندو سبھاؤں کا اصل اصول جو ان کے پلیٹ فارموں پر کام کرتا ہے مسلمانوں سے جداگانہ انتخاب کا ختم کرا دینا ہے، ہندو سبھاؤں

اور آریہ سماجوں کے اشاروں سے ملک بھر کے ہندو کوشش میں ہیں کہ ان کو ساجد کے سامنے باجہ بجانے کا حق دیا جائے اور ایسے اوقات میں جب کہ مسلمان بہ اوقات معینہ نماز با جماعت ادا کر رہے ہوں وہ باجہ بجانے کا حق چاہتے ہیں اور ایسے وقت جب کہ عموماً مذہبی محفل کا وعظ کیا جا رہا ہے اور مسلمان بھی غیر مذہب والوں سے قرآن کی زبان میں " لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ " کہتے ہیں مگر آریہ سماجی کوشاں ہیں کہ وہ جاہل مسلمانوں سے ٹکر لیں اور یوں دونوں قوموں میں تفرقہ کا ایک اور جز شامل کر دیا ہے۔

جداگانہ انتخاب صرف اسی صورت میں ختم ہو سکتا ہے جب کہ اکثریت کی طرف سے اقلیت کے دل و دماغ میں اعتماد کے جذبات پیدا ہو جائیں اور اس کا اعلان مسلمانوں پر ہی منحصر ہوگا کہ اب اعتماد اس درجہ پر ہے کہ جداگانہ انتخاب کی ضرورت نہیں موجودہ زمانہ میں فرقہ وارانہ کشیدگی اتنی بڑھ گئی ہے کہ عملی سیاست میں انتخاب جداگانہ کا ختم کر دینا ممکن نہیں اور اگر کانگریس مسلمانوں کے انتخاب جداگانہ کے خلاف کوئی تجویز پاس کرے تو وعدہ شکنی کی سخت مجرم ہوگی۔ ..... یہ بھی کہنا ناگزیر ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ فرقہ وارانہ فسادات جداگانہ انتخاب کی وجہ سے ہوتے ہیں تو یہ خاص جہالت کی بات ہے "

بہر حال اتحاد کانفرنسوں کا کچھ تو اثر ہوا کہ سیاسیین کی ان سرگرمیوں میں کمی آگئی اور تھوڑے عرصہ بعد رائل کمیشن کے اعلان نے ایک وقفہ کی صورت پیدا کر دی۔

باب ہشتم

اگرچہ تحریک خلافت کے زور شور میں کانگریس کے ساتھ مجنونانہ اشتراک عمل نے مسلم لیگ کو بہت کچھ مضمحل کر دیا تھا لیکن پھر بھی وہ زندہ قوت تھی اور دستوری ترقیوں پر برابر زور دیتی رہی اُس نے ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۶ء آزادی مذہب اکثریت و اقلیت کے مباحث صوبہ سرحد میں نفاذ اصلاحات ہندو مسلم اتحاد پبلک سروسز وقف ایکٹ بنگال کے سیاسی قیدیوں کی رہائی اور باضابطہ تحقیقات، کینیا اور جنوبی افریقہ کے معاملات اور دیگر ملکی مفادات اور مختص القوم امور کے متعلق تجاویز پاس کیں دیسی کپڑے کے استعمال کی ترقی پر توجہ دلائی اور ۱۹۲۶ء کے سیشن میں ایک مبسوط قرارداد میں اس امر کو واضح کیا کہ:-

ہندوستان کے موجودہ آئین میں ترمیمات ہونی چاہئیں اور حکومت ہند ۱۹۱۹ء پر نظر ثانی کرے اور بلا تاخیر ایک شاہی کمیشن کا تقرر کیا جائے جو تحقیقات کے بعد ایسی اسکیم تیار کرے جس کی رو سے قانون ہند مکمل اور مضبوط بنیادوں پر وضع ہو اور جس میں ایسی رعایت ہو کہ ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کی تیاری کے لئے خود بخود ترقی ہوتی جائے۔ اور باشندے دل سے اشتراک عمل کریں جس سے گورنمنٹ میں مضبوطی پیدا ہو لیکن بنیادی اور ضروری اصول کا تحفظ و ضمانت ہونی چاہیئے۔

ملک کی تمام مجالس قانون ساز اور انتخابی جماعتوں میں اقلیتوں کی نمایندگی ایک خاص اور موثر اصول کے ماتحت ہوگی اور کسی صوبہ میں اکثریت کو اقلیت کے برابر نہ کیا جائے گا، اور نہ اکثریت کو اقلیت بنا دیا جائے۔

فرقہ وارانہ جماعتوں کی نمایندگی کا انتخاب جداگانہ رہے گا جیسا کہ جاری ہے بجز اس صورت کے کہ ہر فرقہ کو اختیار ہوگا کہ جس وقت چاہے مشترکہ انتخاب قبول کرے۔

اگر کبھی ملکی تقسیم کی ضرورت ہو تو کسی صورت میں بھی یہ تقسیم پنجاب و بنگال اور صوبہ سرحد

میں اکثریت پر اثر انداز نہ ہوگی پوری مذہبی آزادی تمام قوموں کو ہوگی۔

کوئی بل یا تجویز یا اس کا کوئی حصہ کسی مجلس وضع قانون یا کسی انتخابی ادارہ میں منظور نہ ہوگا اگر کسی قوم کے ¾ ممبر اپنے مفاد قومی کے نقصان کی بنا پر مخالفت کریں اور نہ کوئی ایسی تجویز پیش ہوگی جو ایسے معاملات میں دخل انداز ہو سکے۔

مگر لیگ کی ان تجاویز پر ہندو لیڈروں نے بہت نکتہ چینی کی اور اس بات پر ضد کی کہ مشترکہ انتخاب بہ تحفظ حقوق و مفاد مسلمانان رکھنا چاہیے۔

لہٰذا ممتاز مسلمانوں کا ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں ایک نمائندہ جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ کی کارروائی مسٹر جناح کی صدارت میں شروع ہوئی اور کافی بحث و تبادلہ خیالات کے بعد مشترکہ انتخاب سے چند شرائط کے ساتھ اتفاق کیا گیا اور بلا اختلاف رائے سب نے منظور کیا کہ:۔

مسلمانوں کو حسب ذیل امور پر کوئی بنا ر تصفیہ قرار دے کر جہاں تک کہ آئندہ قانون کی رو سے مختلف مجالس وضع قوانین میں نمائندگی کا تعلق ہے راضی ہو جانا چاہیے۔

(۱) سندھ کو بمبئی پریسیڈنسی سے علیحدہ کر کے جدا صوبہ قرار دیا جائے۔

(۲) سرحد و بلوچستان کے صوبوں میں اور صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں۔

(۳) اگر ان امور کا تصفیہ ہو جائے تو مسلمان مشترکہ انتخاب کو ہر صوبہ میں منظور کریں اور سندھ بلوچستان اور سرحد کے صوبوں میں وہی رعایات جو کہ ہندو اکثریت دیگر صوبوں میں مسلمان اقلیت کے ساتھ کرے مسلمان ان کے ساتھ کریں۔

صوبہ سرحد ۱۹۰۱ء سے پہلے پنجاب سے ملحق تھا لارڈ کرزن کے زمانہ میں غیر آئینی صوبہ قرار پایا۔

بیسویں صدی میں شاید دنیا کا یہ ہی ایک خطہ ایسا رہا ہے جہاں آئین و قانون کی روشنی کے تمام سوراخ بند رکھے گئے تلافی حقوق اور سزا و جزا میں ہزاروں سال پہلے کی جہالت و بربریت روا رکھی گئی مثلاً گھوڑے کی کاٹھی انسان کی پشت پر باندھ کر سواری کرنا ایک خفیف قسم کی سزا تھی جب مسلمانوں نے اس کو نئی اصلاحات دینے کا مطالبہ کیا تو عام ہندوؤں نے جن کو در پردہ کانگریسی زعما کی حمایت بھی حاصل تھی سخت مخالفت کی ہندو زیادہ تر پھر پنجاب سے الحاق پر راضی ہو ئے، صرف مطلب یہی تھا کہ ٹھوس اکثریت کا کوئی صوبہ نہ ہو۔

پنجاب اور بنگال کے صوبوں میں نمایندگی بہ تناسب آبادی ہوگی مرکزی مجلس قانون ساز میں مخلوط انتخاب کے ذریعہ سے مسلمانوں کی نمایندگی ⅓ ہوگی اس کانفرنس نے آخر میں طے کیا کہ یہ تجاویز تمام متعلقہ مسلم آرگنائزیشن کی اتفاق رائے پر منحصر ہونگی۔ کانفرنس کے شرکا کو پوری اُمید تھی کہ ہندو ان تجاویز کو منظور کریں گے اور مسلمان ان پر متفق ہو جائیں گے۔

ملازمتوں اور ایسے بلوں پر اور ریزولیوشنوں کے سوال پر بحث ہوئی جو کسی اور قوم کے مذہب رسم ورواج اور روایات پر فرقہ وارانہ مفاد پر موثر ہوں مگر اس کو آئندہ غور کے لئے جب کہ اصل مسئلہ پر اتفاق رائے حاصل ہو جائے ملتوی کیا گیا۔

مذکورہ بالا کانفرنس میں سر مہاراجہ محمود آباد، سر محمد شفیع، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری۔ سر محمد یعقوب، نواب محمد اسمٰعیل خاں، سید آل نبی، لفٹنٹ سردار محمد نواز خاں، ڈاکٹر سہروردی، مسٹر شاہ نواز، راجہ غضنفر علی خاں، مسٹر فاروقی، مسٹر عبدالرحمٰن نواب عبدالقیوم، شاہ محمد زبیر، امام جامع مسجد دہلی، مولوی سید مرتضےٰ، مولوی محمد شفیع داؤدی، مسٹر داؤدی، مسٹر عبدالعزیز (بہار) عبدالمتین چودھری مرزا عبدالقادر سید عبدالجبار (اجمیری) سید احتشام علی، سر عبدالرحیم، مولوی انوار العظیم، ڈاکٹر حیدر، مسٹر عارف مسٹر اعجاز حسین نواب سر ذوالفقار علی خاں خاص خاص اصحاب تھے۔ اور اس طرح تمام صوبجات ہند کی نمایندگی تھی۔

سندھ تاریخی حیثیت سے ایک علیحدہ ملک کی صورت میں رہا ہے، یہ ملک ۱۸۴۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں آیا اُسی وقت بمبئی ایک خاص نظام کے ساتھ کمپنی کے زیرنگیں تھا لہٰذا انتظامی کفایت شعاری کو ملحوظ رکھ کر اس سے ملحق کر دیا گیا، حالانکہ زبان لباس معاشرت موسم و پیداوار کسی طور سے بھی بمبئی سے اس کو کوئی نسبت ہی نہ تھی پھر حدود میں ایک طرف سمندر اور دوسری طرف صحرا۔

سندھ میں مسلمانوں کی کافی اکثریت ہے لیکن کمپنی اور تاج کی حکومتوں نے جو پالیسی جاری رکھی اس میں اس مسلمان آبادی کو کبھی شعبہ زندگی میں ترقی نصیب نہ ہوئی اور ہندوؤں نے ایک طرف ان کی گردن میں اقتصادی طوق ڈالا اور دوسری طرف تمام مادی ذرائع پر متصرف ہو گئے۔

مئی ۱۹۲۸ء میں کانگریس کی مجلس عاملہ منعقدہ بمبئی نے ان تجاویز کو تقریباً منظور کر لیا اور یہ قرارداد بھی پاس ہوئی کہ مجلس عاملہ مرکزی اور صوبوں کی مجالس قانون ساز کے منتخب شدہ اراکین اور سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے مشورہ کر کے ہندوستان کے لئے سوراج کا دستور اساسی مرتب کرے جس کی بنیاد اعلان حقوق پر ہو نیز اکتوبر میں مذہبی و معاشرتی امور کے متعلق ایک تجویز منظور کی گئی۔

دسمبر میں بمقام مدراس کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا، ڈاکٹر انصاری صدر اجلاس کانگریس نے اپنے خطبہ صدارت میں ہندو مسلم سوال کو ہمیشہ کے لیے حل ہو جانے پر زور دیتے ہوئے صفائی کے ساتھ کہا کہ:-

جس وقت کہ ہم ہندو مسلم مسئلہ کا حل سوچیں اُس وقت ہم کو تشخیص مرض میں کوئی غلطی نہیں کرنی چاہیے، سیاسی و مذہبی اختلافات جو دونوں قوموں کے تعلقات پر اثر انداز ہو رہے ہیں وہ ایک اندرونی اور گہرے تنازعہ کی طرف ظاہری صورت ہے اور اندرونی تنازعہ صرف ہندوستان کی ہی خصوصیت نہیں اور نہ غیر تاریخی چیز ہے۔ یہ یقیناً دو مختلف کلچر (تہذیب) کا مسئلہ ہے جن کا نظریہ زندگی مختلف ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے قریب آتے جاتے ہیں اس لئے بہترین حل یہ ہے کہ ہر کلچر کے حق بقا کو رواداری و عزت کی روح کے ساتھ تسلیم کر لیا جائے اور قومی اداروں کو قائم کر کے ان کلچرز (تہذیبوں) کی ترقی کی کوشش کی جائے جہاں دونوں قوموں کے نوجوان ایک دوسرے سے ملیں گے اور ان کو ایک دوسرے کے اندرونی خیالات سمجھ سکنے کا موقع حاصل ہوگا ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنے حالات سے مجبور ہو کر یوروپین کلچر کو سمجھنے لگتا ہے اور اپنے ہم وطنوں میں سے جو شخص اس سے دو قدم پر رہتا ہوا اس تک کے کلچر سے ناواقف رہتا ہے اب وقت ہے کہ یہ علیحدگی اور لاعلمی دور ہونی چاہیے اور جب ہم ایک دوسرے کے جذبات سے واقف ہو جائیں گے اور مقاصد سے ہمدردی کریں گے تو جداگانہ نمائندگی گاؤکشی اور مسجد کے سامنے باجہ کے مسئلے ماضی کے

معاملات ہوجائیں گے اور صرف تاریخ ہند کی تحقیقات کرنے والوں کے لئے دلچسپی کا سبب ہو سکیں گے۔"

اس اجلاس میں حسب ذیل رزولیوشن بھی پاس کیا گیا کہ :-

یہ کانگریس قرار دیتی ہے کہ ہندوستان کے آئندہ کسی دستور اساسی میں جہاں تک مختلف مجالس مقننہ میں نیابت کا تعلق ہے تمام صوبوں کی مجالس مقننہ اور مرکزی ایوان میں جو اس اسکیم کے مطابق تجویز کئے جائیں گے مشترکہ نیابت کا طریقہ رائج کیا جائے گا، اور اس خیال سے کہ ملک کی دو بڑی ملتوں کو یہ پورا پورا اطمینان رہے کہ فی الحال ان کے جائز مفاد مجالس مقننہ میں محفوظ رہیں گے اور اگر خواہش کی گئی تو ان ملتوں کی یہ نیابت مشترکہ انتخاب میں آبادی کے تناسب سے ہر صوبہ کی مجالس مقننہ میں اور مرکزی جمیعت ہائے مقننہ میں نشستوں کو اس طریقہ کے ساتھ مقابل کر دیا جائے گا کہ پنجاب کی اقلیت کے ساتھ باہمی سمجھوتہ سے اس طرح مراعات کی جائیں کہ دوسرے صوبوں کی مجالس مقننہ میں اقلیتوں کو ان کی آبادی کے اعتبار سے جو نشستیں ملی ہوں وہ بھی زیادہ کر دی جائیں۔ پنجاب میں نمایندگی کے مسئلہ کا تصفیہ کرتے وقت سکھوں کی بحیثیت ایک اہم اقلیت کے نمایندگی کا خاص لحاظ رکھا جائے گا، مسلمان زعما کی طرف سے صوبہ سرحد اور برطانوی بلوچستان میں اس طرح اصلاحات دیئے جانے کی تجویز پیش کی گئی ہے جس طرح کی اصلاحات دوسرے صوبوں کو دی جائیں۔ کانگریس کی رائے میں نہایت درست اور حق بجانب ہے، اور اس پر عملدرآمد رکھنا چاہیئے۔ اور اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے، کہ انتظامی امور میں جو تبدیلیاں کی جائیں اُسکے ساتھ ساتھ عدالتی انتظامات بھی کئے جائیں۔ سندھ کو الگ صوبہ بنانے کی نسبت اس کانگریس کی رائے ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ مختلف صوبوں کو زبان کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے جسے کانگریس نے عرصہ ہوا تسلیم کر لیا ہے اور کوئی صوبہ زبان کے اعتبار سے تقسیم کا مطالبہ کرے تو اس کے متعلق کارروائی شروع کرنی چاہیئے یہ کانگریس قرار دیتی ہے کہ آئندہ ہندوستان کے دستور اساسی میں ہر شخص کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی اور کسی مجلس

مقننہ کو خواہ مرکزی ہو یا صوبہ کی یہ اختیار نہ ہوگا کہ اس قسم کے قوانین بنائے جس میں ضمیر کی آزادی میں خلل پڑے۔ ضمیر کی آزادی سے مراد اعتقاد اور عبادات کی آزادی، مذہبی اعمال و شعائر کی آزادی مذہبی تعلیم اور اشاعت کی آزادی ہے، موخرالذکر امور اس طرح ادا کئے جائیں گے کہ دوسروں کے احساسات کا پورا احترام کیا جائے اور اسی طرح دوسروں کو جو حقوق حاصل ہوں ان میں مداخلت نہ ہو، کوئی ایسا مسودہ قانون ایسی قرارداد تحریک یا ترمیم کسی مجلس مقننہ میں پیش نہ ہو سکے گا جس کی کسی ایک ملت کے تین چوتھائی ارکان جس پر اس مسودہ یا تحریک وغیرہ کا اثر پڑتا ہو مخالفت کریں۔ بین الملی معاملات سے مراد ایسے معاملات ہیں، جنہیں متعلقہ مجالس مقننہ کے ہندو و مسلمان ارکان کی مشترکہ کمیٹی جو ہر مجلس کے آغاز کے وقت مقرر کردی جایا کرے گی بین الملی قرار دیں گے۔

یہ کانگریس قرار دیتی ہے کہ بلا ضرر ان حقوق کے جن کے ہندو اور مسلمان دعویدار ہیں۔ یعنی ایک فریق جہاں چاہے باجہ بجائے یا جلوس نکالے اور دوسرا فریق جہاں چاہے گائے کی قربانی کرے یا غذا کے اغراض کے لئے ذبیحہ کرے مسلمان مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ گائے کے معاملہ میں ہندوؤں کے جذبات کا حتی الامکان لحاظ رکھیں اور ہندو ہندوؤں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ مساجد کے سامنے باجہ بجانے کے معاملہ میں مسلمانوں کے احساسات کا حتی الامکان لحاظ رکھیں، اس لئے یہ کانگریس ہندو و مسلمان دونوں سے اسکی طالب ہے کہ وہ قربانی گائے یا مساجد کے سامنے باجہ بجانے کو روکنے کے لئے تشدد یا قانونی ذرائع کو کام میں نہ لائیں

یہ کانگریس قرار دیتی ہے کہ ہر فرد یا جماعت کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے فرد یا جماعت کو دلائل یا رضامندی سے تبدیل مذہب کرائے، لیکن کسی فرد کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ تبدیل مذہب میں مداخلت کرے۔ یا ایسا کرنے میں جبر و ہوکہ یا دوسرے ناجائز ذرائع مثلاً مادی لالچ دلانے کا طریقہ استعمال کرے۔ اٹھارہ سال سے کم عمر والوں کا مذہب تبدیل نہ کرایا جائے گا۔ سوائے اُن کے والدین یا ولی کے

ساتھ ہوں۔ اگر اٹھارہ سال سے کم عمر کے کسی آدمی کو کسی دوسرے مذہب والے ادھر اُدھر گھومتا ہوا دیکھیں گے تو اسکو فوراً اُس کے مذہب والوں کے سپرد کردینا چاہئیے تبدیل مذہب میں اشخاص کے نام اوقات جگہ اور طریقہ کو چھپایا نہ جائے گا اور نہ اس سلسلہ میں کسی خاص مسرت کا اظہار کیا جائے گا۔ جب کبھی تبدیل مذہب کے متعلق شکایات سُنی جائیں گی کہ اسے خفیہ یا زبردستی یا دھوکہ یا دیگر ذرائع ناجائز سے کرایا گیا یا جب کبھی یہ پتہ چلے کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کے کسی شخص کا مذہب تبدیل کرایا گیا ہے تو اس کی تحقیقات کی جائے گی اور اس کا تصفیہ ثالث کے ذریعہ سے ہوگا۔ جس کو کانگریس کی مجلس عاملہ خواہ نام بنام یا عام ضوابط کے ماتحت مقرر کرے"

اس کے بعد ہی لبرل فیڈریشن منعقدہ بمبئی میں مسلم زعما کی خلوص نیت کا اعتراف کیا گیا اور مشورہ دیا گیا کہ مجوزہ تصفیہ کی مختلف مدات پر کسی قریب تاریخ میں فرقوں کے منتخب نمائندے اتحاد عمل کی پرخلوص نیت کے ساتھ بحث و مباحثہ کریں جو مکمل اتفاق کی طرف رہنمائی کر سکے۔

۳۰ر دسمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ نے بھی بہ زیر صدارت سر مولوی محمد یعقوب حسب ذیل رزولیوشن پاس کیا کہ:-

"آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس کونسل مسلم لیگ کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ ایک سب کمیٹی بدیں غرض مقرر کرے جو کانگریس کی مجلس عاملہ اور اسی قسم کی دیگر مجالس کے ساتھ جنہیں کونسل مناسب سمجھے ملک ہندوستان کے دستور اساسی کا مسودہ کے تیار کرنے میں مشورہ کرے تاکہ اس میں مسلمانوں کے مفاد کا حسب ذیل تجاویز کے ساتھ تحفظ ہو سکے جن کی لیگ تصدیق کرتی ہے اور قبول کرتی ہے اور اس نیشنل کنونشن میں شرکت کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کرتی ہے جسے کانگریس نے آئندہ مارچ میں دہلی میں منعقد کرنا طے کیا ہے پہلی تجویز یہ ہے کہ سندھ کو صوبہ بمبئی سے الگ کرکے خود مختار بنا دینا چاہیئے۔ اور دوسری تجویز یہ ہے کہ سندھ صوبہ شمال مغرب اور بلوچستان میں اس طرح اصلاحات کا نفاذ ہونا چاہئیے کہ وہ بھی دیگر صوبوں کے برابر ہو جائیں؛

تیسری تجویز یہ ہے کہ مجالس مقننہ میں بحالت موجودہ مسلمانوں کو جداگانہ نیابت ناگزیر ہے اور اس لئے مسلمان کسی ایسے اسکیم کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے ہیں سے ان کے قیمتی حق سے انہیں دست بردار ہونا پڑے تاوقتیکہ سندھ کو ایک خود مختارانہ صوبہ نہ بنایا جائے اور صوبہ سرحد و بلوچستان کو مکمل اصلاحات نہ دیدیئے جائیں۔ جب یہ شرائط کامل طور پر پورے ہو جائیں تب مسلمان جداگانہ انتخاب کے حق میں دست بردار ہونے کے لئے تیار ہوں گے جس میں آبادی کے تناسب سے مختلف ملتوں کی نیابت کے لئے نشستیں اس طرح مخصوص ہوں گی کہ (۱) سندھ اور بلوچستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہندو اقلیت کے ساتھ ان نشستوں کے تناسب میں وہی مراعات کرے گی جو ہندو اکثریت دوسرے صوبوں میں مسلم اقلیت کے ساتھ اُن کی آبادی کے تناسب کے بارہ میں کرے گی (۲) مرکزی مجالس مقننہ میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہ ہوگی؎

لیگ نے بحیثیت مجموعی ان تجاویز کی بھی تائید کی جو کانگریس نے ضمیر کی آزادی مذہب گائے، باجہ اور تبدیل مذہب کے متعلق کی تھیں اس سال کے یہ اجلاس بڑے یادگار اور شاندار تھے ہندو مسلم زعمانے اتحاد و اشتراک عمل پر بڑی بڑی تعداد تقریریں کیں اور آپس میں ایک نئی صبح طلوع ہونے پر مبارکبادیاں دی گئیں؎

سلسلہ اصلاحات میں حکومت کی طرف سے ۱۹۲۴ء میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس کے صدر سر الیگزینڈر موڈیمین اور مہاراجہ بردوان، ڈاکٹر سر سپرو، سر سوامی آئر، ڈاکٹر پرانجپے، سر میاں محمد شفیع اور مسٹر محمد علی جناح تھے؎

اس کمیٹی کی مجارٹی اور منارٹی رپورٹوں میں باوجود اختلافات کے فرقہ وارانہ انتخاب قائم رکھنے پر اتفاق تھا۔ حتےٰ کہ (سر) چنتامنی سابق وزیر حکومت صوبہ متحدہ و ایڈیٹر اخبار لیڈر نے بھی اپنی شہادت میں انتخاب جداگانہ کی حمایت کی؎

۱۹۱۹ء کے دستور ہند (گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ) میں آئندہ دستوری ترقیوں کے لئے جو دس سال کے تجربہ کے بعد موعود تھیں ایک کمیشن کے تقرر کا

بھی حوالہ تھا مگر ہنوز اس میعاد میں دو سال باقی تھے کہ نومبر ۱۹۲۷ء میں کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دیا گیا جو ہندوستان کا دورہ کرکے اور شہادتیں جمع کرکے آئندہ دستور کے لئے رپورٹ تیار کرے۔ کمیشن کے سات ممبر تھے جو سب انگریز تھے ہندوستانی سیاست کے لئے یہ ایک ذلت تصور کی گئی کہ اس کا کوئی نمائندہ نہیں لیا گیا نیز اس کے طریق کار پر بھی اطمینان نہ تھا اس بنا پر کانگریس اور مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتوں نے اس کا مقاطعہ طے کیا لیکن مسلم لیگ میں ایک حصہ جس کے رہنما سر محمد شفیع تھے مقاطعہ کے خلاف تھا اور محض اس بنا پر انہوں نے ایک علیحدہ جماعت قائم کر لی جو شفیع گروپ کے نام سے موسوم ہوئی اور اس نے لاہور میں ایک جداگانہ اجلاس منعقد کرکے تعاون کی تجویز پاس کی۔

فروری ۱۹۲۸ء میں سر جان سائمن کی صدارت میں یہ کمیشن ہندوستان میں آیا۔ اہم اور مرکزی مقام پر اس کا مقاطعہ کیا گیا۔ پولیس کے انتظام ہر جگہ نہایت سخت تھے۔ لکھنؤ میں تو سر مہاراجہ صاحب محمود آباد کے محل کا فوجی محاصرہ کیا گیا۔ جابجا مظاہرے ہوئے اور لاٹھی چارج کی بھی نوبت آئی۔

مگر بعض جماعتوں نے اس کے ساتھ تعاون کیا۔ میمورینڈم پیش کئے گئے اور انفرادی طور پر بعض نے شہادتیں بھی دیں۔

ایک طرف یہ کمیشن مصروف کار تھا۔ دوسری طرف قرارداد مدراس کے مطابق بمقام دہلی دستور کا مسودہ مرتب کرنے کے لئے آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی اور ترتیب مسودہ کی گئی۔

اس کانفرنس میں مسلم لیگ کی بھی نمائندگی تھی، اس کو مسودہ پر اعتراضات تھے مگر ان کی شنوائی نہ ہوئی اور انجام کار کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ البتہ کانفرنس نے بطور خود طے کیا کہ:۔

ذمہ دار حکومت کو پیش نظر رکھکر دستور بنایا جائے نیز صوبوں کی نئی تقسیم حلقہ ہائے انتخاب اور نشستوں کے تحفظ کے متعلق بھی تجاویز منظور ہوئیں اور ایک کمیٹی مقرر

کی گئی جس نے مدت معینہ میں اپنی رپورٹ جس میں تجاویز درج تھیں پیش کر دی۔ کانگریس اور لیگ کے متفقہ اصول جو گذشتہ دسمبر میں ہی بمقام کلکتہ قرار دئے گئے تھے سب نظر انداز کر دئے گئے ،

آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس پھر مارچ میں منعقد ہوا اور اس نے دو سب کمیٹیاں مقرر کر دیں جن میں سے ایک کو سندھ کی علیحدگی کے مالی پہلو پر تحقیقات کرنے اور دوسری کو نمایندگی باعتبار تناسب لائق عمل ہونے کے متعلق غور و تجویز کی خدمت سپرد کی کانفرنس نے رپورٹ بھی شائع کرنے کا حکم دیدیا۔ اپریل میں بمقام جبل پور مہاسبھا کے اجلاس نے مسلم تجاویز سے شدید مخالفت کی۔ ۱۹ رمئی کو بمبئی میں پھر کانفرنس کا اجلاس ہوا لیکن فرقہ وارانہ مسائل پر مخالفت رہی۔ اور چونکہ دہلی کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے بھی کوئی رپورٹ پیش نہیں کی تھی۔ اب ایک جدید کمیٹی پنڈت موتی لال نہرو کے تحت صدارت مقرر ہوئی اور اس کو حکم دیا گیا کہ آیندہ یکم جولائی سے پہلے آئین ہند کے اصولوں پر غور کرے اور انہیں متعین کرے پھر مسودہ رپورٹ اظہار رائے کے لئے مختلف انجمنوں کے پاس بھیجا جائے اور فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے مدراس کانگریس کی تجویز پر اور اس کے ساتھ ہندو مہاسبھا مسلم لیگ سکھ لیگ اور دیگر سیاسی انجمنوں کی تجاویز پر جن کے نمایندے دہلی کی آل پارٹیز کانفرنس میں شریک تھے اور نیز دیگر ایسے مشوروں پر جو بعد میں اس کو حاصل ہوں ان سب پر مکمل ترین طریقہ سے فکر و تامل کرے۔ مسلم نقطہ نظر کے اظہار کے لئے سر علی امام اور مسٹر محمد شعیب قریشی ممبر منتخب ہوئے جن میں صرف اول الذکر ایک ہی اجلاس میں شریک ہوئے البتہ آخر الذکر نے مسلسل شرکت جاری رکھی اور آخر میں وہ اس رپورٹ کے متعلق اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہ مسلمانوں کے لئے انتہائی مضرت رساں ہے انہوں نے اس رائے کو بالاعلان ظاہر کر دیا جس سے عام طور پر ایک کھلبلی مچ گئی ،

تاہم رپورٹ جو نہرو رپورٹ کے نام سے موسوم ہوئی آخر اگست میں بمقام

لکھنؤ آل انڈیا پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں پیش ہوئی اس اجلاس میں مسلم لیگ کی قطعی نمایندگی نہ تھی سوراج کے سلسلہ میں تو اُس نے درجہ مستعمرات قبول کرلیا اور مسلم مطالبات تقریباً نظر انداز کردیئے گئے اور جن کو باقی رکھا اُن پر ایسے پیرایہ بیان میں بحث کی گئی جو نہایت دل شکن تھا اور صاف طور پر بیان کیا گیا کہ مطالبات فرقہ وارانہ ہیں اور مفاہمت ممکن نہیں۔ نیز بنگال و پنجاب کی قلیل مسلم اکثریت کو بھی خطرہ میں ڈال دیا گیا،

رپورٹ دراصل اس خطرہ کی گھنٹی تھی کہ ہندوستان میں دوہری حکومت قایم ہو جس میں فوجی اور خارجی اختیار انگریزوں کے ہاتھوں میں رہے اور ملکی وانتظامی اختیارات اکثریت کے ہاتھوں میں آجائیں تاکہ برطانوی سنگینوں سے مسلمانوں کو غلام بنالیا جائے،

اور بقول مولانا محمد علی کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں منادی کی جاتی تھی تو منادی پکارتا تھا کہ "خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا لیکن نہرو رپورٹ کا ملخص یہ ہے کہ خلقت خدا کی ملک ویسرائے یا پارلیمنٹ کا اور حکم مہا سبھا کا"

اس رپورٹ کے سلسلہ میں یہ انکشاف دلچسپی سے دیکھا جائیگا کہ صوبہ سرحد کی بحث میں پنڈت مالویہ نے جب کچھ مطالبات پیش کئے تو ایک مسلمان نمایندے نے کہا کہ آپ جو مطالبات کریں وہ بند لفافہ میں پیش کریں، چنانچہ وہ لفافہ پیش ہوا، اور مسلمان نمایندہ نے اسکو دیکھے بغیر منظور لکھدیا،

جب پنڈت موتی لال نہرو نے لفافہ کھولکر پڑھا تو اس میں ہندو مینارٹی کے لیئے پچاس فی صدی نمایندگی مطلوب تھی اور دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ دیوانی و فوجداری کے وہ مقدمات جن میں کوئی فریق ہندو ہو صرف ہندو یا یورپین جج کے سامنے پیش ہوں۔ مگر پنڈت موتی لال نے اس کاغذ کو فوراً چاک کردیا کیوں کہ اس صورت میں اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو بھی ایسے حقوق دیئے جاتے اور پنڈت موتی لال نہرو اس سوال کو سامنے لانا نہ چاہتے تھے،

غرض اس رپورٹ کی اشاعت سے[227] علاوہ درجہ ستعمرات کے فرقہ وارانہ معاملات اور اقلیتوں کے مسائل پر بھی ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور عجیب جوش وخروش کا اظہار ہوا۔ مسلمانوں کے تمام سیاسی ادارات خلافت کمیٹی وجمیعتہ العلماء وغیرہ نے زبردست احتجاج کئے اور قراردادیں منظور کیں، اور انھوں نے اس کی بحث میں کوئی نمائندگی نہیں کی اسی سلسلہ میں مولوی حسین احمد صاحب (مدنی) کا ایک خط قابل ملاحظہ ہے جو انہوں نے ستمبر میں مولانا شوکت علی (مرحوم) کے نام ارسال کیا تھا اور جس سے صورت حالات پر پوری روشنی پڑتی ہے وہ تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"اگرچہ کچھ عرصہ سے اخبار "خلافت" میرے نام نہیں آیا مگر "انقلاب" "ھمدم" اور "الجمیعتہ" وغیرہ میں آپ کے مقالات آتے ہیں ان سے آپ کی تحریریں معلوم ہورہی ہیں میرے نزدیک آپ کو آگے بڑھکر پکڑنا چاہیئے اور مسلمانوں کو چاروں طرف سے آواز اٹھانی چاہیئے ؎ بر گش بگیر تا بہ تپ راضی شود۔

بلکہ حقیقت بھی یہی ہے کہ ہم نے اس طریقہ پر آواز نہیں اٹھائی جس طرح لازم تھی"

مولانا ابوالکلام آزاد کے بھی کلام رنگیں سے زمیندار کے کالم رنگے جارہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نسخوں سے بھی بیماران صحافت شفا ڈھونڈ رہے ہیں"

میں آنجناب کی توجہ ایک خاص طریقہ پر مبذول کرانا چاہتا ہوں واقعہ یہ ہے کہ آزادی کامل ہمارا مذہبی، سیاسی، وطنی نصب العین ہے اور ہر حیثیت سے ہم کو اس کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مگر اسی کے ساتھ ہم اپنے مذہب وقوم کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ آزادی کو مذہب اور قوم کی وجہ سے ڈھونڈتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مذہب برباد ہوجائے اور مسلمان فنا ہوجائیں تو ایسی آزادی سے کیا فائدہ"

چونکہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں اور ان کی اکثریت بھی غیر معمولی ہے اور تین اور ایک کی نسبت ہے اور ان کی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے یہی فرمارہے ہیں کہ:۔

"یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی فرقہ کی سرزمین نہیں ہے۔ یہاں جو راج قائم ہوگا وہ ہندو راج ہوگا۔ مجھے کئی کروڑ ہندو رضاکاروں کی ضرورت ہے" (دیکھو خطبہ صدارت ڈاکٹر مونجے در سندھ)۔

جو مظالم آئے دن و قاتر میں، شہروں میں اور ریاستوں میں کئے جا رہے ہیں اور جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح جناب "ہندو دیوتا" گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا ہے، ان کی بناء پر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن کے ساتھ متحدہ قومیت کی توقع نہیں کر سکتے،

بلاشبہ متحدہ قومیت عمدہ اور اعلیٰ چیز ہے اور حصول آزادی کے لئے کارآمد نسخہ ہے مگر افسوس کہ ہندوانی اکثریت نہایت تنگدل ہے اور پھر ہم سے بدرجہا منظم اور تعلیم یافتہ ہے۔ تعصب اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے پھر اقلیتیں بالخصوص مسلم اقلیت کس طرح مطمئن ہو سکتی ہے؟

متحدہ قومیت کے راگ الاپے گئے مسلمانوں کو اس طرف کھینچا گیا مگر ابنائے وطن نے کوئی بھی ثبوت رواداری اور متحدہ قومیت کا دیا ہے؟

میرے بزرگ! سیاست محض فلسفی تخیل کا نام نہیں۔ اس کے لئے تاریخ اور واقعات از حد ضروری ہیں ہم اور ہمارے جیسے سینکڑوں صاحب رائے اور ہمدردان وطن کو چند برسوں کے واقعات نے نہایت واضح مگر رنجیدہ سبق دیا ہے۔ ہمارے برادران وطن کسی انصاف اور عدالت کو مسلم اقلیت کے لئے کہیں بھی جائز نہیں رکھتے۔ ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں واقعات کالشمس فی رابعۃ النھار۔ میدان ظہور میں آچکے ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اب پھر جان بوجھ کر ہم اپنے آپ کو اور قوم کو غار میں ڈھکیلیں،

مَنْ جَرَّبَ الْمُجَرَّبَ حَلَّتْ بِهِ النَّدَامَةُ

انہیں امور نے مسلمان رہنماؤں کو ۱۹۲۷ء میں دہلی میں مجبور کیا تھا۔ کہ مسلم اقلیت اپنے فرقہ وارانہ انتخاب کو کسی طرح نہیں چھوڑ سکتی، جب تک کہ اس کو اپنی حفاظت کی ذمہ داری نہ دی جائے اور وہ امور یہ ہیں:۔

(۱) نشستیں حسب مردم شماری ہوں۔ (۲) سندھ علیحدہ صوبہ ہو۔ (۳) سرحد اور بلوچستان کو اصلاحات ملیں۔ (۴) اگر کوئی اقلیت اپنے ¾ ممبروں سے اس امر کا ثبوت دیدے کہ فلاں رزولیوشن پر غور و خوض نہ ہو سکے گا۔ (۵) مذہبی امور میں ہر قوم آزاد رہے گی وغیرہ وغیرہ۔

ان شرائط پر ہی مخلوط انتخاب قبول کیا گیا اور مسلمان رہنماؤں نے انہیں کی بنا پر اپنی وطنیت کا ثبوت دیکر کانگریس کمیٹی کے ممبروں کو قائل معقول کیا تھا، تمام ممبران مسلم لیگ اور گورنمنٹی مسلم اسکو قبول نہیں کرتے تھے۔ بالآخر اس کو کانگریس، مدراس آل پارٹیز دہلی منعقدہ فروری ۱۹۲۸ء نے قبول کر لیا، مگر مہا سبھا اور اسکے ہمنواؤں کو یہ تجویز ہمالیہ سے بھی زیادہ گراں قدر صرف اسلئے معلوم ہوئی کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہندو کسی جگہ بھی مسلم اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے جائیں۔ اور اس لئے اگر ایسا ہو تو ہندو اکثریت بے دست و پا ہو جائے گی اور مسلم اقلیت پر اپنے مستبدانہ اور جابرانہ احکام بھی جاری نہ کر سکے گی۔ ورنہ ایسا ہی جواب اس کو بنگال، پنجاب اور سندھ وغیرہ میں مسلم اکثریت کی طرف سے برداشت کرنا پڑیگا۔ اس لئے مہا سبھا نے ہر جگہ مخالفت کی سکھوں کو اپنے ساتھ لیا اور اس میں طرح طرح کے روڑے اٹکائے۔ کانگریسی ممبر بجائے اس کے کہ مہا سبھا اور سکھ لیگ کو سمجھا سمجھا کر منصفانہ تجویز لاتے اور اپنے اثر و قوت سے انکی قوت کو تہ و بالا کرتے انہوں نے یہ کیا کہ مسلمانوں ہی کو دبایا جائے اور ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر ان کو مفلوج و بیکار بنا دیا جائے۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں میں چند سمجھدار ہستیاں ہمیشہ کی طرح ان کی ہمنوا ہو گئیں اور مسلمانوں کے ٹکڑے کرنے کی تجویزوں اور تدبیروں کے ساتھ اپنے ابنائے وطن کے ساتھ میدان میں آگئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے مخلوط انتخاب قبول کرنے سے حالانکہ وہ مشروط تھا فائدہ اٹھایا گیا۔ اور قبل از تحقیق اعلان کر دیا گیا کہ مسلمانوں نے مخلوط انتخاب قبول کر لیا ہے اب نشستوں کے تعین کو بھی اٹھا دو۔ اور اس حیلہ سے اٹھا دو کہ اکثریت کے سے

کسی جگہ نشستیں متعین نہ رہیں؛

مسلمانوں کے لئے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے مخلوط انتخاب ہی میں خطرہ تھا۔ یعنی ہندو اثرات کی بنا پر ایسے بس بھرے مسلمان منتخب ہوں۔ جو بے دین۔ ایمان فروش اور ہندو پرست ہوں۔ صورت ظاہر میں مسلمان ہوں۔ اور باطن میں ہندو ہوں۔ ان کی تعلیمیافتہ طبقوں میں کثرت ہے۔ کسی اسلامی مفاد کی امید کی جاسکتی ہے! ہرگز نہیں اب جبکہ نشستیں بھی اُٹھ گئیں، تب تو مسلمانوں کا کسی بھی صوبہ میں اپنی شمار کے موافق ان نشستوں کا حاصل ہونا ممکن نہیں ہوگا؛

نتیجہ بالآخر یہی ہوگا جو معمولی سے دباؤ اور تھوڑے سے لالچ میں جو زمینداری ساہوکاری، مہاجنی، آڑہت وغیرہ کی وجہ سے ہر مسلمان پر پڑنے والا ہے کھلے بندوں ہندوؤں کے لئے مسلمان ووٹ دیں گے اور مسلم اکثریت اقلیت میں تبدیل ہوجائے گی مگر اس کا نقصان نہ صرف بنگال یا پنجاب کو اُٹھانا پڑے گا۔ بلکہ دوسرے صوبوں کی مسلم اقلیت کو بھی اس کا زہریلا خمیازہ اُٹھانا پڑے گا۔ ان کی قومی وقعت اور قوت اکثریت کی نظروں میں باقی نہیں رہیگی۔

مسلمان ہر طرح ظلم واستبداد کے شکار بنائے جائیں گے۔ لہذا پنجاب اور بنگال کی بھی تھوڑی سی اکثریت باقی نہ رکھی گئی تو تمام ہندوستان میں مسلم اقلیت کی حفاظت کی کوئی صورت نہیں۔ اس لئے تمام مسلمانوں کو اس کے خلاف آواز اُٹھانا ضروری ہے اور صاف کہدینا چاہئے کہ اگر تناسب آبادی کے لحاظ سے نشستیں محفوظ نہیں کرائی جاتیں۔ اور صوبوں کو آزاد حکومت نہیں دیجاتی اور صوبہ سندھ علیحدہ نہیں کیا جاتا تو ہم فرقہ وارانہ انتخاب کو نہیں چھوڑ سکتے جیسے پنڈت موتی لال نہرو نے صوبہ سندھ کی علیحدگی کے خلاف بمبئی کونسل میں محمد حنان بلوچ کے رزلیوشن پر تمام ممبروں کو آمادہ کیا ہے اور کہا ہے کہ:۔

یہ امر مختلف شروط سے مشروط ہے، اس وقت اس کا ذکر کرنا جب کہ شروط متحقق نہیں ہیں قابل توجہ نہیں سمجھتا اس لئے تمام ممبروں کو نامنظور کردینا چاہئے؛

اسی طرح مخلوط انتخاب بھی کسی طرح اس وقت تک میدان میں نہ آنا چاہیے جب تک شروط متحقق نہ ہوں۔

الحاصل ہم فرقہ وارانہ انتخاب اور تعین نشست سے ہرگز ہرگز دست بردار نہیں اور نہ ہوں گے اگر متفقہ بنانی ہے تو جو رزولیوشن ۱۹۲۷ء میں دہلی اور بمبئی کانگریس اور جمعیۃ العلماء پشاور وغیرہ میں پاس ہوا ہے اس کو بعینہ پاس کیا جائے ورنہ تمام کارروائی بے سود ہے یہ آواز اٹھائی جائے اور تمام ہم نوایان نہرو رپورٹ کو ترمیم کے لئے آمادہ کیا جائے،

ہم اس وقت تک تعین نشست کے حسب آبادی طالب ہیں جب تک کہ اکثریت متحدہ قومیت کا اطمینان نہ کرادے۔ جب حالت قابل اطمینان ہوجائے گی اور سب کا اطمینان اس امر پر متفق ہوگا کہ فرقہ وارانہ نشستیں بالکل اٹھادی جاویں تو ہم ایک برس کی قید لگائیں گے ورنہ دس برس کی، امید ہے کہ آنجناب میری اس عاجزانہ عرض پر غور فرمائیں گے "

اب ۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ء کو رپورٹ پر بحث کرنے کے لئے ایک آل پارٹیز کنونشن طلب کیا گیا،

لیگ کو بھی ایک دعوت نامہ آیا تھا لیکن اس نے پہلے تو نمایندگی سے اجتناب کیا مگر اس کے سالانہ اجلاس میں جو اسی زمانہ میں بمقام کلکتہ ہورہا تھا مسٹر چھاگلا کی تجویز پر ۲۲ نمایندے کنونشن میں شرکت کے لئے منتخب کئے گئے جن میں مسٹر محمد علی جناح، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر کچلو، مسٹر یعقوب حسن، تصدق احمد خاں شیروانی غازی عبدالرحمن اور عبداللہ بریلوی بھی تھے،

کنونشن کا جلسہ ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا اور انہوں نے اپنی تقریر صدارت میں نہرو رپورٹ کی زبردست تائید کی اقلیتوں کے متعلق کہا کہ۔

جو حقوق رپورٹ میں دئے گئے ہیں وہ اس سے زیادہ ٹھوس اور اصلی ہیں جو لیگ آف نیشن (مجلس اقوام) نے یورپ کی جدید ریاستوں میں

نسلی اقلیتوں کو دیتے ہیں۔

اقلیت کا صحیح تحفظ مجلس اقوام کی تعریف کے مطابق اکثریت کی خیراندیشی پر ہے ان مراعات کا اقلیت کو اکثریت سے حاصل کرنا حب وطن، جذبہ ملکی اور ملک کی بہبودی میں اپنے کو وقف کر دینے پر مبنی ہوتا ہے۔ قانونی تحفظا نااہلیت کی بنا پر ہوتے ہیں اور اقلیت کو جتنے تحفظات دیئے جائیں گے اُتنے ہی رد و اور طلب کرے گی اور آزادانہ مقابلہ کی روح فنا ہو جائے گی کیوں کہ قانونی مراعات خیراتی ہوتی ہیں،

وہ ذہنیت سمجھ میں نہیں آتی کہ مسلمان کیوں کر اس کو موت و زیست کا سوال سمجھتے ہیں"

مسلم لیگ کے مطالبات پر بحث کے لئے ایک کمیٹی بنادی گئی جس میں ان پر بحث ہوئی مگر نتیجہ میں وہ مسترد کر دیئے گئے۔ اس کے بعد مسٹر جناح نے کنونشن کے اجلاس میں ان کو ایک مدلل تقریر میں پیش کیا اور ہر ایک مسئلہ کی کافی وضاحت کی، ڈاکٹر محمد عالم (لاہور) نے اس کی تائید کی۔ اس پر کچھ بحثیں ہوئیں اور اعتراض ہوئے مسٹر جناح نے ان کے متعلق ایک جواب دیا۔ لبرل فیڈریشن کے نمائندہ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے غیر جانب دارانہ رویہ رکھا مگر نہرو رپورٹ کی تائید کی البتہ مسلمانوں کے مطالبات کی نسبت خاموش رہے۔ سکھوں نے فرقہ وارانہ تجاویز کو قطعی مسترد کر دیا ہندو مہاسبھا کے نمائندوں نے صاف طور پر کہہ دیا کہ رپورٹ میں سے ایک کامہ (,) بھی کم ہوا تو وہ اس کی تائید سے دست بردار ہو جائیں گے غرض اس کوشش کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا اور مسلمانوں کے مطالبات سے قطعیۃً بے اعتنائی کی گئی۔

مسٹر چھاگلا نے کنونشن کے رویہ کے متعلق ۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو جو بیان پریس کو دیا اس میں کہا کہ:۔

کنونشن کے اجلاس کے سامنے لیگ کی نمائندگی اس لئے کی گئی تھی کہ مسلمان چند ضروری ترمیمات کے بعد نہرو رپورٹ کو منظور کر سکیں گے میں نہایت افسوس

ساتھ اس امر کا اعادہ کرتا ہوں کہ کنونشن کو مسلم مطالبات پر نہایت فراخدلی سے
برنا چاہیئے تھا بجائے اس کے وہ ہندو مہاسبھا کے زیر اثر اور اس کی دھمکی میں
یہ صورت اختیار کرتا۔ میں یہ امر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ کے نمائندوں
اکثریت جو کنونشن کے اجلاس میں شریک ہوئی تھی اور جنہوں نے مسلمانوں کے
مطالبات کو پیش کیا تھا نہرو رپورٹ کے حامیوں میں سے تھے اور یہ وہ لوگ
جنہوں نے نہ صرف اپنی ملت کے ساتھ جنگ کی بلکہ اپنی جماعت (مسلم لیگ)
عن نہرو رپورٹ کی تائید کرنے کے سلسلے میں بُرائی حاصل کی۔ اگر کنونشن ان
منتخب نمائندوں کے ساتھ کسی امر پر گفتگو کرنے سے قاصر ہے تو سمجھنا چاہیئے
ہندوستان کے کسی مسلمان سے بھی فیصلہ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا
ان ۲۳ نمائندوں کو فرقہ پرست سمجھ کر ان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا گیا تو
لوکہ ہندوستان میں ایک بھی مسلم قوم پرور موجود نہیں ہے۔

جس طرح مسلم لیگ نے شفیع سکشن کو علیحدہ کر دیا اور جس طرح اس نے
اس تجویز کو جو کہ علی برادران نے تیار کی تھی رد کر دیا یا آل پارٹیز کانفرنس
اپنے نمائندوں کو بھیجنے سے انکار کر دیا اسی طرح کنونشن کو بھی چاہیئے
بہادری کے ساتھ مونجے اور جیکار کے ساتھ یہ عملدر آمد کرتا جو اجلاس کنونشن
لحظہ بہ لحظہ دھمکی دے رہے تھے کہ وہ اجلاس چھوڑ کر چلے جاویں گے۔"

مولانا محمد علی نے جواب ہندو مسلم اتحاد کے بڑے مخالف اور فرقہ پرور سمجھے
لگے تھے اپنے اخبار ہمدرد میں حسب ذیل بیان شائع کیا کہ:۔

دیار غیر سے زیادہ خود اپنے وطن میں غریب الوطن ہوں جن سے آج اپنی
ر رہا ہوں اپنی تعریف میں ہزاروں قصیدے بھی سُن چکا ہوں ہمارے قید
ہی ہندو مہاسبھا بہار اسٹر نے مہاتما گاندھی اور عدم تعاون کے خلاف
وت بلند کیا۔ خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹی میٹم دے چکنے کے بعد
لی میں وہ روش اختیار کی جسے ملک نے ہتھیار ڈالدینے کے مرادف سمجھا۔

اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کر دیے گئے[۲۳۴] ان کے قید ہونے کے بعد پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس آزاد ہوئے اور بجائے سول نافرمانی کرنے کے جسکا یا ڈش بجیر اب کلکتہ میں نام لیا گیا ہے گیا میں سوراج پارٹی کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا پھر لطف یہ کہ ہندو مہا سبھا نے شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں شروع کیں جنہوں نے اس مذہبی تعصبات کی آگ کو پھر بھڑکا دیا جنہیں ہم ٹھنڈا کر چکے تھے اور اس کے جواب میں مسلمانان پنجاب کے اسی عنصر نے تبلیغ و تنظیم کے نام سے زبانی جمع خرچ دکھانا شروع کر دیا جو آج وطن پرستی اور ملت شکنی کا ڈھول بجا رہا ہے نہ ہم نے ڈاکٹر مونجے مسٹر اسینے اور مسٹر کیلکر کی طرح مہاتما گاندھی کے خلاف اس بغاوت میں حصہ لیا تھا جو بالآخر پنڈت موتی لال کے خلاف بھی جوابی تعاون کے لاجواب نام سے ظاہر ہوئی نہ ہم نے گیا میں اس تحریک کے خلاف پنڈت موتی لال اور ان کے سوراجی ساتھیوں کی طرح علم بغاوت بلند کر کے حصہ لیا نہ پنڈت مدن موہن مالوی اور سوامی شردھانند کی طرح ہندو مہاسبھا کی قائم کردہ سنگھٹن اور شدھی کی تحریکوں میں حصہ لیا اور نہ ڈاکٹر کچلو اور ان کے رفقاء کی طرح تبلیغ و تنظیم کے نام سے اپنا ڈھنڈورا پیٹا۔ آج بھی حضرات کلکتہ کی تماشا گاہ میں اپنا سوانگ بھر رہے ہیں ؎

پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے ساتھیوں کو کونسلوں اور اسمبلی کی شرکت نے جو کچھ سوراج دلوایا وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس شرکت میں پنڈت جی کو جو آج کانگریس کے صدر ہیں، اتنا اصرار تھا کہ انھوں نے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر کانگریس نے اس شرکت کی اجازت نہ دی تو میں کانگریس کے گرداگرد دو سو میل کے احاطہ میں بھی قدم نہ رکھوں گا۔ میں نے اس خیال سے طوعاً وکرہاً اپنی پارٹی سے آج کے خداوند کانگریس و کنونشن کو اجازت دلوائی کہ کہیں یہ دوہ جیل سے نکلکر مہاتما گاندھی مجھ سے شکایت نہ کریں کہ تم نے کانگریس سے اتنی بڑی اقلیت کو کیوں نکلوا دیا ورنہ دہلی اور کوکناڈا میں موتی لال جی کو شکست فاش نصیب ہوتی۔

غرض نہرو رپورٹ کو مسلمانوں نے اپنے لئے سیاسی موت کا جام زہر تصور کیا تمام صوبوں میں احتجاج و ناراضی کے بڑے بڑے جلسے منعقد ہوئے مسلم سیاسئین نے کانگریس اور کنونشن سے مایوس ہو کر ۳۱ ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو دہلی میں ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد کی صوبوں اور مرکزی کونسلوں کے علاوہ مسلم لیگ کے شفیع گروپ خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء کے سرآوردہ زعما وارکان شریک ہوئے صدارت کے لئے ہز ہائنس سر آغا خاں کا انتخاب ہوا۔ نہایت غور وخوض اور اتحاد و سنجیدگی کے ساتھ اس کانفرنس نے ایک مفصل تجویز مرتب کی جسکو سر محمد شفیع نے پیش کیا اور شفیع داؤدی ڈاکٹر سر اقبال سر محمد یعقوب مفتی کفایت اللہ اور مولانا محمد علی اور دیگر اصحاب نے تائید کی یہ تجویز اصولاً مسلم لیگ کی قرارداد کلکتہ پر مبنی تھی۔

مفتی صاحب نے تائیدی تقریر میں فرمایا کہ:۔

"یہ رزولیوشن ایک ایسے جلسہ کی طرف سے ہے جو مسلم قومیت کے حقوق کی حفاظت کا ایک نمائندہ جلسہ ہے اس میں ہر خیال اور ہر طبقہ کے مسلمان شریک ہیں اب کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے نہرو رپورٹ کو تسلیم کیا ہے اگر کوئی شخص ایسا کہے گا تو اس کا کہنا غلط ہوگا اور یہ طرز عمل ایسا ہی ہوگا جس طرح کوئی شخص آفتاب پر خاک ڈالنے کی سعی و کوشش کرے، میں جمیعۃ العلماء ہند کی طرف سے اس تجویز کی تائید کرتا ہوں"

لیکن اس کے بعد ہی کانگریس نے بھی یہ رزولیوشن پاس کر دیا کہ:۔

"موجودہ حالات کے مدنظر کانگریس کنونشن کے پاس کردہ دستور اساسی کو قابل قبول سمجھتی ہے۔ بشرطیکہ ۳۱ ر دسمبر ۱۹۲۹ء تک پارلیمنٹ اس کو منظور کرلے ورنہ اس تاریخ سے کانگریس پر امن ترک موالات شروع کر دے گی اور لوگوں کو ٹیکس ادا نہ کرنے کا مشورہ دے گی"

مسلم لیگ نے آل انڈیا پارٹیز کانفرنس کے طریق کار اور مطامح نظر کو غور کے ساتھ دیکھا اور جب تمام کوشش و محنت رائیگاں ہو گئی اور نہرو رپورٹ کے تمام

مراحل گذر چکے اور ہر مرحلہ میں مہا سبھائی ذہنیت سے مقابلہ رہا تو بالآخر وہ بھی آزاد ہو گئی کہ آیندہ دستور میں آئینی تغیرات کے لئے ایسے اصول بنائے جو مناسب سمجھے، اب یہ کوشش ہوئی کہ مسلم کانفرنس اور شفیع گروپ میں جو لیگ سے الگ تھے اتحاد ہو جائے اور تمام جماعتوں کے اختلافات دور کر دئے جائیں۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۹ء میں بمقام دہلی لیگ کونسل کا جو اجلاس ہونے والا تھا اس موقع کے لئے موزوں تصور کیا گیا نہرو رپورٹ کے ممتاز حمایتی مسلمانوں نے بھی پوری کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ اپنے ساتھیوں کو کونسل کا ممبر کیا جائے اور نہرو رپورٹ مسلمانوں پر مسلط کر دی جائے حکیم جمیل خاں نے (جو اس وقت علیل تھے) سب لوگوں کو اپنے یہاں مدعو کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ باہمی اتحاد و صلح ہو جائے مسٹر جناح اور دیگر ممتاز اصحاب ان کے یہاں گئے ادہر اجلاس کے لئے نہرو رپورٹ کے حامی جمع ہو گئے جن کی پوری کوشش تھی کہ ہر جائز و ناجائز تدابیر سے اس کو مسلم لیگ میں پاس کرا لیا جائے، چنانچہ مسٹر جناح صدر مستقل کا انتظار کئے بغیر یہ تحریک مسٹر یوسف امام و بہ تائید مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی ڈاکٹر عالم کو صدارت کے لئے منتخب کر لیا گیا اور انہوں نے فوراً غازی عبدالرحمٰن کو نہرو رپورٹ کی حمایت کا رزولیوشن پیش کرنے کے لئے حکم دیا اس پر مجمع میں ہیجان و غصہ پیدا ہوا لیکن انہوں نے اس شور میں ہی رزولیوشن کے پاس ہونے کا اعلان کر کے میٹنگ کو ملتوی کر دیا مگر عین اسی وقت مسٹر جناح وہاں پہونچ گئے اور ان کے پہونچتے ہی مجمع پر سکوت چھا گیا اور قانوناً اجلاس کی کارروائی کالعدم قرار دی گئی۔ اس وقت مسلمان مختلف جماعتوں میں منقسم تھے۔ مسٹر جناح اور دیگر اصحاب نے سب کو ایک نقطہ نظر پر متحد کرنے کی کوشش کی اور ایک حد تک کامیابی ہوئی۔ ۳۰ و ۳۱ مارچ کو پھر جلسہ ہوا اور مسٹر جناح نے ایک فارمولا مرتب کر کے پیش کیا اور اپنا مفصل بیان بھی شایع کر دیا بالآخر یہی فارمولا ۱۴ نکات کے نام سے مشہور ہوا جو حسب ذیل ہے:-

"ہر گاہ کہ آل پارٹیز کانفرنس کے طلب کرنے اور کرسمس ہفتہ دسمبر ۱۹۲۸ء

میں کلکتہ نیشنل کانونیشن منعقد کرنے کا اصلی مقصد یہ تھا کہ تمام جماعتیں اور ملتیں باہمی سمجھوتے اور اتفاق سے ایک ایسی متفقہ اسکیم دستور اساسی کی تیار کریں جس کو ملک کی اہم ترین سیاسی مجالس قبول کرلیں اور جس کو ایک نیشنل پیکٹ (میثاق قومی) کہا جاسکے،

اور ہرگاہ کہ نہرو رپورٹ کو کانگریس نے صرف ایک سال یعنی ۳۱، دسمبر ۱۹۲۹ء تک کے لئے قبول کیا تھا کہ اگر برطانوی پارلیمنٹ نے اس کو قبول نہیں کیا تو پھر کانگریس اس کو زائد المیعاد قرار دیگی اور کامل آزادی سول نافرمانی اور عدم ادائے ٹیکس کی تحریکات کو جاری کرے گی،

اور ہرگاہ کہ ہندو مہاسبھا کی روش یہ ہے کہ اس نے کلکتہ کنونیشن میں یہ الٹی میٹم دیدیا تھا کہ اگر نہرو رپورٹ میں بین الملی معاملات کے متعلق ایک کاما یا ایک شوشہ یا نقطہ کی بھی تبدیلی کی گئی تو وہ اس کی تائید چھوڑ کر مخالفت شروع کردے گی۔

اور ہرگاہ کہ نیشنل لبرل فیڈریشن کے ڈیلیگیٹوں نے کلکتہ کنونیشن میں بین الملی معاملات میں غیر جانب داری اور بے تعلقی کی پوزیشن اختیار کی تھی،

اور ہرگاہ کہ سکھ لیگ نے نہرو رپورٹ سے اتفاق کرنے سے انکار کردیا تھا،

اور ہرگاہ کہ غیر برہمن پارٹی اور پسماندہ طبقات نے نہرو رپورٹ کو بالکل مسترد کردیا ہے،

اور ہرگاہ کہ کلکتہ کنونیشن میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نمائندوں نے جو معقول ترین اور معتدل ترین تجاویز نہرو رپورٹ کی ترمیم کے بارے میں پیش کیں ان کو آناً فاناً بلا غور کئے ہوئے رد کردیا گیا۔ لہٰذا آل انڈیا مسلم لیگ نہرو رپورٹ کو قبول نہیں کرسکتی،

آل انڈیا مسلم لیگ کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہونچی ہے کہ جب تک مندرجہ ذیل اصول اساسی کو شامل نہیں کیا جائے گا کوئی دستور ہند مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا،

(۱) نکتہ اول یہ کہ آیندہ دستور ہند کی شکل فیڈرل (وفاقی) ہوگی اور اختیارات باقیہ صوبجات کو حاصل ہوں گے،

(۲) نکتہ دوم یہ کہ صوبوں کو کامل صوبجاتی خود مختاری حاصل ہوگی اور تمام صوبوں کی خود مختاریت میں کامل مساوات اور برابری ہوگی یعنی تمام صوبوں کو یکساں اختیارات حاصل ہوں گے؛

(۳) نکتہ سویم یہ ہے کہ ملک کی تمام قانون ساز مجالس کی تعمیر اس معین اصول پر ہوگی کہ اقلیات کو ہر صوبہ میں کافی اور موثر نیابت حاصل ہو لیکن کسی اکثریت والی قوم کو گھٹا کر اقلیت یا مساوات کی پوزیشن میں نہ کر دیا جائے۔

(۴) نکتہ چہارم یہ کہ مرکزی فیڈرل قانون ساز مجلس میں مسلمانوں کی نیابت ⅓ (ایک تہائی) سے کم نہ ہو؛

(۵) نکتہ پنجم یہ کہ فرقہ وار گروپوں کی نمایندگی ونیابت بطریقہ جداگانہ انتخاب ہوگی جس طرح اب ہوتی ہے البتہ ہر قوم مجاز ہوگی کہ اپنی خوشی سے اس مسلمہ قانونی حق سے خود دست بردار ہو جائے۔

(۶) نکتہ ششم یہ کہ کوئی تبدیلی صوبوں کے علاقوں کی تقسیم میں آیندہ ایسی نہیں کی جائے گی جس کا اثر پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریتوں پر پڑے۔

(۷) نکتہ ہفتم یہ کہ تمام ملتوں کے لئے ضمیر کی پوری مذہبی آزادی عقیدہ و یقین، آزادی عبادت ورسوم آزادی تعلیم و تبلیغ آزادی اجتماع و تنظیم کی ضمانت کی جائے۔

(۸) نکتہ ہشتم کہ کوئی بل۔ ریزولیوشن یا تحریک کسی قانون ساز مجلس میں پیش یا پاس نہیں ہو سکتا ہے اگر ¾ (تین چوتھائی) ممبران کسی قوم کے اس کو اپنے قومی مفاد کے لئے مضر قرار دیں؛

(۹) نکتہ نہم یہ کہ سندھ کو بلا شرط صوبہ بمبئی سے علیحدہ کرکے ایک مستقل صوبہ بنا دیا جائے۔

(۱۰) نکتہ دہم یہ کہ صوبہ بلوچستان میں دوسرے تمام صوبوں کی برابر اصلاحات جاری کی جائیں گی؛

(۱۱) یازدہم یہ کہ سلطنت اور دیگر آئینی خود مختار ادارات کی سروسوں میں مسلمانوں کو دیگر ہندوستانیوں کے پہلو بہ پہلو مناسب حصہ صلاحیت وکارکردگی کی ضروریات کا لحاظ

رکھتے ہوئے دیا جائے گا؛

(۱۲) نکتہ دوازدہم یہ کہ دستور اساسی میں ایسے کافی تحفظات رکھے جائیں گے جن کا مقصد اسلامی کلچر تہذیب و تمدّن کی حفاظت و ترقی اور مسلم تعلیم و زبان رسم الخط۔ مذہب پرسنل لا (شریعت) اور اسلامی ادارات خیریہ کی ترقی و حمایت اور اُن کے لئے سلطنت اور دیگر خود مختار ادارت کی گرانٹ سے مناسب حصّہ حاصل کرنا ہو،

(۱۳) نکتہ سیزدہم یہ کہ کوئی کابینہ وزارت خواہ وہ کسی صوبہ کی ہو یا مرکزی حکومت کی ہو مسلمانوں کی کم از کم ایک تہائی نیابت کے بغیر ترتیب نہیں دی جائے گی۔ یعنی ہر وزارت میں ⅓ مسلمان وزیر ضروری ہو،

(۱۴) نکتہ چہاردہم یہ کہ دستور اساسی میں کوئی تبدیلی یا ترمیم نہیں کی جاسکتی ہے تا وقتیکہ انڈین فیڈریشن (وفاق ہند) کے تمام اجزائے ترکیبی تمام یعنی تمام صوبے اور ریاستیں اس کو تسلیم نہ کریں ؛"

اس سال مسلمانوں کی دو نئی جمعیتیں اور قائم ہوئیں پہلی آل انڈیا مسلم کانفرنس جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور دوسری مسلم نیشنلسٹ کانفرنس جس کی تاسیس اجلاس لیگ کے بعد کی گئی ؛

اس کا مقصد یہ تھا کہ **مسلمانوں** میں حبّ الوطنی پیدا کی جائے اور وہ فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر ملک کی سیاسی جد و جہد میں شریک ہوں۔ اکثریت و اقلیت کے مابین ایسے تعلقات پیدا کئے جائیں جن سے اکثریت وسیع القلبی کے ساتھ مسلمان اقلیت کے حقوق تسلیم کرے؛"

اس جماعت کے صدر مولوی ابو الکلام آزاد، سکریٹری تصدق احمد خاں صاحب شیروانی اور خزانچی ڈاکٹر انصاری مقرر ہوئے،

سائمن کمیشن نے ۱۴/ اپریل تک اپنا کام ہندوستان میں ختم کرلیا تھا وسیرائے ہند لارڈ ارون بھی ہمراہ اس مقصد انگلستان گئے کہ ملک معظم کی حکومت سے تبادلۂ خیال کریں اور مختلف الخیال لیڈروں کے خیالات اور نقطہائے نظر کا اظہار کریں، وہ اس مشن کو انجام

دے کر ۲۵ اپریل کو واپس آئے اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ایک طویل اعلان شائع کیا جس میں آئندہ دستوری ترقی کا تذکرہ تھا اور یہ بیان کیا گیا تھا کہ آئینی کمیشن کی رپورٹ کو پارلیمنٹ کی متفقہ کمیٹی میں پیش ہونے سے پہلے ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ملک معظم کی حکومت کے نمایندے برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمایندوں سے تبادلہ خیالات کریں تاکہ آخری تجاویز کے لئے زیادہ سے زیادہ ذرائع تلاش کئے جاسکیں جن کو پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے

آخر میں ملک معظم کی اس خواہش کا بھی اظہار تھا کہ ہندوستان ان کی نوآبادیوں میں ان طریقوں ہی سے مناسب جگہ حاصل کر سکے گا جو ۱۹۱۹ء میں پارلیمنٹ نے وضع کئے تھے اور کہ مجھے ملک معظم کی حکومت کی طرف سے یہ امر صاف طور پر بیان کرنے کے اختیارات دئے گئے ہیں کہ ہندوستان کی دستوری ترقی کا قدرتی نتیجہ حصول درجہ نوآبادیات ہے۔

وائسرائے کے اعلان اور راؤنڈ ٹیبل (گول میز) کانفرنس پر ملک میں عامتہً اظہار اطمینان کیا گیا لبرل فیڈریشن نے نعت سمجھا مسلم لیگ نے اظہار اطمینان کے ساتھ اپنے اصول و مطالبات کا اعادہ کیا مگر کانگریس نے اس امر پر زور دیا کہ حکومت فوراً اپنی پالیسی میں ایسی تبدیلی کرے جس سے عامتہً یہ محسوس ہو کہ آج ہی سے نیا دور شروع ہوا، اس سلسلہ میں ایک مینی فسٹو بھی شائع کیا گیا۔

دسمبر کے آخری ہفتہ میں ویسرائے کے ساتھ سیاسئین کی ملاقات مقرر تھی چنانچہ ۲۳ دسمبر کو یعنی اسی دن اور چند گھنٹہ بعد ہی جب کہ لارڈ ارون کی اسپیشل پر دہلی کے قریب بم پھٹا گاندھی جی موتی لال نہرو وٹھل بھائی پٹیل، ڈاکٹر سر سپرو اور مسٹر جناح سے وائسریگل لاج میں ملاقات ہوئی لارڈ ارون نے نہایت اطمینان خاطر سے ان سیاسئین سے گفتگوئیں کیں۔

گاندھی جی نے درجہ نوآبادیات کے متعلق وائسرائے سے خاص وعدہ لینا چاہا مگر انہوں نے گورنمنٹ کے اس نقطہ نظر کا حوالہ دیتے ہوئے جو اعلان میں ظاہر کیا گیا تھا کسی اور وعدہ سے صاف انکار کر دیا۔ اور کانگریسی زعما غصہ میں بھرے ہوئے واپس آئے۔

اب اسی ہفتہ کے آخر میں بمقام لاہور کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں طے کیا گیا کہ

گول میز کانفرنس میں شرکت سے کوئی فائدہ نہیں، اور آزادی کامل کا اعلان کیا گیا کیوں کہ کلکتہ کانگریس کی قرار داد میں ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک درجہ نوآبادیات دینے کی تاریخ آخری تھی اور اس وقت یہ یکسالہ مہلت ختم ہو رہی تھی۔

یہ بھی تجویز پاس ہوئی کہ آیندہ انتخابات مجالس وضع قوانین میں کوئی حصہ نہ لیا جائے اور موجودہ ممبر بھی مستعفی ہو جائیں۔

اس اجلاس میں نہرو رپورٹ منسوخ کی گئی یعنی باپ کی کمائی بیٹے (جواہر لال صدر) کے ہی ہاتھ سے دریائے راوی میں غرق کر دی گئی۔

نیز آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اختیار دیا گیا کہ وہ جو وقت مناسب سمجھے سول نافرمانی شروع کر دے جس میں ٹیکس کی عدم ادائیگی بھی شامل ہے، فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق طے کیا گیا کہ آزاد ہندوستان صرف خالص قومی لائنوں پر ہی ان مسائل کا حل کر سکتا ہے، اور یہ یقین دلایا گیا کہ اسوقت تک کوئی فرقہ وارانہ فیصلہ تسلیم نہ ہوگا جب تک کہ متعلقہ اقوام اس کو منظور نہ کریں۔

اس اجلاس میں متعدد مسائل پر اتنا شدید اختلاف ہوا کہ ایک اور نئی جماعت قائم ہو گئی جس کی نسبت سوبھاش بابو نے مسٹر سی آر داس کو تار دیا کہ "حالات اور اکثریت کے ظلم نے ہمیں گیا کی طرح کانگریس ڈیموکریٹک پارٹی بنانے کے لئے مجبور کر دیا ہے"، نہرو رپورٹ میں جو کچھ ناقص اور ناکافی مسلم مطالبات تھے لاہور کی قرارداد نے اس کو منسوخ کر کے ان مطالبات کی بنیاد ہی پر ضرب لگا دی ساتھ ہی مختلف پہلوؤں پر اس بات کی کوشش شروع ہوئی کہ کانگریس میں بغیر شرط و تحفظات شرکت کر لی جائے جس میں نیشنلسٹ پارٹی تو اسی کا جزو تھا جمعیت العلما کو اب مائل کرنے کی تدابیر کی گئیں اور اس کے لئے مسلمان ہی آلہ کار تھے۔

یہ جمعیت مسٹر جناح اور آل مسلم پارٹیز کے نظریات و مطالبات سے کلیتہً متفق تھی مگر جون ۱۹۳۰ء میں بمقام امروہہ جو اجلاس ہوا وہاں اور ہی رنگ تھا۔

مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری اب منظر پر آئے، ایک نئی جمعیت "احرار" کے قائد تھے جو گذشتہ سال قائم ہوئی تھی۔ انھوں نے بلا شرط شمولیت کانگریس پر زور دیا، مگر

جب مجلس مضامین میں اس قسم کی قرار داد پیش ہوئی تو مولوی عبدالقدیر بدایونی نے ایک موثر تقریر میں کہا کہ:-

"بہ لحاظ مخصوص طرز عمل کے جو کانگریس نے اختیار کر لیا ہے اگر مجھے اطمینان دلایا جائے کہ کانگریس کی موجودہ روش کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کو اس میں شریک ہونا جائز ہے تو سب سے اوّل میں شریک ہونگا ورنہ میرے نزدیک مسلمانوں کی شرکت حرام ہے۔"

مولانا مرتضےٰ حسن صاحب دیوبندی نے فرمایا کہ:-

"حضرات میرے مرنے کا زمانہ بہت قریب ہے اور جب خدائے برتر کے روبرو مجھ سے سوال ہوگا کہ تو جمعیت العلماء کے اجلاس میں موجود تھا جس میں کروڑوں مسلمانوں کے حقوق بلکہ موت وحیات ہست ونیست کا مسئلہ درپیش تھا تو تو نے اپنا فرض ادا کیا اور ایسے نازک وقت میں تو نے دیانت اور ایمانداری کے ساتھ بلا کسی لوث ودباؤ کے احکام شرع شریعت کو ظاہر کیا تو میں کیا جواب دونگا اس لئے میں علی الاعلان اور صفائی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بحالت موجودہ جیسا کہ اس وقت کانگریس کا رویہ ہے یعنی غیرمسلم اقوام کی کثرت کی وجہ سے کانگریس میں ہماری آواز قطعاً بے اثر ہے مذھب اور مذہبی احکام کو سیاست کے سامنے پوچھا نہیں جاتا بلکہ اس کے تابع قرار دیا جاتا ہے مسلمانوں کا اس میں شریک ہونا قطعاً ناجائز بلکہ حرام ہے۔

یہ شکل اختیار کرنا کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرکے اہل ہنود سے ایک ہندوستانی سلطنت قائم کریں گے تو ایسی جدوجہد حرام ہوگی البتہ ایک شکل ہے کہ اگر مسلمان اس خیال سے جنگ وجدل کے لئے کھڑے ہوں کہ اسلام کو ہندو وانگریز اور جملہ غیر اقوام سے آزاد کرالیں گے تو ایسی آزادی کے لئے اہل ہنود آپ سے کیوں ملیں گے۔"

بعض دیگر علماء اور بالخصوص علامہ محمد ابراہیم سیالکوٹی نے مولانا مرتضےٰ حسن کی مجوزہ

تائید کی۔

مولوی عطاء اللہ بخاری اصل تحریک کے موید تھے طویل بحث کے بعد یہ ترمیم ہوئی کہ مسلمان دائرہ اسلام کے اندر رہ کر اس شرط کے ساتھ کانگریس میں شریک ہوسکتے ہیں کہ ان کے حقوق کی پوری حفاظت کی ضمانت ہو اور جب تک مسلمانوں کے حقوق نہ تسلیم کئے جائیں انفرادی طور پر جو مسلمان چاہے کانگریس میں شریک ہو جائے۔ لیکن من حیث القوم ان کو شریک نہ ہونا چاہیئے۔

بالآخر ۸ گھنٹے کی رد و کد کے بعد ۳۴ بزرگوں کے مجمع میں جو علماء اور غیر علماء دونوں پر مشتمل تھا۔ ترمیم منظور ہو گئی مگر اجلاس عام میں یہ فقرہ کہ انفرادی حیثیت سے مسلمانوں کو اختیار ہے کہ اس میں شریک ہوں یا نہ ہوں نکال دیا گیا اور دائرہ اسلام کے اندر شرکت کے متعلق مبہم الفاظ رکھے گئے اور ایسے گول فقرے قائم کئے کہ ان کا مطلب دونوں فریق نے اپنی اپنی مرضی کے مطابق لے لیا۔

اس اجلاس کے بعد ہی جمیعت کے دو ٹکڑے ہو گئے ایک جمیعت العلماء دہلی اور دوسری جمیعتہ العلماء کانپور اور دونوں کو آل انڈیا کا ادعا رہا۔

ان مختلف پارٹیوں کے جا بجا اور مختلف تاریخوں میں وقتاً فوقتاً اجلاس ہوتے رہے خلافت کانفرنس اب برائے نام تھی لیکن جمیعت العلماء کے جلسے زور شور سے ہوتے رہتے تھے اور اس کو کانگریس کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کا بھی اجلاس منعقد ہوا، اور اس میں کانگریس کی ہمنوائی کی گئی۔

تمام مسلمان سیاسیین اور ادارت تو اپنے مطالبات پر برابر زور دیتے اور ہندوؤں کی طرف سے جو بے اطمینانی و بے اعتمادی تھی اُس کو علی الاعلان ظاہر کرتے ہی رہتے تھے مگر اور بھی حسب ذیل پانچ اقلیتیں طالب حقوق تھیں۔

(۱) سکھ (۲) اچھوت (۳) برطانوی تجار (۴) اینگلو انڈین (۵) دیسی عیسائی۔

ملک معظم قیصر ہند کے اعلان میں بھی تمام اقلیتوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کا یقین دلایا گیا تھا۔ (نوٹ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۴۴ پر)

مسلمانوں کے متعلق سائمن کمیشن کے سامنے بھی جس قدر رپورٹیں پیش ہوئی تھیں ان سب میں فرقہ وارانہ انتخاب کی حمایت کی گئی اور ۱۹۳۰ء میں لارڈ ارون نے حکومت ہند کی طرف سے جو مراسلہ وزیر ہند کو بھیجا اُس میں بھی یہ امر واضح کر دیا تھا کہ یہ رعایت (جداگانہ انتخاب) جو اسوقت مسلمانوں کو حاصل ہے ان کی مرضی کے خلاف نہ واپس لیجا سکتی ہے نہ لینی چاہیئے۔

کانگریس نے آزادی کامل کا جو اعلان کیا تھا اس کی بنا پر ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو یوم آزادی منایا گیا۔ وائسرائے کے سامنے مطالبات پیش کئے گئے اور سول نافرمانی کی دھمکی دی گئی۔

مرکز اور صوبوں کی اسمبلیوں کے متعدد ممبروں نے استعفے دیدیئے اور بعض استعفوں کے بعد پھر امیدوار بنے وسط فروری میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے عدم تشدد کی شرط کے ساتھ سول نافرمانی شروع کئے جانے کا رزولیوشن پاس کر دیا اور اس کے متعلق گاندھی جی نے

نوٹ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۴۴ - (۱) ۱۹۲۱ء میں سکھوں کو جداگانہ نیابت مل گئی تھی اس موقعہ پر بھی بلند آہنگی کے ساتھ اُنہوں نے اپنے مطالبات پیش کئے ان کی آبادی کل پنجاب اور دیسی ریاستوں میں پوری آبادی کا ۱/۱۰ حصہ ہے

(۲) اچھوت ۰۰۰۰۰ ۲۵ ۴ کی تعداد میں ہیں اس سے قبل وہ ہندو قوم میں شامل تھے لیکن تعلیم نے ان میں اپنی ذلت یا ادنیٰ ذات والوں کے مظالم کا احساس پیدا کر دیا اور حکومت کی دستگیری اور اپنی جد وجہد سے انہوں نے پست اقوام کے نام پر تعلیم و سیاسی مراعات حاصل کیں۔ ۱۹۲۱ء سے اسمبلی صوبجاتی کونسلوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں میں لازمی طور پر ان کی نامزدگی ہونے لگی۔

(۳) برطانوی تجار کو ۱۸۹۲ء سے حق نمایندگی حاصل تھا جو بتدریج ترقی کرتا رہا۔

(۴) اینگلو انڈین کی آبادی کم و بیش ایک لاکھ ہوگی مگر اُنھوں نے بھی اپنے لئے نشستیں حاصل کرنے کی کوشش کی۔

(۵) دیسی عیسائی حقیقت میں ہندوؤں کی نیچ ذاتوں کا بڑا حصہ ہے اور تقریباً ساڑھے چار کروڑ آبادی ہے ۱۹۱۹ء میں انکا وجود بطور فرقہ خاص تسلیم کیا گیا۔ صوبہ مدراس میں حلقہ ہائے انتخاب جداگانہ بنائے گئے اور باقی صوبوں اور مرکز میں نامزدگی سے نشستیں محفوظ رکھی گئیں۔

قانون کی خلاف ورزی کی اسکیم بنائی جس کو وہ تنہا سمندر کے کنارے پر نمک بنانے سے شروع کرنا چاہتے تھے،

نیز یہ کہ جہاں نمک کے کارخانے اور ذخیرے ہیں وہاں ان پر قبضہ کیا جائے۔ ۲ر مارچ کو انہوں نے وائسرائے کو ایک طولانی خط لکھا جس میں برطانوی حکومت کو ایک لعنت قرار دے کر اس کے انتظامات و قوانین وغیرہ پر اعتراضات کئے اور اپنی اسکیم کا بھی تذکرہ کر کے ۱۱ر مارچ تک مہلت دی۔ وائسرائے نے جواب میں لکھا کہ وہ ایسا ذریعہ اختیار کر رہے ہیں جو صاف قانون شکنی کا ہے اور جس سے امن عامہ کو خطرہ ہے گاندھی جی نے جواب الجواب میں تحریر کیا کہ میں اس برطانوی قانون کو ذلت سمجھتا ہوں اور اس کو توڑنا ہی اپنا مقدس فرض تصور کرتا ہوں،

اب سول نافرمانی شروع کر دی گئی مگر حکومت بھی مقابلہ کے لئے تیار تھی ۱۲ر مارچ کو گاندھی جی سابرمتی (گجرات) سے ڈنڈی کو روانہ ہوئے جہاں وہ ۵ر اپریل کو پہونچے اور ۶ر اپریل کو سمندر کے کنارے کثیر والنٹیر دں کے ساتھ عملی طور پر نافرمانی شروع کی بالآخر گرفتار ہوئے اور پھر پبلک جلسوں اور مظاہروں میں عدم تشدد برائے بیت تھا تشدد بھی ہوا گولیاں چلیں اور گرفتاریوں اور سزایابیوں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ مسز نائڈو و پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر متعدد زعمائے کانگریس گرفتار ہوئے۔

اس مرتبہ سول نافرمانی کی تحریک میں مسلمان من حیث القوم شریک نہ ہوئے اور نہ پہلے کی طرح وہ ہمہ گیر تھی۔

باب نہم

گول میز کانفرنس کے اعلان کے بعد حکومت نے ہندوستانی نمایندوں کا خود ہی انتخاب کیا برطانوی نمایندوں کے علاوہ بہتر[1] ہندوستانی تھے جن میں سولہ[16] مسلمان[1] اور سولہ ریاستہائے ہند کے اور باقی دیگر اقوام ہند کے تھے، یہ نمایندے اکتوبر ۱۹۳۰ء تک لندن میں جمع ہو گئے۔ ۱۲ر نومبر کو ملک معظم نے کانفرنس کا افتتاح فرمایا اور پھر ۱۲ر نومبر سے مسلسل اجلاس ہوتے رہے، ہندوستانی نمایندوں نے اپنی تقریروں میں درجہ نوآبادیات کا مطالبہ کیا اور اس مطالبہ پر متفقہ زور دیا گیا۔

مسلم نمایندوں میں مولانا محمد علی کی تقریر نہایت دل چسپ، واضح، مملو از حقائق، مدلل اور پرجوش تھی اور یہ ہی ان کی آخری تقریر تھی، جو انہوں نے اپنی جاں ستاں علالت کی حالت میں بہ اجازت صدر کرسی پر بیٹھے ہوئے کی تھی، اس کے دوران میں انہوں نے کہا کہ:-

> "آج جس مقصد وحید کے لئے میں یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنے وطن کو صرف اس صورت میں واپس جانا چاہتا ہوں کہ ارمغانِ آزادی میرے ہاتھ میں ہو ورنہ میں ایک غلام ملک میں واپس نہ جاؤں گا اور اس کی بجائے ایک غیر ملک میں مرنا پسند کروں گا بشرطیکہ وہ آزاد ملک ہو، پس اگر ہندوستان میں تم ہمیں آزادی نہ دوگے تو یہاں میرے لئے ایک قبر تو تمہیں دینی پڑے گی۔"

دیسی ریاستوں کے نمایندوں نے بھی وفاق کی پرزور تائید کی وزیر اعظم نے بھی ایک

---

[1] (۱) ہز ہائنس سر آغا خاں (۲) مولانا محمد علی (۳) مسٹر محمد علی جناح (۴) سر شاہ نواز (۵) نواب سر احمد سعید خاں (۶) راجہ شیر محمد خاں (۷) مولوی فضل الحق (۸) اے۔ کے غزنوی (۹) سر غلام حسین ہدایت اللہ (۱۰) حافظ ہدایت حسین (۱۱) نواب سر عبدالقیوم (۱۲) سر سید سلطان احمد (۱۳) سر میاں محمد شفیع (۱۴) ڈاکٹر شفاعت احمد خاں (۱۵) چودھری ظفر اللہ (۱۶) بیگم شاہنواز

تقریر کی اور پھر مختلف مسائل پر غور کرنے کے بعد رپورٹین پیش کرنے کے لئے آٹھ سب کیٹیاں[۱]
بنادی گئیں اور تمام نمایندوں کو ان میں منقسم کر دیا گیا،

فرقہ وارانہ مسائل میں ہندوستانی سیاسیئین کے پاس مصالحت کا کوئی حل نہ تھا
البتہ باہمی بے اعتمادی موجود تھی مگر مینارٹی سب کیمیٹی کی پہلی ہی نشست میں مسٹر ریمزے
میکڈانلڈ چیرمین نے اس مسئلہ کی اہمیت پر زور دیا کہ:۔

"اقلیتوں کی مصالحت کا سوال ہندوستان کی سیاسی ترقی کے لئے ضروری ہے اور
یہ نظریہ صرف انگریزوں کا ہی نہیں ہے بلکہ ہر روشن دماغ ہندوستانی کا ہے اور یہ ایک
ایسا سوال ہے جو آپس میں ہی طے ہو جانا چاہئیے۔ یہ اچھی بات نہیں کہ آپ ہندوستان کا
ایک دستور وضع کریں اور کسی بیرونی اتھارٹی سے خواہشمند ہوں کہ وہ ایسے ضروری مسئلہ کو طے
کردے کہ جو اس دستور پر کامیابی کے ساتھ عمل پیرا ہونے کی شرط اولین ہو" دسمبر کی میٹنگ
میں اچھوتوں اور دیسی عیسائیوں کے نمایندوں نے فرقہ وارانہ انتخاب و نمایندگی پر سخت
اصرار کیا مسلمانوں کے اقل قلیل مطالبات وہی تھے جو ۱۹۲۹ء میں مرتب کئے گئے تھے
تمام اقلیتوں نے متفقہ طور پر اس امر کو ظاہر کر دیا کہ ہندوستان کے لئے سیلف گورننگ کانسٹیٹیوشن
(دستور حکومت خود اختیاری) صرف اس صورت میں قابل قبول ہے کہ ان کے مدلل
مطالبات مان لئے جاویں جن میں سب سے اہم مطالبہ انتخاب جداگانہ ہے۔

اس مسئلہ پر مسلمان اور دیگر تمام اقلیتوں میں کامل اتفاق تھا اور وزیر اعظم نے بھی ۱۹ار
جنوری ۱۹۳۱ء کو پہلی کانفرنس کے اختتام پر اپنے اعلان میں اس امر کا اظہار کیا کہ:۔

"دستور اساسی کی ترتیب میں ملک معظم کی حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ
اس قسم کی شرائط رکھے جن سے اقلیتوں کے لئے سیاسی نمایندگی کے علاوہ اس

---

[۱] فرنچائز (حق رائے دہی) (۲) فیڈرل اسٹرکچر (ترتیب خاکہ وفاق) (۳) ڈیفنس (جنگی مدافعت) (۴) سروسز (ملازمتیں) (۵) مینارٹیز (اقلیات) (۶) صوبہ سرحد (۷) صوبہ سندھ (۸) صوبہ برما۔ علاوہ کا مقصد ان صوبوں کو جدا جدا صوبے بنا کر مساوی اصلاحات دیا جانا اور مقصد سے برما کو ہندوستان سے جدا کرنا تھا۔

امر کی ضمانت ہو جائے کہ صرف مذہب، نسل، فرقے یا ذات کے اختلاف کی بنا پر کوئی شخص حقوقِ مدنیت سے محروم نہ کیا جائے گا۔

ملک معظم کی حکومت کے نزدیک مختلف فرقوں کا یہ فرض ہے کہ جو مسائل اقلیتوں کی سب کمیٹی میں پیش ہوئے تھے اگر طے نہوں تو آپس میں کوئی تصفیہ کرلیں۔ اس گفت و شنید کے سلسلہ میں جو اس کے بعد ہوگی یہ تصفیہ ہو جانا چاہیئے اور حکومت اس معاملہ میں جو کچھ مدد کر سکتی ہے کرتی رہے گی کیونکہ اس کو نہ صرف اس کی فکر ہے کہ نیا دستور اساسی جلد از جلد طے ہو جائے بلکہ اس بات کی بھی ہے کہ اس کا آغاز تمام فرقوں کی رضامندی و اعتماد کے ساتھ ہو۔"

۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو یہ سب رپورٹیں جو سب کمیٹیوں نے مرتب کی تھیں کانفرنس میں غور و خوض کے لئے پیش کر دی گئیں۔

وزیر اعظم نے اس کانفرنس میں واضح طور پر بیان دیا کہ **فیڈرل** بنا پر مرکزی لیجسلیچر بنائی جاوے گی جس میں تمام صوبجات اور ریاستوں کے نمایندے شامل ہوں گے حکومت اگزکٹو کی اس لیجسلیچر کے سامنے ذمہ داری تسلیم کرے گی صرف ڈیفنس اور معاملات خارجہ ہی محفوظ رکھے جائیں گے۔ ملک کے امن و امان قائم رکھنے کی خاطر گورنر جنرل کو خاص اختیارات دیئے جائیں گے ...... ملک معظم کی حکومت کا خیال ہے کہ ہندوستان کی حکومت کی ذمہ داری صوبجاتی اور مرکزی مجالس آئین ساز پر ڈال دی جائے لیکن مقررہ عرصہ تک صرف وہ چند اختیارات محفوظ رکھے جائیں گے جن سے خاص حالات پر قابو پایا جاسکے اور جن سے اقلیتوں کی سیاسی حقوق کی حفاظت کی جاسکے۔ اس قسم کے آئینی تحفظات کی صورت میں بھی ملک معظم کی حکومت کا یہ پہلا فرض ہوگا کہ وہ دیکھے کہ خاص اختیارات ہندوستان کے نئے دستور اساسی سے مکمل ذمہ دارانہ حکومت میں مداخلت تو نہیں کرتے"

وزیر اعظم نے بھی یہ اعلان کیا کہ "اگر ان لوگوں کی طرف سے جو اس وقت سول

نافرمانی میں مصروف ہیں وائسرائے کی اپیل کا جواب دیا گیا تو انہیں بھی شمولیت کی دعوت دی جائے گی ۔

اگرچہ سول نافرمانی کی دارو گیر جاری تھی لیکن وزیر اعظم کی تقریر کے بعد جو گول میز کانفرنس میں ہوئی جنوری ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی کی غیر مشروط رہائی عمل میں آئی اور حکومت کے ساتھ اُن کے مذکرات و مراسلت کا آغاز ہو گیا۔ فروری کے پہلے ہفتہ میں گول میز کانفرنس کے نمایندے بھی واپس آگئے اور اُنہوں نے ایک اپیل شائع کی کہ اسکیم کے خاکہ اور اُس کی تفصیلات میں چند مفید اور قابل توجہ امور ہیں اور ہم کو اُمید ہے کہ کانگریس اور دوسری سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اسکیم کو درجہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اشتراک عمل کریں گے۔

ساتھ ہی ڈاکٹر سر سپرو، مسٹر جے کار اور مسٹر شاستری نے گاندھی جی کو مفاہمت اور گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے بہت زیادہ مائل کیا اور بالاخر اعلےٰ حضرت فرماں روائے بھوپال (ادام اللہ اقبالہ) کی کوشش کامیاب ہوئی اور اس تمام گفت و شنید اور مذاکرات و مراسلات کے نتیجہ میں حکومت کی جانب سے ۵ مارچ کو ایک اعلان شائع ہوا جس میں سول نافرمانی کے بند کرنے اور حکومت کے طریق عمل کی وضاحت کی گئی اور دستوری مسائل کے متعلق بیان کیا گیا کہ گول میز کانفرنس میں جو اسکیم تیار کی گئی ہے اس میں فیڈریشن ایک ضروری جزو ہے اور ڈیفنس (مدافعت فوجی) معاملات خارجہ اور مسائل اقلیت کے متعلق حکومت ہند کو تحفظات دینے منظور کئے گئے ہیں۔ نیز یہ کہ کانگریسی نمایندوں کی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے اقدامات کئے جائیں گے، چنانچہ سول نافرمانی بند کردی گئی اور گاندھی جی نے کانگریس کے واحد نمایندہ کی حیثیت سے شرکت قبول کرلی اس دوسرے اجلاس میں برطانوی نمایندوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا مسلمانوں میں سر علی امام مولانا شوکت علی مولانا شفیع داؤدی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال اور بعض دیگر اصحاب کو بھی منتخب کیا گیا۔ پہلے نمایندوں میں سے مولانا محمد علی لندن میں ہی انتقال کر چکے تھے ان جدید نمایندوں کے انتخاب کے وقت کانگریس کی طرف سے ڈاکٹر انصاری کے انتخاب پر بہت زیادہ اور مسلسل زور دیا گیا کیونکہ وہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے روح رواں

تھے اور ان کے متعلق گاندھی جی سے لارڈ ارون زبانی وعدہ کر چکے تھے لیکن مسلمان نمایندوں اور خاص کر مولانا شوکت علی نے زبردست اختلاف کیا اور اب چوں کہ لارڈ ولنگڈن کا دور حکومت (۱۷ اپریل کو) شروع ہوگیا تھا اور انہوں نے گاندھی جی کی اس خواہش کو منظور نہیں کیا۔

قبل ازیں کہ کانگریس کے نمایندے شرکت کے لئے روانہ ہوں اپریل میں مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کا اجلاس بصدارت سر علی امام لکھنؤ میں منعقد ہوا اور اس میں حسب ذیل تجاویز پاس کی گئیں:-

(۱) ایک ایسی دفعہ دستور اساسی میں لازم ہوگی جس کی بناء پر سر باشندہ کا تمدن زبان خط تحریر، تعلیم، مذہبی آزادی، مذہبی اوقاف اور اقتصادی منافع برقرار رہیں گے۔

(۲) حقوق اساسی اور شخصی قوانین دستور اساسی میں اس طور پر مندرج ہو جائیں کہ ان کا پورا تحفظ ہو سکے۔

(۳) ملک کا آئندہ دستور اساسی "وفاقی اصول" پر ہوگا اور ما بقی اختیارات صوبجاتی حکومتوں کو حاصل ہوں گے۔

(۴) کل ملازمتوں کا تقرر ایک پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ ہوگا جو کم از کم معیار قابلیت کو مد نظر رکھکر کسی فرقہ کو اس کے جائز حصہ سے محروم نہ کرے گا اور نیچے طبقوں کی ملازمتوں میں کسی فرقہ کا مکمل درخور جائز نہ رکھے گا۔

(۵) سندھ ایک علیٰحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔

(۶) صوبہ سرحد اور بلوچستان کو ویسا ہی طرز حکومت دیا جائے جیسا کہ دوسرے صوبوں کو ہے۔

(۷) نیشنلسٹ مسلمانوں کا قطعی فیصلہ ہے کہ وفاقی اور صوبجاتی سیاست کے لئے حسب ذیل امور ہی جھگڑوں کو طے کر سکتے ہیں۔

(الف) ہر بالغ کو ووٹ کا حق۔

(ب) مخلوط انتخاب۔

(ج) آبادی کے تناسب سے اقلیتوں کی خالص نشستیں جہاں تیس فی صدی سے کم ہوں اور انکو بقیہ نشستوں کے انتخاب میں حصہ لینے کا حق۔

۸۔ ملک کی فضا کو دیکھتے ہوئے اور خاصکر ایک جماعت کے پروپیگنڈے کا خیال کرتے ہوئے اور دوسری قوموں کے ایک حصہ کا رویہ دیکھ کر امن و امان کی خاطر نیشلسٹ مسلم کانفرنس مخلوط انتخاب اور ہر بالغ کو ووٹ کے حق کی بنا پر گفتگو کرنے کے لئے تیار رہے"

اس ضمن میں ڈاکٹر انصاری نے مسلم تحفظات کے لئے حسب ذیل تشریح کی۔

۱۔ ہندوستان کے آیندہ دستور اساسی میں نمایندگی کی بنیاد حق رائے دہندگی بالغان اور مخلوط انتخاب پر مبنی ہوگی۔

۲۔ (الف) رائے دہندگی بالغان کی حالت میں نشستوں کا تحفظ ان اقلیتوں کے لئے کیا جائے جنکی آبادی ۲۵ فیصدی سے کم ہے۔ یہ تحفظِ نشست تناسب آبادی کے لحاظ سے کیا جائیگا۔ مگر اقلیتوں کو زائد نشستوں کے لئے مقابلہ کرنے کا حق ہوگا۔

(ب) جن صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی ۲۵ فی صدی سے کم ہے اُن میں مسلم نشستیں تناسب آبادی کے لحاظ سے محفوظ کردی جائیں گی۔ اور اُن کو زائد نشستوں کے حاصل کرنے کا بھی حق ہوگا لیکن اگر دوسری اقوام توازن کا مطالبہ کریں تو مسلمانوں کو بھی وہی توازن دیا جائے گا جو انکو آج حاصل ہے۔

(ج) اگر رائے دہندگی بالغان کا اصول قائم نہ ہو یا حق رائے دہندگی ایسا مقرر ہو جس سے تناسب آبادی کے لحاظ سے ووٹروں کی تعداد درج رجسٹر نہ ہو سکے تو پنجاب و بنگال میں مسلم نشستیں اُس وقت تک کے لئے محفوظ رہیں گی جبتک رائے دہندگی بالغان یا ووٹروں کی تعداد تناسب آبادی کے لحاظ سے درج رجسٹر ہو ان صوبوں میں مسلم نمایندگی اس طریقہ سے برقرار رہیگی کہ مسلم اکثریت نہ تو اقلیت میں تبدیل ہو سکے نہ مساوی درجہ پر آسکے۔

۳۔ فیڈرل مجالس مرکزیہ میں مسلمان ممبروں کی تعداد ⅓ ہوگی۔

۴۔ سرکاری ملازمتوں کے لئے ایک پبلک سروس کمیشن مقرر کیا جائیگا جو تقریباً

ہر عہدہ کی معیار قابلیت کو مدِ نظر رکھ کر کریگا - لیکن اس طرح کہ کسی قوم کو اس کے جائز حق سے محروم نہ کیا جائے اور چھوٹی چھوٹی جگہوں پر کسی قوم کو اجارہ نہ حاصل ہو جائے۔

۵ - فیڈرل اور صوبجاتی وزارتوں میں مسلم مفاد کا تحفظ ایک قانون کے ذریعہ سے کیا جائیگا - جسے ہر مجلس قانون ساز کی تمام پارٹیاں منظور کریں گی۔

۶ - سندھ علیحدہ کر کے ایک مستقل صوبہ بنا دیا جائے۔

۷ - صوبہ سرحد و بلوچستان کو ٹھیک وہی اساسی حکومت دیجائے گی جو برطانوی ہند کے دوسرے صوبجات کو حاصل ہونگے۔

۸ - ہندوستان کا آیندہ دستور اساسی فیڈرل (وفاقی) طریقہ کا ہوگا اور صوبجات کو باقی ماندہ اختیارات حاصل ہونگے۔

۹ - (الف) دستور اساسی میں بنیادی حقوق کی ایک دفعہ ایسی ہوگی - جس سے ملک کے تمام باشندوں کے ساتھ زبان، رسم خط، تعلیم، مذہبی پابندی مذہبی حقوق اور اقتصادی مفاد بالکل محفوظ و مامون ہوں۔

(ب) دستور اساسی میں ایسی مخصوص دفعات ہوں گی جس سے ہر شخص کے ذاتی قوانین و بنیادی حقوق کی ضمانت ہو سکے۔

(ج) جہانتک بنیادی حقوق کا سوال ہے اس کے متعلق دستور اساسی میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے گی تا آن کہ ہر مجلس قانون ساز میں ۳/۴ ارکان کی متفقہ اکثریت اس کی حمایت نہ کرے "

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "ہم کسی طرح قبول نہیں کر سکتے کہ پنجاب و بنگال کی مسلم اکثریت مبدل بہ اقلیت ہو جائے یا غیر مسلموں کے مساوی ہو جائے نہ کبھی ہم یہ گوارا کر سکتے ہیں کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں اس کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے - ہم یو - پی اور بہار کے مسلمانوں کو وہی تحفظات دیدینا چاہتے ہیں جو ہندو ان صوبجات میں مانگتے ہیں جہاں وہ اقلیت میں ہیں "

جون ۱۹۳۱ء میں شملہ پر ایک مینی فسٹو (منشور) تیار ہوا جس میں مسلم مطالبات کا

اعادہ اور ہندو مظالم کا سخت الفاظ میں تذکرہ تھا۔ ۵ر جون کو یہ منشور اخبار اسٹیٹسمین میں شائع کرا دیا گیا اور اس کو بحری تار کے ذریعہ ہز ہائنس آغا خاں کے پاس بھی بھیجا گیا لیکن اشاعت کی اطلاع نہیں دی گئی انہوں نے اس کو معتدل کر کے ۱۱ جون کو ٹائمز میں شائع کرا دیا۔ جب یہ منشور دونوں جگہ شائع ہو گیا تو ڈاکٹر انصاری اور دیگر نیشنلسٹ مسلمانوں اور ارکان جمیعت العلماء کے دستخطوں سے جواب شائع ہوا جس میں الزامات کی تردید اور ہندوؤں کے رویۂ کی تعریف کی گئی تھی مگر مسلم کانفرنس میں منشور کی حمایت اور دونوں مخالف جماعتوں کی مذمت اور سر علی امام کے انتخاب کی بھی مخالفت کی گئی اور ان کو مسلم نمایندہ تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا کیوں کہ وہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے ممبر تھے جو کانگریس کی ہی دختر سمجھی جاتی تھی۔

اگست میں دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے گاندھی جی اپنے رفقاء کے ساتھ روانہ ہو گئے جو ۷ ستمبر سے شروع ہونے والی تھی۔

تقریباً ایک سال کے دوران میں فرقہ وارانہ تصفیہ کے لئے پوری کوشش جاری رہی تھی گاندھی جی نے مسلم مطالبات کو صرف اس صورت میں منظور کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ معدودے چند کانگریسی مسلمان ان سے اتفاق کر لیں جو مخلوط انتخاب کے موید تھے مسلمانوں نے ان کانگریسی یا نیشنلسٹ مسلمانوں کو بھی متفق و راضی کرنے کی کوشش کی مگر نتیجہ سے قبل گاندھی جی نے ایک بیان دیدیا کہ مسلمان باہم متفق ہو کر سکھوں کو بھی منا لیں تو مطالبات تسلیم کئے جائیں گے۔ غرض گاندھی جی کے پینترے بدلتے رہنے سے کوئی مصالحت نہ ہو سکی اور جب وہ کانفرنس میں شریک ہوئے تو مختلف مباحثات کے دوران میں انہوں نے اقلیتوں کے مطالبات کی نسبت جو روش اختیار کی اس نے فضا کو بہت زیادہ مکدر کر دیا دیسی عیسائی اور اچھوتوں کے لیڈر نے بھی ان پر بے اعتمادی کا اظہار کیا۔

ان وجوہ سے حالات کی نزاکت بہت بڑھ گئی ایک نازک موقعہ پر مسٹر نائڈو اور سر محمد شفیع کی صلح جویانہ تقریروں نے کچھ سکون پیدا کیا۔

مسٹر نائڈو نے کہا کہ:-

تمہیں کسی اقلیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ مجھے اسوقت وہ نصیحت یاد آتی ہے جو دو سال ہوئے کہ یورپ کے ایک بہت بڑے سیاست داں نے کی تھی کہ:-

"تم کو اپنی اقلیتوں کو خوش رکھنا چاہیئے یاد رکھو کہ تم جب تک اپنی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری نہ کرلو ایک قوم کی تشکیل نہیں کرسکتے۔"

ڈاکٹر سر سپرو اور رائٹ آنریبل سرینواس شاستری نے اس فیصلہ کے لئے تین یا پانچ ممبروں کی ایک کمیٹی قائم کئے جانے کی تجویز پیش کی اور مسٹر گاندھی کے استفسار پر ہزہائنس آغاخاں نے اس کمیٹی پر مسلمانوں کا اتفاق بھی ظاہر کردیا جس سے فیصلہ کی امید پیدا ہوئی۔ لیکن ڈاکٹر مونجے اور پنڈت مالویہ کو تشویش پیدا ہوگئی۔ اور ڈاکٹر مونجے نے بتائید راجہ نریندرناتھ و سردار اجل سنگھ اعلان کردیا کہ جہانتک فرقہ وارانہ مسئلہ کا تعلق ہے ہمکو اعتبار نہیں خود گاندھی جی نے اقلیتوں کی کمیٹی کے آخری اجلاس میں تسلیم کیا کہ اپنی ذات سے تو میں مسلمانوں کو سب کچھ دینے کو تیار ہوں جو وہ چاہتے ہیں اور میں رات کو پچھلے پہر تک ہندوؤں اور سکھوں کو آمادہ کرتا رہا کہ میرا ساتھ دیں مگر مجھے ناکامی ہوئی۔"

ہزہائنس آغاخاں نے مسلمانوں کی طرف سے مسٹر گاندھی کو یہ یقین بھی دلایا کہ وہ ہرصورت میں کانگریس کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ ان کے تحفظ حقوق کی ذمہ داری کی جائے۔"

مسٹر گاندھی نے ذاتی حیثیت سے چودہ نکات اور انتخاب جداگانہ کو بہ ایں شرط منظور کرلیا کہ مسلمان دیگر اقلیتوں کی جداگانہ مخالفت میں کانگریس کی مدد کریں بجز سکھوں کے اور ایسے ہندوؤں کے جو اپنے صوبوں میں اقلیت رکھتے ہوں۔ مگر اس شرط کو ماننے سے انکار کردیا گیا۔ اور اس کو نہایت ذلت آمیز امر تصور کیا کہ وہ ایسی ذلیل شرط پر ان اقلیتوں کی رفاقت ترک کردیں۔ جن کے ساتھ وہ پورا اتفاق اور سمجھوتہ کرچکے ہیں۔"

ان تمام اقلیتوں نے مسٹر گاندھی اور مہاسبھائیوں کے رویہ سے مایوس ہوکر باہمی

معاہدہ کیا اور جب ۱۲ر نومبر ۱۹۳۱ء کو مینارٹی کی آخری نشست ہوئی تو وزیر اعظم نے ایک زوردار تقریر کی جس میں کہا کہ :-

"ہندوستان کے کسی نئے دستور کے لئے سب سے پہلے فرقہ وارانہ حقوق اور اُن کے تحفظ کے مسئلہ کا طے ہونا ضروری ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ آپ بھی اس سے انکار نہ کریں گے کہ بغیر کسی بنیاد کے کوئی قانون بھی وضع نہیں کیا جا سکتا"

اس کے بعد ہز ہائنس آغا خاں نے مینارٹیز پیکٹ پیش کیا جو تمام اقلیتوں کی باہمی مفاہمت سے مرتب ہوا تھا اسکو پیش کرتے ہوئے ہز ہائنس نے کہا کہ :-

"یہ معاہدہ بہت ہی غور و فکر کے بعد اس مشکل اور پیچیدہ مسئلہ کے متعلق طے ہوا ہے اور اسکو سب کا پورا پورا متفقہ راضی نامہ سمجھنا چاہیئے۔ اس معاہدہ کی تمام دفعات ایک دوسرے پر منحصر ہیں اور اگر وہ نامنظور کیا جائے تو کلیتہً اور اگر منظور ہو تو کلیتہً ہونا چاہیئے"

اس پیکٹ کے پیش ہونے کے بعد تمام اقلیتوں کے نمایندوں نے مسلمانوں کا شکریہ ادا کیا مگر اس کے بعد ہندوؤں نے وزیر اعظم سے فیصلہ کی درخواست کی پنڈت مالویہ ڈاکٹر مونجے اور دوسرے ہندو لیڈروں نے انکی خدمت میں متحدہ اپیل کی کہ وہ خود فرقہ وارانہ فیصلہ کر دیں مسٹر گاندھی نے بھی اس کی تائید میں ایک جداگانہ خط لکھا کہ "ہر ایسے فیصلہ کی جس پر متعلقہ پارٹیاں متحد ہو جائیں کانگریس حمایت کرے گی" لیکن مسلمانوں نے اس درخواست پر اس بنا پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ ایسے اندرونی فرقہ وارانہ مسئلوں کا فیصلہ کرے جو کہ باہمی سمجھوتہ سے فیصل نہ ہو سکیں اور دوسری اقتدارتی

(**نوٹ**) مینارٹی کمیٹی کی تقریر میں مسٹر گاندھی نے یہ بھی کہا کہ دوسری اقوام نے جو مطالبات پیش کئے ہیں انکو سمجھ سکتا ہوں لیکن اچھوتوں کی طرف سے جو مطالبات پیش ہوئے ہیں وہ بہت زیادہ دکھ پہنچانیوالے ہیں ہم اچھوتوں کو ہرگز ہرگز علیحدہ کرنا نہیں چاہتے سکھ الگ رہ سکتے ہیں اور اسی طرح مسلمان اور عیسائی بھی کیا اچھوت، اچھوت ہی رہینگے وہ لوگ جو اچھوتوں کے سیاسی حقوق کے متعلق گفتگو کرتے ہیں وہ ہندوستان اور اسکی سوسائٹی کے حالات کو نہیں جانتے اور میں یہاں اپنی پوری طاقت سے کہدینا چاہتا ہوں کہ اگر مجھے تن تنہا اپنی زندگی سے بھی اسکی مزاحمت کرنی پڑے تو کرونگا۔

اس بات کا حق رکھتی ہے کہ وہ کوئی ایسا فیصلہ صادر کر سکے یا اس پر عمل کرنے کے لئے زور دے سکے۔

ان حالات کے سلسلہ میں مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی نے جو مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے سکریٹری تھے اخبار "لیڈر" میں لکھا تھا کہ :۔

"سر محمد شفیع نے مسلمانوں کی طرف سے ایک تجویز پیش کی تھی کہ جس کی رُو سے معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب جاری کر دیا جائے مگر پنڈت مدن موہن مالویہ نے اُسے محض ایک نشست کی کمی بیشی کی بنا پر نامنظور کر دیا اور چونکہ ہندوؤں کو کتاب بیداری ہند کے مصنف مسٹر میکڈانلڈ وزیر اعظم سے توقعات تھیں اس لئے ان کے نام چٹھی لکھی گئی کہ وہ فرقہ وارانہ فیصلہ دیں"

ان ہی طے شدہ مباحث کے ساتھ گول میز کانفرنس کا اجلاس ختم ہو گیا اور آخری دن یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو وزیر اعظم نے جو مبسوط بیان دیا اُس میں فرقہ وارانہ مسائل کی گتھی نہ سلجھنے پر افسوس کا اظہار کیا اور اس کو ترقی کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ قرار دے کر کہا :۔

"اس صورت میں ملک معظم کی حکومت اس امر پر مجبور ہوگی کہ ایک عارضی تجویز پر عمل کرے کیونکہ اس نے یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اس وقت کو بھی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے دے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملک معظم کی حکومت نہ صرف آپکی نمایندگی کے مسائل کا تصفیہ کرے گی بلکہ جہاں تک ممکن ہے دانشمندی اور انصاف کے ساتھ یہ بھی طے کر دے گی کہ اصول جمہوریت کے بے قید اور خلاف انصاف استعمال سے جس کی بدولت اکثریت کو کل اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں، اقلیتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے دستور اساسی میں روک تھام کی کیا کیا صورتیں ہونی چاہئیں۔ یہ میں آپ سے کہے دیتا ہوں کہ اگر حکومت کو عارضی طور پر بھی آپ کے دستور کا یہ حصہ مرتب کرنا پڑا جو آپ خود نہیں کر سکتے تو باوجود اس کے کہ وہ پورے اہتمام سے اقلیتوں کے لئے کافی تحفظات رکھے گی۔ تاکہ ان میں سے کسی کو بے توجہی کی شکایت نہ رہے یہ اس مسئلہ کے حل کرنے

کی قابل اطمینان صورت نہ ہوگی۔ یہ بھی سن لیجئے کہ اگر اس معاملہ میں آپکے آپس
میں کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ تو یہاں پر حکومت کو جو ہندوستان کے دستور اساسی
کے بارے میں ہمارے ہم خیال ہو بڑی مشکلیں پیش آئیں گی اور اس کی وجہ سے
آپ کے دستور کا مرتبہ دوسرے ملک کے دستور سے گھٹ جائے گا۔

اسلئے میں ایکبار پھر آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپس میں گفتگو کر کے جو مواقع
ملیں اُن سے فائدہ اُٹھائیے اور کوئی فیصلہ کر کے ہمارے سامنے پیش کیجئے
فرقہ وارانہ مسئلہ کا وہ حل جس کا تعلق صرف کونسلوں کی نمائندگی سے ہو ان
حقوق کی حفاظت کے لئے کافی نہیں جن کو میں فطرتی حقوق کہتا ہوں جن
شرائط کا ذکر ہو چکا ہے انکے بعد بھی اقلیتیں بدستور اقلیتیں رہیں گی اس دستور اساسی میں ایسی
دفعات کی ضرورت ہے جن سے ہر عقیدہ اور طبقہ کے لوگوں کو پورا اطمینان
ہو جائے اور اکثریت کی حکومت اس طرح نہیں کی جائیگی کہ جس سے اُنہیں ہیئت
سیاسی کے اندر اخلاقی یا مادی نقصان پہونچ جائے حکومت اس وقت
یہ تصریح نہیں کر سکتی کہ اس کے لئے کیا شرطیں ہونا چاہئیں۔ ان کی نوعیت
اور ان کے دائرہ کو معین کرنے کے لئے بہت کچھ غور و فکر کی ضرورت ہے
تاکہ ایک طرف تو اس کا یقین ہو کہ وہ اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے کافی
نہیں اور دوسری طرف یہ اطمینان ہو کہ وہ سیاسی ذمہ دارانہ حکومت کے
اصولوں میں اس حد تک مداخلت نہیں کرتی کہ اُنہیں باطل کر دیں۔ اس
میں مشاورتی کمیٹی کو خاص طور پر دخل ہونا چاہیے۔ کیونکہ نشستوں کے تناسب
اور طریق انتخاب کے مسائل کی طرح اس معاملہ میں بھی دستور کی کامیابی
اس پر منحصر ہے کہ اس کی ترتیب باہمی مفاہمت کی بنیاد پر ہو۔

نتیجہ میں ملک معظم کی حکومت نے دستور جدید میں کمیونل اوارڈ کے نام سے فرقہ وارانہ
فیصلہ کر دیا اور جداگانہ انتخاب کا اصول بہ ایں شرط قائم کیا گیا کہ باہمی رضامندی سے
دس سال کے بعد تبدیل کیا جا سکتا ہے

بنگال اور پنجاب میں نشستوں کی تقسیم نہایت اہم ہے۔ لیکن ان صورتوں میں مسلمانوں کے تناسب آبادی سے تقریباً (۲۰) فی صدی کم نشستیں ملیں گی۔

مذکورہ بالا واقعات کے متعلق جو گول میز کانفرنس میں پیش آئے مئی ۱۹۳۵ء میں (مرحوم) **خان بہادر حاجی حافظ ہدایت حسین** بار ایٹ لا نے سٹر سیتا سوری کے ایک بیان شائع ہونے پر اپنے بیان میں حسب ذیل روشنی ڈالی ہے۔

"۲۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے اقلیتوں کی میٹنگ میں ممبران سے جن میں مہاتما گاندھی بھی شامل تھے۔ اپیل کی تھی کہ اس پیچیدہ مسئلہ کو حل کریں۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اور ہز ہائینس سر آغا خاں کی درخواست پر میٹنگ ایک ہفتہ کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ بعد ازاں ۳۰ ستمبر ۱۹۳۱ء کو یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے بعد ہر طبقہ کے دو دو تین تین ممبران پر مشتمل ایک چھوٹی کمیٹی مقرر کیجائے۔

۸ اکتوبر سے ۱۱ اکتوبر تک مہاتما گاندھی کی صدارت میں اس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا لیکن بالآخر کمیٹی نے اپنی ناکامی کا اظہار کیا۔ ایک ہفتہ کے التواء کے بعد اقلیتوں کی کمیٹی کا پھر اجلاس منعقد ہوا اور وزیر اعظم سے پھر اپیل کی کہ ایک مرتبہ اور اسے حل کرنے کی کوشش کیجائے چنانچہ پھر گفت و شنید شروع ہوئی اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ مہاتما گاندھی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں اور سرحد میں ہندوؤں کی اقلیت تسلیم کرنے کے لئے تیار تھے لیکن ان کے علاوہ اور کسی کو بھی اقلیت تسلیم کرنا پسند نہیں کرتے تھے علاوہ بریں اسی شرط پر گفت و شنید کرنا چاہتے تھے کہ عیسائی اینگلو انڈین اور یورپینوں کو ہندوستان کا باشندہ نہ تسلیم کیا جائے دیگر اقلیتوں نے اس اثناء میں باہمی گفت و شنید کے ذریعہ سمجھوتہ کر لیا تھا مگر نے بھی اسکی حمایت کی۔ مہاتما گاندھی کو اس سے بڑی پریشانی ہوئی اسکے بعد اقلیتوں کی کمیٹی کی میٹنگ منعقد ہوئی مہاتما گاندھی نے اس

سمجھوتہ کی کچھ پرواہ نہ کی اور کہا کہ وہ لوگ مردہ کی چیر پھاڑ کی کوشش کر رہے ہیں۔ وزیراعظم نے میٹنگ ملتوی کرتے ہوئے ممبران سے کہا کہ وہ اپنے دستخطوں سے ان کے پاس ایک درخواست بھیجیں اور اس میں یہ وعدہ کریں کہ میں خود فرقہ وارانہ مسئلہ کو جس طرح حل کروں گا اس کو وہ تسلیم کریں گے۔

۱۴ر نومبر کو مہاتما گاندھی نے مسلم ڈیلی گیشن سے ملاقات کی اور ان کو اس سمجھوتہ سے توڑنے کی کوشش کی لیکن مسلمانوں نے انکار کر دیا اسی دن پنڈت مدن موہن مالویہ نے وزیراعظم کو ایک خط لکھا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان اس مسئلہ کا تصفیہ کریں۔ اس خط پر مہاراجہ دربھنگہ شریمتی سروجنی نائڈو مسٹر نرینیدر ناتھ، ڈاکٹر مونجے۔ سیٹھ برلا۔ مسٹر جیکر اور مسٹر آئینگر کے بھی دستخط تھے۔ جب یہ خط بھیجا گیا اس وقت مہاتما گاندھی نے بھی وزیراعظم کو ایک چٹھی لکھی جس میں انھوں نے یہ واضح کیا کہ پنڈت مالویہ کی چٹھی پر میرے دستخط نہ کرنے کے یہ معنی اخذ نہیں کرنے چاہئیں کہ کانگریس آپ کے فیصلہ کی مخالفت کرے گی اس کے بعد سر تیج بہادر سپرو رائٹ آنریبل سرنواس شاستری۔ سر چمن لال سیتلواد۔ سر اے۔ پی پترو اور فیروز سیٹھنا نے بھی وزیراعظم کو چٹھیاں لکھیں۔ ان تمام چٹھیوں میں اس بات کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا کہ کانگریس اس فیصلہ کی پابند نہیں ہوگی لہٰذا اب یہ کہنا بیکار ہے کہ کانگریس سرکاری فرقہ وارانہ حل کی پابند نہیں ہے۔"

مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی (سندھی) ایم۔ ایل۔ اے بنگال کونسل اُن اصحاب میں ہیں۔ جو کانگریس کے مسلم زعما سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کے خاص رفقا میں ہیں اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے زمانہ میں لندن میں موجود تھے انھوں نے اگست ۱۹۳۷ء میں بمقام سورت ایک پبلک اسپیچ میں کہا ہے کہ:۔

"مسٹر گاندھی نے انگلستان میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے زمانہ میں خود

وزیراعظم کو اپنی رضامندی دی تھی مگر فرقہ وارانہ سوال کے واقعہ کو ہندو پریس نے کلیتہً دبا دیا اور قطعاً نہ اُبھر سکا"

ان ہی کوششوں کے متعلق ڈاکٹر سر سپرو کا بیان ہے کہ:-

"اُنھوں نے (گاندھی جی نے) ۱۰ یا ۱۲ اشخاص کا ایک جلسہ طلب کیا جو قمر سینٹ جیمس میں ہر رات جمع ہوتے تھے۔ اس تمام کارروائی میں وہ (گاندھی جی) بیحد آرزومند تھے کہ کوئی مفاہمت ہو جائے اگر میں بعض اُن حضرات کا تذکرہ کروں جنہوں نے اس جلسہ کی تمام کارروائیوں میں حصہ لیا تھا۔ تو یہ گویا مسئلہ کے بہت ہی نازک پہلو کا اظہار ہوگا۔ ان کارروائیوں کی سچی اور مکمل تاریخ تو ابھی لکھی جانی باقی ہے۔ لیکن میں بلا خوف و تردد بیان کروں گا کہ اس آخری رات کو جب جلسہ ہوا تو ذہنی اضطراب کے آثار اُن (گاندھی جی) کے چہرے سے عیاں تھے۔ ہم بغیر کچھ حاصل کئے ہوئے اُٹھے اور اُس وقت ایران کے شاعر اعظم فردوسی کا وہ قول یاد آگیا جو اُس نے تاریخ ایران کے ایک مشہور واقعہ کے متعلق کہا تھا۔ نشستند و گفتند و برخاستند" میں نے اس تاثر کو اپنی ڈائری میں اسیوقت قلمبند کیا ممکن ہے کہ وہ کسی قدر جذباتی رنگ لئے ہوئے ہو۔ لیکن آج چار سال بعد نیز ان چار سالوں میں جو کچھ میں نے دیکھا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ماننے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس وقت میں کسی مخالفانہ جذبہ سے مغلوب ہو گیا تھا، اس کا اندراج اس طرح ہے:-

"نام نہاد ہندوستانی قومیت کا جنازہ نکلتے دیکھا جسکے مخصوص کندھا دینے والوں میں ...... تھے کیا پھر وہ زندہ بھی ہوگی"

اس موقع پر اکثریت کی رواداری کے متعلق نحاس پاشا وزیر مصر کا وہ خط جو انھوں نے ۱۹۳۸ء میں حافظ عمران خاں لادی مقیم مصر کے نام لکھا تھا۔ قابل مطالعہ ہے کیوں کہ ہندو پریس نے ان کی رائے کو غلط طور پر پیش کیا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں:-

"آپ کا مفصل خط مجھے ملا میں اس تکلیف کے لئے جو صورت حال سے مجھے مطلع کرنے کے لئے آپ نے فرمائی ہے مشکور ہوں۔ استاذ ملکانی سے میری تمام تر گفتگو اس پہلو پر منحصر تھی۔ کہ ہندوستانیوں کو ایک کلمہ پر جمع کرنے کی ضرورت ہے دینی تعصب ترک کرنا چاہیئے اور سب سے پہلی کوشش ہندو مسلم اتحاد کی ہونی چاہیئے تاکہ حقیقی طور پر ہندوستان کی آزادی کے لئے کوشش کی جا سکے اور اس کے مفید نتائج ظاہر ہو سکیں (افسوس ہے کہ اسی اہم تر مسئلہ کی طرف سب سے کم توجہ ہندو کرتے ہیں) میری یہ عادت قریباً دس برس سے ہے۔ اور ہمیشہ جب میں نے ہندوستان کے لیڈروں سے ملاقات کی ہے اسی اہم پہلو کی بابت زیادہ زور دیا ہے کہ سب سے پہلے امت ہندیہ کو ایک کلمہ پر جمع ہونے کی ضرورت ہے اور دینی اختلافات سے قطع نظر کرکے وطن کی آزادی کے لئے سب کی متحدہ کوشش جبتک نہ ہوگی متوقع نتائج ظاہر نہیں ہو سکتے اور یہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب اکثریت اپنے طرزعمل سے اپنے قول وفعل سے اقلیت کو مطمئن کردے۔ اختلافاتِ دین یا کسی فرقہ کی اکثریت اس بات کی موجب نہ ہونا چاہیئے کہ دوسرے فرقوں پر ظلم وزیادتی روا رکھی جائے یہ بات میں نے ایسی نہیں کہی ہے جو عمل سے عاری ہو۔ بلکہ اسکے ثبوت میں ہم اپنا طرزعمل پیش کرتے ہیں جو ہم نے بہت بڑی اکثریت میں ہونے کے باوجود مصر کے قبطیوں کے ساتھ روا رکھا ہے ہم نے انہیں ان کے حقوق سے اتنا زیادہ دیا ہے کہ وہ اس کا تخیل بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے قلوب ہمارے ساتھ ہیں۔ سب سے زیادہ حریص میں اسی کا رہا کرتا ہوں کہ مصر کے قبطی اور مسلمان متحد رہیں اور اس سلسلہ میں کوئی موقع میں ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بہت ہی صراحت کے ساتھ یہ گفتگو میں نے پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو، پروفیسر کلیانی، نیز مسلمان لیڈروں میں قاضی مظفر اور مرحوم سر اقبال سے کی ہے"

میری طرف سے آپ کو اس کی اجازت ہے کہ آپ اخبارات میں میری اس تصریح کو شائع کر دیں۔ اس کے سوا کوئی دوسرا مقصد پروفیسر ملکانی سے میری گفتگو کا نہ تھا۔"

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد دسمبر ۱۹۳۱ء میں کانگریس نے بنیادی حقوق کے نام سے پھر ایک قرارداد پاس کی کہ:۔

"ہر باشندہ کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی اور مذہب کا اعلان آزادی سے کر سکے گا اور وہ اپنے فرائض و رسوم آزادی سے انجام دے سکے گا بشرطیکہ اس سے انتظام عامہ اور اخلاق عامہ میں کوئی نقص واقع نہ ہو ملک کی اقلیتوں کا تمدن، زبان، رسم الخط محفوظ ہوں گے،

نیز ملک کے وہ محفوظ رقبے جو باعتبار اختلاف زبان قائم ہیں اُن کا تحفظ ہوگا، ہندوستان کے تمام باشندے بلا امتیاز مذہب و ملک یا ذات و قوم یا جنسیت قانون کی نظر میں برابر ہوں گے، ہندوستان کا کوئی باشندہ خواہ مرد ہو یا عورت اپنے مذہب یا ذات یا جنسیت کی وجہ سے کسی تجارت یا پیشہ سے ممنوع نہیں سمجھا جائے گا،

مذہب کے معاملہ میں حکومت غیر جانبدار رہے گی،

رائے دینے کا حق ہر عاقل و بالغ کو ہوگا۔"

لیکن یہ قرارداد اتنی مبہم تھی کہ کوئی فرقہ بھی مطمئن نہ ہوا اور صرف خانہ پری کے لئے تصور کی گئی۔

گاندھی جی جب گول میز کانفرنس کے مباحث میں سرگرم کار تھے تو ہندوستان میں پھر صورت حالات نے نزاکت اختیار کر لی تھی۔ صوبہ متحدہ میں کانگریسی زعما بالخصوص پنڈت جواہر لال نہرو اور گوبند بلبھ پنت نے کاشتکاروں اور تعلقداروں و زمینداروں کے مابین لگان وغیرہ کے معاملات میں کاشتکاروں کی ہمدردی کے نام پر مداخلت شروع کر دی ان کی شکایات پر حکومت سے خط و کتابت اور ملاقاتیں کیں۔ تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔ لگان و مالگذاری ادا کرنے کا زمانہ بھی آگیا تھا۔ حکومت نے اس دوران میں

جو معافیاں دیں ان کو غیر تسلی بخش قرار دیا گیا اور سخت کشمکش پیدا ہو گئی اور بالآخر عدم ادائیگی لگان کی تحریک شروع کر دی گئی۔ حکومت نے بھی آرڈیننس (ہنگامی قوانین) جاری کئے۔ پنڈت نہرو اور تصدق احمد خاں شیروانی ان قوانین کے ماتحت گرفتار کئے گئے۔ بنگال میں بھی دہشت انگیزی روکنے کے لئے انھیں قوانین کا نفاذ تھا اور گرفتاریاں بھی جاری تھیں۔ صوبہ سرحد میں خان عبد الغفار خاں کی زیر ہدایت ان کی جماعت "خدائی خدمتگار" کی حکومت کے خلاف سرگرمیاں بڑھ گئیں تھیں خود عبد الغفار خاں نے بکثرت جوش انگیز تقریریں کیں اور آزادی کامل کا اعلان کیا جس پر وہ اور چند دیگر اشخاص گرفتار کئے گئے یہ حالات جاری تھے کہ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی ہندوستان واپس پہونچے اور دوسرے دن انھوں نے وائسرائے کو ان حالات کے متعلق تار دے کر باین غرض ملاقات کی خواہش کی کہ وہ اپنے آیندہ راستہ اختیار کرنے کے لئے روشنی کی تلاش کر سکیں مگر وائسرائے نے اپنے طویل تار میں ان تمام اسباب و وجوہ کو جن کی بنا پر صوبوں میں حکومت نے یہ پالیسی اختیار کی تھی ظاہر کر کے اس پر بحث کرنے سے قطعی انکار کر دیا اب ورکنگ کمیٹی نے گاندھی جی کے مشورہ سے ایک قرارداد پاس کی جس میں ان کارروائیوں کی مذمت کی گئی اور گول میز کانفرنس کی کارروائیوں اور اعلانوں کو غیر تسلی بخش قرار دے کر آزادی کامل کا مطالبہ کیا گیا۔ اور بصورت عدم منظوری سول نافرمانی کو دوبارہ جاری کرنا طے کر دیا گیا۔

گاندھی جی نے پھر یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو ایک طویل تار وائسرائے کو بھیجا جس میں رزولیوشن کا خلاصہ تھا اور کانگریس کو حق بجانب اور حکومت کو مورد الزام قرار دیا گیا تھا اور پھر ملاقات کی خواہش کی تھی لیکن وائسرائے نے ان کے مطالبات اور ملاقات سے انکار کیا اور صاف لکھدیا کہ وہ نتائج جو اس عمل سے ظہور پذیر ہوں گے جن کا ارادہ کانگریس نے کیا ہے ان کا ذمہ دار گاندھی جی اور کانگریس کو قرار دیا جائے گا اور ان کے مقابلے کے لئے گورنمنٹ ہر ممکن ذرائع استعمال کرے گی۔ چنانچہ حکومت نے بہت جلد متعدد ہنگامی قوانین نافذ کر دئے۔ اب نہایت سختی کے ساتھ سول نافرمانی شروع

کر دی گئی مگر اسی سختی سے اس کو دبا یا گیا۔ تمام لیڈر گرفتار کر لیے گئے اور گاندھی جی بھی یروده جیل میں نظر بند کر دئے گئے۔

اس عرصہ میں کمیونل ایوارڈ شائع ہوا اور اس میں اچھوتوں کی جداگانہ نیابت قائم رہی تو گاندھی جی تلملا گئے اور جیل سے ہی انہوں نے ۱۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو وزیر ہند کے نام ایک طولانی خط لکھا۔ جس کا مفاد ملخص یہ تھا کہ:۔

"جداگانہ نیابت دلت جاتیوں کے لئے اور ہندوؤں کے لئے نقصان رساں ہے اس کا صحیح اندازہ وہ ہی شخص کر سکتا ہے جو یہ جانتا ہے کہ برائے نام اونچی ذات والے ہندوؤں میں وہ کس طرح پھیلے ہوئے ہیں اور ان کا موخر الذکر ذاتوں کو کتنا بھاری سہارا ہے۔ جہاں تک ہندومت کا تعلق ہے جداگانہ نیابت ان کے جسم کو بالکل چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔"

اسی خط میں حسب ذیل فقرہ بھی تھا کہ:۔

میں اس کے برخلاف نہیں ہوں کہ ان کو کونسلوں میں نمائندگی دی جائے۔ میں تو اس بات کے حق میں ہوں کہ ان کے ہر ایک مرد و زن کو خواہ ان کی تعلیم یا جائداد کی قابلیت کچھ ہی ہو ووٹر قرار دیا جائے اور خواہ دوسرے فرقوں کے لئے رائے دہندگی کے طریق اس سے زیادہ سخت ہی کیوں نہ ہوں لیکن یہ میری مسلمہ رائے ہے کہ خالص سیاسی نکتہ نگاہ سے خواہ کچھ بھی ہو جداگانہ نیابت ان کے لئے اور ہندوؤں کے لئے نقصان دہ ہے۔"

آخر خط میں فاقہ کشی کر کے اپنی جان دیدینے کی دھمکی دی تھی لیکن حکومت نے اچھوتوں کو جداگانہ نیابت دی اور عام انتخاب میں بھی نشست حاصل کرنے کا حق عطا کیا۔

گاندھی جی نے وزیر اعظم کو اپنے طریق عمل کے فیصلہ کی بھی اطلاع دی اور ۲۰ ستمبر سے فاقہ کشی کا اعلان کر دیا لیکن اس کا جواب ۹ ستمبر کو ہی مل گیا جو حسب مراد نہ تھا۔ اب فاقہ کشی کی معینہ تاریخ تک کے درمیانی وقفہ میں ہندو سیاستین نے ہر ممکن کوشش کی کہ اچھوتوں کے ساتھ باہمی سمجھوتہ سے اس فیصلہ کو تبدیل کرایا جائے چنانچہ ایک کانفرنس

منعقد ہوئی اونچی ذاتوں کے سیاسیئین جمع ہوئے ادھر فاقہ کشی بھی شروع ہو گئی۔ پانچویں دن ایک اسکیم مرتب کی گئی کہ ضروری تحفظات کے ساتھ اچھوت جداگانہ نیابت سے دست بردار ہو جائیں اور ان کو عام ہندو نشستوں میں ایک مخصوص تعداد دی جائے چنانچہ اسی طرح باہمی فیصلہ بھی ہو گیا اور ۲۶ تاریخ کو سرکاری طور پر وزیر اعظم کے فیصلہ میں وہ بطور ترمیم شامل کر لیا گیا۔

ہندوستان میں اچھوت قوم دراصل ہندوؤں کی تمدنی و سیاسی مظالم کی ایک یادگار ہے اگرچہ ان کے سیاسی زوال کے بعد زمانے نے اچھوتوں کی مساعدت کی ان کو کچھ ابھرنے کے مواقع ملے اور تبدیل مذہب نے اونچی ذات کے ہندوؤں کی برابر کرسی پر بٹھا دیا۔ تاہم ابھی تک ایک کثیر تعداد اچھوت ہی ہے۔

مسلمانوں نے ہی ابتداً حکومت کو اس طرف متوجہ کیا کہ یہ اچھوت دراصل ہندوؤں سے ایک علیحدہ فرقہ ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء میں مسلم لیگ نے قرارداد پاس کی کہ:۔

"ادنیٰ ذاتوں کو آئندہ مردم شماری میں ہندو نہ لکھا جائے بلکہ ان کو خود ان کی مستقل ذاتوں کے تحت میں شمار کیا جائے۔"

مقصد یہ تھا کہ اس سے اصل ہندوؤں کی صحیح تعداد کا اندازہ ہو جائے گا اور پتہ لگ جائے گا کہ کتنے کروڑ ہندوستانی ہیں جو اس وقت کس مپرسی اور ناقابل بیان ذلت کی حالت میں ہیں۔ اس بنا پر ہندوؤں کو ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ ان اقوام کو اپنے اندر شامل کر لیا جائے بحالیکہ اب سے ہزاروں سال قبل ان کے مقتن اعظم منو جی مہاراج انہیں اعلےٰ اقوام کے دائرہ سے خارج کر چکے تھے۔ مورخین کا فیصلہ ہے کہ ہندوستان کی ادنیٰ ذاتیں ہندوستان کے اصلی باشندوں کا بقیہ ہیں۔ بجائے کہ اعلےٰ ذات کے ہندو نو وارد ہیں اور اس لحاظ سے وہ ہندوؤں سے بالکل جدا ہیں کمشنر مردم شماری نے بھی ہدایت جاری کی کہ ادنےٰ ذاتوں کو ان کی اصلی ذات کے تحت میں دکھایا جائے اس سے ہندو پریس بہت برافروختہ ہوا اور اس نے دھمکیاں بھی دیں اور ہندو سیاسیئین نے محض اپنی عددی برتری قائم رکھنے کے لئے ان کے ساتھ نمائشی ہمدردی شروع کی جس کا

شرف اولیت مالویہ جی کو حاصل ہے۔ علاوہ بریں یہ مقصد بھی تھا کہ ان کو بطور سپاہیوں کے کام میں لایا جائے چنانچہ ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر مونجے نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ:۔

"اگر دونوں پنڈت موتی لال نہرو اور مدن موہن مالوی علی برادرس سے دریافت کریں کہ وہ کس طرح ایک کروڑ (مسلم) سپاہی دے سکیں گے تو وہ بہت آسانی کے ساتھ جواب دیں گے کہ ہماری عورتوں بچوں بوڑھوں کو خارج کرکے جن کی تعداد چھ کروڑ کے قریب ہوگی تو بھی ایک کروڑ جوان مضبوط آدمی ان کے یہاں موجود ہیں۔ سولہ برس کی عمر سے لے کر ۵۵ برس کی عمر والے جوان سے دشمنوں کے مقابلہ میں بندوق اور تلوار چلانے کو تیار ہیں، کیا ہندو بھی موجودہ وقت میں اس پر مائل ہیں کہ وہ بھی اس قسم کا جواب دے سکیں؟ موجودہ زمانے کا برہمن تو صرف اس کا قائل ہے کہ وہ پوجا پاٹ کرے اور حد سے حد اتنا کرسکے گا کہ وہ اپنا اشیر باد مفت دیدے۔ رہی ویش قوم (بنیا) تو اس کی زندگی کا مقصد صرف روپیہ جمع کرنا ہے۔ اور تلوار کی چمک دیکھ کر وہ تو خوف کے مارے تھر تھر کانپے گا۔ چھتری بے شبہ اب بھی لڑنے اور مقابلہ کے قابل ہیں۔ مگر ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اب صرف ایک قوم رہ گئی ہے اچھوت اگر آپ ملابار جائیں تو وہاں تھیا قوم کو دیکھیں گے قد آور اور مضبوط ہندو دھرم اور تہذیب کی حفاظت کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار، کیا اونچی ذات والے ہندو موجودہ زمانہ کی حالت پر غور نہ کریں گے اور چھوت چھات کی سخت ناانصافی کو دور نہ کریں گے تاکہ وہ سوراج حاصل کریں۔۔۔۔۔

آج بھی اگر ہندوؤں میں کوئی قوم ہے جو اپنی آبادی کے تناسب سے سپاہی دے سکتی ہے تو وہ یہی اچھوت ہیں ان میں طاقت ہے ہمت ہے اور اپنے دھرم کی محبت ہے کیا ہندو موجودہ حالت میں اگر سوراج ان کو مل بھی جائے تو اس کو محفوظ بھی رکھ سکیں گے میں شرم کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ ہندوؤں کی اکثریت ہرگز اس قابل نہیں کہ وہ ملک کی حفاظت کے لئے

اپنے حصہ کے سپاہی دے سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ہر ایک ہندو لڑکا چاہے وہ برہمن کا بیٹا ہو یا چنڈال کا ایک سپاہی بن جائے اور اس قابل ہو کہ لاٹھی تلوار اور بندوق چلا سکے۔"

مگر ان اچھوتوں کو بھی خود اپنی حالت کا احساس ہوا اور اس احساس نے ان میں یک گونہ اُبھرنے کا حوصلہ پیدا کیا اور وہ کامیاب ہوئے اور اُنہوں نے کچھ حقوق حاصل کر لئے۔

اب جدید اصلاحات کے موقعہ پر گول میز کانفرنس میں ان کے نمائندے کا بھی انتخاب کیا گیا اور ان کو ایک جداگانہ قوم تسلیم کر کے جداگانہ حقوق دیے گئے تو ہندو سیاسیئن تلملا اُٹھے۔ ورنہ ان کو کوئی ہمدردی اس کثیر طبقہ آبادی کے ساتھ نہ تھی۔

تیسری گول میز کانفرنس ۱۷ر نومبر ۱۹۳۲ء کو منعقد ہوئی۔ ممبروں کی تعداد دونوں کے مقابلہ میں نصف سے بھی کم تھی، سب کمیٹیوں کی رپورٹ پر بحث کے بعد ۲۴ر دسمبر کو ختم ہو گئی اور دستور جدید کا خاکہ وہائٹ پیپر (قرطاس ابیض) کی شکل میں مارچ ۱۹۳۳ء میں شائع کر دیا گیا۔

اس کی اشاعت کے بعد ہر طرف سے سیاسیئن نے بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ دسمبر ۱۹۳۳ء میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جس کے صدر راجہ سید احمد علیخاں علوی آف سلیم پور تھے اُنھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں ان مسائل پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی، جن کا قرطاس ابیض میں ذکر کیا گیا تھا اُنہوں نے کہا کہ:-

"مجھے اُمید ہے کہ آپ حضرات میں سے کوئی صاحب اقلیت کے اس حق سے انکار نہ کریں گے کہ وہ ملک کے آئین میں اپنے لئے کچھ تحفظات کا مطالبہ کرے اور مجھے یقین ہے کہ آپ تمام حضرات اس معاملہ میں میری تائید کریں گے کہ تمدنی تحفظات کو جس میں زبان اور رسم الخط کے مسائل بھی شامل ہیں دیگر تحفظات پر فوقیت حاصل ہے ہندوستان کے مسلمان ایک خاص تمدن کے حامل ہیں جو اس وقت بھی ان کی ایک

شان امتیازی ہے اور اس تمدن کو وہ دل سے عزیز رکھتے ہیں اور جان کے
ساتھ حفاظت کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے جبتک آئینی تحفظات نہ ہوں اُس
وقت تک مسلمانوں کو بجا طور پر یہ اندیشہ ہے کہ اُن کی انفرادیت کسی ایسی چیز
میں جذب ہو جائے گی جسے وہ اپنے ملی مفاد کے لئے مفید نہیں سمجھتے سال
انڈیا مسلم کانفرنس نے ۱۹۲۹ء میں ایک قرار داد کے اندر یہ مطالبہ پیش کیا تھا
کہ:-

"ہندوستان کے موجودہ معاشرتی اور سیاسی حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے
یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں مسلمانوں کے تمدن کے
تحفظ اور مسلمانوں کی تعلیم، زبان، مذہب، شخصی قانون اور مسلمانوں کے خیراتی
ادارات کے تحفظ اور ترقی اور سرکاری امداد میں انکے مناسب حصے کے لئے
مناسب تحفظات شامل کئے جائیں"

تحفظات کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہے حتیٰ کہ نہرو رپورٹ اور سائمن
کمیشن نے بھی اس مسئلہ کو نظر انداز نہیں کیا البتہ دونوں نے واقعی ضروریات کو
توڑ مروڑ کر بالکل مبہم اور بے نتیجہ شکل میں تبدیل کر دیا ہے نہرو رپورٹ نے مجالس
فرقی کے مسئلہ پر غور کیا، لیکن انکے بروئے کار لانے کی تجویز کو مسترد کر دیا اور
ہندوستانی زبان کو تو ملک کی مشترکہ زبان بنانے پر زور دیا لیکن رسم الخط کے
مسئلہ کو نہایت چالاکی سے گول کر دیا۔ دوسری طرف سائمن کمیشن نے یہ رائے
دی کہ "اس معاملہ میں تحفظ کی بہترین شکل یہ ہے کہ گورنر جنرل اور گورنران صوبہ کو
اس معاملہ میں بروئے کار لانے کے لئے امتیازی اختیارات دیدیئے جاویں"
لیکن اسی سائمن کمیشن نے ایک دوسری جگہ اینگلو انڈین طبقہ کے ایسے ہی مطالبہ
کو اس سے زیادہ وزن دیا ہے اور اس مقصد کے لئے ایک خاص بورڈ کی تشکیل
کی سفارش کی ہے۔

سر چمن لال سیتلواد نے راونڈ ٹیبل کانفرنس کی مائنارٹیز کمیٹی میں ایک یادداشت بھیجی

تھی۔ اُس میں لکھا تھا کہ:۔

"اصل معاملہ میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ اقلیتوں کے لئے کامل مذہبی آزادی اور تمدن و دستور کی حفاظت کی ضمانت کے لئے مناسب تحفظات معین کرنے کی ضرورت ہے اور ایسے قوانین کی ضرورت ہے کہ اُن کے مذہب وغیرہ کے خلاف کوئی قانون نہ بن سکے"

انگلستان میں جو معاہدہ اقلیتوں کے مابین ہوا تھا۔ اس میں بھی ایک دفعہ بالفاظ ذیل موجود ہے:۔

"آئین میں قلیل التعداد اقوام کے مذہب تمدن اور دستور کے تحفظ اور تعلیم زبان اور خیراتی اوقاف کی ترقی اور سرکاری اور بورڈ کی امداد میں ان کے مناسب حصّہ کے لئے مناسب تحفظات ضروری ہیں"

لیکن مجھے افسوس ہے کہ جو مطالبہ اس شد و مد کے ساتھ پیش کیا گیا اور جس کی اس طرح ہر چہار طرف تائید ہوئی اس پر قرطاس ابیض میں اتنی توجہ نہیں کی گئی جتنی چاہیئے تھی، اور ہم مسلمانوں کو اس پر مسلسل اصرار کرنے اور اس کے حصول کے لئے پوری قوت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں کا ایک اور مطالبہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے متذکرہ صدر ریزولیوشن کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

"انتظام ہندوستان کے مفاد کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ دستور اساسی میں ایسا بندوبست کیا جائے جس کی رو سے سرکاری اور آئینی خود مختار مجالس کی ملازمتوں میں اہلیت کے واجبات کا مناسب لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کو دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ مناسب حصّہ دیا جائے"

لندن میں اقلیتوں کا جو معاہدہ ہوا تھا۔ اس میں اس مطالبہ کو بشکل ذیل تسلیم کیا گیا تھا:۔

"ہر صوبہ میں اور نیز مرکزی حکومت کے ساتھ ایک پبلک سروس کمیشن کا تقرر

کیا جائے اور سرکاری ملازمتوں پر تقرر بجز ان صورتوں کے جہاں یہ تقرر گورنر جنرل یا گورنر کی نامزدگی پر منحصر ہو، اسی کمیشن کے توسط سے ہو۔ اور اس طرح ہو کہ مختلف اقوام کے افراد صحیح مناسب تعداد میں استعداد وغیرہ کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے لئے جائیں!

سائمن کمیشن اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس اور قرطاس ابیض میں دیگر مطالبات کی طرح اس مطالبہ کے ساتھ سلوک نہیں کیا گیا۔ اور قرطاس ابیض میں کچھ دفعات ایسی ہیں جن سے مسلمانوں کو اس معاملہ میں تھوڑا بہت تحفظ مل جاتا ہے لیکن ان دفعات کے الفاظ ایسے مبہم ہیں کہ ان پر نظر رکھنے کے لئے ایک سرکاری ادارہ کی ضرورت ہے جو کمیشن مذکور اور مختلف سرکاری محکموں کی سرگرمیوں کی پڑتال کرتا رہے اور یہ اس کانفرنس کا کام ہے کہ اس قسم کی کوئی جماعت بنا دے۔

اس کے علاوہ صوبجاتی اور مرکزی ایوانہائے وزارت میں مناسب نمائندگی کا مطالبہ ہے جو آل انڈیا مسلم کانفرنس کی قرارداد کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

"مذکور الصدر مقاصد کے لئے یہ ضروری ہے کہ مرکزی اور صوبجاتی وزارتوں میں مسلمانوں کو ان کا واجبی حصّہ حاصل ہو۔"

لندن کے معاہدہ اقلیات میں اس مطالبہ کو بشکل ذیل تسلیم کیا گیا تھا،

"مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں میں ایوانہائے وزارت کی ترتیب کے وقت حتی الامکان مسلمان اور دیگر کافی تعداد رکھنے والے قلیل التعداد اقوام کے افراد کو شامل کرنے کی شرط آئین میں شامل ہونی چاہیئے۔"

انڈین سنٹرل کمیٹی نے مسلمانوں کی اس خواہش کو قرین فطرت سمجھا اور نہرو رپورٹ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ایک وزیر اعظم کا تقرر اس مسئلہ کو حل کرے گا۔ اس لئے کہ وزیر اعظم دیگر اقوام کی خواہشات پر نظر رکھنے کے لئے

مجبور ہوگا سائمن کمیشن نے بھی اس قسم کی تجویز پیش کی جیسی نہرو رپورٹ میں ہے لیکن قرطاس ابیض میں ذرا آگے قدم بڑھایا گیا۔ اور حسب ذیل دفعہ رکھی گئی ؎

دستاویز ہدایات میں گورنر پر اس قسم کی پابندی عاید کی جائے گی کہ وہ اپنے وزراء کے تقرر میں اس بات کی پوری کوشش کریں کہ جو شخص ان کی نظر میں مجلس قانون ساز میں سب سے اثر زیادہ رکھتا ہو اس کے مشورہ سے ایسے افراد کا تقرر کریں (جنہیں حتی الامکان قلیل التعداد اقوام کے نمایندے بھی شامل ہوں) جو سب ملکر مجلس قانون ساز کا اعتماد حاصل کر سکیں ؎

یہاں بھی مطالبہ کو ایسی مبہم شکل میں تسلیم کیا گیا ہے کہ اس میں کافی دیکھ بھال اور خبرداری کی ضرورت ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ اس تحفظ کو جزو آئین بنایا جائے اور ہمیں اس کے لئے مسلسل اور اپنی پوری قوت کے ساتھ کوشش کرنا ہے ؎

یہ اور ان کے علاوہ بہت سے دیگر مسائل ہیں جن میں تحفظات کی ضرورت پر اس جلسہ میں کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔ بہت سے مسائل کا میں نے ذکر نہیں کیا ہے مثلاً ایک یہ مسئلہ کہ اکثریت کوئی ایسا قانون نہ بنائے جس کا اقلیت کے مذہب پر اثر پڑے اور اسکے علاوہ اور بہت سی باتیں جنکے متعلق مسلمانوں میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے اور ان مسائل کے متعلق ایک مشترکہ پلیٹ فارم ہونا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تمام حالات پر منصفانہ نظر ڈالنے سے آپکو یقین ہو جائے گا کہ آج جو کانفرنس یہاں مجتمع ہے اسے زیادہ دنوں تک ملتوی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اب ہمیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے کہ وہ ہماری کوششوں کو کامیاب فرمائے اور ہماری مباحث کا یہ نتیجہ نکلے کہ ہم یہاں سے ایک متحدہ جماعت بنکر نکلیں، جس کا ہر فرد دوسرے کے دوش بدوش میدان عمل میں اتر آئے اور اس سے مسلمانان ہند کے اتحاد و استحکام میں ایک نئی جان پڑ جائے تاکہ بالآخر ہم

ہمارے ہندوستان کو ایک قومی رشتہ میں منسلک کر کے متحدہ قومیت ہند کی مضبوط بنیاد رکھ سکیں۔"

سنہ ۱۹۳۴ء میں داخلہ کونسل کے متعلق کانگریس نے غور کرنے کے لئے جلسے کئے اور بمبئی میں قرطاس ابیض اور کمیونل اوارڈ پر پالیسی کا اظہار کیا گیا جس میں اقلیتوں کے مفاد کا تحفظ بطور اصول تسلیم ہوا اور صاف طور پر طے ہو گیا کہ کانگریس اسوقت تک کمیونل اوارڈ کو نہ رد ہی کر سکتی ہے اور نہ منظور ہی کر سکتی ہے جبتک اختلاف رائے قائم ہے۔ پنڈت مالویہ[1] اور مسٹر اینے کانگریس کے اس رویہ سے سخت بیزار تھے اور بالآخر وہ کانگریس کے پالیمنٹری بورڈ اور ورکنگ کمیٹی دونوں سے مستعفی ہو گئے۔ بنگال کے کانگریسی بھی مخالف تھے انکو پونہ پیکٹ (اچھوتوں کے متعلق جو گاندھی جی نے کیا تھا) بھی پسند نہ تھا۔ پنڈت مالویہ اور مسٹر اینے نے اگست میں ممبران کانگریس اور دیگر سیاسئین کی ایک کانفرنس مدعو کی جس نے قرطاس ابیض اور فرقہ وارانہ فیصلہ کے خلاف کونسلوں میں اور ان کے باہر ایجی ٹیشن کرنے کے لئے ایک پارٹی قائم کی اور ورکنگ کمیٹی کانگریس کو مجبور کیا کہ اپنی قرارداد پر نظر ثانی کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ طلب کرے لیکن وہ راضی نہ ہوئی اور اس نے اپنے عمل کی مناسبت میں کوئی شک نہ پایا۔

اس تمام عرصہ میں اگرچہ سیاسی انتشار رہا لیکن آل انڈیا مسلم لیگ بھی اپنے روکھے پھیکے جلسوں سے اپنی زندگی کا ثبوت دیتی رہی۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں اس کا اجلاس ڈاکٹر سر محمد اقبال کی صدارت میں ہوا اور انہوں نے تقسیم ہند یا پاکستان کا ایک نیا نظریہ قوم کے سامنے پیش کیا۔

مارچ سنہ ۱۹۳۴ء میں لیگ کونسل نے اس وقت کے مسائل پر غور کے ساتھ مسٹر جناح کی جگہ جو اب لندن میں مستقل سکونت کے خیال سے چلے گئے تھے ان کی قیمتی خدمات

---

[1] پنڈت ا وی جی نے سنہ ۱۹۳۲ء میں بھی اختلاف کیا تھا اور کانگریس نے مہاسبھائی طاقت سے مرعوب ہو کر اپنے نظریہ و طرز عمل میں تبدیلی کی۔

کے اعترافات کے بعد سر محمد شفیع کو لیگ کا مستقل صدر انتخاب کیا۔

سالانہ اجلاس بھی بمقام دہلی چودھری سر ظفر اللہ خاں کی صدارت میں ہوا اور سوراج کی جگہ جو قبل ازیں مطالبہ تھا کامل ذمہ دار حکومت کا مطالبہ قائم رکھا گیا۔

خطبہ صدارت میں اس وقت تک اُن دستوری مباحث پر جو گول میز کانفرنس میں ہوئے تھے کافی روشنی ڈالی گئی۔

تحفظات مفاد اسلامی، اساسی حقوق، صوبہ جات سرحد و سندھ و بلوچستان، ملازمت مسئلہ نیابت، وفاقی قانون ساز مجلس صوبجات، اقلیت، پنجاب و بنگال وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے صدر نے کہا کہ:۔

"مسلمانوں نے گذشتہ تجربہ سے یہ سبق سیکھا ہے کہ اپنے حقوق و مصالح کے تحفظ کے لئے ان کا قانونی اور آئینی ضمانتوں پر اصرار کرنا ضروری ہے اور محض یہ خیال کہ دوسری قوموں کا سلوک انصاف اور خیرخواہی پر مبنی ہوگا کافی نہیں یہ حالات بے حد افسوسناک ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم میں سے ہر شخص کی یہ خواہش ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتیں ایک دوسرے کو اعتماد کی نظر سے دیکھیں اور اُن کے جائز حقوق اور مصالح و مقاصد کا احترام کریں لیکن ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ واقعات سے تجاہل برتیں۔ جب تک اس ملک کی اکثریت کے رویہ میں کوئی ایسا زبردست تغیر پیدا نہ ہو جائے جس سے اقلیتیں فی الواقعہ مطمئن ہو سکیں ان کو بجا طور پر اس بات کا حق ہے کہ جہاں تک مناسب سمجھیں اپنے حقوق و مصالح کے تحفظ کا مطالبہ کریں۔......... ہم نے اپنے مصالح کے تحفظ کے لئے جو اسکیم تیار کی ہے اس میں ایک نہایت ضروری مطالبہ یہ ہے کہ گذشتہ دس سال سے جداگانہ انتخاب کا جو طریق اس ملک میں قانوناً رائج ہے آئندہ بھی اس پر عمل ہوتا رہے یہاں تک کہ مسلمان خود محسوس کرنے لگیں کہ اب ان کو اس تحفظ کی ضرورت نہیں ہے اس مطالبہ پر بالعموم یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جداگانہ انتخاب کا اصول جمہوریت کے منافی ہے لیکن میرے

نزدیک جمہوریت کا مطلب ہمیشہ یہ رہا ہے کہ کسی ملک کی حکومت بحیثیت مجموعی
اس ملک کے باشندوں کے سامنے جوابدہ ہو۔ عملاً کسی ملک کے باشندے
اپنی حکومت پر اختیار حاصل کرنے کے لئے جو طریقہ استعمال کرتے ہیں وہ یہ
ہے کہ اس ملک کی مجلس عاملہ یا نمائندہ کو قانون ساز مجلس یعنی لیجسلیچر کے سامنے
جو اس ملک کے منتخب شدہ نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے ذمہ دار ٹھہرائیں۔
اب جس حد تک کسی ملک کا نظام ملک کی تمام جماعتوں کے لئے متناسب اور
مساویانہ نیابت کے قابل ہوگا اتنا ہی اس کو اصول جمہوریت سے بعید سمجھنا
چاہیئے اور کوشش کرنا چاہیئے کہ اس قسم کی خامیوں اور نقائص کی کسی نہ کسی
طرح تلافی ہو جائے لہذا جب تجربہ سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس ملک
میں مغربی طریق انتخاب کا نفاذ قانون ساز مجالس میں مسلمانوں کے جائز حصہ نیابت
میں ہمیشہ حارج ہوتا رہیگا۔ بشرطیکہ اس کے لئے کوئی خاص انتظام نہ کر دیا گیا
تو مسلمانوں نے جداگانہ طریق انتخاب کا مطالبہ پیش کیا اندریں حالات یہ کہنا
غلط ہوگا کہ جداگانہ انتخاب کا نظام اصول جمہوریت کے منافی ہے برعکس
اس کے کہ اگر ہم حقیقی جمہوریت کے آرزومند ہیں تو ہمیں اس ملک کے اکثر
حالات کا علاج اس طریق انتخاب کے ذریعے کرنا پڑے گا۔ چونکہ اس طریق
کی ضرورت سالہا سال کے تجربہ سے ظاہر ہو رہی ہے اور اس نظام پر دس
برس سے عملدرآمد جاری ہے۔ لہذا اب یہ ان لوگوں کا فرض ہے جو برابر
اس پر زور دے رہے ہیں کہ اس طریق انتخاب کو یکسر موقوف کر دینا چاہیئے
کہ وہ ہمیں اس امر کا اطمینان دلائیں کہ مستقبل میں اس تحفظ کی ضرورت نہ ہوگی
اس مقصد کے حصول کا اگر کوئی طریقہ ہے تو یہ کہ آئندہ چند سالوں میں اکثریت
کا طرز عمل کچھ ایسی موافقانہ صورت اختیار کرے جس سے ہمیں اس امر کا یقین
ہو جائے کہ وہ ہمارے حقوق و مصالح کو ایسا عزیز رکھتی ہے جیسا کہ خود ہم اور
ہم بااطمینان اس پر اعتبار و اعتماد کر سکتے ہیں حضرات مجھ سے زیادہ اس

خوش آیند صورت حالات کا شاید ہی کوئی شخص متمنی ہوگا اور اگر خوش قسمتی سے مجھے اس کے دیکھنے کا موقع ملا تو میں اس قدر اصرار اور گرم جوشی کے ساتھ جس سے میں اب اس طریق انتخاب کی حمایت کر رہا ہوں اس کے ترک و استرداد پر زور دوں گا اور اس کو نہ صرف اپنا فرض بلکہ اپنے لئے موجب فخر بھی سمجھوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ حضرات کے سینوں میں بھی یہی جذبات موجزن ہیں"

صدر نے پھر آئین کی تبدیلیوں اور ترقیوں پر بھی توجہ دلائی اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی گذشتہ سہ سالہ خدمات کا اعتراف کر کے دونوں کو ضم کر دینے کا مشورہ دیا۔

۱۹۳۲ء میں لیگ کا کوئی اجلاس نہیں ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں لیگ کونسل کے جلسوں میں سیکریٹری اور صدر کے درمیان آویزش رہی اور پھر دو حصوں میں منقسم ہو گئی مگر سر محمد یعقوب نے ان اختلافات کو مٹانے اور مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کو متحد کرنے کی کوشش کی۔

۱۷؍اکتوبر کو کلکتہ میں ایک حصہ کا سالانہ اجلاس زیر صدارت میاں عبدالعزیز منعقد ہوا۔ جس میں مولوی فضل الحق نے ایک قرارداد بہ این مضمون پیش کی کہ کمیونل اوارڈ پر تو مسرت کا اور دستور ہند کے بقیہ اجزا پر عدم اطمینان کا اظہار کیا جائے چنانچہ یہ قرارداد منظور ہو گئی۔

اسی طرح بنگال میں تشدد انگیزی پر جو کانگریس کے زیر سایہ جاری تھی اظہار نفرت کیا گیا۔ اور ہندو مہا سبھا کی اس جد و جہد پر جو وہ کمیونل اوارڈ کے خلاف کر رہی تھی مذمت کی گئی۔

لیکن چوں کہ یہ اجلاس غیر آئینی تھا اس لئے دوسرا اجلاس ۲۵؍نومبر کو دہلی میں حافظ ہدایت حسین بلدامٹ لا کے زیر صدارت منعقد ہوا۔

اس اجلاس میں کمیونل اوارڈ کو بروئے حالات حاضرہ قابل قبول قرار دیتے ہوئے دیگر مطالبات منوانے کی کوشش جاری رکھنے کی قرارداد پاس ہوئی اور اس کی مخالفت کرنے والوں سے اظہار نفرت کیا گیا۔

ایک یہ تجویز پیش ہوئی کہ وزارتوں میں اصل مذہبی اقلیتوں کی کافی نمائندگی

ہو اور ان کی پشت پر ان کی قوم کے اراکین کی سب سے بڑی تعداد ہو نیز یہ کہ ہندو سبھا کی تجاویز سے مرعوب نہ ہو کر ان جماعتوں کے ساتھ جو دل سے تعاون کرنا چاہیں تعاون کرکے پوری ذمہ دار حکومت کی کوشش کی جائے گی۔

فلسطین کی برطانوی پالیسی پر نکتہ چینی کی گئی اور اعلان بالفور کی واپسی پر زور دیا گیا۔ سب سے اہم تجویز یہ تھی کہ مسٹر جناح اور ہز ہائنس آغا خاں کے مشورے سے اتحاد ملی قایم کیا جائے چنانچہ مسلم لیگ کی صفوں میں جو اختلافات تھے وہ ۴ ،۲ مارچ ۱۹۳۴ء کے ایک جلسہ میں جو زیر صدارت حافظ صاحب موصوف منعقد ہوا ختم ہو گئے۔

مسٹر جناح سے جواب ہندوستان واپس آگئے تھے صدارت کے لئے اعیان قوم نے اصرار کیا اور جب انہوں نے منظور کر لیا تو سب متحد ہو گئے اور موجودہ عہدہ داروں نے استعفے دے دئے اور فوراً لیگ کا دستور اساسی جو ۱۹۲۲ء میں منظور ہوا تھا جاری کر دیا گیا۔ ان امور کی توثیق ایک قرارداد کے ذریعہ سے کی گئی۔ نیز مسٹر جناح کو لیگ کے اجلاس سالانہ کے مقام و تاریخ مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا۔

مسٹر جناح نے ۱۹۲۴ء کے واقعات اور اس کے بعد ہندوستان سے نقل سکونت اور پھر واپسی کے متعلق ایک موقع پر اپنے ایک بیان میں لکھنؤ پیکٹ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "وہ سیلف گورنمنٹ کی طرف ایک چھوٹا سا قدم تھا ۱۹۲۴ء سے مسلمان آج تک مکمل سیلف گورنمنٹ کے مقصد کے حصول کی کوششوں میں کسی سے بھی پیچھے نہیں رہے ہیں۔ اس معاملہ میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ چونکہ ابھی تک کانگریس اور لیگ دونوں کی پالیسیوں کا اصل اصول یہی تھا کہ تمام اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی ہر قانون میں حفاظت ہونی چاہئیے خواہ وہ قانون کسی کا بنایا ہوا ہو ۱۹۲۴ء سے گول میز کانفرنس تک بہت کوششیں کی گئیں کہ مسلم ہندو مسئلہ کا حل ہو جائے مجھ میں غرور نہ تھا اور میں کانگریس سے اس کی بھیک مانگتا رہا۔ میں نے اس حل کے لئے اتنا کام کیا کہ ایک اخبار نے میرے متعلق یہ لکھا مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کے لئے کام کرنے سے کبھی بھی نہیں تھکتے۔ لیکن گول میز کانفرنس میں مجھکو زندگی کا دھکا لگا۔ جب کہ خطرہ بالکل سامنے تھا ہندو دماغ و

جذبہ اور ان کے رویہ نے مجھکو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ اتحاد کی کوئی امید نہیں۔ مجھکو اپنے ملک کی حالت سے بہت مایوسی ہوئی اور یہ صورت حال ہماری انتہائی بدقسمتی تھی مسلمان ایک عجیب مخمصہ میں پھنسے ہوئے تھے ان کی زمام قیادت یا تو برطانوی گورنمنٹ کے خوشامدیوں کے ہاتھوں میں تھی یا کانگریس کے خیمہ برداروں کے ہاتھوں میں، گورنمنٹ کے پٹھو اور ٹوڈی ایک طرف اور دوسری طرف کانگریس کیمپ میں جو دغا باز تھے وہ ان کوششوں کو الٹتے رہے ہیں۔ میں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ نہ تو میں اسوقت ہندوستان کی کوئی مدد کر سکتا ہوں اور نہ ہی ہندو ذہنیت بدل سکتا ہوں اور نہ ہی مسلمانوں کو ان کی نازک حالت سمجھا سکتا ہوں اور اتنا مایوس ہوا کہ میں نے یہ طے کیا کہ میں لندن میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لوں اس لئے نہیں کہ مجھے ہندوستان سے محبت نہ تھی بلکہ میں لاچار تھا لیکن میں ہندوستان کے متعلق برابر معلومات رکھتا تھا۔ چار سال کے بعد جب میں نے یہ دیکھا کہ مسلمان اسوقت بہت بڑے خطرے کے سامنے ہیں تو میں نے فوراً ہندوستان واپس آنے کا ارادہ کر لیا۔ چونکہ لندن میں بیٹھ کر میں ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا اور اس وقت میرے پاس کوئی اختیار و طاقت نہ تھی۔ اس لئے میری پوزیشن ایک بھکاری کی سی تھی اور میرے ساتھ بھکاری جیسا برتاؤ بھی کیا گیا۔"

یکم و دوئم اپریل ۱۹۳۴ء کو بمقام دہلی لیگ کونسل کا اجلاس مسٹر جناح کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پہلا دن اتحاد کی اپیلوں اور دیگر تقریروں کے ساتھ ختم ہوا۔

دوسرے دن چند نیشنلسٹ مسلمان بھی اپنی ذاتی حیثیت سے شریک ہوئے جن میں مسٹر آصف علی بارایٹ لا دہلی زیادہ نمایاں تھے انھوں نے ایک تقریر کی جس میں کہا کہ:-

"مسٹر جناح اصولی آدمی ہیں اور یہ کہ مجھے یا اور نیشنلسٹ مسلمانوں کو ان سے محض اصولی اختلاف ہے۔ ہم کو امید ہے کہ مسٹر جناح کے زیر قیادت ہر ایک کے لئے لیگ کے دروازے کھلے رہیں گے اور اس پر کسی خاص پارٹی کا اثر نہ ہوگا صرف اسی امید میں اور مسٹر جناح کی لیگ میں واپسی کی وجہ سے

میں اور میرے رفقاء آج یہاں نظر آتے ہیں کہ تبدیلی روح کا نظارہ کریں۔۔۔
مسٹر جناح ہی ایک ایسے شخص ہیں جن کی سب عزت کرتے ہیں کیوں کہ وہ
چاہتے ہیں کہ ہندوستانی سرشار و راہ ترقی پر گام زن ہو"

اس جلسہ میں کمیونل اوارڈ کے متعلق طے کیا گیا کہ اسوقت کے لئے قبول کیا جاتا ہے جب تک کہ سب قومیں کسی خاص حل کو تلاش نہ کرلیں اور مسلم لیگ دیگر قوموں سے مل کر ایسا حل تلاش کرے اور آئیندہ کے معاملہ میں تعاون کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہے ۔

نیز فلسطین اور اجودھیا میں مسلمانوں پر جو ظلم ہوا تھا اس کے متعلق قراردادیں اور تجویزیں پاس ہوئیں ۔

لیگ کے دستور اساسی میں ترمیم کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ مسٹر جناح نے اس جلسہ کے بعد پریس کو بیان دیا جس میں اجلاس کی نمائندہ حیثیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:-

"میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ وہ ملک کے بہترین مفاد کی خدمت میں کسی فرقہ سے پیچھے نہیں رہے گی۔ وائٹ پیپر کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کے لئے کسی کو دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف اس کی تجاویز کو ایک بار پڑھ لینا کافی ہے۔ ہم میں سے بہت سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ اسکیم ہمارے سروں پر آگئی ہے اور میں بھی خیال کرتا ہوں مگر ساتھ ہی یہ بھی سوچتا ہوں کہ آخر وہ کون سی تدبیر کی جائے جس سے کہ اس کو بالکل اُلٹ دیا جائے اور اس کو بغیر ہندو مسلم اتحاد کے نہیں اُلٹا جاسکتا ۔

ہندوستان کا اس وقت ٹھوس اور متحدہ محاذ ہونا چاہیئے کیا ہم اس نازک وقت میں اس بڑے خطرہ کے مقابلہ میں اپنے ماضی کو نہیں بھول سکتے تاکہ اس خطرے کا مقابلہ کرسکیں جو ہمارے لئے ڈاؤننگ[1] اسٹریٹ اور اور دہلی میں تیار

---

[1] لندن کے اُس محلہ کا نام جہاں پارلیمنٹ واقع ہے ۔

ہو رہا ہے اب یہ کام اکابرین کا ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور سب سے زیادہ مجھے خوشی ہوگی اگر ہندو مسلمانوں میں تعلقات خوشگوار ہو جائیں اور اتحاد ہو جائے اور اس خواہش میں مجھے یقین ہے کہ مجھکو مسلمانوں کا کامل اعتماد حاصل ہے کونسل کی تجویز پبلک کے سامنے ہے کہ کیونکر اتحاد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ہندوستان واپس آکر دیکھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ملک کے سیاسی مفاد کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں کمیونل اوارڈ پر جو زور کہ مسلمان دیتے ہیں وہ صرف اس خواہش کا اشارہ ہے کہ ان تحفظات کو وہ اپنے قومی مطالبے کے اندر چاہتے ہیں مسلمان کسی اور قوم سے قومی حکومت کے معاملہ میں پیچھے نہیں ہیں اصل نکتہ یہ ہے کہ کیا ہم مسلمانوں کو کامل یقین دلا سکتے ہیں کہ جو تحفظات کہ وہ چاہتے ہیں وہ آئندہ کی قانونی اسکیم میں موجود رہیں گے "

۲۸ر نومبر ۱۹۳۲ء کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوان کے ارکان کی ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس میں دارالامرا (ہاؤس آف لارڈز) اور دارالعوام (ہاؤس آف کامنس) سے سولہ سولہ ممبر منتخب کئے گئے اور اس جائنٹ (مشترکہ) کمیٹی کو اختیار دیا گیا کہ وہ بغرض مشاورت ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی ہند کے نمائندوں کو بھی طلب کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے ۲۹ر نومبر کو اپنی کارروائی شروع کر دی۔

(۷) ریاستوں کے (۱۹) برطانوی ہند کے اور (۲) برما کے نمائندے طلب کئے گئے مسلمان نمائندے ہزہائنس آغاخاں، چودہری ظفراللہ، اے۔ کے غزنوی، بیگم شاہنواز، سر عبدالرحیم اور ڈاکٹر شفاعت احمد خاں اور ۱۳ نمائندے دیگر قوموں کے تھے۔ لیکن ان نمائندوں کو کوئی ذمہ دارانہ حق و اختیار نہ تھا کمیٹی کے ۱۵۹ جلسے منعقد ہوئے۔ ۱۲۰ گواہان کے بیانات لئے گئے اور ۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۴ء تک کارروائی ختم ہو گئی۔

کمیٹی کے سامنے ایک عرضداشت تمام ہند کے نمائندوں نے ہزہائنس آغاخاں کی قیادت میں اور دوسری ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے پیش کی جو قرطاس ابیض کے خاکہ پر بطور تبصرہ و احتجاج تھیں، کمیٹی نے چند تغیرات کے بعد اپنی رپورٹ مرتب کی جو جائنٹ پارلیمنٹری

رپورٹ متعلقہ اصلاحات ہند کے نام سے شائع کی گئی۔

رپورٹ میں صوبوں کی خود مختاری اور وفاقی مرکز شعبہ جات خاص اور صوبہ برما کی علیحدگی پر طویل مباحث و تجاویز ہیں۔

مقدمہ میں اقوام ہند کے متعلق ایک فقرہ حسب ذیل ہے:۔

"ہندوستان کا جزوی براعظم جو کوہستان ہمالیہ اور راس کماری کے درمیان واقع ہے ۱۵۷۰۰۰۰ مربع میل کے رقبہ پر مشتمل ہے اور اس کی آبادی اب تقریباً ۳۴۰۰۰۰۰۰۰ ہے۔ اس رقبہ ہی سے برطانوی ہندوستان اور دیسی ریاستوں میں علی الترتیب ۸۲۰۰۰۰ مربع میل اور ۷۰۰۰۰۰ مربع میل شامل ہیں اور ان کی آبادی ۲۶۰۰۰۰۰۰۰ اور ۸۰۰۰۰۰۰۰ ہے۔ اس میں بہت سی اقوام اور قبائل آباد ہیں جو تقریباً ایک درجن خاص زبانیں اور دو سو سے زیادہ ان کی شاخیں بولتے ہیں۔ اور اکثر اصل روایات اور طریقۂ زندگی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں جیسے یورپ کی مختلف اقوام۔ ہندوستان کے باشندوں میں دو ثلث ہندو مذہب کی کسی نہ کسی شق کے پیرو ہیں۔ ۷۷۰۰۰۰۰۰ اسلام کے ماننے والے ہیں ان دونوں میں محض مذہب ہی کا فرق نہیں ہے بلکہ ان کے قانون و تمدن میں بھی فرق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں دو مختلف اور جداگانہ تمدنوں کے نمائندے ہیں ہندو دھرم کی خصوصیت ذات پات کا طریقہ ہے یہ طریقہ اس کے مذہبی اور معاشرتی نظام کی بنیاد ہے اور ایک بہت محدود دائرے کے علاوہ مغربی فلسفوں سے تعلق کا اس پر بہت کم اثر پڑا ہے اس کے مقابلہ میں اسلام کا مذہب بنی آدم کے مساوات کے تخیل پر قائم ہے ان دو بڑی اقوام اور ہندوستانی عیسائیوں کے علاوہ جن کی تعداد اب تقریباً ۶۰۰۰۰۰۰ ہے دوسرے مذاہب اور فرقوں کی بھی لامحدود نوعیتیں موجود ہیں جو حیوان پرستی کے سادہ عقائد سے لیکر بودھوں کے صوفیانہ تخیلات تک پہنچتے ہیں۔ ہندوستان کی آبادی کی بڑی کثرت زمین سے معاش حاصل کرتی

ہے اور بیشتر آبادی اور غیر احتیاجی طریقہ کاشت کی پابند ہے۔ ملک کی مجموعی دولت کی مقدار زیادہ ہے لیکن بیشتر آبادی کی کثرت کے سبب سے جس میں اب بھی اضافہ ہورہا ہے معیار زندگی ادنی ہے اور یورپ کی پسماندہ ممالک کے معیار سے بھی مقابلہ ممکن نہیں ہے شہری حلقوں کے باہر حرف شناسی نادر ہے اور شہری حلقوں میں بھی پڑھے لکھوں کا تناسب مجموعی آبادی سے بہت کم ہے۔"

یہ رپورٹ ہر حیثیت سے ہندوستان کے متحدہ مطالبہ سے کوئی مناسبت نہ رکھتی تھی اور بہر نوع مایوس کن تھی اور ہر نقطہ خیال کے سیاست دانوں نے اس کو ناپسندیدہ ہی نہیں بلکہ مایوسانہ اور مبغوض نظروں سے دیکھا تاہم فرقہ وارانہ فیصلہ ایک امر طے شدہ تھا۔

اب یہ رپورٹ مرکزی اسمبلی میں پیش ہونے والی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں جدید انتخابات ہوئے اور مسٹر جناح منتخب ہونے کے بعد انڈیپنڈنٹ پارٹی کے لیڈر تسلیم کئے گئے۔ اس کا نصب العین بھی آزادی تھا اور بارہا انڈیپنڈنٹ پارٹی نے کانگریس کے ساتھ ہم نوا ہو کر حکومت کو شکستیں دیں۔

۷، فروری ۱۹۳۵ء کو جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ اسمبلی میں پیش ہوئی۔ اب اس نئے دور میں جو جدید اصلاحات سے پیدا ہونے والا تھا مسلمانوں کے مستقبل کے لئے مسٹر جناح کی فطانت و ذکاوت پر ہی سب کچھ منحصر تھا۔

انہوں نے رپورٹ کو تین حصوں میں منقسم کر کے بحث کی جس کے متعلق ایک رزولیوشن پیش کر دیا تھا۔ پہلا حصہ کمونل اوارڈ۔ دوسرا حصہ صوبجاتی آزادی اور تیسرا حصہ مرکزی آزادی تھا۔ پہلے حصہ میں کانگریس کی خاموشی یقینی تھی اور وہ خاموش رہی چنانچہ مسٹر ڈیسائی مخالف پارٹی کے لیڈر نے اس کو ختم یا مسترد کئے جانے کی تحریک پیش کرتے ہوئے کمیونل اوارڈ کی بابت غیر جانبدارانہ رویہ رکھا مسٹر جناح نے کمیونل اوارڈ کو تسلیم کئے جانے کے متعلق ترمیم پیش کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"میری ترمیم ہے کہ جب تک ——— (حضرات! میری شرط کے تعینات کو خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے) ——— "ہم آپس میں ملکر کوئی معقول اور اعلیٰ لائحہ عمل پیش نہ کر سکیں اس وقت تک فرقہ وارانہ حل تسلیم کر لینا چاہیئے۔ حضرات

میرے ہندو دوست فرقہ وارانہ حل سے مطمئن نہیں ہیں۔ بیشک میں خود بھی نہیں ہوں۔ اور یقین دلاتا ہوں کہ مسلمان بھی اس سے مطمئن نہیں ہیں ہرگز نہیں ہیں!! کیونکہ یہ حل مسلمانوں کے درد کا پورا علاج نہیں ہے۔ اور ان کے مطالبات کو بکمال ضرورت پورا نہیں کرتا۔ حضرات میں بھی اس حل سے اپنے عدم اطمینان کا یقین دلاتا ہوں اور اگر میری انفرادی رائے دریافت کی جائے تو عرض کروں گا کہ ذاتی طور پر میں اس کو خودداری کے خلاف سمجھتا ہوں کہ غیر قوم کے مسلط کردہ حل کو قبول کریں مجھے اس وقت تک روحانی اطمینان نہ ہوگا جب تک ہندوستان کے متعلقہ اقوام۔ فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق کوئی معقول حل خود ہی تجویز کرلیں گی۔ ہم کو خود اپنا حل پیش کرنا چاہیئے.......

میں نے اس وقت تک آپ حضرات کے سامنے جو کچھ پیش کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آنکھ بند کرکے اسے قبول کرلیں۔ اصل میں یہ بات ہے کہ آپ کو خود غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ میں نے جو کچھ رائے قائم کی ہے وہ درست ہے میں فرقہ وارانہ حل کو کس لئے قبول کرتا ہوں۔ زیادہ گفتگو کرنا نہیں چاہتا اور نہ ماضی کی تاریخ پر تفصیلی بحث کرکے ایوان کا زیادہ وقت لینا چاہتا ہوں میں صرف اس چیز کو آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی مختلف اقوام اور فرقوں نے بہت حد تک باہمی سمجھوتہ کی کوشش کی لیکن افسوس کہ ہم کسی معقول نتیجہ پر نہ پہونچ سکے۔ خواہ میں اس حل کو قابل تسلیم سمجھتا ہوں لیکن اس وقت یہ ماننے اور ظاہر کرنے کے لئے مجبور ہوں کہ فرقہ وارانہ برطانوی حل کے بغیر (ایسی حالت میں جس کا اوپر ذکر کیا گیا) کوئی دستوری اسکیم عملی طور پر کامیاب نہیں بنائی جاسکتی۔"

حضرات اس حل کو کسی طرح بھی ہم مسترد نہیں کرسکتے اور اس حالت میں اسکو نامنظور کرنے کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم بالکل مجبور سے ہوگئے ہیں میں مخالف پارٹی کے لیڈر کے جذبات و خیالات کی پوری حمایت کرتا ہوں۔

بیشک یہ درست ہے کہ سیاسیات میں مذہب کو دخیل نہیں ہونا چاہیئے اور نہ اسے دخیل ہونے دینا چاہیئے اسی طرح نسل کو بھی سیاسیات پر حاوی نہ ہونے دینا چاہیئے۔ گو زبان کا مسئلہ اسقدر زیادہ وقیع نہیں ہے۔.......

میں یہ جانتا ہوں کہ مذہب کو سیاسیات پر دخیل و حاوی نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مذہب کا معاملہ انسان کا اور خدا کا براہ راست تعلق ہوتا ہے اس سے ہمیں سروکار نہیں ——— بے شک میں مخالف لیڈر سے اس بات میں متفق ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ صرف مذہبی مسئلہ ہے کیا صرف نسلوں کی آویزش کا معاملہ ہے۔ کیا یہ صرف زبان کے اختلاف پر ہی مشتمل ہے۔ نہیں۔ ہندوستان کی اقلیتوں کا مسئلہ قطعی طور پر ایک سیاسی مسئلہ ہے.......

بہرحال حضرات یہ مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے دوسرے ممالک میں بھی اس قسم کا مسئلہ موجود ہے یا نہیں! بیشک ہے۔ ہر ملک میں اقلیتوں کا مسئلہ موجود ہے اور وہاں کے لوگ بہادری کے ساتھ ان روح فرسا حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ جن کا اس مسئلہ یا اُس کے متعلقات سے تعلق ہوتا ہے.....

پھر کیا وجہ ہے کہ ہم بھی جرأت کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ نہ کریں اور تمام وقتوں کے خلاف جہاد نہ کریں جب دوسرے ممالک اقلیتوں کے مشکل مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے فرقے مایوس ہو جائیں اور اس کو حل نہ کر سکیں...............

اقلیت بجائے خود ایک دنیا ہوتی ہے ریاست (اسٹیٹ) میں اقلیت ایک منفرد حالت میں بہت سی چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے اس کا خیال، تصور تمدن، زبان، مذہب، نسل، رنگ، آرٹ، ادب غرض ہر چیز دوسری اقلیت یا دوسرے فرقہ سے مختلف ہوتی ہے، لیکن باوجود اس کے وہ ایک ریاست کا جزو لاینفک ہوتی ہے۔ سوال صرف یہ ہوتا ہے کہ اس فرقہ کے سیاسی اور

بنیادی حقوق کو عملی طور پر کس طرح قبول کیا جائے فرقوں کا مسئلہ قطعی طور پر سیاسی حفاظت اور ترقی کا مسئلہ ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہمیں اس مسئلہ کو حل کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرکے اس کا صحیح و معقول حل تلاش کرنا چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میرے معزز دوست لیڈر مخالف پارٹی نے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ پہلے ہمیں حقوق مل کر حاصل کر لینے چاہئیں۔ اس کے بعد تقسیم کا معاملہ ہوتا رہے گا۔ ۔

میں نہایت ادب کے ساتھ اس اصول کو منطقی بنیادی طور پر غلط سمجھتا ہوں اصل میں اقلیتوں کے مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے۔ پہلے حقوق طلبی و حصول حقوق پر عمل کیا جائے اور تقسیم حقوق کو مستقبل کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ کوئی جاگیر نہیں ہے کہ پہلے حاصل کی جائے گی اور بعد میں اس کی حصہ بٹی ہوگی نہ یہ کوئی لوٹ کا مال ہے کہ بعد میں برابر کے حصے بانٹے جائیں گے اگر یہ بات ہے تو گاندھی جی نے اچھوتوں کے معاملہ کے لئے کیوں فاقہ مرگی شروع کی تھی اور حصول حقوق سے پہلے تعین حقوق کے مسئلہ کو کیوں فوقیت دی تھی۔ ۔ ۔

حضرات صحیح طریقہ یہی ہے جو گاندھی جی نے اختیار کیا، اور میں بھی اس پر زور دینا چاہتا ہوں۔ بیشک گاندھی جی نے ٹھیک کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اچھوت اور پسماندہ اقوام ہندوؤں کا پچاس فیصدی حصہ ہیں۔ اور انکو راضی کئے بغیر سیاسی اقتدار ہندو قوم سے علیحدہ کرنا نہ چاہا۔ اور کسی نہ کسی طرح ان سے معاملہ کر ہی لیا۔ میں نے انگلستان میں ان سے کہا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں تو گاندھی جی نے جواب دیا کہ میں اچھوتوں کو ہندو قوم سے علیحدہ حقوق دلوانا نہیں چاہتا ورنہ وہ عام ہندوؤں سے الگ ہو جائیں گے اور ہندو قوم انتشار اور سیاسی افتراق کا شکار ہو جائے گی۔ لہٰذا میں پہلے ان ہی سے فیصلہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ گروہ ہندو حصے سے باہر نہ نکلنے پائے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا کہ

میں ہندو دوستوں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے اچھوتوں کو اپنے حقوق
میں شریک بنا کر انکو اپنا سیاسی حلیف بنا لیا میں اسی اسپرٹ کو اپنے لئے بھی دیکھنا
چاہتا ہوں۔ پس آئیے ہمارے ساتھ بھی اسی طرح کا انصاف کیجئے میرا ہاتھ دوستی
کے لئے آگے بڑھا ہوا ہے۔ آئیے اور یہی اسپرٹ دکھائیے دوسروں سے لڑنے
کے بجائے ہم خود کیوں نہ کسی معاہدہ پر متفق ہو جائیں میں اس وقت فرقہ وارانہ
حل کی بابت ان الفاظ سے زیادہ کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا"

اس کے بعد مسٹر جناح نے پوری اسکیم پر مدلل بحث کی اور اسی ضمن میں کہا کہ:۔

"جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ، قرطاس ابیض اور تمام متعلقات ایک
عیارانہ فریب ہے اور فیڈریشن کا سراب ہے، فیڈریشن جس چیز کا نام ہے اس
کا عکس بھی اس اسکیم میں نظر نہیں آتا۔ سائمن کمیشن کی سفارشات کا بھی یہی
عالم ہے۔ . . . .

یاد رہے کہ میں صرف اس اسکیم کو معرض بحث میں لا رہا ہوں اصول وفاق سے
مجھے کوئی پرخاش نہیں، میری رائے تو یہ ہے کہ اس اسکیم کو یہیں ختم کر دیا جائے
کلیتہً ختم کر دیا جائے، میں نے آپ کی اسکیم کو پوری طرح سمجھ لیا ہے یہ بنیادی
طور پر غلط، قطعی مہمل، فضول اور ناقابل قبول ہے"

پھر مسٹر جناح نے مرکزی اسکیم کی خرابیوں پر تبصرہ کیا اور اس سلسلہ میں کہا کہ:۔

"اس وقت ہمارے لئے جو منحوس چکر بنایا گیا ہے وہ یہ ہے، اول صوبجاتی
آزادی پر مشروط و محدود فیڈریشن، اور اس کے بعد مرکزی ذمہ داری، یقین
کیجئے حضرات ہم اس چکر سے کبھی نہیں نکل سکتے اور شاید پہلی ہی منزل میں
ہمارا دم نکل جائے گا۔ ہندوستان جس سیاسی ترقی اور بیداری کا طلبگار
ہے وہ اس چکر میں چلنے سے حاصل نہیں ہو سکتی"

پھر ایک طولانی بحث کر کے آخر میں کہا کہ:۔

"میرا کام دراصل یہ ہے کہ کامل استرداد سے پہلے ایک ترمیم ضابطہ بھی پیش

کردوں اور یہ بتاؤں کہ اس کی جگہ کس نعم البدل کی ضرورت ہے۔ محض استرداد سے کام نہیں چلے گا"

میری ترمیم چاہتی ہے کہ "صوبجاتی حکومت کا نظام درست کیا جائے، دوہرا ایوان نہ بنایا جائے۔ مرکزی حکومت کی اسکیم قطعی مسترد کر دی جائے اور اس کی جگہ ایک حقیقی اور آزاد اسکیم بنائی جائے جس میں ہندوستان کی رائے عامہ کو مرجع رکھا جائے، یعنی تمام نقشہ از سر نو تعمیر ہو تاکہ برطانوی ہند میں حقیقی معنوں میں ذمہ دارانہ حکومت قائم ہو"

اس بحث کے نتیجہ میں مسٹر جناح نے کیمونل اوارڈ کو حکومت کے ساتھ مل کر اور باقی حصص میں کانگریس کے ساتھ اتحاد کرکے رزولیوشن کی صورت میں پاس کرالیا۔

باب دہم

اگرچہ اسمبلی کے فیصلہ سے کمیونل اوارڈ ایک طے شدہ مسئلہ تھا تاہم مسٹر جناح اور صدر
کانگریس بابو راجندر پرشاد نے فرقہ وارانہ حل کا ایک اصول قائم کیا مگر بنگال کے کانگریسی
جو اسمبلی سیشن کے موقع پر موجود تھے اُنھوں نے شدید اختلاف کیا اور مجبوراً دونوں
کو متفقہ اعلان کرنا پڑا کہ:-

"فرقہ وارانہ مسئلہ کو طے کرنے کے لئے ہم نے نہایت ہی دیانت دارانہ
کوشش کی کہ اس سے دونوں فریق مطمئن ہو سکیں مگر ہم کو افسوس ہے کہ ہم
باوجود انتہائی کوشش کے اس قسم کا کوئی حل نہ نکال سکے، ہم اس کو محسوس
کرتے ہیں کہ ملک کی ترقی کے لئے فرقہ وارانہ یکجہتی اور اتحاد نہایت ضروری
ہے اور ہم صرف یہی امید کر سکتے ہیں کہ جب حالات خود ساز گار ہوں گے تو
آئندہ زیادہ نتیجہ خیز کوشش کا نتیجہ حاصل ہو سکے گا۔"

اس کے بعد اب تا وقتیکہ کوئی ایسا حل حاصل نہ ہو جس پر دونوں فریق مطمئن اور
رضامند ہو جائیں کسی اختلاف و احتجاج کی گنجائش نہ تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی
اپنے صدارتی ایڈریس کانگریس منعقدہ لکھنؤ اپریل ۱۹۳۶ء میں فرقہ وارانہ فیصلہ کی
بہت کچھ منطقی مذمت کے باوجود یہ کہنا ناگزیر ہو گیا کہ:-

"اگر ہمیں جمہوریت کے اصولوں پر عمل کرنا ہے تو ہمیں مجوزہ فرقہ وارانہ تقسیم کا
خاتمہ کرنا پڑیگا اور میرا خیال ہے کہ اس کا خاتمہ ہو کر رہیگا لیکن فرقہ وارانہ فیصلہ
کا خاتمہ اس جارحانہ طرز عمل سے نہیں ہو سکے گا۔ جو اس کے مخالفوں نے اختیار
کر رکھا ہے۔ اس قسم کی سرگرمیاں اس فیصلہ کو زیادہ مستحکم کر دینگی کیونکہ اسطرح
کی صورت حالات ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی مہلت نہیں دیتی۔ فرقہ وار

فیصلہ کے متعلق کانگریس نے جو حکمت عملی گذشتہ ایام میں اختیار کر رکھی تھی مجھے اس سے اتفاق نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اس حکمت عملی کی بنیاد خالص جذبہ پرستی کا نگریس نے ہمیشہ آزادی کے مسئلہ کو مقدم سمجھا ہے اور دوسرے مسائل کو جنہیں فرقہ وار معاملات بھی شامل ہیں اس نے ہمیشہ ثانوی حیثیت دی ہے۔ اکثریت کو اقلیتوں کے شکوک اور خطرات کو دور کرنے کے لیئے فیاضی سے کام لینا چاہیئے خواہ اس فیاضی میں تھوڑی بہت غیر معقولیت ہی کیوں نہ ہو فرقہ وار فیصلہ کے متعلق کانگریس کی حکمت عملی کے لیئے یہ جواز کافی ہے "

اگست ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی جو منشور شائع کیا اور اس میں فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق جو بحث کی اس میں باوجود اس فیصلہ کی انتہائی بُرائی کے تسلیم کیا گیا کہ ملک کے خاص خاص فرقے ہی باہمی افہام تفہیم سے فرقہ وارانہ مسائل کا قابل اطمینان حل تلاش کر سکتے ہیں "

مگر مختلف اطراف میں احتجاج کی قوت سے اسکو مسترد کرانے کی کوششیں شروع ہوگئیں بنگالی ہندوؤں نے وزیر ہند کے پاس میموریل بھیجا اور پھر پنجاب میں احتجاجی کارروائیاں ہوگیں پنڈت جواہر لال نہرو نے بمقام بنارس ایجی ٹیشن پر اظہار ناپسندیدگی کیا اور بنگال کی مہم کا بیڑا جب بنگال پراونشل کانگریس کمیٹی نے اُٹھایا تو صدر کانگریس نے اس کے سیکریٹری مسٹر سرت چندر بوس سے جواب طلب کیا کہ پراونشل کانگریس کمیٹی نے اس اہم معاملہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تجویز کردہ راستہ سے مختلف راستہ اختیار کرنے کا کیوں فیصلہ کیا۔ مسٹر سرت چندر بوس نے اپنے ایک نہایت طولانی جواب میں اپنے فیصلہ کی تائید کرتے ہوئے یہ بھی تحریر کیا کہ:۔

"کانگریس کے ہیئی منشو میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ کانگریس کی جانب سے نئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو کلیتہً نامنظور کرنے میں کمیونل اوارڈ کی نامنظوری بھی شامل ہے ایکٹ کے علاوہ بھی کمیونل اوارڈ قطعی طور پر ناقابل منظوری ہے۔ بنگال کی کانگریس اور کانگریس خیال کے آدمی محسوس کرتے ہیں کہ نئے آئین کو مسترد کرانے کے لئے ایجی ٹیشن کرنا اور کمیونل اوارڈ

کو منسوخ کرانے کے لئے نہ کرتا منطقی طور پر ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔۔۔۔

ہماری یہ رائے ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کو متفقہ طور پر طے کرنے کے لئے کانگریس کی جانب سے تمام ملک میں کمیونل اوارڈ کے خلاف ایجی ٹیشن نہایت ضروری ہے۔"

اسی سلسلہ میں بابو جگت نرائن لعل پریسیڈنٹ بہار نیشلسٹ پارٹی نے بھی صدر کانگریس کو ایک خط تحریر کیا تھا۔ مگر اب اُن کے خیالات میں بھی تغیر شروع ہوا اور جواب میں انہوں نے تسلیم کیا کہ:۔

کمیونل اوارڈ جیسے اہم معاملہ میں کانگریس غیر جانبدار نہیں رہ سکتی۔ اور کانگریسی ممبر اوارڈ کی مخالفت میں ووٹ دینگے۔ کانگریس اس معاملہ میں غیر جانب دار بے لوث رویہ اختیار نہیں کر سکتی۔۔۔۔ پھر ابتدائی غور و خوض کا موضوع حصول آزادی کے مسئلہ کو قرار دیتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ:۔

ایسی حالت میں جبکہ مختلف وجوہات کی بناء پر کیمونل اوارڈ کے خلاف ایجی ٹیشن کرنا موافق نہ آئے تو اس کے خلاف خاص ایجی ٹیشن کرنے سے بڑے مقصد کو نقصان پہونچے گا۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہو گا کہ ہم درحقیقت نئے آئین یا یوں کہیئے کہ برطانی ملوکیت پرستی کے اندر تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ دوم ایجی ٹیشن کا دارومدار اندرونی صورت حالات پر ہے ممکن ہے کہ کیمونل اوارڈ کے حق میں مسلمانوں کے ایجی ٹیشن کے مقابلہ سے کیمونل اوارڈ کو قائم رکھنے کے حق میں صورت حالات پیدا ہو جائیگی۔ کیونکہ حکومت برطانیہ ہمارے تصادم سے ضرور فائدہ اُٹھائے گی یہی وجہ ہے کانگریس یک طرفہ ایجی ٹیشن پسند نہیں کرتی وہ آزادی کی بناء پر ایسی صورت حالات پیدا کرنا چاہتی ہے جو کہ اس مسئلہ کو حل کرنے میں امداد پہنچائے اس کے یہ معنی نہیں کہ مختلف فرقوں کے تمام فرقہ پرست لیڈر آپس میں سمجھوتہ کرلیں گے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ لوگ خواہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں سیاسی آزادی اور اقتصادی مسائل کو اہم سمجھتے ہیں وہ فرقہ وارانہ فیصلہ کو اس کی صحیح شکل میں دیکھ سکیں گے اور اس کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے میں اشتراک عمل کر سکیں گے سردست کانگریس کا یہ خیال ہے کہ مذکورہ بالا دونوں وجوہ کی بناء پر یہ امر غیر پسندیدہ ہے کہ

کمیونل ایوارڈ کی طرف خاص توجہ مبذول کی جائے۔ اگرچہ بلاشبہ اسکی ناپسندیدگی اور مخالفت کا اعلان ہو جانا چاہئے۔ جیسا کہ انتخابی منشور میں کیا گیا ہے اور ہم میں سے بہتوں نے انفرادی حیثیت سے بھی کیا ہے"

اب مسٹر سرت چندر بوس نے پورے عزم کے ساتھ اس ایجی ٹیشن کو بنگال سے پنجاب میں منتقل کیا۔ انہوں نے کئی جگہ سخت تقریریں کیں اور آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے نوجوان طلبا کو اس مقصد کی غرض سے ایجی ٹیشن کرنے کے لئے انہوں نے کہا کہ:۔

"میں نوجوانوں کی اعانت سے فرقہ وارانہ فیصلہ اور جدید دستور سے ملک کو نجات دلانہ چاہتا ہوں فرقہ وارانہ فیصلہ میں تمام اقوام کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے اور اس سے ہندوستانی قوم میں نفاق و شقاق پھیلا دیا گیا ہے فرقہ وارانہ فیصلہ اور جدید دستور کے خلاف جنگ شروع کرنے میں ملک نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی امداد چاہتا ہے کیونکہ یہ صرف نوجوان ہی ہیں جو فرقہ پرستی میں وسیع النظر ہیں جو کوئی ذاتی غرض نہیں رکھتے اور ان کے پاس لوٹ مار کر کے فائدہ حاصل کرنے کی کوئی اسکیم بھی نہیں"

دسمبر ۱۹۳۵ء میں مہاسبھا نے زیر صدارت پنڈت مالویہ رزولیوشن پاس کیا کہ:۔

"کونسلوں اور اسمبلی میں وہی ہندو منتخب کئے جائیں جو ہندو جاتی کے تحفظ حقوق کا جذبہ دل میں رکھتے ہوں اور صرف یہ واحد مقصد پیش نظر ہو کہ ہندو جاتی کے حقوق کا تحفظ کیا جائے"

بھائی پرمانند نے یہ چیلنج کیا کہ:۔

"ہندوستان ہندوؤں کا وطن ہے مسلمان، عیسائی اور دوسری قومیں جو ہندوستان میں آباد ہیں وہ بطور مہمان ہیں اور اسی وقت تک رہ سکتے ہیں جبتک کہ وہ مہمان کی حیثیت سے رہیں"

اردو ہندی کا سوال تو اور بھی زور پکڑ گیا تھا کہ مسٹر گاندھی نے اپنی پوری طاقت

ہندی کے عروج اور اردو کی مخالفت پر مبذول کر دی اور جا بجا جلسوں میں اُس کو مٹانے کی قرار دادیں پاس ہوئیں چنانچہ نومبر ۱۹۳۶ء میں لاہور میں آریہ سماج کانفرنس کے جلسہ میں کہا گیا کہ:-

"اردو ایک بدیشی زبان ہے اور ہماری غلامی کی یادگار ہے اس زبان کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہیئے۔ اُردو نے جو ملچھوں کی زبان ہے ہندوستان میں رواج پا کر ہمارے قومی مقاصد کو سخت نقصان پہونچایا ہے"

کمیونل اوارڈ کی نسبت اس جذبہ و احتجاج کے بالمقابل غیر مسلم سیاسیین کا ایک طبقہ اس کا حامی رہا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۳۶ء میں بمبئی کے مسلم طلبا کی یونین میں سر چمن لال سیتلواد نے تقریر کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا کہ:-

"جب تک اقلیت رکھنے والی اور اکثریت رکھنے والی اقوام میں اتحاد نہ ہوگا اُس وقت تک جداگانہ انتخاب کے علاوہ کوئی اور صورت باقی نہیں رہتی" اس جلسہ کے صدر سر کاؤس جی جہانگیر تھے اُنھوں نے بھی کہا کہ:-

"کانگریس جداگانہ انتخاب کو صرف اس صورت میں ختم کرا سکتی ہے کہ وہ اقلیتوں پر اعتماد حاصل کرے"

بنگال میں کمیونل اوارڈ کے منسوخ کرانے کی جو زبردست تحریک شروع ہوئی اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ امر اور قابل بیان ہے کہ دسمبر ۱۹۳۶ء میں جب وائسرائے ہند کلکتہ گئے تو برٹش انڈیا ایسوسی ایشن نے ایک ایڈریس پیش کیا اور اُس میں بنگال کے متعلق فرقہ وارانہ فیصلہ کی تنسیخ پر زور دیا گیا مگر وائسرائے نے صاف اور واضح جواب دیا کہ:-

"فیصلہ اس وقت تک اٹل ہے جبتک پارلیمنٹ تبدیلی نہ کرے یا دونوں فرقے از خود تبدیلی پر مائل نہ ہوں"

اس کے بعد بعض ہندو مسلم زعماء میں صوبہ بنگال کے متعلق ایک معقول سمجھوتہ ہوا جس میں دس سال تک کمیونل اوارڈ کو بشرطیکہ باہمی معاہدہ سے ترمیم و تنسیخ نہ ہو قائم

رہنے کی بھی شرط تھی لیکن دوسرے اطراف سے ہندوؤں نے شدید مخالفت کی اور یہ سمجھوتہ کالعدم ہوگیا۔

اس معاہدہ کے متعلق ڈاکٹر راڈ کملا مکرجی نے جو بنگال اینٹی کمیونل اوارڈ کمیٹی کے سیکریٹری تھے کہا کہ :-

"یہ سمجھوتہ اس کمیونل اوارڈ کے خلاف تحریک کا نتیجہ ہے جو گذشتہ اپریل میں بنگال کی ہندو اقلیت کی جانب سے وزیر ہند کو میموریل بھیجنے کی بناء پر شروع کی گئی تھی۔ میموریل پر مہاراج بردوان ڈاکٹر ٹیگور سر پی۔ سی۔ رائے۔ مسٹر جے، این باسو سر نل رتن سرکار کے دستخط تھے یہ میموریل ایک بڑے جلسہ میں منظور ہوا، جس کے صدر ڈاکٹر ٹیگور تھے۔ اسی جلسہ میں ایک اینٹی اوارڈ کمیٹی مقرر ہوئی۔ نیز مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی گئی جس نے متعدد اجلاس منعقد کئے۔ اور اس کوششوں سے سمجھوتہ ہوا، سمجھوتہ کے ذریعہ سے بنگال کے ہندوؤں کو ایگزیکٹو کونسل اور ایڈمنسٹریشن میں وہ پوزیشن حاصل ہو جائے گی، جس کو نئے آئین میں اُنہیں دینے سے انکار کر دیا گیا۔

امید ہے کہ مجلس آئین ساز میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برابر نشستیں تقسیم کر کے مستقبل قریب میں سمجھوتہ کے اصول کو لیجس لیچر تک توسیع کر دی جائیگی اور اس طریقہ پر مکمل فرقہ وارانہ حل ہو جائے گا۔ بنگال کے ہندو اور مسلمان ہر فرقہ وارانہ اختلافات مٹا کر یہ قوم پرستی کا گڈھ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں گے"

مگر ایک حصہ سیاسئین کا بنگال میں ہی ایسے عمدہ حل کی مخالفت پر آمادہ ہوگیا اور پنجاب کے اخبارات نے اس کے خلاف زہر فشانی شروع کر دی۔

بنگال کے متعلق یہی شرائط ۱۹۳۳ء کی جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی میں بھی پیش ہوئے تھے جن کو ہندو مسلم لیڈروں نے منظور کر لیا تھا لیکن اور ہندوؤں کے احتجاج سے مسترد ہو گئے تھے۔

باایں ہمہ کہ اس وقت مسلمانوں میں مختلف جمعیتیں قائم تھیں اور وحدت سیاسی تقریباً فنا ہو چکی تھی تاہم آل انڈیا مسلم لیگ ایک مرکزی اور اہم سیاسی جماعت

کی حیثیت سے قائم تھی۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں اس کا سالانہ اجلاس بمبئی میں ہوا۔ جس کی خصوصیت یہ تھی کہ ان مختلف جمعیتوں کے نمایندے جو لیگ سے بے تعلقی کا اظہار کرتی تھیں شریک ہوئے۔ مولوی محمد احمد کاظمی نے (جو مجلس احرار کے روح رواں ہیں) لیگ کی کارروائیوں میں زبردست حصّہ لیا، مولانا احمد سعید دہلوی رکن جمعیت العلماء نے پریس کے نمایندے سے کہا کہ "جناح کی بے مثال شخصیت نے مجھ جیسے انتہا پسند کو بھی مسلم لیگ میں شامل کر لیا ہے"

صدر اجلاس سر وزیر حسن تھے جو ہائیکورٹ کی ججی سے ریٹائر ہونے کے بعد پھر اب لیگ میں شامل ہوئے تھے اور جنہوں نے ججی سے قبل مسلسل دس گیارہ سال اس کی ترقی اور استحکام میں کوشش کی تھی انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں آئین جدید کے نقائص پر روشنی ڈال کر کمیونیل اوارڈ کے متعلق کانگریس کی روش اور نیشنلسٹ پارٹی کے قیام پر جس کو پنڈت مالویہ جی نے قائم کیا افسوس و رنج ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"میری رائے میں کانگریس کی اس پالیسی نے ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری کے حصول کے لئے ایک متفقہ کوشش کے لائحہ عمل کو بروئے کار لانے میں مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ سیاسی مسائل فرقہ بازیوں سے کبھی حل نہیں ہو سکتے۔ خواہ یہ فرقے ذہنی کرتب کے مظاہرے کے لئے کیسے ہی نفیس ہوں"

اس کے بعد پنڈت مالویہ اور دوسرے ہندو لیڈروں سے کمیونیل اوارڈ کے خلاف جدوجہد ترک کرنے کی اپیل کی اور ہندوستان کی مرکزی و صوبجاتی ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمایندگی کے متعلق ہندوؤں نے جو روش اختیار کی اس کی نسبت کہا کہ:۔

"ان کے نزدیک گویا یہ مسئلہ قابل توجہ ہی نہیں۔ مسلمان اگر سرکاری ملازمتوں میں اپنے جائز حصّہ پر زور دیتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ ان کے دل میں سرکاری عہدہ کے وقار اور عزت کے حصول کی تمنا ہے بلکہ میرے نزدیک یہ ایک خالص اقتصادی مسئلہ ہے۔ عام بیکاری نے اور بالخصوص

ملک کی تعلیم یافتہ جماعتوں کی بیکاری نے اس مسئلہ کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس ملک میں سرکاری ملازمت معاش کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ کیا گورنمنٹ نے ملک کی تعلیم یافتہ جماعتوں کی اقتصادی مشکلات کے ازالہ کے لئے کوئی نئی راہ نکالی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حکومت نے اس وقت تک بیکاری کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کوئی عملی کارروائی نہیں کی بے کاری کے متعلق سپرو کمیٹی کی رپورٹ کا جو خیر مقدم صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ نے کیا ہے اس سے ہمارے قلوب میں اعتماد کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ سرکاری ملازمتوں کا مسئلہ ابھی تک تصفیہ طلب ہے اور ملک کے اعلےٰ مفاد اس امر کے متقاضی ہیں کہ فریقین کے درمیان یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جائے۔

اسی اجلاس میں جدید دستور کے متعلق یہ رزولیوشن منظور ہوا کہ:۔

یہ قرار دیا جاتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ اس دستور کو جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں درج ہے باشندگان ہند پر ان کی اس ناپسندیدگی اور اختلاف کے علی الرغم جو ملک کی مختلف پارٹیوں اور انجمنوں کی طرف سے کیا گیا مسلّط کرنے کے خلاف سخت احتجاج کرتی ہے۔"

لیگ کی یہ رائے ہے کہ ان حالات کے لحاظ سے جو ملک میں اس وقت پیدا ہیں دستور صوبجاتی اسکیم سے جتنا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے وہ حاصل کیا جائے اور اس کے باوجود کہ اس میں بہت سی قابلِ اعتراض باتیں موجود ہیں جن کی وجہ سے گورنمنٹ اور محکمہ انتظام کی تمام تفصیلات میں حقیقی اختیار اور وزارت اور مجلس واضعان قانون کی ذمہ داری بے حقیقت رہجاتی ہے۔"

نیز بہ تائید مولانا احمد سعید سکرٹری جمعیت العلماء دہلی یہ قرار پایا کہ:۔

نئے دستور کے ماتحت جو پارلیمنٹری طرزِ حکومت اس ملک میں جاری کیا جا رہا ہے اس سے پہلے بطور امرِ واقعہ یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ملک میں ایسی پارٹیاں قائم

ہیں۔ جنکی ایک معین پالیسی اور پروگرام ہے اور جنکی وجہ سے جمہور انتخاب کنندگان کو سیاسی معاملات سے باخبر کرنا اور اس کی تعلیم دینا ایک حد تک آسان ہوگا اور ایسی پارٹیاں جن کے مقاصد وسطح نظر متحد ہیں اس میں اشتراک عمل کریں گی۔ اور ازاں جاکہ مسلمانوں کی یک جہتی کو تقویت دینے کی غرض سے تاکہ وہ صوبہ کی حکومتوں میں اپنا مناسب و موثر درجہ حاصل کرسکیں یہ ضروری ہے کہ مسلمان ایک متحدہ پارٹی کی شکل میں اپنے کو منظم کریں جس کا ایک ترقی پرور پروگرام ہو۔ یہ قرار دیا جاتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ آئندہ انتخابات میں اپنے امیدواروں کو پیش کرے اور مسٹر جناح کو اختیار دیا جاتا ہے کہ ایک مرکزی بورڈ قائم کریں جس کے صدر خود صاحب ممدوح ہوں۔ اس بورڈ کے ممبر ۳۵ سے کم نہ ہوں گے اور اس بورڈ کو اختیار ہوگا کہ صوبہ کے حالات کو مدنظر رکھکر صوبوں کے انتخابی بورڈ علیحدہ قائم کرے اور مرکزی بورڈ سے انہیں ملحق کرے اور تمام وہ ذرائع عمل میں لائے جو مقاصد بالا کے تحفظ میں لازمی ہوں"

۲۶ر اپریل کو دہلی میں لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں یہ بھی طے ہوا کہ مسٹر جناح (۵۰) اصحاب کو جو مختلف جماعتوں کے نمائندے ہوں مدعو کریں اور ان سے مشورے کے بعد پالیمنٹری بورڈ بنائیں۔

مسٹر جناح کی دعوت پر دہلی میں ہی کانفرنس منعقد ہوئی اس میں مولوی حبیب الرحمٰن صاحب مجلس احرار کے صدر بھی تھے انھوں نے کہا کہ ہم اس لئے لیگ میں شامل نہیں ہوسکتے کہ اول تو اس میں مرزائی (قادیانی) شامل ہیں اور دوسرے ہماسا کر بیٹھ "بہت سادی" ہے۔

مسٹر جناح نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ لیگ میں شامل ہوکر ان امور کے لئے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائیں مگر انہوں نے زور دیا کہ پہلے اہل قادیان کو نکالا جائے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ (۵۴) آدمیوں کا ایک بورڈ بنایا جائے اور مسٹر جناح ان کے نام شائع کریں۔

نواب سر احمد سعید خاں (چھتاری) نے زراعت پیشہ پارٹی (جو ہندو مسلمان

زمینداروں نے یو۔پی میں قائم کی تھی) کے ٹکٹ پر امیدواری کی اجازت طلب کی۔ لیکن اس کو لوگوں نے ناپسند کیا اور انہوں نے یقین دلایا کہ وہ لیگ کے ہی ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے اس بنا پر وہ پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر نامزد کئے گئے۔

مسٹر جناح نے اس سلسلہ میں دورے کئے۔ چنانچہ لاہور بھی گئے اور وہاں سر میاں فضل حسین نے شمولیت سے انکار کیا مجلس اتحاد ملت نے بھی بہ ایں وجہ کہ احرار شامل ہیں اپنے شامل ہونے سے معذوری ظاہر کی مسٹر جناح نے ان دونوں کو دوبارہ متحد کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔

ان کی اس کوشش پر کہ مسلمان متحد ہو کر کام کریں مختلف اخبارات نے تبصرے کئے اور ان کی متفقہ رائے یہ تھی کہ یہ کوشش کہ ہر طبقہ و خیال کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا جائے ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر ممکن نہیں۔

بعض اصحاب نے مایوسانہ طور پر مسٹر جناح کے خلاف بیانات شائع کئے اور ان کی کوششوں کو بیوقوفوں کی جنت سے تعبیر کیا۔ البتہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنے بیان میں ان کی بے لوث محنتوں کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے طرز عمل سے ان لوگوں کو جو اب تک قوم کے نام پر ذاتی مفاد حاصل کر رہے تھے بجا طور پر تشویش ہوگی۔ اب ایسے لوگوں کو ختم کر دینا چاہیئے اور وہ لوگ منتخب ہوں جو رائے عامہ کو پیش کریں، سندھ میں سر عبداللہ ہارون نے مخالفت کی اور بنگال میں مولوی فضل الحق نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر کے ایک جدا پارٹی بنالی یہی حالت آسام کی تھی صوبہ سرحد میں سر عبدالقیوم نے اپنی پارٹی علیحدہ بنائی غرض وحدت سیاسیہ ختم ہو گئی بہر حال مسٹر جناح نے پارلیمنٹری بورڈ کے ممبروں کے نام شائع کر دئے۔ ان حالات میں پارلیمنٹری بورڈ کی پہلی میٹنگ ہوئی اس میں جمعیت العلما اور مجلس احرار کی نمائندگی بھی تھی مگر فوراً ہی بعض لوگوں نے ممبری سے استعفے دینے شروع کئے۔

خان بہادر عبدالعزیز (بہار) اور سر محمد یوسف اور نواب چھتاری (یو۔پی) بھی مستعفی ہو گئے اور مختلف بیانات شائع کئے۔ غرض اس نوبت پر بہت سے گروپ بن گئے۔

مگر مسٹر جناح نے نہایت استقامت کے ساتھ ہر گوشوں میں مختلف طریقوں سے اپنا پیغام پہنچایا اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ ایسے لوگوں کو جنہیں اپنا مفاد مدنظر ہے ختم کر دیا جائے۔

اُنھوں نے بمبئی کے اجلاس پارلیمنٹری بورڈ میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی اور اعلان کیا کہ:-

"ہم ہر مخالف قوت کا مقابلہ کریں گے اُنھوں نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ صوبجاتی پارلیمنٹری بورڈ کو حق ہوگا کہ جلی مجارٹی سے جو فیصلہ ہوا در جس پارٹی سے اشتراک عمل کی خواہش ہو اس کے مطابق کام کیا جائے۔"

جون ۱۹۳۶ء میں مرکز اور صوبوں میں مسلم لیگ پالیمنٹری بورڈ قائم کیے گئے صوبہ متحدہ کے صدر پارلیمنٹری بورڈ نے اس سلسلہ میں ایک بیان شائع کیا جس میں اُنہوں نے کہا کہ:-

"نیا دستور رو اچھا ہے یا بُرا پارلیمنٹ سے منظور ہوچکا ہے اور فروری ۱۹۳۷ء میں اس دستور کے مطابق گورنمنٹ کی تشکیل کرنے کے لئے اسمبلیوں اور کونسلوں کے انتخابات ہورہے ہیں۔ مسلمانوں کے مطالبات میں سے صرف ایک مطالبہ کمیونل اوارڈ کی صورت میں صاف اور واضح ہو کر منظور ہوا ہے یعنی انتخاب جداگانہ اور نشستوں کا تعین، ہندو اسی کی مخالفت کر رہے ہیں۔ محض اس کی مخالفت کے لئے پنڈت مدنموہن مالوی نے کانگریس نیشنلسٹ پارٹی قائم کی ہے۔ اُنہیں اس پر بھی صبر نہیں آیا کہ کانگریس نے اپنے غیر فرقہ وارانہ ہونے کے دعوے کو قائم رکھنے کے لئے نہ اوارڈ کو قبول کیا ہے اور نہ مسترد کیا ہے گو اوارڈ کو بُرا کہنے میں اس نے بھی کوئی کمی نہیں کی ہے مسلمانوں کو اسلامی کلچر، مذہب زبانی رسم الخط کے تحفظ کا کام ابھی اتنا ہی باقی ہے جتنا اس نئے دستور کی منظوری سے قبل تھا۔"

لیگ نے اس پیچیدہ صورت حال پر بمبئی کے اجلاس میں اچھی طرح غور کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہونچی کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ امور کے متعلق کوئی قطعی سمجھوتہ نہ ہوجائے اسوقت تک اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ الیکشن

کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ پارٹی قائم ہو۔ مسلمانوں کو صرف مسلم پارٹی کی تنظیم کرنی چاہیئے اور تمام ہندوستان میں یہ صرف ایک ہی پارٹی ہو۔ البتہ مجالس واضعان قانون کے اندر جس غیر مسلم پارٹی کے اصول اور مقاصد اسکے مطابق ہوں گے اس کے ساتھ مسلم پارٹی تعاون کرے گی۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کی بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس انتخابی مہم کے اہتمام و انصرام کا کام مسلمانوں کے محترم لیڈر مسٹر **محمد علی جناح** نے اپنے ذمہ لے لیا۔ مسٹر محمد علی جناح کی سیاسی بصیرت شہرۂ آفاق ذہانت اور غیر معمولی جوش عمل سے مسلمان اچھی طرح واقف ہیں اور اسی لئے ان پر پورا اعتماد رکھتے ہیں۔

اگر مسلمانوں کو اپنی ہفت سالہ کوششوں کے نتائج کو رائیگاں کر دینا نہیں ہے اور انھوں نے اپنے اس منصفانہ اور جمہوری نقطۂ نظر کو ترک نہیں کر دیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت اور مجالس واضعان قانون میں تمام فرقوں کے درمیان صحیح توازن قوت پیدا ہو تو اس سے زیادہ دانشمندانہ اور کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا جس کو انہیں قبول کرنا چاہیئے۔ ہم اپنے ہموطنوں کے ساتھ صوبہ کی عام مخلوق کی فلاح و قومی اختیار کی ترقی اور ہندوستان کے سیاسی مدارج کو بلند کرنے کے مقاصد میں پوری فراخ دلی اور جوش کے ساتھ تعاون کریں گے۔ لیکن ہم اپنے اسلامی نقطۂ نظر کو ترک نہیں کرینگے ہم اپنے اس پہلو کو کھلا ہوا نہیں چھوڑیں گے۔ جس پر کج فہمی سے ہمارے برادران وطن حملہ کر رہے ہیں۔

اب چونکہ انتخابی مہم شروع ہونیوالی تھی اس لئے مسلم لیگ نے انتخابی مینوفسٹو جاری کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:۔[۵]

(۱) مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی حفاظت۔

(۲) تشدد آمیز قوانین کے تنسیخ کی سعی۔

---

۵ ۔ اس تحفظ یعنی خاص مذہبی امور میں جمعیت العلماء اور مجتہدین کرام کی رائے کو خاص قوت دی جانی تجویز ہوئی۔

(۳) ان تمام قوانین کی مخالفت جو ہندوستان کے مفاد کے لئے مضر ہوں۔ افراد کے اساسی حقوق پر اثر انداز ہوں یا ملک میں اقتصادی تصرفات کا دروازہ کھولیں۔

(۴) نظم ونسق کے خرچ کو کم کرکے معتدبہ رقوم تعمیری ادارات پر صرف کرنا۔

(۵) ہندوستان کا فوجی خرچ گھٹانا اور فوج کو ہندوستانی بنانا۔

(۶) صنعتوں کو فروغ دینا۔

(۷) کرنسی مبادلہ اور قیمتوں کو ملک کے اقتصادی فائدے کے مطابق منظم کرنا۔

(۸) دیہاتی آبادی کی اقتصادی معاشرتی اور تعلیمی فلاح کی کوشش کرنا۔

(۹) زراعتی قرضہ میں تخفیف کے لئے قوانین بنوانا۔

(۱۰) ابتدائی تعلیم کو عام اور لازمی بنانا۔

(۱۱) اردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت کرنا۔

(۱۲) مسلمانوں کی حالت کو عمومی حیثیت سے بہتر بنانے کی تدابیر اختیار کرنا۔

(۱۳) محاصل کے بوجھ کو کم کرنا۔

(۱۴) ملک میں صحیح رائے عامہ اور عام سیاسی بیداری پیدا کرنا۔ مسلم لیگ پارٹی مجالس آئین ساز میں کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کرے گی اور اس کے پروگرام میں مسلم اقلیت کے مفاد کی حفاظت کے سوا اور کوئی فرقہ وارانہ بات نہ ہوگی۔"

متذکرہ صدر پروگرام کے مطابق انتخابی مہم شروع کی گئی۔ جمعیت العلماء نے بھی مسلم لیگ کی تائید کی، مولانا حسین احمد مدنی نے اس اپیل پر بھی دستخط کئے جو انتخابی غرض سے شائع کی گئی۔ جس میں واضح طور پر لکھا گیا تھا کہ مسلمانوں کے درد کی دوا صرف وہ امیدوار ہوسکتے ہیں جو مسلم لیگ پالیمنٹری بورڈ کے نامزد کردہ ہیں۔"

پھر انہوں نے بطور خود بھی بعض امیدواران ممبری کی تائید میں اعلانات شائع کئے چنانچہ ایک اعلان حلقہ شہری سہارنپور کے ایک امیدوار کی تائید میں شائع کیا۔ اس میں انہوں نے ایک تمہید کے بعد کہا کہ:۔

"ابتک ملک کی قانون ساز مجالس میں لوگ عموماً انفرادی طور پر جاتے

رہے یہ اشخاص اپنے ذاتی رسوخ اور شخصی اثر مال و وجاہت وغیرہ سے کامیاب ہو اکیے مگر ان میں نہ تو کوئی اجتماعی قوت تھی نہ ان کی کوئی معین محدود پالیسی تھی نہ کوئی منظم دستور العمل یا مینوفسٹو تھا، مجالس میں جانے کے بعد اپنے ہم خیال اور ہم غرض اشخاص یا پارٹیوں میں جذب ہو گئے اور خود غرضیوں کا شکار ہو کر ملک و قوم و مذہب کے لئے انتہائی ضرر رساں ثابت ہوئے اور کبھی کچھ افراد یا کسی جماعت میں کوئی جذبہ ملکی یا قومی یا مذہبی پایا بھی گیا تو ان کی آواز صدا بصحرا اور نہایت ضعیف ثابت ہوئی نہ گورنمنٹ نے اس طرف توجہ کی نہ ہمسایہ قوموں اور ان کے نمائندوں نے اس کو کوئی اہمیت دی۔

مسلم لیگ اور اس کے سمجھدار ممبروں نے ان گذشتہ حالات اور آئندہ خطرات کا نہایت غور و خوض سے مطالعہ کیا اور احساس کیا کہ اگر مسلمان مجالس قانون سازمیں جماعتی حیثیت سے معین اور محدود پالیسی کے ماتحت منظم دستور العمل کے ساتھ نہ داخل ہوئے اور انہوں نے ایسے اشخاص کا انتخاب نہ کیا جو کہ راسخ العزم قوی العقیدہ، ملکی و قومی ہمدرد مستقل مزاج سرتاپا اخلاص ہوں تو مستقبل میں بہت زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے۔ شخصی اور انفرادی حیثیت خود غرض اور حکومت پرست پارٹیوں کا انجذاب شخصی منافع کا حصول اپنی طرح مذہب اور قوم و ملک کو ہلاکت کے گھاٹ اتارنے والا ہے ایسے ہی امور باعث ہوئے کہ پریسیڈنٹ مسلم لیگ مسٹر جناح کو مستقل اور کلی اختیارات دیئے جائیں کہ وہ اپنے زیر صدارت مرکزی الیکشن بورڈ قائم کریں جس کے ماتحت صوبجات میں بھی الیکشن بورڈ قائم کئے جائیں۔ نیز ایسی محدود پالیسی اور منظم دستور العمل کو تیار کریں جس کے ماتحت ملکی مصائب زائل ہو سکیں اور اس کے لئے جملہ تدابیر ضروریہ عمل میں لائیں "

اس کے بعد پروگرام کی نقل کرکے مولانا نے تحریر کیا کہ:۔

صوبہ کے الیکشن بورڈ نے بھی یہ اعلان کیا ہے کہ عام اصول جس پر ہمارے

نائبین مختلف مجالس قانون ساز میں کام کرینگے حسب ذیل ہیں۔

(۱) موجودہ صوبجاتی کانسٹی ٹیوشن اور مجوزہ مرکزی کانسٹی ٹیوشن جلد سے جلد بدل کر اس کی جگہ کامل ڈیماکریٹک سیلف گورنمنٹ قائم کیجائے۔

(۲) جب تک یہ مقصد حاصل ہو مسلم لیگ اس عرصہ میں مختلف مجالس قانون ساز کے ذریعہ سے ایسے فوائد حاصل کرنے میں پوری کوشش کرے جو اہل ملک کی قومی زندگی اور انکی ترقی کے لئے ضروری ہیں۔

مسلم لیگ پارٹی کا وجود ظاہر ہے کہ اس وقت تک ضروری اور بہت ضروری ہے جبتک جداگانہ انتخاب پر عمل ہے۔ مگر اسکو آزادی اور اختیار ہوگا کہ کسی ایک جماعت یا جماعتوں سے جنکا نصب العین قریب قریب وہی ہو جو لیگ پارٹی کا ہے۔ اتحاد عمل کرے۔ لیگ تمام مسلمانوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اقتصادی یا دیگر حیلوں کی بنا پر اپنی جماعت کے استحکام کو ضائع نہ ہونے دیں۔ الحاصل مسلم قوم اور ملک ہندوستان اور مذہب اسلام کے لئے موجودہ حالات میں بجز مذکورہ بالا صورت کے کوئی کارآمد مفید طریقہ نہیں تھا۔

اسی طریقہ میں مختلف الخیال اشخاص جمع ہو کر حفاظت اور ترقی کی صورتیں پیدا کر سکتے ہیں۔ اور جتنی صورتیں اس کے مخالف اور مغائر ہیں وہ نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کو ضرر رساں ہیں۔ بلکہ وہ ملک اور انسانیت کے لئے بھی زہر ہلاہل ہیں مسلمانوں پر لازم ہے کہ ہرگز ہرگز ایسے لوگوں اور پارٹیوں کی اعانت نہ کریں۔

بنا بریں آپ اور نیز جملہ مسلمانان حلقہ مذکورہ کا فریضہ ہے کہ مسلم لیگ کے کنڈیڈیٹ کو کامیاب بنانے میں ہر قسم کی جدوجہد فرمائیں۔ اور کسی قسم کی کوشش کرنے میں ادنیٰ درجہ کی کوتاہی کو بھی روا نہ رکھیں اور مسلم لیگ کا کامیاب ہونا تمام مسلمانوں کی عزت کا باعث ہے ثانیاً مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی تنظیم صرف اسی صورت میں مضمر ہے۔ ثالثاً گورنمنٹ کے استبداد کو توڑنے اور مخالف ملک و ملت و مذہب قوتوں کو زیروزبر کرنے کے لئے صرف یہی صورت کارآمد ہو سکتی ہے۔"

علاوہ بریں مولانا موصوف نے متعدد مقامات کے دورے کئے اور مسلم لیگ کے امیدواروں کی حمایت میں تقریریں کیں، گورکھپور کی تقریر میں کہا کہ "جو مسلمان مسلم لیگ کے نمایندے کو رائے نہیں دے گا وہ دونوں جہان میں روسیاہ ہوگا"

مولانا احمد سعید نے بحیثیت صدر انڈپنڈنٹ کانفرنس صوبہ بہار منعقدہ ستمبر ۱۹۳۶ء ارشاد کیا کہ:-

"کمیونل ایوارڈ ایک پنچ کا فیصلہ ہے۔ جب ہم آپس میں کوئی فیصلہ باہمی اعتماد سے نہ کر سکے تو ہم میں ہی سے بعض نے وزیر اعظم کو پنچ بنایا اور انہوں نے اپنا فیصلہ صادر فرما دیا۔ اگرچہ ایسا فیصلہ کیا گیا کہ اس سے فریقین خوش نہیں ہوئے بلکہ اختلاف کی خلیج اور وسیع ہوگئی لیکن بہرحال پنچ کا فیصلہ ہے اور جبتک آپس میں کوئی اور فیصلہ نہ ہو اس کی حفاظت ضروری ہے"

اس فیصلہ کی ذمہ داری ان ہندو مسلمانوں پر عاید ہوتی ہے جنہوں نے باہمی سمجھوتہ کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں اور وزیر اعظم کو پنچ بنانے پر مجبور کیا آج ان لوگوں پر تعجب ہے جو کل لندن میں وزیر اعظم کو پنچ بننے پر مجبور کر رہے تھے لیکن آج اس کے فیصلہ سے انحراف کر رہے ہیں اس قسم کے لوگ یا تو پرلے درجہ کے احمق ہیں یا پرلے درجہ کے بدنیت ہیں جو وزیر اعظم کی نیت پر حملے کر رہے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ خود ہاتھ جوڑ کر اور مائی باپ کہکر ایک شخص کو پنچ بنایا گیا اور پھر اس کے فیصلہ کو اسی کے ہاتھوں سے مسترد کرانے کے لئے اس کو مجبور کیا جائے"

میں اس کمیونل ایوارڈ کو نعمت غیر مترقبہ نہیں سمجھتا اور نہ مجھے اس کا یقین ہے کہ یہ فیصلہ ہمیشہ رہیگا۔ یہ فیصلہ بظاہر کتنا ہی خوشنما ہو لیکن اس میں مسلمانوں کے ساتھ سخت ناانصافی کی گئی ہے " اس فیصلہ نے پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کی اکثریت کو مجروح کر دیا ہے۔ یہ فیصلہ مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ یوروپین کے لئے بہت زیادہ مفید ہے۔ اس فیصلہ میں سرحد کے ہندوؤں کے ساتھ جو رعایت کی

گئی ہے۔ وہ سی۔پی اور مدراس کے مسلمانوں کے ساتھ نہیں کی گئی۔ ایسی
حالت میں یہ فیصلہ مسلمانوں کے لئے کچھ خوش کن نہیں ہے۔ لیکن جب تک
کوئی باہمی سمجھوتہ طے نہیں ہوتا اُس وقت تک اس فیصلہ کو قائم رکھنا ضروری
ہے۔ جو لوگ اس فیصلہ کی مخالفت کر رہے ہیں وہ ملک کے سب سے بڑے
دشمن اور غدار ہیں۔ اگر آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیا جائے تو یہ فیصلہ مسترد
ہو سکتا ہے۔ ہم اس فیصلہ سے خواہ کتنے ہی غیر مطمئن کیوں نہ ہوں، لیکن
باہمی سمجھوتہ سے قبل اس کے استرداد کو مکروہ اور مذموم سمجھتے ہیں"

پھر اُنہوں نے لیگ کی حمایت میں دورے کئے اور ۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کو اسی غرض
سے مراد آباد کی جامع مسجد میں ایک وعظ کیا جس میں مسٹر جناح کی نسبت کہا کہ:۔

"آج مسلمانوں میں سیاست کو سمجھنے والا اس سے بہتر کوئی شخص نہیں
لہٰذا مسلمانوں کے قائد اعظم ہونے کے بجا طور پر وہ مستحق ہیں"

مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی اور ڈاکٹر انصاری کا یکے بعد دیگرے ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء
میں انتقال ہو گیا جو کانگریس میں موثر اور زبردست شخصیتیں رکھتے تھے۔ خصوصاً ڈاکٹر
انصاری کا اثر بڑے بڑے مہاسبھائیوں پر بھی غالب رہتا تھا۔ ان کی دلی خواہش
ایک متحدہ قومیت کی تعمیر تھی اور نصب العین آزادی کامل تھا۔ یہ دونوں ورکنگ
کمیٹی کے بھی ممبر تھے۔ مگر انتقال سے کچھ عرصہ پہلے مستعفی ہو گئے تھے۔ فرقہ وارانہ
مسئلہ پر ڈاکٹر انصاری نے ۱۹۱۸ء میں جو خیالات ظاہر کئے تھے وہ آخر تک تھے
چنانچہ ۱۹۳۳ء کے وسط میں جب کمیونل اوارڈ کے متعلق کانگریس مخالفت کرنے
والی تھی۔ تو اُنہوں نے واشنا سے گاندھی جی کو تار دیا تھا کہ کمیونل اوارڈ کا بدل صرف
ایک متفقہ فیصلہ ہی ہو سکتا ہے۔ جب تک ایسا متفقہ فیصلہ قوموں میں نہ ہو جائے
کمیونل اوارڈ کو برقرار رکھا جائے اور اس کے خلاف کانگریس اپنی آواز بلند نہ کرے
ورنہ وہ کانگریس سے علیحدگی پر مجبور ہوں گے"

مسٹر شیروانی نے بھی اسی قسم کی دھمکی دی تھی چنانچہ اخبار انصاری دہلی نے جو

جمعیتہ العلماء یا بالفاظ دیگر کانگریس کا آرگن ہے ۱۹۳۷ء میں ایک سلسلہ بحث میں لکھا تھا کہ۔

"ہمیں یہ معلوم ہے کہ کانگریس میں گذشتہ سال سے یہ خیال ترقی کر رہا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کو ایک مدت غیر معینہ کے لئے ملتوی کر دیا جائے بلکہ اسے کسی قسم کی اہمیت نہ دیجائے اور یہ پوزیشن قدرتی طور پر اکثریت کے لئے مفید ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے ہمارے سامنے یہ حقیقت موجود ہے کہ مسلمانوں کی ان برگزیدہ ہستیوں نے جن کی شرکت کانگریس پر ہم فخر کرتے ہیں اپنی تمام زندگیاں اس مسئلہ کے حل کرنے میں گذاری ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں سب سے زیادہ توجہ اس مسئلہ پر ڈاکٹر انصاری مرحوم ومغفور نے مبذول فرمائی تھی۔ جب ہم انکی سیاسی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں کانگریس کے پلیٹ فارم پر ہندو مسلم سمجھوتہ کے لئے ایک مسلسل و پیہم سعی نظر آتی ہے ان کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرا جبکہ یہ مقصد عظیم ان کے پیش نظر نہ رہا ہو۔ انہوں نے سال بسال مختلف کانفرنسوں اور مجالس میں فرقہ وارانہ سمجھوتہ کے لئے بیشمار صورتوں پر غور فرمایا دار السلام ہمیشہ اسی قسم کے مساعی کا مرکز بنا رہا........ اپنے آخری زمانہ میں بھی کیمونل اوارڈ کے مسئلہ پر جسقدر جرأت و ہمت اور استقلال و پامردی کے ساتھ مسلمانوں کا مقدمہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے کانگریس میں پیش کیا اسے کون فراموش کر سکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ مرحوم نے ولایت جاتے ہوئے اسی مسئلہ پر یہ بیان دیا تھا کہ اگر کانگریس نے کراچی والی پوزیشن کو بدلا تو میں پارلیمنٹری بورڈ سے استعفےٰ دیدوں گا۔ وہ تمام مباحث آج تک محفوظ ہیں۔ اگر وہ فرقہ وارانہ مسئلہ ایک اہم سیاسی مسئلہ نہ سمجھتے تو غالباً ان کے جذبات اس قدر قوی اور پرزور نہ ہوتے پھر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں بند ہوتے ہی کانگریس کے ارباب حل وعقد بالخصوص پنڈت جواہر لال جی نے اس پوزیشن کو بدل دیا"

آخر ۱۹۳۶ء میں فیض پور[1] کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں عوام کی بڑی کثرت تھی

---

[1] فیض پور خاندیس میں واقع ہے مرہٹوں کی بہت زیادہ آبادی ہے۔ مسلمان بھی آباد ہیں لیکن ہر لحاظ سے پست حالت میں ہیں انعقاد کانگریس سے کچھ ہی پہلے یہاں مسلمانوں پر بڑے بڑے مظالم کئے گئے۔ انکو اسپین کے مسلمانوں کی طرح اپنا گھربار......

اس کے تمام دروازے مرہٹوں کے نام پر بنائے گئے صدر دروازہ شیواجی کے نام پر تھا۔

استقبالیہ کمیٹی کے صدر نے جو ایڈریس پڑھا اس کے چند فقرات مرہٹہ ذہنیت کا اندازہ کرنے کے لئے ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:

"سوراجیہ لوکمانیہ تلک مہاراج نے جو بھی تحریک شروع کی اس کی جڑ میں تین واضح مقاصد کارفرما ہوتے تھے۔ ان کے دل میں یہ بات مضبوطی سے گھر کر چکی تھی کہ ہندوستانی تمدن سب تمدنوں سے اعلیٰ ہے باوجود اس کے کہ ہمارا ملک آج غیروں کے ہاتھ میں ہے ان کا یہ خیال تھا کہ ہمارے تمدن اور سبھیتا کی بنیاد وسیع تر روحانی اصولوں پر ہے۔ اور صرف ان کی بناء پر دنیا میں مجلسی یگانگت اور فلاح و بہبود حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسلئے وہ اس بات کے مضبوطی سے قائل تھے کہ اگرچہ ہندوستان کی تعمیر نو بہت ضروری ہے اور اس کے لئے کوشش لازمی طور پر کی جانی چاہیئے۔ لیکن ان کوششوں کی بنیاد ہندوستان کی روایات و سبھیتا ہونی چاہیئے۔ جو کہ ہماری آبائی پشتوں کی مجموعی فہم و فراست کی نمائندگی کرتی ہیں اور صرف اسی طرح سے ہندوستان بنی نوع انسان کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے حصہ رسدی خدمات انجام دے سکتا ہے۔"

دوسرا عظیم مقصد جو آپ کے پیش نظر تھا ہندوستان کے لئے حصول آزادی تھا تاکہ اس کی شاندار سبھیتا کو تباہ ہونے سے بچایا جا سکے ....

ہندوستانی دلوں میں رام راج کا مفہوم گہری جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ اور اس میں وقت کے مطابق خاص تبدیلیاں کرنے کی گنجائش ہے۔ رشی وسشٹھ اور وشوامتر کے زمانہ کا رام راج آنندوں بھون اور رام داس کے زمانہ کے رام راج سے مختلف تھا۔ لوکمانیہ تلک نے شیواجی کی سالگرہ کو ایک قانونی تیوہار قرار دیدیا تھا۔ اسکے ساتھ ان کا یہ منشاء نہیں تھا کہ وہ پرانے زمانے کے قسم کا سوراجیہ چاہتے تھے وہ جمہوری حکومت کے خواہاں تھے اسی طرح گاندھی طرز کا رام راج بھی جمہوریت اور مساوات پر مبنی ہے۔ جس کا وہ بار بار اعلان کر چکے ہیں ....

۰۰ ۴ سال گذرے مہاراجہ شیواجی نے آزادی کی دیوی پر اپنا سب کچھ قربان کردیا تھا اور تعلیم یافتہ برہمن جو اس زمانہ کی مسلم حکومتوں کو فروغ دینے میں لگے ہوئے تھے رام داس کی پُر زور اپیلوں سے مل گئے تھے اور جب اعلےٰ جماعتوں کے لوگوں نے اپنے فرض کو پہچانا تو کسان لوگوں نے ہزاروں کی تعداد میں اُنکا ساتھ دیا۔ آج بھی کسان اس قسم کی رہنمائی کا متلاشی ہے اگر آج بھی کسانوں کی قسمت تعلیم یافتہ لوگوں کی کوششوں سے وابستہ ہوجائے تو مہاراشٹر قوم کے ہراول دستے میں حصہ لینے سے نہیں چوکے گا۔ مہاراشٹر میں کانگریس کی طاقت بالکل مستحکم اور منظم ہے "

اس اجلاس کی عظمت وشان سے صدر اجلاس پنڈت جواہر لال نہرو کا دماغی توازن خراب ہوگیا۔ اور انھوں نے اس قسم کے بیانات دینے شروع کئے جن میں نہ صرف غرور جھلک رہا تھا بلکہ مسلمانوں کی سیاسی حالت پر نوحہ بھی تھا!

مثلاً — آج ہندوستان میں مسلمانوں کی عجیب وغریب حالت ہے۔ یہ بے بس ہیں۔ آج جو بزرگ مسلمانوں کے لیڈر بنے ہوئے ہیں ان کا خواص اور عوام سے کوئی تعلق نہیں مسلمان کانگریس کی طرف جھک رہے ہیں۔ مسلم امیدواروں کے انتخاب میں ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے انکے حلقوں میں کام ہی نہیں کیا۔ مسلم حلقوں میں ہماری شکست نے ہمیں یہ بتلادیا ہے کہ جیت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ قوموں کی طاقت ملازمتوں اور کونسلوں میں نشستوں سے نہیں بڑھتی۔ بلکہ ان سے کمزوری بڑھتی ہے۔ کانگریس نے سنگھٹن کے ذریعہ ملک کی طاقت بڑھائی۔ طاقت کشتی سے بڑھتی ہے۔ خوشامد اور وکالت سے نہیں بڑھتی۔ میرے اپنے صوبہ میں جو تمدن کا گہوارہ ہے مسلم عوام پر ہمارا کافی اثر ہے، یہ حقوق کی باتیں محض جہالت ہے۔ ہم نے عام لوگوں سے نظر ہٹا کر بدتوں فرقہ وارانہ لیڈروں کی صلح وصفائی اور عہدوپیمان میں وقت گذارا ہے یہ طریقہ نکما ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم دوبارہ اس راستہ پر نگاہ تک نہ ڈالیں۔ ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں کہ گویا دو طبقوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں "

ہمارے زمانہ کی نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اہل دماغ اور عوام ہر طبقہ کے ہندی مسلمانوں میں بڑا ہیجان و اضطراب ہے۔ بغیر صحیح فہم کے رہبروں کے مسلمان مارے مارے پھر رہے ہیں اور رہ رہ کر انہیں اپنی بے بسی پر غصہ آتا ہے۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے فرقہ پرست لیڈروں نے ہمیں سیاسی لحاظ سے بڑا کمزور کر دیا ہے۔ اور سامراج کے بے حقیقت اور دکھاوے کے چھوٹے چھوٹے فائدوں سے بہلا بہلا کر ہمیں قومی تحریک سے دور رکھا ہے۔ .... وہ خوب دیکھ رہے ہیں کہ کانگریس نے ہندو فرقہ پرستی کا قلع قمع کر کے عام لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے اور انہیں رہ رہ کر ہوک اٹھتی ہے کہ آہ ہم اس جنگ آزادی میں نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے دل میں بھی یہی ارمان ہے کہ ہم بھی آج کی قربانیوں اور کل کی کامرانیوں میں برابر شریک ہوں۔ غرض کہ انتخاب اور ہماری انتخابی کشمکش کا یہ اثر ہوا کہ گو عام طور پر مسلم نشستوں کے حاصل کرنے میں ہم ناکام رہے پھر بھی اخلاقی جیت ہمارے حصہ میں آئی۔ انتخابی لڑائی کی بدولت ہم نے فرقہ پرستی کے آسیب پر کسی حد تک قابو پالیا ہے۔ اب ضرورت اسکی ہے کہ ہم مسلمانوں کے اہل دماغ اور عوام سب کو کانگریس کے وسیع نظام میں شریک ہونے کی ———— دعوت دیں۔ اور فرقہ پرستی کے نام پر ہمیشہ کے لئے فاتحہ پڑھیں"

اس کے بعد ہی دوسرے بیان میں لکھتے ہیں کہ:۔

"آج ہندوستان میں دو طاقتیں ہیں ایک کانگریس جو ہندوستانی قوم پرستی کی نمائندہ ہے اور دوسری برطانوی حکومت" ان کے علاوہ سب کو کسی ایک کے ساتھ رہنا پڑے گا۔

پھر تو اسی طرح کے متکبرانہ بیانات کا طومار باندھ دیا۔

ان بیانات کے ساتھ ہی ڈاکٹر سید محمود اور ابوالکلام آزاد کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور ان کے مشورے سے مسلمانوں کی رائے عامہ میں نفاق و شقاق پیدا کرنے کی تدابیر سوچیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ کچھ نہ کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ عوام کو مفلسی بیکاری اور فاقہ کشی کے نام پر اپنی طرف مائل کیا گیا تاکہ مسلمانوں کی ہستی کو جذب کر لیا جائے۔

بعض ممتاز مسلمان بھی کسی اصول سے نہیں بلکہ خاص اغراض کے پیش نظر متاثر ہو گئے
مسلم حلقہائے انتخاب میں کانگریس نے اپنے امیدوار کھڑے کئے اور ان کی کامیابی کے
لئے دل کھول کر روپیہ صرف کیا گیا مگر ناکامی ہوئی صوبہ متحدہ میں ۳۴ میں سے ایک بھی
کامیاب نہوا۔

مسٹر جناح کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اگر بنیادی اصول باہمی رضامندی سے طے
ہو جائیں تو ہم جماعت اور پارٹی کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہیں۔ مجالس قانون ساز
میں مسلم لیگ کے ارکان اس بات کی کوشش کرینگے کہ کونسلوں اور اسمبلیوں سے
ملک کے لئے جسقدر فائدہ حاصل کیا جاسکے کر لیا جائے اور اس بات کی سعی کریں گے
کہ موجودہ صوبجاتی اور مرکزی آئین کی جگہ کامل جمہوری اور خود مختارانہ حکومت قائم کی جائے۔
چنانچہ جب انھوں نے لیگ پالیمنٹری بورڈ کے ممبروں کو مجالس آئین ساز میں
کانگریسی ممبروں کے ساتھ تعاون کا مشورہ دیا۔ تو پنڈت جواہرلال نہرو نے حقارت
سے انکار کر دیا اور چھ صوبوں میں شاندار کامیابی کے بعد جو بعض ہندو حریف جماعتوں
کے مقابلہ میں کانگریس کو حاصل ہوئی تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ صوبجاتی مجالس کی مسلم لیگ
پارٹیوں کو نظرانداز اور ان سے ترک تعاون کیا جائے انتخابات کے بعد کانگریس کنونشن
منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء میں طے ہوا کہ:۔

دستور جدید کو جو اس مقصد کے لئے وضع ہوا ہے کہ دائمی طور پر برطانی غلبہ قائم
رہے اور معاشی دست برد جاری رہے مسترد کیا جائے اور ہندوستان میں حقیقی جمہوری
قسم کی حکومت ہو۔ جہاں تمام تر سیاسی طاقت ہندوستانی لوگوں کے ہاتھوں میں ہو اور یہ
ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی ——— کے ذریعہ ہو سکتا ہے جو حق رائے دہی بالغان
کے اصول پر منتخب شدہ نمایندوں پر قائم ہو۔

نیز اس امر پر زور دیا گیا کہ :۔

کانگریس نے انتخابات آزادی اور دستور جدید کو کامل طور پر مسترد کرنے کے مقصد
کے ساتھ لڑے ہیں کانگریس پارلیمنٹری پارٹیاں جلد از جلد قوم کے نام پر اپنی مجالس آئین ساز

میں اس ایکٹ کو واپس لینے اور کانسٹیٹیوئنٹ اسمبلی کا مطالبہ کرے۔"

صدر کانگریس پنڈت جواہرلال نہرو نے ہزاروں کے مجمع میں کہا کہ "اس آئین کو جہنم میں جھونک دو" اگر اسکو واپس نہ لیا گیا تو ہم اپنی قوت سے ختم کردینگے۔"

دوسری طرف اب وزارتوں کے قیام کا سوال سامنے تھا صدر کانگریس پنڈت نہرو بہ بانگ دہل اپنے صدارتی ایڈریس میں اعلان کرچکے تھے کہ جس کانگریس پالیسی کا ہم نے اپنی تجویزوں میں ذکر کیا ہے اور انتخابی اعلان میں واضح کیا ہے اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہم عہدے یا وزارت قبول کرنے سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ اس راہ سے ہٹنے کے یہ معنی ہونگے کہ ہمنے اپنی پالیسی کو الٹ دیا ہے اور ہم برطانی ملوکیت پرستی کے شریک کار ہوگئے ہیں۔"

یکم اپریل کو جو دستور جدید کے نافذ ہونے کی تاریخ تھی اس پر اظہار ناراضی کے لئے عام ہڑتال کی تجویز ہوئی اور ہر صوبہ میں کانگریس نے ہڑتال کی مسٹر جناح ذاتی طور پر اس کے خلاف رائے رکھتے تھے اور انہوں نے اسکو ظاہر بھی کردیا۔ مگر اس رائے پر عمل کرنے کے لئے اصرار نہیں کیا۔ اور نہ لیگ کی طرف سے مخالفت کی۔

اب یو۔پی میں نواب چھتاری نے، سندھ میں سر ہدایت اللہ، غلام حسین نے، سرحد میں سر عبدالقیوم نے، آسام میں سر سعداللہ نے، بنگال میں مولوی فضل الحق نے اور پنجاب میں سر سکندر حیات خاں نے دستور جدید کی رو سے وزارتیں قائم کرلیں اور دیگر صوبوں میں بھی عارضی وزارتیں قائم ہوگئیں۔ مسلم لیگ کے ممبروں نے ان وزارتوں میں کوئی حصہ نہیں لیا البتہ راجہ سلیم پور صدر پارلیمنٹری بورڈ نے صوبہ متحدہ میں ایک وزارت قبول کرلی جو علانیہ لیگ کے مسلک کی خلاف ورزی تھی۔

ان عارضی وزارتوں کے قیام سے کانگریس اور مہاسبھا میں کھلبلی مچ گئی۔ مہاسبھا کی مجلس عاملہ نے کانگریس کے عہدے قبول نہ کرنے کی شکایت کی کہ اس طرح تمام شمالی ہند میں سرحد سے آسام تک مسلم راج قائم ہوگیا۔ بنگال کی مہاسبھا نے اپیل کی کہ کوئی ہندو اسوقت تک کیبنٹ میں شریک نہ ہو جبتک وزراء کی تعداد برابر نہ ہو۔

کانگریس اب پھر زینے سے نیچے اتری جلسوں پر جلسے منعقد ہوئے۔ جا بجا صوبجات میں کانگریسیوں نے قبول وزارت کے رزولیوشن پاس کئے۔ مسٹر ستیا مورتی نے تو ایک حد تک اعلان جنگ کر دیا اور مارچ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ بڑی بڑی بحثیں ہوئیں اور نتیجہ میں ۰۰ کے خلاف ۱۲۰ رائوں سے عہدے قبول کرنے کا مشروط رزولیوشن ان دعاوی کے ساتھ منظور ہو گیا کہ:۔

راجگوپال اچاریہ۔ اگر ہمارے راستہ میں مشکلات پیدا کی گئیں تو ہم وزارت کی کرسیاں ٹھکرا کر چلے آئیں گے۔

ولبھ بھائی پٹیل ہم وزارت قبول کر کے صوبوں کی نام نہاد خود مختارانہ حکومت کی آزمائش کرنا چاہتے ہیں۔

مسٹر ستیا مورتی۔ بحالت موجودہ عہدے قبول کرنا نئے آئین کو ختم کرنے اور سوراجیہ حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگا۔

راجندر بابو۔ یہ خیال چھوڑ دو کہ عہدے قبول کرنے کے بعد کانگریس حریف کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنجائے گی۔

مگر شرط یہ تھی کہ گورنر اپنے اختیارات خصوصی استعمال ہنیں کریگا اور کسی قسم کی مداخلت ہنیں کرے گا اور نہ وزیروں کی رائے کو ٹھکرائے گا۔ اور نہ اسکو کسی پارٹی سے تعلق ہوگا ساتھ ہی اب یہ دعوے بھی ہونے لگا کہ کانگریس والے لڑنا ہی نہیں جانتے بلکہ حکومت کرنا بھی جانتے ہیں اور اب پنڈت جواہر لال نہرو نے اعلان کر دیا کہ عہدوں کے خلاف کوئی ملامت و مذمت ہنو۔

حالات کی اس رفتار میں وزارت ہند کے بیانات شائع ہوئے۔ ۲۱ جون کو گورنر جنرل وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے بھی ایک طویل بیان بطور پیغام دیا جس میں کانگریس کو دل خوش کن تھپکیاں یا خواب آور لوریاں دی گئی تھیں وائسرائے نے گورنر اور وزراء کے تعلقات پر آئینی تبصرہ کیا غلط فہمیوں اور شبہات کو بے بنیاد بتایا صوبوں مو، وزارت کے سرمایہ تجربہ اور گورنروں کے رویہ کو سند میں پیش کیا۔ ضابطہ

ہدایات (جن میں گورنروں کو کام کی ہدایتیں ہیں) اور گورنروں کی خاص ذمہ داریوں کی تشریح کی۔ اور خود ہی اس طولانی پیغام کا حسب ذیل خلاصہ کیا کہ:۔

"صورت حال یہ ہے کہ صوبہ میں انتظامی اختیار گورنر کے نام سے چلتا ہے لیکن وزارت کے حلقہ اختیار میں ان قیود کے ماتحت جنکا میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں۔ گورنر ان کا پابند ہے کہ وہ اس انتظامی اختیار کو اپنے وزیروں کے مشورے سے انجام دے، بعض دائرے جو سختی کے ساتھ معین و محدود کر دیے گئے ہیں۔ ان کے اندر گو دوسرے معاملہ کی طرح اصلی ذمہ داری وزراء کی ہے تاہم گورنر بالآخر پارلیمنٹ کے روبرو جوابدہ رہتا ہے۔ بقیہ تمام دائروں کے اندر وزراء تنہا ذمہ دار ہیں اور وہ صوبجاتی مجلس قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہیں۔ گورنر اپنی خاص ذمہ داریوں کی انجام دہی میں اس بات کے لئے آزاد رہیگا بلکہ درحقیقت اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اگر وہ یہ خیال کرے کہ وزراء جو طریق کار تجویز کر رہے ہیں وہ اقلیتوں کو بالخصوص علاقوں کو یا دیگر اغراض متعلقہ کو کوئی نقصان پہنچائے گا تو وہ اپنے وزراء کے مشورے کے خلاف عمل کرے گا ایسے معاملات میں فیصلہ گورنر کے اختیار پر ہوگا اور یہ فیصلہ کرنے میں وہ پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوگا، لیکن ایسی مداخلت کے امکانات کا دائرہ سختی سے محدود کر دیا گیا ہے اور اس خیال کی ذرہ برابر بھی اصلیت نہیں ہے کہ گورنر ان ذمہ داریوں کے محدود دائرے سے باہر جو خاص کر اس پر عائد کی گئی ہیں۔ صوبہ کے روزمرہ انتظامی امور میں دخل دینے کے لئے آزاد ہے یا اسے اس کا حق یا اختیار حاصل ہے اس محدود دائرے میں بھی اپنے وزیروں کے مشورہ کے خلاف مشورہ کرنے سے پیشتر گورنر کو اس بات کی امکانی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے وزیروں کو وہ وجوہ اچھی طرح سمجھا دے جس کے بموجب جو فیصلہ اسنے کیا ہے اس کے لئے وہ مجبور تھا اور یہ کہ اس کا فیصلہ صحیح ہے۔ وہ اپنے خیالات پورے طور پر وزراء کے سامنے پیش کر دے گا اور ان دلائل کو سنے گا جو وزراء پیش کرینگے۔ اپنا فیصلہ وہ خود ان دلائل کو ذہن نشین کرنے کے بعد کرے گا۔ اور اس کے متعلق قائل ہونے کے لئے تیار رہیگا۔ ان حالات میں جب نیک اندیشی کی دونوں طرف

سے اعتماد کے ساتھ نہیں توقع ہے اور جس کے بارے میں جہاں تک گورنروں کا تعلق ہے
میں ہز مجسٹی ملک معظم کی حکومت کی طرف سے جوابدہ ہوں۔ معمولاً چپقلش پیدا ہونے کا
اندیشہ نہیں ہے۔ اصولاً کوئی ایسا دستور جس میں اختلاف رائے کی صورت میں خواہ وہ
کتنا ہی غیر اہم ہو وزارت کا استعفےٰ دیدینا یا برطرف ہونا ضروری ہوجائے غیر مناسب ہے
اور ایسے دستور پر جو اعتراضات ہوسکتے ہیں۔ انکو نمایاں کرنے کی مجھے ضرورت نہیں ہے
اس لئے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دائرہ زیر بحث کے اندر بعض معاملات ایسے
ہوں کہ جو بالکل غیر اہم ہوں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ گورنمنٹ اور اس کے
وزراء کی پوزیشن بالکل غیر استوار ہوجائیگی۔ اگر ہر ایسی صورت میں دستور کے ماتحت گورنر
کے سر یہ پابندی عاید کردیجائے کہ وہ اپنے وزراء کو برطرف کردے یا وزیروں کو یہ محسوس
ہو کہ ان کے لئے استعفےٰ دینا ضروری ہے۔ انتظام میں جو دشواری پڑے گی اور وزراء کی
ساکھ جس طرح کھوئی جائے گی وہ ناقابل برداشت ہوگی۔ مزید برآں وزیروں کو ایک ایسے
فیصلہ کی بناء پر مجبوراً استعفیٰ دینا پڑے گا جس کی ذمہ داری ان پر کسی طرح عائد نہیں
ہوتی اور جس کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ پبلک طور پر اس کا اعلان کردیں کہ وہ
گورنر سے متعلق نہیں ہیں اور گورنر نے خود اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں یہ خاص طریق
عمل اختیار کیا ہے تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ آئینی ترقی ایسے محکم گیر دستور سے نہیں ہوتی
بلکہ اس کے سمجھونے اور اسی سوچ سے ہوتی ہے جو ایک کامیاب جمہوری آئین کی خصوصیت
ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ گورنر کے آخری فیصلہ کے ذمہ دار نہیں ہیں اور بلا کسی آئینی
وقت کے اس بات کا اعلان کرسکتے ہیں یہ محسوس کریں کہ اس کارروائی سے ایسی صورت
معاملہ پیدا ہوگئی ہے اور پارلیمنٹری جماعت کی حیثیت سے انکی پوزیشن پر اتنا برا اثر پڑا
ہے کہ اگر انتظامی معاملات میں گورنر کے ساتھ شریک کار رہیں تو ملک میں غلط فہمی پھیلے
اس وقت وزراء کو استعفےٰ دینے کا اختیار ہے یا اگر وہ استعفےٰ دیں۔ اور گورنر یہ محسوس
کرے کہ وزراء سے اسکی رفاقت پبلک کے مفاد کو دیکھتے ہوئے قائم نہیں رہ سکتی تو
گورنر کو اس کا اختیار ہے بلکہ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ انہیں برطرف کردے۔

لیکن گورنر کا مقصد، اور مجھے یقین ہے کہ خود وزراء کا مقصد ہمیشہ یہ رہیگا۔ کہ ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے پائے۔ محض یہ بات کہ گورنمنٹ آف انڈیا میں ایسی باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے جیسے کہ وزراء کی برطرفی یا آئین کا معطل ہوجانا یا ایسی دوسری صورتیں اس سے ذرا وہ کے کے لئے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ایکٹ بنانے والوں کا یا جو لوگ اس کے چلانے کے ذمہ دار ہیں ان کا یا کسی ایسے شخص کا جو اس عظیم الشان ملک کی آئینی ترقی و نشوونما کے خواہشمند ہیں یہ خیال ہوسکتا ہے کہ ایسی خاص صورتیں درحقیقت پیش آجائیں گی۔ پارلیمنٹ کا مقصد اور ہندوستان میں جو لوگ تاج برطانیہ کے ملازم ہیں اور جن پر اس قانون کے ضوابط نافذ کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ ان کا منشا یقیناً یہ ہونا چاہیئے۔ اور ہے کہ ہر صوبہ کی ترقی و اصلاح کے لئے قوم کے منتخب نمائندوں کے ساتھ ہم آہنگی اور اشتراک کو دائرہ عمل میں لانے کی امکانی کوشش کریں اور اقلیتوں کے بارے میں اور اس قسم کی دوسری باتوں کے لئے جو خاص ذمہ داریاں ایکٹ کے بموجب ان پر عاید کی گئی ہیں ان کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسی صورت پیش نہ آنے دیں کہ اس حد تک اختلاف رائے پیدا ہوجائے کہ گورنمنٹ کی مشین قطعی طور پر معطل ہوجائے یا گورنروں اور ان کے وزراء کے مابین وہ کارآمد رفاقت ختم ہوجائے جو اس ایکٹ کی بنیاد ہے اور جو نصب العین جناب وزیر ہند اور گورنر جنرل اور صوبجات کے گورنران کے پیش نظر ہے"

مذکورہ بالا خلاصہ کے بعد کہا کہ :۔

قبل اس کے کہ میں آپ سے رخصت ہوں آپ غالباً مجھ سے یہ خواہش کریں گے کہ تمام اصلاحی گفتگو کو ختم کرکے لمحہ دو لمحہ آپ سے اس طرح گفتگو کروں جیسا کہ ایک ایسے شخص کو کرنی چاہیئے جسے پارلیمنٹ کے کام کا معقول تجربہ ہے اور جس کا جدید آئین کی تشکیل میں کچھ حصہ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں آپ میں سے بعض حضرات کا یہ خیال ہے اور پختگی سے خیال ہے کہ اصلاحات کا یہ خاکہ کامل خود اختیاری حکومت کی طرف کافی حد تک آگے نہیں بڑھا ہے۔ جن لوگوں کی یہ رائے ہے ان کے خلوص پر مجھے کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ ہر ذمہ دار آدمی ایسے اہم معاملہ پر اپنی رائے قائم

کرنے وقت ہندوستان کے بہترین مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے اس بات کی پوری کوشش
کرے گا کہ وہ سمجھ بوجھ کر رائے قائم کرے اور جو کچھ اسے ان مفاد کی ترقی کی خاطر کرنا ہے
اس کے متعلق صحیح فیصلہ کرے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری یہ بھی رائے ہے کہ اگر
ہر طرف سے نیک اندیشی کا اظہار کیا جائے تو یہ آئین کارگر ثابت ہوگا، اس وقت یہ
اسی ملک کا آئین بن گیا ہے اور اس پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں اس کے باوجود بھی ایک
مکمل اور منظم سیاسی اصلاح کی اسکیم ہے جو پبلک کے سامنے ہے۔ مجھے پورا یقین ہے
کہ وہ مکمل سیاسی زندگی جس کی آپ میں سے اکثر حضرات کو خواہش ہے، اس کا مختصر ترین
راستہ یہی ہے کہ اس آئین کو قبول کرلیں اور اس سے جو کچھ بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے اسے
حاصل کریں۔ سیاسی مسائل فطرتاً انقلاب پذیر ہوتے ہیں اور یہ خیال کرنا کہ ایک تحریری
آئین کے الفاظ میں پابند کرنے سے وہ ایک جگہ ٹھہر جائیں گے۔ تاریخ کے سبق اور عقل
کی ہدایت کے خلاف ہے۔

مزید برآں میرا یہ پختہ یقین ہے کہ اس آئین سے پبلک کی مفید خدمت کے بہت
زیادہ مواقع حاصل ہوں گے اور اس سلسلہ میں میں ایک ایسی بات کہوں گا جو میرے
دل کے سب سے زیادہ قریب ہے میرا یہ یقین ہے کہ اس آئین کے پورے طور پر چلانے
اور ترقی دینے سے دیہی آبادی اور غریب طبقوں کی حالت میں عام اور مستقل اصلاح
کی بہترین امید وابستہ ہے۔

وائسرائے نے اپنا پیغام نیک خواہشوں اور کامیابی کی توقعات پر ختم کیا۔

اب راستہ صاف اور ڈھلواں ہوگیا اور ۱۸ مارچ کے اجلاس میں کانگریس کمیٹی نے
ایک رزولیوشن میں بطور تمہید اپنی سابق کی قراردادوں کا اعادہ اور سرکاری بیانات
پر تنقید کرتے ہوئے اس یقین کے اظہار کے بعد کہ گورنروں کے لئے اپنے مخصوص اختیارات
کا استعمال آسان نہیں ہوگا۔ عہدوں کو اس مقصد و غرض سے حاصل کرنے کی خاطر منظور
کرنا طے کردیا جو کہ کانگریس کے منشور میں درج ہیں۔ نیز یہ کہ عہدوں کو نئے آئین کا مقابلہ
کرنے کی پالیسی کو تقویت دینے کے لئے استعمال کیا جائے اور تعمیری پروگرام پر عمل کیا جائے۔

حکومت برطانیہ کے اطمینان بخش بیانات، بحث و مباحثہ اور کثرت رائے سے
یا یہ کہ چند ممتاز کانگریسیوں کی خواہش اقتدار سے کانگریس نے عہدے قبول کرلئے اور جولائی
میں عارضی وزراء نے جگہیں خالی کر دیں۔ لیکن ایک بازو اس کا شدید مخالف بھی رہا
مسٹر مسانی کے خیال میں کانگریس کی تھمی انجام کار استعماری مکڑی کے جال میں پھنس گئی"
ورکنگ کمیٹی کے فیصلہ پر مسٹر رفیع احمد قدوائی نے کہا کہ:۔

"برطانوی سیاست کی فتح ہوئی اہل کانگریس کو تخریبی کام سے ہٹا کر تعمیری کام کی طرف
ڈالا گیا ہے ان کو وزارتیں مرتب کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے۔ جو لوگ ملک کو برطانوی
سیاست کی گرفت سے چھڑانے کے لئے نکلے تھے وہ اسپر آمادہ ہوگئے ہیں کہ برطانوی
نظام سیاست کی خنیسری کے ساتھ ان کو جوت دیا جائے۔ جدید دستور کا کام تمام کرنے
یا اسکو تباہ کرنے کی تمام گفتگوئیں محض لفاظی ثابت ہوئیں "

مگر بہت جلد مسٹر قدوائی وزارت مالگذاری کی کرسی پر جلوہ افروز ہوئے یا برطانوی
سیاست کی خنیسری میں جوت لئے گئے اور صوبہ متحدہ میں ایک وزارت کا قلمدان سپرد ہوگیا۔
جب کانگریس میں عہدے قبول کرنے کے امکانات پیدا ہوگئے تو بابو راجندر پرشاد
سردار پٹیل اور ڈاکٹر کھارے نے کابینہ وزارت کی تشکیل کے بیانات میں اعلان کیا کہ:۔
"کسی مسلمان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ کانگریسی کی حیثیت سے کابینہ
وزارت میں شامل کیا جاسکتا ہے "

جب کانگریسی وزارتیں معمور ہوگئیں تو مسلمانوں کی رائے عامہ میں نفاق اور
اختلاف پیدا کرنے کی تدابیر کی گئیں اور چونکہ اب مسٹر جناح نے بنگال بہار یو۔پی
اور بمبئی وغیرہ میں دورے کئے اور تقریریں کیں جن میں مسلمانوں کے حقوق کی وضاحت
کے ساتھ ان سے متحد ہونے کی بھی اپیل کی تھی نیز ہر جگہ مسلم رہنماؤں سے بالشافہ گفتگوئیں
کیں اور تمام قوم کو مسلم لیگ کے پرچم کے زیر سایہ آنے کی دعوت دی۔ اس لئے اب
لیگ کی طرف رجحان عامہ پیدا ہوگیا۔ بنگال، بمبئی اور یو۔پی میں انتخابی مہم میں بھی
لیگ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن کانگریس مسلمانوں کی یک جہتی اور لیگ کے وجود

کی اشد ترین مخالف تھی۔ اس نے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ یو۔ پی میں ایک مخلوط وزارت کا سبز باغ دکھا کر حسب ذیل شرائط مسلم لیگ پالیمنٹری بورڈ کے سامنے پیش کیں :۔
(۱) مسلم لیگ پارٹی ایک علیحدہ اور مستقل پارٹی کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی (۲) مسلم لیگ پارٹی کے ممبر کانگریس پارٹی میں شامل ہو جائیں گے اور مسلم لیگ پارٹی کانگریس پارٹی میں ضم ہو جائے گی (۳) کانگریس ورکنگ کمیٹی کی پالیسی اور احکام و ہدایات کی پیروی تمام ممبر کریں گے۔ (۴) مسلم لیگ پالیمنٹری بورڈ توڑ دیا جائے گا اور آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ اپنا کوئی نمائندہ کھڑا نہیں کرے گی (۵) کانگریس پارٹی کے ضوابط کی پابندی کی جائے گی (۶) اگر کانگریس پارٹی اسمبلی سے استعفےٰ دینے کا فیصلہ کرے تو تمام ممبران مسلم لیگ بھی مستعفی ہو جائیں گے۔

لیکن مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے ان شرائط کو ٹھکرا دیا۔ بعض وہ مسلمان جو لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے ڈگمگا گئے اور انفرادی طور پر کانگریس میں شامل ہو گئے چند نے اس کے پلیج پر دستخط کرنے کے بعد عہدے بھی حاصل کئے۔ ۱۹۳۶ء میں مجلس احرار بمقام بٹالہ مسلم لیگ سے علیحدگی کا اعلان کر چکی تھی مئی ۱۹۳۶ء میں بمقام مرادآباد جمیعت العلما کا اجلاس ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد جو اب کانگریسی پالیسی کے زبردست آلہ کار بن گئے اس اجلاس میں خاص طور سے شریک ہوئے۔ ایک طبقہ مسلمانوں کے غیر مشروط طور پر کانگریس میں شامل ہونے کے حق میں تھا اور دوسرا طبقہ مشروط شرکت کا خواہاں تھا اور مسٹر جناح کے مشوروں کو اہمیت دیتا تھا۔ غرض بڑی بحث کے بعد اس نے ایک قرارداد پاس کی کہ :۔

جہاں تک تحصیل آزادی اور ملکی اور وطنی مفاد اور اجنبی طاقت کے نفوذ و اثر کا تعلق ہے جمیعت العلمائے ہند نے ہر موقع پر اپنا فریضہ ادا کرتے ہوئے کانگریس کے ساتھ آزادی کی جنگ میں اشتراک عمل کیا ہے اور اس لئے آج بھی کانگریس کے ساتھ شریک ہونے یا نہ ہونے کا اس کے سامنے کوئی سوال ہی نہیں۔ جب کبھی آزادی کے لئے جنگ ہوگی جمیعت کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل ضرور کرے گی۔

لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اس طرح کا اشتراک عمل اکثریت و اقلیت کے درمیان جو علاقہ ہے اور جس کی بنا پر اقلیت اکثریت سے تحفظات چاہتی ہے اس پر کچھ اثر انداز ہو وہ ایک مستقل مسئلہ ہے اور اس میں جمعیت کی رائے یہی ہے کہ ہندوستان کے اندر امن و امان اور منظم و طاقتور نظام حکومت بغیر اس کے قائم نہیں ہو سکتا کہ اکثریت اقلیتوں کو مطمئن کرنے اور ان کے قلوب میں اعتماد و محبت پیدا کرنے کے موثر طریقے اختیار کرے اگر اکثریت اس سے انکار کرتی ہے اور اقلیت اس بناء پر غیر مطمئن رہتی ہے تو وہ قصور وار نہیں ہے صرف آزادی کا نام لیکر اقلیت سے یہ کہنا کہ وہ مطمئن ہو جائے ممکن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اقلیت جو کچھ طریقے اپنے اطمینان کے لئے جائز طور پر ضروری سمجھتی ہو اس کا بند و بست ملکی مفاد کے لئے ازبس ضروری و لازمی ہے اور اس کی ذمہ داری اکثریت پر عاید ہوتی ہے۔ آزادی کی جد و جہد میں اشتراک عمل جس طرح مسلمانوں کا فریضہ ہے اسی طرح ہندوؤں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو نظام حکومت کے متعلق ایک اکثریت کی حیثیت سے مطمئن کر دیں۔ جو کوئی اپنے فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے۔ وہ ہی قصور وار اور مستحق ملامت ہے"

اب پورے زور کے ساتھ مسلم عوام سے رابطہ پیدا کر کے مسلم قومیت کو ہندو قومیت میں جذب کر لینے کی تدبیروں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ جمعیت العلماء نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ مجلس احرار امن رابطہ کی ایجنسی بن گئی۔ کانگریس فنڈ ان کی کفالت کے لئے وقف ہو گیا۔

ان کوششوں میں ہر قسم کا مکروہ پروپاگنڈا کیا گیا۔ تہمت و افترا تلبیس و تدلیس کا ایک نیا لٹریچر پیدا ہو گیا۔

مسلم لیگ اور اس کے ارکان کے متعلق غلط بیانیوں اور بہتانوں میں کوئی کسر نہ رکھی۔ ان حالات میں مسٹر جناح نے حسب ذیل بیان شائع کر کے مسلم عوام کو بہت کچھ ان کے دھوکے سے بچایا:-

میں نہایت افسوس کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ چند کانگریسی لیڈر اپنے

تصورات میں ایک نئی پالیسی کا معین نقشہ بنا کر اس بات میں کوشاں ہیں کہ مسلمان اور مسلم لیگ میں نفاق پیدا کریں۔ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ یہ طریقے جو اختیار کیے جا رہے ہیں قابل اعتراض ہیں مسلمانوں میں پھوٹ ڈالکر ان کے وطنی اور قومی جذبات کو متحرک کر کے یہ جھوٹی بات انکو سمجھائی جاتی ہے کہ کانگریس ہی کو یہ حق امتیاز حاصل ہے کہ وہ آزادئ ہند کی مبارزہ ودعویدار ہے اور یہ بھی تبلاتے ہیں کہ کوئی بھی دوسری جماعت جو کانگریس کی صد فی صد ہم عقیدہ نہ ہو حق حیات ہی نہیں رکھتی ہے۔ لیکن جب انہیں سے اقوام قلیل التعداد کی حفاظت کا سوال کرنے کی جسارت کی جائے تو کمیونسٹ کہکر اس کی زبان بندی فوراً کر دیجاتی ہے کیونکہ انکی رائے میں ہندو مسلم بحث ایسے موقعوں پر کوئی چیز نہیں ہے اور یہی وہ بعید الحقیقت امر ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کا منشا سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مسلمانان ہند میں افتراق پیدا کر کے ان میں اور لیگ میں ایک وسیع خلیج حائل کر دی جائے اور لیگ توڑ دی جائے۔

میرا نظریہ یہ ہے کہ اگر کانگریس والے اسی رویہ اور پالیسی پر اصرار کریں تو ترقی آلت اور پیچھے ہٹ جائے گی وہ مرکز جس پر ۳۵ کروڑ باشندگان ہند اپنی قومی خود مختار حکومت کی بنا قائم کر سکتے ہیں اس کا انحصار فقط اتحاد اور شریفانہ سمجھوتے پر ہے جو ہندو قوم اور اقوام قلیل کے درمیان طے پا سکے۔

میں یہاں مسٹر گاندھی کے ان الفاظ کو دہراؤں گا جن میں انہوں نے کہا ہے کو "مجھے اس بات کے مشاہدے سے سخت رنج ہوا کہ لارڈ زٹلینڈ بھی وہی قدیم اور مشہور و معروف ستر "نفاق ڈالکر حکمرانی کرو" الاپ رہے ہیں۔ کانگریس چند روز بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر وہ اقوام قلیل التعداد کے مفاد سے بے پرواہی برتے۔ اجتماعی حکومت کا قیام ہندوستان کو سیاسی جماعتوں میں تقسیم کر کے حاصل کرنا غیر ممکن ہے کانگریس کی وزارتیں اگر وجود پذیر ہوں بھی اور گورنر بھی اپنے قانونی اختیارات کو عمل میں نہ لائیں تو یہ وزراء اپنی قبر اپنے ہاتھوں تیار کر لیں گے جو نہی وہ مفاد اقوام قلیل التعداد کو پامال یا ان کے ساتھ ناانصافی کا برتاؤ کرنا چاہیں"

مسٹر گاندھی اپنے بیان میں یہ فرض کرتے ہیں کہ ناانصافی یا غلط عمل کرنے والے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس عملی دنیا کے اکثر حصوں میں اکثریت اقلیت کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کر کے عرصہ دراز تک تباہ نہیں ہوئی۔ بلکہ برعکس پھلتی پھولتی رہی گو آخرکار ان کی تباہی ایک لازمی بات ہے۔ اس امر کو جانتے بوجھتے کیوں اس قسم کا لالچ اکثریت کو دیگر اقوام قلیل التعداد کو دواماً خوف و رجا میں مبتلا رکھا جائے؟

میں دوبارہ یہاں پر مسٹر گاندھی کے ان الفاظ کی تکرار کروں گا جنکو حال ہی میں موصوف نے فرمایا ہے کہ "اگر کانگریس کے مطلوبہ اطمینان بخش جواب گورنر نہ دیں تو مجھے شریفانہ سکون (ڈیڈلاک) ان غیر شریفانہ جھگڑوں سے زیادہ پسند ہے جو روزانہ کانگریس اور گورنروں کے مابین ہوتے رہیں"

مسلم لیگ کی بھی بعینہ یہی حالت ہے یہ بھی ہندو مسلمانوں کے درمیان ذلت آمیز کشمکش کے مقابلہ میں جو روزانہ رونما ہو رہی ہے یا ہوا کرے گی۔ شریفانہ سمجھوتہ کو ترجیح دیتی ہے اس قسم کے کھیلوں سے ہندوستان کی دو بڑی متعلقہ جماعتوں میں تفرقہ ڈال کر ان کو دواماً علیحدہ رکھنے کا مشغلہ افسوس ہے کہ ہندوستان کا تاریخی واقعہ ہے۔ جسکا نتیجہ ہے کہ آج ہم پر ایک خارجی حکومت سوار ہے اور کانگریس کی اسی نہج کی مزید کوششیں کہ مسلمانوں میں نفاق ڈالکر حکومت کی جائے موجودہ تسلط کو برابر عرصہ نامعلوم تک قائم رکھے گی۔ مجھے اس بات سے خوشی ضرور ہے کہ کانگریس کے صدر نے کانگریس کی اس غلطی کو تسلیم کر لیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ غفلت اور بے اعتنائی برتنے سے پیدا ہوئی تھی۔ اور جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حالیہ انتخابات کے زمانہ میں کانگریس کو مسلمانوں سے کسی قسم کی امداد نہ مل سکی۔ گو اس سلسلہ میں یہ مفید ہوا کہ مسلم لیگ نے بالآخر کانگریس پر یہ بات ثابت کرا دی کہ مسلمانوں کی رائے اور جذبات کا احترام کانگریس کے لئے ضروری ہے لیکن مجھے افسوس اس امر کا ہے کہ انہوں نے جو علاج تجویز کیا ہے اسکا نتیجہ مزید تلخی پیدا کرنے اور ہر وطن پرست کے آزاد مقصد کو کچلنے کے سوائے اور کچھ نکل نہیں سکتا۔ اپنے سرکیولر میں جس کو صدر کانگریس نے مختلف صوبجاتی کانگریس کمیٹیوں

کے نام اجرا کیا ہے۔ وہ مُصر ہیں کہ مسلم گروہوں میں تبلیغ شروع کر دی جائے۔ اُن کی یہ تجویز ہے
کہ کانگریس پراونشل کمیٹیوں کے تحت مسلمان جماعتوں کے صوبجاتی اختلاطی کمیٹیاں (پراونشل
مسلم ماس کنٹاکٹ کمیٹیز) قائم کی جائیں اور ان میں مسلمانوں کی بھرتی شروع کر کے مسلمانوں
میں کانگریس کے کاموں کی نسبت ذوق و شوق پیدا کیا جائے اس مدعا کو حاصل کرنے کے
لئے وہ چاہتے ہیں کہ نوٹس اور میٹنگ کی کارروائیاں وغیرہ اُردو زبان میں مطبوع اور شائع
ہوں۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور ہر وہ مسلمان جو لکھ پڑھ سکتے ہوں۔ اس سے غیر متعلق رہیں
سوائے ان کے جن کی کانگریس سے بخوبی وابستگی ہے۔

دوسرے کانگریسی لیڈر مسٹر بابو سرت چندر بوس کا جو من حیث المجموع پریذیڈنٹ کے
مساوی الدرجہ ہیں خیال ہے کہ موجودہ دور میں صرف دال بھات کا مسئلہ ہی حل طلب ہے
ورنہ اصولاً ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہیں ہے اس وقت جس بات کی ضرورت ہے وہ
یہی ہے کہ معاشی اصول پر اس مسئلہ پر مسلمان گروہوں میں کچھ پروپاگنڈہ کیا جائے۔ کیا
بابو صاحب بھول گئے ہیں کہ حالیہ انتظامات وزارتِ بنگال کے موقعہ پر باوجود کثرت مسلمانان
ہندوؤں نے ۵۰۰۰ کی ضد کی تھی۔ کیا وہ نہیں جانتے علاوہ غرباء کے اور بھی طبقات
ایسے ہیں جنکے دال بھات کا مسئلہ ہی حل طلب ہے۔ غریب مسلمان طبقہ میں "کچھ پروپاگنڈہ"
کرنے کے بجائے ایک ایسا پروگرام مرتب کیا جاتا جس کے ذریعہ اسباب آسائش کی تکمیل
و فراہمی میں سہولت ہو سکتی اگر وہ یہ کام کر سکتے ہیں۔ تو میں اُنہیں یقین دلاتا ہوں کہ اسکو
کامیاب بنانے میں مسلمان فوراً شریک ہو جاتے۔

پس اب مجھے یہ معلوم ہوا کہ کانگریس کے لیڈروں کو سمجھدار مسلمانوں کی ضرورت
نہیں ہے کیونکہ ان کے عقیدے میں یہ لوگ اپنے وطن اور قوم کی خدمت کے قابل نہیں
ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اسقدر نادان ہیں کہ وہ ہندو سمجھداروں کے مقصد کو نہیں سمجھ سکتے
اور بنا بریں اونچے طبقہ کے ان تھوڑے سے معزز حضرات نے چھ صوبوں میں کامیابی
حاصل کرتے ہی ایک فرمان جاری کیا ہے کہ مجالس آئین ساز میں مسلم لیگ جماعتوں
سے عدم تعاون کا اقرار کرتے ہوئے مسلم لیگ جماعتوں سے لیجسلیچر میں اسوقت تک

بے تعلق رہیں۔ تاوقتیکہ یہ اپنے اصول اور اعتقادات سے دستبردار اور اپنی جماعت اپنی پالیسی اور اپنے پروگرام سے کنارہ کش ہو کر کانگریس کے معاہدہ کو بلاچون وچرا اور بلا شرائط تسلیم نہ کریں۔ اس میں انہیں کامیابی نظر نہ آئی بس اب وہ اس ذہن میں ہیں کہ مسلم جماعتوں کو اس بات کی ترغیب دیں کہ وہ اپنے مسلمان لیڈر یا ان کے قائم مقاموں کو رد کر دیں اور یہ چند کانگریسی اعلیٰ وطن پرست امید رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے گروہ ان کی رہبری قبول کرینگے۔ ایسی صورت میں وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا اہتمام وہ بخوبی اور احسن طور سے انجام دینگے کیونکہ اقلیت کی حفاظت کا سوال ان گروہوں کی سمجھ میں بخوبی آسکتا ہے کیونکہ دال بھات کے دل خوش کن محاورے اور اردو زبان میں کچھ اعلانات ان کو دھوکہ دہی کی خاطر بطور دام بچھائے گئے ہیں۔ حالانکہ بصورت ثانی مسلمانوں کی قومی زبان ہندی ہونیوالی ہے "

قبول وزارت کے فیصلے کے بعد چھ صوبوں میں تو کانگریس وزارتیں قائم ہو گئیں اور عارضی وزارتیں ختم کر دی گئیں، مگر اب یہ کوشش کی گئی کہ بقیہ پانچ صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی وزارتیں ہیں اگر کانگریس وزارتیں قائم نہ ہو سکیں تو مشترکہ (کولیشن) وزارتوں کو قائم کیا جائے اور ان پر اپنا اثر و اقتدار قائم رکھا جائے چنانچہ سندھ و سرحد اور آسام میں ہر ممکن تدبیر سے عدم اعتماد کے ووٹ سے ان کا خاتمہ کیا گیا اور سندھ و صوبہ سرحد میں اگرچہ مسلمان وزیر اعظم رہے مگر ان کی وزارتیں کانگریس کی خیمہ بردار بن گئیں۔ آسام میں ہندو وزارت برسر اقتدار آگئی۔ البتہ پنجاب میں سر سکندر حیات خاں کی اور بنگال میں مولوی فضل الحق کی وزارت مضبوطی کے ساتھ قائم رہی لیکن کانگریس نے ہر ممکن تدبیر ان کے خاتمہ کی کی!

مسٹر جناح کے دوروں اور ملاقاتوں اور تقریروں نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا، نوجوان راجا امیر احمد خاں (محمود آباد) نے چند ہی مہینوں میں صورت حال بدل دی اور اب مسلم لیگ کی قوت بڑھنے لگی۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں راجہ صاحب موصوف کی مساعی جمیلہ سے لکھنؤ میں جو شاندار اجلاس منعقد ہوا اُس

نے مسلم لیگ کی جدید حاصل شدہ قوت کو آنکھوں سے دکھا دیا راجہ صاحب نے مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے اپنے خطبہ صدارت میں بیرونی ممالک اور فلسطین کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ :۔

خود ہمارے ملک میں ایک نازک سیاسی موقع پیدا ہوگیا ہے جس جماعت کی اکثریت ہے وہ مسلم جماعت کے وجود تک کو تسلیم نہیں کرتی اور قومی ترقی کے لئے ہمارے رہنماؤں کے ساتھ اتحاد کلی کرنے پر تیار نہیں ہے آپ جو اسوقت یہاں موجود ہیں ان میں سے بہتوں نے آزادی ملک کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں ترک موالات کے زمانہ میں آپ میں سے بہتوں نے اپنی زندگانی کا بہتر حصہ قیدخانوں میں گذارا ہے وہ لوگ جو آج یہاں موجود نہیں ہیں مگر انکی قربانیوں کی یاد احترام کے ساتھ ہمارے دلوں میں موجود ہے ان میں بہت سے لوگوں کو مجبوراً برادران وطن کے طرز عمل پر اظہار تاسف کرنا پڑا ہے ۔

ہم نے اپنے برادران وطن کو بار بار یقین دلایا ہے کہ جنگ آزادی میں ہم انکے دوش بدوش کھڑے ہونے پر تیار رہیں۔ مگر ہم اپنی ہستی کو بالکل مٹا دینا نہیں چاہتے ایک متحدہ محاذ کا مطالبہ کیا ہے مگر انھوں نے آزادی کی جنگ کو حصول حقوق کی کوشش میں تبدیل کر دیا ہے لہذا ہمکو مجبوراً آل انڈیا مسلم لیگ کے ذریعہ سے اپنی علیحدہ تنظیم کرکے اپنے تمدن اپنی زبان اپنے معاشرتی اور سیاسی حقوق کا تحفظ کرنا پڑا۔

ہم رجعت پسند قرار دیئے گئے ہیں۔ ہمکو برا بھلا کہا گیا ہے اور ہمپر ذاتی حملے کیے گئے ہیں۔ لیکن میں پھر کہتا ہوں کہ آج یہاں کوئی مسلمان نہیں ہے جو خیال اور عمل کی آزادی کا خواہاں نہ ہو اور جو ایک آزاد ملک میں رہنے کا خواہشمند نہ ہو۔

جو لوگ ہمکو رجعت پسند کہتے انکو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ مسلمانوں سے خطاب کر رہے ہیں ان مسلمانوں سے کہ جنکے مذہب نے انھیں آزادی کی تعلیم دی ہے اور جسکے بغیر وہ دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتے ہم اپنے ملک کے لئے آزادی چاہتے ہیں مگر اپنی جماعت کی آزادی کے بھی خواہشمند ہیں یہ جمہوریت کا ایک ضروری جزو ہے کہ

اقلیتوں کو کافی نمایندگی حاصل ہو۔ اس کے بغیر حقیقی جمہوریت تو نہیں۔ جمہوریت کی جھوٹی نمائش البتہ ممکن ہے، مسلمانوں کی شرکت کے بغیر کوئی سیاسی جدوجہد مناسب اور کافی طور سے عمل میں نہیں آسکتی۔ جب ہم قومی جنگ میں کود پڑے ہیں تب ہی ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری عملی سیاسیات کی حدود میں آسکی ؛

اس صوبہ میں گذشتہ انتخابات کے معاملہ میں مسلم لیگ کو قابل رشک کامیابی حاصل ہوئی مسلم لیگ کے نامزد کئے ہوئے ۲۹ امیدوار کامیاب ہوئے جہانسی کے ضمنی انتخابات میں مسلمانوں نے دکھا دیا کہ جب اپنے سے بہت بڑی طاقت کا مقابلہ پڑتا ہے۔ اس وقت ان کے جوہر کھلتے ہیں۔ لیگ کی از سر نو تنظیم کے لئے ایک اسکیم ہمارے سامنے ہے میں پیش بینی نہیں کرسکتا کہ اس اسکیم کے متعلق ہم کیا فیصلہ کرینگے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ آپ سے یہ امر پوشیدہ نہیں۔ کہ گذشتہ موقعہ پر جب مسلم لیگ کا دستورالعمل بنایا گیا تھا اسوقت سے ملک کے سیاسی حالات بہت بدل گئے ہیں۔ لہذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی جماعت کو اس کے حقوق سے خبردار کردیں اور تمام مسلمانوں کو متحد کرکے ایک باقاعدہ منظم جماعت بنادیں۔ ملک بھر میں ضلعوار شاخیں کھلنا چاہئیں اور انکو ایک زندہ ہستی کی طرح مسلسل طور پر سرگرم رہنا چاہیئے۔ حق انتخاب کی توسیع کے ساتھ لیگ کے مشن کو شہر شہر اور گاؤں گاؤں پہونچانا ضروری ہے۔ ان شاخوں کو ہوشیار رہنا چاہیئے اور غرضمند حلقوں کی طرف سے مسلمانوں میں باہمی افتراق کی جو کوششیں کی جائیں انکو رد کرتے رہنا چاہیئے ؛؛

صدر لیگ مسٹر جناح نے اپنے پرزور و بسوط خطبہ صدارت کی تمہید میں اپریل ۱۹۳۶ء کے اجلاس مسلم لیگ کی قرارداد کا اعادہ کرکے اور چند ہی مہینوں میں مسلم لیگ کی کامیابیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ؛

جن جن صوبوں میں لیگ پارلیمنٹری بورڈ قائم ہوا اور جہاں جہاں ہم نے اپنے امیدوار کھڑے کئے ہر جگہ تقریباً ۶۰ یا ۷۰ فیصدی ہمارے ہی امیدوار کامیاب ہوئے اور انتخابات کے بعد میں دیکھ رہا ہوں کہ تقریباً ہر صوبہ میں مدراس کے بعید ترین گوشہ

نے لیکر سرحدی صوبہ تک سینکڑوں ضلع لیگ قائم ہو چکی ہیں گذشتہ اپریل سے تو بیش از بیش تعداد میں مسلمان لیگ کے گرد جمع ہو رہے ہیں اور مجھے کامل یقین ہے کہ جو وقت لیگ کے لائحہ عمل اور پروگرام کو وہ اچھی طرح سمجھ لیں گے تو اسوقت ہندوستان کی تمام اسلامی آبادی مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے کھڑی نظر آئے گی "

پھر اُنھوں نے کانگریس کے ادعائے آزادی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ۔

"بعض حضرات کامل آزادی کی بحث کرتے ہیں لیکن اس سے کیا حاصل کہ آپ کے لبوں پر تو کامل آزادی ہو۔ لیکن ہاتھ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ لئے ہوئے ہوں ہندوستان کو جس چیز کی اس وقت ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ایک متحدہ سیاسی محاذ قائم کیا جائے اور اپنے مقصد میں ہم سچے ہوں اور حکومت ملک کی اہل ملک کے ہاتھ میں ہو اور اہل ملک کے لئے ہو تو پھر آپ اپنی حکومت کا جو نام چاہیں رکھ لیں"

اس کے بعد قائدین کانگریس کی اس پالیسی پر کہ مسلمان مجبوراً کانگریس سے علیحدہ ہو جائیں۔ اور اس امر واقعہ کی طرف کہ کانگریسی حکومت کے صوبوں میں مسلمان انصاف و حق رسی کی امید نہیں رکھ سکتے کانگریس کی بے اصولیوں پر توجہ دلائی اور تمام حالات پر حسب ذیل سیر حاصل بحث کی :-

"لیکن جن صوبوں میں کانگریس کی اکثریت نہ تھی۔ مثلاً صوبہ سرحد میں وہاں یہ مقدس اُصول کہ "سب ایک ہی پارٹی کے ماتحت کام کریں غائب ہو گیا" اور کانگریس پارٹی کی دوسری جماعتوں سے ملنے اور اشتراک عمل کرنے کی اجازت دیدی گئی۔ کوئی فرد واحد مسلمان جس نے کانگریس پلیج پر دستخط کرنا اور کانگریس کا غلام ہونا منظور کر لیا فوراً اُسے عہدہ وزارت[1] پیش کر دیا گیا اور دنیا سے کہہ دیا گیا کہ ہماری وزارت میں مسلمان بھی وزیر ہیں اس پر مطلق توجہ نہ کی گئی کہ کونسل و اسمبلی کے مسلمان ممبروں کی ایک بڑی اکثریت کا

---

[1] صوبہ متحدہ میں حافظ محمد ابراہیم۔ بمبئی میں مسٹر نوری۔ مدراس میں سیٹھ یعقوب حسن۔ صوبہ متوسط میں مسٹر شریف اسی طرح وزیر مقرر ہوئے۔ صوبہ بہار میں ڈاکٹر سید محمود تو پہلے سے کانگریسی تھے۔ اڑیسہ میں ایک مسلمان محض اس قصور پر وزیر نہیں بنایا گیا کہ اس نے کانگریس کا مقابلہ کیا تھا اور اُسکے سوا کوئی قابلیت وزارت نہ رکھتا تھا۔

اسے اعتماد حاصل نہیں اور نہ اسکی مسلمان ممبران کوئی عزت کرتے ہیں؟

ان وفاداراانہ خدمات کے صلہ میں جو اس کانگریس کی ان حضرات نے اپنا سیاسی ایمان بیچ کرکی۔ یہ حضرات دنیا کے سامنے بحیثیت مسلم وزیر کے پیش کئے گئے اور اپنی پارٹی اور قوم کے ساتھ انہوں نے جتنی غداری کی اتنا ہی زیادہ کانگریس کی طرف سے انعام ملا۔

ہندی تمام ہندوستان کی قومی زبان ہوگی "بندے ماترم" قومی ترانہ ہوگا۔ اور جبراً سب سے منوایا جائیگا۔ ہر شخص مجبور کیا جائے گا۔ کہ کانگریسی جھنڈے کی عزت کرے۔ اس کی فرماں برداری کرے؟

جس قوم کی اکثریت ہے اس کو ابھی ذراسی قوت واقتدار نصیب ہوا ہے۔ لیکن ابتدا ہی میں اس نے بتا دیا۔ اور جتا دیا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لئے ہے صرف فرق اتنا ہے کہ کانگریس قومیت کا نقاب ڈالے ہوئے ہے مگر ہندو مہاسبھا مطلب کو چبا چبا کے نہیں کہتی بلکہ صاف کہتی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ کانگریس کی موجودہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کی قوموں کے آپس میں تعلقات ناخوشگوار ہوتے چلے جائینگے تلخی بڑھتی جائیگی ایک فرقہ دوسرے فرقہ سے آمادہ جنگ وپیکار رہیگا۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ شہنشاہیت کا مستبدانہ تسلط ہم پر قوی تر ہوجائیگا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس معاملہ میں برٹش گورنمنٹ کانگریس کو بالکل آزاد وخود مختار چھوڑ دے گی کیونکہ ان خانہ جنگیوں اور مناقشات کی اسے ذرا بھی پرواہ نہیں۔ برخلاف اس کے جبتک شہنشاہی مفاد یا دوسری قسم کے مفاد پر کوئی اثر نہ پڑے اور ہندوستان کی محافظت ومدافعت ان کے قبضہ اقتدار میں رہے وہ ان تمام مناقشات کو اپنے مفید مطلب ہی سمجھیگی۔ مگر میرا خیال ہے کہ کانگریس ملک میں جب نااتفاقی اور پھوٹ کی تخم ریزی کر چکے گی اور ایک متحدہ ممالک وجود میں آنا مشکل ہوجائے گا۔ اس وقت خیالات ایک عظیم الشان پلٹا کھائیں گے اور ایک مہیب ردّ عمل ظہور پذیر ہوگا؟

بے موقعہ نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ جن تباہ کن اور خوفناک نتائج کا امکان ہے اگر وہ رونما ہوئے تو اس کی ذمہ داری اسکی مسئولیت برٹش گورنمنٹ پر کچھ کم نہ ہوگی۔

کانسٹی ٹیوشن میں گورنر جنرل اور صوبے کے گورنروں کو خاص اختیارات دیئے گئے ہیں جنکی رُو سے اقلیتوں کے حقوق کی محافظت کی خاص ذمہ داری عاید کی گئی ہے۔

اس زمانہ میں جبکہ کانگریس پارٹی یہ مطالبہ کررہی تھی کہ اس کی وزارت سے کسی قسم کی مداخلت نہ کیجائے۔ لارڈ زٹلینڈ سکریٹری آف اسٹیٹ نے ان ذمہ داریوں پر بہت زور دیا تھا۔ اوران کا بار بار اعادہ کیا تھا۔ اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ نہ گورنر اور نہ صوبہ کے گورنر ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکتے ہیں۔ کانسٹی ٹیوشن کی اسپرٹ اور گورنروں کی طرف سے جو ہدایت نامے جاری ہوئے انکی خلاف ورزی کرکے مسلمان وزراء مقرر کئے گئے ہیں۔ اس خلاف ورزی میں گورنر اور کانگریس برابر کے شریک ہیں۔ ایسے مسلمانوں کو وزیر مقرر کرکے گورنروں نے یہ ثابت کردیا کہ وہ کانگرسی حکومت کے ہمنوا ہیں۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان مسلمان وزراء پر نہ کونسل کے مسلمان ممبران کا اعتماد حاصل ہے نہ کونسل سے باہر عامتہ الناس کا اقلیتوں کے حقوق کی محافظت کا فرض برٹش گورنمنٹ نے ایک مقدس فرض سمجھ کر اپنی گردن پر لیا تھا۔ اس فرض کے ادا کرنے سے صوبہ کے گورنر قطعاً عاجز و قاصر و بے پرواہ رہے۔

جب اتنے اہم فرض کو وہ ادا نہ کرسکے تو سینکڑوں وہ باتیں جو سطح تک نہیں آتیں اور جنکا علم روزانہ کی حکومت یا کونسلوں کی کارروائیوں میں نہیں ہوتا۔ ان پر کیا توجہ کی جاسکے گی۔ یہ حالات نہایت فکرو اندیشہ سے مطالعہ کرنے کے قابل ہیں۔ اوران سے معلوم ہوگا کہ واقعات کا رُخ کدہر ہے۔ میری مسلمانوں سے عرض یہ ہے کہ قبل اس کے کہ حالت تیراز کمان جستہ و آب از جو رفتہ کے مصداق ہوجائے وہ معلوم کرلیں کہ ان کے لئے راہ عمل کیا ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ وہ سارا وقت اور اپنی ساری ہمت اپنی تنظیم بڑہانے پر صرف کردیں اور دیگر معاملات سے قطع نظر کریں۔

میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ مسلمانوں میں تفریق ہے ان میں سے ایک گروہ تو وہ ہے جو برٹش گورنمنٹ کی طرف اپنا رُخ کئے ہوئے ہے۔ اگر اس کے نتائج سے وہ بیخبر رہے تو وہ تا ابد بے خبر رہیگا۔ خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد خود کرتے ہیں۔ ایک

دوسرا گروہ ہے جس کا رُخ کانگریس کی طرف ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اپنے اوپر بھروسہ کریں۔ اور اپنی قسمت کا خود فیصلہ کریں ہمیں وہ آدمی چاہئیں جو مضبوط ارادے مضبوط ہمت، مضبوط ایمان کے مالک ہوں۔ اور جس بات کو امر حق سمجھتے ہوں۔ اس کے لئے تن تنہا جنگ کرنے کے لئے تیار ہوں، گوچہ بظاہر ساری دنیا ان کے خلاف نظر آتی ہو۔ ہمیں اپنے میں قوت اور عزم بالجزم پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاآنکہ مسلمانوں کی پوری تنظیم ہو جائے۔ اور ان میں وہ زور و قوت پیدا ہو جائے جو ایک متحد الرائے متحد الارادہ جماعت میں ہوتا ہے۔

اکثریت سے کسی سمجھوتہ یا مفاہمت کا امکان نہیں کیونکہ ہندوؤں کا کوئی لیڈر جو صاحب اثر و اختیار ہو نہ اسکی طرف کوئی توجہ کرتا ہے نہ اس کے لئے خلوص دل سے تیار ہے باعزت سمجھوتہ برابر کے فریقین میں ہوتا ہے۔ اور تاوقتیکہ دونوں فریق ایک دوسرے کی عزت اور طاقت محسوس نہیں کرنے لگتے سمجھوتہ کی کوئی صورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ کمزور جماعت کی طرف سے صلح جوئی کے معنی اعتراف کمزوری اور اپنے حقوق میں مداخلت کی دعوت ہوا کرتی ہے۔ حب الوطنی اور حق و انصاف کے نام پر اپیل بالکل بیکار ثابت ہوا کرتی ہے۔ تمام تحفظات و معاہدے ایک ردی کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اگر ان کی پشت پناہ طاقت نہ ہو۔

سیاست کے معنی ہیں طاقت نہ کہ حق و انصاف! نہ کہ کسی کی نیک نیتی پر بھروسہ دنیا کی اقوام کو دیکھئے اور سمجھئے کہ کیا ہو رہا ہے جبش کا کیا حشر ہوا۔ چین اور اسپین کا کیا حال ہو رہا ہے اور فلسطین کا تو کچھ ذکر ہی نہیں جسکے متعلق میں ابھی ذکر کرونگا!

کانگریس کے ارباب بست و کشاد مختلف آوازوں میں گفتگو کرتے ہیں۔ وہ مختلف الآراء ہیں ایک کی رائے میں ہندو مسلم کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اور ملک میں کوئی شئے اقلیت کے نام سے نہیں دوسرے کی رائے میں مسلمانوں کی موجودہ پراگندہ اور غیر منظم صورت حال میں ان کو بہلانے اور پھسلانے کے لئے صرف یہی کافی ہوگا۔ کہ ان کی طرف روٹی کے چند ٹکڑے پھینک دئے جائیں۔ وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں

کو اس طرح دھوکا دیا جا سکتا ہے؟

آل انڈیا مسلم لیگ اب زندہ رہنے کے لئے آئی ہے اور وہ ہندوستان کی سیاسیات میں پورا حصہ لے گی۔ اور جتنی جلدی اسکی اہمیت کا صحیح اندازہ لگالیا جائے گا اور سمجھ لیا جائیگا اسی قدر یہ تمام دوسری جماعتوں کے لئے بھی بہتر ہوگا۔ ایک تیسری رائے کا یوں اظہار کیا جاتا ہے کہ ہر طرف تاریکی اور اندھیرا ہے اور کوئی شعاع امید نظر نہیں آتی لیکن جیسے جیسے کانگریس طاقت حاصل کرتی جاتی ہے وہ اپنے سادہ چلکوں کے پرانے وعدے بھولتی جاتی ہے اور انہیں پورا نہیں کرتی۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اس صورت حال پر غور کریں اور اپنی قسمت کا فیصلہ ایک متحدہ لائحہ عمل بنا کر کریں جس پر نہایت وفاداری سے تمام ہندوستان میں عملدرآمد کیا جائے کانگریسی مسلمان شدید غلطی کرتے ہیں جب وہ مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ غیر مشروط طور سے کانگریس میں ضم ہو جائیں اس سے بڑھکر شکست خوردہ ذہنیت کا اور کیا مظاہرہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں اور اس سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ اور کیا دشمنی و غداری ہو سکتی ہے اگر اس پالیسی پر عمل کیا گیا تو میں آپ کو متنبہ کئے دیتا ہوں کہ مسلمان اپنے محضر قتل نامہ پر خود مہر لگادیں گے۔ اور پھر وہ ملک اور حکومت کی قومی زندگی میں جماعتی حیثیت سے خود فنا ہو جائیں گے۔ صرف ایک صورت مسلمانوں کو بچا سکتی ہے اور ان کی گئی ہوئی طاقت انکو واپس دلا سکتی ہے کہ وہ اپنی گمشدہ روح کو پھر بیدار کریں۔ پھر حاصل کریں اور اس اعلیٰ وارفع اصول پر ثابت قدمی سے کاربند ہوں جو ان کے باہمی اتحاد اور انکو ایک شیرازہ میں منسلک کرنے کی بنیاد ہیں۔ ان آوازوں اور طعنوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہونا چاہیئے جو مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً "فرقہ پرست" "ٹوڈی" یا رجعت پسند" دنیا بھر کا بدترین "ٹوڈی" اور شریر ترین "فرقہ پرست" جب آج کانگریس کے سامنے ہتھیار ڈالدیتا ہے اور اپنے ہی بھائیوں کو لعنت ملامت کرنے لگتا ہے۔ تو کل ہی وہ قوم پرستوں کا سردار بنا دیا جاتا ہے یہ آوازے طعنے اور گالیاں صرف اسوجہ سے استعمال کی جاتی ہیں کہ مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا ہو جائے وہ اپنے آپ کو حقیر و ذلیل سمجھنے

لگیں۔ ان میں آپس میں تفرقہ پڑجائے اور وہ ساری دنیا میں بدنام ہو کر مشہور ہوجائیں۔ یہ محض پروپاگنڈہ ہے اور ہمیں اسے انتہائی نفرت وحقارت سے ٹھکرادینا چاہیئے۔۔۔۔

آل انڈیا مسلم لیگ نہایت ثابت قدمی سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہتی ہے یہی اس کا سب سے اولین اور بنیادی اصول ہے اور یہی اس کے وجود میں آنے کی غرض وغایت ہے۔ کانگریس لیگ اور اس کے معاونین سے محض اسی لئے ناراض ہے ورنہ ہم کون ایسا کام کر رہے ہیں جس پر کانگریس کو اعتراض ہو۔ آج خود کانگریس وہی کر رہی ہے جسے کرنے کا مسلم لیگ نے چند سال پہلے فیصلہ کیا تھا۔ لیگ ہرگز یہ نہیں دیکھ سکتی کہ حکومت برطانیہ یا کسی دوسری پارٹی کے ہاتھوں مجلس قانون ساز میں یا باہر مسلمان دوسروں کے اغراض ومقاصد کے لئے قربان کر دئے جائیں۔

کانگریس نے اپنی تمام لن ترانیوں کے باوجود گذشتہ سالوں میں مسلمانوں کے لئے کچھ نہیں کیا وہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے دلوں میں اعتماد واحساس طمانیت کے جذبات پیدا کرنے سے قاصر رہی۔ کانگریس نے مسلم عوام سے ربط ضبط پیدا کرنے کے پردہ میں یہ کوشش کی کہ مسلمانوں میں پھوٹ پڑجائے۔ وہ کمزور اور منتشر ہوجائیں اور اپنے سالہا سال کے خدمتگذار قائدین سے بدظن ہوجائیں یہ کانگریس کی ایک خطرناک چال ہے اور یہ کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرسکتی۔ اس قسم کی گھاتیں باوجود مختلف قسم کی آوازوں۔ طعنوں۔ نعروں کے کامیاب نہیں ہوسکتیں۔

ایمانداری اور نیک نیتی کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ صرف یہ کہ اقلیتوں کے جائز مطالبات پورے کر دئے جائیں۔ بھوک اور افلاس کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں اشتراکی اور بالشویک خیالات پیدا ہوں۔ اس کے واسطے ابھی ملک تیار نہیں موجودہ صورت میں مسلم لیگ کی رائے میں سول نافرمانی کی پالیسی بالکل بیکار اور خودکشی کے مترادف ہے اس قسم کی دو تحریکیں بالکل ناکامیاب ثابت ہوئیں اور عوام کو بہت زیادہ مشکلات اور مصائب برداشت کرنا پڑیں

اور سالہا سال اس قسم کی بیکار محض کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کو پہلے سے بھی رجعت آمیز آئین دیا گیا۔ اور کانگریس اب اس آئین پر خود عمل پیرا ہے ؎

کسی رزولیوشن کے ذریعہ سے گورنر جنرل سے کہنا کہ وہ وزیر ہند سے استدعا کریں کہ ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی (ہر بالغ کا حق رائے دہندگی) طلب کی جائے۔ سب سے بڑی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان میں واقعات کو اصلی رنگ میں دیکھنے کی صلاحیت نہیں ؎

کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی وہ جماعت ہوتی ہے جو اسلئے طلب کی جاتی ہے کہ ملک کا قانون اساسی بنائے۔ یہ اسمبلی صرف اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جبکہ وہ حکومت کی طرف سے وجود میں آئے اور ان لوگوں پر مشتمل ہو جو عوام کے منتخب نمایندے ہوں اور جنکو یہ اختیار دیا گیا ہو کہ وہ اپنی رائے کے مطابق ملک کا آئین حکومت مرتب کریں اور جبوقت ملک کا دستور اساسی مرتب ہو جائے وہ دستبردار ہو جائیں اور ان کا بنایا ہوا آئین نافذ ہو جائے ؎

ہر بالغ کو اختیار رائے دہندگی دیکر رائے دہندگان کی فہرست کون مرتب کریگا۔ اور کتنے رائے دہندگان سے کتنے نمایندے منتخب کئے جائیں گے۔ قانون کس کے ہاتھ میں ہوگا! اور کون اس کا انتخاب کرائیگا جو اپنی پسند کے مطابق آئین کو مرتب کریں گے یہ سب لوازمات کون عمل میں لائیگا۔ اور اقلیتوں کی قسمت کا کیا فیصلہ ہوگا!

کیا کانگریس سنجیدگی سے اس کو باور کرسکتی ہے کہ وزیر ہند یہ سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ جبکہ چند ہی دنوں پیشتر حکومت برطانیہ کے نمایندے جنکو کامل اختیارات ہیں۔ یعنی ہز اکسیلنسی وائسرائے نے کہا کہ انہیں کامل توقع ہے کہ وہ مستقبل قریب ہی میں ہندوستان میں فیڈریشن قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور یہ کہ جب وہ ہندوستان سے گئے تو انھوں نے اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ صوبوں میں حکومت خود اختیاری قائم ہو جانے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں فیڈریشن قائم ہو جائے گی، اٹھارہ مہینے کے تجربہ کے بعد فیڈریشن قائم ہو جائیگی۔ توقع یقین میں تبدیل ہو گئی۔ ملک کی حالت کا بحیثیت

۱۳۱

مجموعی اندازہ کرتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کانگریس حاکمانہ اقتدار سے ابھی بہت دور ہے اور گورنمنٹ برطانیہ کے متعلق یہ توقع کرنا کہ وہ اس جماعت کو طلب کرے گی جو قانون اساسی کے سارے واقعات سے چشم پوشی کرلیتا ہوگا اور یہ امید کہ کانگریس میں قابلیت ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرا سکے گی۔ . . . . خلاف واقعہ محض قیاس آرائی ہے۔ کانگریس کو سب سے پہلے تو ملک کی بڑی قوموں اور بڑے بڑے طبقوں کے مفاد کو اپنے زیر قیادت لانا ہے ایک بیرونی حکومت سے جو اس ملک میں مالک تخت و سلطنت ہے کہ وہ ایک قسم کی آئینی اسمبلی طلب کرے اور قبل اس کے کہ فرقہ وارانہ مسائل کا کوئی بھی تصفیہ ہو اور قبل اس کے کہ ہندوستان کی بڑی قوموں نے کانگریس کی لیڈری قبول کی ہو، اس کی مثال ایسی ہوگی کہ گاڑی کے پیچھے گھوڑا جوتا جائے۔ اس حقیقت کو کبھی نظرانداز نہ کرنا چاہیئے کہ ہندوستان کی آبادی کا ⅓ حصہ بالکل ایک جداگانہ حیثیت اور نوعیت رکھتا ہے۔ یعنی وہ آبادی جو کہ ہندوستانی ریاستوں میں آباد اور دیسی فرمانرواؤں کے زیر اثر ہے بے نتیجہ کوشش کرنے یا بالفاظ دیگر بالو میں ہل چلانے کے بجائے کانگریس کو کم از کم اس ایک چیز کی طرف اپنی تمام تر توجہ کو مبذول اور مرکوز کرنا چاہیئے کہ آل انڈیا فیڈریشن اسکیم کو جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں شامل اور موجودہ مرکزی آئین سے کہیں زیادہ رجعتی ہے وہ کسی طرح عملی جامہ اختیار نہ کرسکے۔ اسلئے کہ وہ لوگ جو حکومت برطانیہ کی طرف سے ذمہ وارانہ اختیار رکھتے ہیں۔ یہ چیز پورے زور اور پورے وثوق کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ فیڈریشن کی اسکیم عنقریب جامۂ عمل پہننے والی ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ تن تنہا اپنی جماعتی جمعیت سے اسکو روک سکتی ہے یا وہ کوئی دوسرا فارمولا سوچ رہی ہے یا اس نے یہ طے کرلیا ہے کہ خاموشی کے ساتھ جو کچھ سامنے آئے اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرلے جیسا کہ وہ ابھی صوبوں کی خود اختیاری کے سلسلہ میں کرچکی ہے کہ اس کے چوٹی کے لیڈران اس کے خلاف چیختے اور چلاتے رہے اور اس نے اسے قبول کرلیا۔"

اس اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل قرار پائے:۔

(۱) ہندوستان میں کامل آزاد وفاقی جمہوری ریاستوں کا قیام جس کے دستور میں مسلمانوں کے اور دوسری اقلیتوں کے حقوق و مفاد کی مؤثر اور مکمل حفاظت کیجائے۔

(۲) ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی حقوق و مفاد کی ترقی اور حفاظت کرنا۔

(۳) دیگر اقوام ہند کے ساتھ مسلمانوں کے دوستانہ تعلقات اور اتحاد کو بڑھانا۔

(۴) مسلمانان ہند کے باہمی نیز دیگر ممالک کے مسلمانوں کے ساتھ رشتۂ اخوت قائم واستوار کرنا۔

وہ تمام اصحاب بھی جو پارلیمنٹری بورڈ کے قیام کے وقت علیحدہ گروہوں میں منقسم تھے مجالس وضع قوانین کی لیگ پارٹی میں شامل ہوگئے۔ سندھ سے سر عبداللہ ہارون بہار سے سید عبدالعزیز اور بنگال سے مولوی فضل الحق نے بلا شرط شمولیت کی۔

یونینسٹ پارٹی کے روح رواں سر سکندر حیات خاں اور مسٹر جناح میں ایک میثاق ہوا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:۔

(۱) سر سکندر حیات خاں اپنی واپسی پر اپنی پارٹی کا ایک خاص اجلاس منعقد کریں گے اور ان تمام مسلم ممبران کو جو اس وقت مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں مشورہ دیں گے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اس کے کریڈ پر دستخط کردیں۔ اس کے بعد ان تمام قواعد و ضوابط پر جو کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبجاتی بورڈ کے ہیں عمل کرنے پر مجبور ہوں گے مگر اس سے موجودہ یونینسٹ پارٹی کی حیثیت اور تشکیل میں کچھ فرق نہ آئے گا۔

(۲) اس میثاق کے بعد آئندہ تمام انتخابات اور ضمنی انتخابات جو اسمبلی کے لئے ہونگے ان میں تمام گروپ اس شخص کی متحدہ مدد کریں گے جس کو پارٹی نے کھڑا کیا ہو۔

مسلم ممبران اسمبلی جو لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہوں یا جنہوں نے لیگ کے ٹکٹ پر دستخط کرکے اس میں شمولیت کی ہو ان کی اسمبلی میں ایک علیحدہ پارٹی ہوگی جو مسلم لیگ پارٹی کہلائے گی۔

مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہوگی کہ وہ کسی دوسری پارٹی سے جس سے

اس کا سمجھوتہ ہوا اس کو قائم رکھے یا اگر وہ کسی دوسری پارٹی سے مل کر کام کرنا چاہے تو کر سکے بشرطیکہ ایسی پارٹی کا پروگرام اور اصول لیگ سے مختلف نہ ہوں۔

اس معاہدہ کی بناء پر پراونشل لیگ اور پارلیمنٹری بورڈ بھی بنائے جائیں گے۔ ان کے علاوہ سر سعد اللہ (آسام) سے اور وزارت سے مستعفی ہونے کے بعد سندھ سے سر غلام حسین ہدایت اللہ بھی لیگ میں داخل ہو گئے۔

۱۷، و ۱۸ اپریل ۱۹۳۸ء کو کلکتہ میں ایک نہایت زبردست اجلاس خصوصی منعقد ہوا۔ آنریبل مولوی ابوالقاسم فضل الحق نے بہ حیثیت صدر استقبالیہ کمیٹی بنگال کی سیاسی حالت مسلمانوں کے خلاف کانگریس اور مہاسبھا کی متعصبانہ ذہنیت مسلمانانِ بنگال کی تباہی کا مختصر بیان کرتے ہوئے موجودہ صورتِ حال کی نسبت کہا کہ :-

ہم کو اس وقت دو مصیبتوں کا سامنا کرنا ہے پہلی مصیبت تو کمیونل ایوارڈ ہے جس نے ہماری اکثریت کو اقلیت بنا دیا ہے اور دوسری مصیبت ہمارے ان مسلمان بھائیوں کی بے وفائی ہے جو کانگریس کے لمبے چوڑے لیکن جھوٹے وعدوں پر بھروسہ کر کے دھوکا کھا رہے ہیں اور اس طرح ہماری رہی سہی قوتِ اجتماعی کو صدمہ پہونچا رہے ہیں اگر فقط کانگریس اور مہاسبھا کا مقابلہ ہوتا تو آپ یقین فرمائیں کہ ہمارے اتحاد عمل کے سامنے ان کی چالیں بے سود ثابت ہوتیں۔

اس کے بعد انھوں نے کانگریس کے ساتھ اشتراک کی پیشکش کی کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کرے اور کانگریسی صوبوں میں اس صوبہ کی مسلم لیگ پارٹی کے ساتھ اشتراک کر کے وزارت قائم کرے، مسلمانوں کو عہدے اور ملازمت دینے اور دیگر معاشرتی مسائل میں سمجھوتہ کر لے لیکن کانگریس نے کوئی اعتنا نہ کیا۔ البتہ بنگال کے مسلمانوں میں اتحاد عمل کا جوش پیدا ہوا اور جس سے بہت جلد صورتِ حال میں تغیر رونما ہو گیا۔

باب یازدہم

سینٹرل اسمبلی میں جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے سے پہلے بابو راجندر پرشاد صدر کانگریس اور مسٹر جناح کے درمیان ایک ایسے سمجھوتہ کے متعلق جو کمیونل اوارڈ کا بدل ہو سکے ذاتی حیثیت سے مذاکرات شروع ہوئے تھے۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں کا یہ نقطہ نظر پیش کیا کہ کمیونل اوارڈ کو پہلے اسوقت تک کے لئے عارضی طور پر منظور کر لینا چاہئیے۔ جبتک دونوں قوموں میں کسی نعم البدل پر اتفاق رائے ہو۔ دوسرے یہ کہ ہمیں صوبجاتی دستور اساسی کو وہ جس قابل بھی ہے استعمال کرنا چاہئیے اور اپنی جدوجہد اس وقت تک جاری رکھنا چاہئیے۔ جب تک اہل وطن کے اطمینان کے قابل دستور اساسی حاصل نہو جائے۔

مسٹر جناح نے صاف طور پر یہ بھی کہدیا کہ راجندر پرشاد وغیرہ مخلوط انتخاب کی بنیاد پر کوئی ایسا بدل پیش کریں جو بمقابلہ موجودہ کمیونل اوارڈ کے مسلمانوں کے مفاد کو زیادہ محفوظ رکھ سکے اور زیادہ بہتر ہو تو میں اس پر غور کر سکتا ہوں اور نعم البدل اقوام متعلقہ مثلاً ہندوؤں اور سکھوں کی تائید کے ساتھ پیش ہو تب میں اسے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں بلا تاخیر پیش کردوں گا۔ لیکن قبل ازیں کہ ایسا فارمولا یا نعم البدل پیش ہو بنگال کے کانگریسی لیڈروں نے شدید اختلاف کیا اور پنجاب کے مہاسبھائیوں نے شورش کی چنانچہ یہ مذاکرات بے نتیجہ رہ گئے۔

اب انتخابات کے بعد جو فضا قائم ہوئی اس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بحیثیت صدر کانگریس اپنی پوری ذمہ داری کے ساتھ بانگ دہل یہ اعلان کر دیا کہ:۔ "اقلیتوں کے مفاد وحقوق یا ان کے تحفظ کے متعلق گفتگو کرنا بھی حماقت ہو نیز یہ کہ کانگریس نے کمیونل اوارڈ کو درہم برہم کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے کیونکہ وہ اسے پسند

نہیں کرتی۔ اگر مسلمان سمجھوتہ کرنا چاہیں تو ہندو سبھا سے درخواست کریں گے"

مسلم ماس کنٹیکٹ (رابطہ عوام مسلمانان) کی تحریک زور شور سے جاری کی گئی صوبہ متحدہ میں مولانا حسین احمد صاحب مسلم لیگ سے کنارہ کش ہی نہیں بلکہ اس کے مخالف بنکر کانگریس کیمپ میں جا ملے اور اس صلہ میں ان کے رفیق خاص حافظ محمد ابراہیم بجنوری کو وزارت مل گئی اسی طرح مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی خود مسلمان شرکائے کانگریس کی طرف سے کوششیں شروع ہو گئیں تاہم طرفین میں کچھ خفیف کوشش تصفیہ اور سمجھوتہ کی بھی جاری تھی اور کبھی کبھی اخبارات میں اس پر بحث بھی چھڑ جاتی تھی۔ راجندر بابو نے ۱۹۳۵ء کی دعوت صلح کو "کھلاڑیوں کی پیش کش" سے تعبیر کر کے سمجھوتہ نہ ہونے کا سارا الزام مسٹر جناح کے سر ڈالا۔ لیکن فوراً ہی بنگال کے کانگریسیوں نے ایک بیان اس کے خلاف شائع کر دیا۔ پھر مسٹر جناح کو یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اگر انہوں نے راجندر بابو کی اس پیشکش کو منظور نہ کیا تو صوبہ متحدہ کے چند ارکان مسلم لیگ سے مستعفی ہو جائیں گے۔

اس قسم کی دھمکیوں اور کارروائیوں نے اس امر کا شبہ پیدا کر دیا کہ تصفیہ و صلح کی خواہش صادق نہیں بلکہ یہ ساری جدوجہد مسلمانوں میں تفرقہ اور مسلم لیگ میں پھوٹ ڈالنے اور اتحاد اسلامی پر ضرب کاری لگانے کے لئے ہے۔

ان ہی حالات میں مئی ۱۹۳۸ء میں مسٹر جناح اور وزیر اعظم بمبئی کی ملاقات ہوئی اور سلسلہ گفتگو میں مسٹر جناح نے ان کے ذریعے سے گاندھی جی کو یہ پیغام بھیجا کہ اس سوال کو وہ اپنے ہاتھ میں لیں اور اپنے سارے اثرات سے کام لیکر مصالحت کی کوشش کریں۔ لیکن گاندھی جی کی طرف سے یہ تحریری جواب موصول ہوا کہ:۔

"میری خواہش ہے کہ کچھ کر سکتا، لیکن میں بالکل بے بس ہوں۔ اتحاد کے بارے میں میرا عقیدہ ہمیشہ کی طرح اب بھی واضح اور روشن ہے۔ البتہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مجھے روشنی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ اور اس مصیبت میں روشنی حاصل کرنے کے لئے خدا تعالےٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگتا ہوں۔"

ان مذاکرات کے دوران میں مسلم لیگ ۲۳۶ روز افزوں طاقت حاصل کر رہی تھی
تاآنکہ ۱۷ اکتوبر کو اس کا لکھنؤ میں نہایت شاندار اجلاس منعقد ہوا۔
مسٹر جناح کا خطبہ صدارت ۱۹ اکتوبر تک عرض طول ہند میں شائع ہو گیا۔ ولدہا
میں گاندھی جی نے بھی اسکو پڑھا جس سے انکے سامنے ایک روشنی نمودار ہوئی۔ اور
انہوں نے فوراً مسٹر جناح کو ایک خط لکھا اور مذکورہ بالا خط کی اشاعت کا شکوہ کرکے
ان کے خطبہ صدارت کو اعلان جنگ سے تعبیر کیا اور اپنی پوزیشن ہندو مسلمانوں کے
درمیان ایک پل کی قرار دی۔ اس خط میں یہ فقرہ بھی تھا کہ :۔

"میں دیکھتا ہوں کہ آپ کوئی درمیانی واسطہ نہیں چاہتے اس پر مجھے افسوس ہے جھگڑا
دو فریق کے درمیان ہوتا ہے اگر میں صلح ساز نہیں ہو سکتا تب بھی آپ مجھے ایک فریق
نہیں پائیں گے"

مسٹر جناح نے ۵ نومبر کو جواب لکھا اور اس خط کی اشاعت کے متعلق اپنے
کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے اپنی تقریر کو حفاظت خود اختیاری کے مرادف بتایا اور توجہ
دلائی کہ :۔

"کیا آپ نے یہ نہیں سمجھا تھا کہ ان تمام مہینوں کے دوران میں آپ کی کامل
خاموشی نے بتا دیا ہے کہ آپ کانگریس کی قیادت سے وابستہ ہیں اگرچہ میں جانتا ہوں کہ
آپ اس جماعت کے چار آنہ والے ممبر بھی نہیں"

گاندھی جی نے اس کے جواب میں ۳ فروری ۱۹۳۸ء کو جو خط لکھا۔ اس میں
اپنی خاموشی کے متعلق اپنے اولین خط کی طرف اشارہ کرکے یقین دلایا کہ :۔

"جسوقت میں کوئی ایسی بات کر سکوں گا کہ دونوں قومیں ملجائیں تو دنیا میں کوئی
چیز مجھے ایسا کرنے سے باز نہ رکھ سکے گی" ساتھ ہی خطبہ کے بارے میں اپنے تاثرات
کا اظہار کرکے اس کو اعلان جنگ ثابت کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ اور تحریر کیا کہ
آپ کی تقریروں میں میں پرانے نیشنلسٹ کے جذبات نہیں پاتا ۱۹۱۵ء میں جب
میں جنوبی افریقہ سے خود اختیار کردہ جلاوطنی کے بعد واپس آیا تھا۔ اس وقت ہر شخص

یہ کہتا تھا کہ مسٹر جناح بچے سے بچے نیشنلسٹوں میں سے ہیں اور ہندو مسلمان دونوں کی امید گاہ ہیں کیا آپ اب بھی وہی مسٹر جناح ہیں۔ اگر اپنی تقریروں کے باوجود آپ فرمائیں کہ ہاں میں وہی ہوں تو میں آپ کی بات ضرور قبول کر لونگا۔ آخری بات یہ ہے کہ آپ چاہتے کہ میں کوئی تجویز پیش کروں میں اس کے سوا کیا پیش کر سکتا ہوں کہ دوزانو ہوکر آپ سے درخواست کروں کہ آپ وہ ہی رہیں۔ جو میں سمجھتا تھا۔ لیکن دونوں قوموں کے درمیان اتحاد کی بنیاد بننے والی تجویزیں یقیناً آپ کی طرف سے پیش ہونی چاہئیں ۔"

مسٹر جناح نے ۱۵ فروری اس خط کے جواب میں گاندھی جی کے فقرات کا حوالہ دیکر کہا کہ :۔

"آپ کہتے ہیں کہ میں نے آپ کی خاموشی کی شکایت کی۔ ہاں میں اس کی شکایت کرتا ہوں آگے چلکر آپ کہتے ہیں کہ جس وقت میں ایسی بات کر سکوں گا کہ دونوں قومیں مل سکیں تو دنیا میں کوئی چیز مجھے ایسا کرنے سے باز نہ رکھ سکے گی" اب میں آپ کے ان الفاظ سے کیا سمجھوں بجز اس کے کہ وہ وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ رہی آپ کی یہ رائے کہ میری لکھنؤ کے اجلاس والی تقریر اور میری بعد کی تقریریں اعلان جنگ ہیں۔ میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ چیزیں حفاظت خود اختیاری کا حکم رکھتی ہیں۔ بظاہر آپ واقف نہیں کہ کانگریسی اخبارات میں کیا ہو رہا ہے اور آپ نہیں جانتے کہ ان میں روزانہ مجھے کس قدر بدنام کیا جا رہا ہے۔ اور کتنا جھوٹ بولا جاتا ہے اگر آپ ان چیزوں سے واقف ہوتے تو یقین ہے کہ مجھے الزام نہ دیتے۔ آیا آپ ان تمام باتوں کے کہنے میں حق بجانب ہیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ لوگ ۱۹۱۵ء میں آپ کے متعلق کیا کہتے اور سمجھتے ہیں۔ قوم پروری کسی فرد واحد کا اجارہ نہیں ہے اور آجکل قوم پروری کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن میں اس بحث کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی اپیل درکار نہ تھی اور اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ آپ دوزانو ہوکر مجھے تلقین فرمائیں کہ میں وہی ہوں جو آپ نے مجھے سمجھ رکھا تھا۔ جہانتک ان تجویزوں کی تشکیل کا تعلق ہے۔ جو بنیاد اتحاد ہونگی کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کام خط و کتابت

سے ہو سکتا ہے یقیناً جس قدر میں جانتا ہوں۔ اسی قدر آپ بھی جانتے ہیں کہ بنیادی نقطہائے تنازعہ کیا ہیں۔ میری رائے میں اسی قدر آپ کا بھی کام ہے کہ اس مسئلہ کو چھیڑنے کے طریقے اور وسائل پیش کریں۔ اگر آپ صادقانہ ومخلصانہ خواہش رکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ کہ اب آپ کے ہاتھ ڈالنے کا وقت آگیا ہے اور اپنی پوزیشن اور اثر کے ساتھ معاملہ کو جوش جذبہ سے ہاتھ میں لینے کو تیار رہیں۔ تو جو امداد بھی میں دے سکتا ہوں اس سے دریغ نہ کروں گا۔"

اس تمہیدی مراسلت کے بعد **گاندھی جی** نے بالمشافہ ملاقات میں تبادلہ خیالات کرنا چاہا اور سیگاڑں (واردھا) میں مدعو کیا اور لکھا کہ:۔

"**جہاں تک** میرا تعلق ہے ہندو مسلم مسئلہ پر میں ڈاکٹر انصاری سے رہنمائی حاصل کیا کرتا تھا۔ لیکن اب جبکہ ڈاکٹر انصاری ہمارے درمیان نہیں ہیں تو میں نے مولانا **ابو الکلام** آزاد کو اپنا رہنما بنا لیا ہے لہذا میری تجویز آپ کے سامنے یہ ہے کہ پہلے آپ کے اور مولانا صاحب کے درمیان گفتگو ہونی چاہیئے۔ لیکن ہر حالت میں میری خدمات آپ کو حاصل رہیں گی۔"

مسٹر جناح کا جواب حسب ذیل تھا:۔

"**آپ کا** ۲۴ فروری ۱۹۳۸ء کا خط موصول ہوا۔ افسوس کہ جواب میں دیر ہوئی کیونکہ میں علیل تھا۔ آپ کے خط میں لبیک کی آواز نہیں پاتا کہ آیا آپ کی رائے میں اب آپ کو روشنی دکھائی دیتی ہے اور وقت آگیا ہے اگر ایسا ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا آپ معاملہ کو جوش وجذبہ کے ساتھ ہاتھ میں لینے کے لئے تیار ہیں تیسری بات یہ ہے کہ جب آپ یہ فرماتے ہیں کہ چونکہ ڈاکٹر انصاری زندہ نہیں ہیں اسلئے مولانا ابو الکلام آزاد سے رہنمائی حاصل کرینگے تو آپ کو ان باتوں سے مجھے آپ کے طرز عمل اور ذہنیت کی کسی تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر آپ نے یہ راستہ اختیار کیا تو اسی الم ناک تاریخ کا اعادہ کرینگے جو اسوقت ظہور پذیر ہوئی تھی جب آپ نے کہا تھا کہ میں تو مانتے کو تیار ہوں لیکن کیا کروں ڈاکٹر انصاری نہیں مانتے لہذا مجبوری ہے جیسا کہ آپ کو

معلوم ہے یہ سب کچھ گول میز کانفرنس میں آپ کے تشریف لیجانے سے پہلے ہوا تھا۔ گول میز کانفرنس میں بھی آپ نے اسی کا اعادہ کیا کہ آپ خود مشروط طریقہ پر بعض شرطیں ماننے کے لئے تیار دکھائی دیتے تھے لیکن اس موقع پر بھی آپ نے یہی کہا کہ میں مجبور ہوں کیونکہ ہندو نہیں مانتے اور اگر ہندو اور مسلمان کوئی سمجھوتہ کرلیں تو کانگریس کے نمایندہ کی حیثیت سے آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

اب ہم ایک ایسی منزل پر پہونچ گئے ہیں کہ اس بات میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنا چاہیئے کہ آپ آل انڈیا مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی واحد مستند اور نمایندہ جماعت تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف آپ کانگریس اور تمام دوسرے ہندوؤں کے نمایندہ ہیں کسی ایسے بنیاد پر ہم آگے قدم بڑھا سکتے ہیں اور سر جوڑ کر بیٹھنے کی تدبیر پیدا کرسکتے ہیں۔

بلا شبہ میں آپ سے ملکر خوش ہونگا اور اسی قدر پنڈت جواہر لال یا مسٹر بوس سے مل کر خوشی ہوگی۔ یہ آپ کی خواہش پر موقوف ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں ان دونوں صاحبوں میں سے کوئی آپ سے رجوع کئے بغیر معاملہ کو آگے نہ بڑھائے گا۔ لہذا پہلے پہل میں آپ ہی سے ملنا پسند کروں گا لیکن بہر حال مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں ۱۰ر مارچ سے قبل آپ سے ملنے کے لئے سہگاؤں نہیں آسکتا، مجھے بمبئی جانا ہے۔ اور اپنے دورہ کی بہت سی دوسری مصروفیات بھی طے کرچکا ہوں۔ لیکن ہم ایسا وقت اور مقام طے کرسکتے ہیں جو دونوں کے لئے سہولیت کا ہو"

گاندھی جی نے اس کے جواب میں روشنی نظر آنے کا انکار کرتے ہوئے خفیف ترین موقع سے بھی فائدہ اٹھانے کا خیال ظاہر کیا مگر اس اقرار و اعتراف کے ساتھ کہ میں نہ کانگریس کی نمایندگی کرسکتا ہوں اور نہ ہندوؤں کی، لیکن ایک باعزت تصفیہ کرانے میں اپنے اثر کو جو کانگرسی ہندوؤں پر حاصل ہے انتہائی طور پر استعمال کرونگا۔

اس کے بعد ۲۸ر اپریل کو بمبئی میں مسٹر جناح کے یہاں ملاقات طے ہوگئی گاندھی جی نے اپنے ہمراہ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی شریک گفتگو رکھنا چاہا لیکن مسٹر جناح

نے تنہا ملاقات پسند کی۔

ادھر گاندھی جی اور مسٹر جناح کی مراسلت کا سلسلہ جاری ہوا۔ اور دوسری طرف پنڈت جواہر لال نے ۔ا نومبر ۱۹۳۷ء کو نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب صدر مسلم لیگ صوبہ متحدہ کے نام ایک طولانی خط لکھا جس میں انہوں نے اس تمہید کے ساتھ کہ "واقعات نے جو شکل اختیار کی ہے۔ اس نے مجھے سخت بے چین کر رکھا ہے۔ فریقین کی طرف سے جو باتیں کہی اور شائع کی جا رہی ہیں۔ ان سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ یہ کشیدگی آنے والے خطرے کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح آپ بھی اسے پسند نہیں کرتے...... آپ یقین کریں مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ سیاسیات میں ہمارے اختلاف کیا ہیں۔ بہرکیف اختلافات کتنے بھی ہوں مجھے یقین ہے کہ اس بات میں آپ میرے ساتھ متفق ہوں گے کہ پبلک زندگی میں ہمیں ایک خاص معیار قائم رکھنا چاہئیے اور اس امر کی کوشش کرنا چاہئیے کہ شرارت اور اشتعال انگیزی نہ ہونے پائے..... فرض کر لیجئے کہ آپ کے خیال میں کانگریس نے غلط طریقہ کار اختیار کر رکھا ہے اور غلط مقاصد کے لئے جدوجہد کر رہی ہے آپ کو حق حاصل ہے کہ کانگریس کے متعلق ایسی رائیں قائم کریں۔ تاہم آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم علیحدہ علیحدہ پولیٹیکل پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف ہماری صد قدانہ نکتہ چینی افراد اور پارٹی کو آگے بڑھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسی صحیح نکتہ چینی ہمیں اور پبلک کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی ممکن ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی سے ہم ایک دوسرے کے قریب بھی آ جائیں۔ اس لئے میں آپ کا بے حد ممنون و مشکور ہوں گا۔ اگر آپ مجھے یہ بتائیں کہ کانگریس کے پروگرام اور اصول میں کونسی باتیں ہیں جن سے آپ کو اتفاق نہیں...... غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے اور چودھری خلیق الزماں نے ہمیں بتایا تھا کہ آپ کانگریس کے وار دھا پروگرام سے حرف بحرف متفق ہیں۔ کانگریس کا واردھا پروگرام گو چھوٹا سا پروگرام ہے۔ تاہم اس کی جامع حیثیت اسے تمام اہم معاملات پر حاوی کر دیتی ہے اور اس پر عمل درآمد

سو ہم اس منزل پر پہونچ سکتے ہیں جس پر پہونچنے کی ہم خواہش رکھتے ہیں۔ کانگریس کا کراچی رزولیوشن آپ کے سامنے ہے۔ جس میں کانگریس نے ہندوستانیوں کے بنیادی حقوق کی وضاحت کردی ہے۔ علاوہ ازیں کیونل اوارڈ کے متعلق کانگریس کی جو پوزیشن ہے وہ بھی آپ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ حال ہی میں کلکتہ میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا تھا اس میں اقلیتوں کے مذہبی و تمدنی اور سیاسی حقوق کے متعلق ایک جامع رزولیوشن پاس کردیا گیا ہے۔"

زبان اور رسم الخط کے متعلق اپنے پمفلٹ کی طرف اشارہ کیا اور اشتعال انگیز تقریروں کا الزام مسلم لیگ کے نمائندوں اور لیڈروں پر رکھتے ہوئے لکھا کہ:۔

"میرے خیال میں بھی نہیں آسکتا کہ آپ ایسے تقریروں اور بیانوں سے متفق ہوں گے تاہم اُن کی تردید نہیں کی جاتی، یہی نہیں بلکہ بعض اوقات مسلم لیگی لیڈروں کی طرف سے ان قابل مذمت حرکات سے بے تعلقی کا اعلان بھی نہیں کیا جاتا۔ جو بعض غیر ذمہ دار اور گمراہ نوجوانوں کی طرف سے مسلم لیگی رہنماؤں کی تقریروں اور بیانوں کے کے زیر اثر سرزد ہوتے رہتے ہیں" پھر اس امر کے ثبوت میں انتخاب بجنور کے زمانہ کے چند واقعات بیان کرکے بطور خلاصہ لکھا کہ:۔

"بجنور کے ضمنی انتخاب میں مسلم لیگی امیدوار کے حمایتی مقررین کی طرف سے کانگریس کے خلاف مندرجہ ذیل الزامات لگائے گئے۔

(۱) کانگریس اردو زبان کو مٹا دینا چاہتی ہے۔ (۲) کانگریس تعزیئے نکالنے کی اجازت نہیں دے گی۔ (۳) کانگریس ذبیحہ گاؤ کی مخالف ہے (۴) کانگریس مسلمانوں کو اسلامی لباس کی بجائے دھوتیاں پہننے پر مجبور کردے گی۔ (۵) کانگریس نے مسلم علماء کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے"

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر محمد اشرف پر جو اعتراضات کئے گئے تھے اُن کو بیان کرکے مسلم یونیورسٹی یونین میں جو کچھ ان کے ساتھ گذرا اُس کا تذکرہ کرتے ہوئے نہایت بے باکی سے اس سب کو مولانا ظفر علی خاں کی اشتعال انگیز تقریر اور ڈاکٹر سر

ضیاءالدین احمد وائس چانسلر کی انگیجمنٹ کو قرار دیتے ہوئے ایک اخلاقی پند و وعظ پر خط کو ختم کیا۔

اس طولانی خط کا نواب محمد اسمٰعیل خاں نے حسب ذیل جواب دیا جس میں ہر معاملہ پر بہ تفصیل بحث ہے:-

میرٹھ - ۳۰ نومبر ۱۹۴۶ء میرے پیارے پنڈت جی! میں آپ کے خط کا جواب بھیجنے میں دیر کے لئے آپ سے معافی کا خواستگار ہوں - موجودہ سیاسی صورت حالات اور موجودہ فرقہ وارانہ تلخی پر اپنے خیالات مجھ تک پہونچانے کے لئے جو نوازش آپ نے مجھ پر کی ہے اس کے لئے آپ کا شکر گذار ہوں - آپ نے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور جس طرح آپ نے اس ذہنیت کی مذمت کی ہے جو اسوقت ہر طرف نظر آتی ہے، مجھے آپ سے اس امر کے متعلق پورا اتفاق ہے لیکن اس کے باوجود میں آپ کی طرف سے مسلم لیگ کے لیڈران کی مذمت کی تائید نہیں کر سکتا اور نہ ہی ان اطلاعات کو صحیح تصور کرنے کو تیار ہوں - جو آپ کی رائے کی بنیاد ہیں - مجھے آپ معاف فرمائیں گے - اگر میں یہ کہوں کہ جناب نے محض ان اطلاعات کی بناء پر جو آپ کو خاص ذرائع سے حاصل ہوئیں - اس قسم کے نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے اور آپ نے ان الزامات کی کسی قسم کی تصدیق کئے بغیر ہی ہمارے کارکناں کے خلاف عاید کردہ الزامات کو صحیح تصور کر لیا ہے، مجھے بعض بیانات نے تو نہایت پریشان کر دیا ہے۔

میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے اس امر کا رتی بھر بھی علم نہ تھا کہ ہمارے کارکنان اس قسم کے بیانات شائع کر رہے ہیں۔

نوٹ :- ان الزامات کی نسبت یہی کہنا کافی ہے کہ صداقت کے ساتھ سامنے آ رہے ہیں - پنڈت جی معاملات کو اپنے رفقا کی نظر سے دیکھنے اور انہیں کے کانوں سے سننے کے عادی ہیں اور اسی بنیاد پر نتائج کی منزل تعمیر کرتے ہیں - ڈاکٹر اشرف نے خود اشتعال انگیزی کی اور بار بار ممانعت پر بھی وہ باز نہ آسکے اسی زمانہ میں وائس پریسیڈنٹ یونین نے بیان بھی شائع کر دیا لیکن پنڈت جی ان ہی دونوں پر الزام لگا رہے ہیں۔

ہاں ہماری جماعت ان غیر ذمہ دار لوگوں کے بیانات یا تقاریر کے لئے ذمہ دار نہیں گردانی جا سکتی۔ جن کا ہماری انجمن سے کسی قسم کا تعلق ہی نہیں ہے۔ کیا آپ براہ نوازش مجھ کو یہ بتا سکیں گے کہ اس قسم کے بیانات کن کن لوگوں نے اور کس کس موقعہ پر دیئے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جن کا لیگ سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن کسی خاص امیدوار کے حامی ہونے کی وجہ سے وہ جا بجا تقریر کرتے پھرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق لیگ ذمہ داری نہیں لے سکتی۔

اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم پبلک کے کاموں میں مذہبی جذبات کو ابھار کر باہمی دشمنی پیدا نہ کریں، لیکن میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ یہی مشورہ کانگریس کے مولوی صاحبان کو دیا جانا چاہیئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ احراری لیڈروں کی تقاریر آپ تک پہونچی ہیں یا نہیں اور نہ ہی مجھکو یہ معلوم ہے کہ آپ نے کانگریس کے دو ذمہ داروں کی تقاریر ونگر اخبارات میں بھی پڑھی ہیں یا نہیں میں تو ان گندی گالیوں کا یہاں ذکر بھی نہیں کر سکتا جو یہ بہادر لوگ مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں کو دیتے ہیں ان کی تقاریر لغویت کی انتہا تک پہونچی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کانگریسی ان کی تقریروں پر دل کھول کر تالیاں بجاتے اور خوش ہوتے ہیں میرا یہ خیال ہے کہ ایسی اطلاعات جو کانگریس کارکنان کے خلاف جاتی ہیں وہ آپ تک پہونچتی ہی نہیں۔ میں اس وقت ان لوگوں کے خلاف جو گذشتہ چند ماہ سے پلیٹ فارم کے ذریعہ اینٹی لیگ پراپگنڈا کر رہے ہیں۔ شکایت نہیں کرنا چاہتا۔ نہ ہی میں اس پریس پراپگنڈا کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو پورے زور سے لیگ کے خلاف نام نہاد قوم پرست اخبارات کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔ البتہ میں آپ کی توجہ ایک ڈرامہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو "ہندوستان" اخبار میں شائع ہوا ہے، جس کے ڈائرکٹروں میں یو۔ پی کے وزیر اعظم صاحب بھی ہیں آپ اس ڈرامہ کو پڑھکر اپنی رائے سے مجھے مطلع کریں پھر آپ سردار سردول سنگھ کوشیر جیسے مشہور کانگریس رہنما کی پنجاب پولیٹیکل کانفرنس کی صدارتی تقریر پڑھیں اور دیکھیں کہ کس طرح انہوں نے مسٹر جناح کی زندگی اور مذہبی عقائد پر حملے کئے ہیں۔ اگر ایسے

ذمہ دار لوگ اس قسم کی باتیں کر سکتے ہیں تو پھر دوسروں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا ہے اور اگر کسی ذمہ دار کانگریس لیڈر کے پروٹسٹ کی عدم موجودگی میں وہ ان کا جواب دیں اور ممکن ہے وہ جواب ناشائستہ ہو تو آپ کو اس صورت میں گھبرانا نہیں چاہیئے۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ڈیمو کریسی کی آمد نے سپیکروں کو بے لگام کر دیا ہے اور جو جی میں آتا ہے کہہ دیتے ہیں۔ میں اس قسم کے بے شمار مثالیں آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا اور نہ ہی آپ کا مقصد پورا ہوگا وہ مقصد یہ ہے کہ پبلک معاملات پر ہر شخص کو آزادی رائے کا حق ہو۔ اور وہ مذہبی۔ جماعتی جھگڑوں کو بیچ میں لائے بغیر ان پر بحث کرے۔ موجودہ صورت حالات کے متعلق محض کسی جماعت یا فرقہ پر الزام عائد کر دینے سے ہی تو مقصد حاصل نہ ہو سکے گا اور نہ ہی اس سے صورت حالات بہتر ہو گی اگر ہم درحقیقت حالات کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس مسئلہ پر کسی اور ہی ڈھنگ سے غور کرنا ہوگا۔ لیکن اگر آپ کا مقصد اس وقت محض یہ ہے کہ غیر ذمہ دارانہ تقاریر اور باتوں کو بند کیا جائے تو میں آپ کو اپنے پورے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

آپ نے چند پوسٹروں اور تقاریر کا ذکر کیا ہے جو بجنور اور بندیلکھنڈ کے ضمنی انتخابات میں کی گئیں اور آپ نے ان پر سخت اعتراض کیا ہے، مجھے تو اس امر کا یقین ہو چکا ہے کہ اس قسم کے انتخابات میں ایسی باتیں صرف ہمارے ہی ملک میں ہیں بلکہ دنیا بھر میں ہوتی ہیں اور ابھی تو تین اور ضمنی انتخابات لڑے جا رہے ہیں جو غالباً فرقہ وارانہ جذبات کو زیادہ خراب کریں گے درحقیقت لیگ نہیں بلکہ کانگریس ان ضمنی انتخابات میں اپنی کامیابی کو غیر ضروری اہمیت دے رہی ہے کیونکہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ انتخابات کے بعد جھگڑے ختم ہو جائیں۔ گو مجھے یہ خدشہ ہے مسلم ماس کنٹیکٹ کی تحریک موجودہ تلخی کو قائم رکھنے کا باعث ہو گی۔

آپ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ ہم اور آپ کن کن باتوں میں متفق ہیں اور کن باتوں میں ہمارا اختلاف ہے وار دھا پروگرام کے مطابق لیجسلیچر میں کام کرنے

کی ہماری رضامندی کے پیش نظر یہ ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے کہ آپ ہمیں بتائیں
کہ ہمارے ساتھ آپ کن کن باتوں پر اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ میں آپ کو لکھنؤ میں
گذشتہ اکتوبر میں پاس شدہ مسلم لیگ کے رزولیوشن اور اپنا مینی فسٹو بھیج رہا ہوں
ان چیزوں سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ لیگ نے اپنے کریڈ میں تبدیلی کرلی ہے
اور جہاں تک ملکی مفاد کا تعلق ہے اب لیگ کے نئے پروگرام کے مطابق دونوں
جماعتوں کے پروگرام اور پالیسی میں کوئی زیادہ فرق نہیں رہا۔

اس سلسلے میں آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ اگر مسلم ماس کنیکٹ تحریک
ہمارے اوپر نہ ٹھونس دی جاتی اور کانگریس اکثریت کے صوبجات میں لیگ پارٹی سے
اسمبلیوں میں حقارت آمیز سلوک نہ روا رکھا جاتا تو مسلمان یقیناً کانگریس کے زیادہ
نزدیک ہوتے ایسے کئی لوگ ہیں جو کانگریس کے سرگرم کارکن رہے ہیں۔ لیکن ان
کے جلسوں میں کانگریس کے رویہ نے بدگمانی پیدا کردی اور یہی وجہ ہے کہ مولانا قطب الدین
عبدالوالی صاحب اور سید ذاکر علی صاحب جیسے لوگ ایسے بیانات شائع کرنے پر مجبور
ہوئے۔ جنہیں آپ پسند نہیں کرتے یہ تو ان لوگوں کی رائے ہے۔ جنکی تائید میں وہ ثبوت
مہیا کرنے کو تیار ہیں۔ ایسے بہت سے مسلمان ہیں جو دیانتداری سے یہ محسوس کرتے
ہیں کہ مسلم ماس کنیکٹ کی تحریک مسلمانوں میں تفرقہ ڈلوانے کے لئے جاری کی گئی
ہے اور کہ کانگریس مسلمانوں کو جو کہ اس وقت ایک ہندو جماعت ہے روپیہ دیتی ہے
تاکہ وہ اپنے ہم مذہبوں سے برسرپیکار رہوں اس کے علاوہ ایک اور وجہ ان لوگوں
کو وزارتوں میں شامل کرنا ہے۔ جو حال ہی میں اپنی پارٹیوں سے الگ ہو کر کانگریس
میں شامل ہوئے ہیں۔

آپ نے جو باتیں لکھی ہیں اس سلسلہ میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کمیونل ایوارڈ
کے متعلق جو آپ نے حال میں ہی ریزولیوشن پیش کیا ہے اس سے مسلمانوں کی ایک
بڑی شکایت دور ہو گئی ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ رزولیوشن قائم رہنے دیا جائیگا۔
رسم الخط اور زبان کے متعلق آپ نے جو تجاویز اپنے مضمون میں کی ہیں

جس کی نقل آپ نے مجھے بھی بھیجی ہے قابل غور ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہر سمجھدار اور انصاف پسند آدمی اس کی تائید کریگا......... جو ہولناک بیانات مسلم لیگ کے کارکنان کے ساتھ منسوب کئے گئے ہیں اُن کے متعلق میں اوپر کہہ چکا ہوں اور اب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جب کبھی ایسی غیر ذمہ داری سے کسی مقام پر کوئی تقریر ہو تو مقامی کانگریس کمیٹی مسلم لیگ کو اس سلسلہ میں لکھ بھیجے۔

آپ نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ لیگ کے ایک والنٹیر نے کانگریس مسلم ورکر کو چلتی گاڑی میں زخمی کر دیا۔ اس سلسلہ میں میں کہنا چاہتا ہوں کہ مکمل تحقیقات کے بعد ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ لیگ والنٹیر کو بہت زیادہ اشتعال دلایا گیا تھا اور پھر معاملہ اس وقت عدالت میں ہے اس لئے اس کے متعلق اس مرحلہ پر زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ مجھے اس امر کا افسوس ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ مسلم لیگ والے تشدّد کی حمایت اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یہ خیال بے بنیاد ہے۔

"اسلام خطرہ میں" کا نعرہ مسلم لیگ والوں نے نہیں لگایا یہ تو ہمارے مخالفوں نے ہم سے منسوب کیا ہے۔ ہر مسلم لیگی یہ یقین رکھتا ہے کہ اسلام کبھی خطرہ میں نہیں ہو سکتا۔ آپ نے صحیح طور پر ان الزامات کی مذمّت کی ہے جو علمائے کے خلاف رشوت خوری کے لگائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ الزامات ان الزامات کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہیں جو مولانا شوکت علی پر کانگریسی مسلمانوں کی طرف سے لگائے جاتے ہیں۔

میں نے بجنور میں سُنا تھا کہ آپ نے ایک کانگریس والنٹیر سے کانگریسی جھنڈا چھین لیا تھا جس پر "اللہ اکبر" لکھا ہوا تھا کیونکہ آپ اس جھنڈے پر ان الفاظ کو مناسب نہ سمجھتے تھے، مجھے آپ سے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ اس افواہ میں رتّی بھر بھی صداقت نہ تھی۔ مولانا شوکت علی نے جو یہ الزام لگایا ہے کہ بجنور میں مال افسران نے کسان ووٹران پر اپنا اثر ڈالا۔ اس کے متعلق غالباً ان کے پاس کوئی ثبوت ہوگا میں ان سے دریافت کرکے آپ کو مطلع کر دوں گا۔

ڈاکٹر اشرف سے جو بیان منسوب کیا گیا ہے وہ اس کی تردید کر سکتے ہیں اور جو واقعہ علی گڑھ یونیورسٹی میں ہوا اس کا مجھے افسوس ہے لیکن مسلم لیگ کا اس سے کوئی واسطہ نہ تھا اور پرو وائس چانسلر یونیورسٹی نے لڑکوں کے فعل کی مذمت کر دی ہے۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ لیگ والے تشدد کی انگیخت کرنے میں اس قسم کا نتیجہ اخذ کرنے کو تیار نہیں آپ کے خط کا تو یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اس قسم کا کرہ ہوائی پیدا کر لیا ہے، لیکن میں اس الزام کی پرزور تردید کرتا ہوں البتہ اگر آپ نے یہ مثالیں محض یہ ثابت کرنے کے لئے دی ہیں کہ ملک میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلی ہوئی ہے اور حالات کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے تو ہم آپ کی ہر کوشش کو خوش آمدید کہنے کو تیار ہیں اور آپ کی ہر ممکن امداد کریں گے۔"

اب پنڈت جی نے ۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو مسٹر جناح کے نام ایک خط بھیجا جس میں ان بیانات کے متعلق جو اس زمانہ میں دونوں طرف سے شائع ہوئے تھے۔ شکوہ کر کے صحیح طور پر غور طلب متنازعہ نقاط معلوم کرنے کی خواہش کی تاکہ غیر ضروری اختلافی بحث سے بچ کر اصل موضوع کو ہاتھ میں لیا جائے مسٹر جناح نے بھی اخبارات و مراسلات کے ذریعہ اس بحث کو جاری رکھنا پسند نہیں کیا پنڈت جی نے پھر ایک مطول خط میں اس امر پر زور دیا کہ:-

"میں سمجھتا ہوں کہ کچھ اختلافی نقاط ہیں کیونکہ آپ نے بار بار کانگریس کی پالیسی اور کام کی نکتہ چینی کی ہے اگر یہ اختلافی نقاط بصورت تحریر منضبط کر دیئے جائیں اور ہماری توجہ ان کی طرف منعطف کرائی جائے تو اس طرح ان پر غور کرنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔"

ساتھ ہی گزشتہ خفیف معاملات کا تذکرہ کر کے کانگریس کی پالیسی کی وضاحت کی مسٹر جناح نے ان کو مکرر سمجھایا کہ:-

"آپ چاہتے ہیں کہ میں اختلافی نقاط بصورت تحریر منضبط کر دوں" اور ان پر خط و کتابت کے ذریعہ سے تبادلہ خیالات کروں، یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس کے

متعلق میں پہلے ہی خط میں کہہ چکا ہوں کہ نہایت ناپسندیدہ اور ناموزوں ہے میں آپ کی
اس تجویز کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ جب کبھی ضرورت ہوگی ہم میں سے ہر ایک گفتگو کا خیر مقدم
کرے گا اور آپ بیں کا اگر کوئی گفتگو کے لئے آمادہ ہے تو میں بخوشی آپ سے ملوں گا اور
یکساں طور پر گفتگو کا خیر مقدم کروں گا، بات یہ ہے کہ آپ ایک دوسرے کے متعلق گفتگو
کرنا پسند کرتے ہیں اور میں ایک دوسرے کے درمیان گفتگو کرنا پسند کرتا ہوں۔ یقیناً آپ
جانتے ہیں اور آپ کو جاننا چاہیئے کہ بنیادی نقطہائے متنازعہ کیا ہیں؟

پنڈت نہرو نے پھر ایک طویل خط لکھا جس میں اس عرصہ کے بیانات کانگریس
اور مسلم لیگ کی پالیسی وغیرہ پر ہی بحث تھی اب مسٹر جناح کو صاف طور سے لکھنا پڑا کہ:۔
"مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ریشہ دوانیوں اور الزامی چوٹوں کی اسپرٹ جاری ہے
اور بے وقعت نوعیت کے جملہ اقسام کے معاملات اٹھائے جارہے ہیں جو ہمارے موجودہ
موضوع کے لئے برمحل نہیں ہیں۔ جس کے نام پر آپ نے ابتدا کی تھی۔ یعنی یہ کہ معلوم کیا
جائے کہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے نہایت اہم اور نمایاں سوال کو ہاتھ میں لینے کی بنیاد کس
طرح دریافت کی جائے۔

آپ نے اپنا خط اس اصرار پر ختم کیا ہے کہ مجھے یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیئے کہ
میں نقطہائے متنازعہ کو مرتب کردوں اور آپ کی خدمت میں آپ کے غور کے لئے
پیش کردوں اور اس کے بعد آپ کے ساتھ خط و کتابت کروں۔ میں پہلے کہہ
چکا ہوں کہ میری سوچی سمجھی ہوئی رائے میں یہ طریقہ ناپسندیدہ اور ناموزوں
ہے جس طریقہ کار پر آپ مصر ہیں، فریقین مقدمہ کے درمیان موزوں ہو سکتا
ہے اور سالیسٹر لوگ موکلوں کی طرف سے یہی طریقہ کار اختیار کرتے ہیں۔
لیکن قومی مسائل اس طرح طے نہیں ہو سکتے۔

جب آپ یہ کہتے ہیں کہ "میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اقرار کرنا چاہیے کہ میں نہیں جانتا
کہ نقطہائے متنازعہ کیا ہیں" تو مجھے آپ کی لاعلمی پر حیرت ہوتی ہے۔ ملک کے اہم ترین
لیڈر ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۷ء تک اس معاملہ کو چھیڑتے رہے ہیں۔ لیکن اب تک کوئی

حل نہیں نکلا ہے۔ میں آپ سے استدعا کروں گا کہ آپ معاملہ کا مطالعہ کریں اور خود ہی اپنے آپ کو مطمئن کرنے اور تسکین دینے لینے کا طرز عمل اختیار نہ کریں اور اگر آپ جذبہ رکھتے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ آپ کو یہ سمجھ لیتے میں زیادہ دشواری ہوگی کہ نقطہائے متنازعہ کیا ہیں۔ کیونکہ حال میں بھی ان کا ذکر اخبارات اور پبلک پلیٹ فارموں پر برابر ہوتا رہا ہے۔"

پنڈت نہرو کے زیادہ اصرار سے مسٹر جناح نے ۱۷ مارچ ۱۹۳۸ء کو چودہ نکات کی طرف اشارہ کر کے اور چند اخبارات اسٹیٹسمین مورخہ ۱۲ فروری اور نیو ٹائمز مورخہ یکم مارچ کی کاپیاں بھیجیں اور لکھا کہ:-

"یہ آپ پر ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ جو مختلف تجویزیں پیش کی گئی ہیں۔ یا پیش کی جا سکتی ہیں جن کے پیش ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔ ان کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ اور انجام کار میں اس کو ہر سچے نیشنلسٹ کا فرض سمجھتا ہوں چاہے وہ کسی پارٹی یا ملت سے تعلق رکھتا ہو۔ کہ وہ اس کو اپنا کام سمجھے اور صورت حال کی جانچ پڑتال کرے اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک میثاق کرائے اور حقیقی متحدہ محاذ پیش کرے اور جس طرح میں اس فکر میں ہوں اور اسکو اپنا فرض سمجھتا ہوں اسی طرح آپ کو بھی اس کی فکر ہونی چاہیئے اور آپ اسکو اپنا فرض سمجھیں اور اس کا مطلق لحاظ نہ کریں کہ ہمارا کس پارٹی یا ملت سے تعلق ہے۔ لیکن اگر آپ کی خواہش یہ ہے کہ میں یہ تمام تجویزیں جمع کروں اور ایک عرضداشت گذارنے والے کی حیثیت سے وہ تجویزیں جمع کر کے پیش کروں۔ تاکہ آپ اور آپ کے رفقاء ان تجویزوں پر غور کریں تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا، نہ میں اس غرض سے یہ کام کر سکتا ہوں کہ ان مختلف نکات کے متعلق آپ کے ساتھ مزید خط و کتابت ہو لیکن آپ اب بھی اس پر مصر ہیں۔ چنانچہ جب آپ نے اپنے خط میں وہ الفاظ لکھے ہیں جو آگے آئے ہیں تو ان کا یہی منشاء معلوم ہوتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میرا دماغ موثر طریق پر کام کرنے یا کسی کارروائی کے متعلق فکر کرنے سے قبل وضاحت چاہتا ہے۔ ابہام یا حقیقی مسائل سے گریز قابل اطمینان نتائج کی طرف نہیں لیجا سکتا یہ بات مجھے

ضرور عجیب معلوم ہوتی ہے کہ میری پے در پے درخواستوں کے باوجود مجھے نہیں بتایا گیا آیا کن مسائل پر تبادلہ خیالات ہونا چاہیئے۔" یہ ایک صحیح بیان یا حالات کا منصفانہ نقشہ نہیں ہے۔ لیکن اس صورت میں میں آپ سے درخواست کرونگا کہ آپ کانگریس سے درخواست کریں کہ وہ باضابطہ طریق پر اس باب میں مجھ سے خط و کتابت کرے اور میں معاملہ کو کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کے سامنے رکھدوں گا کیونکہ آپ خود کہتے ہیں کہ آپ کانگریس کے صدر نہیں ہیں۔ اور اس طرح پہلی جیسی نمائندہ حیثیت نہیں رکھتے لیکن اگر اس معاملہ میں مجھے مدد مل سکتی ہے تو میری خدمات کانگریس کو حاصل ہیں اور میں خوشی کے ساتھ سب سے ملوں گا۔ اور ان معاملات کے متعلق آپ سے تبادلہ خیالات کروں گا۔ رہی آپ سے ملاقات اور معاملات کے متعلق آپ سے تبادلہ خیالات کرنے سے مجھے یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس سے مجھے مسرت ہوگی۔"

اس خط کے جواب میں پنڈت نہرو نے ایک بہت ہی طولانی خط لکھا اور اُس میں اپنی سمجھ کے مطابق مطالبات قرار دے کر سب پر ایک مفصل بحث کی مسلم لیگ کے متعلق اسی سلسلہ میں تحریر تھا کہ:۔

"میں نہیں سمجھ سکا کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا جائے۔ مسلم لیگ ایک اہم فرقہ وار انجمن ہے اور ہم اس سے ایسا ہی برتاؤ کرتے ہیں۔ جن لوگوں اور انجمنوں سے ہمیں واسطہ پڑتا ہے۔ ہم ان سے مناسب طور سے برتاؤ کرتے ہیں۔ ہم ان کی اہمیت کا فیصلہ نہیں کرتے۔ کانگریس میں اس وقت ایک لاکھ کے قریب مسلمان شامل ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو برسوں جیل کے اندر اور جیل کے باہر ہمارے گہرے ساتھی رہے۔ ہم ان کی دوستی کی بڑی قدر کرتے ہیں کئی تحریکات ایسی ہیں جن میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔ مثلاً ٹریڈ یونین کسان سبھا۔ زمیندار ایسوسی ایشن چیمبر آف کامرس وغیرہ۔ ہمیں ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ کئی مسلم جماعتیں ایسی ہیں۔ مثلاً احرار، جمعیت العلماء، پرجا پارٹی وغیرہ جو خاص توجہ کی مستحق ہیں جتنی اہم کوئی انجمن ہوگی اتنی ہی زیادہ اس پر توجہ دیجائے گی۔ لیکن اہمیت باہر سے

نہیں آتی ۔ بلکہ خود کوئی انجمن پیدا کرتی ہے ۔ دوسری انجمنیں چاہے وہ چھوٹی ہوں لیکن ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

اس خط میں مسلمانوں کے جملہ حقوق سیاسی بندے ماترم، زبان، قومی جھنڈے سب ہی پر خیالات ظاہر کر کے کانگریس کے ہر خیال و عمل کی تائید کی غرض اس سہ ماہہ مراسلت کا آخری بند صرف آخر کے دو خط تھے جو ان دونوں نے ایک دوسرے کو لکھے۔

(۱) بمبئی - ۱۲ اپریل ۱۹۳۸ء

ڈیر پنڈت جواہر لال آپ کا خط مورخہ ۸ اپریل ملا ۔ میں اپریل کے آخر تک بمبئی میں رہونگا ۔ اور مجھے خوشی ہوگی اگر آپ مجھ سے ملیں ۔ جہاں تک باقی خط کا تعلق ہے مجھے پڑھ کر افسوس ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ میرا خط صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے ۔ کیونکہ آپ کا دماغ بین الاقوامی حالات سے بھرا ہوا ہے اس لئے ان حقائق کے متعلق جو ہمیں ہندوستان میں درپیش ہیں آپ مختلف طور پر سوچتے ہیں ۔ میں نے آپ کے روبرو جو پوزیشن رکھی ہے آپ نے اس کا غلط طور پر مطلب نکالا ہے میں نے آپ کو اخبارات کے وہ اقتباسات بھیجے تھے جو حال ہی میں شائع ہوئے تھے کیونکہ آپ نے متواتر مجھ پر زور دیا تھا اور درخواست کی تھی کہ آپ مشکور ہوں گے اگر آپ کو اخبارات کی رائے بھیجوں ۔ جس سے آپ کو معاملات کے سمجھنے میں امداد ملے یہ وہ مطالبات ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کی توجہ کا باعث بن رہے ہیں انہیں کس طرح پورا کیا جائے کس حد تک پورا کیا جائے اور کن ذرائع سے پورا کیا جائے یہ سوال ہے جسے میں نے سچے قوم پرست کے سامنے رکھا ہے کیا ان کے لئے آئینی تبدیلیاں ضروری ہیں کیا ہمیں ان کا تصفیہ معاہدہ یا کنونشن کے ذریعہ سے کرنا چاہئے ۔ یہ ایسا سوال ہے جو میرے خیال میں بحث طلب ہے لیکن مجھے یہ معلوم کر کے سخت رنج ہوا کہ آپ نے اپنے خط میں اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا ہے اور دیباچہ کے ساتھ بہت سے امور کے متعلق اپنے رائے کا اظہار کر دیا ہے ۔ اس کا یہ مطلب

ہے کہ آپ بحث کی تجویز کے جس سے سمجھوتہ ہونے کا امکان ہے خلاف ہیں۔ کیونکہ
آپ نے اپنی چٹھی میں لکھا ہے کہ "مجھے اس فہرست کو دیکھ کر حیرانی ہوئی ہے کیونکہ
مجھے خیال نہیں تھا کہ آپ ان میں سے بہت سے امور کے متعلق ہمارے ساتھ بحث
کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ان میں سے کئی امور کے متعلق کانگریس پہلے ہی فیصلہ کر چکی ہے
کچھ ایسے ہیں جن پر بحث کی ضرورت نہیں" اس کے بعد آپ نے اپنے نتائج بیان
کرنے شروع کئے ہیں اور اپنے خیال کے مطابق نکات مرتب کرلئے ہیں آپ کا لب
لہجہ اور زبان اس قسم کی متکبرانہ فوجی سپرٹ کا مظاہرہ کر رہی ہے جیسے کانگریس صرف
طاقت ہو آپ نے لکھا کہ "مسلم لیگ ایک اہم فرقہ وار جماعت ہے اور ہم اس کے
ساتھ اس طرح سلوک کرتے ہیں، جس طرح دیگر جماعتوں کے ساتھ جن کا ہمارے ساتھ
تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اگر ان جماعتوں کے درمیان کوئی فرق ہے تو ہم اسے زیادہ اہمیت
نہیں دیتے" اس کے بعد آپ نے بہت سے فرقہ وار انجمنوں کا ذکر کیا ہے یہاں میں
اس بات کو جس کا میں کئی دفعہ پبلک طور پر اعلان کر چکا ہوں واضح کرنا چاہتا ہوں
کہ جب تک کانگریس مسلم لیگ کو مکمل طور پر مساوی جماعت کی حیثیت میں اس کے ساتھ
گفت و شنید کرنے کے لئے تیار نہ ہو ہمیں اپنی طاقت پر انحصار کرنا پڑیگا اور اس
وقت تک انتظار کرنا پڑے گا جب آپ اس کے اور دوسری جماعتوں کے درمیان
امتیاز کا احساس کریں آپ کی ذہنیت کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے لئے آپکو مزید اپنی
پوزیشن سمجھانا مشکل ہے جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے میں ان امور پر بحث نہیں کرنا چاہتا
جن کا آپ نے خط و کتابت کے ذریعہ سے آغاز کیا۔ کیونکہ میری رائے میں اس معاملہ
کے تصفیہ کے لئے یہ درست طریقہ نہیں ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ اردو اخبارات میں
کانگریس کے متعلق شدید غلط بیانیاں کی گئی ہیں اور یو۔ پی گورنمنٹ کی کارروائی عمل
کے متعلق ایک سرکاری سرکلر جاری کیا گیا ہے میں اس کے متعلق تحقیقات کئے بغیر
کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتا لیکن میں آپ کو بیشمار ایسی غلط بیانیاں بتا سکتا ہوں
جو کانگریسی اخبارات میں شائع ہوئی ہیں اور کانگریسیوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے

متعلق اپنے بیانات میں کی ہیں میں ایسی مثالیں پیش کرسکتا ہوں جن میں جان بوجھکر اخبارات اور کانگریسیوں کی تقریروں میں بنگال، سندھ، پنجاب اور آسام کی مسلم گورنمنٹوں کو غلط صورت میں پیش کیا گیا ہے اور انہیں بُرا بھلا کہا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان گورنمنٹوں کو توڑا جائے لیکن ہماری خط و کتابت اس موضوع پر نہیں ہو رہی ہے علاوہ ازیں ایسا کرنے سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

پنڈت نہرو نے چند تمہیدی جملوں کے بعد لکھا کہ:۔

"اپنے گذشتہ خط میں میں نے ان مختلف باتوں کا جواب دیا تھا جن کے متعلق آپ نے اقتباسات بھیجے تھے۔ میں نے آپ کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے متعلق کانگریس کی پوزیشن کیا ہے روزمرہ کی سیاسیات میں کوئی بات آخری نہیں ہوتی اگرچہ بعض سیاسیات خاص اصولوں کی بنا پر چلائی جاتی ہیں۔ کانگریس اگر چاہے تو کسی پالیسی میں تبدیلی کرسکتی ہے۔ میں صرف یہ کرسکتا ہوں کہ موجودہ اور گذشتہ پالیسی کو واضح کردوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں متکبرانہ اور فوجی سپرٹ میں لکھتا ہوں جب میں بطور ایک کانگریسی کے کانگریس کی پالیسی پر بحث کرتا ہوں۔ تو میں اس بات کو واضح کرتا ہوں کہ کانگریس کی پالیسی کیا ہے۔ ایسے کرتے ہوئے میں یہ ذاتی خیال پیش نہیں کرتا۔ آپ نے لکھا ہے کہ کانگریس نے مسلم لیگ، اس کے کچھ لیڈروں اور بنگال، پنجاب، سندھ اور آسام کی گورنمنٹوں کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کی ہیں۔ میں آپ کے اس خیال کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں کہ اس قسم کی غلط بیانیوں اور الزامات کی مذمت کی جانی چاہیے۔ مگر ایسا کوئی پریس نہیں ہے جس پر کانگریس کو کنٹرول حاصل ہو۔ ہاں یہ درست ہے کہ بہت سے اخبارات کانگریس کی حمایت کرتے ہیں۔ خواہ آپ ان پر اثر ڈال سکیں یا ہم اس قسم کے جھوٹے اور غلط بیانات کو روکنا چاہتے ہیں اور ان کے متعلق اظہار ناپسندیدگی کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ خاص باتیں پیش کریں تاکہ ہم کارروائی کرسکیں"۔

ان مذاکرات کا ہنوز کوئی نتیجہ نہ نکلا تھا کہ پنڈت نہرو یورپ روانہ ہوگئے۔ گاندھی جی اور مسٹر جناح کا تبادلہ خیالات ہنوز بالکل خفیہ اور تمام مراسلت جواب تک ہو چکی

تھی صیغہ راز میں تھی کہ یکا یک جون میں نہرو جناح مراسلت کی نقول یونائیٹڈ پریس کو کانگریس کے سکرٹریٹ سے دیدی گئیں اس واقعہ کی اطلاع سردار پٹیل اور مولانا ابوالکلام آزاد کو ہوگئی اور بقول خود انہوں نے فوراً پریس کو اس کے شائع کرنے کی ممانعت کی۔ لیکن اس ممانعت کی کہیں پرواہ نہ کی گئی۔ اب سردار پٹیل صرف یہ کہکر رہ گئے کہ یہ ایک کھلا ہوا جرم اور سنگین معاملہ ہے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی یقیناً تحقیقات کرے گی اور جو کارروائی ضروری سمجھی جائے گی عمل میں لائے گی۔ اس کے ساتھ کانگریس سکرٹریٹ کے ایک ذمہ دار شخص کی طرف سے اس مراسلت کے متعلق ریویو کیا گیا اور اور اس میں مسلمان لیگ اور مسٹر جناح ہی مورد الزام قرار دیئے گئے۔ مگر ورکنگ کمیٹی نے نہ کوئی تحقیقات کی نہ کسی کو سزا دی۔

اس کے بعد مسٹر جناح کی تحریک سے گاندھی جناح مراسلت کی بھی اشاعت کردی گئی۔ مئی میں مسٹر سبھاش چندر بوس صدر کانگریس اور مسٹر جناح کے مابین مذاکرات کی باری آئی۔ مسٹر جناح نے یہ خیال پیش کیا کہ:۔

"جو کوئی بھی سمجھوتہ ہو وہ کانگریس اور مسلم لیگ کی پوزیشن کے متعلق ایک واضح مفاہمت پر مبنی ہونا چاہیئے" چنانچہ انہوں نے اپنی گفتگو کی بنیاد یہ قرار دی کہ "آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانان ہند کے مستند اور نمائندہ نظام کی حیثیت سے اس تحریر کے ذریعہ دو بڑی قوموں کے درمیان ایک میثاق اور ہندو مسلم مسئلہ کے تصفیہ کے طور پر حسب ذیل شرائط پر اتفاق کرتی ہیں۔

لیکن مزید گفتگو کے بعد یہ ترمیم ہوئی کہ:۔

"کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانان ہند کے مستند اور نمائندہ نظام کی حیثیت سے اس تحریر کے ذریعہ سے ایک میثاق کے طور پر ہندو مسلم تصفیہ کی حسب ذیل شرائط پر اتفاق کرتی ہیں"

اب مسٹر بوس نے ۱۴ مئی کو مسٹر جناح کے پاس ایک نوٹ بھیجا جس میں لکھا کہ:۔

مسٹر جناح کا یہ دوسرا بیان اگرچہ ظاہر میں مختصر ہے۔ لیکن اس میں بھی وہ ہی خیال منضبط ہے، جو پہلے بیان میں منضبط تھا، یعنی یہ کہ کانگریس کو ہندوؤں کی نمائندگی کرنی چاہیئے اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کی کانگریس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اپنے متعلق یہ سمجھے کہ صرف ایک قوم کی نمائندہ ہے یا ایک قوم کی نمائندہ کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ چاہے وہ قوم ہندوستان کی اکثریت والی قوم ہی کیوں نہ ہو، کانگریس کے دروازے ناگزیر طور پر تمام اقوام کے لئے کھلے رہنے چاہئیں اور اسے ان تمام ہندوستانیوں کا خیر مقدم کرنا چاہیئے جو اس کی عام پالیسی اور طریقوں سے اتفاق رکھتے ہیں۔ کانگریس ایک قوم کی نمائندہ ہونے کی پوزیشن کو قبول نہیں کر سکتی۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو ایک فرقہ وار جماعت نہیں بنا سکتی۔ اسی کے ساتھ کانگریس دوسری جماعتوں کے ساتھ جو اقلیت والے مفادات کی نمائندہ ہیں۔ بات کرنے اور تعاون کرنے کے لئے بالکل آمادہ ہے یہ بھی ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ مسلمانان ہند اگرچہ کل ملک کے اندر ایک اقلیت ہیں لیکن ملک کی آبادی کا ایک بہت بڑا جزو ہیں اور ہندوستان کے متعلق ہر اسکیم میں ان کی خواہشات کا لحاظ رکھنا لازمی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ ایک نظام ہے جو مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی رائے عامہ کی نمائندہ ہے۔ جس کا لازمی طور پر وزن ہونا چاہیئے۔ اسی وجہ سے کانگریس نے مسلم لیگ کے نقطہ خیال کو سمجھنے اور اس کے ساتھ مفاہمت کی کوشش کی ہے۔ مگر کانگریس کا فرض ہوگا کہ مسلمانوں کے دوسرے موجودہ نظاموں سے بھی مشورہ کرے جنہوں نے گذشتہ زمانہ میں کانگریس کے ساتھ تعاون کیا ہے۔ مزید براں اگر دوسرے گروہوں یا اقلیت والے مفادات کا معاملہ آیا تو ان کے نمائندوں سے بھی مشورہ کرنا ضروری ہوگا"

اور ۱۵ رمئی کو خط لکھا کہ آپ کی تجویز پر کانگریس کے خیالات واضح کرنے کے بعد ہمارا خیال ہے کہ اب اگلی منزل کی طرف قدم بڑھانا باقی رہجاتا ہے یعنی کانگریس اور مسلم لیگ اپنی اپنی کمیٹیاں مقرر کردیں جو ملکر شرائط مفاہمت طے کریں"

مسٹر جناح نے اس خط اور نوٹ وغیرہ کو اگزکٹو کونسل آل انڈیا مسلم لیگ

نا کونسل کے اجلاس منعقدہ جون بمقام دہلی میں پیش کیا۔ کونسل نے غور کے بعد اپنی متفقہ رائے یہ قائم کی کہ:۔

اگزیکٹو کونسل آل انڈیا مسلم لیگ نے اس نوٹ پر جو صدر مسٹر سبھاس چندر بوس کی طرف سے مسٹر جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کو ۱۴ رمئی کو دیا تھا۔ اور جو خط اُنھوں نے ۱۵ رمئی ۱۹۳۸ء کو بھیجا تھا اُس خط پر غور کیا اور یہ معلوم کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے لئے ممکن نہیں ہے کہ کانگریس کے ساتھ ہندو مسلم تصفیہ کے متعلق سوائے اس بنیاد کے کسی دوسری بنیاد پر سلوک کرے کہ مسلم لیگ مسلمانان ہند کا مستند اور نمایندہ نظام ہے کونسل نے مسٹر گاندھی کے خط مورخہ ۲۲ رمئی پر بھی غور کیا اور کونسل کی رائے یہ ہے کہ مجوزہ کمیٹی کے ارکان میں کانگریس کی مقرر کردہ کسی مسلمان کو شامل کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔

اگزیکٹو کونسل اس بات کو صاف کر دینا چاہتی ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی اعلان کردہ پالیسی یہ ہے کہ تمام دوسری اقلیتوں کے حقوق و فوائد کا بھی تحفظ ہونا چاہیے۔ تاکہ ان میں احساس حفاظت پیدا ہو اور ان کا اعتماد حاصل کیا جائے اور جب ضرورت ہوگی آل انڈیا مسلم لیگ ایسی اقلیتوں اور دوسرے مفادات کے نمایندوں سے مشورہ کرے گی۔ جن کا تعلق ہوگا۔

اس رائے کو مسٹر جناح نے اپنے خط مورخہ ۶ رجون کے ساتھ صدر کانگریس کے پاس بھیجدیا اور کچھ ضمنی مراسلت کے بعد صدر کانگریس نے حسب ذیل خط ارسال کیا:۔

ڈیر مسٹر جناح ورکنگ کمیٹی مسلم لیگ کے اگزیکٹو کونسل کے اس رزولیوشن پر جو آپ نے ازراہ کرم اپنے خط مورخہ ۶ رجون ۱۹۳۸ء کے ساتھ بھیجا تھا جتنی بھی توجہ کر سکتی تھی وہ تمام توجہ اس رزولیوشن پر صرف کی، لیگ کونسل کے پہلے رزولیوشن میں لیگ کے مرتبہ کی تصریح کی گئی ہے اگر اس کے یہ معنی ہیں کہ قبل اس کے ہم فرقہ وارانہ مسئلہ کے تصفیہ شرائط پر غور کرنے کے لئے ایک نظام قائم کرنے کے لئے قدم آگے بڑھائیں۔

کانگریس کو مسلم لیگ کا وہ مرتبہ تسلیم کرنا چاہیئے جس کی تصریح کی گئی ہے تو یہ ایک کھلی ہوئی دشواری ہے، اگرچہ رزولیوشن میں مسلم لیگ کی صفت میں "واحد" کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے اور رزولیوشن کے الفاظ ایسے نہیں ہیں، لیکن منشاء یہی ہے، اس سے قبل ہی ورکنگ کمیٹی کو تنبیہیں موصول ہو چکی ہیں کہ مسلم لیگ کے واحد نمائندگی کے مرتبہ کو تسلیم نہ کیا جائے مسلمانوں کے کچھ نظام ہیں جو مسلم لیگ سے بالکل آزاد کام کر رہے ہیں۔ ان میں کے بعض کانگریس کے پکے موئید ہیں علاوہ ازیں انفرادی طور پر کچھ مسلمان ہیں جو کانگریس میں ہیں ان میں سے کچھ ملک کے اندر کچھ کم اثر کے حامل نہیں ہیں، پھر صوبہ سرحد ہے، جو مسلمانوں کی زبردست اکثریت کا صوبہ ہے۔ وہ ٹھوس طریق پر کانگریس کے ساتھ ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ ان معلومہ واقعات کے پیش نظر کانگریس کے لئے ناممکن ہی نہیں بلکہ نامناسب بھی ہے کہ اس بات کو تسلیم کر لیا جائے جو لیگ کونسل کا پہلا رزولیوشن بظاہر کانگریس سے تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ یہ خیال بھی پیش کیا گیا کہ کسی تصریح و تعریف سے جماعتوں کو مرتبے حاصل نہیں ہوا کرتے، کسی جماعت کو اس خدمت سے مرتبہ حاصل ہوا کرتا ہے۔ جس کے لئے جماعت نے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ لہذا ورکنگ کمیٹی کو امید ہے کہ لیگ کونسل کانگریس سے ایک ناممکن چیز کا مطالبہ نہیں کرے گی۔ یہاں سوال یہ ہے کہ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ کانگریس صرف رضامند ہی نہیں بلکہ بے چین ہے کہ لیگ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں اور پریشان کن ہندو مسلم مسئلہ پر لیگ کے ساتھ باعزت سمجھوتہ کیا جائے اس موقعہ پر کانگریس کا دعویٰ بھی بیان کر دینا شاید اچھا ہوگا جو یہ ہے کہ اگرچہ اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ کانگریس کے بے شمار رجسٹروں میں جو لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی تعداد ہندوؤں کی ہے۔ لیکن کانگریس میں خاصی بڑی تعداد مسلمانوں کی بھی ہے اور دوسری قوموں کے اراکین بھی ہیں جو مختلف مذاہب رکھتے ہیں، کانگریس کی مسلسل روایات یہ رہی ہیں کہ وہ ان تمام اقوام تمام نسلوں اور تمام طبقوں کی نمائندگی کرتی ہے، جو ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں ابتداء ہی سے ممتاز مسلمان کانگریس کے صدر اور جنرل سکریٹری رہے ہیں جبکہ کانگریس

کانگریس کی روایت یہ ہیں کہ اگرچہ ایک کانگریسی
کا بھی اعتماد حاصل رہا ہے اور ملک کا بھی،
کانگریسی ہونے سے اس مذہب سے علیحدہ نہیں ہو جاتا جس میں اس کی پیدائش ہوئی
ہے اور اس کی پرورش ہوئی ہے اور کوئی شخص کانگریس میں اپنے مذہب کی بناء پر داخل
نہیں ہوتا تاہم وہ اس بناء پر کانگریس میں آتا ہے اور کانگریس کا بنجاتا ہے کہ اس نے
کانگریس کے سیاسی اصولوں اور پالیسی پر صاد کیا ہے۔ لہٰذا کانگریس کسی لحاظ سے ایک
فرقہ وار جماعت نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ فرقہ وارانہ اسپرٹ سے جنگ کی ہے کیونکہ فرقہ وارانہ
اسپرٹ خالص اور غیر منقسمہ نیشنلزم کے لئے مضر ہے، لیکن جہاں کانگریس یہ دعویٰ کرتی
ہے اور وہ کم و بیش اس دعوے کے ساتھ زندہ رہی ہے وہیں اگر آپ کی کونسل کانگریس
کے ساتھ سمجھوتہ کرے تاکہ ہم قومی استحکام حاصل کرسکیں اور مشترک مقسوم حاصل کرنے
کے لئے گرمجوشی کے ساتھ کام کرسکیں تو ورکنگ کمیٹی کو خوشی ہوگی، رہا لیگ کونسل کا دوسرا
رزولیوشن، مجھے افسوس ہے کہ جو خواہش لیگ کونسل نے اس میں ظاہر کی ہے، ورکنگ
کمیٹی لیگ کونسل کی اس خواہش کو پورا نہیں کرسکتی۔

تیسرے رزولیوشن کو ورکنگ کمیٹی سمجھنے سے قاصر ہے۔ جہاں تک ورکنگ کمیٹی
کا تعلق ہے اس کے نزدیک مسلم لیگ اس لحاظ سے ایک خاص فرقہ وارانہ جماعت ہے
کہ وہ مسلم فوائد کی خدمت کرتی دکھائی دیتی ہے اور اس کی رکنیت کا دروازہ بھی صرف
مسلمانوں کے لئے کھلا ہوا ہے ورکنگ کمیٹی نے برابر یہی سمجھا ہے کہ جہاں تک مسلم لیگ
کا تعلق ہے مسلم لیگ بجا طور پر کانگریس کے ساتھ ہندو مسلم مسئلہ پر تصفیہ چاہتی ہے جہاں
تک کا تعلق ہے اگر دوسری اقلیتوں کو بھی کانگریس سے شکایت ہے تو کانگریس ہمیشہ ان
کے ساتھ بھی بات کرنے کو تیار ہے کیونکہ یہ اس کا فرض منصبی ہے کیونکہ وہ اپنے دستور
ہی کی بناء پر ایک ایسی جماعت ہے جو بلالحاظ ذات و عقیدہ کے تمام ہندوستان کی
نمائندہ ہے۔ ان امور کے پیش نظر مجھے امید ہے کہ ہم تصفیہ کی گفت و شنید کی اگلی
منزل میں داخل ہو جائیں گے۔

تجویز یہ ہے چونکہ سابقہ خط وکتابت شائع ہو چکی ہے اس لئے یہ چیز دانشمندانہ ہوگی کہ پبلک کا اعتماد حاصل کیا جائے اور بعد کو ہمارے درمیان جو خط وکتابت ہوئی ہے اس کو بھی شائع کر دیا جائے۔ اگر آپ اس سے اتفاق کریں۔ تو یہ کاغذات فوراً اشاعت کے لئے دیدیئے جائیں۔"

اس خط کا ۱۰ راگست کو مندرجہ ذیل جواب دیا گیا۔"

ڈیر مسٹر بوس میں نے آپ کا خط مورخہ ۲۵ رجولائی ۱۹۳۸ء آل انڈیا مسلم لیگ کی اگزیکیٹو کونسل کے سامنے پیش کیا۔ اگزیکیٹو کونسل نے ان دلائل پر پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ غور کیا جو آپ نے اپنے خط میں اس غرض سے پیش کئے ہیں کہ لیگ کو اس پر راضی کر لیا جائے کہ وہ اپنے لئے اس مرتبہ کا دعویٰ نہ کرے جو اس نے اپنے اسی رزولیوشن میں کیا ہے جو آپ کو بھیجا جا چکا ہے۔"

مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ اس مرتبہ کی تشریح کے سلسلہ میں کونسل کا منشاء یہ نہ تھا کہ وہ آپ سے کوئی بات منوائے بلکہ اُس نے ایک مسلمہ واقعہ بیان کیا تھا کونسل کو پورا یقین ہے کہ مسلم لیگ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد مستند اور نمائندہ جماعت ہے۔ جب ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کے اندر کانگریس لیگ کا پیکٹ ہوا تھا۔ اُس وقت اس پوزیشن کو قبول کیا گیا تھا اس وقت سے ۱۹۳۵ء تک جب جناح، راجندر پرشاد گفتگو ہوئی تھی۔ اس پوزیشن پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا لہٰذا آل انڈیا مسلم لیگ کانگریس سے نہ اپنی پوزیشن قبول کرانا چاہتی ہے نہ تسلیم کرانا چاہتی ہے۔ نہ مسلم لیگ کی اگزیکیٹو کونسل کے اجلاس بمبئی کے رزولیوشن کا یہ منشاء تھا۔ لیکن اس واقعہ کے پیش نظر کہ مسلم لیگ کی اس پوزیشن پر بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کے وجود ہی پر اس زمانہ کے صدر کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک بیان میں اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ ملک میں صرف دو پارٹیاں ہیں یعنی حکومت برطانیہ اور کانگریس۔ اسلئے مسلم لیگ کی اگزیکیٹو کونسل نے کانگریس کو یہ اطلاع دینی ضروری سمجھی تھی کہ کس بنیاد پر دونوں جماعتوں کے درمیان گفت وشنید آگے

بڑھ سکتی ہے۔

علاوہ ازیں یہ واقعہ کہ کانگریس نے مسلم لیگ کا دروازہ ہندو مسلم مسئلہ کے تصفیہ کی گفتگو شروع کرنے کے لئے کھٹکھٹایا اسی کے معنی یہ ہیں کہ کانگریس مسلم لیگ کی مستند اور نمایندہ حیثیت کو مانتی ہے اور مسلم لیگ کے اس حق کو تسلیم کرتی ہے کہ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی طرف سے معاہدہ کر سکتی ہے۔

کونسل کو اس واقعہ کا علم ہے کہ صوبہ سرحد میں کانگریس کی ایک اتحادی حکومت ہے اور دوسرے صوبوں میں کچھ مسلمان کانگریس کے نظام میں شامل ہیں، لیکن کونسل کی رائے یہ ہے کہ یہ کانگریسی مسلمان مسلمانان ہند کے نمایندے نہیں ہیں اور نمایندگی نہیں کر سکتے جسکی سیدھی سادھی وجہ یہ ہے کہ ان کی تعداد بہت حقیر ہے اور یہ کہ کانگریس کے ممبروں کی حیثیت سے انہوں نے اپنے آپ کو اس قابل نہیں رکھا ہے کہ مسلمان قوم کی نمایندگی کر سکیں، یا اس کی طرف سے بول سکیں، اگر ایسا نہیں ہے تو کانگریس کی قومی نوعیت کے متعلق جو دعوے آپ نے اپنے خط میں کیا ہے وہ دعوے باطل ہو جائے گا۔

رہیں "دوسری مسلم جماعتیں" جن کا حوالہ آپ نے اپنے خط میں دیا ہے، لیکن جن کے نام آپ نے نہیں لئے ہیں۔ ان کے متعلق لیگ کونسل سمجھتی ہے کہ زیادہ مناسب یہ تھا کہ آپ ان کے نام لیتے، اگر وہ جماعتیں اجتماعی یا انفرادی طور پر مسلمانان ہند کی طرف سے بات کرنے کی پوزیشن میں ہوتیں۔ تو صدر کانگریس اور مسٹر گاندھی ہندو مسلم سوال کے تصفیہ کے لئے مسلم لیگ کے ساتھ گفت و شنید شروع نہ کرتے۔

جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے، مسلم لیگ کو علم نہیں ہے کہ مسلمانوں کی کسی دوسری جماعت نے یہ دعوے کیا ہو۔ کہ وہ مسلمانان ہند کی طرف سے بول سکتی ہے یا گفت و شنید کر سکتی ہے لہذا یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ نے اس سلسلہ میں "دوسری مسلم جماعتوں" کا ذکر کیا ہے۔

کونسل بھی پریشان کن ہندو مسلم مسئلہ کے تصفیہ کے متعلق یکساں طور پر بے چین

ہے اور اس طرح مشترک منزل مقصود پر جلد پہونچنے کی فکر رکھتی ہے، لیکن یہ دیکھکر تکلیف ہوتی ہے کہ مسئلہ کو الجھانے کے لئے ناموزوں دلائل پیش کئے جا رہے ہیں اور گفت وشنید کی ترقی کو پیچھے کی طرف ہٹایا جا رہا ہے۔

مندرجہ صدر واقعات کے پیش نظر کونسل اس امر کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہے کہ مجوزہ کمیٹی میں کانگریس کے مقرر کئے ہوئے مسلم اراکین کی شمولیت اس لئے ناپسندیدہ سمجھی کہ وہ کمیٹی ہندو مسلم مسئلہ کا حل نکالنے اور اسے طے کرنے کے لئے بیٹھے گی اور اس لئے متعلقہ مسائل کی نوعیت ہی کی بنا پر کانگریس کے مقرر کردہ مسلم اراکین کو نہ ہندوؤں کا اعتماد حاصل ہوگا نہ مسلمانوں کا، واقعہ یہ ہے کہ ان کی پوزیشن نہایت پریشان کن ہوگی لہٰذا کونسل کی درخواست آپ سے یہ ہے کہ آپ مندرجہ صدر گفتگو کی روشنی میں مسئلہ پر غور کریں۔

تیسرے رزولیوشن کی بابت یہ ہے کہ دوسری اقلیتوں کا ذکر کانگریس کی اس یادداشت میں کیا گیا تھا جس کا حوالہ آپ نے اپنے خط مورخہ ۱۵ ارمئی ۱۹۳۸ء میں دیا تھا اور مسلم لیگ نے اس پر اظہار رضامندی کیا کہ اگر ضرورت ہوئی اور جب ضرورت ہوئی وہ اپنی اعلان کردہ پالیسی کے مطابق ان سے مشورہ کرے گی۔

رہی آپ کی یہ خواہش کہ خط وکتابت کو . . . . جس میں یہ خط بھی شامل ہے اشاعت کے لئے دیدیا جائے آپ ایسا کریں تو کونسل کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

(آپ کا مخلص۔ ایم۔ اے۔ جناح)

یہ خطوط متذکرہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۲ ر اکتوبر میں پیش ہوئے اور کمیٹی کی رائے سے حسب ذیل جواب دیا گیا:۔

"اگرچہ آپ کے خط میں غیر صحیح چیزیں درج ہیں مگر ان پر بحث بے سود ہے آپ کے خط کا خلاصہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لیگ اس بات کی توقع کانگریس سے نہیں کرتی کہ کانگریس معناً یا صراحتاً اس کا مرتبہ اس حیثیت سے تسلیم کرے گی کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد مستند جماعت ہے۔

اگر لیگ اس خیال کو قبول کرلے تو مجھے یہ کہنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ ورکنگ کمیٹی

اس کمیٹی کے ساتھ کانفرنس کرے گی، جس کو لیگ شرائط تصفیہ مرتب کرنے کے لئے مقرر کرے گی ورکنگ کمیٹی کے کم سے کم پانچ اراکین اس کانفرنس کے اجلاسوں میں نمائندوں کی حیثیت سے شریک ہوں گے؛

اس جواب کے متعلق لیگ کونسل نے بمقام کراچی غور کرکے صدر کانگریس کو حسب ذیل جواب دینے کا اختیار دیا:-

"آپ کا خط مورخہ ۷ ر اکتوبر موصول ہوا جو لیگ اگزکیٹو کونسل کے سامنے پیش کیا گیا، مجھے یہ جواب دینے کا اختیار دیا گیا ہے کہ اگزکیٹو کونسل کو اس امر پر بہت افسوس ہے کہ میرے مکتوب مورخہ ۷ ر اکتوبر کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بالکل غلط سمجھا میرا مکتوب بالکل واضح تھا، اور نہ وہ کسی مزید تشریح کا محتاج ہے اور نہ اس کو کوئی اور معنی پہنائے جا سکتے ہیں کہ مسلم لیگ ہندو مسلم تصفیہ کے لئے گفت و شنید جاری رکھنے پر تیار ہے مگر اسی بنیاد پر جو میرے محولہ بالا خط میں پیش کی جا چکی ہے اور وہ اس کمیٹی سے گفتگو کرنے کے لئے اپنے نمائندوں کو مقرر کردے گی، جس کو کانگریس ہماری پیش کردہ بنیادوں اور ہماری ۵ جون کی قراردادوں کے مطابق جو آپ کو بھیجی جا چکی ہیں مقرر کرے گی"

لیکن یہ مذاکرات مصالحت صرف دنیا کو دکھانے اور مغالطہ دینے کے لئے تھے جو بالآخر بے نتیجہ رہے۔

اجلاس مسلم لیگ منعقدہ لکھنؤ نے مسلمانوں میں جو احساسات پیدا کئے اور جس طرح ان کو اپنی صحیح حالت کا اندازہ ہوا اس نے ان میں بیداری اور عزم راسخ پیدا کر دیا اور بہت جلد مسلم لیگ کی قوت اتنی زبردست ہو گئی کہ مخالفوں کو اس کی اہمیت و طاقت کا اعتراف کرنا پڑا۔

مذکورہ بالا مذاکرات کو کانگریس کا بڑا حصہ ناپسند کرتا تھا چنانچہ ورکنگ کمیٹی کے خلاف آل انڈیا کانگریس میں یہ تحریک پیش ہوئی کہ اس نے مسلم لیگ سے مصالحانہ گفتگو کا آغاز کرکے کانگریس کے وقار کو صدمہ پہونچایا ہے جو گویا تحریک ملامت تھی تو مسٹر بوس نے اپنی صفائی میں دوسری وجوہ کو پیش کرتے ہوئے یہ وجہ بھی بیان کی کہ:-

"میں بنگال میں جس جگہ بھی جاتا تھا مسلمان سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کرتے تھے اور مطالبہ کرتے تھے کہ میں پہلے مسلم لیگ سے کانگریس کی صلح کراؤں اور پھر ان کے سامنے آؤں۔"

ان مخالفین کے علاوہ لارڈ لوتھین کا بیان بھی لیگ کی عظمت کا ایک صاف اقرار ہے لارڈ موصوف نے دستور جدید کی تشکیل میں بڑا کام کیا تھا۔ وہ ۱۹۳۸ء کے اواخر میں بغرض سیاحت ہندوستان آئے اور کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے۔ انہوں نے ہندوستانی سیاسیات کا بغور مطالعہ کیا اور واپس جا کر ایک طویل مضمون شائع کرایا جس میں لکھا تھا کہ:۔

"ہندوستان کی صورت حال سے متعلق کانگریس کے علاوہ جس کا تذکرہ پچھلے ہفتہ کیا گیا تھا اور بھی خاص عناصر ہیں یعنی دو عناصر مسلمان اور والیان ریاست ہیں۔ جدید دستور کے نفاذ نے مسلمان قوم میں ایک نہایت اہم حرکت پیدا کر دی ہے مسلمانوں کی تعداد آٹھ کروڑ سے زیادہ ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ گیارہ صوبوں میں سے چار صوبوں میں مسلمانوں کو عملاً مستقل قابو حاصل ہے اور دوسرے صوبوں کے اندر نیابت کے سلسلہ میں تعداد سے زیادہ حق حاصل ہے اور ووٹ بھی جداگانہ حلقوں کی صورت میں دیتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ معاشرتی اصلاح حال سے متعلق مسلمانوں کے پروگرام اور کانگریس کے پروگرام میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ البتہ مسلمان سول نافرمانی کے اصول کو مسترد کرتے ہیں۔ حال میں مسلم لیگ نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ ہندوستان کی منزل مقصود آزادی ہے، لیکن مسلمان اس بات کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتے کہ روشن خیال اہل کانگریس کے غیر فرقہ وارانہ دعاوی اور حقیقی خواہشات خواہ کچھ ہوں، لیکن کانگریس کے ممبروں کی زبردست اکثریت ان ہندوؤں پر مشتمل ہے جو مسلمانوں اور برطانیہ کی صدیوں کی حکومت کے بعد اب ہندو راج کے قیام کے منتظر ہیں۔

"مسلمانوں کو ایک اقلیت کی حیثیت سے اپنے مستقبل کے متعلق خطرہ ہے پھر ایک

واقعہ یہ ہے کہ کانگریس ایک طرف نوجوان مسلمانوں کو اپنے عقیدہ قومیت متحدہ ہندیہ پر لاڈالنے کے لئے پرجوش کوشش کر رہی ہے اور دوسری طرف وہ مسلمان کسانوں کو اپنے زرعی پروگرام کا گرویدہ بنانا چاہتی ہے۔ ان چیزوں نے مسلمانوں کی ایک زبردست اکثریت کو ایک از سر نو زندہ پارٹی کی صورت میں مستحکم بنا دیا ہے۔ اس پارٹی کا نام مسلم لیگ ہے اور مسٹر جناح اس کے لیڈر ہیں۔ معاً مسلمانان ہند کی پوزیشن ویسی ہی ہے جو آئرلینڈ میں السٹر کی ہے۔ ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت سے ان کی تنظیم کی حقیقی بنیاد۔ مذہب کا اختلاف ہے اور اگر یورپ کا تمام تجربہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ تو قبل اس کے کہ ہندوستان کے منظر سے فرقہ وارانہ عنصر دور ہو۔ طویل مدت گذرے گی۔ فیڈریشن پر مسلمانوں کا ایک ہی اعتراض ہے، جو یہ ہے کہ تمام تحفظات کے باوجود فیڈریشن کے ذریعہ سے مرکزی وفاقی حکومت میں ایک مستقل ہندو اکثریت مستحکم ہوگی۔"

تھوڑے ہی عرصہ میں کانگریسی صوبوں میں جو واقعات گذرے اور یکے بعد دیگرے جس طرح کانگریس نے ہر جگہ اپنے بیّنہ اصولوں سے انحراف کیا اور کراچی کے مشہور ریزولیوشن کو مہمل الفاظ کا مجموعہ بنا دیا۔ ان سب امور نے مسلمانوں میں ایک متحدہ پلیٹ فارم اور متحدہ محاذ کی ضرورت اور اہمیت کا بہت زیادہ احساس پیدا کر دیا اگرچہ جمیعت العلماء اور جمیعت احرار نے ہر موقعہ پر نئے نئے اور قابل اعتراض طریقوں سے مزاحمتیں کیں اور مولانا حسین احمد، شیخ الحدیث دیوبند نے تو قائداعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگ کے متعلق افتراء و بہتان میں ایسی دلیری کی جو انہیں کا حصّہ ہو سکتی ہے لیکن مسلم لیگ کی قوت روز بروز بڑھتی رہی۔

اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ مسلم لیگ کا پراونشل اجلاس کراچی میں منعقد ہوا اس صوبہ کا جداگانہ قیام محض مسلم لیگ کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مگر جدید اصلاحات کے بعد کانگریس کی ریشہ دوانیوں اور مسلمانان ہند کی باہمی نااتفاقیوں نے یہاں کی وزارت میں ایک سخت خلفشار مچا دیا۔

اس اجلاس کا مقصد سب کو لیگ کے پلیٹ فارم پر متحد کرنا تھا جس کے لئے

مقامی ممتاز اصحاب نے سعی بلیغ کی اور بظاہر کامیابی ہو گئی - چند شرائط پر سب متحد ہو گئے۔

مسٹر جناح نے اس اجلاس میں ایک نہایت شاندار تقریر کی جو اس عرصہ کے تمام واقعات وحالات پر مشتمل اور دور رس نتائج کی حامل تھی۔

انھوں نے صوبہ سندھ وسرحد میں اصلاحات کی کوششوں اور کانگریس کے مخالفانہ رویہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ :-

"میدان سیاست میں جو جنگ ہم کر رہے ہیں وہ نہ تو روٹی کے لئے ہے اور نہ وزارتوں اور چند نوکریوں کے لئے ہے اور نہ ہی اس جنگ کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے عوام کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی ترقی کے مخالف ہیں بلکہ ہم تو دل سے خواہاں ہیں کہ ہندوستان ترقی کرے لیکن ہمارا مقصد خصوص یہ ہے کہ مسلمان بھی ساتھ ہی ساتھ ترقی کرتے رہیں چنانچہ ہم اپنے ہم وطنوں کے دوش بدوش اپنی قوم کی بہتری کے لئے کوشاں ہیں۔ مخالفین آپ سے کہیں گے کہ لیگ کی پالیسی اور پروگرام رجعت پسندانہ ہے مگر ہر وہ ایماندار شخص جس نے مخلصانہ طور پر ہمارے پالیسی اور پروگرام کا مطالعہ کیا ہے کہہ سکتا ہے کہ ہماری پالیسی اور پروگرام پورے طور پر قومی ہے اور مفاد وطن بھی اس کا فرض اولین ہے اور رجعت پسندی کا اس میں شائبہ بھی نہیں۔"

اس کے بعد کانگریس اور ہندو پریس کے پروپگنڈے اور کانگریس ہائی کمانڈ کے پر عناد رویہ، لیگ کے تعاون سے انکار اور دونوں کے پروگراموں کا مقابلہ کر کے بتایا کہ :-

"ہم ہندوستان کی مکمل آزادی چاہتے ہیں یعنی آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو بھی آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے حقوق اور مفاد کے تحفظ کے بھی خواہاں ہیں اور کسی خاص فرقہ کی آزادی نہیں چاہتے۔"

کانگریسیوں اور کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں اور اقلیتوں کے متعلق ان محدود اختیارات کا جو دستور جدید کی رو سے حاصل ہوئے تھے جس طرح برا استعمال کیا اور

جس طرح خوف اور لالچ دیا گیا ان پر اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ :-

"میں جانتا ہوں کہ گورنروں اور گورنر جنرل نے اقلیتوں کو کانگریس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اور خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ صریحاً ناانصافی برتی ہے مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کانگریس اور برطانوی حکومت میں ایک ناجائز سمجھوتہ ہوا ہے کہ گورنر اور گورنر جنرل اپنے اختیارات خصوصی کا استعمال نہ کریں۔ اور اس سے ظاہر ہے کہ کانگریس کے جور و استبداد کی رسی کے دراز کرنے میں ان کو سہولیت دی جا رہی ہے اور کانگریس کے اس رویہ سے آپس میں نفرت کا زہر پھیل رہا ہے اور ہر فرقہ اور جماعت میں تصادم پیدا ہو رہا ہے اور اس پالیسی سے تمام ہندوستان میں امن و امان مفقود ہو چکا ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ اس پالیسی کا اثر ہندوستان کی جنگ آزادی پر بہت مہلک ہوگا۔ کانگریس اس وقت اپنی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی سے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں جا رہی ہے جو خیبر سے راس کماری تک اور کراچی سے کلکتہ تک ہندوستان کی یگانگت کو پاش پاش کر کے رکھ دیں گے۔"

حضرات! ہم کو پنجاب، بنگال اور آسام کے حالات کا معائنہ کرنا چاہیئے۔ چونکہ ان صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس لئے کانگریس ان کی وزارتوں کے خلاف ہر قسم کی رکیک سے رکیک سازش کر رہی ہے۔

پنجاب میں سکندر حیات خاں کی وزارت کے خلاف ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن وہاں ان میں اتنی جرأت بھی نہ ہوئی کہ عدم اعتماد کی تحریک لانے کی کوشش بھی کرتے۔ بنگال میں فضل الحق کی وزارت پر حملہ کا منہ توڑ جواب پا چکے ہیں۔ لیکن جب آسام میں سر سعداللہ کی وزارت نے استعفےٰ دیدیا تو فوراً صدر کانگریس مع اپنے رزخریدوں کے آسام تشریف لے گئے اور اپنے اصولوں کو خیرباد کہہ کر مخلوط وزارت قایم کر لی لیکن مسٹر باردولی کو ایک بھی مسلمان وزیر نہ مل سکا اور اب بھی دو وزرا کی جگہ خالی رہ رہی اور بزدلی کی حد یہ ہے کہ عدم اعتماد کی تحریک کے ڈر سے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرا دیا گیا اور باردولی وزارت اپنے پر اعتماد ثابت کرنے کے لئے اسمبلی کے اجلاس کے بجائے

جانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور جب اکسٹھ سات اراکین میں سے چھپن اراکین نے
عدم اعتماد کی تحریک پر دستخط کر دیئے تو مسٹر بوس کو اپنے منتے بچتے کے لئے اکسیجن کی ضرورت
محسوس ہوئی اور انھوں نے یورپین پلانٹرز (کاشتکاران چائے) کے پاؤں پکڑنا شروع
کر دیئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کے ناخدا صرف ایک بات چاہتے ہیں اور
وہ یہ کہ مسلمانوں میں اتحاد نہ ہو سکے خواہ اس کے لئے ان کو ناجائز اور رکیک حرکات
ہی کرنی پڑیں اور کسی صورت سے بھی مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکا جائے
چاہے اس میں شرمناک اور اوچھے ہتیار استعمال کرنا پڑیں چونکہ کانگریس والے شرم و
حیا سے بالاتر ہیں اور اخلاق کے معیار ان کے لئے نہیں۔ ان کی پالیسی غرور و تکبر سے
پُر ہے اور وہ صرف ابن الوقتی کے قائل ہیں بدقسمتی سے ان کو اہل ہنود کا اعتماد حاصل
ہے اور اس اعتماد سے وہ قطعاً ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور نہ صرف عوام بلکہ مہاتما
گاندھی جن کو ہندو دیوتا سمجھتے ہیں اور اُن کا حکم خدائی حکم کا درجہ رکھتا ہے وہ ان ناخداؤں
کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں اور جب کبھی مسٹر گاندھی ان غیر موزوں پوزیشنوں
سے نکلنا چاہتے ہیں تو یا تو وہ اپنی اندرونی آواز کی طرف رجوع کرتے ہیں یا پھر اس واقع
کے پیچھے آڑ لیتے ہیں کہ میں تو کانگریس کا چار آنہ والا ممبر بھی نہیں اور خاموشی اختیار کر لیتے
ہیں اور پھر وہ کانگریس کی اندرونی بد انتظامیوں، جھوٹ اور تشدد کا ماتم کرنے لگتے ہیں
اور ظاہر کر دیتے ہیں کہ وہ کانگریس ہائی کمانڈ کے آگے لاچار ہیں۔

یہ گراؤنڈ فاسسٹ کونسل یعنی کانگریس ہائی کمانڈ جسے ہندوستان کی حکومت
کے مقابلہ میں کانگریسی حکومت کا کابینہ کہا جاتا ہے عوام کی ترجمانی کا دعویٰ کرتی ہے
اور اس کابینہ کی حرکتیں ایسی ہوتی ہیں جیسی کہ سرکس کے مسخرے کیا کرتے ہیں۔

آج ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ کا حل کرنے کا حق ہم کو نہیں اور کانگریس
کے ناخدا چاہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی نمائندگی کا ثبوت پیش کریں۔ حضرات! اس
مطالبے کے معنی بالکل صاف ہیں لیکن ہم کو دشمنوں سے شکایت بیکار ہے۔

اور اگر مسلمانوں کو اپنے مقصد کے حصول میں شکست کا خطرہ ہو سکتا ہے تو دشمن

سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے جو ہم میں سے ہیں مگر مار آستین اور غدار ہیں اور مسلمانوں کے
اتحاد کے لئے زہر قاتل ہیں اور جس کا تجربہ ہم کو ماضی میں بھی ہو چکا ہے کہ خود ہمارے ہی
لوگوں نے ہم کو دھوکا دیا اور انہی کی غداری کے سبب ہم اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکے
میں ایسے غدارانِ قوم کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا سوائے اس کے کہ ان کا جی چاہے
چاہے بدترین سے بدترین کوشش کر لیں اور کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں لیکن میں آپ سے
اپیل کرتا ہوں چونکہ آپ کے دل میں مسلمانوں کا اور اسلام کا درد ہے اور اپنی قوم کے بہی
خواہ ہیں کہ وہ کسی زہریلے پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں اور مسلم لیگ کے اسلامی پرچم
کے نیچے جمع ہو کر اور مسلمانوں کو بھی اتحادِ عمل کی دعوت دیں اور بہ یک آواز مسلمانوں کے
حقوق کے لئے کلمۃ الحق بلند کریں۔"

یہاں میں اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری ہندو قوم کے ساتھ کوئی
جنگ نہیں بلکہ بعض اہل ہنود میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ میری جنگ دراصل کانگریسی
ہائی کمانڈ سے ہے جو میری رائے میں صرف ہندوستان کی ترقی اور آزادی کی بدترین
دشمن ہے بلکہ ہندوؤں کے لئے بھی مار آستین ہے اگرچہ بہت سے ہندو کانگریس کی
موجودہ پالیسی پر لعنت بھیجتے ہیں مگر تاہم ان کی اکثریت اس کے دام فریب میں مبتلا ہے
اور کانگریس کے میٹھے اور خوش آئند وعدوں پر مفتوں ہے۔

کیا وہ دن آئے گا جب ہندو اپنی عقل سے کام لے کر اس مسمریزم کرنے والی
جماعت سے اپنے قول و فعل کی آزادی حاصل کر سکیں گے۔"

اس کے بعد مسئلہ فلسطین کے متعلق اب تک جو کوششیں ہوئی تھیں اور حکومت
کو جس طرح متنبہ کیا گیا تھا اور قاہرہ مسلم کانفرنس میں شرکت کی جو تدابیر وغیرہ کی گئی تھیں
ان سب کے ایک مختصر بیان کے بعد کہا کہ:۔

"افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ برطانیہ نے اپنے دوستوں کو بھیڑیوں کے سامنے
ڈال دیا ہے اور وہ اپنے وعدے بھول گئے ہیں چوں کہ وہ ہمیشہ ایسی طاقت کے سامنے
جھکتے ہیں جو اس کو ذرا دھمکا سکے۔ چنانچہ یہاں بھی انھوں نے ہم مسلمانوں کو بھیڑیوں

کے سامنے ڈالا ہے میں اس بات کو سختی سے واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جب تک برطانیہ فلسطین کے عربوں کی جائز شکایات دور نہ کردے اُس وقت تک مشرقِ قریب میں اس کو امن نہیں حاصل ہو سکتا۔

ہندوستان میں ملک معظم کی حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ برطانیہ کے سیاست دانوں کو اس دھوکہ میں نہیں رہنا چاہیئے کہ صرف کانگریس ہی ہندوستانی قوم کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ چونکہ یہاں ۹۰ ملین فرزندان توحید بھی بستے ہیں۔ اس موقع پر میں کانگریس ہائی کمانڈ کو بھی جتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ موجودہ حالات پر غور کریں جن کی وجہ سے دنیا پر جنگ کے بادل چھا گئے تھے اور اس سے ان کو درس عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔

اور یہ سب کچھ کیوں کر ہوا صرف اس لئے کہ چیکوسلاواکیا کی اکثریت سوڈیٹن جرمنوں کی اقلیت کے ہر جائز مطالبے کو ٹھکراتی رہی اور اُن پر ظلم و تشدد کرتی رہی جسکے نتیجہ میں اب چیکوسلاواکیا کی جمہوریت ختم ہو گئی اور دنیا کا نقشہ بدل گیا۔ ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح سوڈیٹن جرمن ۲۰ سال تک ان مظالم اور تشدد کو خاموشی سے برداشت کرتے رہے اس لئے نہیں کہ وہ کمزور تھے چنانچہ بعد کو اُنہوں نے ظلم و تشدد کرنے والی طاقتوں کو بتا دیا کہ وہ کمزور نہیں ہیں اور وہ اس ظلم کا تختہ الٹ سکتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے مسلمان بھی کمزور نہیں ہیں اور وہ کسی صورت میں بھی اس پر آمادہ نہیں کہ وہ اپنی قومیت اور تمناؤں سے جو اس برِاعظم سے وابستہ ہیں دست بردار ہو جائیں۔ ۔ ۔ ۔ یہاں پر میں حکومت ہند کی سرحد کی پالیسی پر کچھ کہوں گا۔ اور اس کے متعلق صرف اتنا کہنا بہتر ہے کہ جتنی جلد وہ اپنی اس پالیسی کو بدل دے اور اس کی بجائے وسائل آسانی اختیار کرلے اتنا ہی اس کے لئے بہتر ہے لہذا میں حکومت برطانیہ سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنی پالیسی پر جو فلسطین، وزیرستان، مسلمانان ہند اور عام طور پر تمام اسلامی طاقتوں سے متعلق ہے اس پر غور کے ساتھ نظر ثانی کرے اور یہ خود برطانیہ کے مفاد میں بہتر ہوگا۔ اگر وہ اپنی پالیسی اور اس کے نتائج کو گذشتہ ۲۰ سال میں جو دنیا میں واقعات ہوئے

ہیں ان کی روشنی میں دیکھے اور تبدیل کر دے۔"

اس لئے مسلمانوں سے مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ آگے بڑھو اور تمام ہندوستان میں اپنی تنظیم کر ڈالو اور اگر پھر ہمارے دلائل اور وجوہات ناکام رہیں تو پھر ہم کو مجبوراً اپنی طاقت پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ نہ تو میں ڈرتا ہوں اور نہ ہم سب کو ڈرنا چاہیئے۔ اور نہ نتائج کے خیال سے ناامید ہونا چاہیئے۔ چونکہ ہماری جنگ موت و زیست کی ہے جس میں ۹ ملین مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہے۔"

سندھ میں مسلم لیگ نے جو اتحاد پیدا کرنا چاہا اس نے کانگریس کو بے چین کر دیا اور پوری دسیسہ کارانہ قوت کے ساتھ اس کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی گئی اور بلاشبہ وہ کامیاب ہوئی۔ اجلاس کے بعد ہی وزیراعظم مسٹر اللہ بخش نے ان شرائط اتحاد کو بالائے طاق رکھکر سیاسی ارتداد کر لیا، مگر باوجود اس ناکامی کے جو مسلم لیگ کو وزارت کے حلقہ میں ہوئی اتحاد ملی کو زبردست طاقت حاصل ہو گئی مسلمانوں میں عامتہ بیداری پیدا ہو گئی اور حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون کے شغف و انہماک اور پُرخلوص جد وجہد نے سندھ کو مسلم لیگ کا ایک پرجوش و قوی صوبہ بنا دیا۔

باب ۱۲ دوازدہم

دسمبر ۱۹۳۸ء میں بمقام پٹنہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا، سید عبدالعزیز بار ایٹ لا کی صدارت میں مجلس استقبالیہ نے نمایندوں مہمانوں اور عام شرکائے اجلاس کی آرام و آسائش کا ہر ممکن انتظام کیا۔ صوبہ کے تمام اضلاع سے بتعداد کثیر والنٹیر جو مسلم نیشنل گارڈ کے ممبر تھے آئے۔ ان کو قابل مثال تربیت دی گئی تھی ان کا کام عام انتظام پہرہ چوکی اور کیمپ میں ٹھہرنے والوں کی ضروریات کی فراہمی تھا یہ نوجوان نہایت خاموشی و مستعدی اور انکساری و تواضع کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیتے تھے۔ ایک ہی احاطہ میں ہر صوبہ کے جدا جدا کیمپ تھے۔ طبی امداد و اطلاعات کا بہترین انتظام تھا اور ہر قسم کی ضروریات کی دکانیں تھیں۔

کیمپ کے قریب ہی ایک وسیع شاندار مگر سادہ پنڈال تھا اور اس میں خواتین کے لیے مخصوص گیلری تھی۔

مختلف صوبوں سے بھی نیشنل گارڈ کے دستے آئے تھے اور پنڈال کے قریب ہی ان کے کیمپ لگائے گئے۔ چوں کہ بہت زیادہ اندیشہ تھا کہ مخالفین پنڈال میں آگ لگا دیں اسلئے نیشنل گارڈ اور والنٹیر رات رات بھر برفانی موسم میں پنڈال کے گرد پہرہ دیتے تھے۔

صدر مجلس استقبالیہ کی کوٹھی دلکشا کے وسیع صحن میں ورکنگ کمیٹی اور دوسرے جلسوں کا انتظام تھا۔

غرض صدر مجلس استقبالیہ کی اولی العزمی و محنت شاقہ اور ان کے رفقا کے عزم و انہماک نے اجلاس کو کامیاب اور پر عظمت و شوکت بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔

۲۷۲

۲۱ر دسمبر کو مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ صبح کے وقت پٹنہ سٹی اسٹیشن پر پر اُترے اگرچہ اُنھوں نے بذریعہ تار جلوس و استقبال میں ہجوم کی ممانعت کردی تھی اور موسم بھی بہت سخت سرد تھا۔ لیکن پھر بھی اسٹیشن پر ہزارہا مسلمانوں کا اجتماع تھا، صدر لیگ رسمی تعارف کے بعد صدر مجلس استقبالیہ کے ساتھ کار میں شہر کی طرف روانہ ہوئے۔

بہار، سندھ، دہلی اور یوپی کے نیشنل گارڈ کے دستے جلوس میں تھے۔

اسٹیشن سے پنڈال تک جو صدر مجلس استقبالیہ کی کوٹھی "دلکشا" کے قریب ہی تھا۔ سات میل طولانی سڑک ہے اس پر تقریباً سو دروازے بنائے گئے تھے جو لیگ کے زعما و اکابر کے ناموں سے موسوم تھے۔ جلوس کی جگہ مجلس استقبالیہ کی ہدایت کے مطابق پوری گذرگاہ پر دورویہ خیر مقدم کرنے والوں کی صفیں قائم تھیں یہ استقبال سنجیدگی و سلیقہ، زیبائش و آرائش اور جوش و جذبات ہر لحاظ سے نہایت شاندار تھا۔

۲۷ر دسمبر کو جناب صدر نے رسم پرچم کشائی ادا کی۔ پورا نیشنل گارڈ چاروں طرف استادہ تھا اور تمام والنٹیر صف بستہ جمع تھے۔ اس تقریب میں بہت مختصر تقریر اردو میں کی۔

۲۶ر دسمبر کو اجلاس عام شروع ہوا آلات نشر الصوت (لاؤڈ اسپیکر اور مائکروفون) کا بہترین انتظام تھا نہ صرف وسیع پنڈال حاضرین سے بھرا ہوا تھا بلکہ اس کے باہر بھی بہت بڑا ہجوم تھا۔

اجلاس کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انتہائی سکون و خاموشی رہتی تھی اور حاضرین تقریروں کے سننے میں محو ہو جاتے تھے البتہ مناسب موقعوں پر موزوں نعرے اور چیرز اس فضا میں چند لمحوں کو تلاطم پیدا کرتے رہتے تھے۔

تلاوت قرآن کریم اور مشہور ترانہ اقبال کے بعد سندھ کے نیشنل گارڈ نے ایک ترانہ پڑھا جو نہایت موثر تھا اور حاضرین کے دلوں کا جوش چہرہ سے نمایاں ہو رہا تھا اور ہر شخص بے اختیاری کے ساتھ مصرعوں کو زیر لب دوہراتا تھا۔

اس کے بعد صدر مجلس استقبالیہ نے[۴۳] اردو میں اپنا جامع اور فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا جس میں تمام حالات حاضرہ اور اپنے صوبہ کی مظلومی اور کانگریسی حکومت کے مظالم پر روشنی ڈالی اور جدید تحریکات، متحدہ قومیت اسلامی اجتماعیت اور مسلم لیگ کی نسبت کہا کہ:-

"آج قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے کون کون سی تحریکات مسلمانوں کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ ہر تحریک انہیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ دوسروں کے لئے یہ تحریکات جتنا بھی مفید ہوں، لیکن مسلمانوں کے درد کی دوا نہیں بن سکتیں، اس قدر متضاد تحریکات کی کشمکش دنیا کے کسی حصہ میں اس وقت نہیں ہے، جس قدر ہندوستان میں پائی جاتی ہے، اس ملک میں مختلف نسلوں اور مذہبوں کی وجہ سے جو دشواریاں سیاسی، سماجی، اور تمدنی مسائل کے حل کرنے میں سدّراہ ہیں، اُن کو ان جدید تحریکات نے اور بھی مشکل تر بنا دیا ہے۔

مسلمانان ہند بہت دنوں تک اپنی سادہ لوحی، خوش نیتی اور اخلاص طبعی کی وجہ سے ہر سمت دوڑ گئے، لیکن ہر طرف سے ہواؤں کے طوفان اور گرد و غبار کے تھپیڑوں نے انھیں واپس کیا۔

اس کشمکش میں آخر مسلمان کب تک مبتلا رہتے، خدا کا شکر ہے کہ مسلمان بیدار ہوئے اور صحیح معنوں میں اپنی تنظیم شروع کر دی اور قلیل مدت میں اپنے جذبۂ قومی اتحاد باہمی، اور خدمات ملکی کا جو ثبوت دیا اور مسلم لیگ کے اندر نئی روح ڈال کر اس کے مفید نصب العین کو قبولیت عامّہ کا جامہ پہنایا، اس کا منظر آج آپ کے سامنے ہے۔

متحدہ قومیّت گاندھی جی اور ان کے پیرو قومیت کے نام سے ہندوستان کے تمدن کی ترقی صرف ہندوؤں کی تاریخی روایات پر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ایک طبقہ ایسا بھی نظر آتا ہے جو ہندوستان کی متحدہ قومیت کی تعمیر چاہتا ہے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی امتیازات کو مٹانا چاہتا ہے۔ اور اس کے بدلے مغربی وضع کی ایک قومیت کی تعمیر کا خواہش مند ہے۔

مذہب کا کھلم کھلا وہ مخالف تو نہیں مگر اسے غیر ضروری یا صرف ایک خانگی چیز سمجھتا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اس قدر مذاہب موجود ہوں ہندوؤں کے لئے اس تحریک میں شاید کوئی حرج نہیں، چوں کہ اکثریت ان کی ہے اور وہ اپنی حکومت کے ذریعہ اپنے تمدنی اثرات کو غالب کر سکتے ہیں، اور اس کی ضرورت کو پیش کر سکتے ہیں اور کریں گے، لیکن ایسی تحریک مسلمانوں کے لئے بلا شبہ نہایت مضر ثابت ہوگی۔

مسلمان متحدہ قومیت کی تحریک کے صرف اس پہلو کو تسلیم کر سکتا ہے جو ملک کے لئے آزادی اور اختیارات حاصل کرنے میں مددگار اور ہندوستان کے معاشی مسائل کے حل کرنے میں معاون ہو لیکن وہ اسے کسی طرح نہیں قبول کر سکتا کہ اپنی قومی ہستی کو ہندوستان کی متحدہ قومیت میں ضم کر دے۔ زندگی کے متعلق مسلمانوں کا خاص تصور ہے، وہ تصور کے ماتحت زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا عادی ہے۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا تصور زندگی نہ صرف اس کے لئے مفید ہے بلکہ ہندوستان اور تمام دنیا کے لئے بھی نافع ہے، وطن اور روٹی کا بت بنا کر وہ ان کی پرستش نہیں کر سکتا یا وطن کو آزاد کرنے اور روٹی کے مسئلے کو حل کرنے میں کسی کے پیچھے رہنا نہیں چاہتا۔ لیکن ایسی متحدہ قومیت جس میں اس کا ملی وجود، اس کا خاص تصور زندگی اس کی مخصوص تاریخی روایات اس کے بعض مذہبی شعار اور سیاسی حقوق فنا ہو جائیں۔ اس کے لئے کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد جو نئے حالات پیدا ہوئے ہیں ان کے علاوہ وہ قومی جذبات اور دوسرے محرکات ہیں جو مسلم لیگ کے استحکام اور اس کی زندگی ثانی کا سبب ہوئے اور آج بجا طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ نے ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے، ہندوستان کی تحریک قومیت اور اشتراکیت کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانان ہند کو ان میں سے ایک بھی مطمئن نہیں کر سکتی۔ دونوں تحریکات میں ایسے عناصر ہیں

جو ہماری قومی زندگی کی خصوصیات کے بالکل خلاف ہیں، اس لئے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے ذریعہ عظیم الشان کام انجام دینا ہے، پہلے انہیں منظم و متحد ہونا ہے، تاکہ وہ صرف اپنے لئے ہی مفید نہ ہوں بلکہ ان کا وجود ہندوستان عالم اسلام اور تمام دنیا کے لئے مبارک ثابت ہو۔ مسلمانوں کو تمام جماعت بندیاں ختم کر دینی چاہئیں، اور ان کو لازم ہے کہ ذات کی بنا پر جو اسلامی اصول کے منافی ہے اپنے کو ٹکڑا ٹکڑا نہ کریں، اور جو ان کو تقسیم کرکے کمزور بنانا چاہتے ہیں، اُن سے ہوشیار ہوجائیں، مسلمانانِ ہند کی صرف ایک جماعت ہونی چاہیئے، اور وہ جماعت اس وقت مسلم لیگ ہے، مسلم لیگ کا ایک آزاد اور مستقل وجود ہے، اور اس کے پروگرام میں ذیل کے مقاصد بھی شامل ہیں:۔

(۱) یہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے جائز حقوق کی محافظ ہوگی۔

(۲) یہ ملک کی آزادی کے لئے جد و جہد کرے گی۔

(۳) یہ اقتصادی ابتری اور معاشی مسائل کو حل کرے گی۔

بعض لوگ شاید یہ سوال کریں کہ کانگریس اور سوشلسٹ پارٹی میں بھی ایسے مقاصد موجود ہیں، تو پھر ایک ایسی اسلامی جمعیت کے قیام کی ضرورت کیا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ کانگریس میں اکثریت ہندوؤں کی ہے، جس میں بے شمار دولت مند، سرمایہ دار اور کوتاہ نظر شامل ہیں، اس لئے اقلیت کو اپنی حفاظت کے لئے ایک علیحدہ جماعت قائم رکھنا ضروری ہے۔

ہندوستان نہایت ہی متعصب ملک ہے، یہاں اقلیتوں کی قسمت دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑی نہیں جاسکتی۔

سوشلسٹ پارٹی سے بھی مسلمانوں کو اتفاق نہیں ہے، اولاً تو وہ مادہ پرستوں کی جماعت ہے، اور ہمیں ڈر ہے کہ اس وقت تو وہ مذہب کو بیکار ہی سمجھتے ہیں، لیکن جب ان کی طاقت کافی بڑھ جائے گی اور ملک پر قبضہ ہوجائے گا تو مذہب اور آزادی ضمیر پر ویسے ہی پابندیاں عاید کریں گے جس طرح روس میں آج کل ہیں۔ دوئم ان کی سیاسی حل سے ہمیں کلی اتفاق نہیں ہے، وہ ناقابل عمل مساوات

چاہتے ہیں، ہم تعاون، وہ ذاتی ملک اور جائداد کو فنا کر دینا چاہتے ہیں، ہم صرف سرمایہ داری کے اس حصہ کو برا اور مضر سمجھتے ہیں جس کے ذریعہ قوم کی اقتصادی حالت کو نقصان پہنچتا ہے اور چند اشخاص کا ملکی اختیارات یا مالیات پر قبضہ ہو جاتا ہے۔

لیکن علم، عقل، ہنر، محنت اور تجارت کا ذریعہ افراد کے لئے دولت حاصل کرنا اور اس کو صحیح راہ میں صرف کرنا ملک اور قوم کے لئے بلاشبہ نہایت ہی مفید اور مستحسن ہے۔

بہرحال مسلم لیگ کا نصب العین خواہ مخواہ کسی کی مخالفت پر مبنی نہیں ہے، مسلم لیگ اسی نوع کے سیاسی و معاشی پروگرام کا ساتھ دے گی، جس کے اصول اسلامیان ہند اور دوسری قوموں کے لئے مفید ہوں، وہ کاشتکاروں کو زمینداروں کی زیادتی اور ناانصافی سے پریشان اور بدحال نہ ہونے دے گی اور ناقابل عمل وعدوں سے ان کو خوش کرکے پھر انہیں مایوس نہ کرے گی اور نہ خواہ مخواہ ہر زمیندار کو ظالم قرار دے کر ان کی آمدنی کے ذرائع کو بند کر دینے کے لئے کاشتکاروں کو مشتعل کرے گی اور غیر دانشمندانہ صلاح دے گی۔

مزدوروں کے ساتھ خاص ہمدردی رکھتے ہوئے اور ان کی ترقی اور اصلاح میں آسانیاں پیدا کرتے ہوئے صنعت اور تجارت کو بھی جو ان کا ذریعہ معاش ہے تباہی سے بچائے گی۔"

خطبہ استقبالیہ کے بعد صدر اجلاس مسٹر جناح نے زبانی تقریر کی، شکریہ و تعزیت کے تمہیدی فقروں کے بعد ۱۹۳۶ء میں مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کا سرسری تذکرہ کیا کہ وہ کس طرح برطانوی اور کانگریسی کیمپوں میں منقسم تھے اور کس طرح کانگریس کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ پھر اس امر پر مسرت ظاہر کی کہ:۔

اب حالات بدل گئے، اور یہ بات صاف صاف ظاہر ہو گئی اور کسی کو شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ کانگریس مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتی ہے اور اس کا مدعا ہے کہ ان کو پیش خدمت کی طرح استعمال کرے پست کرکے اپنے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور

کرے ان پر حکومت کرے اور ہندو راج قائم کرکے ان کو رعایا بنائے۔"

اس کے بعد کانگریس کی ان ترغیبات کی جو مسلمانوں کو دی جاتی ہیں اس طرح قلعی کھولی کہ:-

"آپ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ آپ کو اس کا علم ہونا چاہیے کہ کانگریس نے ہندو مسلم اتحاد کی تمام امکانی امیدوں کو ٹھیک فسطائی اندازسے پاش پاش کردیا۔ کانگریس مسلمانوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتی وہ مسلمانوں سے اپنی شرائط منوانا چاہتی ہے اور جیسا کہ صدر مجلس استقبالیہ نے کہا ہے کہ کانگریس یہ چاہتی ہے کہ مسلمان سمجھوتہ کو اس طرح قبول کریں کہ گویا وہ اکثریت کا عطیہ ہے۔ کانگریس ہائی کمانڈ یہ بھی دعویٰ پیش کرتا ہے کہ وہ تمام ہندوستان کی طرف سے بولنے کے تنہا حقدار ہیں۔ وُہی ہیں جو کوئی نتیجہ خیز عمل کرسکتے ہیں۔ دوسروں کو لازمی ہے کہ اس طاقتور بادشاہ سے عطیہ لیں۔ کانگریس ہائی کمانڈ یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی تمام شکایات رفع کرے گا اور وہ یہ توقع کرتا ہے کہ مسلمان اس اعلان کو مانیں۔ لیکن مجھے یہ کہنے دیجئے کہ مسلمان عطیہ نہیں چاہتے۔ مسلمان مراعات نہیں چاہتے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ اس ملک میں ہم اپنے پورے پورے حقوق حاصل کریں گے اور ہم وہ حقوق ہی کے طور پر چاہتے ہیں عطیات اور مراعات کے طور پر نہیں چاہتے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے۔ اس ملک میں چار طاقتیں مصروف عمل ہیں۔ اوّل حکومت برطانیہ دوسرے ہندوستانی ریاستوں کے فرمانروا اور باشندے۔ تیسرے ہندو اور چوتھے مسلمان ہیں۔ کانگریسی اخبارات جتنا جی چاہے شور مچائیں اور صبح و شام دوپہر اور رات کے اڈیشن نکالا کریں اور کانگریس کے لیڈر جتنا جی چاہیں چلائیں کہ کانگریس قومی انجمن ہے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ جھوٹ ہے۔ کانگریس اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ عمومیت کے ساتھ ہندو جماعت ہے یہ ایک حقیقت ہے اور کانگریس کے لیڈر اس سے واقف ہیں۔ چند مسلمانوں کی موجودگی سے اور چند مسلمانوں کی جو گمراہ ہیں اور گمراہ کئے ہوئے ہیں اور پھر ان چند کی موجودگی سے جو محض بعید از قیاس مقاصد کے لئے کانگریس میں

داخل ہیں نہ وہ قومی انجمن بنتی ہے اور نہ بن سکتی ہے۔ میں چیلنج کرتا ہوں کوئی اس سے انکار کرے کہ کانگریس بڑی حد تک ہندو جماعت نہیں ہے۔ میں دریافت کرتا ہوں کیا کانگریس مسلمانوں کی نیابت کرتی ہے؟ کیا کانگریس عیسائیوں کی نیابت کرتی ہے؟ (نہیں) کیا کانگریس اچھوتوں کی نیابت کرتی ہے؟ (نہیں) کیا کانگریس غیر برہمنوں کی نیابت کرتی ہے (نہیں) میں کہتا ہوں کانگریس سارے ہندوؤں کی بھی نیابت نہیں کرتی ہندو مہا سبھا اور لبرل فیڈریشن کے متعلق پھر آپ کیا کہئے گا؟ کانگریس بلاشبہ ملک میں سب سے بڑی واحد پارٹی ہے۔ مگر وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے وہ تکبر سے جو دعویٰ چاہے کرنے لگے۔ کانگریس ہائی کمانڈ طاقت کے نشہ میں شرابی آدمی کی طرح جس دعوے سے اس کا جی خوش ہو وہ کیا کرے لیکن ایسے دعووں سے کانگریس کی حیثیت نہیں بدل سکتی وہ جیسے بڑی حد تک ہندو جماعت ہے رہے گی چند لوگوں کو ایسے دعووں سے چند روز کے لئے دہوکہ دیدیا گیا ہوگا لیکن مسلمانوں کو زیادہ عرصہ تک دہوکہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔ میں قائل ہو گیا ہوں اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی قائل ہو گئے اور بہت سے آئندہ قائل ہو جائیں گے جو اب تک ایمانداری سے غلطی پر ہیں وہ نہیں جو اپنے عقائد میں بددیانت ہیں، وہ بھی اس کے قائل ہو جائیں گے کہ کانگریس قومی انجمن نہیں ہے۔ ہمارے ملک کی بدنصیبی ہے یہ ایک سانحہ ہے کہ کانگریس ہائی کمانڈ نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ اس ملک کے تمام دوسرے فرقوں اور کلچروں کو پامال کر ڈالے اور صرف ہندو راج قایم کرے۔ وہ سوراج کی گفتگو کرتے ہیں ان کا مقصد ہندو راج ہے وہ قومی حکومت کی گفتگو کرتے ہیں مگر ان کے ذہن میں ہندو گورنمنٹ ہے۔ لیکن بلبلا جلد ہی ٹوٹ دیا گیا اُس طاقت کے نشہ میں سرشار جوان کو چھ یا سات صوبوں کی اکثریت کے ساتھ نئے دستور سے ملی ہے۔ کانگریس کے دعوے کی پول جلد ہی کھل گئی۔“

پھر ہندی اور ترنگے جھنڈے ہندی ہندوستانی اور واردہا اسکیم کے متعلق کانگریس کی جد جہد اور اس کے خلاف مسلمانوں کے رویہ پر توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ:۔

”ساری صورت حال ایک فقرہ میں بیان کی جا سکتی ہے۔ آج کی ہندو ذہنیت

اور ہندو نا و یہ نظر کو باحتیاط مرتب و قایم کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو اس پر مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ نئے حالات کو منظور کریں اور کانگریسی لیڈروں کے احکام کے سامنے سر تسلیم جھکا دیں، یہ ہندو نا و یہ نظر مسلمانوں کی زندگی میں مخل ہو رہا ہے۔ مسلمان اپنی روز مرّہ کی زندگی میں ہندو تصورات اور مطمح نظر قبول کرنے پر مجبور کئے جا رہے ہیں۔ کہیں مسلمانوں نے بھی ایسا کیا ہے۔ کہیں مسلمانوں نے ہندوؤں کو مسلم کلچر اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس پر بھی مسلمانوں نے جہاں کہیں اس کے خلاف کہ ان پر ہندو کلچر مسلط کیا جا رہا ہے خفیف سا بھی احتجاج کیا ہے۔ تو ان کو فرقہ پرست اور امن شکن قرار دیا گیا ہے اور کانگریسی گورنمنٹ کے جابرانہ نظام کو ان کے خلاف حرکت میں لایا گیا۔"

پھر انھوں نے مسلمانوں کی کچھ حال کی سیاسی بیداری اور ہندوؤں کے اخلاقی و سیاسی احساس کی ضروری صفت اور اس کی طاقت کی تعریف کرکے کہا کہ:۔

"یہی ان کی پشت پر قوت ہے یہی طاقت میں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی پیدا ہو جائے جب آپ یہ طاقت پیدا کرلیں گے تو یقین کیجئے کہ جو آپ چاہتے ہیں آپ کو حاصل ہوگا۔ سروں کا شمار بہت اچھی چیز سہی لیکن یہ قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کے لئے آخری حکم نہیں، آپ کو ابھی قومی خودی اور قومی تشخص پیدا کرنا ہے یہ بہت بڑا کام ہے اور جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ آپ ابھی اس کی سرحد میں داخل ہوئے ہیں مگر مجھے کامیابی کی بہت بڑی امید ہے۔ جو ترقیاں اس وقت تک ہو چکی ہیں وہ بھی حیرت انگیز اور کرامت ہیں۔

یہ حیرت انگیز مظاہرہ جو اس وقت ہمارے سامنے ہے کبھی میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ تاہم آپ ابھی اپنی مہم کی سرحد پر ہیں "

اس کے بعد مجلس مضامین میں پیش ہونے والے مسائل میں سے فلسطینی مظالم پر خیال رجوع کراتے ہوئے کہا کہ:۔

"ہماری تمام ہمدردیاں ان بہادر غازیوں اور شہیدوں کے ملئے ہیں جو غاصبوں کے مقابلہ میں آزادی کی جنگ کر رہے ہیں ان کے ساتھ وہ تمام ہولناک ناانصافیاں

ہو رہی ہیں جو برطانوی شہنشاہی اس بین الاقوامی صیہونیت کو راضی کرنے کے لئے ایجاد کر سکتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں اشرفیوں کی تھیلیاں ہیں"

پھر دیسی ریاستوں اور بالخصوص مسلم ریاستوں میں کانگریس کے طرز عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے لیگ کی پالیسی کی وضاحت کی کہ:

"مسلم لیگ کے موجودہ دستور کے مطابق مسلم لیگ دیسی ریاستوں کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتی لیکن میں اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر کانگریس نے حیدرآباد جیسی مسلم ریاستوں میں ان مفسدانہ مقاصد کے لئے جو واقعی اس وقت اس میں حرکت پیدا کر رہے ہیں اپنی سرگرمیاں ترک نہ کیں تو مسلم لیگ از سر نو ریاستوں کے معاملات میں دخل دینے کی پالیسی پر غور کرے گی۔ ہم ہندو ریاستوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کو جابروں کے رحم پر اور ان کے رحم پر جو انہیں آسامی بنانا چاہتے ہیں نہیں چھوڑ سکتے"

اب مسٹر جناح نے فیڈریشن کے اہم مسئلہ پر کسی قدر تفصیل سے اظہار رائے کیا اور سلسلہ کلام میں کہا کہ:۔

"ایک مسئلہ فیڈریشن (وفاق) کا ہے جس پر آپ کو غور کرنا ہے۔ کانگریس یہ کہتی رہے کہ ہم فیڈریشن ہرگز منظور نہ کریں گے مگر میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں کانگریس کے اس قول کا اعتبار نہیں کرتا۔ کانگریس اس پر اسی طرح پھسل پڑے گی جس طرح وہ دستور کے صوبجاتی جزو پر پھسل پڑی۔ ابھی حال میں مسٹر سوباش چندر بوس نے بآواز بلند یہ کہا ہے کہ انفرادی طور پر فیڈریشن کے متعلق بعض کانگریسی کچھ ہی کہتے رہیں۔ لیکن کانگریس نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ فیڈریشن کو کامل طور پر مسترد کر دے میں ایسے اعلانات کا اعتبار نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں کہ کانگریس کے لیڈر نے کہا ہے کہ فیڈریشن کی نظر ثانی اور ترمیم سے ہم مطمئن ہو جائیں گے۔ اور اگر انتخابی اصول منظور کر لیا گیا تو اس سے کانگریس کا مخالفانہ جوش ٹھنڈا ہو جائے گا۔ ایک کانگریس کے لیڈر نے کہا ہے کہ اگر وفاق کی اسکیم میں اس طرح ترمیم کر دی جائے کہ اس سے کامل آزادی

کامفر حاصل ہو جائے تو کانگریس اس کو چلا سکتی ہے اور اس طریقہ پر فیڈریشن کی ناقابل پسند اور ناقابل عمل اسکیم قابل پسند اور قابل عمل ہو سکتی ہے۔ کانگریس کے طرزِ عمل میں میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ خیال مضمر ہے کہ مسلمانوں کو ایک مرتبہ اور حکمہ دیا جائے۔ میں ان لیڈروں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو اب زیادہ عرصہ تک دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ مسلمان اب وہ نہیں رہے ہیں جو وہ اب سے تین سال قبل تھے۔

کانگریس کی ساری چال یہ ہے کہ اس نہایت قابل اعتراض خراب اور متعفن دستور کو جس سے وہ نفع اندوز ہونا چاہتے ہیں اس کو بڑی اکثریت حاصل ہو جائے اور اگر یہ اکثریت حاصل ہو جائے تو پھر وہ نہایت جوش و مسرت سے فیڈریشن قبول کر لیں گے اور ازاں بعد وہ مسلمانوں کی کلچر اور تنظیم کو تباہ کرنے اور کانگریس کے نظام کو فسسٹ نمونہ پر ایک اور محض مستبدانہ نظام بنانے کی غیر منصفانہ اسکیم پر عمل کریں گے۔ اور پھر وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ ہندو راج قائم کرنے کے مطمح نظر کو پورا کریں۔

کانگریس کے لیڈر اس سے واقف ہیں کہ ان کا مقصد کیا ہے۔ انہوں نے سات صوبوں میں اکثریت حاصل کر لی ہے اور ان صوبوں میں ان کی حکومتیں قائم ہیں۔ اب صرف چار صوبے باقی رہ گئے ہیں۔ کانگریس لیڈروں کی للچائی ہوئی نظریں ان چاروں صوبوں پر بھی پڑ رہی ہیں۔ بار بار وہ اس کا اعلان کرتے ہیں کہ غیر کانگریسی صوبوں کی گورنمنٹیں ڈگمگا رہی ہیں اور اس کے باوجود ڈگمگا رہی ہیں کہ وہاں ان کی اکثریتیں ہیں اور بس وہ تنکے کے سہارے جی رہی ہیں۔ کانگریس کے لیڈروں کا خیال ہے کہ ان چار صوبوں میں وزارتیں زیادہ مضبوط نہیں ہیں۔ لیکن کانگریس کے لیڈروں کی چالیں ایسی نہیں ہیں جنہیں کوئی سمجھ نہ سکے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان میں سے جس صوبہ میں ہو سکے کانگریس کی گورنمنٹ قائم ہو جائے۔ میں نے صوبہ سرحد کے بعض دوستوں سے گفتگو کی۔ مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ اس صوبہ میں ہمارے ہم مذہبوں سے یعنی بھولے پٹھانوں سے یہ کہا گیا ہے کہ کانگریس عوام کا بھلا چاہتی ہے اور مسلم لیگ شہنشاہیت کی موئید اور حلیف ہے۔ کیا میں نے کبھی ایک مرتبہ

بھی اور کبھی ایک موقعہ پر بھی مجلس واضعان قانون کے اندر یا باہر شہنشاہیت کی تائید کی ہے ؟ اور بھلا شہنشاہیت کا حلیف تو میں کیوں ہی ہونے لگا تھا !
(آوازیں "نہیں - نہیں")

مجھے کامل یقین ہے کہ مسلمانوں میں سے بعض کبھی پہلے بھی اس خیال کے تھے کہ برطانوی شہنشاہی سے اتحاد قائم کر کے مسلمان اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں تو اب ان کا یہ مغالطہ کامل طور پر دور ہو گیا ہے، میں کہتا ہوں کہ مسلم لیگ کسی سے اتحاد کرنے والی نہیں ہے لیکن مسلمانوں کے نفع کے لئے وہ شیطان سے بھی اتحاد کرلے گی۔

یہ اس وجہ سے نہیں کہ ہمیں شہنشاہیت کے ساتھ عشق ہے لیکن بساط سیاست پر ہر ایک کو اپنی چال چلنی تو ضرور ہے - میں کہتا ہوں کہ مسلمان اور مسلم لیگ کا صرف ایک حلیف ہے اور وہ مسلم قوم ہے اور وہ ایک اور صرف ایک جس سے وہ مدد کے متوقع ہیں اللہ ہے (پرجوش نعرے) ۔

فیڈریشن کے متعلق کانگریس کی چالیں بہت صاف ہیں - اگر کانگریس کو وفاق کے نظام پر اختیار حاصل ہو جائے تو پھر ان براہ راست اور بالواسطہ اختیارات کے ذریعہ جو وفاقی گورنمنٹ کو حاصل ہوں گے - کانگریس بنگال میں آنریبل مسٹر فضل الحق کی گورنمنٹ اور پنجاب میں آنریبل سر سکندر حیات کی گورنمنٹ کو بے حقیقت اور عضو معطل کر دے گی - نتیجہ یہ ہوگا کہ سات صوبے تو ان کو اس طرح سے ملے کہ وہاں غالب اکثریت ان کو خدا کی طرف سے عطیہ ہے اور چار صوبے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے کانگریس ہائی کمانڈ کے باجگذار بن جائیں گے۔

اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو کانگریس کا اصل مقصد یہ ہے - اس لئے میں کہتا ہوں کہ کانگریس کی طرف سے فیڈریشن کی مخالفت دیانت پر مبنی نہیں ہے - کیا میں اس پر قابل الزام ہوں ؟ کیا غلطی پر ہوں ؟ (آواز "نہیں - نہیں")

مسٹر جناح کی یہ تقریر انگریزی میں تھی جس کو ختم کر کے انہوں نے اردو میں اپنے

درمیان اتحاد کرنے کی اپیل کی اور کہا کہ :-

جس وقت کانگریس نے رابطہ عوام کی تحریک شروع کی تو اسی نے چیلنج کیا کہ مسلمان عوام کانگریس کے ساتھ ہیں۔

یو۔پی کے ضمنی انتخابات میں اور بالآخر ہزاری باغ میں مسلمانوں نے کانگریس کے اس چیلنج کا معقول جواب دیدیا اور اب کانگریس نے مرکزی اسمبلی کے تازہ انتخاب میں (مولانا شوکت علی کی جگہ) مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلہ میں اپنا امیدوار کھڑا کرنے سے بھی انکار کردیا اب بتائیے کہ اس مسلم رابطہ عوام کا کیا حشر ہوا۔ اب کانگریس کو چاہیئے کہ اس رابطہ کے معاملہ سے ہاتھ اُٹھائے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ سمجھوتہ کا اب کوئی امکان نہیں کانگریس اپنے طور پر مسلمانوں کو اپنی طرف کرلے گی اب ہم اس "اپنے طور پر" کو بھی دیکھیں گے۔

پھر اپیل کی کہ وہ اپنے نفع کے لئے مسلم لیگ میں داخل ہوں۔ ۲۷ و ۲۸ دسمبر کو بحث و مباحثہ کے بعد متعدد اہم تجاویز اجلاس عام نے پاس کیں۔ مختلف صوبجات میں جو مظالم ہوئے ان کے متعلق ورکنگ کمیٹی کو اختیار دیا گیا کہ جب وہ ضروری سمجھے ڈائرکٹ ایکشن (براہ راست کارروائی) کا فیصلہ کرلے۔

وفاقی اسکیم یعنی فیڈریشن کو مکرر ناقابل قبول تسلیم کرکے صدر مسلم لیگ کو اختیار دیا گیا کہ اس اسکیم کے کسی ایسے بدل کو تلاش کریں جس سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے مفاد کا پورے طور پر تحفظ ہوجائے۔

بلوچستان کے لئے آئینی ترقی کا مطالبہ اور آزاد علاقہ سرحد میں برطانیہ کی پالیسی پر احتجاج کیا گیا، برما میں ہندوستانیوں پر جو مظالم کے گئے ان کی نسبت غم و غصہ کا اظہار کرکے مسلمانوں کو تلافی نقصان کے لئے معقول تاوان دئے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔

بیگم حبیب اللہ نے اس مفاد کا ایک رزولیوشن پیش کیا کہ خواتین کی ایک ضمنی کمیٹی بنائی جائے جو عورتوں کو زیادہ سے زیادہ لیگ میں شامل کرے گویا کہ لیگ کا

زنانہ شعبہ ہو۔ چنانچہ یہ رزولیوشن منظور ہوگیا، ایک کمیٹی بنا دی گئی اور اس کے عہدہ داروں کا بھی انتخاب ہوا۔

فلسطین کے متعلق بھی ایک طویل قرارداد پاس کی گئی۔

جنگ عظیم کے بعد شام و فلسطین ٹرکی سیادت سے خارج ہو کر فرانس و انگلستان کے انتداب میں آگئے جن پر ان کی ایک مستبدانہ حکومت قایم ہوگئی برطانیہ نے اس لڑائی میں یہودیوں کی امداد اور اُن کی دلجوئی کے لئے ایک اعلان جو اعلان بالفور کے نام سے موسوم ہے شایع کیا تھا جس سے کہ گویا فلسطین کو وطن الیہود بنانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اہل فلسطین کو فوجی طاقت سے مغلوب کر کے یہودیوں کو اس ارض مقدس پر بسنے کی آزادی دیدی گئی اور خارجی حملہ آوروں سے حفاظت کی جگہ برطانیہ نے غیر ملکی یہودیوں کو فلسطین پر حملہ کر دینے میں سہولت اور امداد پہنچائی اور ملک کے اصلی باشندوں کے خلاف ان پردیسیوں کی حفاظت کی۔ اعراب فلسطین ابتدا ہی سے برطانوی انتداب کے خلاف تھے اور آغاز ۱۹۱۹ء سے انہوں نے مسلسل کوشش کی تھی کہ نمایندہ حکومت قائم کی جائے انتداب ختم کیا جائے اور یہودیوں کی درآمد کو روکا جائے۔ مسلمانوں کے ساتھ عیسائی عرب بھی ہم نوا اور ان کی کوششوں میں برابر کے شریک رہے مسلم اور عیسائی اداروں نے اپنے مطالبات کے متعلق ہر قسم کی آئینی تدابیر کیں عربی وفود نے انگلستان میں آکر نہایت پرزور طریقہ سے اپنے مطالبات کا بار بار اعادہ کیا مگر برطانوی حکومت کی پالیسی جابرانہ اور تشدد آمیز رہی اور اس نے انتداب کی تمام شرائط کو پس پشت ڈالدیا عراق کا انتداب ختم کر دیا گیا تھا اور شام کا فرانسیسی انتداب ذمہ دار مقامی حکومت میں بدل لیا تھا لیکن فلسطین کا انتداب روز بروز سخت اور قوی کیا گیا۔

اعلان بالفور کے وقت صاف طور پر سمجھایا گیا تھا کہ صرف ان یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے دیا جائے گا جن پر جنگ عظیم کا اثر پڑا تھا لیکن وہ تمام یہودی جو جرمن سے نکالے گئے یا جن کے لئے دوسرے ممالک میں جگہ نہیں رہی فلسطین میں آباد کئے

گئے اور وہ اس ملک کے ہر شعبہ زندگی اقتصادی و صنعتی و زراعتی سب پر حاوی ہو گئے۔
اور فلسطین کے اصلی باشندے اقتصادی و سیاسی طور پر روز بروز تباہ ہوتے رہے اس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں بے چینی اور ناراضی بڑھتی گئی اور اُسکو دور کرنے کے لئے حکومت
نے ہمیشہ مجلس اقوام کی کونسل کے اختیارات کی آڑلی اور بار بار ایسی تاویلات پیش
کیں کہ جو الفاظ کا گورکھ دھندا تھیں۔ تاآں کہ اس بے چینی نے ایک مسلح شورش کی صورت
اختیار کرلی اور ملک بدامنی اور خوں ریزی کا منظر بن گیا۔ اب اس شورش کو دبانے
کے لئے تقریباً تمام ملک میں مارشل لا جاری کر دیا گیا۔

ان واقعات نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی مضطرب کر دیا اور ہر سیاسی
عقیدہ کی جماعتوں اور سرکردہ اصحاب نے صدائے احتجاج بلند کی۔ ستمبر ۱۹۳۶ء میں
مختلف صوبوں کے چند ممتاز اصحاب کا ایک وفد بھی وائسرائے کی خدمت میں گیا
اور اس نے ایک ایڈریس میں پوری حالت کا خاکہ کھینچ کر حکومت کو توجہ دلائی لیکن
کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔

اسی سال کلکتہ میں بھی ایک آل انڈیا فلسطین کانفرنس منعقد ہوئی جس نے
طے کیا کہ مسئلہ فلسطین کے متعلق مسلمانان ہند کا نقطہ نظر پیش کرنے کے لئے انگلستان اور
اور اسلامی ممالک کو ایک وفد بھیجا جائے۔

لکھنؤ کے اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ ۱۹۳۷ء میں مذکورہ بالا قرارداد کی تائید
و توثیق کی گئی لیکن وفد کی روانگی سے پہلے مصر میں اس صورت حال پر غور و بحث کرنے
کے لئے ممالک اسلامیہ کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد کئے جانے کی تجویز ہو گئی
اور اس کے دعوت نامے ہندوستان میں بھی موصول ہوئے مسلم لیگ نے بھی اپنے
نمائندے[1] منتخب کر کے بھیجے۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں اس کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا آٹھ
ملکوں کے نمائندے آئے تھے سب نے اپنے اپنے ملک کا نقطہ نظر پیش کیا اور تمام

---

[1] (۱) مسٹر عبدالرحمان صدیقی رئیس وفد (۲) چودھری خلیق الزماں خاں (۳) مولانا فضل الحسن
حسرت (۴) مولانا مظہر الدین اڈیٹر رسالہ وحدت و الامان دہلی۔

حالات پر بحث و مباحثہ کے بعد ایک متفقہ قرارداد پاس ہوئی جس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ اس کانفرنس کا ایک وفد انگلستان جا کر اس قرارداد کو برطانوی حکومت کے سامنے پیش کرے چنانچہ سات ارکان کا انتخاب ہوا جن میں مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی اور چودھری خلیق الزماں بھی منتخب کیے گئے لیکن تین ارکان کو ان کی حکومتوں نے پروانہ راہداری و اجازت دینے سے انکار کر دیا اور ایک رکن بعض مجبوریوں سے شامل نہ ہو سکے دونوں ہندوستانی اور ایک مصری (رئیس وفد) روانہ ہو گئے۔ مگر لندن میں وزیر نو آبادیات نے ان کے ساتھ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا اور اس وفد کا مقصد پورا نہ ہوا۔

اسی اثناء میں حکومت کی طرف سے عرب اور یہود کی لندن میں ایک مشترکہ کانفرنس کا اعلان ہوا جس کا مدعا تھا کہ حتے الامکان دونوں قوموں کے مشورے و رضامندی سے معاملات کا تصفیہ کیا جائے۔

دوران قیام میں ارکان مسلم لیگ نے وزیر ہند نائب وزیر ہند وزیر نو آبادیات اور نائب وزیر خارجہ سے غیر ضابطہ ملاقاتیں کیں۔ ماہرین سیاست اور اخبار نویسوں سے ملے اور نہایت قابلیت سے مسلمانان ہند کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کی۔

وزیر ہند نے ان کو مطلع کیا کہ:۔

"گورنمنٹ ہند صورت حالات سے باخبر ہے اور اس نے ملک معظم کی گورنمنٹ کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ مسئلہ فلسطین پر مسلمانان ہند کے محسوسات میں روز بروز تلخی و ناگواری بڑھ رہی ہے"

نیز یقین دلایا کہ:۔

"میرا فرض ہوگا کہ مسلمانان ہند کی رائیں حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کر دوں"

ان ارکان نے جنیوا جا کر لیگ اقوام کی اسمبلی میں بھی اس معاملہ کو پیش کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ پھر وہ انقرہ اور دمشق گئے اور بیروت میں مفتی اعظم فلسطین سے ملے انہوں نے بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور وفد کی خدمات لندن کا شکریہ ادا کر کے خواہش کی کہ:۔

"مسلم لیگ اور مسلمانانِ ہند کو جنہوں نے معاملۂ فلسطین میں ان کی زبردست تائید کی ہے ان کا یہ پیغام پہونچا دیں کہ وہ دل سے ان کے ممنونِ منت اور احسان مند ہیں"

وفد مسلم لیگ نے اپنی مکمل رپورٹ ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کی اور مسلم لیگ نے اجلاس عام پٹنہ میں ایک قرارداد کے ذریعہ فلسطین میں برطانیہ کے ظالمانہ طرزِ عمل اور برطانوی پالیسی اور منصوبوں کی مذمت اور مجاہدینِ فلسطین کے استقلال و بہادری اور قربانیوں پر مبارکباد دیتے ہوئے حکومت کو تنبیہ کیا گیا کہ اگر اس نے فوراً یہودیوں کی درآمد نہ روکا اور مجوزہ کانفرنس میں مفتی اعظم فلسطین اور اصلی نمایندگانِ عرب و مسلمانانِ ہند کو شریک نہ کیا تو یہ کانفرنس جھوٹی نمایش اور بے نتیجہ ثابت ہوگی"

اس امر کا اعلان بھی کیا گیا کہ:۔

"مسئلہ فلسطین مسلمانانِ عالم کا بین الاقوامی مسئلہ ہے اگر حکومت برطانیہ نے اب بھی عربوں کے ساتھ انصاف نہ کیا اور مطالبات پورے نہ کئے تو ہندوستانی مسلمان ہر اس بین الاقوامی پروگرام کے ماتحت جس کی ترتیب میں ان کا مشورہ شریک ہوگا فلسطین کو برطانوی شہنشاہی کے پنجہ اور یہودیوں کے غاصبانہ قبضہ سے نجات دلانے کے لئے ہر ممکن تدبیر کو جائز سمجھیں گے اور کسی قربانی سے دریغ نہ کریں گے اور فلسطین کو ارضِ یہود بنانے کا جو تصور برطانیہ اور امریکہ کے بعض حلقوں میں پیدا ہو گیا ہے اگر اس کو عملی صورت میں لانے پر اصرار کیا گیا تو اس سے مستقل بدامنی اور فساد کی راہیں ہمیشہ کے لئے کھل جائیں گی"

لندن میں جو فلسطین کانفرنس منعقد ہو رہی تھی اس میں مسلم لیگ نے اپنی نمایندگی کے متعلق کوشش کی اور صدر لیگ نے وزیر ہند کو پرزور طریقہ سے اس مطالبہ پر توجہ دلائی۔ لیکن وزیر ہند نے جواب میں اطلاع دی کہ:۔

"ملک معظم کی حکومت اس سے قبل احتیاط کے ساتھ اس نوعیت کے انتظامات کے امکان پر غور کر چکی ہے لیکن قوی وجوہ کی بنا پر جو کانفرنس کی عام ترکیب سے علاقہ رکھتے ہیں بڑے افسوس کے ساتھ اس نتیجہ پر پہونچی ہے کہ نمایندگی کی جو حدود اس سے قبل مقرر ہو چکی ہیں ان کو وسعت دینا ممکن نہ ہوگا۔ دوسری قابل لحاظ چیزوں سے قطع نظر آپ

اس بات کو محسوس فرمائیں کہ اگر کانفرنس کی ایک پارٹی کے متعلق اس نمایندگی کی بنیاد کو وسیع کر دیا جائے تو لازمی طور پر اسی طرح دوسری سمتوں میں وسعت کرنی پڑے گی لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ملک معظم کی حکومت برابر پورے طور پر باخبر رکھی گئی ہے اور برابر مسلمانان ہند کے خیالات پورے طور پر اس کو معلوم رہے ہیں اور یہ کہ ملک معظم کی حکومت نے برابر اس بات کو ذہن میں رکھا ہے اور آیندہ بھی برابر اس بات کو ذہن میں رکھے گی کہ کانفرنس کے سامنے جو مسائل درپیش ہیں ہندوستان کے مسلمان ان کے ساتھ کس قدر زبردست اہمیت وابستہ کرتے ہیں ملک معظم کی حکومت کو قوی امید ہے کہ کانفرنس مسئلہ فلسطین کا حل تلاش کرنے میں کامیاب ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مخالف مفادات کے درمیان مصالحت ہو جائے گی اور تمام دنیا کے مسلمان اس حل کو منصفانہ حل کی حیثیت سے قبول کریں گے۔"

مگر صدر مسلم لیگ نے پھر تار کے ذریعہ توجہ دلائی کہ:۔

"آپ نے اپنے جواب سے جس خوش خلقی کا اظہار فرمایا ہے میں اس کی بڑی قدر کرتا ہوں مجھے اس سے بڑی ہی مایوسی ہوئی کہ ملک معظم کی حکومت فلسطین کانفرنس میں اسلامی ہندوستان کو نمایندگی دینے کے لئے تیار نہیں ہے اسلامی ہندوستان کا دوسری پارٹیوں کے ساتھ تقابل نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ جنگ عظیم کے دوران میں مسلمانان ہند کے ساتھ معین وعدے وعید کئے گئے تھے فلسطین مسلمانوں کا قبلہ اول ہے اپنے مقامات مقدسہ کے ساتھ مسلمانوں کو عمیق اور اہم تعلق خاطر ہے میں ملک معظم کی حکومت سے پرزور اصرار کروں گا کہ ہماری درخواست کو پورا کیا جائے۔"

مجلس عالیہ عربیہ نے بھی ایک تار صدر مسلم لیگ کے پاس بھیجا کہ:۔

"مجلس عالیہ عربیہ فلسطین کو آپ کی اس درخواست پر بڑا اطمینان ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمایندگی فلسطین کانفرنس میں ہونی چاہئے۔ مجلس کو امید ہے کہ آپ اپنے مطالبہ پر مُصر رہیں گے حکومت برطانیہ جو دنیا بھر کے یہودیوں کی نمایندگی قبول کر چکی ہے اس کو اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ فلسطین کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کو اور خاص کر ارض مقدس جو اسلام کا پہلا قبلہ ہے اس کے ساتھ مسلمانان ہند کے تعلقات کو نظر انداز کرے۔

لیکن حکومت نے اس مطالبہ کو منظور نہیں کیا اور پھر یہ مسئلہ مسلم لیگ کے مستقل مسائل میں شامل ہوگیا اور باوجودیکہ جنگ یورپ کے باعث پالیسی میں کچھ تبدیلی ہوگئی ہے اور انتداب کا معیار مقرر کرکے یہودیوں کی درآمد پر کچھ روک قائم کی گئی ہے لیکن اس سے مسئلہ کی اہمیت میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا اور مسلم لیگ کا پرزور مطالبہ قایم ہے۔

"نیشنل گارڈ" عرصہ سے ہندوؤں نے نوجوانوں میں نیم فوجی قسم کی تنظیم شروع کردی تھی ان کی مختلف قسم کی اور مختلف ناموں سے جمعیتیں قائم ہوگئیں کانگریس نے بھی ایک کانگریس ملیشیا قائم کی اور عرض وطول ہند میں والنٹیر بھرتی کرکے ان کی ٹریننگ کا ایک نظام بنایا۔ مسلمانوں میں خلافت تحریک کے زمانہ میں خلافت والنٹیروں کی کچھ تنظیم کی گئی تھی اور بہت اچھا تجربہ ہوا تھا۔ خاکساروں کی جماعت بھی اپنے ایک خاص نظام کے ماتحت قائم تھی۔ لیکن مسلم لیگ کی نگرانی و تحت میں بھی ایک ایسی جماعت کی ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ چنانچہ صوبہ سندھ میں سیٹھ عبداللہ ہارون نے نیشنل گارڈ کے نام سے ایک جماعت مرتب کی اور پھر صوبہ میں یہ تحریک جاری ہوگئی۔

بمبئی میں مسٹر اصفہانی نے ایک آل انڈیا اسکیم تیار کی اور پٹنہ کے اجلاس میں مختلف مقامات سے جو دستے آئے اور انہوں نے جس مستعدی و اطاعت اور ڈسپلن کے ساتھ خدمات انجام دیں ان کو دیکھکر اس تنظیم کی ضرورت و اہمیت کا عام احساس تیز ہوگیا۔

۱۵ اپریل ۱۹۳۹ء کے اجلاس کونسل آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ دہلی میں یہ قرارداد پاس ہوئی کہ "آغاز کار کے طور پر تمام صوبوں میں براہ راست صدر صوبہ کی نگرانی میں مسلم نیشنل گارڈ کی جمعیتیں قائم کی جائیں" اسی قرارداد میں ایک کمیٹی بنائی گئی جو تمام ہندوستان میں نیشنل گارڈ کے متعلق یکساں بنیادی اصول و شرائط مرتب کرے۔

چنانچہ یہ اصول و شرائط وضع کئے گئے اور ہر صوبہ کے اضلاع میں نیشنل گارڈ قائم ہوگئے۔"

باب سیزدہم

اب سے تیس سال قبل ۱۹۰۶ء میں جب مسلم لیگ کی تاسیس ہو رہی تھی۔ نواب وقار الملک نے اپنی ایک تقریر میں مستقبل پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

"اُس وقت وہی قوم ملک پر حکمراں ہوگی جو تعداد میں ہم سے چار حصّہ زیادہ ہے اور اب صاحبو ہر ایک شخص کو چاہئے کہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اُس وقت ہماری حالت کیا ہو جاوے گی، اُس وقت ہماری حالت یہ ہوگی کہ ہماری جان ہمارا مال ہماری آبرو اور ہمارا مذہب سب خطرہ میں ہوگا آج جب کہ برٹش کی زبردست سلطنت اپنی رعایا کی محافظ ہے جس قسم کی مشکلات بسا اوقات ہم کو اپنے ہمسایہ دوستوں سے پیش آتی رہتی ہیں اس کے نظائر کم وبیش ہر صوبہ میں موجود ہیں تو وائے اس وقت پر جب کہ ہم کو ان لوگوں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے جو اورنگ زیب کا بدلہ صدہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہیں"

چنانچہ وہ وقت آیا اور کانگریسی وزارت کے ہر صوبہ میں آئینی و غیر آئینی طریقوں سے مسلمانوں کا ستایا جانا شروع ہوا اور بعض جگہ تو معلوم ہونے لگا کہ ایک طے شدہ پالیسی کے ماتحت یہ طریق عمل اختیار کیا گیا، اس کی ابتدا بندے ماترم کے ترانے کانگریسی جھنڈے کی عظمت منوانے اردو کو مٹانے سے کی گئی اور مرور ایام کے ساتھ کانگریس کے اسٹیم رولر کی حرکت میں تیزی آتی گئی۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ بہت سے مقامات کی کانگریس کمیٹیوں میں شریف نما بدمعاش اور جرائم پیشہ بھی داخل ہو گئے، جنہوں نے خود کانگریس کے اندر بھی جعل و خیانت اور سرقہ سے پاک نہیں کیا اور کانگریس کے باہر بھی ارتکاب جرائم میں نہایت دلیر رہے۔ اکثر تجارتی اغراض اور کاروبار کے فروغ کی غرض سے شامل ہوئے اور

کانگریس کی بعض تحریکات اور اثر و اقتدار سے ۱۹۳۷ء سے ہر جائز و ناجائز نفع کمایا اور انہوں نے رام راج کے کارندوں کی حیثیت سے مسلمانوں کے ستانے کی نئی نئی ترکیبیں نکالیں۔ صوبہ متحدہ میں عہدہ داران اضلاع مقامی کانگریسیوں سے مشورہ کرنے پر حکماً پابند بنائے گئے اور انہوں نے اس حکم کا نہایت ناجائز فائدہ اٹھایا بعض جگہ سرکاری تحقیقاتوں کے متوازی تحقیقاتیں ہونے لگیں اور افسران متعلقہ کو متاثر کرنے کے لئے ان کے سامنے پیش کیا گیا، اس سلسلہ کی بعض کارروائیوں پر ہائی کورٹ کو مجبوراً توجہ کرنی پڑی اپریل ۱۹۳۹ء میں سشن جج ہردوئی نے ایک مقدمہ قتل کے فیصلہ میں ایک کانگریسی کی حرکات کا ذکر کرتے ہوئے ریمارک کیا کہ :-

"کانگریس کے ذمہ دار لیڈر اُن حرکتوں کو جو سکھ لال جیسے لوگ کانگریس کی نمائندگی کے ادعا پر کرتے ہیں ختم کریں گے کیوں کہ اس طرح یہ لوگ خلاف قانون حرکتیں کرتے ہیں اور پھر پولیس اور عدالتوں کا کام بھی خود کرنے لگتے ہیں۔"

تعصب کا یہ زہر طلبا تک پھیل گیا چنانچہ ۱۹۳۹ء کے ہندو مسلم فساد بنارس میں ہندو یونیورسٹی کے طلبا نے نہ صرف یونیورسٹی سے باہر حصہ لیا بلکہ اپنے معدودے چند مسلمان رفقا کی عافیت بھی خطرہ میں ڈالدی جو اتفاقاً ہی اس یونیورسٹی میں داخل تھے، اور حدود یونیورسٹی میں گویا یونیورسٹی اتھارٹیز کی امان میں تھے۔ مگر اتھارٹیز نے کوئی نوٹس نہ لیا اسی فساد میں جب پولس کی گولی سے ایک طالب علم مارا گیا تو اس کو شہید قوم کا درجہ دے کر اس کی ارتھی کے ساتھ بلا استثنےٰ تمام طلبا اور اسٹاف کو شرکت کا حکم دیا گیا، حالات نے اس درجہ نزاکت اختیار کرلی کہ خود مسٹر پنتھ (سابق) وزیر اعظم بطور خود بنارس پہنچے اور پھر صیغہ راز میں ہی سب کچھ ہو کر چند دن کو یونیورسٹی میں تعطیل کردی گئی۔

۶ ۲ار جنوری ۱۹۳۹ء کو نمائش علیگڈھ میں شام کے وقت ڈنگل کے واسطے کے دروازہ پر مسلم یونیورسٹی اسکول اور سیوا سمتی اسکاؤٹس کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا۔ سیوا سمتی والوں نے ان طلبا پر ڈنڈوں سے حملہ کیا۔ جس میں ایک ہندو سب انسپکٹر پولس اور ایک کانسٹبل نے اسکاؤٹس کی اعانت کی یہ خبر نمائش میں پھیلی

اور چونکہ یونیورسٹی کے طلبا کی ایک بڑی تعداد اس وقت حسب معمول نمائش میں تھی ان میں
ہیجان پیدا ہوا اور وہ پولس والوں کی سزا کا مطالبہ کرنے کے لئے پولس کیمپ کے سامنے
جمع ہو گئے جو نمائش کے متصل مغربی جانب تھا۔ پرو وائس چانسلر اطلاع پاتے ہی موقع پر
پہونچے اور انہوں نے طلبا کو ہدایت کی کہ فوراً ہاکی کے میدان میں چلے جائیں جو نمائش
کے باہر مشرقی جانب تھا۔ طلبا نے تعمیل کی۔ بعد ازاں افسران یونیورسٹی کلکٹر (مسٹر مہتا)
اور سپرنٹنڈنٹ پولس، کلکٹر کے خیمہ میں مضروب طلبا کا معائنہ کرنے کے لئے جمع ہو گئے
اس عرصہ میں اور بہت سے طلبا یونیورسٹی سے آگئے۔ پرو وائس چانسلر نے فوراً پراکٹر
کو ان کی فہمایش و نگرانی کے لئے بھیج دیا اتنے میں یہ افواہ پھیلی کہ نصف درجن طلبا کو پولس
نے حراست میں لے لیا ہے اور ان کے ساتھ برا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس لئے طلبا
کی ایک بڑی تعداد اصلیت معلوم کرنے کے لئے کیمپ کے قریب جمع ہو گئی اس وقت
ایک نوجوان پولس افسر نے پانچ فیر کئے اور طلبا پر لاٹھی چارج کا حکم دیا جس کا طلبا نے
بھی مشتعل ہو کر جواب دیا۔

چند منٹ بعد ہی پولس کیمپ کی دو تین چھولداریوں میں آگ لگی۔ کلکٹر اور
پرو وائس چانسلر دونوں کیمپ کی جانب گئے۔ آگ بہت جلد بجھا دی گئی اور پرو وائس
چانسلر کے سمجھانے سے طلبا اپنے وارڈنوں کی معیت میں جو موقع پر پہنچ گئے تھے یونیورسٹی
کو واپس چلے گئے۔ چند پولس والے بھی زخمی ہوئے اور طلبا کے بھی چوٹیں آئیں۔ جن میں
سات بری طرح زخمی تھے۔ جو کچھ پولس کیمپ میں ہو رہا تھا اس سے نمائش میں ایک
پریشانی تو ضرور ہوئی لیکن کسی قسم کی بدامنی نہیں پھیلی حتےٰ کہ بدستور دکانیں کھلی رہیں۔
اس واقعہ کے متعلق صبح کو ایک سرکاری قسم کا تار شائع ہوا۔ جس میں بتایا گیا
کہ "طلبا نے نمائش میں آگ لگا دی" لیکن ایسوشی ایٹڈ پریس کا تار جس میں پورا
حقیقت واقعہ درج تھی روک لیا گیا۔ اور جو کچھ شائع ہوتا رہا وہ سرکاری زبان ہی
سے تھا۔

غرض نتیجہ میں یونیورسٹی سے حکومت نے ڈھائی ہزار روپیہ بطور تاوان

وصول کیا۔ اور اس تاوان سے زیادہ افسوسناک واقعہ یہ ہے کہ چند کانگریس زدہ اصحاب نے قومی ادارہ کے ساتھ وفاداری کے خلاف رویہ اختیار کیا ۔

اس صوبہ میں قربانی گاؤ کے سلسلہ میں نہایت مفسدانہ اور اشتعال انگیز کارروائیاں ہوئیں ۔ مسلمانوں پر کئی جگہ حملے ہوئے قصابوں سے گائیں چھینی گئیں بعض رقبات میں دفعہ ۱۴۴ عائد کر کے قربانی مسدود کی گئی اور ایک مقام مصطفےٰ آباد کے تمام مسلمان مردوں کو جیل بھیج دیا گیا اور عورتوں اور بچوں کا بھی کوئی نگراں نہ رہا ایک مسجد میں عید الضحےٰ کی رات کو سور کاٹ کر ڈال دیا گیا۔ ایک مقام پر عید کی نماز نہ پڑھنے دی۔ غرض اسی قسم کے مظالم کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ جن اخبارات نے ان مظالم کو شائع کیا انہیں پورے اقتدار حکومت کو کام میں لا کر مرعوب و تباہ کرنے کی تدابیر کی گئیں ۔

کانپور میں مسلم لیگ کا بہت زور تھا اور یہ بات حکومت اور عام کانگریسیوں کو کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی ۔ عوام کے دلوں میں گذشتہ فساد کا بھی عناد بھرا ہوا تھا سب اس دور میں مسجد کے سامنے نماز کے وقت ایک جلوس نکالنے کی تجویز کی گئی اور پہلے سے مسلمانوں کو مرعوب کرنے اور اُن پر حملہ کرنے کی تیاری کر لی گئی افسران ضلع اس جلوس کے خلاف تھے لیکن وزارت کے ایما سے مجبور رہے نتیجہ میں جلوس نکلا اور شدید فساد ہوا جو پولس کے قابو سے باہر ہو گیا اور مسلمانوں کا خون گویا کہ ارزاں تھا وزیر اعظم اطلبہ فریبی کے لئے خود کانپور تشریف لے گئے مگر ایوانِ وزارت سے غیر آزاد تحقیقات سے افسران ضلع کی حمایت کی گئی ۔

اسی طرح ٹانڈہ میں جو فساد ہوا اور اس میں مسلمانوں کا کشت و خون کیا گیا اس کے ذمہ دار بھی مسلمان ہی قرار دئے گئے۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی تحقیقات پر ان کا احتجاج ذرہ برابر موثر نہ ہوا بلکہ وزارت پر گراں گزرا اور پھر وہ اپنی مصلحتوں کی بنا پر خاموش ہو گئے۔ اس صوبہ کے فسادات میں جان و مال کا جس قدر نقصان ہوا اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف بنارس و کانپور کے ان اعداد کو دیکھ لینا

کافی ہے جو سنہ ۱۹۲۹ء کے شروع کے ہیں یعنی (۱۱۰) ہلاک (۳۴۰) زخمی (۲۵۴۸) گرفتار ہوئے۔
اُن مسلم اخبارات کا گلا گھونٹنے میں بھی کوئی کسر نہ رکھی گئی جو مسلم لیگ کے مقاصد کی حمایت کرتے تھے۔

صوبہ بہار میں جس قسم کے مظالم کا سلسلہ قائم ہوا وہ بھی کچھ کم عبرتناک نہیں مسٹر سید عبدالعزیز بار ایٹ لا نے اپنے خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ اجلاس مسلم لیگ میں نہایت جامع طور پر کہا تھا کہ:۔

"برادران ملت! میں چند لفظوں میں بعض مقامی شکایات کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول کرانی چاہتا ہوں۔ بہار کے مسلمان اقلیت میں ہیں ان کی آبادی تقریباً ۱۴ فی صدی ہے۔ ان کی اقتصادی اور تعلیمی حالت اچھی نہیں ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان حالات میں بھی ان کے اندر بہت سی خوبیاں موجود ہیں اگرچہ انقلاب زمانہ کی وجہ سے ان کا پہلے جیسا اثر نہیں۔

آج انتہائی دکھ کے ساتھ مجھے اس تلخ حقیقت کا اعلان کرنا پڑتا ہے کہ کانگریسی حضرات نے کراچی کے بنیادی حقوق کے طے شدہ اعلان کو طاق نسیاں کا گلدستہ بنا دیا۔ آج قربانی کے مسئلہ میں رسم و رواج کی ایسی قید لگائی جا رہی ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی فرائض کو برت نہیں سکتا۔ یہ فرائض رواج پر منحصر نہیں اور نہ اکثر جگہوں میں رواج کا ثبوت دیا جا سکتا ہے۔ چونکہ یہاں قربانی عام طور سے گھروں کے اندر کی جاتی ہے اور اگرچہ کیدار کو اس کی اطلاع بھی ہوئی تو عام طور پر ہندو چوکیدار اور ہندو پولیس افسران ہونے کے باعث بہت سے علاقوں کی قربانیوں کا اندراج تھانہ کے رجسٹر میں نہیں ہوتا۔ اور پولس کی مصلحت بھی زیادہ تر یہی ہے کہ کم سے کم جگہوں کے متعلق قربانیوں کا اندراج ہو۔

کیا یہ چیز قابل غور نہیں کہ ایک طرف تو غیر رواداری کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کی فراخ دلی اور رواداری کا یہ انداز کہ انہوں نے صوبہ کے کسی حصہ میں ہندوؤں کے کسی حق پر حملہ نہیں کیا اور نہ کسی طرح بھی ان کو دکھ پہنچایا سوائے اس

کے کہ بعض جگہوں پر مسجد کے سامنے باجے کے ساتھ جلوس گزارنے پر جواب بہ کثرت نکلنے لگے ہیں۔ اعتراض کیا اور کہیں کہیں اس میں کچھ جھگڑے بھی ہو گئے لیکن ہم لوگوں کی صلح و ہدایت کی وجہ سے اب کوئی مسلمان جلوس اور باجے پر مزاحم نہیں ہوتا۔"

دفعہ ۱۴۴ کا تیر کانگریسی وزارت کے ترکش سے جس تیزی اور کثرت سے مسلمانوں پر چلا ہے اس کی کوئی مثال نہیں اسی طرح امن عامہ کا بہانہ کر کے متفرق جگہوں پر مسلمانوں کو اپنے شعائر اور حقوق کی ادائیگی سے جس طرح روکا گیا ہے اس کا تذکرہ بھی ناقابل بیان ہے ہندوؤں کے بعض متعصب طبقہ نے مسلمانوں پر جو دل آزار اور تباہ کن حملے کئے ہیں ان کی سزا نہ کر کے بے گناہ اور کمزور مسلمانوں کو دی گئی ہیں مسلمان اب صرف قربانی کے فرائض سے روکے نہیں جاتے بلکہ ان کی غذاؤں پر بھی پابندیاں لگائی جا رہی ہیں اس قسم کا تشدد اور کھانے پینے کی آزادی میں ناجائز رکاوٹ صرف مضحکہ انگیز ہی نہیں بلکہ ایک ظالمانہ اور شرمناک طریقہ انسانی حقوق کے لوٹنے کا ہے۔"

سب سے بدترین صوبہ صوبہ متوسط و برار ثابت ہوا جہاں ۹۰ فیصدی سے زیادہ ہندو آبادی ہے اور ہر قسم کا اس کو دفتری اقتدار نیچے سے اوپر تک ہے، اور اسی صوبہ میں مستقر حکومت سے قریب تر ضلع میں گاندھی جی کا آشرم ہے!

اس صوبہ کے وزیر اعظم مصرا پر ایک کانگریسی ممبر نے ہی ایک نابالغ مسلمان لڑکی کے ساتھ مسلسل زنا بالجبر کا الزام لگایا اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے پولیس کے روزنامچہ کی عکسی نقلیں پیش کیں۔ نیز توجہ دلائی کہ وزیر مذکور اس کارکارڈ تلف کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور اب شعبہ پولس بھی ان کو سپرد کر دیا گیا ہے۔ بڑے اصرار کے بعد ملزم کے طرفداروں میں سے ہی چند آدمی چن کر ان کی تحقیقاتی

نوٹ۔ اس صوبہ کی مظالم کی بھی جامع رپورٹ "شریف رپورٹ" کے نام سے دو حصوں میں شائع کی گئی ہے جو ایک عبرتناک داستان ہے۔

کیٹی بنائی گئی اور نتیجہ ظاہر تھا کہ وہ بے قصور قرار دیا گیا۔

اس صوبہ کے مظالم کی داستان طویل میں لبوا چاندوسہ کا واقعہ تو کانگریس کی مزعومہ جمہوریت اور انصاف کے لئے ایک بدی لعنت ہے، ۱۸ مارچ ۱۹۳۵ء کو ہندو مسلم فساد ہوا جس میں ایک کانگریسی جو ایسے فسادات کا بانی تھا مارا گیا۔ ۱۸ کو گیارہ مسلمان گرفتار کئے گئے ۲۰ مارچ کو صوبہ اسمبلی میں تحریک التوا پیش ہوئی اور سخت اشتعال انگیزی کی گئی ایک ممبر نے کہا کہ "ہمیں مسلمانوں کے دماغ سے غرور کا نشہ اتارنے کے لئے اپنے ہاتھ سخت کر لینے چاہئیں، یہ باتوں سے ماننے والے نہیں۔"

۱۹ کو وزیراعظم موقع پر گئے۔ ۲۴ کو تعزیری پولس لبوا میں مقرر کی گئی اور اس کا صرفہ مسلمانوں پر ڈالا گیا اور اس کے لئے جائدادیں قرق کی گئیں۔ اپریل کے اوائل میں ۲۳۰ یعنی تمام بالغ مسلمان آبادی کو شناخت کی پریڈ کے لئے جمع کر کے دھوپ میں رکھا گیا۔ جس میں ۷۰ سالہ ضعیف اور ۱۲ اور ۱۴ سال کی عمر کے لڑکے بھی شامل تھے اب ۱۴۵ مسلمان حراست میں لئے گئے اور حوالات میں جو ۲۰×۲۰ فٹ کی تھی بند کئے گئے اور اور پوری رات بلا آب و دانہ رکھا گیا۔ آخر میں ۲۴ مسلمانوں پر مقدمہ چلایا گیا اور سشن جج کی عدالت سے ۲ کو سزائے موت اور ۱۴ کو حبس دوام کی سزا ہوئی۔ مگر عدالت اپیل سے سب بری کر دئے گئے۔ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلہ میں اسمبلی کی تقریروں پر بھی ریمارک کیا کہ:۔

دوران بحث میں متعدد ممبروں نے اس قسم کی تقریریں مناسب خیال کیں کہ گویا جرم کی پوری پوری نوعیت ان کو معلوم ہے۔ اور ایک ممبر تو اپنی رائے کے اظہار سے بھی نہ چوکا کہ فلاں شخص نے قتل کیا ہے۔ اس مباحثہ میں خود وزیراعظم نے بھی "بلا تامل قتل" کا لفظ استعمال کیا اور یہ ظاہر کیا کہ یہ محض ایک بلوہ کی واردات نہیں بلکہ ایک ایسا قتل ہے جس کی پیش بندی خوب سوچ سمجھ کر کی گئی تھی۔ جس کا وقوع نہایت بے رحمی کے ساتھ ہوا۔ وزیراعظم نے اس امر کے متیقن بیانات پیش کئے کہ مسلمانوں نے جگدیو پراؤ مثیل کے قتل کی سازش کی تھی۔ اور قتل کے طریقہ کو خوب سوچ سمجھ کر تجویز کر چکے

تھے اور وہ اس کے قتل کے لئے مسجد کی کمین گاہ میں چھپے بیٹھے تھے۔ اور یہ کہ مسلمان ہی ظالم تھے اور ما قبل سازش قتل کے مطابق انھوں نے بغیر کسی چھیڑ چھاڑ کے جگدیو پر حملہ کیا تھا۔"

وزیر اعظم کے مذکورہ بالا بیانات میں سے ہر ایک بعد میں غلط اور بے بنیاد ثابت ہوا، اور ناگپور ہائی کورٹ کے ججوں نے اپنے فیصلہ میں تو نہایت وضاحت کے ساتھ اصلیتِ معاملہ پر روشنی ڈالی۔ چیف جسٹس نے یہ رائے ظاہر کی کہ:-

"یہ مقدمہ انتہائی اندوہناک ہے۔ یہ لفظ جو میں نے اوپر استعمال کیا اس وقت بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ ہم اس مقدمہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس میں ۴۲ افراد قتل کے الزام میں عدالت میں لا کر کھڑے کئے جاتے ہیں گواہ پر گواہ۔ جن کی شہادتیں جھوٹی ہیں، خانہ شہادت میں گواہوں میں ترمیم و اصلاح کرا کے پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان گواہوں میں سات گواہ ایسے ہیں جو بچے یا نوجوان ہیں جن کو جھوٹی شہادت کے لئے سکھا پڑھا کر اپنی پوری کوشش اس غرض سے کی گئی ہے کہ دوسرے انسان کے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑ جائے۔ خواہ وہ بے قصور ہو یا مجرم۔ انسانی اخلاق کی پستی اب اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے لئے بچوں کی جھوٹی گواہی کا سہارا ڈھونڈا جائے۔" دوسرے فاضل جج نے ہندو گواہان استغاثہ کی شہادت کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "اس مقدمہ کے خانہ شہادت میں مسلسل جھوٹ کا طومار بندھا ہوا تھا" لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ کانگریس گورنمنٹ نے اپنی مرضی و منشا کے مطابق تحقیقات کرانے کی غرض سے اس سب انسپکٹر کا جو لبوا میں تھا۔ تبادلہ کر دیا کیونکہ اتفاق سے وہ مسلمان تھا، اور بقول جج ہائی کورٹ کے "شروع ہی سے معاملہ کی تحقیقات اسکے ہاتھ سے نکال لی گئی" فاضل ججوں نے اپنے فیصلہ کا خلاصہ ذیل کے الفاظ میں پیش کیا ہے: "گواہی کا گڑھا جانا اور اس کے اسباب بالکل واضح ہیں۔ اکرام الدین۔ مقدمہ ہذا کا ایک خاص ملزم مسلمانوں کا لیڈر تھا، اس لئے پانچ اہم گواہ اس مقدمہ میں پیش

کیے گئے جنہوں نے اس لیڈر کی جان لینے کے لیئے دیدہ و دانستہ جھوٹی گواہی دی یہ تمام مبالغہ آمیز گواہیاں مذاق پر محمول کی جا سکتی تھیں بشرطیکہ ان سے اندوہناک نتائج کا اندیشہ نہ ہوتا اس سازش کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ۶ شخصوں کو سزائے موت اور ہم ا کو عمر بھر قید کی سزا دیدی گئی تھی۔ اس مقدمہ کو ایک تہوار کی طرح سمجھا گیا تھا۔ جس میں ہر گواہ دوسرے گواہ پر اس بارہ میں سبقت لیجانا چاہتا تھا کہ کتنے زیادہ مسلمانوں کو وہ پھانسی گھر تک پہونچا سکتا ہے۔ سچائی، عزت، انسانی زندگی کا احترام اپنے حلف کا پاس یہ سب چیزیں بالکل نظر انداز کر دی گئی تھیں " آگے چلکر جج صاحبان فیصلہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں " جب شہادتوں کو مسخ کرنے اور انصاف کے مقررہ طریقے کو بدلنے کے لیئے اس قسم کی یک طرفہ بلکہ بعض لحاظ سے مجرمانہ تحقیقاتی کارروائیاں (جن کا مشاہدہ اس مقدمہ میں ہم نے کیا) کی جائیں گی۔ تو ایسے ہی نتائج نکلنا اغلب ہیں ہم نے ان گواہوں کے بیانات میں اس امر کی گہری سازش موجود پائی ہے کہ جس طرح ہو سکے ہر مسلمان کو پھنسایا جائے۔ محض اس لیئے کہ وہ مسلمان ہے "

یہ واقعہ واردھا سے قریب ہی ہوا تھا لیکن گاندھی جی نے اپنی خاموشی سے مُہر پسندیدگی لگا دی کیونکہ وزیر اعظم ان کا خاص منظور نظر تھا۔ بایں ہمہ اُنہوں نے مذاکرات متعلقہ جنگ کے سلسلہ میں ایک بحری تار انگلستان کے اخبار نیوز کرانیکل میں شائع کرایا کہ برطانیہ جمہوریت کو تباہ کر رہا ہے۔ اور برطانیہ اگر ہندوستان کے ساتھ انصاف نہیں کرتا تو وہ خود بھی انصاف طلب نہیں کر سکتا، گویا جمہوریت کانگریس ہے اور کانگریس ہی انصاف ہے۔

اس بیان کا مدعا چونکہ اہل انگلستان کو مغالطہ میں ڈالنا تھا، مولوی **فضل حق** نے گاندھی جی کو ایک مفصل مکتوب مفتوح مورخہ ۱۰ اگست میں جو تمام اخبارات میں شائع کیا گیا واقعہ لیوا اور ججوں کے فیصلہ کی طرف توجہ دلا کر ان کی جمہوریت اور کانگریس کے انصاف اور خود اُن کی خموشی کی قلعی کھولی تو اس کے جواب میں انہوں نے وندھا کے طرز عمل کی حمایت کرتے ہوئے وزیر اعظم کی تقریر کو صرف سیاسی غیر دانشمندی قرار

دیا اور سارا الزام پولس پر ڈال کر اس کو معمولی کارروائی کے دائرہ میں رکھ دیا۔ ہائی کورٹ کے ریمارک کو برسبیل تذکرہ کہہ کر اور عدالتی وقعت سے انکار کرکے خود کورٹ کو مورد الزام بنا دیا کہ اس نے پنڈت شکلا کا جواب لئے بغیر یہ ریمارک کئے اور اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ تمام ملزم بالکل چھوٹ گئے۔ اور اگر یہ ملزم نہ تھے تو دوسرے مسلمان تو تھے؟

ہائیکورٹ کے فیصلہ کے بعد پولس کے رویہ کی تحقیقات کے لئے حکومت نے بمبئی ہائی کورٹ کے ججوں کا ایک کمیشن مقرر کیا اس نے بھی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس اور دو سب انسپکٹروں کے خلاف الزامات عائد کئے اور اس کے طرز عمل پر سخت نکتہ چینی کی اس کے بعد بغیر حکومت نے تعزیری پولس ہٹالی اور جو صرفہ مسلمانوں سے لیا گیا تھا اس کی واپسی کا حکم صادر ہوگیا۔

یہ واقعہ عبرت انگیز ہے کہ جمعیت العلما نے باوجودیکہ کانگریس کی خیمہ بردار اور بقول خود مسلم جماعتوں میں کانگریس کی ہم نوائی کے اعتبار سے پیش پیش ہے" اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ جونپور میں ۹ رجون ۱۹۴۰ء کو ایک قرارداد میں مسٹر شکلا وزیر اعظم اور ان کے شرکا کے طرز عمل اور متعصبانہ ذہنیت کی پرزور مذمت کی اور ان کے خلاف تادیبی کارروائی کئے جانے کی تحریک کی لیکن قصر وارد ہا یا ایوان انند بھون پر کوئی اثر نہوا اور جمعیت کا مقصد بھی اس سے زیادہ نہ تھا کہ اس کی روئداد میں یہ قرارداد ثبت ہوجائے۔

اسی صوبہ میں کانگریسی دور وزارت سے کچھ قبل ہولی کے موقع پر ہندو مسلم فساد ہوا۔ ہندوؤں کے خفیف ضربات آئیں اور چار مسلمان جان سے مارے گئے، پولس نے دونوں کا چالان کیا۔ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں کچھ ہی زیادہ تھی۔ ہندوؤں میں چند سربرآوردہ اور مالدار ملزم تھے۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی اور سشن سپرد ہوا۔ اسی دوران میں کانگریسی وزارت قائم ہوگئی۔ نتیجہ مقدمہ صاف تھا کہ مسلمانوں کو کم اور معمولی جرمانہ کی سزا ہوتی اور ہندوؤں کو پھانسی اور حبس دوام تک، اب وزارت نے اس بات کو حیلہ بنا کر مقدمات کے جاری رہنے سے فضائے امن صاف نہ ہوسکے گی اور مقدمات اٹھا لینے سے فضا صاف ہوجائے گی۔ مقدمات اٹھا لئے اس طرح ہندو قاتل صاف

پہنچ گئے۔ مسلمانوں نے ہر چند مقدمات کی سماعت جاری رہنے پر اصرار اور اس حکم پر احتجاج کیا مگر شنوائی نہ ہوئی اور جبلپور میں فرقہ وارانہ عداوت کی فضا مستقل طور قائم ہو گئی۔
۱۹۳۷ء سے پہلے بھی بہت سے مقامات پر سخت فساد اور بلوے ہوئے تھے
لیکن کانگریسی دور وزارت کی تعداد و اہمیت سالہائے ماسبق پر فوقیت لے گئی۔ صرف صوبہ متحدہ میں ہی دو سال کے اندر اتنی تعداد تھی کہ جو سابق کی مجموعی تعداد سے بڑھ گئی۔
ان صوبوں کی بد امنی کا اندازہ مرکزی اسمبلی میں ڈیفنس سکریٹری کے ایک بیان سے ہوگا جو انہوں نے ایک سوال کے جواب میں دیا تھا، انہوں نے بتایا کہ:۔
"جولائی ۱۹۳۷ء اور جولائی ۱۹۳۹ء کے درمیان صوبجاتی حکومتوں کی درخواست پر آٹھ بار صوبہ متحدہ میں اور ایک بار صوبہ بہار میں فوج بھیجی گئی اور نو بار صوبہ متوسط و برار میں اور دو بار بمبئی میں فوج تیار کھڑی رہی، جولائی ۱۹۳۵ء سے جولائی ۱۹۳۹ء تک صوبہ متحدہ میں دس بار اور بمبئی میں ایک بار طلب کی گئی۔ اور بارہ مرتبہ صوبہ متحدہ میں دو بار بہار میں اور ایک بار صوبہ متوسط میں تیار رہی۔
جولائی ۱۹۳۵ء تا جولائی ۱۹۳۶ء کے درمیان ایک بار صوبہ متحدہ میں اور ایک بار بمبئی میں طلب کی گئی اور صوبہ متحدہ میں تین بار تیار رکھی گئی۔"
یہ اعداد خود بتا رہے ہیں کہ کانگریسی حکومتیں کس درجہ ناقابل اور متشدد رہیں، کوئی کانگریسی صوبہ ہڑتالوں کسانوں اور مزدوروں کے جھگڑوں فسادوں اور مختلف قسم کی بے چینیوں اور بد امنیوں سے خالی نہیں رہا، لا آیند آرڈر کی وہ تمام مشینیں مسلمانوں کے خلاف زیادہ تیزی سے متحرک رہیں جن کو کانگریس نے لعنتی کہا تھا۔
مسٹر گاندھی کے ایما سے ہی واردھا اسکیم تعلیم عام کی اشاعت و ترقی کے نام پر مرتب ہوئی جس کی نسبت مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اس کا لازمی نتیجہ مسلمانوں کی تعلیم ان کے تمدن

۱؎ اس اسکیم اور اس کے نتائج پر عبور حاصل کرنے کے لئے رسالہ طلوع اسلام دہلی کے مضامین اور کتابچہ واردھا اسکیم اور آل انڈیا مسلم لیگ کی رپورٹ مرتبہ کمیٹی تحقیقاتی کا مطالعہ کیا جائے۔

ومعاشرت اور روایات وزبان سب ہی کو برباد اور تباہ کرنا اور ان پر ہندوانہ کلچر روایات اور مذہبی معتقدات کا اثر ڈالنا مقصد تھا۔ اس اسکیم کو مسلمانوں کے سخت احتجاجات کے باوجود مختلف پیرایوں سے تمام کانگریسی وزارتوں نے نافذ کرنے کی کوشش کی گویا ایک نیا مذہب اور ایک نیا فلسفہ جو قدیم ہندویت کا نیا چولا ہے جبرًا مسلمانوں کے سر منڈھا گیا۔ مسٹر اچاریہ کرپلانی جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے تو واضح اعلان کر دیا کہ:۔

"کانگریس صرف سیاسی جماعت نہیں سیاست کی طرح وہ معاشرت کو بھی نئی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ جو لوگ اس کے معاشرتی اصولوں کو نہ مانیں ان کو کانگریس میں داخل نہ ہونا چاہئے۔ کانگریسی اسکیموں کا قلم کسی اور فلسفہ پر نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ فلسفۂ زندگی دنیا کے کسی اور فلسفہ زندگی کے ماتحت نہیں بنایا جاسکتا ہے ہر کانگریسی کو گاندھی جی کا فلسفہ ماننا اور تسلیم کرنا ضروری ہے"

اس اسکیم کے علاوہ صوبہ متوسط وبرار کے لئے ایک مخصوص ودّیا مندر اسکیم تیار کی گئی جو "قطعی ہندوانہ" تھی اور بہ زور حکومت مسلمانوں کو اس کے قبول کرنے پر مجبور کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ صورتاً وسیرۃً عقائد واعمال اور زبان و روایات غرض ہر بات کے لحاظ سے ہندوانہ رنگ میں رنگے ہوئے ہوں مگر اس کے خلاف بالآخر مسلمانوں نے براہ راست سول نافرمانی کا اعلان کر دیا اور اتنا عظیم الشان مظاہرہ کیا جو ہندوستان کی تاریخ میں کم نظر آتا ہے۔ حکومت بھی اس سے مرعوب ہوگئی۔ گورنر غور کرنے پر مجبور ہوا اور انجام کار جنرل سکریٹری مسلم لیگ (نوابزادہ لیاقت علی خاں) کی مداخلت ووساطت سے حکومت کے ساتھ ایک سمجھوتہ ہوا اور ودّیا مندر کی بلا ان کے سر سے ٹل گئی لیکن حکومت نے پھر اس کو لیت ولعل میں ڈالدیا تا آں کہ کانگریسی وزارت مستعفی ہوگئی۔

اسکیم کی ترتیب میں بھی ایک فریب اور درس عبرت ہے۔ اس کے لئے ایک مخصوص کمیٹی بنائی گئی جس کے صدر جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی کے شیخ (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں)

اور ایک ممبر پرنسپل مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج (خواجہ غلام السیدین) منتخب کئے گئے، ترتیب علیگڈھ میں ہوئی۔ ٹریننگ کالج کے بعض اساتذہ نے بڑے انہماک سے کام کیا۔

۱۷ ستمبر ۱۹۳۸ء کو شیخ جامعہ نے گاندھی جی کے سامنے تعلیمی کانفرنس میں جو واردھا میں منعقد ہوئی ایک رپورٹ کے ساتھ یہ اسکیم پیش کی جس میں ٹریننگ کالج اسٹاف کے دلی تعاون اور ان کے وقت وقابلیت اور تجربہ کے استعمال کا شکریہ تھا۔

گویا یہ اسکیم متحدہ قومیت کی آئینہ دار ہے جو مسلمانوں کے دو مستند تعلیمی اداروں کے قابل ترین مسلمانوں کے مشورہ و رہنمائی سے مرتب ہوئی ہے۔

اس فریب کی رسی اب اور دراز کی گئی۔ آغاز ۱۹۳۹ء میں بمقام اٹاوہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جس کے سکریٹری خان بہادر مولوی بشیر الدین منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ و اڈیٹر اخبار البشیر اور جوائنٹ سکریٹری مولوی نظام الدین نظامی اڈیٹر ذوالقرنین بدایوں ہیں[1] اس اجلاس میں جو زیر صدارت حافظ محمد ابراہیم وزیر صوبہ متحدہ منعقد ہوا۔ خلاف معمول متعدد کانگریسی مسلمانوں نے شرکت کی صوبہ بہار اور صوبہ متحدہ کے وزرا بھی رونق افروز ہوئے، ایک اجلاس میں یہ اسکیم پیش ہوئی لیکن دیگر مسلمانوں کی مداخلت نے اس کو پاس نہ ہونے دیا۔ پھر ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم صوبہ بہار کی خاص کوشش سے اکتوبر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد کیا گیا، اس اجلاس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن صدارت کا قرعہ مولوی ابوالقاسم فضل الحق وزیر اعظم بنگال کے نام نکلا۔ داعی کانفرنس ایک ناگزیر ضرورت کے عذر پر دہلی میں رہے اور شرکت نہ کرسکے، سالہا سال کے خلاف معمول کانفرنس میں ممتاز مسلمان ماہرین تعلیم کا مجمع تھا، صدر کے خطبہ میں دیگر مسائل تعلیم کے ساتھ ان اسکیموں پر بھی اظہار خیال کیا گیا تھا اور یہ ضروری انتباہ بھی تھا کہ:۔

اُس کا مجھے پورا احساس ہے کہ جن صوبوں میں کانگریسی حکومت قائم ہوگئی ہے

---

[1] ہشتادسالہ مولوی بشیر الدین اور اُن کے رفیق نظامی صاحب کچھ عرصہ سے کانگریس کے خاص مداحین میں ہیں اور ان کے اخبارات اس کے مبلغ اور کانگریسی حلقوں میں مقبول ہیں۔

وہاں وار دھا اسکیم کا نفاذ غالباً ہو کر رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں کانگریس کے ارباب حل و عقد کو تنبیہ کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر اس اسکیم کو مسلمانوں کی مرضی کے خلاف بہ جبر جاری کیا گیا تو جو بد دلی مسلمانوں میں پیدا ہوگی وہ ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں ایک وسیع خلیج بن کر حائل ہو جائے گی جس سے ملک اور قوم کے لئے بدترین نتائج پیدا ہوں گے۔ اکثریت والی قوم کو اس کا احساس چاہیئے کہ نشۂ حکومت و اقتدار سے چور ہوئے بغیر حسن سلوک، رواداری اور برادرانہ برتاؤ کے ذریعہ سے اقلیت کا اعتماد حاصل کرے۔

کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے ایک طویل الذیل ریزولیوشن پیش کیا جس میں وار دھا کی تعلیمی اسکیم کو مسترد کرتے ہوئے تمام ملک میں لازمی اور مفت تعلیم پر زور دیا گیا۔ محرک اور موید (ڈاکٹر مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو) کل ہند نے معرکہ کی تقریریں کیں اور ریزولیوشن پاس ہو گیا۔

یہ اجلاس نہایت ہنگامہ خیز تھا۔ مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیت علمائے ہند جب اس ریزولیوشن پر اظہار خیال کے لئے پلیٹ فارم پر تشریف لائے اور انہوں نے چند تمہیدی جملے کہے تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور آخر کار اُن کو مجمع کا رنگ دیکھ کر خاموش ہو جانا پڑا۔

ودیا مندر اسکیم پر اظہار ناپسندیدگی کا ریزولیوشن ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں نے پیش کیا اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے تائید کرتے ہوئے ان تمام واقعات کو بیان کیا جو اس کے متعلق صوبہ سی۔ پی میں پیش آئے تھے۔

ان اجلاسوں کے بعد جمعیت العلماء دہلی نے کچھ ترمیمی تجاویز کیں اور دھمکی بھی دی کہ اگر کانگریس نے ان کی تجاویز کے مطابق ترمیم نہ کر دی تو وہ سول نافرمانی کریں گے۔ امارت شرعیہ بہار نے بھی اس کے خلاف جد و جہد کی اور اپنی مراسلت بھی شائع کر دی۔

اسی سلسلہ تعلیم میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مکتبہ (بک ڈپو) کی طرف سے پانچ کتابیں ایک[1] مشترکہ عنوان نئی کتاب کے نام سے شائع ہوئیں جن میں اردو کو بگاڑ کر

---

[1] ماخوذ از اخبار منشور دہلی اکتوبر ۱۹۳۸ء۔

ایک جدید زبان ہندوستانی بنانے کی کوشش میں زبان کو ناہموار کر دیا۔ ہندی کے بے شمار الفاظ زبردستی ٹھونسے گئے ہندو معاشرت اور تمدن کی خوبی و فروغ خاص مقصد رکھا گیا اسلام و اسلامی معاشرت کو برائے بیت کر دیا اسی طرح تاریخی حصّوں میں یہی مقصد پیش نظر رہا، سیاسی نقطہ نظر سے وطن پرستی پر زور دیا گیا مگر گاندھی جی کے کا پرچار اور گاندھی جی کی متحدہ قومیت کی تخم ریزی اصل مقصود تھا۔

"مذہبی پیشواؤں میں سے ان کا حال دیا گیا ہے (۱) حضرت محمدؐ (۲) مہاتما گوتم بدھ (۳) حضرت زرتشت (۴) رامچندر جی (۵) حضرت عیسےٰ (۶) سری کشن جی۔

مہاتما گوتم بدھ کا حال بہت اچھے طریقہ سے دیا گیا اور ان کی تعلیم کا خلاصہ موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔" حضرت زرتشت" کے متعلق یہ چیز نمایاں کی گئی ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کو اچھا اور نیک بننا اور ایک خدا کی پوجا کرنا سکھایا" اور فرمایا کہ بس ایک خدا کو مانو۔ محتاجوں کی مدد کرو اور جانوروں پر رحم کھاؤ" ان کے پیروؤں کے متعلق لکھا ہے کہ آگ اور سورج کی ان میں بہت عزت کی جاتی ہے۔" رامچندر جی کا حال معروف عام کہانی کے طور پر ہے۔ حضرت عیسٰی کے حال میں اگرچہ ان کے نبی ہونے کا کوئی ذکر نہیں لیکن اتنا اشارہ ہے کہ انھوں نے خدا کے حکم سے اچھی اچھی باتیں اپنی قوم کو سمجھانی شروع کیں۔ ان کی تعلیم میں سے صرف یہی چیز انتخاب کی گئی ہے کہ جو تمہارے ساتھ برائی کرے اس کے ساتھ نیکی کرو۔ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو تم دوسرا گال بھی پیش کر دو" سری کرشن جی کے کارناموں کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ان کا حاصل زندگی یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی ساری عمر ظالموں اور پاپیوں کو سزا دینے اور مظلوموں کو مدد کرتے بیتی تھی"

ان سب کے مقابلہ میں رسول پاک صلعم کی سیرت مبارکہ کے متعلق جو لکھا گیا ہے وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ آنحضرت کا ذکر سب سے پہلے تو قاعدہ کے اندر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

حضرت محمدؐ غار میں خدا کی عبادت کرتے تھے:

کہنے کو تو جھٹ کہا جا سکتا ہے کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے! لیکن ظاہر ہے کہ بچوں کے

دل میں آنحضرت کی قبل از نبوت زندگی کے صرف ایک واقعہ کا نقش بٹھانا جس سے ذہن
راہبانہ زندگی کی طرف منتقل ہو اور یوں تعلیمات اسلامی کے بالکل منافی اثر قبول کرلے۔
کہا تک حق بجانب کہا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے..... حصے میں "حضرت محمدؐ" کے عنوان سے ایک سبق
ہے۔ تمام سبق میں کسی جگہ بھی اُن کے رسول یا نبی ہونے کا مطلق ذکر نہیں۔ ایک جگہ لکھا
ہے کہ "آپ نے چالیس برس کی عمر میں اپنا کام شروع کیا اور تریسٹھ برس کی عمر میں اس دنیا
سے سدھار گئے" لیکن یہ نہیں ظاہر کیا کہ آخر وہ کام کیا تھا۔ آپ کی سب سے بڑی تعریف
بس اس قدر کی گئی ہے کہ "مکے میں مسلمانوں کے سب سے بڑے سردار پیدا ہوئے"
ساتھ ہی آپ کی "اچھی باتوں" کے ضمن میں یہ لفظ بھی قابلِ غور ہیں۔ "اس پر
دشمن بہت گھبرائے۔ آپ کو روپے پیسے کا لالچ دیا اور کہا ہمارے سردار بن جاؤ پر یہ
خیال چھوڑ دو۔ لیکن آپ نے صاف جواب دے دیا"
آں حضرت صلعم کی تعلیمات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ
کہ "آپ اپنی دُھن میں لگے رہے کہ خدا کے بندے خدا کو ٹھیک پہچاننے لگیں"
تمام سبق میں لفظ اسلام سے پوری طرح اجتناب کیا گیا ہے اور اسلام کے پھیلنے
کا ذکر ان دلچسپ لفظوں میں کیا گیا ہے"
"مکے والوں پر اس مہربانی کا بہت اثر ہوا، انھوں نے پرانی برائیوں سے توبہ
کی۔ سب نیک ہوگئے۔ اور ہوتے ہوتے عرب کے سب شہروں میں نیکی پھیل گئی"
مختصر یہ کہ اس سبق میں آنحضرت کا تذکرہ عقیدت اور اثر سے بالکل خالی ہے
اور بالکل اس طرح ہے جس طرح خاکم بدہن کسی عام انسان کا ہو"
جامعہ ملیہ اسلامیہ سیاسی اغراض سے ترک موالات کے زمانہ میں مسلم
یونیورسٹی کو برباد کرنے یا یہ کہ حقیقی معنوں میں ایک آزاد مسلم ادارۂ تعلیم کا نمونہ
پیش کرنے اور مسلم طلبا میں اسلام کی حقیقی روح پیدا کرنے کے لئے قائم ہوا تھا،
اس کے اخراجات کی کفالت خلافت فنڈ نے کی اور عرصہ تک تقریباً دس ہزار روپیہ

سالانہ اس پر صرف ہوتا رہا مگر جب فنڈ کی حالت خراب ہو گئی تو اس کا اثر جامعہ پر بھی پڑا تا آں کہ ۱۹۲۵ء میں وہ علی گڈھ سے دہلی منتقل ہوا اور اب ایک خالص تعلیمی ادارہ بن گیا عرصہ دراز تک مسیح الملک حکیم اجمل خان مغفور اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کے اثر اور ذاتی امدادوں پر انحصار رہا۔ اسی زمانہ میں ایک مکتبہ بھی اس کی امداد کے لئے اور ایک فیاض امیر کی عنایت سے ایک اچھا پریس بھی جاری ہوا۔

ڈپٹی کمشنر اور چیف کمشنر دہلی کی تصدیق و سفارش پر چند اسلامی ریاستوں سے وقتاً فوقتاً امداد ملی، لیکن ڈاکٹر انصاری کی افسوسناک وفات کے بعد ہندوستانی سیاسیات کا رنگ بدلا اور کانگریس کو ارکان جامعہ کی خدمات کی ضرورت ہوئی، کانگریسی سرمایہ داروں نے وقتاً فوقتاً تھوڑی تھوڑی مالی امداد کی تا آں کہ کانگریس کا دور حکومت آیا، واردھا اسکیم مرتب کی گئی ادھر آریہ تحریک نے حیدر آباد میں خطرناک صورت اختیار کی اور خاص اثرات کے ماتحت وہاں سے ایک لاکھ روپیہ کی گرانقدر رقم مل گئی۔

بمبئی گورنمنٹ نے جامعہ کی ان کتابوں کو جن پر اس باب میں تنقید موجود ہے کورس میں داخل کرکے مالی امداد کا راستہ نکالا۔ یو۔ پی گورنمنٹ نے مکتبہ جامعہ سے پچاس ہزار روپیہ کی کتابیں خریدیں تاکہ ابتدائی مدارس کو بطور تحفہ حکومت عطا کی جائیں، اس بڑی مقدار میں معقول تعداد ان کتابوں کی تھی جو مسلمانوں کے خلاف سیاسی زہر پھیلانے کے لئے نہایت کارآمد تھیں۔ مکتبہ جامعہ ملیہ عرصہ سے ایسے لٹریچر کی اشاعت میں مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس بذل عنایت میں بعض مصنفین نے اسی قسم کا زہریلا لٹریچر پیش کرکے معقول فائدے حاصل کئے۔

بعض مسلم اخبارات بھی نظر لطف سے محروم نہ رہے۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ انتہائی کوشش کے باوجود انٹرمیڈیٹ کالج تو نہ بن سکا البتہ دو سال کے لئے اخبار البشیر کی خریداری منظور کی گئی، کیوں کہ اس نے مسلم لیگ کے خلاف زہر فشانی اور اس کے قائد اعظم کے متعلق دریدہ دہنی و افترا پردازی کو اپنی مستقل پالیسی قرار دے لیا ہے۔

اُردو کو مٹانے کا سوال نصف صدی ۱۸۶۷ء سے زیادہ عرصہ گذرا کہ پیدا ہو گیا تھا اور اس کے متعلق ہندوؤں کی ایک مسلسل و منظم جد و جہد جاری تھی آخرکار اس نے لسانی حدود سے تجاوز کر کے سیاسی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی، گاندھی جی کے اثر و اقتدار میں ترقی کے ساتھ ساتھ یہ جد و جہد بھی زیادہ منظم طریقہ سے کی گئی حتیٰ کہ خود انہوں نے ترویج ہندی کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جب کانگریسی وزارتیں قائم ہو گئیں تو اقتدار حکومت سے کام لیا گیا۔ تمام صوبوں میں اردو کو ختم کر کے بلکہ مقامی زبانوں کو بھی مٹا کر ترویج ہندی مطمح نظر بنگیا اور ودرانے بھی آزادی کے ساتھ ہندی پرچار کیا، صوبہ مدراس میں جہاں ۹۰ فیصدی کے قریب ہندو آبادی ہے ترویج ہندی کی ہندوؤں نے ہی سخت مخالفت کی مگر حکومت نے اس پاداش میں جیل کی سزاؤں تک کو جائز رکھا۔

لیکن انجمن ترقی اُردو کُل ہند نے بھی اس حالت کا زبردست مقابلہ کیا جس میں بہت سے ممتاز ہندوؤں اور بالخصوص ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت دتاتریہ کیفی نے بڑے عزم کے ساتھ اعانت کی۔ انجمن نے متعدد کتابچے شائع کئے اور ۱۹۳۹ء سے اخبار "ہماری زبان" شائع کر کے خالص لسانی نقطہ نظر سے تمام ملک میں حمایت و حفاظت اردو کا جذبہ پیدا کر دیا۔

ودّیا مندر اسکیم کے سلسلہ میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ایک طویل خط ستمبر ۱۹۳۸ء میں گاندھی جی کو لکھا تھا جس کا حسب ذیل اقتباس خصوصاً مسلمانوں کے لئے عبرت و بصیرت ہے:-

جنوری ۱۹۳۸ء سے سی پی کے مسلمان برابر شور مچا رہے ہیں لیکن ہائی کمانڈ توجہ نہیں دیتی۔ جنوری میں انجمن اردو ناگپور کا جلسہ ہوا اور ایک قرارداد آنریبل وزیر تعلیم کی خدمت میں بھیجی گئی پھر انجمن کے ایک رکن نے معزول شدہ مسلمان وزیر کی معیت میں گاندھی جی سے ملاقات کی، گاندھی جی نے تسلیم بھی کر لیا کہ واقعی ودّیا مندر تام بعض حیثیت سے قابل اعتراض ہے اور ایک وعدہ بھی کیا۔ پھر مارچ میں

مسلمانوں کا ایک عام جلسہ ناگپور میں ہوا انجمن ترقی اردو نے بھی دوبارہ ایک جلسہ کیا
لیجس لیٹو اسمبلی کے مسلمان ممبروں نے بھی اپنے دستخطوں سے اعلان کر دیا نیشنلسٹ
مسلمانوں کے ایک وفد نے شری بوس صدر کانگریس سے ملاقات کی اور
انھوں نے وفد کے مطالبات سے کامل اتفاق بھی ظاہر کیا۔ صوبے کے کانگریسی
مسلمانوں کی ایک کانفرنس نے بھی ودیا مندر کے خلاف قرارداد منظور کی اسی طرح
ایجوکیشنل کانفرنس برار نے بھی ودیا مندر اسکیم کے خلاف سخت رنج و افسوس
کا اظہار کیا یعنی جہانتک اس اسکیم کا تعلق ہے باوجود شدید سیاسی اختلافات
کے صوبے کے سب مسلمانوں نے ایک آواز ہو کر اس کی مخالفت کی۔ غل مچایا دہائی
دی کہ ہم کو اس اسکیم کی کسی کمیٹی تک میں نہ لیا گیا لیکن ادہر مصروفیت و مشغولیت میں
بے پرواہی و بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ملکی دھندوں کی اہمیت سے گویا زبان اردو
کی زبان بندی کا حکم مل چکا تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اقلیتوں کی زبان و تہذیب کی محافظ
ہے آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ میری انجمن کا نمائندہ قصبہ پانڈھرنا (ضلع چھندواڑہ)
کے مدرسہ میں پہنچا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ اسکول کے
شروع ہونے سے پیشتر ہندو اور مسلمان لڑکے سرسوتی کی مورت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر
پرارتھنا کر رہے ہیں مسلمان لڑکے ان مدرسوں میں پڑھکر اسلام تک بھول گئے ہیں اور
ب وہ سلام کی جگہ "نمستے" اور "رام کی جے" کہتے ہیں۔ کیا زبان اور تہذیب کی حفاظت
کے یہ ہی معنی ہیں؟

مہاتما جی! ہم نے ہر جائز اور آئینی کوشش کر کے دیکھ لیا آپ سے یہ آخری
زارش ہے اور اگر اس کے بعد بھی کوئی شافی جواب نہ ملا تو میں آپ کو بصد عاجزی
نبہ کرتا ہوں کہ پھر مسلمانوں کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ کار نہ رہے گا کہ وہ آپ
ی کے ہتھیار آپ کے مقابلہ میں استعمال کریں۔"

لیکن گاندھی جی نے جو اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولوی صاحب

موصوف کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ان واقعات کی تردید کی جو مسلمان بچوں کو مشرکانہ عبادت ورسوم کے متعلق بیان کئے گئے۔ لیکن جب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ جامعہ نے ان کو لکھا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ میں نے عبدالحق کا خط نہیں پڑھا، میں کیا کر سکتا ہوں خدا کرے جب میں اس دنیا سے اٹھوں تو لوگ یاد رکھیں کہ میری ساری عمر ہندو مسلمانوں میں اتفاق پیدا کرنے میں گذری

اگرچہ ۱۸۸۴ء میں لوکل سیلف گورنمنٹ کا سنگ بنیاد قانون کے ذریعہ سے رکھا گیا تھا مگر ۱۹۰۹ء کی اصلاحات سے قبل مسلمان ہر جگہ اپنے حقوق سے محروم تھے دراصل ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل ہی حکومت خود اختیاری کا زینہ یا تربیت گاہ ہیں اور انہیں میں باشندوں کی زندگی کی روزمرہ ضرورتوں کا تصفیہ ہوتا رہتا ہے، مثلاً ابتدائی تعلیم حفظان صحت، روشنی سڑکوں کی تعمیر و درستی، مذبح کی تعمیر، مقامی ٹیکس، ملازمت، نیلام، اراضی، اراضی نزول، منڈیاں اور دوکانیں وغیرہ۔ لیکن ہندو اکثریت نے ہمیشہ ان حقوق سے فائدہ اٹھایا اور مسلمان دور دور رکھے گئے۔

اب وقت آیا کہ مسلمان بھی ان اداروں میں داخل ہوں ۱۹۱۶ء میں صوبہ متحدہ کی کونسل میں جب میونسپل کا قانون پیش ہو رہا تھا تو راجہ تصدق رسول خاں تعلقدار جہانگیر آباد نے مسلمانوں کی نمائندگی کے متعلق ایک ترمیم پیش کی اور صلح پسند و منصف مزاج ہندو ممبروں نے تائید کی اسوقت حالت یہ تھی کہ صوبہ کی شہری آبادی میں تو مسلمان قریب ۴۰ فی صدی تھے۔ مگر منجملہ ۸۰ میونسپلٹیوں کے ۹۸۰ منتخب ممبروں میں ان کی تعداد صرف ۲۴۶ (۸، ۲۸) تھی اور خاص خاص اور بڑی میونسپلٹیوں میں مثلاً الہ آباد، فیض آباد میں تو ایک ممبر بھی منتخب شدہ نہ تھا اور باقی خال خال تھے نئے ایکٹ سے ممبروں کی کل تعداد ۹۴۸ کر دی گئی۔ جن میں مسلمان ۳۴۲ (۰۸، ۳۴) ہو گئے یعنی (۲۳، ۲) زیادہ اس تعداد سے جس کے کہ وہ مستحق تھے، پرانا ایکٹ ان کو ۹۴ ممبریوں سے محروم رکھتا تھا۔

لیکن ہندو اکثریت نے باوجودیکہ میثاق لکھنؤ ہو چکا تھا اس کو گوارا نہ کیا اور

خاص طور پر پیروان مسلک الہ آباد نے شورش کی اور صدا دی کہ ہندو خطرہ میں ہیں
اور ایک فوج کی فوج جوشیلے ہندوؤں کی صف بستہ ہوگئی اور کاشی میں تو اس
جذبہ نے سخت مخالفت کا رنگ اختیار کر لیا۔"

لوکل سیلف گورنمنٹ کے یہ اختلاف مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے نفاذ
کے بعد بھی قائم رہے اور اگرچہ جذبہ اتحاد ترقی پر تھا سیاسی اختلافات مٹائے
جا رہے تھے، لیکن دوسری طرف ردعمل بھی جاری تھا اور ادارات بلدیہ کے اجارہ
کال میں کسی طرح مسلمانوں کی مداخلت گوارا نہ تھی چنانچہ فروری ۱۹۲۵ء میں صوبہ
متحدہ کے مسلمانوں نے اپنے حقوق کے متعلق مطالبہ احتجاج کیا تو انتہائی مخالفت
کی گئی تاہم بعض مدبر ہندو جن میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نہایت ممتاز ہیں اس حق
کے موید تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر صاحب ممدوح نے الہ آباد میں ایک پبلک
میٹنگ میں کہا تھا کہ:-

"میری قطعی رائے ہے کہ ہندوؤں کی جانب سے یہ سخت غلطی ہوگی کہ اگر وہ
اس وقت یا آئندہ کئی سالوں تک مسلمانوں کے اس مطالبہ کی مخالفت کریں کہ مسلمانوں
کو پبلک سروس یا پبلک جماعتوں میں جداگانہ نیابت کا حق دیا جائے۔ میں یہ بات
عملی پالیٹیشن کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں اب وقت ہے کہ پبلک جماعتوں اور مجالس
وضع قوانین میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں تصفیہ ہو جائے۔ اگر آپ یہ اصول تسلیم
کر لیں کہ قلیل التعداد اقوام کی حفاظت و حقوق کا انتظام ہونا چاہیے تو اس کی بناء پر
اس مسئلہ کے حل کی ایسی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں جنہیں ہندو اور مسلمان دونوں بہ آسانی
منظور کر سکتے ہیں۔"

راجہ صاحب سلیم پور صدر اجلاس مسلم لیگ صوبجات متحدہ (۱۹۲۶ء) نے
مسلمانوں کی ناکامیوں کی داستان سناتے ہوئے ادارات بلدیہ کے متعلق کہا تھا کہ:-

"ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمینوں کا صوبجات متحدہ میں انتخاب مخلوط حلقوں
سے ہوتا ہے مگر صورت حال کیا ہے صوبجات متحدہ میں ڈسٹرکٹ بورڈوں کے

۸۴ منتخب شدہ چیرمینوں میں سے صرف ایک مسلمان ہے اور باقی ہندو۔
پھر انھوں نے بہار اڑیسہ کے حالات پر روشنی ڈالنے کے بعد کہا کہ:-
"اگر ان صورت حال کی موجودگی میں ہم اس سسٹم کو ناپسند کرتے ہیں تو ہمیں کوئی الزام نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہم پر یہ بہتان عائد کیا جاسکتا ہے کہ ہماری یہ روش قوم پروری کے منافی ہے"

اگرچہ یہ رکاوٹیں کانگریسی دورِ وزارت سے قبل پیش آتی تھیں جو گویا کانگریسیوں اور مہاسبھائیوں کی ہی بدولت تھیں تاہم مسلمان اپنے حقوق سے کم وبیش مستفید ہوتے تھے لیکن کانگریس کا دور شروع ہوتے ہی صوبجاتی کونسلوں میں آئینی طور پر مسلمانوں کو لوکل سیلف گورنمنٹ یعنی ادارات بلدیہ سے انتخاب جداگانہ ختم کردینے سے نکال دینے کی تدابیر شروع ہوگئیں اور اس کے لیے جابجا ترمیمی بل پیش کیے گئے، اور انتخاب جداگانہ اڑادیا گیا۔

جب ان شکایات ومظالم کا سلسلہ دراز ہوا تو مارچ ۱۹۳۸ء میں کونسل آل انڈیا مسلم لیگ نے تحقیقات اور رپوٹ مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی کا تقرر کیا جو پیرپور کمیٹی کے نام سے موسوم ہے اور اس نے اپنی رپورٹ پٹنہ کے اجلاس سالانہ میں پیش کی مگر وہ بھی ایک مختصر روئداد ہے۔ اس کے علاوہ صوبہ متوسط وبرار اور صوبہ بہار کے مظالم کی رپورٹیں بھی (خان رپورٹ اور شریف رپورٹ) مرتب ہوئیں، جن میں کسی قدر تفصیل سے ان کو بیان کیا گیا ہے۔

کانگریس کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ تو ابتدا سے ہی مغایرانہ اور جابرانہ تھا جو حکومت کی کرسیوں پر قبضہ کے بعد اور بڑھ گیا لیکن اچھوتوں سے سمجھوتہ اور کیمونل اوارڈ کی ترمیم کے بعد یقین تھا کہ یہ اعلیٰ ذات والے ہندو ان کے متعلق اپنی ہمدردی کا ثبوت دینگے اور ان کو مساوی حقوق عطا کریں گے جو ہندو اعلےٰ ذات کے جسم کا عضو کہے گئے اور جن کی علٰحدگی لاش کی چیرپھاڑ تصور کی گئی۔
ان کی ہمدردی کے بہت سے گیت گائے گئے تھے انکو پستی سے نکالنے کے لئے۔

اصلاحی اسکیمیں جاری ہوئیں لیکن جب ۱۹۳۷ء کانگریس نے وزارتوں کی ترتیب کی تو ان کو ہر جگہ نظر انداز کر دیا گیا۔

اگست ۱۹۳۸ء میں اچھوت لیڈر ایم۔ سی راجہ نے گاندھی جی کو ایک مفصل خط میں مدراسی حکومت کی شکایت کرتے ہوئے لکھا کہ:۔

"مدراس اسمبلی میں اعلیٰ ذات کے ہندو اس معاملہ کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہے ہیں پارٹی ڈسپلن کے زیر اثر اچھوت ممبر مجبور ہوئے کہ مندروں میں اچھوں کے داخلہ کے بل کی مخالفت کریں۔ . . . ہندوؤں کے ساتھ مشترکہ نیابت قبول کر کے ہم نے اپنی آزادی سلب کر دی اور اپنے گلوں پر اپنے ہاتھوں چھری پھیری۔ مسٹر راجہ نے آخر میں دھمکی دی کہ اب میری قوم مجبور ہو گئی ہے کہ جداگانہ نیابت کے لئے جدوجہد کا براہ راست اقدام کرے۔"

آخر اکتوبر میں مشہور اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبیدکر نے ایک تقریر کے دوران میں بمقام احمد آباد کہا کہ:۔

"مجھے کانگریس اور گاندھی جی پر بالکل اعتماد نہیں کہ وہ کبھی بھی پست اقوام کی بہتری کے لئے کچھ کریں گے۔ مجھے گول میز کانفرنس کا تجربہ ہے اور گاندھی جی پر میرا اعتماد ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے جو (گاندھی) مسلمانوں کے مطالبات منظور کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا مگر پست اقوام کے لئے نشستیں مقرر کرنے کا مطالبہ ماننے کو تیار نہ تھا گو وہ (گاندھی) اس سے پہلے اعلان کر چکا تھا کہ اگر دیگر جماعتیں ہمارے مطالبات منظور کرلیں تو وہ بھی اس کے لئے تیار ہے۔"

مسلمان پست اقوام کے مطالبات منظور کرنے کے لئے تیار تھے، مگر گاندھی جی رضامند نہ تھے۔

گاندھی جی نے کانگریسی وزارتوں کو اپنے کابینہ میں کسی اچھوت وزیر کے تقرر کے لئے نہیں کہا، بمبئی کی کانگریسی حکومت نے اس کمیٹی کی منظوری پر کوئی توجہ نہیں دی جو سابقہ حکومت نے پست اقوام کی ترقی کے لئے مقرر کی تھی اور نہ ہی ان کے لئے

کچھ کیا ہے۔

آخر میں اُنھوں نے کہا کہ "وہ خود اپنی تنظیم کریں یا انڈپنڈنٹ لیبر پارٹی میں شرکت کو ترجیح دیں جو مہاراشٹر میں اقتدار حاصل کر رہی ہے"

ان پر مظالم کا وہی سلسلہ جاری رہا جو اس دور سے پہلے تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا ان کے نام پر صدہا ودیالے اور مدرسے قائم ہوئے جن کو گرانقدر امدادیں دی گئیں مگر ایک اچھوت لیڈر نے جب چند اسکولوں کا معاینہ کیا تو نہ وہاں کوئی اچھوت استاد ملا اور نہ شاگرد، غرض ہر کانگریسی صوبہ ان کے حق میں بد سے بدتر ثابت ہوا۔ یوپی کونسل میں ایک اچھوت ممبر نے منجملہ شکایات ایک شکایت بطور سوال کی کہ۔

"اگر یہ سوال ہیں ایک اچھوت دولہ جو پالکی میں بیٹھا برات کے ساتھ جا رہا تھا اس کو تحصیلدار نے اونچی ذات والوں کے کہنے سے کیوں پالکی سے اُتروا دیا، اس کا جواب صرف یہ تھا کہ مقامی قواعد کے مطابق اسے اترنا ہی چاہیئے تھا"

سی پی میں بھی کوئی وزیر اچھوت نہیں بنایا گیا وہاں کے اچھوت لیڈر جے کھنڈیکر ممبر کونسل نے گاندھی جی کے آشرم پر بطور احتجاج ستیہ گرہ کی اور یہاں تک نوبت پہونچی کہ عورتیں بھی شامل ہو گئیں مگر گاندھی جی نے سب کو ٹھکرا دیا"

سرحد و سندھ کے صوبوں کی وزارتیں بھی جو اتفاقات سے کانگریسی مسلمانوں کی وزارتیں بن گئیں دوسری کانگریسی وزارتوں کے نقش قدم پر چلیں"

صوبہ سرحد کی مسلم وزارت کانگریس کی خیمہ بردار رہی اور مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کی جگہ اور ان کو قعر ہلاکت و مذلت میں ڈھکیلنے لگی۔ ہندو اقلیت کے حقوق میں جو پہلے ہی بہت زیادہ تھے اور اضافہ کر دیا گیا ہر شعبۂ زندگی میں ان کے تفوق کو برقرار اور وسیع کرنے میں کانگریسی جد و جہد کی اعانت و تقویت کی گئی۔ اسی مقصد کے لئے گاندھی جی نے صوبہ کے متعدد دورے کئے"

نیازکیشی و مرعوبیت کا اس درجہ ثبوت دیا گیا کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کی کتب درسیہ جو ابتدائی تعلیم میں مسلمانوں کے لئے بہترین مانی گئی ہیں اور ہر حصۂ ہند

میں مقبول ہیں کیوں کہ ان کے درس سے بچوں کو مذہبی معتقدات و روایات سے ایک حد تک واقفیت ہو جاتی ہے اور صوبہ سرحد میں بھی مدت مدید سے داخل نصاب تھیں۔ کانگریسی احتجاج کے باعث وزیر تعلیم نے انکو خارج کرنا منظور کر لیا۔ خان عبدالغفار نے جو اس صوبہ میں ایک ممتاز و مقتدر شخصیت رکھتے ہیں اور اُسوۂ گاندھی کے اتباع میں سرحدی گاندھی کے لقب سے ملقب ہیں پورا تہیہ کر لیا ہے کہ تمام صوبہ کانگریس کا غلام بنا دیا جائے اور اس کی روح عسکری کو فنا کر دیا جائے گا۔

سالہا سال سے کانگریس اس روح سے خوف زدہ ہے گاندھی جی کے بار بار کے دورے اسی کوشش کے سلسلے میں ہیں کہ یہ روح باقی نہ رہے مگر ستم ظریفی یہ کہ یوں تو وہ ساری دنیا کو حتیٰ کہ یورپ کی متحارب قوموں کو بھی عدم تشدد کی تلقین کرتے ہیں لیکن صوبہ سرحد کے ہندوؤں کو حفاظت خود اختیاری کے لئے اسلحہ دیئے جانے کا مطالبہ ہے۔

سندھ کا صوبہ تو کانگریس کے صوبوں سے بھی بازی لے گیا۔ وزیر اعظم خان بہادر اللہ بخش نے اپنے آپ کو کانگریس اور مہا سبھا کے حوالہ کر دیا۔

اس صوبہ کے واقعات میں مسجد منزل گاہ سکھر کے واقعہ نے تو کربلا کا نمونہ دکھلایا۔ یہ مسجد حکومت کے قبضہ میں تھی اور مسلمان اس کی واگذاری کے لئے کوشاں تھے اللہ بخش کے دور وزارت میں جب کہ تین اور مسلمان بھی ارکان وزارت تھے مسلمانوں نے متواتر عرضداشتیں پیش کیں اور جب وزیر اعظم اس تحریری و زبانی اقرار کے کہ مطالبہ واگذاری جائز و صحیح ہے واگذار کرنے کی جرات نہ کر سکے تو ایک سخت ہیجان پیدا ہوا پھر اُنہوں نے جمعیت العلما سندھ سے وعدہ کیا اور اس وعدہ کو مسلمانان سکھر تک پہونچانے کا انتظام بھی کیا کہ تین دن کے اندر مسجد واپس کر دی جائے گی، نیز بہت سے ارکان اسمبلی کو یقین دلایا اور ۲۰ ستمبر ۱۹۳۹ء کو سیٹھ عبداللہ ہارون اور دوسرے لیڈروں سے کہا کہ میں قطعی طور پر مانتا ہوں کہ یہ عمارت مسجد ہے اور مسلمانوں کو واپس ملنی چاہئے لیکن یہ وعدہ بھی ایفا نہ ہوا۔

مسلمانوں نے واگذاری کی جد و جہد کے لئے ایک کمیٹی بھی قائم کر لی تھی جس نے

تمام آئینی ذرائع ختم ہونے کے بعد سول نافرمانی کا فیصلہ کیا تین دن کے اندر تقریباً ڈیڑھ ہزار مسلمانوں نے نہایت پرامن طریقہ سے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا اور کوئی خفیف سا خفیف واقعہ بھی ایسا پیش نہ آیا جو تشدد پسندی سے تعبیر کیا جاسکے، حکومت نے اس فیصلہ کے لئے ثالث مقرر کئے مسجد میں نماز کی اجازت دیدی اور دفعہ ۱۴۴ نافذ ہونے کے باوجود نمازیوں کو فرض ادا کرنے کی آزادی رہی۔ اسی دوران میں مسٹر جناح نے ایک فارمولا بھی تیار کر لیا تاکہ خوش اسلوبی کے ساتھ اس معاملہ کو ختم کر دیا جائے لیکن حکومت نے غیر متوازی طور پر ممبران کمیٹی کے نام مسجد خالی کرنے کے نوٹس جاری کر دئے اور بالآخر گرفتاریاں شروع کر دیں مگر پھر گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا اور مسجد سے پولس ہٹالی گئی اور مسلمانوں نے مسجد پر قبضہ کر لیا اب پھر خالی کئے جانے کا مطالبہ شروع ہوا جو شدید و سنگین صورت اختیار کر گیا،

دراصل الہ بخش کی وزارت اس قسم کا موقع پیدا کر رہی تھی کہ گولی چلائی جائے اور اسمبلی کے فریق مخالف سے انتقام لیا جائے۔ ہندو وزرا کی طرف سے بھی دھمکیاں دی گئیں کہ اگر ۱۰ر نومبر تک مسجد خالی نہ کرا دی گئی تو وہ مستعفی ہو کر الہ بخش وزارت کا خاتمہ کر دیں گے،

دوسری طرف ہندوؤں کے پریس نے سخت مخالفانہ رویہ اختیار کیا مسلم قوم اور اکابر و واجب الاحترام ہستیوں کو برا بھلا لکھا گیا گورنمنٹ کو تشدد پر آمادہ کیا کیا گیا۔ روزانہ ہندو محلوں میں مسلمانوں پر قاتلانہ حملے ہوتے رہے مسلم اخبارات نے ہر چند اس حالت پر حکومت کو توجہ دلائی مگر مطلق تدارک نہوا ۱۴تا ۱۴ار نومبر سکھر میں ہندو کانفرنس منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر مونجے کے زیر صدارت مقررین نے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا اور اشتعال انگیز تقریریں کیں اور بہ کثرت ہندوؤں کے لائسنس لے گئے،

۱۹ر نومبر کی صبح کو دس بجے اچانک پولس نے مسجد منزل گاہ پر حملہ کیا۔ چوں کہ مسلمانوں نے سخت اشتعال کی حالت میں بھی متحمل رہنے اور ہاتھ نہ اٹھانے کی

کی قسم کھائی تھی اس لئے پولس کے مظالم سہتے رہے۔ متعدد رہنما ڈکٹیٹر اور دیگر مسلمان سخت زخمی ہوئے بعض شہید بھی ہو گئے اور بہت سے گرفتار ہوئے۔ کچھ ان مظالم سے بچنے کے لئے شہر کی طرف ہندو محلوں سے گذرے جو راستہ میں واقع ہیں ان پر ہندوؤں نے حملے کئے اور انجام کار پولس اور ہندوؤں کے تشدد و مظالم نے خطرناک صورت اختیار کر لی جو پولس اور فوج کے قابو سے باہر ہو گئی تمام ضلع میں بدامنی چھائی ہوئی تھی اور سکھر دوسرا پولینڈ بنا ہوا تھا جہاں مسلمانوں کا خون سب سے ارزاں تھا۔

با ایں ہمہ خان بہادر اللہ بخش پر کانگریس کو اطمینان حاصل نہوا اور ہمیشہ ان کو مرعوب رکھا گیا مسلم لیگ کا اعتماد تو ابتداء ہی میں زائل ہو گیا تھا ازیں سو راندہ وزاں سو درماندہ کی مثال پورے طور سے ان پر منطبق تھی۔

وزارت سے مستعفی ہونے کے بعد اگست ۱۹۴۲ء میں آزاد مسلم کانفرنس کے متعلق ایک بیان دیتے ہوئے انہوں نے سندھ کی سیاسی حالت پر بھی روشنی ڈالی اور سندھ کے ہندو لیڈروں کی نسبت کہا کہ:۔

"انھوں نے صوبہ میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے کبھی کسی حکومت کی مدد نہیں کی بلکہ ہمیشہ ان کے راستے میں مشکلات پیدا کیں اور جھگڑے پیدا کئے"

اس سلسلہ میں انھوں نے کانگریس کا بھی شکوہ کیا اور اس کو بھی الزام سے مستثنے نہیں رکھا۔

اس وزارت کے زمانہ میں مسلمانوں اور بالخصوص ممبران کمیٹی واگذاری مسجد پر مقدمات کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا مگر وزارت ختم ہونے کے بعد موجودہ حکومت نے کمیٹی سے تصفیہ کر لیا مقدمات اٹھا لئے گئے اور ماخوذین بری ہو گئے۔ ضلع سکھر کے ان فسادات میں افسران کے طرز عمل اور رویہ کی تحقیقات کے لئے جج ان ہائیکورٹ کی ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی جس نے ستمبر ۱۹۴۲ء میں اپنا نتیجہ تحقیقات پیش کر دیا اس نتیجہ یا رپورٹ میں افسروں کو بے قصور تسلیم کیا گیا اور یہ بات بھی ظاہر کی گئی ہے کہ:۔

"پولس کی مسلم اور غیر مسلم دونوں جماعتوں میں فرقہ وارانہ تعصب موجود تھا"

شروع زمانے میں وزراء کی یہ ذہنیت تھی کہ وہ ان معاملات کو بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیں جو زیادہ صحیح طور پر افسران ضلع کے ہاتھوں میں تھے اور اس طرح مقامی افسران کے ہاتھوں سے ان کی ذمہ داریاں نکال لی گئیں تھیں...... سابق وزیر اعظم خان بہادر الہ بخش نے مقامی افسران کے بغیر مشورہ منزل گاہ کا سوال خود اٹھایا....... گو خان بہادر الہ بخش اپنے عہدہ کے متعلق بہت زیادہ ذاتی لاپرواہی ظاہر کرتے تھے مگر یہ صاف اور عیاں ہے کہ انہوں نے اپنے عہدہ کی بقا کے لئے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔"

مسٹر عبدالقیوم ممبر مرکزی اسمبلی نے جو کانگریس کی طرف سے معاملات سندھ کے متعلق رپورٹ مرتب کرنے پر مامور ہوئے تھے لکھا ہے کہ:۔

"عام عقیدہ ہے کہ کانگریس ممبروں نے کانگریس کے اصول اور پروگرام کو بالائے طاق رکھدیا اور بعض اوقات مداخلت کی اور اکثر قوانین کے پیش ہونے سے پہلے ہی جن کا منشاء یہ تھا کہ ان سے مسلم عوام کو جو زیادہ تر زراعت پیشہ ہیں اور جو مفلسی اور قرض میں دبے ہوئے ہیں کچھ ایسی سہولتیں حاصل ہوں جن سے ان کی حالت سُدھر سکے ایسی حرکتیں کیں کہ وہ قانون ہی پیش نہ ہو سکے نہ تو سندھ کے لیڈروں میں وسعت خیال ہے اور نہ دماغی توازن باقی رہا ہے۔"

سندھ کے ہنگاموں میں گاندھی جی نے ہندوؤں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ عدم تشدد کے اصول پر قائم رہیں یا یہ کہ سندھ سے نقل سکونت کریں۔ اس بنا پر ایک ہندو لیڈر شام لال گڈوانی نے گاندھی جی کو ایک خط لکھا جس میں ان کے مشورہ عدم تشدد کو بھگوان کرشن کی گیتا کی تعلیمات کے قطعی خلاف بتا کر اس پر کار بند ہونے سے عذر کیا اور سندھ پر ہندوؤں کا اقتصادی قبضہ دکھا کر دوسرے مشورہ کو قبول کرنے سے بھی معذوری ظاہر کی اور آخر میں لکھا کہ:۔

"پُرامن مشورہ دینے کی بجائے اگر آپ یہ مشورہ دیتے کہ سندھی اور بالخصوص سندھ کے ہندو اپنی ذاتی حفاظت کے لئے استعمال اسلحہ کی تربیت حاصل کریں تو شاید وہ اپنی بہتر حفاظت کرنے کے قابل ہو سکتے اور بے رحمانہ قتلوں کا جو سلسلہ بندھا ہوا ہے

اس سے بچ جاتے۔"

اسی دوران میں بعض جرائم پیشہ لوگوں نے پانچ ہندوؤں کو قتل کردیا عاماً اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کو فرقہ وارانہ جذبات و تعصبات سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ ذاتی کینہ غارت گری اور باہمی رقابت کی سازش ان کی بنیاد ہوتی ہے۔ مگر گاندھی جی نے اس واقعہ کو فرقہ وارانہ سازش کا نتیجہ قرار دیکر ایک نہایت زہریلا مضمون اپنے اخبار ہریجن (۲۰ اکتوبر ۱۹۴۰ء) میں سپرد قلم کیا جس میں وہ پہلے سوال کرتے ہیں کہ:۔

"کیا سندھ سے ہندوؤں کو نکالنے کے لئے دہشت انگیزی کا پروگرام ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے میں چاہتا ہوں کہ سندھ میں سے کوئی اور صاحب اس کا جواب دیں۔"

پھر عدم تشدد کے فلسفہ پر ایک بحث کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

"سندھ کے لیڈروں کی غلطی ہے کہ وہ بیرونی امداد کی راہ دیکھ رہے ہیں وہ لکھنا بند کریں اور سنجیدگی سے عملی اسکیم سوچیں خواہ وہ پرامن ہو یا مبنی بر تشدد اور مضبوطی و بہادری کے ساتھ عمل پیرا ہوں۔

میں سندھ کے مسلمانوں سے بھی یہ کہنے کی جرات کروں گا کہ ان کی شہرت خطرہ میں ہے۔ اگر وہ بے گناہ لوگوں کے قتل کی مجنونانہ حرکتوں کو روک نہیں سکتے تو تاریخ انہیں گناہگار قرار دے گی وہ کسی شخص کو اس بات کا یقین نہیں دلا سکتے کہ وہ اس شرارت کا سدباب کرنے میں بے بس ہیں۔ اس قسم کی وارداتیں ناممکن ہیں جب تک اس فرقہ کی جس سے قاتلوں کا تعلق ہو ان سے خاموش ہمدردی نہ ہو۔"

گذشتہ پندرہ سولہ برس میں جابجا مسلمانوں کے ساتھ جس قسم کا بہیمانہ برتاؤ کیا گیا اور انتہائی سفاکانہ بے رحمیاں کی گئیں خود سندھ میں جو کچھ منظم طور پر مسلمانوں کے ساتھ گذرا ان میں سے کسی ایک واقعہ پر بھی کبھی گاندھی جی کا قلم حرکت میں نہ آیا اور اس وقت صرف پانچ ہندوؤں کے قتل پر پوری قوم کو مجرم بنا دیا، اور عدم تشدد کا فلسفہ بالائے طاق رکھ دیا گیا۔

دولت آصفیہ کے خلاف مہاسبھائیوں اور آریہ سماجیوں نے جو یورش و شورش

کی اس میں بالاعلان کانگریس[1] کی اعانت تھی اور اس کے متعدد عہدہ دار اس تحریک کے رہنما تھے۔ پنڈت نہرو کا دل بھی سلگ رہا تھا اور جب وہ ریاستی کانفرنس لدھیانہ کے صدر ہوئے تو بھڑک اُٹھا اور اپنے ایڈریس میں اس طرح شعلہ فشانی کی کہ :۔

"جہاں تک حیدرآباد کا تعلق ہے یہ ریاست ہندوستان میں مطلق العنانی کی بدترین مثال پیش کرتی ہے وہاں لوگوں کو شہریت کے ابتدائی حقوق تک حاصل نہیں اور حال ہی میں وہاں مذہبی فرائض کی ادائیگی پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئیں ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حیدرآباد کی یہ حالت کسی ہنگامی کارروائی کا نتیجہ نہیں ہے وہاں معمولی حالت میں بھی لوگ اس قسم کی پابندیوں میں جکڑے رہتے ہیں"

پھر ایک خط مورخہ اپریل ۱۹۳۹ء میں لکھا کہ :۔

"آریہ سماجیوں کی بہت سی شکایات ہیں جن سے نجات حاصل کرنے کی خواہش کبھی فرقہ وارانہ نہیں کہلا سکتی۔ تحریک کچھ اس ڈھب سے شروع کی گئی کہ حیدرآباد کی حکومت کو اس قومی تحریک کے ساتھ فرقہ وارانہ تحریک کا سا سلوک کرنے کا موقع مل گیا"

گاندھی جی بھی در پردہ اس تحریک کے مربی رہے اور انھوں نے حیدرآباد میں نفاذ اصلاحات کے بعد بالاعلان اس کو قبول کیا اور یہ مشورہ دیا کہ جنگ بدستور جاری رکھی جائے اور اعلانِ اصلاحات سے مطمئن نہوں"

جمعیت العلماء کے ارگن اخبار انصاری نے اپنے نوٹ میں لکھا کہ :۔

"تری پورہ میں ان کے حامیوں نے وہ طاقت دلائی جو از روئے دستور کسی کو بھی حاصل نہیں۔ کانگریس کی تمام مشنیری ان کے منشاء اور ان کی مرضی کے مطابق اور ان کی پالیسی پر چل رہی ہے اور وہ کانگریس کے جسے ہندو مسلمانوں کی مشترکہ جماعت کہنا چاہیئے قائد اعظم ہیں اور دوسری طرف ایک خالص فرقہ وارانہ تحریک

---

[1] اس تمام شورش کے متعلق حکومت نظام نے مختلف زبانوں میں متعدد پمفلٹ شائع کرکے اس کی حقیقت و اصلیت کو بے نقاب کر دیا ہے۔

جس کی بنیادوں میں مسلمانوں کے ساتھ نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ان کی توجہات کا موضوع بن رہی ہے "

ہم دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ اس قسم کی فرقہ وارانہ تحریک کے متعلق گاندھی جی کو کانگریس کا لیڈر ہوتے ہوئے خفیہ مشورے کرنے کا کیا مجاز ہے اور کیا وہ اس طرح ملک کے تمام مسلمانوں کا جن میں قوم پرور مسلمان بھی شامل ہیں اعتماد زائل نہیں کر رہے ہیں "

جو صورت حالات اس وقت ہمارے سامنے ہے اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گویا اس تحریک کی عنانِ قیادت ہی گاندھی جی کے ہاتھ میں ہے "

مگر یہ امر بھی خود گاندھی جی کے تجزیہ بیان سے مسلّم ہو گیا کہ دراصل عنانِ قیادت خاص انہیں کے ہاتھوں میں تھی اور ہے، اور اب بھی مملکت آصفیہ میں باوجود متعدد ادارات پر عطیاتِ گرانقدر کی بارش کے گاندھی جی ستیہ گرہ کے رہنما ہیں "

نوٹ ۔ باوجود ان تمام واقعات ثبتہ کے نہایت دیدہ دلیری سے ۲ر جنوری ۱۹۴۱ء کو صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ آٹھ صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کی رہنمائی کے لئے جو بورڈ بنایا گیا تھا اس کا ایک ممبر میں بھی تھا اور ان وزارتوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی ذمہ داری مجھ پر نہ تھی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ان وزارتوں نے مسلمانوں سے کوئی بداخلاقی نہیں کی جو الزام اور تہمتیں تراشے گئے ہیں وہ سرتاپا غلط اور بے بنیاد ہیں۔

باب چہاردہم

ان ظالمانہ واقعات سے جو کانگریسی صوبوں میں ہو رہے تھے وہاں کے مسلمانوں میں شدید بے چینی پھیلی جس سے تمام مسلمانان ہند متاثر تھے اور ہر طرف سے براہ راست کارروائی کرنے کے لئے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور صدر لیگ کے سامنے اجازت کے لئے پرزور درخواستیں آرہی تھیں لیکن مسٹر جناح نے پہلے آئینی ذرائع استعمال کرنے کی ہدایت کی اور گورنروں اور گورنر جنرل پر اختیارات خصوصی عمل میں لانے کا زور دیا چنانچہ، اپریل کو وائسرائے نے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی اطلاع دی۔

کانگریس ہائی کمانڈ اور ڈکٹیٹر گاندھی جی نے تو ان سب شکایتوں کی تکذیب ہی کی تا آں کہ ان حالات کے ماتحت مسئلہ جنگ یورپ پر جس کے چھڑ جانے کا خطرہ سر نکال چکا تھا، ۲۷ اگست ۱۹۳۹ء کو کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ جس میں اس امر پر غور کیا گیا کہ لڑائی میں مسلمانان ہند کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے نیز حکومت برطانیہ کی اس پالیسی پر اظہار افسوس کے ساتھ جو اس نے مسلمانوں کے معاملہ میں ایسا قانون نافذ کرکے اور بالخصوص فیڈریشن کی اسکیم بنا کر جس سے ایسی مستقل فرقہ وارانہ اکثریت قائم ہوتی ہے جو مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور تمدنی حقوق کو پامال کر رہی ہے اور گورنروں اور وائسرائے نے اقلیتوں کے متعلق اپنے خاص اختیارات کا استعمال نہیں کیا اور فلسطین میں عربوں کے مطالبات پورے کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ رائے ظاہر کی کہ اگر ان حالات میں حکومت برطانیہ مسلمانان عالم کی اور بالخصوص مسلمانان ہند کی ہمدردی چاہتی ہے تو اس کو بلا تاخیر مسلمانوں کے مطالبات پورے کرنے چاہئیں اور آخری تصفیہ ورکنگ کمیٹی پر منحصر کر دیا گیا۔

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو فرانس اور جرمنی میں لڑائی شروع ہوگئی اور ۳، ستمبر کو برطانیہ

نے بھی اعلان جنگ کر دیا اور وائسرائے نے مقاصد جنگ یعنی انصاف و امن اور تحفظ جمہوریت وغیرہ پر ایک تقریر نشر کی۔ ۴ ستمبر کو گاندھی جی اور مسٹر جناح نے وائسرائے ہند کی دعوت پر ان سے ملاقات کی جس میں جنگ کی صورت حال پر راز دارانہ گفتگو ہوئی۔ گاندھی جی پر تو ایوان ہائے پارلیمنٹ اور ویسٹ منسٹر ایبے پر گولہ باری کا ذکر کرتے ہوئے رقت طاری ہو گئی اور انہوں نے اپنے بیان میں غیر مشروط امداد و تعاون کا اعلان کیا۔ ۷ ستمبر کو مسٹر جناح نے بھی ایک بیان شائع کیا، جس میں انھوں نے جرمنی کے وحشیانہ طاقت کے استعمال کی مذمت اور موجودہ صورت حال کے مقابلہ میں پولینڈ انگلینڈ اور فرانس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر کے حکومت برطانیہ کو مشورہ دیا کہ اسے بوساطت مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے اعتماد میں لینا چاہیے اور ایسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے جو ان اصولوں پر حاوی ہو جن کا ذکر وائسرائے نے اعلان جنگ کے عین مابعد اپنی تقریر (نشر صوتی) میں کیا تھا اور یہ کہ مسلمان صرف انصاف کے خواستگار ہیں۔ ۱۱ ستمبر کو وائسرائے نے مرکزی اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے مشترکہ اجلاس میں پیغام شاہی سنا کر اپنی تقریر میں فیڈریشن کے التوا کا بھی اعلان کر دیا جس کے خلاف مسلم لیگ جد و جہد کر رہی تھی۔ اسی تاریخ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے مسٹر جناح کو بذریعہ تار کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں جو بمقام واردھا منعقد ہو رہا تھا شرکت کی دعوت دی تاکہ مسئلہ زیر بحث کے فیصلہ میں ان کی مدد حاصل کی جائے مگر مسٹر جناح کمی وقت کے باعث دعوت قبول نہ کر سکے نیز دنیا کو متحدہ محاذ اور کانگریس کی متحدہ قومیت و بے تعصبی کا دھوکا دینے کی یہ ایک چال تھی۔

جنگ شروع ہوتے ہی حفاظتی تدابیر کے سلسلے میں حکومت نے مرکزی اسمبلی سے رائے لئے بغیر کچھ ہندوستانی فوجیں بیرون ہند بھیجیں۔ کانگریس نے اسکو ہندوستانی کی توہین تصور کر کے اسمبلی کی کانگریس پارٹی کو آئندہ سیشن میں عدم شرکت کی ہدایت[۱]

---

[۱] نومبر ۱۹۳۹ء فنانس بل پر بحث میں حصہ لینے کے لئے کانگریس نے یہ پابندی اٹھا لی اسی بل پر بحث کے دوران میں مسٹر ستیامورتی نے کہا تھا کہ "اگر کانگریس حکومت کو پریشان کرنا چاہتی تو بہت کچھ کر سکتی (بقیہ صفحہ

کی چنانچہ شملہ سیشن میں یہ پارٹی شریک نہ ہوئی اس کے بعد ہندوستان بھی شریک جنگ سمجھا گیا۔ آرڈیننس نافذ ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ترمیم ہوئی کانگریس کی اس مخالفت شرکت کے متعلق ڈاکٹر کھارے (سی پی) نے ناگپور اسمبلی میں ۸ رنومبر کو کہا تھا کہ "ڈیفنس آف انڈیا آرڈیننس کے نفاذ کے بارہ میں مسٹر سی راج گوپال اچار وزیر اعظم مدراس سے حکومت نے مشورہ کیا تھا جنہوں نے اسکو پسند کیا پھر کانگریس پارٹی اسمبلی سے غیر حاضری ہوئی اور حکومت کو آرڈی ننس کی منظوری میں سہولت ہو گئی ہے"

۱۴ ستمبر کو واردھا میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس میں ایک طویل ریز پاس کیا جس میں برطانیہ عظمےٰ کو ہندوستان میں کامل جمہوریت کے قایم کرنے اور بیرونی مداخلت کے بغیر جمہور ہند کو ایک کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے ذریعہ اپنے دستور بنانے کے حق پر توجہ دلائی اور اسکو دعوت دی کہ وہ غیر مبہم الفاظ میں مقاصد جنگ ادرا اور اس بات کی تشریح کرے کہ ہندوستان کے متعلق کس طرح ان کو بروئے لایا جائے گا اور اس صورت میں آزاد جمہوری ہندوستان ڈیفنس اور اقتصادی تعا میں شرکت کریگا،

بایں ہمہ کمیٹی کا یہ انقطاعی فیصلہ نہ تھا اور اس نے آیندہ وضاحت کا موقع بھی رکھا تھا۔

اس ریزولیوشن کا ایک صاف مقصد یہ بھی تھا کہ گویا حکومت ہند اس بات کو تسلیم کرلے کہ کانگریس ہی ہندوستان کی واحد سیاسی نمایندہ جماعت ہے اور اس کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کا وضع کیا ہوا قانون ہندوستان کا قانون ہوگا، اور یہی ایک ایسا اہم سوال تھا جس نے مسلمانوں کی توجہ کو بہت زیادہ اپنی طرف مائل کرلیا۔ چونکہ اس طرح رام راج یا ہندو حکومت قائم کئے جانے کے مدعا کا ایک صاف اظہار تھا۔

(بقیہ صفحہ ۴۴۲) تھی مگر اس نے برعکس فیصلہ کیا علاوہ بر این جب حکومت نے فائدہ اُٹھانا چاہا تو بھی تما گاندھی سے فائدہ اٹھایا لیکن اب وہ ناپسند کرتی ہے،

۱۷ و ۱۸ ستمبر کو مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی[۲۴] ایک میٹنگ ہوئی اور طولانی بحث کے بعد بالاتفاق ایک ریزولیوشن پاس ہوا جس میں کونسل آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ اگست کے ریزولیوشن کی تائید اور فیڈرل اسکیم کے معطل کئے جانے پر اظہار پسندیدگی کیا گیا اور اس امر پر زور دیا گیا کہ یہ بجائے معطل کرنے کے بالکل ترک کر دی جائے اور ان تجربات کی روشنی میں جو ڈھائی سال کے اندر موجودہ صوبجاتی دستور کے عمل سے اور ان واقعات سے جو ۱۹۳۵ء سے اب تک پیش آئے ہیں دستور حکومت کے مسئلہ کی از سر نو نظر ثانی ہونی چاہیے"

کمیٹی نے مسلمانان ہند کی سیاست ہند میں جو اہم حیثیت ہے اس پر زور دیتے ہوئے اور ہندوستان کی آزادی کی جد وجہد کا ذکر کرتے ہوئے اس امر کا اعادہ کیا کہ صوبجاتی دستور سے ایک مستقل فرقہ وارانہ اکثریت کی حکومت قایم ہے اور ہندوؤں کو مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں پر حاکمانہ غلبہ حاصل ہو گیا ہے اور ان کی جان و مال اور آزادی و عزت ہر چیز خطرہ میں پڑ گئی ہے اور یہ بات بہ وضاحت بیان کی گئی کہ تمام اسلامی ہندوستان ہندوستانیوں کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف صف آرا ہے اور بار بار اس نے آزاد ہندوستان کی تائید میں اعلان کیا ہے مگر وہ انتہائی مخالف اس کا ہے کہ مسلمانوں پر اور دوسری اقلیتوں پر ہندوؤں کا استبداد قایم ہو اور اسلامی ہند کو غلام بنایا جائے اور وہ ہر اس وفاق کو مقصد قرار دینے کے خلاف ہے جس کا لازمی نتیجہ جمہوریت اور پارلیمنٹری طرز حکومت کے بھیس میں اکثریت رکھنے والے فرقہ کی حکومت کا قیام ہو اس قسم کا دستور ملک کے ان باشندوں کے مزاج کے بالکل ناموافق ہے۔ جو مختلف قوموں سے مرکب ہیں اور اس سے قومی حکومت نہیں قائم ہوتی۔

مسلم لیگ بلا اشتعال حملہ کی اور اس اصول کی کہ حق طاقت پر مبنی ہے مذمت کرتی ہے اور بنی نوع انسان کی آزادی کے اصول کی اور اس اصول کی کہ بلا لحاظ حق و انصاف طاقتور کی مرضی کو غالب آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تائید کرتی ہے کمیٹی پولینڈ، انگلستان اور فرانس کے ساتھ اپنی گہری ہمدردی کا اظہار کرتی ہے مگر کمیٹی

یہ محسوس کرتی ہے کہ مسلمانان ہند کی حقیقی اور مجموعی تائید اس نازک وقت میں برطانیہ کو حاصل نہیں ہو سکتی اگر ملک معظم کی گورنمنٹ اور وائسرائے ان صوبوں میں جہاں کانگریسی حکومتیں قایم ہیں اور جہاں مسلمانوں کی جان و مال و آبرو خطرہ میں ہے اور جہاں ان کے ابتدائی حقوق بھی نہایت سنگدلی سے پامال کئے جا رہے ہیں مسلمانوں کے حق میں انصاف کرانے اور خوش معاملگی برتوانے میں قاصر رہی۔

کمیٹی نہایت قوت کے ساتھ ملک معظم کی گورنمنٹ اور وائسرائے و گورنر جنرل سے اصرار کرتی ہے کہ گورنروں کو ہدایت کریں کہ جہاں صوبجاتی وزارتیں مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے اور خوش معاملگی برتنے سے قاصر رہیں یا جہاں کہیں یہ وزارتیں زیادتیاں کریں اور مسلمانوں کے مذہبی، اقتصادی کلچر اور جماعتی حقوق کے مفاد میں مداخلت کریں وہ اپنے خاص اختیارات ان وعدوں، ضمانتوں اور اعلانات کے مطابق عمل میں لائیں جن کی بنا پر بہ اظہار مقاصد یہ اختیارات کتاب قانون میں درج کئے گئے تھے۔

کمیٹی افسوس کے ساتھ یہ کہتی ہے کہ اب تک یہ خاص اختیارات معطل و محروم عمل رہے ہیں اور گورنر کانگریس کے اقتدار اعلیٰ کی اس دھمکی کے اثر سے کہ اگر گورنروں نے خاص اختیارات استعمال کئے تو وہ تمام کانگریسی صوبوں میں جہاں ان کی ٹھوس اکثریت ہے نازک حالات پیدا کر دیں گے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے ہے۔

کمیٹی ہندوستان کی آزادی کے دعوے کے ساتھ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ سے یہ مزید اصرار کرتی ہے اور اس کا تیقن چاہتی ہے کہ نہ ہندوستان کی آئینی ترقی کے مسئلہ کے متعلق بغیر آل انڈیا مسلم لیگ کی منظوری کے کوئی اعلان کیا جائے گا اور نہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ اور برطانوی پارلیمنٹ کوئی دستور وضع کرے اور قطعی طور پر اختیار کرے گی فلسطین کے عربوں کے معاملہ میں حکومت برطانیہ کی پالیسی سے مسلمانوں کے جذبات اور محسوسات سخت زخمی ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں جتنے معروضات کئے گئے ان کا حکومت برطانیہ پر واقعی اثر نہیں ہوا کمیٹی ہز مجسٹی کی گورنمنٹ سے ایک مرتبہ پھر یہ اصرار کرتی ہے کہ عربوں کے قومی مطالبات پورے کرے۔

اگر حکومت برطانیہ اس نازک عالمگیر اور شدید خطرہ میں مسلمانان ہند کا پورا اور موثر اور باعزت اشتراک عمل چاہتی ہے اور اسکی یہ خواہش ہے کہ یہ کامیابی کے ساتھ ختم ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ مسلمانوں میں سلامتی اور اطمینان کا احساس پیدا کرے اور آل انڈیا مسلم لیگ کا اعتماد حاصل کرے کہ مسلمانان ہند کی طرف سے بولنے کی مجاز صرف یہی ایک انجمن ہے۔"

۵ راکتوبر کو مسٹر جناح کی وائسرائے سے دوبارہ ملاقات ہوئی جو ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی۔ ملاقات سے قبل انجمن اقوام پسماندہ مدراس کے صدر اور دیگر اچھوت لیڈروں نے ان سے اپیل کی تھی کہ اپنی ملاقات میں پسماندہ اقوام کا بھی خیال رکھیں۔ چنانچہ مسٹر جناح نے ان مظالم پر جو کانگریسی صوبوں میں جاری تھے توجہ دلاتے ہوئے اچھوتوں کی حالت بھی پیش کی۔ ان مذاکرات کے نتیجہ میں وائسرائے نے صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرکے کانگریسی لیڈروں اور گاندھی جی پر زور دیا کہ کم از کم دوران جنگ میں مسلم لیگ کے ساتھ اتحادی بنیاد پر صوبجات میں سمجھوتہ کر لیا جائے۔

اب صدر کانگریس نے مسٹر جناح کو لکھا کہ کانگریس اس بات کے لئے تیار ہے کہ صرف ان صریح الزامات کی تحقیقات کی جو مسلم لیگ مرتب کر سکتی ہو۔ سر ماریس گوئر یا اور کسی موزوں شخص سے درخواست کرے مگر مسٹر جناح نے اس بنا پر یہ تجویز منظور نہ کی کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو قانونی اور دستوری حیثیت سے نہ تو کوئی درجہ حاصل ہے اور نہ اختیار، اور یہ شکایت جن حکومتوں کے خلاف تھیں وہ مجلس قانون ساز اور انتخاب کنندگان کے سامنے جوابدہ ہیں نہ کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے، پھر اس کے رزولیوشن سے مجوزہ عدالت کو گواہوں کی طلبی اور حلف دینے کے اختیارات نہیں مل سکتے اور نہ مطلوبہ دستاویزات کی پیشی پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اور سب سے آخری بات یہ تھی کہ اس کی رپورٹ کس کے سامنے پیش ہوگی اور وزارتوں کے خلاف کارروائی کی ضرورت کی صورت میں آخری حاکم مجاز کون ہوگا، ان امور کے علاوہ کانگریس ورکنگ کمیٹی پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی کہ مسلم لیگ کے عائد کردہ الزامات بے بنیاد ہیں۔

مسٹر جناح نے نامنظوری کی اطلاع[۲۶] کے ساتھ اس بات کی بھی اطلاع دیدی تھی کہ کل معاملہ گورنر جنرل وائسرائے ہند کے سامنے پیش ہوچکا ہے تاکہ بلاتاخیر اقلیتوں کی حفاظت اور ان کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے انتظامی کارروائی کی جائے۔

مسٹر جناح نے ایسی باضابطہ تحقیقات کے لئے ایک رائل کمیشن کا بھی مطالبہ کیا۔ اس دوران میں وائسرائے نے مختلف طبقات کے ۵۲ لیڈروں پرنس چیمبر (ایوان شہزادگان ہند) کے چانسلر وغیرہ سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان کے نتیجہ میں ۱۷ اکتوبر کو ایک طولانی بیان دیا جس میں ان ملاقاتوں اور ملاقاتیوں کے زاویہ نگاہ کے اختلافات وغیرہ کی طرف اشارات کرکے موجودہ مرحلہ پر مقاصد جنگ کی وضاحت کو غیر دانشمندانہ اور ناقابل عمل اور یورپ کے لئے ایک مستقل امن اور بہترین طریقہ کار کی بنیاد کو مختصراً بیان کیا اور ہندوستان کی آئینی حیثیت اور دستور ہند کی اسکیم کے استحکام فیڈریشن کے قیام کے طریقوں کی تعریف اور اس کے تعطل وغیرہ کا ذکر کرکے کہا کہ:-

"اب مجھے ملک معظم کی حکومت کی طرف سے یہ کہنے کا اختیار ہے کہ لڑائی ختم ہونے پر حکومت ہندوستان کے مختلف مفادات وطبقات اور پارٹیوں کے نمائندوں اور ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ گفتگو کی بہت خواہاں ہوگی تاکہ وفاقی دستور میں مناسب تبدیلیاں کرنے کے لئے ان کا تعاون اور امداد حاصل کی جاسکے ...... اس اسکیم میں ہندوستانی زاویہ نظر کی روشنی میں تبدیلیاں کی جاسکیں اور ہندوستان کو اس کے منزل مقصود تک پہونچنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔

اس سلسلے میں یہ بھی کہدینا چاہتا ہوں کہ اقلیتوں کے نمائندوں نے دوران گفتگو میں پرزور طریقہ پر مجھسے کہا ہے کہ آئین میں جو بھی ترمیم ہو اس میں ان کے نظریہ اور مفادات کو پورا وزن دینے کا صاف طور پر وعدہ کیا جائے۔ اس کے متعلق میں اس سے زیادہ کہنا ضروری نہیں سمجھتا کہ گذشتہ ۲۰ سال سے زیادہ عرصہ میں جو گول میز کانفرنسیں ہوئیں اور جوائنٹ پارلیمنٹری سب کمیٹی بیٹھی سب میں حکومت ملک معظم نے تمام پارٹیوں کے نمائندوں سے مشورہ کیا اور ملک کے تمام مفادات کے مشورے شامل رہے۔ یہ بات

بالکل ناقابل غور ہے کہ اب ہم کوئی نیا طریقہ اختیار کریں گے اور مستقبل ہند کے آئین کے کسی حصہ میں کسی لحاظ سے بھی ان لوگوں کے مشورہ کے بغیر ترمیم کریں گے جو قریب کے زمانہ گذشتہ میں ملک معظم کی حکومت اور پارلیمنٹ کو قریبی مشورے دیتے رہے ہیں۔ . . . اتحاد کی بنیاد پر ہی ہندوستان آگے بڑھنے کی امید کر سکتا ہے اور اس درجہ کو حاصل کر سکتا ہے جس کا وہ اپنی تاریخ اور قسمت سے مستحق ہے . . . . . میں اس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ ملک معظم کی حکومت پہلے کی طرح ہندوستان کی تمام پارٹیوں میں مفاہمت کی کوشش کرے گی جو ہندوستان کے حصول مقصد کے لئے ضروری شرط ہے"

پھر وائسرائے نے جنگ کے جاری رکھنے میں ہندوستان کی رائے عامہ کو حکومت کے ساتھ شریک رکھنے کے متعلق کہا کہ :-

"ایک مشورہ کی جماعت بنائی جائے جس میں برطانوی ہند کی بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کے اور والیان ملک کے نمائندے ہوں اور صدارت خود گورنر جنرل کرے کہ اس جماعت کی تعداد معین ہو اور ہر سیاسی پارٹی چند نام دے گی ان میں سے گورنر جنرل معین تعداد کو منتخب کرلیں گے"

آخر میں وائسرائے نے پھر اتحاد کی پرزور اور پرشکوہ الفاظ میں اپیل کی دوسرے ہی دن ۱۸ اکتوبر کو مجلس امراء میں وزیر ہند نے مسائل ہند پر تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کو درجہ مستعمرات دیئے جانے کے وعدہ کی توثیق کی اور بیرون ہند فوجوں کی روانگی کانگریس کی ناراضی اور اسمبلی کے اجلاس کے بائیکاٹ کے مشورہ پر کہا کہ :-

"اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ مشرق و مغرب دونوں جانب سے ہندوستان کی سلامتی کے خطرہ کا امکان تھا اور فوجیں اعلیٰ فوجی حکام کی ہدایات کے مطابق روانہ کی گئی تھیں دنیا سمجھ سکتی ہے کہ فوجوں کی روانگی کے مسئلہ پر اسمبلی میں بحث کرنے کے معنی یہ تھے کہ ہم دشمنوں کو پہلے سے اپنی فوجی نقل وحرکت کی اطلاع کردیں اور ظاہر ہے کہ یہ ہماری انتہائی حماقت ہوتی"

تمام دشواریوں کی جڑ یہ ہے کہ ہندوستان کی اکثریت پر اقلیتوں کو اعتماد نہیں ہے

اور اقلیتیں چاہتی ہیں کہ ان کے حقوق کا پورا تحفظ کیا جائے"

ان بیانات پر کانگریسی لیڈروں نے جو بیانات شائع کئے ان کا ماحصل یہ تھا کہ:۔

جنگ کے برطانوی مقاصد سے ہندوستان کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی (صدر کانگریس)

خاموش رہو، مطمئن رہو، منظم اور تیار رہو (پنڈت نہرو)

بہتر ہوتا کہ حکومت برطانیہ کوئی بیان نہ دیتی (گاندھی جی)

۲۲ ر اکتوبر کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک تجویز پاس کی جس میں کہا گیا کہ "سامراجی پالیسی کو پھر دوہرایا گیا ہے"

اقلیتوں کی نسبت بیان کیا گیا "کانگریس ہمیشہ ان کے حقوق کی زیادہ سے زیادہ ضمانت کرنے کو تیار رہی ہے اور اسکی مطلوبہ آزادی کسی خاص فرقہ یا گروپ کی نہیں بلکہ کل ہندوستان کی ہوگی"

ساتھ ہی کانگریس کمیٹی نے برطانیہ کو کسی قسم کی بھی مدد دینے سے انکار کر دیا اور صوبجاتی وزارتوں کو مستعفی ہونے کی ہدایت دی سیاسی ہڑتال سول نافرمانی اور اسی قسم کی دوسری عاجلانہ حرکت کرنے کی اہل کانگریس کو ممانعت کی گئی"

۲۲ ر اکتوبر کو ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا اور اس نے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا۔

ریزولیوشن "وائسرائے کے اعلان مورخہ ۱۷ ر اکتوبر ۱۹۳۹ء کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ اس نتیجہ پر پہنچی کہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ نے کانگریس کے اس بے بنیاد دعوے کی پرزور طریقہ پر تردید کر دی ہے کہ ہندوستان کی وہ ہی تنہا نمائندہ ہے اور اس کو بہ نظر اطمینان دیکھتی ہے کہ ملک معظم کی گورنمنٹ نے یہ حقیقت تسلیم کی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نیابت مسلم لیگ ہی کرتی ہے اور وہ ہی ان کی طرف سے بول سکتی ہے اور نیز یہ کہ اقلیتوں کے حقوق اور مفاد واجبی طور پر مانے گئے ہیں"

مگر کمیٹی یہ بیان کرنے پر مجبور ہے کہ مسلم لیگ نے اپنے بیان مورخہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جو اہم مسائل اٹھائے تھے ان کے متعلق صاف اور قطعی تشفی نہیں کی گئی لہٰذا کمیٹی یہ تجویز پیش

کرتی ہے کہ جس طرح ہز ایکسیلنسی وائسرائے نے خواہش ظاہر کی ہے اسی طرح مساویانہ انداز میں اشتراک عمل حاصل کرنے کے لئے ان معاملات کو واضح کرنے کی ضرورت ہے جو مشتبہ رہ گئے ہیں اور جن کو قابل اطمینان طریقہ پر پورا نہیں کیا گیا ہے اور جن کے متعلق اس نظر سے کامل سمجھوتہ اشد ضروری ہے تاکہ صرف ان معاملات میں نہیں جو مسلمانوں سے متعلق ہیں بلکہ ان میں جو تمام ملک سے متعلق ہیں مسلم لیگ تعاون کرنے کے قابل ہو جائے ہز ایکسیلنسی کے بیان میں ان تمام واقعات کا تذکرہ ہے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی منظوری تک پیش آئے ہیں ان کو ورکنگ کمیٹی کامل طور پر منظور نہیں کر سکتی۔ لیکن ان تاریخی اور دوسری طرح کی غلط بیانیوں کے متعلق وہ بحث میں بھی پڑنا نہیں چاہتی مسلم لیگ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی ان تفصیلات ہی کے خلاف نہیں ہے جو اس میں درج ہیں اور صرف ان پر دوبارہ غور کرانے کی طالب نہیں ہے بلکہ اسکا مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان کے آئندہ دستور حکومت کی پورے طور پر اور نئے سرے سے نظرثانی کی جائے۔ کمیٹی دوبارہ پرزور طریقہ پر یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ ہندوستان کے کسی ایسے دستور کو قبول نہیں کرے گی جس کے متعلق اسکی پوری پوری رضامندی حاصل نہ کر لی جائے۔

کمیٹی نے ہز ایکسیلنسی وائسرائے کی اس تجویز پر بھی غور کیا کہ کنسلٹیٹو گروپ (یعنی ایک جمعیتہ مشاورت) قایم کی جا دے لیکن ورکنگ کمیٹی اس مسئلہ پر اسوقت تک اظہار رائے نہیں کرنا چاہتی جب تک کہ اس کا درجہ، اختیارات، دائرہ عمل اور فرائض نہ معلوم ہو جائیں البتہ اس مسئلہ پر جیسا کہ ہز ایکسیلنسی نے اپنے بیان میں تجویز پیش کی ہے مزید مشورہ کو پسند کرے گی ۔

ان مذاکرات کے سلسلہ میں کانگریس نے پھر جمہوریت کے نام پر بیانات کے ذریعہ سے دنیا کو مغالطہ دینا شروع کیا۔ بعض برطانوی جرائد نے ہندوستان کے حالات ومشکلات پر غور کئے بغیر ہمنوائی کی اس لئے مسٹر جناح نے ۲۸ اکتوبر کو مانچسٹر گارجین نامی اخبار میں بیان کے ذریعہ مسئلہ جمہوریت کی عملی حقیقت نمایاں کی، انہوں نے ہندوستان میں نمایندہ اور جمہوری طرز حکومت سے مسلمانوں کے اندیشوں کو جو ۱۹۱۶ء کی اصلاحات کے حالات اور مطالبۂ آئینی تحفظات و بحالی، خود مختاری اور کانگریس ہائی کمانڈ کے رویہ اور عزائم سے پیدا ہوئے ہیں۔ بیان کرکے

کہا کہ:-

آئین پرعمل کرنے سے صاف طور پر ظاہر ہوگیا ہے کہ ہندوستان میں پارلیمنٹری طور کی جمہوریت کا چلنا ناممکن ہے۔ اس کا صاف نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اکثریت فرقہ کی حکومت اقلیتوں پر ہمیشہ کے لئے قائم ہوگئی ہے جو کہ اپنے اختیارات اور حکومت کی مشنری کو اقلیتوں پر اپنے فرقہ کا غلبہ قائم کرنے کے لئے استعمال کرلی ہے۔ اس لئے میرے خیال میں دیگر اسباب کے علاوہ جن کی تفصیل میں میں نہیں جانا چاہتا۔ ہندوستان میں جمہوری حکومت کے معنی ہندو وراج ہوں گے اور یہ ایک ایسی پوزیشن ہے جس کو مسلمان ہرگز منظور نہیں کریں گے ان کے علاوہ چھ کرور اچھوت اور دیگر اقلیتیں ہیں جیسے عیسائی، یہودی، پارسی وغیرہ، اس لئے بڑے غور وخوض کے بعد مسلم لیگ اس نتیجہ پر پہونچی ہے کہ آئندہ آئین ہند کے مسئلہ پر بالکل از سر نو غور کیا جائے اور کہ حکومتِ ملک معظم کی جانب سے مسلم لیگ کی منظوری کے بغیر جو مسلمانان ہند کی واحد اور نمائندہ و با اختیار جماعت ہے کسی اعلان کا وعدہ نہ کیا جائے"۔

برطانوی پبلک اس مغالطہ میں نہ رہے کہ مسلمان آزادی ہند کے خلاف ہیں ہم آزادی چاہتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کس کی آزادی، مسلم ہند مکمل طور پر آزادی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور اپنی منشا کے مطابق اپنی سیاسی، اقتصادی سوشیل اور تمدنی ترقی کا خواہاں ہے اور وہ ہندوستان کے لئے بھی ایسا ہی چاہتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ انگریز جس نے اپنے ملک میں پارلیمنٹری گورنمنٹ کے سسٹم کو فروغ دیا ہے وہ اور کسی قسم کے طرز حکومت کو خیال میں نہیں لاسکتا وہ اسی طرزِ حکومت کا خیال کرسکتا ہے جس کو اس نے صدیوں سے فروغ دیا ہے مگر اس کو اپنے دماغ سے ان تجربات کو نکال دینا چاہیے جو اس نے کنیڈا اور آسٹریلیا میں کئے ہیں جہاں حکومت کی تمام بنیادیں عوام (جو کہ زیادہ تر انگریز ہیں) کے منشا کے مطابق ہیں،

یہ امر مشتبہ ہے کہ جنوبی افریقہ میں اس پر کس طرح عمل ہوسکتا ہے جہاں کہ مقابلہ کے دو فرقے ہیں ایک انگریز اور دوسرے بوئر، اور وہاں بھی ان کے اختلافات اتنے بنیادی نہیں جتنے کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے درمیان ہیں، آئرلینڈ بھی مدتوں تک سیل

کہنے کے بعد برطانی پارلیمنٹ کے آگے نہیں جھکا ہیں لارڈ مورلے کے مقولہ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں کہ کنیڈا کا گرم کوٹ ہندوستان کی گرم آب وہوا میں موافق نہیں رہ سکتا"

کانگریس کا یہ ادّعا کہ وہ ہندوستانیوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے نہ صرف بے بنیاد بلکہ ترقی ہند کے لئے سخت نقصان رساں ہے، وہ خود جانتی ہے کہ وہ تمام ہندوستان کی تو کہاں تمام ہندوؤں کی بھی نمائندہ نہیں اور مسلمانوں کی تو ہرگز بھی نہیں جن کو مغربی لغت میں عامتہً اقلیت کہا جاتا ہے۔ مسلمان صوبہ سرحد اور بنگال میں اکثریت میں ہیں اور کراچی و کلکتہ کو ریڈور (راستہ) میں ان کی اکثریت ہے۔ ہندوستان کے برّ اعظم کے اس حصہ کی آبادی ورقبہ برطانیہ سے دوگنا ہے جب تک کانگریس کا دماغ ٹھیک نہ ہوجائے گا اور حقیقتوں کا مقابلہ نہ کرے گی تو وہ ہندوستان کی ترقی کا راستہ روکنے کی ذمہ دار ہوگی اور جب تک وہ اپنی پالیسی اور پروگرام کی فسسٹ اور مطلق العنانہ طریقہ کو ترک نہ کرے گی اس وقت تک ہندوستان میں امن قائم نہیں ہو سکتا!

۲۶ اکتوبر کو پارلیمنٹ میں سرسیمول ہور نے ایک طولانی تقریر کی جس کے ضروری نقاط یہ ہیں کہ:-

"اگر کانگریس نے عدم تعاون کیا تو بھی ملک معظم کی حکومت کو پوری مضبوطی کے ساتھ جاری رکھا جائے گا۔ کانگریس کا مشاورتی گروپ سے انکار کرنا جلد بازی ہے۔ ہندوستانیوں کو پہلے خود اپنے اختلاف دور کرنے چاہئیں"

ایسے وقت میں جب کہ ہماری قوم اور باشندگان ہندوستان کا ایک مشترکہ خطرہ سے مقابلہ ہے اور دونوں کے مقاصد بھی ایک ہی ہیں تو پھر کسی قوم کے بڑے طبقہ کا عدم تعاون ایک بدبختی اور فضول کام ہوگا برطانوی ہند اور ریاستوں کے کروڑوں باشندے اس خیال سے متفق ہیں وہ ہمارے ساتھ اسی قدر تعاون کرنا چاہتے ہیں جس قدر کہ ہم ان کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں اور خود کانگریس (میں مہاتما گاندھی کے الفاظ کا حوالہ دیتا ہوں جو انہوں نے تین روز ہوئے کہے تھے) اپنی اخلاقی حمایت سے برطانیہ کی امداد کرنا چاہتی ہے جو اس کی خصوصیت ہے کانگریس اس وقت تک

یہ امداد نہیں دے گی جب تک اس پر یہ واضح نہ ہو جائے کہ برطانیہ کے اصول بالکل بے عیب ہیں۔
میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہماری پوزیشن اس قدر واضح ہے جیسی کہ گھنٹی کی آواز نیک نیتی اور قطعی خلوص کے ساتھ ہم نے ہندوستان میں آئینی تجربہ شروع کیا تھا جو دنیا میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا عرصہ ہوا کہ ہم سامراجی خواہشات کو ترک کر چکے ہیں ہمیں یقین ہے کہ دنیا میں ہمارا مشن دوسری قوموں پر حکومت کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی امداد کرنا ہے تاکہ وہ خود اپنے اوپر حکومت کریں اسی جذبہ کے ماتحت پارلیمنٹ نے سلسلہ وار بڑے بڑے قانون پاس کئے جن کی رُو سے نوآبادیوں کو آزاد آئین دیا گیا اسی اسپرٹ میں ہم نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پاس کیا تھا جس کے ماتحت ہم نے خود اپنی مرضی سے ہندوستانی حکومت کی طرف بہت سے اختیارات منتقل کر دئے اسی جذبہ کے ماتحت ہم قانون کو چلانا چاہتے ہیں اور جنگ کے دوران میں ان اختلافات کو دور کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا چاہتے ہیں جو اس کی کامیابی کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔
جب جنگ ختم ہو جائے گی اور سلطنت کی متحدہ کوششوں سے فتحمندی کے ساتھ ختم ہوگی تو پھر ہم ان آئینی دشواریوں پر نظر ثانی کریں گے جو گذشتہ چند سال کے تجربے کے بعد پیدا ہوئی ہیں عدم تعاون اور صرف عدم تعاون ترقی کی اس تیز رفتار کو روک دے گا۔"
وائسرائے کی ملاقاتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس کے ضمن میں کانگریسی لیڈروں اور مسٹر جناح کی بھی ملاقاتیں ہوئیں اور وائسرائے کی تحریک سے کانگریس اور لیگ میں مفاہمت کا سوال پیش ہوا لیکن کانگریس کا نقطہ نظر اور زیادہ صحیح یہ کہ اس کا غرور کسی آخری نتیجہ تک پہنچنے کی راہ میں حائل رہا ۵ رنومبر کو وائسرائے نے ایک پیغام نشر صوتی (براڈ کاسٹ) کیا جس میں انہوں نے یکم نومبر کی ملاقاتوں کا تذکرہ کر کے یہ بتایا کہ:-
"جو تحریک مفاہمت تھی وہ ناکام رہی" اور اس صورت حال پر روشنی ڈالنے کے بعد کہا کہ "اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ہنگامی ضروریات کے لئے جو ضوابط مقرر کئے گئے ہیں انہیں عمل میں لایا جائے۔"

اس اعلان کے دوسرے ہی دن وائسرائے نے وہ تمام خط و کتابت شائع کر دی جو صدر کانگریس، صدر لیگ اور گاندھی جی کے مابین ہوئی تھی۔

وائسرائے نے اپنے خط میں اپنی گفتگو کا حوالہ دیکر اپنی ان تجاویز کا ذکر کیا جو مرکز کے نظم و نسق میں پیش نظر تھیں اور جو صرف زمانہ جنگ تک محدود تھیں اور جنکا ماحصل یہی تھا کہ اگزیکٹو کونسل میں جو اضافہ کیا جائے گا وہ ذمہ داریوں اور مرتبہ کے لحاظ سے موجودہ ممبروں کے برابر ہوگا اور آخر میں لکھا تھا کہ:-

"اب مجھے ملک معظم کی حکومت کی طرف سے یہ کہنے کا مجاز قرار دیا گیا ہے کہ خاتمۂ جنگ پر وہ ہندوستان کے مختلف مفادات مختلف فرقوں اور جماعتوں کے نمائندوں اور مہاراجگان ہند سے اس سلسلہ میں صلاح مشورہ کرنے پر بمسرت تمام آمادہ ہوگی تاکہ ضرورت پیش آنے پر قانون حکومت ہند میں ترمیم کرنے کی غرض سے ان کی امداد اور اشتراک حاصل کیا جائے۔

میں نے اپنے اس یقین کا اظہار بھی کیا تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس سے اس حقیقت کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ ملک معظم کی گورنمنٹ اس امر کی تمنائی ہے کہ ہندوستان اور انگلستان میں سلطنت کے اندر اشتراک ہو ہو تاکہ ہندوستان بھی بڑی بڑی نوآبادیات میں اپنی پوزیشن حاصل کر سکے۔ قانون حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۵ء میں مندرجہ اسکیم اس سلسلہ میں ایک ضروری مرحلہ تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے۔ حکومت برطانیہ خاتمۂ جنگ پر ہندوستان کی رائے عامہ کی روشنی میں اسکیم میں ترمیم عمل میں لانے کے لئے تیار رہیگی۔

اس سلسلہ میں اس حقیقت کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ ماضی کی طرح وہ اس وقت بھی اپنا فرض سمجھے گی کہ حتی المقدور ایسا معاہدہ مرتب کرنے کی انتہائی کوشش عمل میں لائے گی جس کے ذریعہ سے ہندوستان اپنی منزل مقصود تک نہایت منظم اور باضابطہ طریق پر پہنچ سکے گا۔

آخر میں میں نے قلیل التعداد اقوام کے مطالبات کا تذکرہ کرتے ہوئے یقین دلایا تھا کہ ان کے خیالات اور حقوق و مفادات کو پوری اہمیت دی جائے گی اور پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔"

یہ ناممکن ہے کہ ہم ان لوگوں سے صلاح مشورہ لئے بغیر جنہوں نے ہندوستان کے

سابقہ دستور اساسی کی ترتیب کے وقت حکومت برطانیہ اور پارلیمنٹ سے پورے اشتراک عمل کا ثبوت دیا تھا۔ ہندوستان کے موجودہ دستور اساسی کے کسی جزو میں ترمیم کرنے یا از سرنو دستور مرتب کرنے کے بارے میں غور و خوض شروع کر دیں"

اس خط کا صدر کانگریس بابو راجندر پرشاد نے جو جواب دیا اس میں زیادہ تر کانگریس کی اس پوزیشن کا ذکر کیا گیا جو ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن کی رو سے اختیار کی جا چکی ہے اور یہ کہہ دیا گیا ہے کہ کانگریس اس پالیسی کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہے جو وائسرائے کے ابتدائی بیان میں مذکور ہے۔ جب تک برطانی حکومت کانگریس کی نشا کے مطابق اپنی پالیسی صاف اعلان میں واضح نہ کر دے۔ کانگریس مزید تعاون کے سلسلے میں کوئی قدم اُٹھانے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔

کانگریس اس مخلصانہ خواہش کا اظہار متعدد مرتبہ کر چکی ہے کہ فرقہ دارانہ اختلاف کو باہمی سمجھوتہ سے طے کیا جائے۔ ہم اپنی ان کوششوں کو جاری رکھیں گے۔ مگر میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ سوال آزادیٔ ہندوستان کے اعلان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا اس قسم کا اعلان سارے ہندوستان پر حاوی ہوگا۔ کسی خاص فرقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا ہندوستان کی نمائندہ اسمبلی جو ہندوستان کا دستور اساسی تیار کرے گی رائے دہی کے وسیع ترین بنیادی اصول پر قائم کی جائے گی فرقہ دارنیابت کے متعلق کوئی مفاہمت کر لی جائے گی۔ اس معاملہ پر مزید غور و خوض کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ پہلے غیر مبہم اعلان کر دیا جائے۔

مسٹر جناح نے وائسرائے کو بتاریخ ۴، نومبر جو جواب ارسال کیا تھا اس میں لکھا کہ:۔

"میں نے کانگریسی لیڈروں کے ساتھ ملاقات کی۔ مجھے اُنہوں نے آخری اور قطعی جواب یہ دیا کہ وہ یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ جب تک برطانی حکومت ان کے اس مطالبہ کو جو ورکنگ کمیٹی کی قرارداد میں مذکور ہے پورا نہ کر دے وہ ان امور سے تعلق رکھنے والے سوالات پر گفت و شنید نہیں کریں گے۔ جن کا حوالہ آپ نے مکتوب مورخہ ۱۷، نومبر میں دیا ہے۔ اور جن کا تعلق

صوبجاتی یا مرکزی معاملات سے ہے ان حالات میں ان دو سوالات پر گفت و تنقید نہیں ہو سکی۔"

انہی مذاکرات کے دوران میں گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد پر ایک نہایت مکروہ اور دل آزار مضمون شائع کیا جس میں انہوں نے مسٹر جناح اور لیگ کے متعلق بھی الزامات لگائے۔

مگر مسٹر جناح نے بھی اسی دن (۵ر نومبر) ایک بیان دیا جس میں انہوں نے اس مضمون پر اظہار افسوس کے بعد کہا کہ:-

"گاندھی جی لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جناح صاحب کی امیدیں دولت برطانیہ سے وابستہ ہیں کوئی چیز جو کانگریس کرے یا دے ان کو مطمئن نہیں کر سکتی لہذا وہ ہمیشہ اور طبعی طور پر اپنے نقطہ نظر کے مطابق ایسی چیز کا مطالبہ کر سکتے ہیں جو نہ کانگریس دے سکے نہ اس کی ضمانت کر سکے اس لئے مسلم لیگ کے مطالبات کی کوئی حد نہیں ہو سکتی۔"

یہ قطعی افترا اور مسلمانان ہند کا تہتک ہے گاندھی جی جیسے مرتبہ کے شخص کو اس کا مرتکب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ گاندھی جی اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:-

"کانگریس نے ہندوؤں کی بحیثیت ہندو کبھی نیابت نہیں کی اس کا دعوے ہندو مہاسبھا کو ہے۔"

میں نے بارہا اس حقیقت کی اچھی طرح وضاحت کی ہے کہ اور یہ صرف ثابت ہی نہیں ہوا بلکہ صاف طور پر اس کا مظاہرہ ہو گیا کہ کانگریس ہندو انجمن ہے۔ یہ ایک ہی سکہ ہے جس کے دو رخ ہیں ایک طرف مہاسبھا کا ٹھپہ ہے اور دوسری طرف کانگریس کا اور جس بات کو ایک برملا کہہ رہی دوسری اس پر عمل کر رہی ہے۔

میں گاندھی جی کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانان ہند صرف اپنی ہی طاقت پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ ہم اپنے حقوق اور مفاد کے لئے کانگریس اور برطانیہ دونوں کے خلاف الرغم حقدار ہیں اور آخری خندق تک ہم نے جنگ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ ہم کسی اور کے بھروسہ پر نہیں رہتے۔"

اس بیان کے بعد، ر نومبر کو بمبئی کے ۱۹۴۲ء ایک عظیم اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:-

"میں ہمیشہ اس بات کے لئے تیار ہوں کہ مساوی شرائط پر ہندو بھائیوں کے ساتھ سمجھوتہ ہوئے"

اعلان جنگ کے بعد اس ملک میں ایک سنگین نزاکت رونما ہوئی تھی۔ مسٹر گاندھی ویسٹ منسٹر ایبے (لندن کی اہم ترین تاریخی عمارت) اور پارلیمنٹ کے ایوانوں کی تباہی و بربادی کے تصور سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے کہا کہ کانگریس غیر مشروط طور پر برطانوی مقاصد کی حمایت کرے گی لیکن اس طرز عمل کے سلسلے میں انھوں نے اپنے آپ کو یکہ و تنہا پایا۔ چنانچہ کانگریس ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ایسے رزولیوشن منظور کئے جن میں کہا گیا کہ:-

جنگ کے کام میں کانگریس اس وقت تک برطانیہ کا ساتھ نہ دے گی اور اس کے ساتھ تعاون نہ کرے گی جب تک کہ برطانیہ ہندوستان کو ایک آزاد اور خود مختار قوم نہ بنا دے گی۔ اور اہل ہند کو اس بات کی آزادی نہ دے گی کہ وہ امکانی طور پر وسیع ترین رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کی ہوئی ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے ذریعہ سے ایک دستور بنالیں لیکن حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ ہم ہندوستان کے مختلف مفادات سے مشورہ کے بعد ہندوستان کے لئے دستور بنانے کا پورا اور مکمل حق اپنے لئے محفوظ رکھتے ہیں"

اب جہاں دونوں (یعنی برطانیہ اور کانگریس) یہ دعوے کر رہے تھے کہ بس ہم ہی اس معاملہ میں تنہا حکم اور جج ہیں۔ وہاں مسلم لیگ کی پوزیشن یہ تھی کہ مسلم لیگ نے دونوں میں سے کسی کے اس حق کو تسلیم نہیں کیا کہ وہ مسلمانوں کے سر پر ایک ایسا دستور منڈھ سکتا جس سے مسلم لیگ متفق نہ ہو اور جسے مسلم لیگ نے پسندیدہ نہ سمجھا ہو۔ اور اب ہم اس کوشش میں آخر وقت تک لڑیں گے کہ ہم پر کوئی ایسا دستور نہ منڈھا جائے"

سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے مسٹر جناح نے فرمایا کہ "اقلیتوں کو صرف یہی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کی فکر کریں کہ ان کے فوائد محفوظ ہوں بلکہ انہیں یہ جانتے کا حق بھی حاصل ہے کہ ملک میں کس قسم کا دستور نافذ ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

چار صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس چیز کے پیش نظر مسلمانوں کو ایک اقلیت والی قوم قرار دینا غلط ہے۔ میں بالکل مساویانہ حیثیت سے ہندو بھائیوں کے ساتھ سمجھوتے کے لئے تیار ہوں لیکن ایک ایسے سمجھوتہ کے لئے تیار نہیں ہوں جیسا کہ ایک اقلیت والی قوم ایک اکثریت والی قوم کے ساتھ کیا کرتی ہے۔ مجھے ہندوؤں کے ساتھ کوئی عناد نہیں ہے۔ لیکن جب تک موجودہ کانگریس ہائی کمانڈ ایک قسم کی فاسسطائی گرینڈ کونسل بنی رہے گی اس وقت تک سمجھوتہ کی امید نہیں ہے۔ اصول کے لحاظ سے جمہوریت کچھ اور چیز ہے اور عمل کے لحاظ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ جمہوریت ایک گرگٹ کی طرح ہے جو اپنے ماحول کے مطابق اپنا رنگ بدل لیا کرتا ہے۔ چنانچہ جمہوریت کا رنگ انگلستان میں کچھ اور ہے اور امریکہ میں کچھ اور ہے۔ اسلام اخوت آزادی اور مساوات کا قائل ہے وہ مغربی طرز کی جمہوریت کا قائل نہیں ہے۔

ہندوستان میں وہ جمہوری پارلمنٹری نظام ناکام ہو چکا ہے جس کا دستور پارٹی گورنمنٹ کی اساس پر قائم ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو بہ مقابلہ مسلمانوں کے تگنے ہیں۔

اس کے بعد مسٹر جناح نے کانگریس کی جمہوری حیثیت پر نظر ڈالی اور سوال کیا کہ آیا یہ جمہوریت ہوئی کہ ایک گرانڈ فاسسطائی کونسل نے واردھا میں بیٹھکر صوبوں کے ان وزیروں کے نام جو مجالس قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہیں احکام جاری کر دیئے اور پھر لطف یہ ہے کہ اس عظیم فاسسطائی کونسل کا واحد اور آخری ڈکٹیٹر ایک ایسا شخص ہے جو اس نام نہاد جمہوری جماعت کا چار آنے والا ممبر بھی نہیں ہے جو لوگ سچائی کا پروپیگنڈا کیا کرتے ہیں۔ میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ مسائل کا سامنا کریں ان مسائل کا جنکی نظیر دنیا میں موجود نہیں ہے"

اسی تاریخ ایوان امرا میں وزیر ہند نے بھی ایک بیان دیا جس میں وائسرائے کی تجاویز اور گفتگوئے مصالحت اور اس کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:۔

جب تک کہ پہلے ان مشکلات کے متعلق کوئی راہ نہیں نکلتی جو کانگریسی حکومت

والے صوبوں کے اندر مسلمان اپنی پوزیشن کی نسبت محسوس کر رہے ہیں۔ اس وقت تک ان تجویزوں کے معاملہ میں کسی سمجھوتہ کا امکان نہیں ہے جو جنگ کے کام میں مرکزی حکومت ہند کے ساتھ ہندوستانیوں کو شریک کرنے کی غرض سے ان کے زیر غور تھیں۔۔۔ کانگریس نے گورنر جنرل کی پیش کی ہوئی ٹھوس تجاویز پر اس وقت تک غور کرنے سے قطعی انکار کر دیا ہے جب تک کہ ملک معظم کی حکومت پہلے اس مفہوم کا اعلان نہ کر دے کہ ہندوستان ایک خود مختار قوم ہے اور یہ کہ حکومت ملک معظم اس امر کی مخالفت نہیں کرے گی کہ ہندوستان اس کی مداخلت کے بغیر وسیع ترین بنیاد پر ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی طلب کرے اور اس کے ذریعہ سے فرقہ وارانہ نیابت کا سمجھوتہ کر کے آئندہ اپنا طرز حکومت متعین کرے۔

کانگریس نے برابر اس پر اصرار کیا ہے اور اس پر قائم ہے کہ یہ واقعہ اس سلسلہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا کہ ہندوستان میں نسلی اور مذہبی اقلیتیں ہیں۔

کانگریس ہمیشہ اس ارادہ پر قائم رہی ہے کہ خود ہندوستانیوں کے بنائے ہوئے دستور کے ذریعے سے اقلیتوں کے حقوق کا اس طرح تحفظ کیا جائے جو ان کے لئے قابل قبول ہو، مگر ملک معظم کی حکومت کے لئے اس پوزیشن کو قبول کرنا غیر ممکن ہے۔ ہندوستان کے ساتھ برطانیہ کے طویل تعلق کی بنا پر ملک معظم کی حکومت پر ہندوستان کے متعلق ایسی ذمہ داریاں عاید ہیں جن کو وہ اس طرح نہیں چھوڑ سکتی کہ آئندہ ہندوستان کے طرز حکومت کی تشکیل کے معاملہ سے کوئی دلچسپی نہ رکھے۔۔۔۔۔۔ یہ واقعہ بالکل غیر مشتبہ طور سے ثابت ہو چکا ہے کہ اگر ملک معظم کی حکومت سرسری طور پر ہندوستان کے اندر اپنی پوزیشن سے دست بردار ہو جائے اور مجوزہ مفہوم کا اعلان کر دے تو یہ چیز ہندوستانی آبادی کے بڑے بڑے طبقوں کے لئے قابل قبول نہ ہو گی۔"

مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے بھی کانگریسی مظالم کی ایک روئداد شائع کی جس کی حسب معمول کانگریسیوں اور خاصکر پنڈت نہرو نے تکذیب کی اور مضحکہ کیا مگر مولوی فضل الحق نے پنڈت نہرو کو چیلنج کیا کہ وہ اپنی سہولت کا وقت مقرر کریں اور یقیناً ایک روز جن مقامات پر لے جا کر ان کی آنکھیں کھول دینگے اور پھر ان کو نظر آئے گا کہ کانگریس نے کیا کیا

مظالم کیئے ہیں اور بصورت ثبوت وزارتوں کو مستعفی ہونا پڑے گا"

لیکن اس اثنا میں سکے بعد دیگر کانگریسی وزارتیں مستعفی ہوگئیں تاہم یہ مذاکرات جاری رہے۔ ۱۹ ر نومبر کو پھر مولوی فضل الحق نے ایک بیان شائع کیا اور انھوں نے اب معاملہ کا انحصار رائل کمیشن پر کر دیا اور اس بات کو بھی منظور کیا کہ:۔

"اگر پنڈت نہرو میں وزارتوں کے خلاف فیصلہ صادر کرنے کی ہمت ہے تو وہ اس کا اعلان کریں اور میں ان کے ساتھ چل کر اپنے الزامات کی صداقت کا یقین دلا سکتا ہوں لیکن اس کا ہمارے رائل کمیشن کے مطالبہ پر کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ ہم نے اس مطالبہ پر زور دینے کا تہیہ کر لیا ہے اور اگر مطالبہ کمیشن پورا کر دیا گیا تو ہم یہ اور دوسرے قطعی نوعیت کے الزامات اس غیر جانبدار جیوری کے ٹربیونل کے سامنے رکھیں گے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے بنگال کی مسلم لیگی وزارت کے خلاف جو الزام لگائے گئے ہیں میں نے ان کے جواب میں کانگریسی وزارتوں کے خلاف اپنے الزامات کا شوشہ چھوڑ دیا ہے۔ یہ خیال اسی قدر بے بنیاد ہے کہ اس کی تردید کرنا بھی میں اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہوں۔ میں صاف صاف اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ بنگال کے جو ہندو یقین رکھتے ہیں کہ ہماری حکومت کے ماتحت ہندوؤں پر جو مظالم ڈھائے گئے ان کے ثبوت موجود ہیں تو انہیں اس بات کی کھلی اجازت ہے کہ وہ ہمارے خلاف اپنے الزامات کی فہرست مرتب کریں اور میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم اس بات پر رضامند ہیں کہ ان کے یہ الزامات رائل کمیشن کے سامنے پیش کر دئے جائیں اور کمیشن اس بارے میں جو فیصلہ کرے گا ہم اس کے پابند ہوں گے۔ کیا میں امید کروں کہ بنگال کی ہندو اقلیت مسلم لیگ کے رائل کمیشن کا مطالبہ کی حمایت کرے گی۔ جو نہ صرف کانگریسی حکومت کے خلاف مسلمانوں کی شکایات بلکہ مسلم وزارتوں کے خلاف ہندوؤں کی شکایتوں کی بھی تحقیقات کرے گی۔ ہم اس تحقیقات کا سامنا کرنے سے نہیں ڈرتے"

کانگریسی وزارتوں میں جو مظالم و فسادات ہوئے بلا شبہ ان کے متعلق گورنروں نے اپنی خاص ذمہ داری کو عمداً بالائے طاق رکھدیا اُنہوں نے اقلیتوں کے جائز حقوق کی

حفاظت سے طرح دی اور خلل عامہ کے امکانات کو روکنے اور امن قائم رکھنے میں کوئی اقدام نہیں کیا اور اس طرح مسلمانوں نے جو الزام کانگریسی وزارتوں پر لگائے ان میں گورنروں کو بھی بجا طور پر اعانت کا ملزم قرار دیا ۔

اُن میں سے بعض نے اپنی اپنی وزارتوں کے کام پر تحسین بھی کی اگرچہ خود ان کا دل کہہ رہا تھا کہ جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہے ہیں غلط ہے ۔ مگر یہ سب کچھ اس پالیسی کا نتیجہ تھا جو جدید آئین کے ماتحت صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کے لئے قرار دے لی گئی تھی اور ابھی تک پبلک کو ان گورنروں کے اصلی اور دلی خیالات بہت کم معلوم ہوئے ہیں اور جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ سیاسی زبان اور سیاسی احتیاط کے غلاف میں ڈھکا چھپا ہے تاہم اس سے کچھ نہ کچھ حقائق معلوم ہو ہی جاتے ہیں ۔

ان گورنروں میں صوبہ متحدہ کے گورنر سر ہیری ہیگ نے سبکدوشی کے چند ماہ بعد مئی ۱۹۴۰ء میں کیکسٹن ہال لندن میں اپنے صوبہ کی کانگریسی وزارت پر ایک طولانی تقریر کی تھی جس میں اگرچہ حسب معمول تعریف ہے مگر کہیں کہیں حقیقت کا بھی اظہار ہے چنانچہ انتخابات کے متعلق اُنہوں نے کانگریسی مشینری کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ :-

"جب انتخابات کا وقت قریب آیا تو اس میں فوری حرکت شروع ہو گئی اور غیر مستقل طور پر نہیں بلکہ مستقل طور پر ان کا کام جاری رہا جو ان کے مقامی کارکن ہر گاؤں میں کر رہے تھے ، جلسے ، جلوس ، نعرے ، جھنڈے اور ان کے ساتھ ساتھ لوگوں کی شکایتوں سے ہمدردی اور وعدے کچھ اس طرح کئے گئے کہ لوگوں کے سامنے ایک نئے آسمان و زمین کا نقشہ آ گیا اور اس سے ملک میں کچھ ایسی حالت پیدا ہو گئی جس کا اس سے پہلے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا اور اس تغیر حالت کے احساس نے گاؤں والوں کو جگا دیا ، حکومت جس نے گزشتہ شورشوں میں کانگریس کی ہمیشہ بہت سخت مخالفت کی تھی اس وقت بالکل غیر متحرک کھڑی تھی اگر کسی گاؤں والے سے یہ اُمید کی جاتی کہ وہ حکومت کے اس رویہ کو ایک قانونی ضرورت سمجھے تو یہ توقعات سے بالاتر چیز ہوتی اس کی جگہ اس نے یہ محسوس کیا کہ برطانوی راج کمزور ہوتا جا رہا ہے اور کانگریس راج آ رہا ہے اور

جیسا کہ اکثر بیشتر ہوتا ہے اس نے اپنے کو ایسے فریق کے سپرد کر دیا جس کو کہ وہ فریق فاتح خیال کر رہا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انتخابات میں کانگریس کو بہت بڑی فتح حاصل ہوئی۔"

اس کے بعد عارضی وزارتوں اور کانگریس کے برسرِ اقتدار آنے کے سلسلہ میں کہا کہ:۔

"جب جولائی میں بہت پس و پیش کے بعد کانگریس نے عہدے قبول کرنے کا فیصلہ کیا جس وقت کہ یہ بھی (مجلس قانون ساز) بننے والی تھی فوراً ہی اقلیتوں والی وزارتوں نے استعفے دیدئے ان وزارتوں کے ۳ ماہی دورِ حکومت میں صوبہ بالکل خاموش رہا لیکن اس نے اپنی امیدیں نہ چھوڑی تھیں جس وقت کہ کانگریس نے عہدے قبول کر لئے اس کے مداحوں میں جوش پھوٹ پڑا۔ ایک زمانہ تک ہر کانگریسی اپنے آپ کو حکمراں خیال کرتا رہا اور جب کہ ان کو اس بات کا یقین دلایا گیا تھا کہ حکومت ان کی ہے تو نا تجربہ کاری کی وجہ سے قدرتاً انہوں نے خیال کر لیا کہ ملازمینِ حکومت ان کے اپنے ملازمین تھے چنانچہ کانگریسی افراد نے اپنا یہ حق تصور کر لیا کہ وہ پولیس کو احکام دیں اور نظم و نسق کی تفصیل میں مداخلت کریں۔"

پھر مسلمانوں کے متعلق ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"مسلمان جو انتخاب کے وقت باہم منظّم نہ تھے اور جن کی کوئی پالیسی نہ تھی جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ کانگریس کا یہ ارادہ نہیں کہ وہ ان کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرے بلکہ ان کو بھی وہ کانگریس کے اندر ضم کرنا چاہتی ہے تو وہ فوراً متحد ہو گئے اور اس کے بعد ہی مسلم لیگ کی تنظیم شروع ہو گئی اور اتنی جلدی وہ پھیلی اور اس نے طاقت حاصل کی کہ حکومت وقت کے لئے وہ باعث خطرہ بن گئی اور مسلمانوں کی یہ تحریک حکومت کے لئے سب سے زیادہ پریشانی اور فکر کا سبب ہوئی۔"

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ بایں ہمہ پھر کیوں مسلمانوں کے دلوں میں کانگریسی وزراء کے خلاف یہ جذبات تھے اس کا جواب یہ ہے کہ "اس کی وجہ صوبہ کے ماحول میں ملتی ہے، کانگریس کے لیڈر ہمیشہ اپنی جماعت کو ایک قومی جماعت بتاتے رہے ہیں اور کہتے رہے ہیں کہ ہماری جماعت بالکل غیر فرقہ دارانہ ہے اس کے باوجود بھی اس جماعت کے پیروؤں میں ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت ہے اور تحریک ہندو خیالات اور ہندو اثر لے ہوئے ہے عوام کو کانگریسی راج کے خیالات خود بخود ہندو راج میں تبدیل ہو گئے اور اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تمام خیالات پورے......

باب پانزدہم

کانگریسی وزارتوں کے مستعفی ہونے کے بعد ہر جگہ مسلمانوں کو ایک سکون محسوس ہوا اور ۲ دسمبر کو مسٹر جناح نے مسلمانان ہند کے نام حسب ذیل اعلان شائع کیا:-

"میں چاہتا ہوں کہ تمام مسلمانان ہند ۲۲ دسمبر کو جو جمعہ کا دن ہوگا اس امر پر اظہار تسکین کے لئے کہ آخر کار کانگریسی حکومت کا دور ختم ہوگیا ہے، یوم رستگاری و شکرانہ منائیں مجھے امید ہے کہ طول و عرض ہند میں صوبوں اور ضلعوں کی اور ابتدائی مسلم لیگ کمیٹیاں پبلک جلسے کریں گی۔ اور حسب ذیل رزولیوشن ان ترمیمات کے ساتھ منظور کرینگی، جو اس ریزولیشن میں مناسب معلوم ہوں اور نماز دوگانہ اور شکرانہ ادا کی جائے گی کہ نا منصفانہ کانگریسی عہد حکومت سے رستگاری حاصل ہوئی۔ مجھے بھروسہ ہے کہ تمام پبلک جلسے ضبط نظم اور واجبی احساس انکسار کے ساتھ ہوں گے اور کوئی ایسی چیز نہیں کی جائے گی جو کسی دوسری قوم کے لئے تکلیف دہ ہو، کیونکہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ جو ناانصافیاں ہوئی ہیں، بنیادی طور پر ان ناانصافیوں کا ذمہ دار کانگریس ہائی کمانڈ ہے"۔

رزولیوشن مجوزہ مسلمانوں (مقام فلاں) کا یہ جلسہ عام اپنی اس رائے کو ضبط تحریر میں لاتا ہے کہ کانگریسی وزارت نے اپنی قطعی اینٹی مسلم پالیسی سے حتمی و قطعی طور پر دکھا دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ کانگریس کا یہ دعوے جھوٹا تھا کہ وہ انصاف اور معقولیت کے ساتھ تمام مفادات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس جلسہ کی یہ سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے کہ کانگریسی وزارت مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں اور مفلوک کے حقوق و فوائد کے تحفظ کے معاملہ میں ناکام رہی ہے۔

یہ کہ کانگریسی وزارت نے انتظام حکومت سے متعلق اپنے فرائض کی ادائیگی

میں بھی اور مجلس قانون ساز میں بھی دونوں طرح حق المقدور مسلمانوں کی رائے کی تحقیر کی اور مسلمانوں کے کلچر کو تباہ کیا۔ اور ان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں مداخلت کی اور ان کے اقتصادی اور سیاسی حقوق کو پامال کیا۔

نیز یہ کہ جن معاملات میں اختلاف اور تنازعہ تھا کانگریسی وزارت نے ان میں کبھی بھی مسلمانوں کے فوائد کا مطلق لحاظ نہیں کیا اور مسلمانوں کو مضرت پہونچاتے ہوئے ہندوؤں کے مقاصد کی حمایت کی اور ان کا ساتھ دیا اور ان کے مقاصد کو آگے بڑھایا۔

اور یہ کہ کانگریسی حکومت نے برابر چھوٹے چھوٹے معاملات تک میں افسران ضلع کے جائز اور روزمرہ کے فرائض میں مداخلت کی جس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا اور اس طرح ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس سے ہندو پبلک میں یہ خیال پھیل گیا کہ ہندو راج قائم ہو گیا ہے اور اس طرح ہندو جو زیادہ تر کانگریسی تھے نڈر اور بے خوف ہو گئے اور انھوں نے مختلف مقامات پر مسلمانوں کے ساتھ بدسلوکی کی اور مسلمانوں کے ابتدائی حقوق آزادی میں دخل دیا۔

لہٰذا یہ جلسہ مختلف صوبوں میں کانگریسی عہد حکومت کے خاتمہ پر اپنے عمیق احساس تسکین کا اظہار کرتا ہے اور مسرت کے ساتھ آج کے دن پچھلے ڈھائی سال کے ظلم، تشدد اور ناانصافی سے نجات حاصل کرنے پر یوم رستگاری مناتا ہے اور اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہے کہ اسلامی ہندوستان کو ایسی قوت ایسا ضبط نفس اور ایسی تنظیم کی توفیق ہو کہ وہ کامیابی کے ساتھ پھر ایسی وزارت کی آمد کو روک سکے اور صحیح معنی میں عوام کی ایک ایسی محبوب وزارت قائم کرا سکے جو تمام قوموں اور مفادات کے ساتھ مساوی انصاف کر سکے۔

یہ جلسہ ہز اکسلنسی گورنر (صوبہ فلاں) اور ان کی مجلس مشیران سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کی جائز شکایات اور ان زیادتیوں کی تحقیقات کی جائے جو برطرف ہونے والی کانگریسی وزارت نے ان کے ساتھ کی ہیں اور ان شکایتوں اور زیادتیوں کا ازالہ بھی موقع پر ان اعلانات کے مطابق کیا جائے جو گورنروں نے قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۹۳ کے ماتحت مختلف صوبوں کی عنان حکومت لیتے ہوئے کئے ہیں اور اس

طرح جمہور کو یقین دلایا جائے کہ جدید عہد حکومت تمام متعلقہ اقوام اور مفادات کے ساتھ مساوی انصاف کا حامی ہے۔"

اس اعلان پر کانگریسی زعماء اور خاص کر گاندھی جی پنڈت نہرو اور مسٹر پٹیل نے بڑے بڑے بیانات شائع کئے اور یوم رستگاری و شکرانہ کے التوا پر زور دیا۔ بعض انگریزی جرائد نے بھی ان کی ہمنوائی کی۔ ۱۴ر دسمبر کو وزیر ہند نے بھی ایوانِ اُمراء میں حالاتِ ہند پر تقریر کرتے ہوئے یوم رستگاری کی جگہ عارضی صلح کا مشورہ دیا۔"

لیکن آخر میں مسٹر جناح نے سب کے جواب میں ایک واقعاتی اور مُدلّل و جامع بیان شائع کیا۔ پہلے اُنھوں نے کانگریسی وزارتوں کے برسرِ اقتدار آنے کے وقت سے مستعفی ہونے کے وقت تک کے واقعات کو مجملاً بیان کیا اور پھر کہا کہ:۔

بہرحال بابو راجندر پرشاد کو جو خط میں نے لکھا تھا اُس کے بعد کانگریسی وزارتیں مستعفی ہوگئیں۔ بالکل قدرتی طور پر ان کے استعفے سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو بڑا سکون حاصل ہوا۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی فیصلہ کیا تھا کہ اظہار تسکین کے اور اپنے احساس تسکین کو اس شدت کے ساتھ ظاہر کرنے کے لئے کہ جو کان اب تک بہرے تھے وہ بھی ہماری بات سننے پر مجبور ہو جائیں ایک یوم رستگاری منایا جائے۔ یہاں میں اس چیز کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ہماری اپیلیں مناسب وقت پر سُنی گئی ہوتیں تو ہماری طرف سے ابھی کسی کارروائی کی ضرورت نہ ہوتی۔

"یوم رستگاری" منانے کے متعلق میری اپیل کو مختلف عنوانات کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ اپیل بے وقت ہے۔ اشتعال انگیز ہے اور مخالفِ قومیت ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ منتخب حکومتوں کی روانگی پر بغلیں بجائیں اور افسروں کی حکومت کا خیر مقدم کریں۔

میں خوشی سے اُن نکتہ چینیوں کا جواب دیتا ہوں۔ جہاں تک وقت کا سوال ہے میری اپیل ان وجوہ کی بنا پر جو میں پہلے بتا چکا ہوں اس سے قبل شائع نہیں ہو سکتی تھی۔ رہی پنڈت جواہر لال نہرو کی آمد سے اس کے تعلق یا ان کی آمد پر اس کے اثر کی بات، وہ میں اس بیان کے آخر میں بتاؤں گا۔ جہاں تک میری اپیل کی اشتعال انگیز ہونے کا تعلق ہے میں اپنی اپیل کے الفاظ کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ میں نے اپیل میں کہا کہ :-

"مجھے بھروسہ ہے کہ تمام پبلک جلسے شائستہ طریق پر ہوں گے اور واجبی احساس انکسار کے ساتھ ہوں گے اور کوئی ایسی حرکت نہیں ہونی چاہئے جس سے کسی قوم کو تکلیف پہنچے۔"

اپنے اس اصرار کو بالکل واضح کرنے کے لئے کہ "یوم رستگاری" کے جلسے اسی اسپرٹ میں ہوں گے۔ کوئی ہڑتال نہیں ہونی چاہئے۔ کوئی جلوس نہیں نکلنے چاہئیں۔ یا اس قسم کے کوئی مظاہرے نہیں ہونے چاہئیں۔ بلکہ روح انکسار جاری وساری ہونی چاہئے اور لوگوں کو غور وفکر کا طرز اختیار کرنا چاہئے۔ ہمارے دلوں میں سکون وامتنان کے جذبات تو ہیں خوشی وکامرانی کے نہیں ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ کہنا انتہائی ناانصافی ہے کہ مسلمان موجودہ حکومت کا خیر مقدم کرتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ ہم ان پر زور دیتے ہیں کہ ہماری شکایات کی تحقیقات کیجئے اور ان کا ازالہ کیجئے، لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایسا کرنا ان کے اختیار میں ہے۔ دوسری طرف میری اپیل میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ سچ مچ عوام کی ایسی محبوب وزارتوں کے قیام کی دُعا مانگی جائے جو تمام قوموں اور مفادات کے ساتھ برابر انصاف کرنے والی ہوں۔

لیکن میری اپیل پر ایک بیان ایسا بھی شائع ہوا ہے جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ کانگریس پارلیمنٹری کمیٹی کے صدر جیسے مستند آدمی کا بیان ہے، مجھ سے کہا گیا ہے کہ

ہمارے تمام الزامات بالکل جھوٹے اور غیر حق بہ جانب ہیں۔ اسی کی توقع بھی تھی، لیکن مجھے
ان کے اس اعلان پر توجہ کرنی چاہیئے۔"

"مزید براں میرے ایما سے ہر وزیر اعظم نے اپنے گورنر کو دعوت دی تھی کہ گورنر جب
کبھی محسوس کرے کہ وزارت کی کارروائی صحیح نہیں ہے وہ بلا تامل اقلیتوں کے حقوق و
فوائد سے تعلق رکھنے والے معاملات میں مداخلت کریں۔ جب حال میں مسٹر جناح نے
الزامات پیش کئے تھے میں نے ہر وزیر اعظم کو ہدایت کی تھی کہ گورنر کی توجہ ان الزامات
کی طرف منعطف کرانی چاہیئے۔ کیونکہ یہ الزامات گورنر سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اس پر مجھے
اطلاع دی گئی کہ گورنر صاحبان الزامات کو بے بنیاد سمجھتے ہیں۔"

مندرجہ صدر بیان کی بنا پر ایک بہت سنگین مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے کیونکہ اس واقعہ
میں گورنر صاحبان بھی لپٹ جاتے ہیں! میں مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کو بتانا چاہتا ہوں کہ
ہمارے پاس اپنے دعوے کے ثبوت میں زبردست شہادتیں موجود ہیں۔ اور جیسا کہ انھوں
نے سمجھا ہے۔ ہم تحقیقات سے بھاگتے نہیں، بلکہ میرا اصرار ہے کہ حکومت برطانیہ ایک
شاہی کمیشن مقرر کرے۔ جو صرف ملک معظم کی ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل ہو۔ اور اس کا
صدر پریوی کونسل کا کوئی امیر قانون (لا لارڈ) ہو۔ کانگریس کی طرف سے یا کسی دوسرے
گوشے سے میرے اس مطالبہ پر کوئی اعتراض میری سمجھ میں نہیں آتا اور میں ان سے مطالبہ
کرتا ہوں کہ وہ میری اس درخواست کی تائید کریں۔

اپنا یہ بیان ختم کرنے سے پہلے مجھے مسٹر گاندھی کی اپیل اور پنڈت جواہر لال نہرو
کی آمد کا ضرور ذکر کرنا چاہیئے۔ اگر مسٹر گاندھی اور دوسرے کانگریسی لیڈر خلوص کی ایسی فضا
کی ضرورت کے متعلق جس میں فرقہ وارانہ تصفیہ ہو سکے، وہی کرتے بھی جو کہتے ہیں تو میں
مسٹر گاندھی کی اپیل پر لبیک کہنے پر مائل ہوتا۔ کیا میں انھیں یاد دلاؤں کہ جب دہلی میں
باتیں ہوئی تھیں اس وقت سے برابر زبردست جد و جہد جاری ہے جسے خود مسٹر گاندھی
نے شروع کیا ہے۔

دہلی میں ماہ اکتوبر میں مسٹر گاندھی کے ساتھ میری باتیں ہوئی تھیں، اس کے

بعد اُنہوں نے مسلم لیگ کو سامراج کا ایجنٹ بتایا ہے۔ ہندوستان کی آزادی و ترقی کے راستہ کی رکاوٹ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ مسلم لیگ کی کبھی سیری نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ہمیشہ حکومت برطانیہ کی طرف نظریں اُٹھائے رہتی ہے کہ حکومت برطانیہ اس کے مطالبات پورے کردے مسٹر گاندھی نے مسلمانوں کو یہ دھمکی بھی دی ہے کہ چاہے مسلمان اس وقت ملک کی ترقی کو روک لیں لیکن وہ زیادہ مدت تک ایسا نہیں کرسکتے ؎

مزید برآں کانگریسی اخبارات اور کانگریسی جماعتیں ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر مسلم لیگ کو بدنام کرنے کے لئے اور مسلمانوں کی صفوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لئے پروپیگنڈا کر رہی ہیں۔ میرے پاس بہت سی مثالیں ہیں ان میں سے صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ شاید مسٹر گاندھی کو خبر نہیں ہے کہ خود صدر کانگریس کے صوبہ کی یعنی بہار پراونشل کانگریس کمیٹی نے صداقت آشرم ڈاکخانہ ڈیگاگھاٹ پٹنہ سے ایک خفیہ خط جاری کیا ہے۔ یہ خط ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی گیا کو بھیجا گیا تھا جو اخبار اسٹار آف انڈیا میں ۴ دسمبر کو شایع ہوا تھا۔ جس کی کوئی تردید نہیں ہوئی ہے اس خط میں لکھا ہے کہ:۔

"مجھے اُمید ہے کہ اب آپ کو یقین ہوگیا ہوگا کہ ایک اہم مسئلہ ہمارے سامنے ہے اور جو حل طلب ہے اور اس طرح سلف گورنمنٹ کے متعلق ہماری منزل مقصود کی طرف ہماری اقدامی حرکت کے لئے نمونہ تیار کر رہا ہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ہندوستان کے کانگریسی خیال کے اور سچے نیشنلسٹ مسلمان آواز اُٹھائیں تاکہ لیگ نے تمام ترقی کے راستہ میں جو رکاوٹ ڈال رکھی ہے وہ غائب ہو جائے"

مجھے یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ان اصولوں پر روزانہ جو پروپیگنڈا ہو رہا ہے اس کا بالکل وہی نتیجہ ہوگا جو مسٹر گاندھی کو اندیشہ ہے کہ میری اس ایک اپیل سے سامنے آئے گا ؎

اب میں اس خاص اعتراض کی طرف آتا ہوں جو میری اپیل کے خلاف کیا

گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ پنڈت نہرو کے اور میرے درمیان فرقہ وارانہ گفتگوؤں کے انعقاد پر اس کا مضر اثر پڑے گا۔ اس سلسلے میں میں پبلک کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ جو خوش فہمی کے ساتھ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے کہ گفت وشنید تصفیہ کے قریب پہونچ رہی ہے، بات یہ نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ گفت وشنید ابھی شروع ہی نہیں ہوئی ہے۔ پنڈت نہرو اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کے ساتھ میری جو باتیں ہوئی تھیں وہ بالکل سیاسی نوعیت کی تھیں اور ان سیاسی مطالبات سے متعلق تھیں جو اس وقت کانگریس نے حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کئے تھے۔ اس چیز کو خود کانگریسی لیڈر بیان کر چکے ہیں، دہلی میں میں نے اُن سے کہا تھا کہ جبتک کہ پہلے کانگریس اور لیگ کے درمیان سمجھوتہ نہیں ہو جاتا میں حکومت برطانیہ کے سامنے کسی مشترک مطالبہ میں شرکت نہیں کر سکتا۔ میں نے انکو یہ بھی بتا دیا تھا کہ ایسا کوئی سمجھوتہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جبتک کہ مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی مستند و نمائندہ جماعت تسلیم نہ کر لیا جائے۔ کانگریسی لیڈروں نے اس پوزیشن کو قبول نہ کیا اور گفتگو اسی نکتہ پر ختم ہو گئی جب پنڈت نہرو نے مجھ سے پھر ملنے کی خواہش ظاہر کی تو میں مسرت کے ساتھ آمادہ ہو گیا اور میں اُنکی آمد کا منتظر ہوں۔"

چوں کہ بیانات کا سلسلہ جاری تھا اور مظالم سے برابر انکار کیا جا رہا تھا اس بنا پر، ۱۸ دسمبر کو پھر مولوی **فضل الحق** (وزیر اعظم بنگال) نے ایک مفصل وطول بیان شائع کرایا اور مصدقہ دستاویزات کی بنا پر ایک سو چالیس مثالیں نمونۃً ان مظالم کی پیش کیں جن میں (۶۵) صوبہ بہار کی (۵۴) صوبہ متوسط (سی پی) کی اور (۲۰) صوبہ متحدہ کی تھیں۔ لیکن ان صاف و روشن واقعات کی تردید کیوں کر ممکن تھی، پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی بالآخر خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

ہندوستان کی تاریخ میں ۲۲ دسمبر کی تاریخ یادگار رہے گی طول وعرض ہند کے گوشہ گوشہ میں دیہات و قصبات اور شہروں میں اپنے قائد اعظم کے اعلان و ہدایت کے مطابق اور کامل طور پر سکون و انکسار کے ساتھ یوم رستگاری منایا گیا اور اپنے محبوب لیڈر پر اظہار اعتماد کیا گیا۔

مدراس کی غیر برہمن قوموں نے صوبہ بمبئی کے پارسیوں نے اور جا بجا اچھوتوں نے ان جلسوں میں شرکت کی اور بعض جگہ بطور خود منایا۔ بمبئی میں جہاں قائد اعظم بھی موجود تھے نہایت پُرعظمت نظارہ اور لاکھوں آدمیوں کا اجتماع تھا جن میں دیگر قوموں کے لوگ بھی تھے اور ان کے لیڈروں نے نذرِ عقیدت بھی پیش کی۔

ٹائمز آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق بمبئی میں ایسا اور اتنے سکون کے ساتھ کوئی اجتماع نہیں ہوا۔ ان مظاہروں کے متعلق اسی اخبار میں ایک معاند انگریز کا ایک بیان شائع ہوا جس کا اہم اقتباس یہ ہے کہ:۔

"**مسٹر جناح** کے مشہور و معروف یوم نجات سے متعلق جو مواد صحافت نے بہم کیا ہے یا جو تنقید یں اور مضامین اس پر لکھے گئے ان کا مطالعہ کرنے کے بعد جو اولین تاثرات پیدا ہوتے ہیں وہ یہ کہ تاریخ ہند کا ایک مشہور واہم واقعہ ہے جو اپنی تاریخ آپ بنا رہا ہے۔ لیکن اس کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ مستحق تھا۔ یہ وہ نمایاں کارنامہ ہے جو ہر مفکر کو خواہ وہ مرد ہو کہ عورت، دعوتِ فکر دیتا ہے۔ لیکن یا تو اسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا یا اسے ایسی وقعت نہیں دی گئی جو دی جانی چاہیے تھی۔

اس بات پر زور دینے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کا جو خاکہ بنایا جائے گا۔ اس کی تکمیل اسی نقطہ سے ہو گی یہاں جو تصوّرات اس سے متعلق پیدا ہوئے وہ یہ کہ ایک احتجاج کا عام طریقہ تھا اور بس اس سے بڑھ کر اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس شکل وصورت میں اسکو پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کبھی ہندو بیرون ہند کے شعور بیدار نہ ہوں اس قصور سے متاثر ہو کر مسٹر جناح کے بعض رفقائے کار ان کا ساتھ دینے میں پس وپیش کرنے لگے۔ تاہم انتہائی راست بازی و جراءت عزم راسخ اور اس اعتماد کے ساتھ جو انہیں مسلمانوں میں حاصل ہے۔ **مسٹر جناح** نے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ تمام مزاحمتوں کو اپنی راہ سے ہٹاتے ہوئے اپنے اس اعلیٰ مقصد کو لے کر آگے بڑھے اور شاندار طریقہ سے اختتام کو پہنچایا۔

اس سے بحث نہیں کہ **مسٹر جناح** کی پالیسی کیا ہے! کوئی اس سے اتفاق کرتا ہے یا نہیں؟ اس سوال سے نفس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ **مسٹر جناح** کے تصورات

جداگانہ اوروں کے تصورات جدا کوئی اس سے متفق ہو یا نہ ہو یہ اپنے اپنے مذاق پر موقوف ہے لیکن مسئلہ زیر بحث ذاتیات سے کہیں بڑھا ہوا تھا۔ اس لئے مسٹر جناح کا احتجاج نہ صرف جمہوریت کی اعلیٰ ترین روایات کے مطابق تھا۔ بلکہ وہ اس ونارت اور فحش گوئی سے پاک و منزہ تھا جو ان لوگوں کے احتجاج میں پائی جاتی ہیں جن کا طریقہ تفکر مسٹر جناح کے طریقہ تفکر سے بالکل مختلف ہے اور مسٹر جناح کے نقاط نظر کے برخلاف ''اوہام پرستی اور غیر معتدل بدگوئی میں رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں ہر جگہ یوم نجات منایا گیا۔ جس کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ نہ کوئی پتھر کسی پر پھینکا گیا۔ اور نہ کسی پر کسی کا دست تعدی دراز ہوا۔

خصوصاً مسلمانوں کو فخر کرنا چاہیئے کہ ان کی یہ عظیم الشان کامیابی نہ صرف آئینی تھی بلکہ معقول بھی۔ ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ تاریخ ہند کا یہ اہم واقعہ بحیثیت ایک جماعت کے ان کے کردار کا ایک آئینہ تھا جس سے کذب و افترا کی عمارتیں خود بخود منہدم ہو گئیں۔ اس کے نتائج کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ کیونکہ واقعہ مذکور محدود فرقہ پرستی سے زیادہ بلند و زیادہ حوصلہ افزا ہے ''

اس واقعہ نے یہ ثابت کر دیا۔۔ کہ ہندوستان کے باشندے اعلیٰ پیمانہ پر نہایت ہی منظم طریقہ سے سیاسی اقدام کر سکتے ہیں۔ اور ان میں یہ قابلیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اگر ان کی صحیح اور باہمت طریقہ سے قیادت کی جائے تو وہ عدیم المثال شائستگی کے ساتھ اپنے جذبات و احساسات کا عملی طور پر مظاہرہ کر سکتے ہیں۔

یقیناً یہاں ایسا ہی مظاہرہ ہوا۔ جس کا مستقبل غیر معمولی طور پر امید افزا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ صرف قیادت کا قصور ہے۔ (نہ کہ عوام کا) کہ ہندوستان کی سیاسیات کو تشدد و اعمال خصوصاً افکار سے ملوث کر دیا جاتا ہے۔ یہ گناہ ایسا نہیں ہے کہ اسے یہ سمجھ کر قابل عفو قرار دیا جائے کہ ایسے اشتعال انگیز واقعات دنیا میں پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ یوماً فیوماً بلکہ ساعتہً فساعتہً ہندوستان ان لوگوں کے ہاتھوں بے لگام تشدد کا عادی ہوتا جا رہا ہے۔ جو لفظاً و تفکراً تو متشدد ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو عدم تشدد کا دیوتا سمجھتے ہیں۔ پھر کس طرح جہلا اور غیر مہذب عوام سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ

اعمال تشدد سے اجتناب کریں گے۔"

ہندوستانی قوم کی تنظیم و تکریم کے مستحق صرف مسٹر جناح ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ اپنے احتجاج میں حق بجانب تھے اور مسلمانوں کی نیک نیتی و بے نفسی کو ظاہر کرنا چاہتے تھے بلکہ اس لئے کہ مسٹر جناح نے اس راز کا انکشاف کیا کہ ہندوستانی ہندی قوم کی حیثیت سے نہ صرف بحیثیت قوم مسلم سچی جمہوریت کی راہ پر لگائے جا سکتے ہیں۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں سے اپیل کی اور مسلمانوں نے اپنی قدیم شائستگی اور روایات کے دامن کو بدگوئی اور نامناسب اعمال سے بچاتے ہوئے اُنکی اپیل پر لبیک کہا۔

کیا یہ زیادتی ہوگی اگر ہندوستان کی رائے عامہ کے نمائندوں سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اس واقعہ سے سبق سیکھیں۔ اور رشک و حسد کی بجائے فراخدلی کو اپنے قلوب میں جگہ دیں۔ اور حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھیں اور حق و صداقت کی قیادت کو قبول کرلیں؟ اور کیا یہ نام نہاد خداوندان عدم تشدد کے قدرت سے باہر ہے کہ وہ اپنے اعمال تشدد کو چھوڑ کر عدم تشدد کو اس کے اپنے حقیقی خط و خال کے ساتھ اختیار کرلیں اور تشدد خواہ وہ کسی صورت میں نمودار ہو اسکو تشدد تسلیم کریں؟ اگر اُنھوں نے ایسا کیا تو یقیناً اس واقعہ کی مثال ہر نوعیت کی مادی تشدد سے اجتناب کی تعلیم سے بے نیاز کردے گی۔"

کانگریسی زعما نے سلسلہ بیانات کے علاوہ اپنی پوری قوت صرف کی تھی کہ مسلمان اور خصوصاً غیر مسلم قومیں یوم رستگاری نہ منائیں پروپاگنڈا کے لئے کانگریسی پریس وقف تھا اور اُس نے مخالفت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا، ان مسلمانوں سے جو اس کے ہاتھوں میں بک چکے ہیں جتنی شرارت آمیز مخالفت ممکن تھی کرائی گئی لیکن تمام تدابیر ناکام رہیں اور یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوگئی کہ کانگریسی وزارتوں سے وہ قلیل التعداد اقوام جو مجموعتہً کانگریس سے اور ان قوموں سے جن کی نمائندگی کا وہ دعوےٰ کرتی ہے زیادہ ہی ہیں بیزار تھیں اور صرف مسلم لیگ ہی ہے جو مسلم حقوق کی محافظت کے ساتھ ساتھ ان کے حقوق و مفادات کو بھی محافظ ہے یوم رستگاری

کو ناکام بنانے کے لئے کانگریس نے جو کوششیں کیں جب وہ ناکام رہیں تو ۲۶ جنوری ۱۹۴۰ء کو یوم آزادی منانے کا ڈھونگ رچایا تاکہ یوم رستگاری کے اثرات پر پردہ ڈالا جائے مگر مسٹر جناح کے بروقت انتباہ سے نہ مسلمان شریک ہوئے اور نہ دوسری قوموں نے حصہ لیا۔

یوم آزادی کی قلعی بھی گاندھی جی کے بیانات سے اتر گئی اور دنیا کو معلوم ہو گیا کہ کانگریس ہائی کمانڈ پھر اس بات کے لئے بیقرار ہے کہ برطانیہ کی سیادت قائم رکھ کر پہلے کی طرح حکومت سے ایک ایسا شریفانہ معاہدہ کرے جس سے مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے مفادات قربان و پامال کرنے کی طاقت اس کے ہاتھ میں آجائے گا اور وزارتیں واپس آکر رام راجیہ کی یاد تازہ کرائیں۔

چنانچہ ادھر ۹، ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے آزاد جمہوری حکومت کے قیام اور ہندوستان کو ایک آزاد قوم تسلیم کرنے کے اعلان کا جو نہایت وسیع پیمانہ کی آزادی کے ساتھ ہو پر زور مطالبہ کیا۔ ادھر گاندھی جی نے ۲۹ اکتوبر کو اپنے اخبار میں صاف طور پر برطانوی سیادت قائم رکھے جانے کا اعلان کر دیا کہ :۔

اگر برطانوی ہندوستان سے آج چلے جائیں تو پنجاب سے پنجابی اور مشرق سے گورکھے آکر ہندوستان کو ویران کر دیں ... اگر ہندوستان میں ان کی (یعنی برطانیوں کی) سیادت قائم رکھنے کا کوئی خواہش مند ہو سکتا ہے تو وہ کانگریس ہی ہے۔

گویا پنجاب ہندوستان کا جزو نہیں ہے اور یا یہ کہ پنجابی سے صحیح مراد مسلمان ہیں۔ اسی مضمون کا ایک ٹکڑا اور بھی ہے جو کانگریس کو بے نقاب کرتا ہے یعنی

ہندوستانیوں کی اور ان ہندوؤں کی جو اکثریت کے باوجود کمزور ہیں وہی (کانگریس) ایک نمایندہ اور مختار انجمن ہے۔

کانگریس کا مقصد کبھی مکمل آزادی نہیں رہا زمانہ اعتدال میں تو صاف طور پر ڈاکٹر راش بہاری گھوش نے کہدیا کہ :۔

"ہندوستان میں خود ملکی حکومت مگر کامل آزادی کے ساتھ نہیں"
صدر نشینان کانگریس انگریزی حکومت کو منجانب اللہ ہی سمجھتے اور کہتے رہے۔
۱۹۲۱ء میں جب آزادی کامل کا رزولیوشن مولانا حسرت موہانی نے پیش کیا تو خود گاندھی جی نے مخالفت کی اور ۱۹۲۸ء کی نہرو رپورٹ میں باوجود آزادی کے رزولیوشن کے جو مدراس میں پاس ہو چکا تھا درجہ نوآبادیات قبول کر لیا گیا۔ اس رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کر دینے کے بعد آزادی کامل کا جوش و جذبہ پیدا ہوا لیکن راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے مباحث گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ اور وزارتی کرسیوں پر قبضہ کرنے کے بعد اس جوش میں افسردگی پیدا ہو گئی اور فیڈریشن کانگریس کا مطمح نظر بن گیا۔ مخفی طور پر حکومت سے ساز باز ہوا اور تمام کوشش اس نقطہ پر مرتکز ہو گئی کہ اس وفاقی حکومت میں کانگریس کی اکثریت ہو جائے تاکہ ہندوستان کا تمام اعلےٰ دفتری اقتدار اس کے ہاتھ میں آ جائے اور برطانوی سنگینوں کے سایہ میں رام راج قائم کر دیا جائے۔
گاندھی جی اور ہائی کمانڈ یعنی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے مقتدر ممبر اس جماعت اور اُن تمام افراد کو راستہ سے ہٹا دینے کے درپے رہے جو ان کے مقاصد میں سدِّ راہ متصوّر ہوا۔ پرجوش نہرو کو پورے طور پر مسحور کر لیا گیا۔ ان کے الفاظ کیسے ہی جوش انگیز ہوں تقریریں کیسا ہی جذبہ نمایاں کیا جائے لیکن معنی و ماحصل یہ کہ "گاندھی جی کا جو حکم ہے وہ ہی واجب التعمیل ہے" اور یہ کہ "ورکنگ کمیٹی کبھی غلطی نہیں کرتی"۔
مسٹر بوس البتہ مسحور نہ کئے جا سکے اور نہ ہائی کمانڈ اور گاندھی جی کو ان پر اعتماد رہا جب وہ یورپ میں تھے تو ان پر جاسوس مقرر کئے گئے۔ پنڈت نہرو جو ان کے رفیق رہ چکے ہیں اتنے سخت حریف و رقیب ہو گئے کہ انہوں نے اپنی خود نوشت ضخیم سوانح عمری میں باوجودیکہ بہت سی دُور از کار باتوں کے لئے متعدد صفحات وقف کر دئے مگر مسٹر بوس کے کارناموں کا کہیں اور کوئی تذکرہ نہیں حالاں کہ ایسے شخص کا نام جس نے سول سروس سے استعفا دیا ہو قید و بند کے مصائب برداشت کئے ہوں نظر بند اور جلا وطن رہا ہو اور کانگریس کے لئے انتہائی ایثار کیا ہو دیگر زعمائے کانگریس کے

ساتھ جگہ پانے کا مستحق تھا مگر جذبہ رقابت اور غرورِ قیادت نے اجازت نہ دی۔
مسٹر پٹیل کے ساتھ بھی مسٹر بوس کے تعلقات خوشگوار نہ تھے اور ان کے بھائی مسٹر وٹھل داس پٹیل کی ایک وصیت کے متعلق سخت اختلاف تھا اس لئے ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس میں انتہائی استبداد نمایاں رہا۔
۱۹۳۸ء میں صدارت کانگریس کے لئے مسٹر بوس دوبارہ امیدوار ہوئے جسے کانگریس ہائی کمانڈ نے ناپسند کیا اور ان کے خلاف ایک بیان شائع کر دیا اور متعدد ممبروں کے دستخطوں سے مسٹر سیتہ رامیا (مدراس) کے حق میں اپیل کی گئی جو بالمقابل صدارت کے امیدوار تھے مگر ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے علی الرغم آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ڈیلی گیٹوں نے مسٹر بوس کو کافی کثرت رائے سے انتخاب کر لیا اس انتخابی کارروائی کے دوران میں فریقین کی طرف سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے بہت سی ناجائز کارروائیاں بھی کی گئیں نتیجہ انتخاب کے بعد گاندھی جی منظر پر آئے اور انہوں نے صاف طور پر اعلان کیا کہ "ستیا رامیہ کی شکست میری شکست ہے" اس اعلان نے بہت سے پرستاروں کے دل ہلا دئے اور وہ سمجھے کہ کوئی خدائی قہر نازل ہونے والا ہے۔
بمقام تری پورہ (جبلپور) جو سالانہ اجلاس منعقد ہوا اس میں مسٹر بوس باوجود شدید علالت کے شریک ہوئے لیکن گاندھی جی راجکوٹ تشریف لے گئے کیوں کہ وہاں کی پرجا اور راجا کے درمیان شدید کشمکش تھی اور راجہ نے اصلاحات کے جو وعدے کئے تھے اب ان سے انحراف ہو رہا تھا لیکن جب اپنے مطالبات کو منوانے میں ناکامی ہوئی تو مرن برت رکھ لیا اس خبر کے شائع ہوتے ہی کانگریسی وزارتوں میں زلزلہ آگیا وزراء نے دھمکیاں دیں کہ اگر وائسرائے نے مداخلت نہ کی تو سب مستعفی ہو جائیں گے۔ بالآخر وائسرائے نے گاندھی جی کی مرضی سے یہ معاملات سر گوئر مارس چیف جسٹس فیڈرل کورٹ کے سپرد کر دئے اور مرن برت ختم ہو گیا لیکن جیسا کہ حقیقی مدعا تھا اس مرن برت کے اعلان نے تری پورہ میں بوس کے خلاف ایک مہیب فضا پیدا کر دی اور بجائے اس کے کہ ملک کی آزادی دستور کی بربادی۔

سامراج کے خلاف محاذ جنگ کی تیاری کے متعلق غور و فکر کی جاتی۔ مسٹر پنت (سابق) وزیر اعظم صوبہ متحدہ نے ایک قرارداد پاس کرائی کہ کانگریس کی عنان قیادت گاندھی جی کے ہاتھوں میں رہے اور وہ ہی جدید ورکنگ کمیٹی کا انتخاب کریں حالانکہ بروئے قانون یہ اختیار اور حق صدر کا تھا، اس نام نہاد جمہوری جماعت نے آمریت کی بدترین مثال دنیا کے روبرو پیش کی۔

اجلاس کے بعد مسٹر بوس اور گاندھی جی کے درمیان مراسلت کا سلسلہ جاری ہوا۔ مسٹر بوس اس وقت بستر علالت پر تھے جو خطرناک حد تک تھی بعض نجومیوں نے ان کی بیماری کو مخالفین کے جادو کا اثر بتایا اور خود مسٹر بوس اسی وہم میں مبتلا ہو گئے اپریل میں بمقام کلکتہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ گاندھی جی خود آئے بالمشافہ اور دوستانہ گفتگوئیں ہوئیں۔ مسٹر بوس نے تری پورہ کے فیصلہ کے اتباع میں گاندھی جی سے مجلس عاملہ منتخب کرنے کی درخواست کی مگر انکاری جواب ملا اور کنایۃً ایک طرح عدم تعاون کا اظہار کر دیا گیا۔ اس حالات میں مسٹر بوس استعفےٰ پر مجبور ہو گئے اور ان کی جگہ بابو راجندر پرشاد صدر کانگریس منتخب کئے گئے۔

کانگریس کے اجلاسوں کی بدتمیزیاں بھی روایتی حیثیت رکھتی ہیں دسمبر ۱۹۰۷ء میں بمقام پونہ جو بدتمیزیاں ہوئیں وہ یادگار ہیں۔ مسٹر راش بہاری گوش کی تحریک صدارت پر مسٹر تلک نے ترمیم پیش کرنی چاہی تو اُن کو اجازت نہیں ملی دفعتہً ایک جوتا پھینکا گیا جو سر فیروز شاہ مہتہ کے لگا۔ پھر لاٹھیاں استعمال کی گئیں اور مسٹر گوکھلے کی پگڑی پر بھی پڑیں پلیٹ فارم پر حملہ ہوا۔ کرسیاں پھینکی گئیں اور ایک طوفان بے تمیزی برپا ہو گیا بالآخر پولیس نے مداخلت کی اور پنڈال خالی کرا لیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد دوسرے دن الگ الگ اجلاس ہوئے۔ سر فیروز شاہ مہتہ اور سر سریندر ناتھ بنرجی، مسٹر گوکھلے اور لالہ لاجپت رائے نے نیشنل کنونشن کے نام سے ایک جماعت قائم کی اور یہ رزولیوشن پاس کیا کہ:۔

"ہم انگریزی نوآبادیوں کے نمونہ کی خود اختیاری حکومت کو اپنے لئے کافی سمجھتے

ہیں اور اس کے حصول کے لیے جائز قانونی ذرائع سے کام لیں گے اور گورنمنٹ کی اعانت کے خواہاں رہیں گے ۔"

اب تیس سال بعد تری پورہ میں اس سے بدتر آثار نظر آئے مگر گھٹاؤں میں بجلیاں چمک کر رہ گئیں اور جو بدتمیزیاں شروع ہوئی تھیں وہ بعض مقتدرین کانگریس کی اپیلوں مسٹر بوس کی نزاکت صحت اور گاندھی جی کے مرن برت کے اثر سے بڑھنے نہ پائیں لیکن زبدا کی یہ گھٹائیں اب دریائے ہگلی پر برسیں۔ ۱۹۰۷ء میں مرہٹہ سورما معرکہ آرا تھے اب بنگالی بہادر میدان میں اُترے ۔

جونہی پنڈت نہرو اور دوسرے لیڈر پنڈال کے شمالی دروازے کی طرف بڑھے ایک جوتا آگرا اور اُسکے بعد شور شروع ہوا بھانت بھانت کی بولیاں بولی جانے لگیں گالی گلوج اور طعن تشنیع کا کوئی ایسا لفظ بنگالی لغت میں باقی نہ رہا جو استعمال میں نہ آگیا پھر ہلہ بول دیا گیا اور بڑے بڑے لیڈر جو آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے ویلنگٹن پارک میں جمع تھے ایک عجیب معرکہ میں گھر گئے۔ پولیس کی مدد طلب کی گئی یا وہ خود آگئی بیس آدمیوں کے زخم آئے اور کچھ لوگ گرفتار بھی کئے گئے ۔

اس کے بعد مسٹر بوس نے ایک فارورڈ بلاک بنایا تاکہ وہ کانگریس کی غلطیوں اور استبداد کی اصلاح کرے اور اس کے بعض فیصلوں کے ماننے سے انکار کر دیا جا بجا دورے کئے احکام کانگریس کی خلاف ورزیاں کیں۔ وہ اور اُنکے رفقاء کانگریس کے عہدوں سے علیحدہ کئے گئے اور بہت سوں کو تنظیمی سزائیں دی گئیں اور ہر فارورڈ بلاک کی قوت میں اضافہ ہوتا رہا اُدھر مخالفت بھی برابر بڑھتی رہی اور جلسوں میں بدتمیزیوں کا سلسلہ بھی قائم ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی بہار میں مسٹر بوس کے ساتھ بھی تقریباً وہ ہی گذرا جو کلکتہ میں راجندر بابو اور پنڈت نہرو کے ساتھ گذرا تھا۔

اصل یہ ہے کہ مسٹر بوس کبھی گاندھی جی کے اندھے مقلد نہیں رہے اُنہوں نے اپنی کتاب اسٹرگل آف انڈیا (جدوجہد ہندوستان) میں کئی سال پہلے گاندھی جی کے متعلق لکھا تھا کہ :-

"ایسا شخص جو تاریخ میں کوئی پارٹ ادا کرتا ہے وہ کچھ تو اُس شخص کی جسمانی و دماغی قوتوں اور کچھ اس کے ماحول پر اور اُس کے زمانہ کے مقتضیات کی مطابقت پر مبنی ہوتا ہے۔ مہاتما گاندھی میں کچھ ایسی بات ہے جو ہندوستان کے عوام کو اپنی طرف کھینچے رکھتی ہے لیکن اگر کسی اور ملک میں پیدا ہوتے تو بالکل غیر موزوں ثابت ہوتے مثلاً یہ اگر روس جرمنی یا اٹلی میں ہوتے تو کیا کرتے۔ ان کے اس عدم تشدد کی تعلیم کا نتیجہ یا تو یہ ہوتا کہ ان کو پھانسی دیدی جاتی یا کسی دماغی امراض کے شفاخانہ میں بھیجدیئے جاتے لیکن ہندوستان میں حالات ذرا مختلف ہیں۔

ان کا سادہ لباس سادہ زندگی بھاجی اور دودھ کی خوراک اور کرسی کے بجائے فرش پر بیٹھنے کی عادت الغرض یہ کہ ان کا طرز زندگی سب پُرانے زمانہ کے جبلی مہاتماؤں کی طرح ہے..... جب مہاتماجی بات کرتے ہیں تو اسپنسر اور برک کی زبان میں نہیں جیسے کہ سر بندر ناتھ بنرجی کیا کرتے تھے۔ بلکہ زبان وہ ہوتی ہے جو رامائن اور بھگوت گیتا میں پائی جاتی ہے۔ جب وہ ان سے سوراج کی باتیں کرتے ہیں تو اُسوقت وہ ان سے صوبجاتی خود مختاری یا فیڈریشن کی خوبیاں بیان نہیں کرتے بلکہ ان کے سامنے رام راج کا تزک و شان پیش کرتے ہیں جو عوام کے دل میں بیٹھ جاتی ہیں۔ اور جب وہ اہنسا اور محبت کے ہتھیار سے فتح کرنے کا خیال ظاہر کرتے ہیں تو وہ عوام ان کو بدھ اور مہاویر خیال کرنے لگتے ہیں۔

مہاتماجی کی دماغی اور جسمانی قوتیں ہندوستانیوں کے مزاج کے مطابق ہیں اسلئے اگر وہ ہندوستان کی تاریخ کے کسی اور زمانہ میں پیدا ہوئے ہوتے مثلاً ۱۸۵۷ء میں تو اُس وقت کیا کرتے عوام ہتھیار بند تھے اور لڑسکتے تھے ان کو ایسے لیڈر کی ضرورت تھی جو لڑائی میں ان کی رہنمائی کرے۔

مہاتما کی کامیابی دراصل اس وجہ سے ہے کہ قانونی مخالفت اور مسلح بغاوت دونوں ناکام رہیں۔"

کانگریس کے قتیل استبداد مسٹر بوس کے علاوہ کانگریس کے اور بھی پرانے

خدام ہیں جن میں بمبئی کے مشہور لیڈر مسٹر نریمان (پارسی) اور ڈاکٹر کے این، بی کھارے نہایت نمایاں ہیں اور آخر الذکر کا قضیہ تو تاریخ کانگریس کا ایک باب بن چکا ہے۔

ڈاکٹر موصوف نئے دستور کے مطابق جب صوبہ متوسط (سی پی) میں وزارتیں قائم ہوئیں تو وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ لیکن اُن کے اور گاندھی جی کے بعض پرستاروں کے تعلقات اچھے نہ تھے اور ہائی کمانڈ پر اُن ہی پرستاروں کا کافی اثر تھا ان کے باہمی اختلافات نے طوالت اختیار کی اور ڈاکٹر کھارے کو وزارت عظمےٰ سے مستعفی ہونے کا حکم دیا گیا جس کو احتراماً وطاعتہً اُنہوں نے قبول کیا اور استعفا داخل کر دیا۔ ان کی جگہ پر ان مخالفوں میں سے ایک کا انتخاب ہوا اور یہاں تک نوبت پہونچی اور ایسا نازیبا سلوک ہوا کہ جو نا قابل برداشت تھا۔ اس لئے وہ بعض کارروائیوں کو بے نقاب کرنے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۸ء میں انھوں نے ایک عام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"میں ایسی تدبیر اختیار کرنا چاہتا تھا کہ دستور جدید کی شکست و ناکامی کی صورتیں پیدا ہوں۔ مگر کانگریس ہائی کمانڈ نے کبھی اس کا موقعہ مجھے نہیں دیا۔ اور دیگر صوبوں کے کانگریسی وزراء نے عملاً ساتھ دینے سے انکار کیا"

یوم آزادی کی تعطیل کے سلسلہ میں گورنر سی۔ پی تک کو راضی کر لیا۔ مگر دوسرے صوبوں کے کانگریسی وزیروں اور اعلیٰ لیڈروں نے میری تجویز کو کامیاب ہونے دیا یہاں تک کہ گورنر سی۔ پی نے کہا کہ میں تو تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار تھا مگر تمہارے کانگریسیوں نے تمہارا ساتھ نہیں دیا۔"

پھر ستمبر میں ایک عام ممبر کی حیثیت سے اسمبلی میں کہا کہ:۔

"ہاؤس کو وہ حالات معلوم ہیں جن کے ماتحت کانگریس نے عہدے قبول کئے تھے۔ کانگریس کا مقصد یہ تھا کہ دستور جدید کے خلاف جنگ کی جائے اور اسے تباہ کیا جائے، لیکن اس میں زیادہ دن نہیں لگے کہ اجنبی حکومت کے مزاحمت و مقابلہ کے بلند تخیل نے ابتذال اختیار کیا اور غلامانہ انداز میں روساء دستور کی

حیثیت سے صوبوں کے گورنروں کا تفوق تسلیم کر لیا گیا۔
واقعہ یہ ہے کہ مسٹر سی، راج گوپال آچاریہ اور گورنر مدراس کے درمیان ایک غیر مستند اور ذاتی خفیہ گفت و شنید ہوئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت برطانیہ ابتداً اس پر راضی ہو گئی تھی کہ چھ صوبوں میں کانگریسی وزیر دستور کو چلائیں۔ موجودہ وزیر اعظم مدراس نے اس زمانہ کے صدر کانگریس کے برخلاف لارڈ ارسکن سے ملاقاتیں کی تھیں۔ اور اُن کے ساتھ ان اصولوں کے متعلق سمجھوتہ کر لیا تھا جن کے ماتحت کانگریس پارٹی تمام ہندوستان میں دستور کو چلانے والی تھی۔
میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ مسٹر راج گوپال اچاریہ نے گورنر کو یقین دلایا تھا کہ کانگریس کا مقصد دستور کو تباہ کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ حکومت برطانیہ اور تاج کے ساتھ تعاون کیا جائے اور کانگریس نے دستور جدید کے متعلق جنگ کرنے اور تباہ کرنے کا جو اعلان کیا تھا وہ صرف اس لئے تھا کہ کانگریسی انتہا پسندوں کو راضی کیا جائے۔"
ڈاکٹر کھارے چوں کہ کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے اس لئے ہائی کمانڈ نے ان کو اسمبلی سے بھی استعفا پیش کرنے کی ہدایت کی لیکن وہ اس خودکشی پر راضی نہ ہوئے اور انہوں نے اپریل ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی کو جن کی منظوری سے یہ سب کچھ ہوا تھا ایک طویل چٹھی لکھی اور ان کی اور ہائی کمانڈ کی آمریت، فسطائیت اور استبداد وغیرہ پر روشنی ڈالی۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے وائسرائے سے راز کی ملاقاتوں وغیرہ کے متعلق لکھا کہ:۔
"آپ ذرا وائسرائے صاحب سے حال کے مسلسل اور طویل ملاقاتوں کی طرف آئیے۔ میں اس سلسلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر مارس گائر اور ایوارڈ کے بعد ان طویل اور بار بار کی ملاقاتوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کوئی اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ان ملاقاتوں میں آپ نے وائسرائے سے موسم کی حالت روحانیت اور مضبوط سانڈوں کے متعلق گفتگو کی ہوگی۔ گفتگو ضروری سیاسی

مسائل مثلاً فیڈریشن وغیرہ پر بھی ہوئی ہوگی۔ کیا اس موقعہ پر بھی کانگریس کی کوئی تجویز ہے جیسا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں آپ کی شرکت کے متعلق کانگریس کی تجویز تھی کہ آپ ہندوستان کے مستقبل پر وائسرائے سے گفت و شنید کریں؟ کیوں آپ عوام کا اعتماد حاصل کر کے تمام شبہات اور شکوک کا ازالہ نہیں کر دیتے اور یقین جانئے کہ ان شکوک کے پیدا ہونے کی کافی وجہ بھی موجود ہے۔ لاہور کی کانگریس نے پنڈت نہرو کی صدارت میں اپنی کامل آزادی کی تجویز منظور کی ہے مگر آپ نے اس تجویز کو اس کے نچوڑ کی وضاحت سے بالکل ختم کر دیا۔ اس سے مراد اصلی کیا تھی۔ اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں مگر اطلاع تو یوں ہی ہے کہ آپ نے سب کچھ ایک وعدہ کی تکمیل کی غرض سے کیا تھا جو آپ نے ایمرسن ہوم سکریٹری حکومت ہند سے کیا تھا اور یہ وعدہ ۱۹۳۱ء کے مارچ میں ایک گفتگو کے دوران میں ایمرسن سے کیا تھا۔ یہ گفتگو گاندھی ارون مصالحت کے بعد ہوئی تھی۔ مجھے یہ دیکھکر حیرت ہے کہ آخر کیوں آپ کے معتمدین کو حکومت کے افسران اعلیٰ سے ملاقاتیں کرنے اور اُن کے مجالس میں حصّہ لینے میں بڑی مسرت ہوتی ہے۔ کیا ان حضرات کے لئے اصول کی پابندی ضروری نہیں ؟ یا یہ کہ اُنہوں نے مخصوص حالات میں صدر کانگریس کی ایما اس بارے میں حاصل کر لی ہے ؟ کیا آپ اس کو ضروری نہیں سمجھتے کہ ان تمام باتوں کو کانگریس کے مفاد کی خاطر صاف اور واضح کر دیا جائے"

پھر انھوں نے جولائی میں بمقام پونہ ایک تقریر میں صاف طور پر یہ بات بیان کی کہ :-

"کانگریس نے انتخابات کے زمانہ میں عوام سے بہت سے وعدے کئے اور برطانیہ نے کانگریس سے خفیہ وعدے کئے تھے جو مجھے معلوم ہیں لیکن عہدے قبول کرنے کے بعد کانگریس اپنے وعدوں کو پورا نہ کرسکی وزیراعظم مدراس مسٹر راج گوپال اچاریہ نے کانگریسی احکام کی خلاف ورزی کر کے چندری

چوری گورنر مدراس سے دو دفعہ ملاقات کی اور پھر گاندھی جی سے تبادلہ خیالات کیا گاندھی جی نے دو مرتبہ ایمرسن سابق سکریٹری حکومت ہند سے ملاقات کی اور آزادی کامل کا خیال ترک کر دیا۔ راج گوپال اچاریہ گاندھی جی کے سمدھی ہیں پنڈت پنتھ کی پیٹھ پر جواہر لال کا ہاتھ ہے۔ مسٹر کھیر نے بھولا بھائی اور ولبھ بھائی کو پھانس رکھا ہے۔ اسی طرح تمام وزارتوں کی نکیل انگریزی ہے اور ان کی مہار گاندھی ہے ''

نہرو اور بوس ایک دوسرے کے رقیب ہیں، بوس نے صدر کانگریس کے انتخاب میں گاندھی جی کو جو شکست دی اس کا انتقام لینے کے لئے گاندھی جی نے سیاست ہند کی شطرنج پر جواہر لالی مہرہ کو بڑھایا۔ کانگریس نے صوبہ متوسط میں مجھے اور بمبئی میں مسٹر نریمان کو کچلنے کے بعد مکاری کے ڈرامہ کا تیسرا باب راجکوٹ میں کھیلا، اور چوتھا تری پورہ میں، جہاں سوبھاش کو تختہ مشق ستم بنایا گیا تاکہ گاندھی نے انگریزوں سے جو وعدے کئے ہیں پورے ہو سکیں ''

گاندھی جی کو راجکوٹ میں منہ کی کھانی پڑی ہے۔ اس کی حکمت عملی ہمیشہ دورخی اور دوغلی ہے گاندھی جی کا بیان ۵/۱ تاریخ میں ایک ٹھگ کی زبان سے اپنی سیاہ کاریوں کے اعتراف کی حیثیت سے یادگار رہے گا، اس نے چرخہ کو پیشہ اور وائسرائے کو دیوی مان لیا ہے اور اس کی پرستش عقیدہ ہے ''

بیر بیر لنگوٹی باندھو اور وائسرائے کے پاؤں پڑو، یہ ہیں وہ اصول جن کے ماتحت آجکل کانگریسی کارکن سرگرم کار ہیں ''

جنگ سے پہلے اور آغاز جنگ میں گاندھی پنڈت نہرو اور دیگر کانگریسی زعماء نے بانی جنگ ہر ہٹلر (جرمن کے ڈکٹیٹر) کو نفرین کی اور فرانس وانگلستان کو جمہوریتیں قرار دے کر ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا حتیٰ کہ گاندھی جی نے بڑی دلسوزی سے کہا کہ '' اگر فرانس و برطانیہ تباہ ہو گیا تو ہندوستان آزاد ہی ہو کر کیا کریگا '' مگر جب برطانیہ نے ہندوستان کے آئندہ دستور و آئین میں مسلمانوں

کی اہمیت تسلیم کر لی اور کانگریس کے نصب العین ۱۹۴۳ء کے مطابق فرقہ وارانہ تصفیہ ہوا تو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک طرف یہ طے کیا کہ صرف کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی ہی کے ذریعہ سے فرقہ وارانہ معاملات اور دوسری دشواریوں کو طے اور حل کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف ہندوستان کی آزادی کامل کا مطالبہ کیا اور اعلان کر دیا کہ جب تک برطانیہ ہندوستان کے متعلق اپنے ارادے ظاہر نہ کر دے اس وقت تک کانگریس نہ دور تغیر میں گورنمنٹ کی ذمہ داریاں قبول کرے گی اور نہ کسی ضمنی مسئلہ پر غور کرے گی۔ مثلاً مرکز میں وائسرائے کی کونسل کی توسیع اور اہتمام جنگ میں شرکت وغیرہ مگر پھر مطالبہ نرم کر دیا گیا کہ حکومت یہ وعدہ ہی کر لے کہ جنگ کے بعد آزادی کا اعلان کر دیا جائیگا۔ مگر کانگریسی وزارتوں کے مستعفی ہونے کی دھمکی بھی دی گئی اور جب حکومت برطانیہ نے کانگریس کے مطالبات پر اس کے حسب مدعا اعتنا نہ کی تو وزارتیں یکے بعد دیگر ذرا ذرا وقفہ سے مستعفی ہو گئیں مگر حکومت نے ان کے استعفے منظور کر لئے، اس کے بعد کانگریس نے ۲۲ر نومبر کو بالکل طے کر دیا کہ موجودہ جنگ بھی ۱۹۱۴ء کی طرح شاہانہ اغراض پر مبنی ہے اور کانگریس کمیٹی کو برطانیہ و فرانس کے طریقہ جنگ اور حکومت برطانیہ کے اُن بیانات سے معلوم ہوا ہے جو اُس نے ہندوستان کے متعلق شایع کئے ہیں کہ ہندوستان پر برطانوی شہنشاہی دواماً مسلط رہنا چاہتی ہے۔ لہٰذا وہ ایسی جنگ اور ایسی پالیسی میں شرکت اور تعاون نہیں کر سکتی۔

کانگریس کے ان تمام بیانات اور قرار دادوں کا مقصد صرف حکومت برطانیہ کو مرعوب کر کے تمام تر حکومت اکثریت کا قیام تھا جس میں مسلمانوں کو نظر انداز کر کے اور رام راج کا ایک دستور حکومت تیار ہو کر مرکز اور صوبوں میں حکمرانی کی جاتی جس کا پرتو ڈہائی سال کی حکومت میں دکھا دیا گیا لیکن یہ تمام اُمیدیں زائل ہو گئیں اور خود اپنی ضد اور اور مسلمانوں کے ساتھ معاملہ طے نہ کرنے اور غرور کے ساتھ تجاویز مصالحت کو ٹھکرانے سے آزادی ہندوستان کا مسئلہ بہت دور ڈالدیا۔

۲ر نومبر کی ملاقات کے بعد ۵ر نومبر کو مسٹر جناح نے وائسرائے کو ایک

خط لکھا تھا جس میں دوران ملاقات کی ۱۹۳۹ء گفتگو و بحث کی طرف متوجہ کرتے ہوئے حسب ذیل معاملات غور مزید کے لئے پیش کئے تھے:

(۱) جوں ہی حالات اجازت دیں یا جنگ کے بعد فوراً گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (دستور ہند) ۱۹۳۵ء سے قطع نظر کرکے آیندہ مسئلہ دستور ہند کی کامل طور پر تنقیح کی جائے گی اور اس پر غور کیا جائے گا۔

(۲) ملک معظم کی گورنمنٹ یا پارلیمنٹ ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر اصولاً یا کسی اور نہج پر نہ کوئی اعلان کرے گی اور نہ کوئی دستور بصورت قانون نافذ کرے گی۔

(۳) ملک معظم کی گورنمنٹ کو چاہئیے کہ اعراب فلسطین کے تمام معقول قومی مطالبات پورے کرے۔

وائسرائے نے ۲۳ دسمبر ۱۹۳۹ء کو اس خط کا حسب ذیل جواب دیا۔

ڈیر مسٹر جناح:

اب میں اس قابل ہوں کہ آپ کے خط مورخہ ۵ نومبر کا جس میں آپ نے بعض معاملات میرے غور کے لئے پیش کئے ہیں جواب دوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ یہ مانیں گے کہ آپ کے خط میں ایک سے زیادہ مسائل ایسے ہیں کہ اگر ان پر تمام باتوں کی روشنی میں غور کیا جائے جو ان میں مضمر ہیں تو اس کا اثر ہندوستان کے دوسرے فرقوں پر پڑے گا اور نیز آپ یہ بھی مانیں گے کہ میری اور آپ کی باہمی خط و کتابت ان مسائل پر اعلان کا مناسب ذریعہ نہیں ہے لیکن مجھے یہ اُمید ہے کہ میرے جوابات سے اگرچہ وہ معناً محدود ہیں آپ کی دشواریاں رفع ہو جائیں گی۔ آپ کے پہلے سوال کا میری طرف سے یہ جواب ہے کہ میں نے ملک معظم کی گورنمنٹ کی منظوری سے ۱۸ اکتوبر کو جو اعلان کیا تھا اُس سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے کسی جزو کی یا اس پالیسی کی جس پر وہ مبنی ہے جانچ کرنا خارج نہیں ہے۔

آپ کی دوسری بات کے متعلق میں یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ ملک معظم کی گورنمنٹ

کو اس معاملہ میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے کہ ہندوستان کے آئینی استحکام اور ترقی کے لئے آپ کی قوم کا مطمئن ہونا کس قدر اہم ہے لہٰذا آپ کو اس بات سے خوف کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہندوستان میں اپنی حیثیت کی وجہ سے آپکی قوم کی رائے کا جو وزن ہے اسکو گھٹایا جائیگا۔ فلسطین کے متعلق اپنی پالیسی قائم کرنے میں ملک معظم کی گورنمنٹ نے عربوں کے تمام معقول مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کو اس مسئلہ کی اہمیت کا پورا احساس ہے۔ آخر میں آپنے یہ ضمانت چاہی ہے کہ ہندوستانی فوجیں کسی مسلم حکومت یا ملک کے خلاف ہندوستان سے باہر استعمال نہیں کی جائیں گی۔

خوش نصیبی سے چونکہ ملک معظم کی گورنمنٹ کسی مسلم حکومت سے برسرپیکار نہیں ہے لہٰذا یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ بہرکیف یہ آپ مانیں گے کہ ایسی وسیع شرائط میں اس کی ضمانت جو آپ کے خط میں درج ہیں ممکن نہیں جس کا اثر یہ ہوگا کہ ہندوستان کا وہ حق محدود ہو جائیگا جو اُسے ان حالات میں جن کی پیشن گوئی اس وقت نہیں کی جا سکتی اپنے دفاع میں اپنی فوج کے استعمال کا حاصل ہے مگر موجودہ صورتِ حالات میں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، حکومت ہند کی خواہش پر ملک معظم کی حکومت اس امر کی پوری احتیاط کر رہی ہے کہ اس خصوص میں مسلمانانِ ہند کے جذبات کا پورا احترام کیا جائے۔"

آپ کا مخلص (لنلتھگو)

۲۳ و ۲۴ فروری ۱۹۴۰ء کو ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دہلی میں اس مراسلت پر غور کیا گیا اور یہ تجویز پاس ہوئی کہ:۔

"ہز اکسلنسی کا جواب قابل اطمینان نہیں کیوں کہ ہنوز بعض اُمور میں مزید توضیح و تشریح کی ضرورت ہے اس لئے کمیٹی صدر کو اختیار دیتی ہے کہ وہ کمیٹی کے خیالات ہز اکسلنسی کے سامنے پیش کر کے درخواست کریں کہ وہ ان ضمانتوں کے معاملہ پر جن کے متعلق کمیٹی کے ریزولیوشن ۱۸ ستمبر و ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں خواہش کی گئی ہے دوبارہ غور کریں اور اس طرح مسلمانوں کے دل سے تمام شبہے اور وسوسے دور کئے جائیں۔"

چنانچہ مسٹر جناح نے اپنے خط مورخہ ۲۴ فروری میں ورکنگ کمیٹی کے حسب ذیل

خیالات ظاہر کئے۔

"ورکنگ کمیٹی[1] پہلے پوائنٹ کے متعلق آپ کی توضیح سے مسرور اور مطمئن ہے۔
جس میں آپ نے ملک معظم کی حکومت کے ساتھ مشورہ کے بعد فرمایا کہ آپ کے اعلان مورخہ
۱۸ اکتوبر کا یہ مطلب نہیں کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء یا اس کے ماتحت کسی
پالیسی پر بھی مکرر غور ہو سکتا ہے۔ جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے ورکنگ کمیٹی
اس کے متعلق مطمئن نہیں ہے کیوں کہ اس امر کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا اور نہ کوئی اعلان
ہوا ہے کہ کوئی آئین اس وقت تک ہندوستان میں نافذ نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی
پارلیمنٹ کوئی ایسا قانون پاس کرے گی جو مسلمانان ہند کے نزدیک ناقابل قبول ہو۔
لیکن ہم آپ کے اس وعدہ کی اہمیت کا احساس ضرور کرتے ہیں۔"

جب آپ نے کہا کہ ملک معظم کی حکومت محسوس کرتی ہے کہ ہندوستان میں کوئی
آئین اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا اور نہ آئینی ترقی کی طرف قدم بڑھایا جا سکتا ہے
جب تک مسلمانانِ ہند اس کے لئے رضامند نہ ہوں آپ نے یہ بھی لکھا کہ ہندوستان
میں آپ کی قوم کو پوری اہمیت حاصل ہے۔"

مجھے افسوس ہے کہ اس جواب سے ہماری تسلی نہیں ہوئی کیونکہ اس کا مطلب سوائے
اس کے اور کچھ نہیں کہ ہندوستان کے ۹ کروڑ مسلمانوں کی قسمت برطانیہ کے حوالے کر دی جائے۔
اور وہی آخری فیصلہ کی مجاز ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم یہ پوزیشن تسلیم نہیں کر سکتے۔

جہاں تک فلسطین کے متعلق پولیسی کا تعلق ہے آل انڈیا مسلم لیگ کی خواہش ہے
کہ ملک معظم کی حکومت پر زور دیا جائے کہ اس مسئلہ کا کوئی ایسا حل تجویز کیا جائے جو عربوں
کی تسلی کر سکے۔ مجھے آپ کی اس اطلاع سے مسرت ہوتی ہے کہ ملک معظم کی حکومت
کی خواہش ہے کہ عربوں کے ہر جائز مطالبہ کو پورا کیا جائے اور اس مقصد کے لئے
کوشش کی جا رہی ہے لیکن دنیائے اسلام اس بات کی منتظر ہے کہ اس سلسلہ میں

---

[1] مسٹر جناح اور وائسرائے کی مراسلت۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۴۰ء کو شائع ہوئی تھی تسلسل قائم رکھنے کے لئے
اس کے خاص مواقع پر درج کی گئی ہے۔

کیا کیا رہا ہے؟

جہانتک اس سوال کا تعلق ہے کہ ہندوستان کی افواج کو اسلامی طاقتوں اور مسلم ممالک کے خلاف استعمال نہ کیا جائے میرا خیال ہے کہ آپ نے اس پوزیشن کو غلط سمجھا ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ ہمیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ ہماری افواج ہندوستان کے باہر جا کر کسی ملک کا مقابلہ نہ کریں گی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ اگر ہندوستان پر کوئی سختی یا حملہ ہو تو ان افواج کا استعمال نہ کیا جائے ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے اس امر کا یقین دلایا ہے کہ گورنمنٹ ہند کے ایما پر ملک معظم کی حکومت نے وعدہ کیا ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانانِ ہند کے جذبات کا احترام کیا جائے گا لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں مزید وضاحت کی ضرورت ہے؟

آپ نے مسلمانانِ ہند سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ جنگ کے دنوں میں گورنمنٹ کی پوری امداد کریں لیکن پیشتر اس کے ہم اس امر کی تسلی چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل غیر یقینی نہ رہے اس لئے ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے آئین کے متعلق کسی دیگر پارٹی سے کوئی سمجھوتہ نہ ہو اور نہ کوئی آئینی تبدیلی عمل میں لائی جائے تاوقتیکہ ہم اس کے متعلق رضامند نہ ہوں اگر ملک معظم کی حکومت ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی کو درست تسلیم کرتی ہے تو اس صورت میں یہ اس کا فرض ہوگا کہ ایسے معاملہ میں جس کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہو ان کے ساتھ مشورہ کرے جہاں تک ہمارا تعلق ہے میں یہ عرض کردوں کہ آپ خواہ مخواہ دوسرے فرقوں کے متعلق تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ ہماری کبھی یہ خواہش نہیں ہوئی کہ دوسرے فرقہ کے ساتھ بے انصافی کی جائے ہم نے صرف اس خطرے کے پیش نظر اس معاملہ کو چھیڑا کہ کہیں برطانوی حکومت کسی اور طاقت در سیاسی پارٹی کے ساتھ کوئی ایسا سمجھوتہ نہ کرے جو نہ صرف مسلمانانِ ہند کے لئے نقصان دہ بلکہ اُن کے لئے تباہ کن بھی ہو؟

جہانتک فلسطین کے سوال کا تعلق ہے اس کا کسی دوسری قوم سے کوئی واسطہ نہیں اس خط میں اس معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث نہیں کی جا سکتی اگر آپ اس کی ضرورت

محسوس کریں تو میں آپ کی خدمت میں اس کی تفصیل پیش کروں گا۔

آغاز جنگ سے اوّل ہفتہ فروری ۱۹۴۰ء تک وائسرائے نے ملک کے متعدد سیاسی لیڈروں سے متعدد ملاقاتیں کیں گاندھی جی ۵ فروری کو ۲ مہینے کے اندر پانچویں مرتبہ وائسرائے سے ملاقی ہوئے اور ایک طویل گفتگو کے بعد طے ہوا کہ سردست مزید تبادلۂ خیالات کو روک دیا جائے۔

۶ فروری کو مسٹر جناح کی بھی طویل ملاقات ہوئی اور اس کے نتیجہ میں جو سرکاری کمیونک شائع ہوا اس میں بتایا گیا کہ مسٹر جناح نے اس امر پر زور دیا کہ مسلمانوں اور تمام اقلیتوں کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ آئندہ سمجھوتہ کے لئے جو مذاکرات ہوں اُن میں ان کے مفادات کے تحفظ کا خاص خیال رکھا جائے" جواب میں وائسرائے نے یقین دلایا کہ "حکومت برطانیہ کو اقلیات کے جائز حقوق کے تحفظ کا پورا پورا خیال ہے نیز مسٹر جناح کو اس بات کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیئے کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں اور اقلیتوں کے مفادات کی پروانہ کرے گی"

۲۵ فروری کو کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کا ہنگامہ خیز اجلاس ہوا دُور دراز حصص سے بہ کثرت ممبران شریک تھے طویل طویل بحثیں ہوئیں بعض بحثوں میں بہت زیادہ رازداری برتی گئی اور ایک خاص موقع پر گیلری کو پریس کے نمائندوں اور وزیٹروں سے بھی خالی کرادیا گیا۔ مسٹر جناح نے تقریر کی تمہید میں کہا کہ:۔

مسلمانو! میں نے دنیا کو بہت دیکھا۔ دولت، شہرت اور عیش و عشرت کے بہت لطف اُٹھائے اب میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد و سربلند دیکھوں میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں کہ میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی اور مسلمانوں کی آزادی، تنظیم اور مدافعت میں اپنا فرض ادا کر دیا میں آپ سے اس کی داد اور شہادت کا طلبگار نہیں ہوں، میں یہ چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا اپنا دل میرا اپنا ایمان، میرا اپنا ضمیر گواہی دے کہ جناح تم نے واقعی مدافعت اسلام کا حق ادا کر دیا جناح تم مسلمانوں کی تنظیم، اتحاد، و حمایت کا فرض بجالائے میرا خدا

۱؎ یہ حصہ تقریر پریس میں نہیں آیا کیوں کہ اس وقت پریس کے نمائندوں سے کونسل کی گیلری خالی کرالی گئی تھی مگر بعد کو اخبارات میں شائع ہو گیا۔

یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبہ میں علم اسلام کو سر بلند کئے ہوئے مسلمان مرے۔"

شاہدوں کا بیان ہے کہ مسٹر جناح کے منہ سے یہ رقت آمیز الفاظ سن کر حاضرین زار زار رو رہے تھے۔

اس کے بعد قرار دادہائے ورکنگ کمیٹی ۸ار ستمبر و ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۹ء و ۳ر و ۴ر فروری ۱۹۴۰ء کو کونسل کے سامنے منظوری کے لئے پیش کرتے ہوئے ان معاملات کا تذکرہ کیا جو وائسرائے سے دوران گفتگو میں اور بنیادی مطالبات کے سلسلہ میں پیدا ہوئے اور بتایا کہ ورکنگ کمیٹی کے تمام فیصلے جو ۴ر فروری تک ہوئے وائسرائے کے پاس بھیجے جاتے رہے۔ لیگ کے پانچ مطالبات کے سلسلہ میں کہا کہ ایک مطالبے کو معلوم ہوتا ہے کہ وائسرائے نے غلط سمجھا مسلم لیگ نے یہ خواہش کی تھی کہ مسلم فوجیں ہندوستان کے باہر کسی اسلامی حکومت یا ملک کے خلاف نہ استعمال کی جائیں۔ اس میں یہ معنی ہرگز مضمر نہ تھے کہ ہندوستانی افواج حفاظت ہند میں استعمال نہ کی جائیں اگر کسی ملک نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ہندوستانی فوج کو ہندوستانی سرحدوں کی حفاظت کے لئے ضرور لڑنا پڑے گا۔

لیگ نے حکومت برطانیہ سے اس کے متعلق ایک صاف بیان کا مطالبہ کیا تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء لفظاً معناً اور قانوناً پورے طور پر منسوخ کیا جائے اور اس کے گذشتہ ڈھائی برس کے عملی تجربات کی روشنی میں نیز اس تجربہ کی روشنی میں جو آئندہ حاصل ہو پوری اسکیم کی از سر نو جانچ کی جائے وائسرائے نے اس مطالبہ کو قابل اطمینان طریقہ پر پورا کیا اور یقین دلایا کہ پوری اسکیم کی اور نیز اس پالیسی اور خاکہ کی جس پر وہ مبنی ہے از سر نو جانچ کی جائیگی۔ تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کسی اعلان یا آئین کو قانونی صورت دینے میں اس وقت تک متفق نہ ہوگی جب تک کہ اس سے ماقبل منظوری نہ لی جائے اور نہ کسی پارٹی کی دھمکی یا دباؤ سے خواہ وہ کتنی ہی طاقتور ہو درمیانی زمانہ کے لئے مسلم لیگ کی ماقبل رضامندی حاصل کئے بغیر کوئی سمجھوتہ کیا جائیگا۔ اس باب میں بھی وائسرائے نے یقین دلایا کہ وہ مسلمانوں کی اہمیت بخوبی محسوس کر رہے ہیں اور کسی ایسے سمجھوتے کا

خیال بھی نہیں کیا جا سکتا جس میں مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔

یہ بیان ناقابل اطمینان ہے کیوں کہ اس نے مسلمانوں کو صرف صلاح اور مشورہ کی منزل پر چھوڑا ہے اور مسلمان اپنے مستقبل کا خود ہی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔

چوتھا مطالبہ مسئلہ اعراب فلسطین کا تھا وائسرائے نے جواب دیا ہے کہ فلسطین میں اپنی پالیسی کی تشکیل کے لئے ملک معظم کی حکومت نے عربوں کے تمام معقول مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی ہے اور اس مسئلہ کی اہمیت کا مزید احساس رکھتی ہے۔ لیکن مسئلہ کی اہمیت کا احساس کافی نہیں ہے حکومت کو عربوں کے ساتھ تسلی بخش سمجھوتہ جلد از جلد کرنا چاہئے۔

آخری مطالبہ کانگریسی حکومتوں کے صوبوں میں مسلمانوں کی شکایات کے متعلق تھا یہ صحیح ہے کہ جب وہ حکومتیں موجود نہیں ہیں تو وائسرائے دخل نہیں دے سکتے۔ مگر اس مسئلہ کے دو اہم پہلو ہیں اولاً ہم نے بخوبی واضح کر دیا کہ کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں پر مظالم ہوئے اور لیگ کے ممبر خاص طور پر نشانہ بنائے گئے۔ کانگریس ہائی کمانڈ نے ان بیانات کو لغو قرار دیا مگر اس پر آمادگی ظاہر کی کہ ایک جوڈیشل عدالت قائم کی جائے۔ اسکی یہ تجویز لغو تھی اور جن وجوہ سے لغو تھی وہ پہلے بیان کی جا چکی ہیں دوسری طرف میں نے اس پر آمادگی ظاہر کی کہ ایک رائل کمیشن مقرر کیا جائے۔ جس میں انگلستان کے ہائی کورٹ کے دو جج ہوں اور اسکی صدارت پریوی کونسل کا لارڈ کرے صرف ایسی ہی عدالت ہو سکتی ہے جو ملک کے زہریلے ماحول سے الگ ہو اور گواہوں کا بیان لینے اور ان کو حلف دینے کا اور ہر قسم کے کاغذات پیش کرنے کے لئے مجبور کرنے کا اختیار بھی رکھتی ہو مگر کانگریس نے اس تجویز کا مضحکہ اڑایا کہ ہم اپنے خانگی امور میں غیر ملک کی مدد مانگ رہے ہیں گویا سر ماریس گائر تو جنہیں کانگریس نے تجویز کیا تھا بالکل سودیشی ہیں اور وارد ہا یا شیو گاؤں میں پیدا ہوئے ہیں میں نے اپنے مطالبہ کا پھر اعادہ کیا ہے۔

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ آیا کانگریس ہائی کمانڈ کی وزارتیں پھر برسر کار آنے والی ہیں۔ یوم رستگاری سے یہ اچھی طرح ظاہر ہو گیا کہ کانگریس کے باہر ہندوستانیوں

ؔ فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس۔

کا ہر ایک گروہ کانگریسی حکومت کا کس قدر مخالف تھا ان میں وہ ہندو بھی شامل ہیں جو ہندو مہاسبھا کے ممبر ہیں اور جنہوں نے لیگ کے پلیٹ فارم سے ہمارے ساتھ یوم رستگاری میں دعا مانگی اس کے بعد مسٹر جناح کہا کہ دوسرا مسئلہ اقلیتوں کے تحفظ کا ہے اور مسٹر گاندھی کی اس نصیحت کا ذکر کیا کہ ہندو عدم تشدد سے اپنی حفاظت کریں اور اگر ضرورت ہو تو تشدد سے بھی اور یہی نصیحت مسلمانوں کو بھی کی ہے پس اگر اس نصیحت پر عمل ہونیوالا ہے تو میرے خیال میں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اقلیتوں کو اپنے تحفظ کے لئے اپنی فوجوں پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ چونکہ حکومت تو حفاظت کر نہیں سکتی۔

مسٹر گاندھی کی ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کے متعلق جو ۱۹۲۹ء سے ہے توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ کبھی ان کو روشنی نظر آئی اور کبھی اندھیرا لیکن اصل مسئلہ کے قریب وہ کبھی نہیں پہنچے اُن کے اس اقرار سے کہ ہندو مہاسبھا اصل میں وہ انجمن ہے جس سے مسلم لیگ کو گفت و شنید کرنی چاہیئے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آخر کانگریس پھر کس کی نیابت کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں مسٹر گاندھی اور کانگریس یہ محسوس کریں کہ مسلمان اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں اس کے خلاف کانگریس جو کچھ کہتی ہے وہ محض ایک فریب ہے اور اس کا منشا ہے کہ مسلمان ہتھیار ڈالدیں اور اطاعت قبول کریں گے۔

آخر میں مسٹر جناح نے کہا کہ لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ ہمارا مطمع نظر کیا ہے۔ اگر تم اب بھی یہ نہیں سمجھے کہ وہ کیا ہے تو تم کبھی نہیں سمجھو گے، یہ تمام مسئلہ بالکل سادہ ہے برطانیہ عظمٰے ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتی ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگریس ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ نہ ہم برطانیہ کو ہندوستان پر حکومت کرنے دیں گے اور نہ مسٹر گاندھی اور کانگریس کو ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں اور یہی ہمارا مطمع نظر ہے۔ میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ تم اپنی تنظیم کرو اور ہر ایک ممبر سے جو یہاں اسوقت موجود ہے چاہتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کے پاس یہ پیغام لے جائے اور انہیں یہ سمجھائے کہ مسلم لیگ کا مقصد کیا ہے" اس تقریر کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام رزولیوشن منظور ہو گئے نیز ایک اہم قرارداد قبائلی علاقہ (سرحد) میں حکومت ہند کی اقدامی پالیسی

کے متعلق پاس ہوئی جس میں حکومت سے اپنی ۴۷۲ پالیسی پر نظر ثانی کرنے کی خواہش کی گئی۔ نیز یہ کہ قبائل کو رضامند کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں اور ان کو یقین دلایا جائے کہ حکومت برطانیہ مخالفِ اسلام نہیں ہے۔"

ان مذاکرات و مباحث کے ضمن میں کانگریس اور لیگ کے زعما کی ملاقاتیں ہوئیں اور ایک مرتبہ پھر ہندو مسلم مسائل کے حل کرنے کے لئے راہیں تلاش کی گئیں۔ مسٹر جناح اور پنڈت نہرو میں یکم دسمبر سے مراسلت شروع ہوئی تھی ملاقات کے لئے وقت و مقام متعین کیا گیا لیکن ملاقات سے قبل ہی مراسلت میں سیاسی نقاطِ نظر اور مسائل بنیادی کے اختلافات اور زیادہ تر یوم رستگاری کے اعلان کا قصہ چھڑ گیا پنڈت نہرو کی چال یہ تھی کہ کانگریس نے حکومت سے مقاصد جنگ کے تعین اور ہندوستان کی آزادی کامل تسلیم کرنے اور اس حق کو کہ وہ اپنے ملک کا دستور حکومت خود مرتب کرے ماننے کے متعلق اعلان کئے جانے کا جو رزیولیوشن پاس کیا تھا مسلم لیگ سے کورانہ تقلید کے ساتھ اسکی تائید حاصل ہو لیکن مسٹر جناح اس صورت میں تائید نہیں کر سکتے تھے جس صورت میں کہ کانگریس کا مقصد تھا کیونکہ یہ ایسی صورت تھی کہ مسلمان بالکل کانگریس کے رحم و کرم پر چھوڑ دئے جاتے نیز اُنہوں نے اس بنیادی شرط کو بھی کہ "مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی واحد اور مختار نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے" قبول نہیں کیا اور کانگریس کی خیمہ بردار جماعتوں کی آڑلی غرض ایک طویل مراسلت کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا مگر بعدہٗ جب پنڈت نہرو نے پنجاب کے دوروں میں سارا الزام مسٹر جناح پر رکھا کہ وہ ہندوستان میں برطانوی تسلط قایم رکھنے کی طرف مائل ہیں تو مسٹر جناح نے بھی جنوری ۱۹۴۰ء میں وہ تمام مراسلت شایع کر کے تمام حقیقت بے نقاب کر دی۔

باب شانزدہم

سنہ ۱۹۳۰ء میں اجلاس مسلم لیگ کے صدر (مرحوم) ڈاکٹر اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت میں قومیتِ ہند کی وحدانیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"لیکن اس تلخ حقیقت کے بیان کرنے سے صدمہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی اندرونی یک جہتی کے لئے اس قسم کے اصول دریافت کرنے میں جتنی کوششیں کیں وہ اب تک بالکل ناکام رہی ہیں سوال یہ ہے کہ یہ کوششیں کیوں ناکام رہی ہیں؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک دوسرے کی نیتوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور دل میں یہ آرزوئیں چھپی ہوئی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فریقِ مقابل پر تغلب و تسلط حاصل کر لیا جائے یا اس کی یہ وجہ ہے کہ باہمی اشتراکِ عمل کے بلند مقاصد تباہ ہوتے ہوں تو ہوں لیکن وہ استمراری اجارہ داری ہاتھ سے نہ جانے پائے جو اتفاقاتِ زمانہ سے ایک فریق کے قبضہ میں آ چکی ہے حالت یہ ہے کہ دماغ میں أَنَا الْمَوْجُوْدُ لَا غَيْرِيْ کا سودا سما رہا ہے لیکن ان جذبات کو قومیت پرستی کے مقدس چولے میں چھپایا جاتا ہے۔ بلند آہنگ دعاوی کو دیکھو تو حبّ الوطنی کی وسعتِ قلبی کے مظاہرے ہو رہے ہیں لیکن دل کی گہرائیوں میں اتر کر جائزہ لو تو وہاں "ذات" اور "قبیلہ" کی وہی پرانی تنگ نظری جلوہ فرما ہے۔ ہاں! اور اس کا یہ بھی باعث ہو سکتا ہے کہ اس حقیقت کے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس ملک میں ہر ایک جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تمدنی روایات کے مطابق آزادانہ طور پر اپنی اجتماعی نشو و نما کر سکے۔ بہر حال ہماری ناکامی کے وجوہ کچھ بھی ہوں میں اب تک مایوس نہیں ہوں۔ واقعات کی رفتار ایک اندرونی یکجہتی کے میلان کا پتہ دیتی ہے اگر اس اصول کو ایک مستقل فرقہ وارانہ تصفیہ کا سنگِ بنیاد تسلیم کر لیا جائے تو مسلمانوں کو اپنے وطنِ عزیز میں اس امر کی مکمل آزادی حاصل ہو گی کہ وہ اپنے کلچر اور روایات کی بنا پر اپنی نشو و نما کر سکتے ہیں تو جہاں تک میں نے مسلم ذہنیت کا مطالعہ

کیاہے میں بلا تامل اعلان کرتا ہوں کہ اس اصول کے تسلیم کر لینے کے بعد مسلمان ہندوستان کی آزادی کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر بالکل آمادہ ہوگا۔ واضح رہے کہ یہ اصول کہ ہر جماعت کو اپنی اپنی مخصوص بنیادوں پر آزادانہ نشوو ارتقا کا حق حاصل ہونا چاہئے کسی تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کے جذبہ پر مبنی نہیں ہے فرقہ پرستی بھی کئی قسم کی ہے اور اس کے اقسام میں بین فرق پایا جاتا ہے جو قوم دوسری قوموں کے متعلق اپنے دل میں بدخواہی کے جذبات کی پرورش کرتی ہے وہ نہایت پست فطرت اور رذیل قوم ہے میرے دل میں دوسری قوموں کے رسوم وشعائر قوانین وضوابط مذہبی ومعاشرتی اوارات کا بے حد احترام ہے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق تو مجھ پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں دوسری قوموں کے معابد کی حفاظت بھی کروں با ایں ہمہ مجھے اس ملت سے عشق ہے جو میری زندگی کی طبعی اُفتاد کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے مذہب اپنے لٹریچر، اپنی حکمت اور اپنے کلچر کی تجلیات سے اقبالؔ کو اقبالؔ بنا دیا اور یوں اپنے درخشندہ ماضی کو ایک جیتے جاگتے زندگی بخش عنصر کی صورت میں میرے حال میں سمو دیا ملت پرستی کے اس بلند ترین پہلو کی قدر وقیمت کو تو نہرو رپوٹ کے واضعین تک نے بھی تسلیم کیا ہے چنانچہ علیحدگی سندھ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"یہ کہنا کہ فرقہ وارانہ صوبوں کا وجود میں لانا قومیت پرستی کے وسیع نظریہ کے منافی ہوگا ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ دنیا میں الگ الگ قوموں کی ہستی بین الاقوامیت کے وسیع ترین تصور کے منافی ہے ان دونوں باتوں میں ایک حد تک صداقت موجود ہے لیکن بین الاقوامی نصب العین کا سرگرم سے سرگرم حامی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ بین الاقوامی نظامِ حکومت اس وقت تک ناممکن بلکہ محال ہے جب تک ہر قوم مکمل طور پر خود مختار نہ ہو اسی طرح جب تک مختلف فرقے اس باب میں بالکل آزاد نہ ہوں کہ وہ اپنی تہذیب وتمدن (کلچر) کی بنیادوں پر اپنے نظامِ زندگی کی تشکیل کر سکیں ایک

ہم آہنگ قوم کا وجود عمل میں نہیں آسکتا اور یہ کسے یاد نہیں کہ جب فرقہ پرستی کسی بہتر جذبہ پر مبنی ہو تو وہی کلچر بن جاتی ہے۔"

اس سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ "کل" کی تشکیل کے لئے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے۔ برعکس یوروپین ممالک کے ہندوستان میں جماعتی تشکیل کی بنا جغرافیائی حدود نہیں۔ ہندوستان ایک ایسا براعظم ہے جس میں مختلف النسل مختلف اللسان اور مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں ان کے نظریۂ زندگی کی بنا کسی مشترک نسلی شعور پر نہیں ہے حتیٰ کہ ہندو بھی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جس کے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو ہندوستان میں یوروپین اصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل نہیں ہو سکتی جب تک یہاں مختلف فرقوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کر لیا جائے لہٰذا مسلمانوں کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک مسلم ہند کو معرض وجود میں لایا جائے۔

دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے جو رزولیوشن پاس کیا ہے میرے نزدیک تو اس کا محرک یہی مقدس جذبہ تھا کہ بجائے اس کے کہ ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے جذبۂ آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے انھیں اس امر میں خود مختار چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے حلقہ میں اپنے مخصوص نظریات زندگی کے ماتحت اپنے جوہر مضمر کی نشو و نما کر سکیں اور پھر ان صحیح عناصر کے مجموعہ سے ایک ہم آہنگ "کل" تخلیق ہو اور مجھے یقین واثق ہے کہ لیگ کا یہ اجلاس مسلمانوں کے ان مطالبات کی پرزور تائید کرے گا جو مذکورہ قرارداد میں بیان کئے گئے ہیں جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے (ہندوستان کو) حکومت خود اختیاری زیر سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقے کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی

تھی لیکن اس نے اس کو اس بنا پر رد کر دیا کہ اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنا دیا گیا تو اس سے
ایک ریاست معرض وجود میں آجائے گی جس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا جہاں تک رقبہ
کا تعلق ہے کمیٹی کی یہ رائے صحیح ہے لیکن بلحاظ آبادی مجوزہ ریاست ہندوستان کے بعض
موجودہ صوبوں سے بھی چھوٹی ہو گی اگر قسمت انبالہ اور چند ایسے اضلاع کو جن میں غیر مسلم
آبادی کی اکثریت ہے اس ریاست سے خارج کر دیا جائے تو یہ رقبہ میں کم ہو جائیگی
اور اس میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بڑھ جائے گا جب اس طرح غیر مسلم آبادی کا تناسب
بہت کم رہ جائے گا تو یہ متحدہ اسلامی ریاست اس قابل ہو جائے گی کہ وہ اپنے علاقہ کے
اندر رہنے والی اقلیتوں کو موثر تحفظات دے سکے اس تجویز سے نہ تو ہندوؤں کو بدکنا چاہیے
اور نہ ہی انگریز کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اس ملک میں اسلام بحیثیت
ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اُسے ایک مخصوص علاقہ میں
مرکوز کر دیا جائے مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں کہ جس کے بل بوتے
پر یہاں برطانوی راج قائم ہے (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ
نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الذکر نہ صرف ہندوستان
بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا اس سے مسلمانوں میں ذمہ داری کا احساس اور
ان کا جذبۂ حبِّ وطن اور بھی زیادہ ہو جائے گا جب اس طرح شمال مغرب کے مسلمانوں
کو ہندوستان کے سیاسی نظام میں رہتے ہوئے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع
حاصل ہوں گے تو وہ ہر بیرونی حملے کے مقابلہ میں خواہ وہ خیالات کا سیلاب ہو یا شمشیر
وسناں کا ہجوم ہندوستان کی بہترین مدافعت کر سکیں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں
کی آبادی چھپن فیصدی ہے لیکن ہندوستان کی فوج کا پچپن فیصدی حصہ انھیں
پر مشتمل ہوتا ہے اور اگر وہ اُنیس ہزار گورکھے علیحدہ کر دیئے جائیں جو نیپال کی آزاد
ریاست سے بھرتی کئے جاتے ہیں تو پنجاب کے فوجی سپاہیوں کی تعداد ساری
ہندوستانی فوج میں باسٹھ فیصدی ہو جاتی ہے اس میں ابھی وہ چند ہزار سپاہی

شامل نہیں ہیں جو صوبہ سرحد اور بلوچستان کے ہندوستانی فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔
اس سے آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستی سے محفوظ رکھنے کے لئے شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں میں کس قدر صلاحیت موجود ہے
رائٹ آنریبل سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمان شمال مغربی سرحد کے قریب آزاد اسلامی ریاستوں کا مطالبہ اس غرض سے کر رہے ہیں کہ بوقت ضرورت حکومت ہند پر دباؤ ڈالنے کا ایک ذریعہ ان کے ہاتھ آجائے میں مسٹر شاستری کو کھلے کھلے الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کا محرک وہ جذبہ نہیں ہے جس کا الزام وہ مسلمانوں پر عائد کر رہے ہیں یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انھیں بھی کہیں اپنی نشو و ارتقا کا موقعہ ملے اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدت قومی کے نظام میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انھیں غلبہ اور تسلط ہو۔"

لیکن اس عظیم المرتبت فلسفی کا یہ بلند نظریہ اُس وقت عامتہً ایک شاعرانہ تخیل سمجھا گیا تاہم بعض نوجوانوں کے دلوں میں اُتر گیا جن میں مسٹر رحمت علی کا نام نہایت ممتاز ہے جو کیمبرج اور ڈبلن کے سند یافتہ ہیں اور انگلستان میں مقیم ہیں انھوں نے ۱۹۳۳ء میں اس نظریہ کو تحریک پاکستان کے نام سے شروع کیا جس کا لُبِّ لُباب انہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

"یہ اس سیاسی نقشے کے مطابق مرتب کی گئی ہے جو ایک قدیم حقیقت ہے اگرچہ اب تک اس کے ساتھ تغافل برتا گیا ہماری تجویز یہ ہے کہ آزاد اور جُداگانہ پاکستان شمال کے پانچ اسلامی صوبوں پر مشتمل ہو اور ہندوستان کے مساوی نیز اقوامِ عالم کی دوسری متمدن قوموں کے مساوی اسے مرتبہ حاصل ہو اس تحریک کے حامیوں کو یقین ہے کہ ہندوستان کی دونوں قوموں کی عزت سے زندگی بسر کرنے کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ مسلمان پاکستان

میں اور ہندو ہندوستان میں رہیں اور اسی صورت میں برطانوی قیصریت کے

ان دونوں کی نوچ کھسوٹنے کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔"

انھوں نے یہ تجویز گول میز کی مجلسوں اور ہندو مندوبوں کے سامنے بھی پیش کی لیکن انگریزوں اور ہندوؤں دونوں نے مسترد کر دی مگر اس نظریہ پر کانگریسی وزارتوں کے قائم ہونے کے بعد مختلف اہل الرائے اصحاب کے حلقوں میں غور ہونے لگا۔ اور مسلم لیگ کے اجلاس خصوصی منعقدہ کراچی اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ان تمام واقعات کی بنا پر جو کانگریسی وزارتوں کے قائم ہونے سے اس وقت تک رونما ہوئے تھے ایک مطول و مفصل رزولیوشن کی صورت میں یہ طے کیا گیا کہ:۔

درآں حالیکہ اس اکثریت نے باوجود قومیت، مساوات اور جمہوریت کے دعووں کے جو دنیا کی ابھی قومیں دل سے چاہتی ہیں اپنے اندر ذات و پات کا تفرقہ قائم رکھا ہے اور ایک بڑی جماعت کی اپنے مظالم کی وجہ سے سوشل اور اقتصادی حالت اس قدر پست کر دی ہے کہ وہ کسی قابل نہیں رہی ہے اور سوسائٹی میں اس کی وقعت غلامی سے زیادہ کچھ نہیں۔

اور جب کہ ہر شخص خواہش کرتا ہے کہ ایک متحد ہندوستان ہو اور وہ ایک متحد قوم کی طرح ایک متحد مقصد کے لئے کوشش کر رہا ہو اسی وجہ سے ناممکن ہے کہ اول تو اکثریت کی ذہنیت ذات و پات کے تفرقہ سے مسموم ہے اور دوسرے اس کی پالیسی مسلم مفاد کے خلاف ہے نیز یہ کہ مذہب، زبان، رسم الخط کلچر اور سوسائٹی دونوں قوموں کی بالکل مختلف ہے اور ان کا نظریہ زندگی ان اختلافات کی وجہ سے جدا ہے تو وہ کیوں کر ایک دوسرے سے مل کر ایک متحدہ قومیت تعمیر کر سکتے ہیں۔

اس لئے یہ کانفرنس ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں امن، کلچر، سوشل اور اقتصادی ترقی کے لئے ضروری سمجھتی ہے کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ سے درخواست کرے کہ وہ ایک ایسا دستور اساسی بنانے کے سوال پر غور کرے

جس میں اپنا باعزت مرتبہ قائم رکھے اور جس کے ماتحت مسلمان پوری آزادی حاصل کر سکیں۔

نیز یہ کہ یہ کانفرنس اس فیڈریشن کی جو حکومت ہند کے ایکٹ ۱۹۳۵ء میں ہے پرزور مخالفت کرتی ہے اور حکومت سے درخواست کرتی ہے کہ وہ فیڈریشن کا نفاذ نہ کرے چونکہ ایسی صورت میں اس کا نفاذ غلط ہوگا جب کہ عام طور پر تمام ہندوستانی اور خاص طور پر تمام مسلمان اس کو نقصان دہ سمجھتے ہیں۔

اور یہ کانفرنس اس بات کا بھی اعلان کرتی ہے کہ کوئی بھی ایسا قانون مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا جو مذکورہ بالا اصول پر نہ تیار کیا گیا ہو اور اس کو آل انڈیا مسلم لیگ نے تسلیم نہ کر لیا ہو۔"

پھر ۱۹۳۸ء کے سالانہ اجلاس میں بمقام پٹنہ فیڈریشن (وفاق) کی اسکیم مندرجہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے اور اُن واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو ایکٹ کے نافذ ہونے کے بعد پیش آئے اور آئندہ پیش آسکتے ہیں ایسی متبادل اسکیم تیار کرنے کا رزولیوشن پاس کیا گیا جس سے مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے مفاد کا تحفظ کامل ہو سکے۔

اس کے بعد آئینی سب کمیٹی منعقدہ لاہور نے ایک تفصیلی اسکیم مرتب کرنے کا کام ڈاکٹر عبداللطیف کے سپرد کر دیا چنانچہ انھوں نے آخر مارچ میں لیگ کی مجلسِ عاملہ کے سامنے اس کو پیش کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی چند[1] اسکیمیں پیش ہوئیں مجلسِ عاملہ نے ان سب پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنا دی تاکہ وہ مسلمانانِ ہند کے آزادانہ و خود مختارانہ سیاسی و ثقافتی نشو و نما کا انتظام کرنے کے لئے کسی دستوری اسکیم پر نظر ڈالے۔

---

[1] ان اسکیموں میں (۱) نواب صاحب ممدوٹ (۲) سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب (۳) ڈاکٹر سید ظفر الحسن صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی و ڈاکٹر افضال حسین قادری استاد شعبہ جغرافیہ کی مشترکہ اسکیم نہایت اہم ہیں۔ یہ سب اسکیمیں بکثرت شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر عبداللطیف نے اپنی اسکیم کے آغاز میں[480] لکھا ہے کہ

"ہندوستان کے مسلمان برطانوی حکومت سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ۱۹۳۵ء کے آئین جدید کو منسوخ کر کے اس کے بجائے ایک ایسا آئین نافذ کرے جس کی رو سے ہندوستان میں ہر قوم اپنی اپنی تہذیب و معاشرت کے بموجب اپنی خود مختار حکومت قائم کر سکے۔ اس وقت جو آئین ہندوستان کو دیا گیا ہے اُسے مسلمان کسی طرح قبول نہیں کر سکتے کیونکہ اس آئین کو بنانے والوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ہندوستان میں ایک متحدہ قوم بستی ہے حالانکہ نہ ایسا ہے اور نہ مستقبل قریب میں ایسا ہونے کی کوئی توقع ہے۔ ہندوستان میں ہندو مسلمان دو ایسی قومیں بستی ہیں جو تہذیب و معاشرت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں اور اس لئے وہ جمہوری حکومت جو آج کل صوبوں میں نافذ ہے نیز وہ حکومت جو فیڈریشن کے نام سے عنقریب مرکز میں نافذ ہوا چاہتی ہے، حقیقت میں صرف اکثریت رکھنے والی قوم یعنی ہندوؤں کی حکومت ہے، دوسری تمام قومیں ہندو قوم کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی ہیں۔ بنابریں ضرورت ہے کہ ان دونوں قوموں (ہندو مسلمان) کو اپنے اپنے تہذیبی حلقوں میں مکمل خود مختار حکومت بنانے کا حق دیا جائے اور اسی چیز کو سامنے رکھتے ہوئے ہندوستان کے صوبے نئے سرے سے بنائے جائیں۔ تاکہ ہر قوم اپنے اپنے تہذیبی حلقہ میں دوسروں کی نوچ کھسوٹ سے محفوظ رہے اور پھر ان تمام مختلف تہذیبی حلقوں کی ایک مرکزی انجمن (کانفیڈریسی) بنا دی جائے۔"

(۱) موجودہ آئین میں ہم خالص اسلامی بنیادوں پر اپنی معاشی، معاشرتی اور تہذیبی ترقی نہیں کر سکتے (۲) یہ آئین اس ملک میں مسلمانوں کی تاریخی اہمیت کو زائل کر کے ہماری امتیازی حیثیت کا خاتمہ کرتا ہے اور ہمیں ہمیشہ کے لئے ناقابلِ التفات بنا کر ملکی نظم و نسق میں ہمارے دیرپا اثر و نفوذ کو فنا کرتا ہے اور (۳) ہندو مسلمانوں کے درمیان مذہبی، معاشرتی، اور معاشی تصادم کے امکانات

کو قوی تر بناتا ہے ———— اور پھر یہ سب باتیں ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کے مقصد کو ایک غیر معین مدت تک کے لئے پیچھے ڈال دیتی ہیں۔ اس لئے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر ہندوستان میں ہندو مسلم تہذیب کے ایسے ہم آہنگ صوبے بنا دیئے جائیں جن میں یہ دونوں قومیں آزادی کے ساتھ اپنی اپنی تہذیب و روایات کے زیر سایہ ترقی کر سکیں۔ صوبوں کی اس حد بندی کا کام ایک شاہی کمیشن کے سپرد کیا جائے جو بطور خود ہندوستان کے حالات کا معائنہ کر کے اس سلسلہ میں ایک رپورٹ تیار کرے۔"

اس کے بعد جغرافی تقسیم کا خاکہ کھینچ کر لکھا کہ :-

ہندوستان کی وہ مرکزی حکومت جو مذکورہ بالا اصول پر قائم ہوگی (۱) ایک ایسا قانون نافذ کرے گی جس کی رو سے مخصوص اغراض کے لئے مسلمان اور ہندو دونوں مجاز ہوں گے کہ اپنے "تہذیبی علاقہ" کو چھوڑ کر دوسرے "تہذیبی علاقہ" میں رہ سکیں۔ (۲) ہندو علاقہ میں مسلمانوں کی اور مسلم علاقہ میں ہندوؤں کی جو عبادت گاہیں اور قبرستان و مزارات وغیرہ ہیں اُن کی حفاظت کی جائے گی (۳) عیسائی، پارسی اور بدھ وغیرہ چھوٹی چھوٹی قوموں کو مذہبی و تہذیبی تحفظات دیئے جائیں گے اور اگر وہ چاہیں گے تو جن شہروں میں اُن کی اکثریت ہوگی وہاں سوئٹزرلینڈ کی طرح اُن کے خود مختار گروپ (کینٹن) بنا کر ان کو مقامی طور پر سیاسی خود اختیاری دیدی جائے گی۔ (۴) اچھوتوں کی چونکہ کوئی متحد تہذیب نہیں ہے اس لئے اُن کو کامل اختیار ہوگا کہ وہ چاہیں تو مسلم علاقہ کو اپنی سکونت کے لئے منتخب کریں اور چاہیں تو ہندو علاقہ کو۔

۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا لیکن اجلاس سے ۲ دو دن قبل ۱۹ مارچ کو پولیس اور خاکساروں کا تصادم ہو گیا جس میں گولی چلانے کی نوبت پہونچی اور بہت سی جانیں تلف ہوئیں یہ خبر تمام ہندوستان میں پھیل گئی اور التوائے اجلاس کی قیاس آرائی شروع ہو گئی کیوں کہ ۲۱ سے پہلے تک حالات پورے طور پر قابو میں

نہ آئے تھے مگر مسٹر جناح صدر لیگ اور مجلس استقبالیہ نے ان قیاسات کی تردید کر دی اور ہر حصۂ ہند سے بکثرت ڈیلیگیٹ اور وزیٹر شریک ہوئے کوئی بڑا اور چھوٹا صوبہ ایسا نہ تھا جہاں کی کافی نمایندگی نہ ہو ریل کے علاوہ دُور دُور سے لوگ لاریوں اور موٹروں کے ذریعہ سے لاہور پہونچے۔

خاکساروں کا واقعہ نہایت سخت المیّہ تھا اگرچہ وہ ایک علیحدہ اور آزاد جماعت ہے اس کی تنظیم خاص اصولوں کے ماتحت ہے اور مسلم لیگ سے غیر متعلق ہے مگر چونکہ مسلمانوں کی جماعت ہے اس لئے عام ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔ اس المیّہ کا زبردست اثر پورے اجلاس پر تھا اور جناب صدر بھی کم متاثر نہ تھے وہ جمعرات کے دن جب لاہور پہونچے ہیں تو سب سے پہلے انھوں نے میو ہسپتال میں جاکر زخمیوں کو دیکھا اور ان کو تسلی و تسکین دی اور اس المیّہ کے متعلق اکثر اہل الرائے سے مشورہ کیا۔

۲۲، مارچ کو بعد جمعہ اجلاس عام شروع ہوا تقریباً ایک لاکھ آدمی پنڈال میں تھے اور پنڈال سے باہر کے میدان میں بھی جم غفیر تھا۔ صدر لیگ کی آمد کے بعد سر شاہ نواز نواب ممدوٹ صدر مجلس استقبالیہ نے اپنے خطبۂ استقبالیہ پڑھا جس میں مہمانوں کے خیر مقدم کے بعد اُنھوں نے کہا کہ:۔

> سیاسی بیداری کے ساتھ مسلمانانِ ہند نے اس امر کی انتہائی کوشش کی کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر غلامی کی زنجیروں کو توڑ دیں تقریباً ۲۵ مرتبہ یہ کوشش کی گئی کہ کوئی ایسا سمجھوتہ ہو جائے کہ جس سے مسلمان اپنی اسلامی تہذیب کا پورے طور پر فائدہ اٹھا سکیں اور اُن کے مذہبی سیاسی اور مجلسی حقوق محفوظ رہیں لیکن افسوس ان کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا!!.........

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:۔

> مغربی قسم کا نظامِ حکومت ہندوستان کے لئے موزوں نہ ہوگا پ۲ سال

کانگریسی اکثریت کے صوبوں کا تجربہ اس کا ناقابل انکار ثبوت ہے"

پھر انھوں نے تمام مسائلِ حاضرہ پر ایک جامع بحث کی۔

صدرِ اجلاس مسٹر جناح نے زبانی تقریر کی جس میں پہلے اجلاس پٹنہ کے بعد کی سرگرمیوں، اعلانِ جنگ کے بعد کی دشواریوں، حکومت کے ساتھ گفت و شنید، ڈھائی سالہ صوبجاتی [illegible]سے کے تجربات، کانگریس اور حکومت کے شریفانہ معاہدہ یعنی گورنروں کی عدم مداخلت [illegible]س کے خاتمہ پر ایک تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے کانگریس کی ہندوانہ حیثیت، اور گاندھی جی [illegible]ہندوانہ نمایندگی، اور مسلم لیگ کی نمایندہ حیثیت، اور کانگریسی چالوں کے متعلق کہا کہ

مسٹر گاندھی ایمانداری کے ساتھ کیوں تسلیم نہیں کر لیتے کہ کانگریس ایک ہندو جماعت [illegible]، اور وہ سوائے ہندوؤں کی ٹھوس جماعت کے اور کسی کی نمایندگی نہیں کرتے، مسٹر گاندھی [illegible]پر نازاں کیوں نہیں ہیں اور کیوں نہیں کہتے کہ میں ہندو ہوں اور کانگریس کو ہندو قوم کی [illegible]س تائید حاصل ہے، میں تو یہ کہنے میں ذرا بھی نہیں شرماتا کہ میں مسلمان ہوں میں صحیح [illegible]ا ہوں اور مجھے امید ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اب تو وہ بھی جو بالکل اندھا ہے اس کا قائل [illegible]یا ہے کہ مسلم لیگ کو تمام مسلمانانِ ہند کی ٹھوس تائید حاصل ہے۔

پھر یہ فریب کاریاں کیوں ؟ یہ سازشیں کیوں ؟ یہ برطانویوں کو مجبور کر کے مسلمانوں پر [illegible]حاصل کرنے کی کوشش کیوں ؟ یہ عدم تعاون کا اعلان کیوں ؟ یہ سول نامتابعت کی [illegible]لیاں کیوں ؟ اور کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے لئے اس غرض سے جنگ کیوں ؟ کہ مسلمانوں [illegible]رائے عامہ معلوم کی جائے کہ آیا وہ رضامند ہوتے ہیں یا نہیں ؟

مسٹر گاندھی اپنی قوم کے نمایندے کی حیثیت سے اور اس پر نازاں کیوں نہ آئیں [illegible]میں ان سے اس پر نازاں ملوں کہ مسلمانوں کا نمایندہ ہوں"

پھر آیندہ آئینِ حکومت کے ازسرِ نو جانچ کے مطالبہ کی منظوری کا تذکرہ کرتے ہوئے [illegible]یا کہ

دوسرے معاملات کے متعلق ہم ابھی گفت و شنید کر رہے ہیں اور وہ اہم معاملات یہ ہیں [illegible]) ہندوستان کے آیندہ دستورِ حکومت کے متعلق ہماری منظوری اور رضامندی بغیر

ملک معظم کی گورنمنٹ کوئی اعلان نہ کرے اور ہمارے پس پشت کسی مسئلہ کے متعلق کسی فریق سے سمجھوتہ نہ کیا جائے جب تک ہم اس کے متعلق منظوری اور رضامندی نہ دیدیں۔

خواتین و حضرات اب حکومت برطانیہ اپنی عقل کی روشنی میں ہمیں اس معاملہ میں یقین دلائے یا نہ دلائے لیکن مجھے یہ اعتماد ہے کہ اس کو یہ نظر آئے گا کہ ہمارا یہ مطالبہ منصفانہ ہے اور ہمارا یہ قول حق پر مبنی ہے کہ ہم نو کروڑ مسلمانوں کے مستقبل اور قسمت کا فیصلہ کسی دوسرے جج پر نہیں چھوڑیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اور صرف ہم اپنے آخری حکم ہوں، ...... میں اس پلیٹ فارم سے اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں اگر مسلمانوں کی منظوری اور رضامندی بغیر کوئی اعلان کیا گیا یا کوئی عارضی سمجھوتہ کیا گیا تو ہندوستان کے مسلمان اس کی مخالفت کریں گے اور اس معاملہ میں کوئی غلطی نہ ہونی چاہیئے اس کے بعد فلسطین کا معاملہ تھا۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ عربوں کے قومی مطالبات پورے کرنیکے لئے کوششیں اور مخلصانہ کوششیں کی جارہی ہیں۔ بہت خوب مگر ہم مخلصانہ کوششوں سے، پُرجوش کوششوں سے اور بہترین کوششوں سے مطمئن نہیں ہو سکتے (قہقہے) ہم یہ چاہتے ہیں۔ کہ حکومت برطانیہ حقیقت میں اور واقعی اعراب فلسطین کے مطالبات پورے کرے۔

پھر افواج بھیجنے کا مسئلہ تھا۔ اس معاملہ میں کچھ غلط فہمی ہے۔ لیکن بہرحال ہمارا جو مقصد ہے۔ وہ ہم نے صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ یہ ہم کبھی نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کی فوجوں کو خود اپنے ہی ملک کی حفاظت کے لئے پوری طرح استعمال نہ کیا جائے۔ اگر اس معاملہ میں کوئی غلط فہمی یا پریشانی ہے تو وہ غلط ہے۔ ہمارے مطالبہ کے الفاظ ہی سے یہ ثابت ہے کہ اس قسم کی غلط فہمی حق بجانب نہیں ہے۔ ہم نے اس معاملہ میں جو کچھ چاہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ حکومت برطانیہ ہمیں یقین دلائے کہ ہندوستانی فوجیں کسی مسلم ملک یا مسلم حکومت کے خلاف نہیں بھیجی جائیں گی۔ ہمیں یہ اُمید کرنی چاہیئے۔ کہ ہم اب بھی حکومت برطانیہ سے ان معاملات کی مزید وضاحت کرا سکیں گے۔

پھر مسلمان قومیت کے متعلق کہا کہ :-

غلطی سے یہ بات مسلمہ سمجھی گئی ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اور ہم اس کو سننے کے

اتنے عرصہ سے عادی ہو گئے ہیں کہ ان قائم شدہ توہمات کو دور کرنا مشکل ہو گیا ہے مسلمان اقلیت نہیں ہیں مسلمان ایک قوم ہیں اور ہر اس تعریف کے مطابق جس کی بنا پر برطانوی اور بالخصوص کانگریس یہ کہتی ہے کہ ”اچھا آپ بہرحال اقلیت ہیں آپ اب چاہتے کیا ہیں“ اور جیساکہ بابو راجندر پرشاد کہتے ہیں ”اس کے علاوہ اقلیتیں اور چاہتی کیا ہیں“ لیکن مسلمان یقیناً اقلیت نہیں ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے برطانوی نقشہ کے مطابق بھی ہم ہندوستان کے ایک ایسے بڑے حصہ پر قابض ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مثلاً بنگال، پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان۔

اس کے بعد ہندو مسلمانوں کی جداگانہ قومیت مسئلہ ہند کی بین الاقوامی حیثیت کے متعلق اور دیگر مہمات امور کی نسبت کہا کہ:-

کئی قرن سے برطانوی گورنمنٹ اور پارلیمنٹ اور ان سے بھی زیادہ برطانوی قوم ہندوستان کے مستقبل کے متعلق ان معین خیالات کے ساتھ پرورش پا رہی ہے جو ان سرگرمیوں پر مبنی ہیں جو خود ان کے ملک میں جاری رہی ہیں اور جن سے یہ برطانوی دستور بنا ہے جو اس وقت ایوانہائے پارلیمنٹ اور وزارت کے طرز کے ذریعہ عمل کر رہا ہے۔ ان کا پارٹی کا تخیل جو سیاسی نماکوں کے مطابق عمل کرتا ہے ان کے لئے ایک مثال بن گیا ہے جس کو وہ ہر ملک کے لئے بہترین طرز حکومت تصور کرتے ہیں اور یک طرفہ طاقتور پروپیگنڈے نے جو طبعاً برطانویوں پر اثر کرتا ہے ان کو ایک سخت غلطی میں مبتلا کر دیا جس سے یہ دستورِ حکومت پیدا ہوا جس نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی صورت اختیار کی ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ عظمیٰ کے بڑے سے بڑے مدبر جن کا دماغ ان خیالات سے معمور ہے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنے بیانات میں کہتے ہیں اور یہ امید ظاہر کرتے ہیں کہ امتدادِ زمانہ سے ہندوستان کے متضاد عناصر موافق اور ہموار ہو جائیں گے۔

انگلستان کے ایک بہت بڑے اخبار لندن ٹائمز نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پر دورانِ تنقید میں کہا کہ ”بلاشبہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو اختلاف ہے

وہ محدود معنی میں صرف مذہب ہی کا نہیں بلکہ قانون اور کلچر کا بھی ہے اور اس وجہ تک
ہے کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں دو مختلف تہذیبیں ہیں بہرکیف جیسے جیسے زمانہ گزریگا
یہ توہمات فنا ہوتے جائیں گے اور تمام ہندوستان ایک قوم کی صورت اختیار کرے گا
(گویا لندن ٹائمز کے خیال میں یہ تمام دشواریاں توہمات ہیں) ان بنیادی، مذہبی، اقتصادی،
کلچرل، معاشرتی اور سیاسی اختلافات کو جن کی جڑیں بہت ہی گہری ہیں نرمی کے ساتھ
توہمات کہہ کر ٹال دیا گیا۔ لیکن یقیناً یہ کہنا کہ یہ محض توہمات ہیں برِعظم ہندوستان کی
گزشتہ تاریخ اور اسلامی اور ہندو سوسائٹی کے تصورات کو بری طرح نظر انداز کرنا ہے وہ
قومیں جو ایک ہزار برس یکجا رہیں اور جن کے درمیان تعلقات کے اعتبار سے قریب
ترین اتصال رہا اب تک ایسی ہی الگ الگ اور دور ہیں جیسی ہمیشہ تھیں وہ محض جمہوری
دستور کے تحت میں آکر اور برطانوی پارلیمنٹری آئین کے ذریعہ غیر طبعی اور مصنوعی ذرائع
سے زبردستی یکجا کر کے ایک قوم نہیں بن سکتیں یہ بات ناقابل تصور نہیں ہے کہ یہ مختلف
قومیں جو اس برِعظم میں آباد ہیں کیسی رضامندی اور وفاداری سے ایک گورنمنٹ کے
احکام اور فرامین کی تعمیل کریں گی سوائے اس حالت کے کہ ان کی پشت پر مسلح طاقت ہو۔

ہندوستان کا مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے اور اس کے ساتھ ایسا ہی
برتاؤ بھی ہونا چاہئے جب تک یہ بنیادی حقیقت تسلیم نہ کی جائے گی جو دستور بھی بنے گا وہ
تباہی پر منتج ہوگا اور تباہ کن اور مضر ثابت ہوگا صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ برطانیہ کو
اور ہندوؤں کے لئے بھی اگر برطانوی حکومت واقعی اس برِعظم ہندوستان کے باشندوں
کے لئے اخلاص اور توجہ کے ساتھ امن اور خوشحالی چاہتی ہے تو ہم سب کے لئے اس کی
ایک ہی تدبیر ہے وہ یہ کہ ہندوستان کو خود اختیاری قومی حکومتوں میں تقسیم کر کے۔ بڑی
قوموں کے لئے قومی وطن معین کر دیئے جائیں اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ دونوں قومیں
آپس میں دشمنی رکھیں اس کے برخلاف ان کی باہمی رقابتیں اور ہر ایک کی طرف سے یہ
طبعی خواہش اور کوشش رفع ہو جائے گی کہ دوسرے پر اجتماعی حیثیت میں اور گورنمنٹ
کے اندر سیاسی حیثیت میں غلبہ حاصل کرے۔ بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعہ وہ

جبی رضامندی کی طرف مائل ہوں گی اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ پورے پورے امن کے ساتھ رہ سکیں گی۔ مزید یہ کہ اس سے اقلیتوں کے معاملہ میں باہمی انتظام اور دوستانہ رضا و تفہیم کے ذریعہ ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے درمیان دوستانہ سمجھوتہ کی طرف رہنمائی ہوگی اور اس سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق و مفاد کا زیادہ موثر اور بہتر طریقے پر تحفظ ہو جائے گا۔

یہ جاننا بہت ہی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہندو دوست اسلام اور ہندویت کی اصل حقیقت سمجھنے سے عاری کیوں ہیں یہ فقط مذاہب کے حقیقی معنیٰ میں مذہب نہیں ہیں بلکہ واقعی دو مختلف معاشرتی اور عمرانی نظام ہیں یہ محض ایک خواب ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم بنیں گے۔ ہندوستانی قوم کے متعلق یہ غلط فہمی اب حد سے گزر گئی ہے، یہی ہماری بہت سی دشواریوں اور تکلیفوں کا باعث ہے اور اگر ہم جلد ان خیالات کی نظر ثانی کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تو یہ ہندوستان کو بربادی کی طرف لیجائے گی۔ ہندو اور مسلمانوں کا دو مختلف مذہبی حلقوں معاشرتی رسموں اور ادبیات سے تعلق ہے نہ وہ آپس میں بیاہ شادیاں کرتے ہیں نہ ساتھ کھاتے ہیں اور در حقیقت ان کی دو مختلف تہذیبیں ہیں جو بڑے اصولوں کے اعتبار سے متضاد خیالات اور افکار پر مبنی ہیں۔ یہ بالکل صاف بات ہے کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف تاریخی ذرایعہ سے افکار، جذبات اور تمنائیں حاصل کرتے ہیں۔ ان کے کارنامے مختلف ہیں ان کے حوادث مختلف ہیں اور ان کے ہیرو (بڑے آدمی جو قوم میں ممدوح کی حیثیت اختیار کریں) مختلف ہیں۔ اکثر ایک کا ہیرو دوسرے کا دشمن ہے اور ایک کی فتح دوسرے کی شکست ہے۔ ایسی دو قوموں کو ایک حکومت کے جوئے میں جوتنا ایک کو اقلیت کی حیثیت سے اور دوسری کو اکثریت کی یقیناً بڑھتی ہوئی بےچینی کی طرف لے جائے گا اور ایسی گورنمنٹ کے لئے جو نظام بھی بنایا جائے گا وہ اس سے تباہ ہو جائے گا۔

تاریخ نے ہمارے سامنے اس کی بہت سی مثالیں پیش کر دی ہیں جیسے برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ چیکوسلاویکیہ اور پولینڈ۔ تاریخ نے ہمارے سامنے ایسے بہت سے جغرافی

علاقے بھی پیش کر دیئے ہیں جو ایک ملک ہو سکتے تھے لیکن ان میں جتنی قومیں آباد ہیں اتنی ہی ان میں حکومتیں قائم کی گئی ہیں۔ جزیرہ نمائے بلقان میں سات یا آٹھ خود مختار حکومتیں ہیں۔ جزیرہ نمائے آئی بیریا میں اسپین اور پرتگال الگ الگ حکومتیں ہیں اس کے مقابلہ میں وسیع ہندوستان ہے جس میں ہندوستان کی وحدتِ ملکی اور وحدتِ قومی کا حیلہ پیش کر کے مرکزی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ ۱۲ سو برس کی تاریخ ہندوستان میں یہ اتحاد نہ پیدا کر سکی اور اس نے دیکھا کہ اس طویل زمانہ میں ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان الگ الگ رہے ہے۔ ہندوستان کی موجودہ مصنوعی وحدت صرف برطانوی دَور کی پیدا وار ہے اور وہ بھی صرف برطانوی سنگینوں کے زور سے قائم رہی لیکن برطانوی حکومت کا خاتمہ جو ملک معظم کی حکومت کے حالیہ بیانات کی رو سے قطعی ہے بالکل علیحدگی اور ایسی بڑی قسم کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگا جو ایک ہزار برس میں مسلم حکومت کے ماتحت کبھی نہیں ہوئی۔ یقیناً یہ ورثہ اس قابل نہیں ہے جسے برطانیہ ڈیڑھ سو برس کی حکومت کے بعد ہندوستان کے لئے چھوڑ دے اور نہ ہندو مسلمان اتنے بڑے فتنہ کا خطرہ انگیز کرنا گوارا کریں گے۔

مسلم ہندوستان ہرگز ایسا دستور منظور نہیں کرے گا جو ہندو اکثریت کی حکومت پر منتج ہو۔ اسے جمہوری طرزِ حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجا کرنے کے معنیٰ جو اقلیتوں پر زبردستی مسلط کیا گیا ہو سوائے ہندو راج کے اور کچھ نہیں ہو سکتے یہ جمہوریت جس کے عشق میں کانگریس ہائی کمانڈ مبتلا ہے ان سب چیزوں کی قطعی بربادی کے مرادف ہے جو اسلام میں سب سے زیادہ بیش بہا ہیں۔ ہمیں گزشتہ ڈھائی سال کے اندر صوبجاتی خود اختیاری کا اچھی طرح تجربہ ہو چکا ہے اور ایسی حکومت کا دوبارہ قیام یقیناً خانہ جنگی اور اس قسم کی نجی فوجوں کی بھرتی پر منتج ہوگا جو مسٹر گاندھی نے سندھ کے ہندوؤں کے لئے تجویز کی ہیں۔ یعنی انھوں نے یہ کہا تھا کہ "ان کو چاہئے کہ بلا تشدد یا بہ تشدد اپنی حفاظت کریں ضرب کے جواب میں ضرب لگائیں اور ان سے یہ نہ ہو سکے تو ترکِ وطن کریں"۔

جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے مسلمان اقلیت نہیں ہیں کوئی دیکھے اس وقت برطانوی

نقشے کے مطابق بھی گیارہ صوبوں میں سے چار صوبوں میں جہاں کم و بیش مسلمانوں کی اکثریت ہے اس کے باوجود بھی ان کی حکومتیں قائم ہیں اور چل رہی ہیں جب کہ کانگریس نے عدم تعاون کا فیصلہ کر لیا ہے اور سول نامتابعت کی تیاریاں کر رہی ہے۔ مسلمان قوم ہیں۔ اور قوم کی ہر تعریف کے مطابق ان کا وطن ہونا چاہیئے ان کا علاقہ ہونا چاہیئے اور ان کی حکومت ہونی چاہیئے۔ ہم اپنے ہمسایوں کے ساتھ بحیثیت آزاد اور خود مختار قوم کے امن و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری قوم روحانی کلچرل اقتصادی سیاسی ہر شعبۂ حیات میں اس طرح ترقی کرے جیسے ہم بہتر سمجھیں اور اپنے تصورات اور مزاج کے مطابق دیانت اور اپنی قوم کے کروڑوں نفوس کا مفاد ہم پر یہ پاک فرض عاید کر رہا ہے کہ ہم کوئی ایسا باعزت اور پُرامن حل نکالیں جو سب کے لئے منصفانہ ہو لیکن اس کے ساتھ ہی دھمکیوں اور ڈراووں کے ذریعہ ہم اپنے مقصد سے نہیں ہٹ سکتے۔ ہمیں تمام مشکلات اور نتائج کا مقابلہ کرنے اور اس مقصد اور مطمح نظر کو حاصل کرنے کے لئے جو ہم نے اپنے سامنے رکھ لیا ہے ہر قسم کی قربانیاں کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

دوسرے دن آنریبل مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے حسبِ ذیل رزولیوشن پیش کیا۔

ورکنگ کمیٹی اور کونسل آل انڈیا مسلم لیگ نے آئینی مسئلہ کے متعلق جو عمل اختیار کیا اور جس کا اظہار ان کی قرار داد ہائے مورخہ ۲۷ر اگست و ۱۷ و ۱۸ر ستمبر ۱۹۳۹ء اور ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ر فروری ۱۹۴۰ء سے ہوتا ہے اس کو منظور کرنے اور اس کی تصدیق کرنے کے ساتھ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس پُرزور الفاظ میں یہ دوہراتا ہے کہ فیڈریشن کی وہ اسکیم جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں درج ہے۔ اس ملک کے خاص حالات کی وجہ سے قطعی غیر موزوں اور ناقابل عمل ہے اور بالکل اس قابل نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس کو منظور کریں۔

(۲) یہ اجلاس پُرزور الفاظ میں اپنی یہ رائے بھی ثبت کرتا ہے کہ وائسرائے کا وہ بیان جو انھوں نے ۱۸ر اکتوبر ۱۹۳۹ء کو ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کی طرف سے دیا تھا اس حد تک

قابلِ طمانیت ہے کہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اس پالیسی اور خاکہ پر جس پر کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ
مبنی ہے، ہندوستان کے مختلف فرقوں، پارٹیوں اور مفادات کے مشورے سے دوبارہ
غور کیا جائے گا۔ لیکن مسلم ہندوستان اُس وقت تک مطمئن نہیں ہوگا جب تک کہ پورے
آئینی مسئلہ پر ازسرِنو غور نہ کیا جائے اور کوئی نظرِثانی کیا ہوا دستور بغیر اس کے مسلمانوں
کے لئے قابلِ قبول نہ ہوگا جب تک وہ مسلمانوں کی منظوری اور رضامندی سے وضع
نہ کیا گیا ہو۔

(۳) قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی یہ پختہ رائے ہے کہ کوئی آئینِ حکومت بغیر اس
کے نہ قابلِ عمل ہو سکتا ہے اور نہ مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہو سکتا ہے کہ وہ ذیل کے
بنیادی اصولوں پر مبنی ہو یعنی یہ کہ جغرافیائی حیثیت سے ایسے متصل علاقے جن کی ضرورت
کے مطابق ملکی لحاظ سے اس طرح حد بندی کر دی گئی ہو کہ جن علاقوں میں تعداد کے اعتبار
سے مسلمانوں کی اکثریت ہے جیسے کہ شمالی و مغربی اور مشرقی منطقوں میں ہے وہ خودمختار
حکومت قرار دیئے جائیں اور جن کے اجزائے ترکیبی اندرونی طور پر خود اختیار اور
خودمختار رہوں۔

یہ کہ ان علاقوں اور (منطقوں کے) اجزائے ترکیبی میں اقلیتوں کے مذہبی، کلچرل،
اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لئے آئین میں
معقول، مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات درج کئے جائیں اور نیز ہندوستان کے دوسرے
علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد کم ہے مسلمانوں کے لئے اور نیز دوسری اقلیتوں
کے لئے ایسے معقول مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات معین طور پر دستور میں داخل کر دیئے جائیں
جن سے ان کے مذہبی، کلچرل، اقتصادی، سیاسی اور انتظامی اور دوسرے حقوق و
مفاد کا تحفظ ہو جائے۔

یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو یہ مزید اختیار دیتا ہے کہ دستور کی ایک اسکیم مرتب کرے جو
ان بنیادی اصولوں پر مبنی ہو اور وہ اس قسم کی ہو جس میں یہ آئینی گنجائش ہو کہ ان علاقوں
کو اس قسم کے تمام اختیارات مل جائیں جیسے دفاع، امور خارجیہ و رسل و رسائل، کروڑگیری

اور نیز ایسے ہی دوسرے امور جو ضروری ہوں"۔

بسلسلۂ تحریک رزولیوشن محرک نے کہا کہ :-

ہم نے یہ قطعی طور پر اور صاف صاف کہدیا تھا کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ صرف یہ نہیں ہے کہ فیڈریشن کے خیال میں ادھر اُدھر تھوڑی تھوڑی ترمیم کر دیں بلکہ اس کو بالکل بدل ڈالیں تاکہ فیڈریشن بالکل ختم ہو جائے۔ مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ فیڈریشن بالکل ملتوی ہو جائے بلکہ یہ ہے کہ یہ خیال ہی ترک کر دیا جائے۔ مختلف مواقع پر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اور ابھی چند دن ہوئے بنگال کی اسمبلی میں مَیں نے پُرزور اور قطعی الفاظ میں کہا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان کسی ایسی اسکیم کو منظور نہیں کریں گے جو بغیر ان کی منظوری کے بنائی جائے۔ مجھے امید ہے کہ جن کے اختیار میں یہ ہے کہ ہندوستان کا آئندہ دستور مرتب کریں وہ مسلم جذبات کو ملحوظ رکھیں گے اور کوئی ایسا عمل نہ کریں گے جس کے بعد میں پچھتانا پڑے۔ مسلمانوں نے اپنی روش صاف صاف بیان کر دی ہے اس وقت وہ ۹ کروڑ ہیں اور تمام ہندوستان میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ سننے میں ایک بہت بڑی تعداد معلوم ہوتی ہے۔ لیکن تعداد کے اعتبار سے وہ اس وقت ہندوستان کے ہر صوبہ میں کمزور ہیں۔ پنجاب اور بنگال میں ان کی اکثریت ہے مگر با اثر اکثریت نہیں اور دوسرے مقامات پر وہ نہایت قلیل اور مایوس اقلیت ہیں۔ صورت حال ایسی ہے کہ دستور حکومت کیسا ہی ہو۔ مسلمانوں کے مفاد کو اسی طرح نقصان پہنچتا ہے گا جس طرح کہ دستور صوبجاتی خود اختیاری کے سہ سالہ عمل کے دَوران میں پہنچا ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد کے خطبۂ صدارت کے متعلق جو انھوں نے کانگریس کے اجلاس میں پڑھا مولوی فضل الحق صاحب نے فرمایا کہ :-

وہ اسلامیت کے خلاف ہے اور اُنکے اس بیان پر کہ مسلمان پریشان نہوں وہ نو کروڑ ہیں اور یہ اتنی بڑی تعداد ہے جس کو ڈرنا نہیں چاہئے اُنھوں نے مولانا کو

یاد دلایا کہ خود پنجاب اور بنگال میں بھی مسلمان محفوظ نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت یہاں کچھ اس قسم کی ہے کہ ان کے سیاسی دشمن اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنی مخلوط گورنمنٹیں بنانے کے لئے دوسرے مفاد اور اقلیتوں کی مدد لینی پڑتی ہے اور یہ دستوری نقطۂ نظر سے کمزور ترین گورنمنٹ ہوتی ہے۔ دوسرے صوبوں میں مسلمان اس قدر کمزور ہیں کہ انکا وجود اکثریت کے رحم پر منحصر ہے۔ جب تک مسلم آبادی کی اس غیر مساوی تقسیم کا معقول حل نہ نکال لیا جائے اُس وقت تک آئینی ترقی اور تحفظات کی گفتگو فضول ہے یہ نقص جب تک دور نہ ہوگا تحفظات محض ایک فریب رہیں گے۔ انھوں نے مسلمانانِ ہند سے اپیل کی کہ وہ متحد رہیں۔ انھیں خود اپنے ہی پیروں پر کھڑا ہونا ہے وہ مدد حتیٰ کہ رہنمائی کے لئے بھی کسی غیر کی طرف نہیں دیکھ سکتے۔
اس تجویز پر تقریباً تمام صوبجات کے نمایندوں نے تقریریں کیں اور بالاتفاق پاس ہوئی دوسری تجویز فلسطین کے متعلق یہ تھی کہ:-

"اب فلسطین سے سمجھوتہ کرنے میں حکومت برطانیہ نے جو طویل تاخیر کی ہے اس پر مسلم لیگ اپنی شدید پریشانی کا اظہار کرتی ہے اور صاف وغیر مبہم الفاظ میں اپنی یہ قطعی رائے ثبت کرتی ہے کہ فلسطین کے معاملہ میں کوئی فوجی کارروائی نہ کی جائے گی اور ایسا کرنا ان مواعید کے خلاف ہوگا جو عملی مدد حاصل کرنے کے لئے ۱۹۱۴ء کی جنگ میں حکومت برطانیہ نے مسلمانانِ عالم سے کئے تھے۔ مزید براں لیگ حکومتِ برطانیہ کو اس خطرہ سے متنبہ کرتی ہے کہ وہ فلسطین میں عظیم برطانوی فوج کے قیام سے فائدہ نہ اٹھائے اور عربوں کو خوف زدہ کرکے اطاعت پر مجبور نہ کرے۔"

اس تجویز کو بھی بالاتفاق پاس کیا گیا۔

چوں کہ خاکساروں اور حکومت پنجاب کے تصادم نے ایک تشویش ناک صورت پیش کردی تھی اس لئے مسٹر جناح نے تمام مندوبین کی غیر مشتبہ رضامندی حاصل کرکے

کرسیٔ صدارت سے حسب ذیل تجویز پیش کی۔[1]

آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کے اس حادثہ پر انتہائی رنج والم کا اظہار کرتا ہے جو خاکساروں اور پولس کے درمیان تصادم کی صورت میں رونما ہوا اور جس کے نتیجہ میں بہت سی جانیں ضائع ہوئیں اور اُن سے بھی زیادہ زخمی ہوئے۔ ان کے ساتھ جو قتل و زخمی ہوئے اور ان کے خاندان والوں کے ساتھ اور نیز ان کے ساتھ جو ان سے وابستہ تھے باخلاص ہمدردی کرتا ہے۔

یہ اجلاس حکومت سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ فوراً ایک ایسی آزاد اور غیر جانبدار تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرے جس کے ارکان پر عوام کو پورا پورا اعتماد ہو اور اُس کو یہ ہدایت کرے کہ وہ اس معاملہ کی پوری پوری تحقیقات اور تفتیش کرے اور جس قدر ممکن ہو اپنی رپورٹ پیش کرے۔

یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ اختیار دیتا ہے کہ رپورٹ کی اشاعت کے فوراً ہی بعد اس معاملہ میں جو کارروائی وہ ضروری سمجھے کرے۔

یہ اجلاس مختلف حکومتوں سے یہ اصرار کرتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ تمام احکام منسوخ کردے جن کے ذریعہ نظام خاکسار کو غیر آئینی قرار دیا گیا ہے۔

چند اور ضابطہ کی تجاویز پیش اور منظور ہونے کے بعد

مسٹر جناح نے مجلس استقبالیہ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ان کا نہایت شاندار استقبال کیا اور اجلاس کی کارروائی کی تکمیل میں مدد دی، انھوں نے کہا کہ:۔

مسلمانوں نے دنیا کے سامنے اس کا مظاہرہ کر دیا کہ وہ کس قدر صاحبِ ضبط و نظم قوم ہیں۔

جس وقت میں نے خاکساروں کے حادثۂ فائرنگ (آتشباری) کے متعلق سُنا تو مجھے سخت پریشانی ہوئی مجھے یہ مشورہ دیا گیا کہ میں لیگ کا اجلاس ملتوی کر دوں لیکن چوں کہ مجھے اپنی قوم پر پورا اعتماد تھا لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ اجلاس ملتوی نہ کیا جائے، میں جس وقت لاہور پہنچا تو میں نے اخبارات کے

نمایندوں سے ایک ملاقات کے دوران میں کہا تھا کہ لاہور کا اجلاس مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی تاریخ مستقبل میں تعین حدود کا ایک نشان ثابت ہوگا۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عین آغازِ اجلاس کے وقت یہ حادثہ پیش نہ آگیا ہوتا تو یہ اجلاس اور بھی زیادہ کامیاب ہوتا اگر یہ حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو بہت ہی عظیم الشان جلوس نکلتا جس میں مسلمانوں کو اپنے دلی جوش کے اظہار کا موقع ملتا ہمارے دشمن اجلاس کو بے رونق کرنا چاہتے تھے ان کی تمام کوششیں ناکام رہیں اور اجلاس کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔

مجھے مسرت ہے کہ اجلاس کی کارروائی سکون و سکوت کے ساتھ انجام پذیر ہوئی یہ مسلمانوں کا سخت امتحان تھا۔ ۴ مسلمان گولیوں سے ہلاک ہو چکے تھے اور ہمارا خون کھول رہا تھا ان حالات میں سکون قائم رکھنا بہت ہی دشوار تھا۔ مگر آپ نے دنیا کے سامنے اس کا مظاہرہ کر دیا کہ مسلمانوں میں غم پر صبر کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ آپ نے اس کا بھی مظاہرہ کر دیا کہ آپ لاکھوں کے مجمع میں اپنا کام بخیر و خوبی انجام تک پہنچا سکتے ہیں۔ یہ بہترین سند ہے جو کسی قوم کو دی جا سکتی ہے اس اجلاس کی کامیابی سے میں اپنے اندر وہ طاقت اور جوش محسوس کر رہا ہوں کہ گویا میری عمر اس سے دس برس کم ہے جتنی کہ واقعی اس وقت ہے۔

اس وقت مسلم لیگ کا وقار مسلمانانِ پنجاب کے ہاتھوں میں تھا لہٰذا میں تہہ دل سے ان کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اس کامیابی سے آپ کی خدمت کی مجھ میں اور زیادہ ہمت بڑھ گئی ہے۔

مسٹر جناح نے فرمایا کہ لاہور کا اجلاس ہندوستان کی تاریخ میں ایک نمود ہے اور وہ اس وجہ سے کہ اس میں ہم نے اپنا مطمح نظر معین کر دیا ہے ہم نے نہایت اخلاص کے ساتھ یہ عظیم فیصلہ کیا ہے۔ میں مسلمانانِ پنجاب سے اپیل کرتا ہوں کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی اچھی طرح تنظیم کریں اور گاؤں گاؤں اور گھر گھر مسلم لیگ

کا پیغام پہنچا دیں۔ آپ جتنی زیادہ تنظیم کریں گے۔ اتنی ہی زیادہ آپ کے اندر اپنے حقوق حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہوگی۔ مزدور ہوں کسان ہوں، اہلِ علم ہوں، زمیندار ہوں، مالدار ہوں، کوئی ہوں، سب مسلمانوں کو بیک زبان بولنا چاہیئے۔

یوں تو مسئلہ تقسیم ہند سامنے آتے ہی ہندو پریس اور کانگریسی زعماء نے آواز مخالفت بلند کی لیکن اجلاس لاہور کی تجویز پاس ہوتے ہی ایک طوفان بپا ہوگیا بڑے بڑے بیانات ومضامین شائع ہونے شروع ہوئے گاندھی جی نے تو نہایت بے چین ہوکر کہا کہ "وہ سارے ملک کو تو جناح صاحب کو پیش کر سکتے ہیں لیکن قطع برید پر راضی نہیں ہوسکتے۔"

اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو مغالطہ میں ڈالنے کے لئے عجیب عجیب دلائل تراشے گئے۔ سکھوں کو ابھارا گیا۔ ریاستوں کو خوف زدہ کیا گیا۔ غرض ایک مستقل اور باقاعدہ مخالفت کے لئے پروپاگنڈا شروع ہوگیا۔

مسٹر جناح نے اجلاس لاہور کے بعد ہی چند مخالف بیانات کے جواب میں اس مسئلہ کی وضاحت کی، انھوں نے اس امر پر زور دیتے ہوئے کہ انھیں تجاویز پر جلد از جلد آزادی ہند کا انحصار ہے کہا کہ:-

پہلی چیز تو یہ ہے کہ مسلمان اقلیتوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے اس غلط خیال اور پُر فریب پروپاگنڈا سے زمین و آسمان سر پر رکھ لیا گیا ہے کہ تمام مسلم اقلیتوں کو اپنے گھر بار اور اپنی جائداد چھوڑ کر ترک وطن کرنا ہوگا۔ اور زن و مرد اور بوڑھے اور بچے سب کے سب سواد اعظم ہندوستان سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوں گے۔ لیکن میں برادران اسلام کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ ان شرارت انگیز غلط بیانیوں کا شکار نہ ہوں کیونکہ ان دروغ بافیوں کے جواز کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ آزاد سلطنتوں کے قیام کے ساتھ اگر ضرورت نے مجبور ہی کر دیا اور واقعی باشندوں کے تبادلہ کی نوبت آئی تو اس پر عملی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے گا۔

دوئم۔ بڑی ہوشیاری و عیاری سے مسلم اقلیتوں کو یہ یقین دلانے کی کوششیں کی گئی ہے کہ تقسیم حدود یا تعین ملک کی کسی اسکیم پر بھی عمل کیا گیا تو مسلم اقلیتیں معلق رہ جائنگی

ان کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا۔ اوران کی حالت اس وقت سے بھی بدترین ہوجائے گی۔
یہ ابلہ فریبیاں مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے کی جارہی ہیں۔"

"یہ ہمدردانِ اسلامیانِ ہند اوران کی ابلہ فریبیوں کے شکار مسلمان ذراسوچیں اورغور کریں، میں پرزورطریقہ پر کہہ سکتا ہوں کہ مفروضہ مشترکہ قومیت اور مرکزی حکومت کے ماتحت بھی ان مسلمانوں کی حالت جو ہندوصوبوں میں اقلیتوں میں ہیں ہرگز ہرگز اس سے بہتر نہ ہوگی جواب ہے، جو کچھ بھی ہو خواہ ہندوستان میں ہندو اکثریت کی مرکزی حکومت قائم ہواور کانگریس کی مجوزہ مشترکہ قومیت مسلط کی جائے یا ہندومسلم آزادعلاقے قائم کئے جائیں ہرصورت میں مسلم اقلیتیں۔ اقلیتیں ہی رہیں گی، وہ بجاطورپران تمام تحفظات کا مطالبہ کرسکتے ہیں اوران جملہ احتیاطوں کو وسیع اور موثر طریقہ پر حاصل بھی کرسکتے ہیں جو کسی مہذب حکومت کا شیوۂ امتیاز ہونا چاہئے، لیکن اس سے زیادہ وہ اور کچھ حاصل نہیں کرسکتے اسلئے اگر آزاد اسلامی سلطنت کے قیام کی راہ میں وہ روڑے اٹکائیں گے تو وہ یقین رکھیں کہ اپنے اس سنگِ راہ ہونے سے کم ازکم اپنی حالتوں کو تو وہ زیادہ بہتر نہیں بناسکتے۔"

"برعکس اس کے میں یہ جتادینے پر مجبور ہوں کہ اگر بعض مسلمان ہندو پروپیگنڈا کا شکار ہوگئے اوران فریب خوردہ مسلمانوں نے "مسلم وطن" کو قائم نہ ہونے دیا اوراس راہ میں رکاوٹوں پر رکاوٹیں پیداکیں، اوراس طرح چھ کروڑ مسلمانوں کو اپنی ایک آزادسلطنت قائم کرلینے سے محروم رکھا۔ اورجملہ نوکروڑ مسلمانوں کو ایک ہی مرکزی حکومت کے جوئے تلے باندھ دیا تو یاد رہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہ صرف ایک اقلیت بنے رہیں گے بلکہ چین کی زندگی بھی کبھی نہیں گزارسکتے۔ یہی وجہ تھی اوراسی حقیقت کا احساس تھا جس کی بناپر ہندو صوبوں کی مسلم اقلیتوں نے لاہور میں مذکورہ قرارداد کی پرزور حمایت کی۔"

"ہندوصوبوں کی مسلم اقلیتوں کے سامنے سوال صاف ہے۔ ان کو صرف اتنا فیصلہ کرنا ہے کہ آیا ایک ہندو اکثریت کے راج کے ماتحت ہمیشہ کے لئے نوکروڑ مسلمانوں کو رکھ دینا بہتر ہے۔ یاکم ازکم چھ کروڑ مسلمانوں کو اس جوئے سے رہائی حاصل کرلینے دیں اورجہاں وہ اس وقت رہ رہے ہیں اوراکثریت میں وہیں انھیں اپنا "مسلم وطن" بنالینے دیں؟ تاکہ

اس "قیام" وطن" سے ان کو موقع مل سکے کہ وہ اپنی روحانی، تمدنی، معاشی، اقتصادی۔ اور سیاسی زندگی کو اپنی خداداد قابلیت وذہانت سے فروغ دے سکیں اور اس طرح اپنا ایک شاندار وقابل فخر مستقبل بنا سکیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ ہندوؤں وغیرہ کو بھی اسی طرح پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے مواقع مہیا کر سکیں"۔

"یہی حالت ہندو دنیا کی سمجھ لینی چاہئے جس قدر ہندو دنیا مسلمان اقلیتوں کی فلاح و بہبود چاہے گی۔ اسی کیفیت کا عکس "مسلم وطن" کے آئینہ میں دکھائی دے گا، جو پوزیشن اور حیثیت مسلم اقلیتوں کی ہندو وطن میں ہوگی وہی پوزیشن ہندو اور دیگر اقلیتوں کی مسلم وطن میں ہوگی۔ میرے خیال میں جوں ہی ایک فرقہ کی تمام ملک پر غلبہ حاصل کر لینے اور تمام کے تمام پر اپنا تسلط جما لینے کی ہوسناکیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ فوراً ایسی فضا پیدا ہو جائے گی کہ چاروں طرف ہم کو بہتر مفاہمت کے حصول ایک دوسرے کی بھلائی کی خواہش اور باہمی رواداری کے خیرہ کن مناظر جلوہ گر نظر آئیں گے۔ کیونکہ تقسیم ملک اور قیام وطن سے مجوزہ وطن کی اکثریتوں پر ایسی اہم ذمہ داریاں عائد ہوں گی کہ وہ اقلیتوں کے دل ودماغ میں تحفظ کا حقیقی اور اصلی جذبہ پیدا کرنے پر مجبور ہوں گی۔ اور اس طرح انکا پورا پورا اعتماد اور تعاون حاصل کرنے کے لئے ان کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑیگا"۔

"میں ہمیشہ سے غیور سکھوں کی اپنے دل میں بڑی عزت وتوقیر رکھتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ میرے سکھ بھائی ہندوستان کی آئین سازی کے مسئلہ کا بڑے غور سے مطالعہ کریں۔ اور دیکھیں کہ وہ آج کس منزل پر ہے اور کن نتائج کا حامل ہے؟ میرا یقین ہے کہ وہ شمالی مغربی "مسلم منطقہ" میں رہ کر زیادہ بہتر حالت میں ہوں گے۔ وہ ایسی حالت میں ہوں گے جو مشترکہ ہند اور ایک مرکزی حکومت کے ماتحت تمام ملک کو رکھ دینے کی صورت میں وہ کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ ایک مرکزی حکومت میں ان کی آواز ہوتے کے برابر ہوگی اور اس نقارہ خانہ میں طوطی کی آواز کون سنے گا؟ پنجاب ہر حالت میں ایک خود مختار و بااختیارات ما بقی جز ہوگا اور بہر حال ان کو پنجاب ہی میں رہنا ہے تو پھر کیوں اس حقیقت کو نہ سمجھا جائے کہ مرکزی حکومت کے تسلط میں ان کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے

مگر وجی منطقہ کے مسلم وطن میں جس میں خود مختار اجزا کی فیڈریشن ہوگی اور ان میں سے پنجاب بھی مابقی حقوق کے ساتھ ایک خود مختار جزو لاینفک ہوگا۔ اس آزاد سلطنت میں سکھ ہمیشہ ایک معزز و مقتدر جگہ کے مالک رہیں گے اور ایک موثر و قومی آواز کے مالک ہوں گے۔ یعنی وہ اپنے اس ملک پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

"قابل ذکر ریاستیں مشرقی منطقہ میں تو موجود ہی نہیں البتہ شمالی مغربی منطقہ میں بعض قابل ذکر ریاستیں موجود ہیں۔ مثلاً کشمیر۔ بھاولپور۔ پٹیالہ وغیرہ اگر یہ ریاستیں اپنی مرضی سے خوشی خوشی مسلم وطن کی فیڈریشن میں شریک ہونا پسند کریں گی تو ہم بڑی مسرت کے ساتھ اُن سے معقول اور لایق توقیر معاہدات کریں گے لیکن ہم ان پر ایسا کرنے کے لئے کبھی زور نہ دیں گے اور نہ کسی قسم کے ناجائز دباؤ سے کام لیں گے۔"

جہاں تک "مسلم وطن" اور برطانیہ عظمیٰ کے تعلقات کا معاملہ ہے مسٹر جناح نے لاہور کی قرارداد کے اس جزو کا حوالہ دیا جس میں تحریر ہے کہ "یہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ مذکورہ بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر آئین حکومت کے متعلق ایک اسکیم تیار کرے جس میں یہ رعایت رکھی جائے کہ مختلف منطقے بالآخر ملکی مدافعت امورِ خارجیہ ذرائع رسل و رسائل۔ محصولات بحری و دیگر امورِ ضروریہ کے مالکِ کل بن جائیں گے۔

"جہاں تک ہندوانڈیا کے اس منطقہ یا منطقہ جات کا معاملہ ہے جو بقیہ برِ اعظم ہند میں قائم کئے جائیں گے ظاہر ہے کہ ان منطقوں سے ہمارے تعلقات بین الاقوامی نوعیت کے ہوں گے۔ اس کی مثالیں ہند و برما کے یا ہند و لنکا کے تعلقات میں آج بھی موجود ہیں۔"

"بعض کانگریسی مسلمانوں نے بھی مخصوص اعتراضات کئے ہیں ظاہر ہے کہ وہ "آنچہ شستاد از اں گفت ہماں می گویم" پر عامل ہیں لہذا کسی شخص کو ان کے شور و غوغا پر متردد ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ارکان لیگ اور مسٹر جناح کے علاوہ اور بھی اہل الرائے اصحاب نے اس مسئلہ پر غیر جانبدارانہ طور پر نظر ڈالی ایک صاحبِ نظر نے حسبِ ذیل نکات پیش کئے جو خاص طور پر اہلِ غور قرار دیئے۔ (۱) آٹھ کروڑ مسلمان اقلیت کی پوزیشن میں رہنے سے انکار کرتے ہیں

خاص کر ایسی حالت میں کہ مناسب تقسیم کے ذریعہ شمال مغربی و شمال مشرقی ہندوستان
میں ۷۵-۸۰ فیصدی کی اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ (۲) مغربی جمہوریت موجودہ شکل
میں ہندوستان کے مناسب حال نہیں ہو سکتی کیوں کہ صوبوں اور مرکز کی حکومت میں ہمیشہ
اکثریت والی قوم کا منشا منعکس ہوتا رہے گا (۳) ۱۹۳۵ء میں مسلمانوں کے ساتھ جو
ناانصافی ہوئی کہ ملک کے انتظام میں وہ اپنے حصہ سے محروم کر دیئے گئے وہ ناانصافی
قائم و دائم ہو جائے گی کیوں کہ مرکزی حکومت خام کاروں کے ہاتھ میں آجائے گی اور یہ
لوگ پست اقوام کے ساتھ جو سلوک کر چکے ہیں ان کی بنا پر اور بھی شدید شبہات لاحق
ہوتے ہیں کہ کیوں کر اقلیتوں کے ساتھ انصاف کا سلوک کر سکیں گے کیوں کہ فطرت بدل
جانے کی توقع نہیں ہو سکتی۔"

ہندوستان کے ممتاز اخبار اسٹیٹسمین نے بھی ۲۱ مارچ کی اشاعت میں ایک مفصل
تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:-

یہ ایک انقلابی تجویز ہے لیکن وہ لوگ جو اس کی مخالفت کرنا چاہیں ان کو مخالفت
سے پہلے اس کا بغور مطالعہ کر لینا ضروری ہے انھیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مسلم لیگ نے پوری
سنجیدگی سے اس کو پیش کیا ہے اور اس لئے اس کو محض خواب و خیال کہہ کر نظر انداز نہیں
کیا جا سکتا۔ ہندوؤں کو خواہ یہ بات اچھی ہو یا بری تسلیم کرنا پڑے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ
ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان اپنے جداگانہ کلچر کا زبردست احساس رکھتے ہیں وہ
اپنے آپ کو زیادہ طاقتور سمجھتے ہیں اور تشدد کو بطور پالیسی اختیار کرنا نہ برا سمجھتے ہیں اور
نہ اس سے کنارہ کش ہوئے ہیں اس لئے مسلمانوں سے یہ توقع نہ رکھنا چاہئے کہ وہ دوسرے
فرقہ کے ۲۵ کروڑ افراد کے کہنے سے اکثریت کی حکومت تسلیم کریں گے وہ ہرگز کسی ایسی
حکومت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں گے جو ہاتھوں کے گننے پر قائم ہو اور جس میں ہاتھوں
کی بے شمار اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہو۔

یہ ایک مشکل مسئلہ ہے جس کا حل ہندوؤں کو تلاش کرنا ہے اگر وہ یہ نہیں چاہتے اور وہ
یقیناً نہ چاہیں گے کہ ہندوستان کی خود مختار حکومت ہمیشہ کے لئے برطانوی فوج کی سنگینوں

کی امداد پر قائم رہے اور اگر وہ عدم تشدد کو اپنا ناقابل ترمیم مسلک سمجھتے ہیں تو پھر انھیں
مسلمانوں کو مطمئن کرنا ہی پڑے گا۔ عدم تشدد سے انسان کا دل اس وقت موم ہو سکتا ہے
جب حریف طاقت دینا قبول کرے کانگریس کو یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اس نے
جن طریقوں کو انگریزی حکومت کے خلاف استعمال کر کے کامیابی حاصل کی ہے وہ مسلمانوں
کے مقابلے میں کارگر نہیں ہو سکتے انگریزوں کے مقابلے میں تو یہ ممکن تھا کہ زبان سے
عدم تشدد کا اظہار کرنے پر بھی خوب جی کھول کر انگریزوں کے خلاف زہر اُگلا جائے لیکن
مسلمانوں کے مسئلہ میں زبانی عدم تشدد کا دعوی کرنا اور قول و عمل کے اعتبار سے ان کو اچھا
نہ سمجھنا اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا پھر یہ صحیح ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کی ایک خاص تعداد
شامل ہے جو کانگریسی ہائی کمانڈ کو غیر متعصب سمجھتی ہے لیکن اس کے باوجود اس حقیقت کو
جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت ہندوؤں کی عظیم اکثریت پر اقتصادی اور
مذہبی مسائل میں بھروسہ نہیں کرتی حتی کہ کانگریس کا وہ طبقہ جو اپنے کو "بایاں بازو" کہتا
ہے جو مارکس کے فلسفہ کا مبلغ ہے اور جو سوسائٹی میں مکمل انقلاب دیکھنے کا آرزومند ہے
وہ بھی صاف طور سے ہندو راج کا دلدادہ نظر آتا ہے ابھی حال میں کانگریس کے اس طبقہ
کی طرف سے مہاسبھا کے صدر مسٹر ساورکر کا جو شاندار استقبال بنگال میں کیا گیا نیز اس طبقہ
کے اخباروں نے جن سُرخیوں کے ساتھ صدر موصوف کی تقریروں اور بیانوں کو شائع
کیا اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے۔

یہ مشورہ ایک ایسا مشورہ ہے جو مایوسی کی موجودہ حالت میں پیش کیا گیا ہے اور اسلئے
ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس تجویز میں ایماندارانہ طور پر موجودہ ناگفتہ بہ ہندو مسلم تنازعہ کا
ایک قابل عمل حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تجویز کے پیش کرنے والوں کے نزدیک
صرف یہی ایک قابل عمل حل ہے ہم انگریز ہندوستان میں ایک ایسی قوم پیدا کرنے کی توقع
رکھتے تھے جیسی انگلستان اور فرانس میں بستی ہے اور متحدہ قومیت کے اسی مقصد کو طاقت
دینے کے لئے جو کچھ ہم سے ہو سکا ہم نے کیا لیکن اس اسکیم میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان
اتحاد تو قائم رہے لیکن فرانس اور انگلستان کی طرح نہیں بلکہ کناڈا کے فرانسیسی اور انگریزوں

کی طرح یا جنوبی افریقہ کے ڈچ اور انگریزوں کی طرح یا نیوزی لینڈ کے موریوں اور انگریزوں کی طرح یعنی پہلے دو قومیں اپنے اپنے حلقوں میں خود مختار بنائی جائیں اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور اس لئے یہ تجویز ایک تعمیری تجویز ہے تخریبی نہیں اور اس کا مقصد ہندوستان میں امن قائم کرنا ہے۔"

با ایں ہمہ کہ یہ صاف و سادہ اور آسان مسئلہ تھا لیکن کانگریس اور ہندوؤں کی مجنونانہ مخالفت ہر روز ترقی پر رہی اور اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا کہ یہ صرف ایک قلیل جماعت کی رائے ہے عامۃً مسلمان متفق نہیں گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن میں مخالفانہ مضامین کا تانتا باندھ دیا اور دیگر کانگریسی لیڈروں نے پبلک مجامع میں اشتعال انگیزی تک سے باک نہیں کیا۔ ان حالات میں مسٹر جناح نے ہدایت کی کہ ۱۹ اپریل کو ہر جگہ مسلمانانِ ہند لاہور والے رزولیوشن کی تائید کریں اور ۱۱ اپریل کو ایک مختصر بیان دیا جس میں اُنھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ کہا کہ:-

"کوئی ایماندار مسلمان نہ ان (گاندھی) کا ہم عقیدہ ہو سکتا ہے اور نہ ہندوستانی کلچر کے اس تصور کو قبول کر سکتا ہے جو مسٹر گاندھی کے ذہن میں ہے مسٹر گاندھی اپنا کام پرارتھنا اور بھگوت گیتا کی تلاوت سے شروع کرتے ہیں۔ اہنسا، ستیہ، اہمسہ، چرخہ، کھدر، بندے ماترم، سنسکرت الفاظ سے لبریز ہندی ودیا مندر اور واردھا اسکیم کے مسٹر گاندھی معتقد ہیں کوئی ایماندار مسلمان اس قسم کے عقاید اور کلچر کا قائل اور پیرو نہیں ہو سکتا۔ رام گڑھ قدیم ہندویت کے اس تصور کا مرقع تھا جو مسٹر گاندھی کے ذہن میں ہے وہاں سوائے ایک صدر اور چار ہونے والے ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے اور کیا چیز ایسی تھی جسے اسلامی یا مسلم کہا جا سکے۔"

مسٹر سی راج گوپال آچاریہ نے اپنی سیلم کی تقریر میں کہا کہ:-

"ہندوستان کی تقسیم سے متعلق مسٹر جناح کا اقدام اس قسم کا ہے جیسے دو بھائیوں میں ایک گائے کی ملکیت پر جھگڑا ہو اور وہ اس اپنی گائے کو دو ٹکڑوں

میں کاٹ کر باہم بانٹ لیں۔"

مجھے واقعی یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس مرتبہ کا آدمی جیسے کہ وہ ہیں۔ ہندو عوام کے سامنے میرے متعلق محض اس وجہ سے کہ میں نے شمالی و مغربی اور مشرقی علاقوں میں آزاد حکومت متین قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہے یہ کہے کہ میں گائے کو کاٹ کر دو ٹکڑے کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد ۱۹ اپریل کو تمام عرض و طول ہند میں اس رزولیوشن کی زبردست جوش و خروش سے تائید کی گئی اور دنیا کو معلوم ہو گیا کہ یہ رزولیوشن تمام مسلمانانِ ہند کی صحیح اور پختہ و قطعی رائے ہے اور وہ اس پر مستحکم طور سے قائم رہیں گے۔

حکومت کی طرف سے اس تجویز پر صاف طور سے اگرچہ کوئی اظہار رائے نہیں کیا گیا۔ اور نہ موجودہ زمانہ میں اس کے لئے بمقتضائے مصالح ممکن ہی تھا تاہم لارڈ زٹلینڈ وزیر ہند ۱۸ اپریل کو دارالعوام کے سامنے اس تجویز پر بھی حقیقتوں کی روشنی میں لب کشائی پر مجبور ہوئے انھوں نے دستورِ ہند کے ترمیمی بل کو پیش کرتے ہوئے جو بیان دیا اس کے ضمن میں کہا کہ :۔

میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اگرچہ میں ان وجوہ کو مانتا ہوں جن پر یہ تجویز مبنی ہے مگر میں اس کو مایوسی کا مشورہ سمجھتا ہوں کیوں کہ اس کے قبول کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں نے عرصہ دراز تک یکساں طور پر ہندوستانیوں کے مسلمہ اختلافات کے باوجود اس نظر سے ایک سیاسی اتحاد پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہے کہ ہندوستان برطانوی دولتِ مشترکہ میں ایک جزو لاینفک کے طور پر مرتبہ حاصل کرے وہ ناکام رہی اور اس ناکامی کا ہم نے اعتراف کر لیا...... لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستان کا آیندہ دستور ہندوستان کے باشندوں کے خلاف اس ملک کی پارلیمنٹ اور گورنمنٹ کے حکم سے بنے گا یقیناً ملک معظم کی حکومت کی طرف سے اس وعدہ کی کہ ہندوستان کی تمام پارٹیوں اور مفاد کے مشورہ سے پورے آئینی مسئلہ کی جانچ پڑتال

کی جائے یعنی حکم نہیں اگفت وشنید ہے[۵۰۳]......... میں یقین نہیں کر سکتا کہ اس ملک کی کوئی گورنمنٹ یا پارلیمنٹ کوشش کرے گی کہ ملک معظم کی نو کرور مسلم رعایا پر کوئی ایسا دستور مسلط کرے گی جس کے ماتحت وہ امن و اطمینان کے ساتھ نہ رہ سکے...... جہاں تک میرے اختیار میں ہے میں ان دو عظیم فرقوں ہندو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کروں گا جو بہر حال مذہب اور کلچر اور زندگی کے پورے تصور کے متعلق اختلافات کے باوجود تقریباً ایک ہزار سال سے ایک جگہ رہتے ہیں، مگر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان پر اثر ڈالنے کیلئے میرا اختیار کس قدر محدود ہے کیوں کہ اس معاملہ میں حقیقت یہ ہے کہ کانگریس پارٹی نے مسلمانوں کے دلوں میں ایسے اندیشے پیدا کر دئے ہیں کہ انھیں وہی دور کر سکتی ہے۔"

لارڈ زٹلینڈ کا یہ عاجلانہ بیان[۵] ہے جس میں انھوں نے اس تحریک تقسیم اور منطقوں کے قائم کئے جانے کی تجویز کو مایوسانہ مشورہ سے تعبیر کیا ہے مگر بہت جلد انھیں زبانوں سے یہ عاقلانہ مشورہ کہا جائے گا کیوں کہ ہندوستان کا روشن مستقبل صرف اسی تجویز پر منحصر ہے۔

اسی مہینہ اور انھیں تاریخوں میں بمقام رام گڑھ (بہار) کانگریس کا سالانہ اجلاس بھی منعقد ہوا جس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔

مولانا قوم اور ملک میں ۱۹۱۳ء سے روشناس ہوئے جب کہ انھوں نے کلکتہ سے مشہور اخبار الہلال جاری کیا۔ یہ زمانہ مسلمانوں کی داخلی و خارجی بے چینی کا تھا جو روز بروز بڑھتا گیا اور مسئلہ خلافت سامنے آیا۔ اس دوران میں کانگریس اور مسلم لیگ کا اشتراک ہو گیا مگر مولانا اس اتحاد کے مؤید نہ تھے چنانچہ انھوں نے ۱۹۲۱ء میں لکھا کہ:۔

" اسلام اس سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے کہ اس کے پیرووں کو اپنی

---

[۵]۔ اس کے بعد مسٹر ایمرے وزیر ہند نے نومبر کی ایک تقریر میں دیگر امکانات کے ساتھ اس اسکیم کے امکان کو بھی تسلیم کیا۔

پولیٹکل پالیسی قائم کرنے کے لئے ہندوؤں[4] کی پیروی کرنی پڑے مسلمانوں کیلئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولٹکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں .... ہم تو خود اسے مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ انھوں نے اپنے سامنے دو راستے ہی دیکھے یا گورنمنٹ پر اعتماد اور یا ہندوؤں اور کانگریس کی شرکت .... نہ تو گورنمنٹ پر بے جا اعتماد کیجئے اور نہ ہندوؤں کے حلقہ درس میں شریک ہو جیئے"

مگر خلافت کا قصہ ختم ہونے کے بعد مولانا کے نہ صرف سیاسی عقائد میں بلکہ مذہبی عقائد میں بھی تغیر شروع ہوا جس کی مظہر تمام ان کی وہ تفسیر ہے جو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں شائع کی۔ مثالاً :-

قرآن کا جب ظہور ہوا تو دنیا کا یہ حال تھا کہ تمام مذاہب، مذہب کو صرف اس کے ظواہر و رسوم میں ہی دیکھتے تھے اور مذہبی اعتقاد کا جوش و خروش اس طرح کی باتوں میں سمٹ آیا تھا ہر گروہ یقین کرتا تھا کہ دوسرا گروہ نجات سے محروم ہے کیوں کہ وہ دیکھتا تھا کہ دوسرے کے اعمال و رسوم ویسے نہیں ہیں جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں لیکن۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ اعمال و رسوم نہ تو دین کی اصل وحقیقت ہیں نہ انکا اختلاف حق و باطل کا اختلاف ہے یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے لیکن روح وحقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہ ہی اصل دین ہے۔

اصل دین کیا ہے؟

ایک[5] خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی یہ کسی ایک گروہی کی میراث

---

[5] تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو "دارد ھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان" شائع کردہ دائرہ طلوع اسلام دہلی۔

نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نازل جائے، یہ تمام مذاہب میں
یکساں طور پر موجود ہے۔

اس تفسیر نے ان کو گاندھی جی کا خاص منظور نظر بنا دیا کیوں کہ ان کی بہت سی مفید مطلب باتیں ایک عالم کی تفسیر میں موجود تھیں انھوں نے اس کی اتنی قدر کی کہ کئی ہزار کی تعداد میں اس کا ہندی ترجمہ شائع کرایا۔

مولانا کے لئے کانگریس میں ایک حیثیت خاص اختیار کرنے کے لئے اب زبردست موقع پیدا ہو گیا اور ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے بعد ان کے لئے بہت بڑی جگہ نکل آئی ان کا پہلا اور بڑا فرض یہ تھا کہ وہ کانگریسی صوبوں کے مظالم کی تردید کرتے رہیں۔

تفسیر کا مطالعہ کرنے والے تو بہت ہی خاص لوگ تھے اس لئے اس کے مضامین کی شہرت صرف علماء کے طبقہ تک محدود رہی لیکن اخباری بیانات عام نظروں سے گزرتے رہے اور ۱۹۳۷ء سے عامتہً مسلمانوں میں ان کی طرف سے حقارت کے جذبات پیدا ہو گئے۔

مولانا چند سال سے کلکتہ میدان میں عید کی امامت کیا کرتے تھے جو درحقیقت ایک بہت بڑی عزت تھی مگر ۱۹۳۸ء میں مسلمانوں نے ان کے اقتداء سے انکار کیا اور ان کے خلاف زبردست مظاہرہ کر کے ان کو امامت سے معزول کیا گیا۔

۱۹۳۷ء سے سیاسیات کا تموج برابر بڑھ رہا تھا کانگریس بے نقاب ہو چکی تھی اور متحدہ قومیت کا ادعا باطل ہو رہا تھا۔

دارالعوام اور دارالامرا میں وزراء نے اپنی تقریروں میں کانگریس کو ایک ہندو جماعت اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کی جماعت تسلیم کر لیا تھا مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کا احساس الفاظ سے بھی ظاہر ہونے لگا تھا۔

اب کانگریس کے ہائی کمانڈ نے وزراء کے بیانات کے رد عمل اور اپنے ادارہ کی متحدہ قومیت کی خصوصیات دکھانے اور دنیا کو فریب میں مبتلا کرنے کے لئے ایک مسلمان کو صدر بنانا ضروری تصور کیا صوبوں میں احکام جاری کئے گئے اور انتخاب ہو گیا۔

اس سال سے پہلے کئی مرتبہ صدارت کے لئے اِن کا اور خان عبد الغفار خاں کا نام پیش ہوا تھا لیکن دونوں نے ازراہِ انکسار نہیں بلکہ مقابلہ میں شکست کے خوف سے انکار کر دیا تھا مگر اس مرتبہ خود گاندھی جی نے مولانا آزاد کا نام پیش کیا اب اختلاف کا کوئی اندیشہ نہ تھا تاہم کانگریس کے بائیں بازو (لیفٹ ونگ) نے مسٹر ایم این رائے کا نام پیش ہی کر دیا اور یہ بھی ایک اصُول کی خاطر تھا کہ "دنیا پر اس بات کو ظاہر کر دیا جائے کہ کانگریس میں ایک ایسا گروہ موجود ہے جو گاندھی جی کی پالیسی اور خیال کا مخالف ہے اور ہندوستانی سیاسیات میں دوسرا نظریہ رکھتا ہے"

چنانچہ صدر منتخب ہونے کے بعد ہی مولانا بھی کانگریسی مقاصد کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوئے اور انھوں نے انتخاب کے بعد ہی جو بیان دیا اس میں واضح کیا کہ:۔

"سیاسی مسئلہ کا تصفیہ فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیہ کا محتاج نہیں جو بہرحال خانگی جھگڑے ہیں مسلمانوں کو اس کا پورا حق ہے کہ اپنے تحفظات پر اصرار کریں انھیں اس کے لئے برطانیہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ ہم وطنوں کی طرف دیکھنا چاہیئے مسٹر جناح کا یہ نظریہ کہ ہندو اور مسلمان دو جُدا قومیں ہیں غلط فہمی پر مبنی ہے"

یہ بیان خود اس امر کا اعلان تھا کہ ان کے انتخاب کا جو مدعا عام طور پر سمجھا گیا اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا۔

علاوہ ازیں مولانا نے ازراہِ تفاخُر ارشاد کیا کہ:۔

"میری کامیابی مسٹر گاندھی کی لیڈری پر اعتماد اور ان کے پروگرام کی منظوری کی علامت ہے"

غرض سالانہ اجلاس نہایت شان سے منعقد ہوا لیکن قدرت نے طوفانی بارش سے اس پر پانی پھیر دیا اور تمام کارروائی ضابطہ کی خانہ پُری کے طور پر عمل میں آئی۔ مولانا ابوالکلام نے اس موقع پر کانگریس کا سہ رنگا جھنڈا لہرایا اور حسب معمول ایک مختصر تقریر کی جس میں کہا کہ:۔

"یہ جھنڈا متحدہ ہندوستان کا نشان ہے یہ کسی خاص طبقہ یا پارٹی کی نمایندگی نہیں کرتا یہ آزادی کے لئے ہندوستان کی قومی تحریک کا مظہر ہے۔"

پھر اس کے بعد "بندے ماترم" کے گیت کے ساتھ جھنڈے کی سلامی دی گئی۔

یہ بات تو صاف ہو چکی ہے کہ بندے ماترم کا گیت قطعی مشرکانہ ہے جس میں دیویوں سے امداد و استعانت کی جاتی ہے اور عامۃً مسلمان اس سے متنفر ہیں اس تنفر کی بنا پر ایک ممبر مسٹر مبارک ساغر نے مجلس مضامین میں تحریک کی کہ ہندوستانی زبان میں ایک ایسا قومی گیت تیار کیا جائے جس سے ہر عقیدہ کے لوگ متفق ہوں لیکن جناب مولانا نے فرمایا کہ:۔

"تین سال ہوئے کہ ایک سب کمیٹی نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا ہے قومی گیت کبھی کوئی کمیٹی نہیں بناتی اور بندے ماترم کا گیت برابر چالیس برس سے گایا جا رہا ہے اور وہ ہماری زبان کا قومی جزو بن گیا ہے اور اس طرح اس نے قومی گیت کی جگہ حاصل کر لی ہے۔"

مجلس استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد تھے انھوں نے اس موقع پر جو ایڈریس پیش کیا وہ بہار کی دو ہزار سال سے زائد کی ہندوانہ تاریخ کا ایک ادبی شاہکار تھا۔ صوبہ بہار کی خصوصیات میں ہندوؤں کے قدیم مذاہب بدھ مت اور جین مت کے ظہور و عروج اور وسعت و ہمہ گیری اور بہار کی سلطنتوں کا ایک مؤرخانہ تذکرہ کر کے کہا کہ:۔

"صوبہ کی سرزمین کے وسیع حصہ کا ایک ایک ذرہ گوتم بدھ اور جین مہاویر کے قدموں کی برکت سے مقدس ہے۔

ٹھیک اسی زمانے میں جب کہ یونان میں ریپبلک حکومتیں برسر پیکار تھیں اس سے پہلے ہی اس صوبہ میں ریپبلک حکومتیں سرسبز و شاداب تھیں۔"

اشوک کی سلطنت کی عظمت کے بیان میں کہا کہ:۔

"اِن سلطنتوں کی برابر وسیع سلطنتیں ہندوستان کے کسی دوسرے حصہ میں قائم نہیں ہوئیں ان سلطنتوں نے سلطنت مغلیہ اور آج کل کی برطانوی ہند

کی سلطنت سے زیادہ وسیع حصوں پر راج کیا۔ تاہم طول و عرض کسی سلطنت
کی بڑائی کے لئے امتیاز نہیں ہے بھارت نے انسان کی ترقی کے لئے ٹھوس
کام بھی کیا آپ نے کتابوں میں رشیوں کی کہانیاں پڑھی ہوں گی اور
ان مقامات کا نام بھی پڑھا ہوگا جہاں وہ تپسیا کیا کرتے تھے۔"

غرض تمام ایڈریس میں اسی قسم کی سلطنت اور انسانی ترقی کے ٹھوس کاموں
نہ گاندھی جی کی کورانہ پیروی کا فخریہ بیان تھا ایک موقع پر انھوں نے کہا کہ:۔

"ایک دفعہ مہاتما بدھ نے اپنے بھگتوں کو داجیوں کی اسمبلی دکھائی تھی
اور یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ دیوتاؤں کی اسمبلی ہے کیا ہمارے لئے یہ ممکن
نہیں ہے کہ ہم بھی اسی طرح سنگھٹ ہوں اور اپنی راشٹریہ سنستھا کو
اسی طرح چلائیں کہ مہاتما گاندھی ہمارے تشدد اور بدنظمی کی شکایت کرنے
کے بجائے اپنے آشرم کی لڑکیوں سے اسی قسم کے الفاظ کہیں جو مہاتما بدھ
نے اپنے بھکشوں سے کہے تھے۔"

کون شخص کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کا ایڈریس کسی ایسی اسمبلی کا ہو سکتا ہے جس میں متعدد
مختلف مذاہب کے پیرو شامل کئے جاتے ہوں یہ خالص ہندو اسمبلی کا ہی ایڈریس ہے
کون اس حقیقت میں شبہ کر سکتا ہے کہ کانگریس ایک خالص ہندو جماعت نہیں ہے۔

کیا ان تاریخی فخریات، مذہبی تصورات، برہمنی جذبات اور اس دیوتاؤں کی اسمبلی کو بجز
اونچی ذات والے ہندوؤں کے کسی اور قوم اور فرقہ سے بھی کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا صدارتی ایڈریس کافی طویل تھا عام سیاسی اعتبار سے اس
لب لباب یہ تھا کہ:۔

"ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ برطانی حکومت بہت زیادہ اس کی خواہشمند
ہے کہ ہندوستان جہاں تک جلد ممکن ہو نوآبادیات کا درجہ حاصل کرے
ہمیں معلوم تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی ہے اب ہمیں
یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ وہ اس کی بہت زیادہ خواہش مند ہے مگر سوال

برطانوی حکومت کی خواہش اور اس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے صاف اور سادہ سوال ہندوستان کے حق کا ہے ہندوستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے اسی سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہے ہندوستان کے لئے یہ سوال بنیاد کی اصلی اینٹ ہے وہ اسے ہلنے نہیں دے گا اگر یہ ہل جائے تو اس کی قومی ہستی کی عمارت ہل جائے گی۔..........

جہانتک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے ہمارے لئے صورت حال بالکل واضح ہو گئی ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں جس طرح ہم نے پہلی لڑائی میں دیکھا تھا ہم تیار نہیں کہ اس چہرہ کی فتح کے لئے لڑائی میں حصہ لیں ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لئے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتحمند نہیں دیکھنا چاہتے ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مقابل سمت جا رہی ہے"

یہ دعاوی اور یہ خیالات تو وہ ہیں کہ جن کو جو کوئی بھی صدر ہوتا بیان کرتا اور زیادہ پُرزور الفاظ میں بھی بیان کئے جا سکتے لیکن مولانا آزاد کی صدارت سے جو مقصود تھا وہ اس ایڈریس میں جانِ سخن ہے اور اسی کا حصہ غالب ہے۔ وہ مقصد مسائل اقلیت اور فرقہ وارانہ حقوق و تحفظات کے ساتھ متحدہ قومیت کا اثبات تھا جو نہایت پُرشکوہ الفاظ اور منطقی دلائل کے ساتھ حقائق پر نقاب ڈال کر بیان کیا گیا۔

انھوں نے مسلمانوں کی روایات، تاریخ، معاشرت، لٹریچر، برادرانہ مساوات اور زندگی کے مجموعی تصوّر کو ہندوؤں سے جُدا تسلیم کرنے کے بعد کہا کہ:-

لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا اسلام کی رُوح مجھے اِس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے میں فخر کے ساتھ محسوس

کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں میں[۵۱] ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل ہوں میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا"۔

مولانا کی یہ ایک نرالی منطق ہے جس میں وہ اُلجھ کر رہ گئے اور اپنے زورِ بیان میں خود ہی گر گئے۔

مولانا ابو الکلام مسلم قوم کا ایک جزو ہونے کے ساتھ اسی طرح ہندوستانی ہیں جس طرح کہ انگریز، جرمن، فرنچ، ہسپانوی، اطالوی علیحدہ علیحدہ قومیں ہونے کے ساتھ ساتھ یورپین بھی ہیں اور اس دعوے میں ان کے درمیان پورا پورا اتحاد و اشتراک ہے اور اپنی اس حیثیت کا ان کو اس سے کہیں زیادہ طاقتور احساس ہے جتنا کہ مولانا کو اپنی وطنی حیثیت کا۔ یقیناً مسلم لیگ والے بھی اس کے قائل ہیں کہ مسلمان ہندوستانیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہیں جس کے بغیر ہندوستانیت کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے مسلمان اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہیں وہ اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتے اور اسی دعوے کی بنا پر مسلم لیگ نے مسلمانوں کی واحد نمایندہ اور مختار انجمن کی حیثیت سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ بغیر مسلمانوں کی منظوری اور رضامندی کے ہندوستان کے مستقبل کے متعلق نہ کوئی اعلان کیا جائے اور نہ کوئی دستور مرتب کیا جائے۔ ہندوستان کے اُن علاقوں کو الگ کر دیا جائے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ان کو الگ جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہے ان آزاد حکومتوں کے دونوں مجموعوں کی الگ الگ فیڈریشنیں ہوں تاکہ اسلامی روایات، تعلیم، تاریخ، علوم، فنون، تہذیب، مذہب اور کلچر میں کسی خارجی مداخلت کا امکان نہ رہے اس عدم مداخلت کی سب سے

---

۵۱ تبصرہ اخبار منشور دہلی ۲۱ اپریل ۱۹۴۰ء

بڑی ضمانت اختیار حکومت ہے اور سب سے بڑی نہیں بلکہ یہی ایک ضمانت ہے"

کانگریس کے اجلاس میں جو طولانی رزولیوشن منظور ہوا اس کا مفاد یہ تھا کہ "برطانوی حکومت کے اعلان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر سامراجی مقاصد کے لئے جنگ کر رہی ہے اور اپنی سلطنت کو محفوظ و مضبوط کرنا چاہتی ہے اور اس کا دار مدار ہندوستانی باشندوں کی لوٹ کھسوٹ پر ہے لہذا کانگریس بہ سختی اس کی مخالفت کرتی ہے کہ ہندوستان کی فوجیں برطانیہ عظمیٰ کے لئے لڑیں اور جنگ کے لئے ہندوستان سے آدمی اور مال لیا جائے، ہندوستان میں رضامندی کے ساتھ نہ تو بھرتی کی جا سکتی ہے اور نہ ہی روپیہ جمع کیا جا سکتا ہے کانگریسی اور کانگریس کے زیر اثر لوگ جنگ جاری رکھنے میں آدمیوں روپیہ یا مال سے امداد نہیں کر سکتے۔

ہندوستانی مکمل آزادی سے کم کوئی چیز قبول نہیں کر سکتے ہندوستان کے باشندے عام رائے دہندگی کے اصول پر منتخب کی ہوئی کانسٹیٹیونٹ اسمبلی کے ذریعہ خود ہی اپنا دستور حکومت مرتب کر سکتے ہیں اور دنیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ اپنے تعلقات طے کر سکتے ہیں"

پھر کانسٹیٹیونٹ اسمبلی کو ہی فرقہ وارانہ اتحاد کا ذریعہ قرار دے کر بیان کیا گیا کہ:-

"آزادی، جمہوریت اور قومی اتحاد پر ہندوستان کے آئین کی بنیاد رکھی جانی چاہیئے ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور ہندوستانی قوم کو الگ الگ کرنے کی تمام کوششوں سے کانگریس اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتی ہے"

رزولیوشن میں دوسرا قدم سول نافرمانی قرار دیا گیا لیکن وہ ڈسپلن کے اطمینان کے ساتھ مشروط رکھا گیا۔

اس سال مسئلہ تقسیم ہند کی مخالفت کے لئے کانگریس پلیٹ فارم کے علاوہ ایک جدید پلیٹ فارم ہندو لیگ کے نام سے قائم کیا گیا سکھوں نے بھی جا بجا مخالفانہ جلسے کئے، اس مخالفت میں جمیعت العلماء اور آزاد مسلم کانفرنس نے بھی حصہ لیا

اور یہ آخر الذکر ادارہ نئے نام سے اسی مقصد کے لئے قائم ہوا، لیکن یہ تحریک عام مسلمانوں اور اقلیت کے صوبوں میں برابر ترقی کر رہی اور مقبول ہو رہی ہے، لیگ کے بھی ایک وفد نے جابجا دورے کر کے مسلمانوں کو اس کی اہمیت سمجھادی۔ اس قلیل عرصہ میں نہ صرف مضامین بلکہ متعدد کتابیں اس کی مخالفت اور تائید میں شائع ہوئیں اور اب یہ مسئلہ مسلمانوں کا سیاسی مطمح نظر بن گیا۔

بایں ہمہ اس جدید ادارہ کے صدر نے اپنی تقریر میں جہاں اُردو ہندی جھگڑے پر اظہار خیال کیا اور مسلم لیگ پر بوچھار کی وہاں ان کو یہ کہنا بھی پڑا کہ:۔

مگر جب ۱۹۳۷ء میں کانگریس نے ملک کے کئی صوبوں کی حکومت کا چارج لیا تو بعض ہندو وزراء کی انتہا پسندی اور کوتاہ بینی اور ناعاقبت اندیشی کے سبب ہندوستانی مسلمانوں کو اس باب میں ان سے سخت شکایتیں پیدا ہو گئیں پھر جس بنیادی غلط اندیشی کے زیر اثر اس قضیہ نے یہ صورت اختیار کی وہ زندگی کے دوسرے مظاہر پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی، مسلمانوں نے حسرت و افسوس کے ساتھ دیکھا کہ ہندو دوستوں نے ایک زبان ہی کو نہیں ہر اس چیز کو اپنے معاشرے سے ابدی دیس نکالا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس میں ہندو مسلم اخلاص و پیار کے زمانہ کی مُہریں لگی ہوئی ہیں انہوں نے اضطراب اور بیقراری کے ساتھ دیکھا کہ جدید ہندوستان کی تعمیر جن جن خطوط پر کی جانے کی سعی لاحاصل ہو رہی ہے ان میں کوئی خط ان کو ایسا نظر نہیں آتا جس کو وہ اپنا کہہ سکیں، اس صورتِ حال نے بالکل فطری طور پر ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے مستقبل کی طرف سے اندیشہ ناک بنا دیا اور یہ سوچنے لگے کہ کل کے بھارت ورش میں ان کی حیثیت کیا ہو گی وہ اس جدید ہندوستان میں اپنی روایات، اپنا سرمایۂ ادب، اپنا کلچر، اور اپنی اجتماعی اور ملی خصائص کیونکر محفوظ رکھ سکیں گے۔

باب ہفتدہم

گزشتہ فروری ۱۹۴۰ء کی مراسلت کے بعد مسٹر جناح اور وائسرائے کی پھر ملاقات ہوئی اور چوں کہ مسٹر جناح کا خط جس میں ورکنگ کمیٹی کے نکات کی تشریح کی گئی تھی نہایت اہم تھا اس لئے ملک معظم کی حکومت سے مشورہ کے بعد ۱۹ اپریل کو وائسرائے نے جواب دیا جس میں مسلم ممالک کے خلاف ہندوستانی فوجوں کے استعمال کے متعلق مستقبل کی ضمانت کو ناممکن بتاتے ہوئے موجودہ صورتِ حال میں حکومتِ برطانیہ اور تمام مسلم طاقتوں کے درمیان ہمدردانہ تعلقات اور معاہدات اتحاد کی طرف توجہ دلائی اور یہ اطمینان بھی دلایا کہ جب کبھی ایسا موقع آئے گا تو آپ کی تجویز نظر انداز نہ کی جائے گی۔

وائسرائے نے آیندہ ترتیب آئین کے متعلق وزیر ہند کی اُس تقریر پر جو اُنھوں نے ۱۸ اپریل کو ہاؤس آف لارڈز میں کی تھی اور اس کے ان خاص فقرات پر جو آئین کے متعلق تھے متوجہ کیا۔

لیکن ۱۷ جون کی ورکنگ کمیٹی نے وائسرائے کے جواب کو غیر تسلی بخش قرار دیا۔ نیز مسلم لیگ کے ممبروں کو وار کمیٹیوں میں جو حکومت نے ہر ایک صوبہ میں قائم کی تھیں شامل ہونے کی ممانعت کی، اور اس رزولیوشن کی نقل مسٹر جناح نے اپنے خط کے ساتھ وائسرائے کے پاس بھیجدی۔

۲۷ جون کو پھر ملاقات کے بعد مسٹر جناح نے ان نکات کو جو اس ملاقات میں پیش کئے تھے اپنے خط مورخہ یکم جولائی کے ذریعہ سے بطور ایک میمورنڈم کے ارسال کر دئے جو حسب ذیل تھے۔

ملک معظم کی حکومت کی طرف سے ایسا کوئی اعلان یا بیان جاری نہ کیا جائے جو ہندوستان کی تقسیم اور شمال مغرب اور مشرق میں مسلم ریاستوں کے قیام کے متعلق مسلم لیگ کے لاہور کے رزولیوشن پر کسی طرح اثر انداز ہو کیونکہ یہ مسئلہ مطمح نظر بن چکا ہے۔

ہز میجسٹی کی گورنمنٹ قطعی اور واضح طور پر مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلائے کہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستان کے لئے کسی بھی ایسے عارضی یا مستقل آئین کی اسکیم تیار نہیں کی جائے گی جسے مسلمانوں کی منظوری حاصل نہ ہو۔

جنگ میں مسلمانوں کا سرگرم تعاون حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ برٹش گورنمنٹ مرکز اور صوبوں کی حکومتوں میں مسلم لیڈروں کا برابر کے حصہ دار کے طور پر اعتماد حاصل کرے اور اس سلسلہ میں عارضی طور پر اور صرف جنگ کے دوران تک ذیل کے اقدامات کئے جائیں۔

۱۔ موجودہ آئین کی حدود میں رہتے ہوئے وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل میں توسیع کی جائے ایڈیشنل ممبروں کے متعلق مزید بحث میں فیصلہ کیا جائے لیکن یہ یاد رہے کہ اگر کانگریس ایگزیکٹیو کونسل میں آنا منظور کرے تو مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر نمائندگی دی جائے ورنہ اکثریت، کیوں کہ جیسا کہ ظاہر ہے مسلمانوں کو ہی زیادہ بوجھ اور ذمہ داری برداشت کرنا پڑے گی۔

۲۔ جن صوبوں میں آئین معطل ہے ان میں غیر سرکاری مشیر مقرر کئے جائیں ان کی تعداد کا فیصلہ بھی مزید بحث کے بعد کیا جائے لیکن ان کی اکثریت مسلمان نمائندوں کی ہو جن صوبوں میں پارٹیوں کے اشتراک سے آئین پر عمل ہو سکتا ہے قدرتی طور پر ان میں متعلقہ پارٹیاں ہی صوبائی امور کا فیصلہ کریں گی۔

۳۔ ایک جنگی کونسل بنائی جائے معہ صدر کم از کم پندرہ ممبر ہوں اس کی صدارت وائسرائے کریں میں اس کونسل کا نام جنگی مشاورتی بورڈ پسند نہیں کرتا اس کونسل کی باقاعدہ میٹنگیں ہوں اور وقتاً فوقتاً جو صورتِ حالات پیدا ہو وہ اس پر بحث کرے اور متعلقہ جنگ امور کے متعلق عموماً ڈیفنس اور مالیات کے متعلق خصوصاً گورنمنٹ کو مشورہ دے اس کونسل میں والیان ریاست کی بھی نمائندگی حاصل کرنا مشکل نہ ہوگا اور اس کونسل میں بھی مسلمانوں کو شرکت کانگریس کی صورت میں برابر کی نمائندگی دی جائے یا بصورتِ دیگر اکثریت ہو، نیز یہ کہ ایگزیکٹیو کونسل، جنگی کونسل اور غیر سرکاری مشیروں کے

طور پر بھی جو مسلمان نمایندے سلئے جائیں ان کا انتخاب مسلم لیگ ہی کرے"۔
وائسرائے نے ۱؍ جولائی کو اس میمورینڈم کے جواب میں اطمینان دلایا کہ اگزکٹو کونسل میں اگر توسیع کی گئی تو مسلم مفاد کے لئے نمایندگی کا تسلی بخش انتظام ہوگا اور یہ کہ اگزکٹو کونسل کے کسی خاص حصہ پر کم یا زیادہ ذمہ داری کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ تمام تر ذمہ داری تو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل پر عائد ہوگی اور موجودہ قانون و روایتی طریقہ کار کے لحاظ سے چند نام ملک معظم کی خدمت میں پیش اور منتخب کرکے گورنر جنرل کے مشورہ سے وزیر ہند ان کا اعلان کریں گے وہ کسی پولیٹکل پارٹی کے نامزد نہیں ہو سکتے، اگرچہ وزیر ہند اور گورنر جنرل انتہائی کوشش کریں گے کہ کسی ایک فرقہ کے مختلف طبقات کے اشخاص کا انتخاب کریں۔
صوبوں میں مختلف سیاسی جماعتوں کے نمایندوں کو بطور غیر سرکاری مشیروں کے لینے کا انحصار مختلف صوبوں کی صورت حال پر ہے۔
جنگی کونسل میں مسلمان نمایندوں کے تقرر کا سوال مسلم لیگ پر چھوڑنا آئینی طور پر ناممکن ہے لیکن یہ اندیشہ نہیں کرنا چاہئے کہ اس کی پیش کردہ تجویز پر بخوبی غور نہیں کیا جائیگا۔
یہ تمام مذاکرات و مراسلات صدر مسلم لیگ اور حکومت کے مابین صیغۂ راز میں تھے مگر کانگریسی پروپاگنڈا ابھی جاری تھا اور مسلم پبلک نتیجہ معلوم کرنے کے لئے متردد تھی اس لئے مسٹر جناح نے میمورینڈم کی اشاعت کی اجازت چاہی لیکن وائسرائے نے اپنے خط مورخہ ۶؍ جولائی کے متعلق غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا اور ۵؍ اگست کو رازدارانہ طور پر اپنے بیان کی ایک نقل جو ۸؍ اگست کو شائع ہونے والا تھا صرف ذاتی اطلاع کے لئے بھیجی اور اگزکٹو کونسل اور مشاورتی جنگی کونسل میں مسلم لیگ کے تعاون کی درخواست کی نیز ۲؍ اگست کو بمبئی میں ملاقات کے لئے مدعو کیا۔
۸؍ اگست کو متذکرہ بالا بیان شائع ہوگیا جس میں گزشتہ واقعات اور اکتوبر ۱۹۳۹ء کی پیشکش کا اعادہ ہندو مسلم مساعی اتحاد کا تذکرہ کانگریس اور مسلم لیگ کے رزولیوشنوں کا حوالہ بطور تمہید تھا، اصل مسائل کے متعلق اگزکٹو کونسل میں توسیع کے ساتھ ہندوستان کے

بند نمائندوں کی شمولیت اور مشاورتی جنگی کونسل کے قیام اور ہندوستانی ریاستوں اور
موعی طور پر ہندوستان کی قومی زندگی کے دیگر مفادات کے نمائندوں کی شرکت کی دعوت تھی
ئینی مستقبل اور اس میں اقلیتوں کی پوزیشن کی نسبت کہا گیا کہ :-

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان کے امن و بہبودی کی خاطر حکومت اپنے موجودہ اختیارات کسی ایسے نظامِ حکومت کو منتقل نہیں کر سکتی جس کی ہندوستانی قومی زندگی کے چیدہ و طاقتور عناصر براہِ راست مخالفت کر رہے ہوں نہ وہ ان عناصر سے زبردستی ایسی حکومت کی اطاعت کرانے میں فریق بننا گوارا کرے گی۔

مستقبل کے آئین کے متعلق اس خواہش کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہ "خود ہندوستانی مرتب کریں اور انھیں کی ذمہ داری ہو" کہا کہ :-

ایسے مرحلہ پر جب کہ سلطنت برطانیہ اپنی ہستی برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہے بنیادی مسائل آئینی کے متعلق قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا تاہم حکومتِ برطانیہ نے مجھے اس بات کے اعلان کرنے کا اختیار دیا ہے کہ وہ جنگ کے خاتمہ پر ہندوستان کے لئے آئین کا ڈھانچہ تیار کرنے کے لئے فوراً ایک ایسی جماعت قائم کرنے کی منظوری دیدے گی جو ہندوستان کی قومی زندگی کے چیدہ عناصر کی نمائندہ ہو اور حکومت تمام متعلقہ مسائل کا جلد از جلد تصفیہ کرانے میں بحدِ امکان ہر طرح مدد دے گی اور اس درمیان میں حکومت ہر ایسے مخلصانہ اور عملی اقدام کا خیر مقدم کرے گی اور اس کو درجۂ تکمیل تک پہنچانے میں ہر نوع مدد دے گی جو ہندوستان کے نمائندہ لیڈر بطور خود دوستانہ سمجھوتہ کی بنیادوں کا فیصلہ کرنے کے لئے مندرجہ ذیل امور کے متعلق کریں گے۔

(۱) بعد جنگ جو نمائندہ جماعت قائم کی جائے اس کی تشکیل کیا ہو اور وہ متعلقہ مسائل کا فیصلہ کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کرے۔

(۲) خود مطلق اصول آئین کیا ہوں۔

مسٹر جناح اور وائسرائے کی موعودہ ملاقات میں مسلم مفاد کی حفاظت کا اصل مسئلہ صوبجات غیر سرکاری مشیروں کے تقرر توسیع شدہ اگزیکٹو کونسل اور مشاورتی جنگی کونسل کے قیام اور ان دونوں کی طاقت یعنی تعداد ممبران، مسلمان ممبروں کی تعداد و انتخاب وغیرہ کے متعلق رازدارانہ گفتگو ہوئی۔

۱۴ اگست کو مسٹر ایمرے وزیر ہند نے دارالعوام میں مسئلۂ ہند کے مباحثہ کے سلسلہ میں ایک معرکتہ الارا تقریر کی اس تقریر میں ہندوستان کی سیاسی حالت، سیاسی تعطل، کانسٹیٹیوئنٹ اسمبلی، اور آزادی کامل کے کانگریسی مطالبات، شرائط امداد جنگ، مرکز میں قومی حکومت اور کانگرس کی اہمیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ :-

اگر کانگریس واقعی اپنے دعوے کے مطابق ہندوستانی قومیت کے تمام عناصر کی طرف سے بولنے کا حق رکھتی تو یقیناً اس کے مطالبات کو خواہ وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوتے قبول کرنے میں ہماری مشکل بہت سے اعتبارات سے آج کے مقابلہ میں بہت آسان ہوتی، یہ صحیح ہے کہ تعداد کے لحاظ سے کانگریس برطانوی ہند میں سب سے بڑی پارٹی ہے لیکن ہندوستان کی طرف سے بولنے کا جو دعویٰ وہ کرتی ہے وہ ہندوستان کی بہت پیچیدہ قومی زندگی کے اہم عناصر کی طرف سے تسلیم نہیں کیا جاتا۔ یہ دوسرے عناصر مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کو نہ صرف ایک جداگانہ اقلیت سمجھا جائے بلکہ ہندوستان کے مستقبل کا جو آئین بھی بنے اس میں ان کو مستقل جداگانہ عوامل کی حیثیت دی جائے۔

ان عناصر میں سب سے آگے نوکروڑ مسلمانوں کا عظیم الشان فرقہ ہے جو نہ صرف ہندوستان کے شمال اور مشرق میں اکثریت میں ہی بلکہ اقلیت کی حیثیت سے ہندوستان کے پورے براعظم پر پھیلا ہوا ہے ان کے اور اُن کے ہم وطن ہندوؤں کے درمیان جو اختلافات ہیں وہ اگر بہت نہیں تو کم از کم اتنے ہی

گہرے ضرور ہیں جتنے اسی قسم کے اختلافات کی گہرائی یورپ میں ہے لیکن یہ اختلافات خوشگوار معاشرتی تعلقات یا بارآور سیاسی اشتراک کی راہ میں حائل نہیں ہوتے حقیقت میں ان اختلافات نے مسلمانوں کو انفرادی طور پر کانگریس میں سرگرم حصہ لینے سے نہیں روکا۔ لیکن مسلمان بحیثیت جماعت کے کانگریس سے الگ کھڑے ہیں۔ موجودہ آئین پر مسلمانوں کا اعتراض یہ نہیں ہے کہ اس میں وہ جمہوری حکومت نہیں دی گئی جو کانگریس چاہتی ہے بلکہ اُن کا اعتراض یہ ہے کہ یہ آئین ہندو اکثریت کو مرکز میں بہت زیادہ طاقت دے دیتا ہے وہ اس آئین سے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے جو ایک ایسی نمایندہ اسمبلی کے ذریعہ بنایا جائے جسے جغرافیائی اکثریت نے منتخب کیا ہو۔ آئین بنانے کے ہر مباحثہ میں مسلمانوں کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کو ایک مستقل عنصر سمجھا جائے اور وہ صرف اسی آئین کو منظور کرنے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں جس میں ہندوستان کی عددی اکثریت کے مقابلہ میں ان کو ایک جداگانہ امتیازی حیثیت دیدی جائے۔"

اس کے بعد کانگریس سے بطور فرقہ اچھوتوں کی علیحدگی تسلیم کرتے ہوئے والیانِ ریاست کی جداگانہ حیثیت ان کی کانگریسی مطالبات سے مخالفت اور فیڈریشن میں آمادگی شرکت کا تذکرہ کر کے کہا کہ:۔

بہت سے اعتبارات سے ان کے مقبوضہ علاقے اپنی خصوصیات میں ہندوستان کے ہندوستانی حصے کہلاتے ہیں ساتھ ہی ساتھ ان کو بھی بہت فائدہ پہنچے گا جب کہ وہ بقیہ ہندوستان کے ساتھ قریبی تعلق رکھیں گے اس سے انکے یہاں آئینی اور اقتصادی ترقی ہوگی لیکن یہ خیال کرنا ٹھیک نہیں ہے کہ اس قسم کی ترقی ایک رات میں ہو جائے گی یا مرکزی حکومت میں ان کو کام کا موقع دیے بغیر ان پر یہ ترقی بالجبر نافذ کر دی جائے گی۔

پھر ہندوستان کی تعریف اس کی نازی حملوں سے نفرت، مشترکہ مقصد کی حمایت کا ذکر اور

وائسرائے کی تازہ پیش کش کی تعریف و اہمیت اور ان کے بیان کی تائید و حمایت کرتے ہوئے کہا کہ:-

گو کانگریس نے حوصلہ شکن رویہ اختیار کیا ہے تاہم مجھے اب بھی اُمید ہے کہ وہ اپنا حصہ لینے کو تیار ہو جائے گی لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا تو لارڈ لنلتھگو ان پارٹیوں سے ملکر کام کرنے کو تیار رہوں گے جو ان کے ساتھ باہم تعاون کرنا چاہتی ہوں۔

پھر درجہ نوآبادیات کو برطانوی پالیسی کا نصب العین قرار دے کر کہا کہ:-

یہ درجہ خود ہندوستانیوں کی مقدم ذمہ داری ہونا چاہیئے اور ہندوستان کا آئندہ آئین ہندوستانی زندگی کے مجلسی، اقتصادی، اور سیاسی نظام کے متعلق ہندوستانیوں کے نقطۂ نظر کے مطابق ہونا چاہیئے۔ ملک معظم کی گورنمنٹ کو ہندوستانیوں کی اس خواہش سے ہمدردی ہے لیکن وہ ان ذمہ داریوں سے دست کش نہیں ہو سکتی جو ہندوستان سے طویل رشتہ کی وجہ سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو تسلیم کرنا درجہ نوآبادیات میں نقص ڈالنا نہیں بلکہ صرف تاریخی اور جغرافیائی حقائق کو تسلیم کرنا ہے جو ہندوستان کی موجودہ پوزیشن اور دیگر نوآبادیوں کی پوزیشن میں تمیز کرتے ہیں۔ بنا بریں حکومت کی خواہش ہے کہ ہندوستان کا آئین خود ہندوستانیوں کو تیار کرنا چاہیئے۔ یہ ہندوستانی زندگی کے سیاسی، اقتصادی اور مجلسی نظام کے متعلق ہندوستانیوں کے نقطۂ نگاہ کی پیداوار ہونی چاہیئے۔

یہ کام خاتمۂ جنگ پر حتی الوسع جلد از جلد ہاتھ میں لے لیا جائے گا۔ ہندوستان کی قومی زندگی کے سرکردہ عناصر کی نمائندہ باڈی قائم کی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دیسی باڈی قائم کی جائے گی جس کے متعلق مختلف عناصر کے نمائندوں میں اتفاق رائے ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک ایسی باڈی قائم کی جائے گی جسے کسی خاص عنصر کا خواہ وہ کتنا ہی با اثر کیوں نہ ہو اعتماد حاصل

ہوگا۔ لیکن اقلیتوں کا نہیں۔ ملک معظم کی گورنمنٹ یہ بات واضح کرچکی ہے کہ وہ موجودہ ذمہ داریاں کسی ایسے نظام حکومت کے سپرد کرنے کو تیار نہیں جسے ہندوستان کی قومی زندگی کے بڑے اور طاقتور عناصر تسلیم نہ کریں۔ اس معاملہ میں بھی ہم نے ان اصولوں سے انحراف نہیں کیا جن پر نوآبادیوں میں عمل کیا گیا تھا۔ ہر نوآبادی میں موجودہ درجہ دینے سے پیشتر نہ صرف جغرافیائی یونٹوں میں بلکہ ان نوآبادیوں کی مختلف اقوام میں مفاہمت ہوگئی تھی۔ مثال کے طور پر کینیڈا میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں۔ جنوبی افریقہ میں انگریزوں اور بوئروں میں اس امر کے متعلق سمجھوتہ ہوا کہ آئین کس قسم کا ہونا چاہیئے اور کس طریقہ سے مرتب کیا جانا چاہیئے۔

مفاہمت یعنی رضامندی آزاد گورنمنٹ اور سچی جمہوریت کی بنیاد ہے۔ اکثریت کا فیصلہ جمہوریت کا اس قدر لازمی جزو نہیں جس قدر یہ کہ وہ آئین کے متعلق دوسری پارٹیوں کی رضامندی حاصل کرے۔ کئی فیڈرل آئین ایسے ہیں جن میں فیڈریشن کے عناصر کے علیحدہ مفاد کا تحفظ کرنے کے مدنظر اکثریت کے فیصلوں پر پابندیاں لگائی گئی ہیں یہ کہنا کہ اس قسم کی مفاہمت پر زور دینا آئینی ترقی کو روکنے کے مترادف ہے متعلقین کی قوم پرستی اور احساس ذمہ داری پر دھبہ لگانا ہے۔ مفاہمت کا یہ مطلب نہیں کہ ایک باڈی کو ویٹو کے اختیار دئے جائیں بلکہ سمجھوتہ کرنا اور سمجھوتے کی خواہش کرنا۔ ہندوستان ہو یا کوئی اور ملک یہی بات ذمہ داری کے احساس کی کسوٹی ہے اور اسی پر آزاد گورنمنٹ کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔

دوسری طرف حصول مفاہمت کے نقائص کی وجہ سے جو پابندیاں لگائی گئی ہیں ان میں رہتے ہوئے ساری آئینی پوزیشن کی دوبارہ پڑتال کی جاسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مرکز سے صوبوں یا ریاستوں کے تعلقات یا انتخاب اور نمایندگی کے طریقوں سے بالکل نرالا طریقہ اختیار کرنے سے کوئی ایسا سمجھوتہ ہو جائے جو موجودہ آئین کے اندر ہندوستان کی سابقہ انتظامیہ روایات اور برطانیہ کے آئینی نظریات پر مبنی ہو

مگر ان امور کی تکمیل کو فیصلۂ جنگ پر ملتوی رکھا گیا۔ البتہ ابتدائی بحث و تمحیص اور تحقیقات[521] موجودہ حالت میں خیر مقدم کرنے کا اقرار کیا۔
پھر جوابی تقریر میں ہندوستان کی دو بڑی جماعتوں مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلافات اور وائسرائے کی سعی اتحاد تعطل ختم کرنے کی کوشش وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کی توسیع اور جنگی مشاورتی کمیٹی کی تشکیل کی توضیح کرکے کہا کہ:۔
جنگ کے بعد اس جنگی کمیٹی کے ارکان ہندوستان کا آیندہ دستور اساسی اور آئین مرتب کریں گے ...... خاتمہ جنگ کے بعد ہندوستان کو جدید آئین کے ماتحت درجہ نوآبادیات دیدیا جائے گا۔
رام گڑھ کے اجلاس کے بعد بین الاقوامی صورتِ حال کے اقتضا سے کانگریس کے رویہ اور عقیدہ میں بھی تغیر رونما ہوا۔ ۲۱ جون کو ورکنگ کمیٹی نے ایک طویل بیان شائع کیا کہ وہ تحریکِ آزادی میں عدم تشدد کی پابند رہے گی مگر خارجی حملہ آور اور اندرونی اختلال کے خلاف تشدد اختیار کرے گی۔ لیکن وار کمیٹیوں کی تائید و شرکت سے انکار اور اپنی والنٹیر جماعتیں بنانے پر زور بھی تھا، چونکہ قرارداد گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد پر بھی جو چند دن پہلے برطانیہ کو مشورہ دے چکے تھے کہ وہ اپنے جزائر وغیرہ سب کچھ ہٹلر کے حوالہ کر دے اور عدم تشدد سے مقابلہ کرے اس لئے ایک بڑی عقیدتمندانہ بحث کے بعد ان کو کانگریس کی قیادت سے سبک دوش کر دیا گیا۔
آغاز جولائی میں گاندھی جی اور وائسرائے میں ملاقات ہوئی اور گاندھی جی نے ایک بیان شائع کیا کہ کانگریس کا مقصد فوری کامل آزادی ہونا چاہیئے مگر عملاً جنگ میں امداد نہ دی جائے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۷ جولائی کو یہ قرارداد پاس کی کہ:۔
"مکمل آزادی تسلیم کئے جانے کا غیر مبہم اعلان فوراً کیا جانا چاہیئے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اولین قدم کے طور پر مرکز میں ایک عارضی قومی حکومت قائم ہونی چاہیئے جو عبوری دور کے لئے ہو اور اس کو مرکزی اسمبلی کے تمام منتخب عناصر کا اعتماد اور صوبوں کی ذمہ دار حکومتوں کا پورا تعاون حاصل ہو۔"

اسی اعلان پر ہندوستان کی مدافعت کی مؤثر تنظیمی کوششوں میں اپنے تعاون کو مشروط کر دیا مگر اس قومی گورنمنٹ میں ایک گہری چال تھی جس کی نسبت مسٹر جناح نے دوسرے دن ایک بیان میں بتایا کہ :-

دہلی کے رزولیوشن میں نام نہاد قومی حکومت کا جو مطالبہ کیا گیا ہے اس کے معنی ہیں "کانگریس راج" لفظ "قومی" کو بہت بری طرح استعمال کیا جا رہا ہے ہندوستان میں ایک قوم نہیں بلکہ یہاں تو یورپ اور امریکہ کا سا حال ہے، اگر کانگریس کا مطالبہ پورا کیا گیا تو اس کے معنی ہوں گے "مستقل ہندو اکثریت کی حکومت" اس پوزیشن کو مسلمان ہرگز قبول نہیں کریں گے مسلم لیگ کو پختہ یقین ہے کہ تقسیم ہند واحد حل ہے۔"

اس بیان کے شائع ہوتے ہی صدر کانگریس نے تحت اعتماد بصیغہ راز مسٹر جناح کو حسب ذیل تار دیا :-

"آپ کا ۹ ر جولائی والا بیان نظر سے گزرا کانگریس کی قرارداد دہلی میں "قومی گورنمنٹ" کے الفاظ سے قطعی طور پر ایسی مخلوط وزارت مقصود ہے جو کسی ایک جماعت میں محدود نہ ہو لیکن کیا لیگ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ کسی ایسے عارضی انتظام سے بھی متفق نہیں ہو سکتی جو ۲ قوموں والی اسکیم پر مبنی نہ ہو اگر ایسا ہی تو براہ کرم تار کے ذریعہ وضاحت فرمائیے۔"

مسٹر جناح نے فوراً حسب ذیل جواب دے کر پریس میں بھی شائع کرا دیا :-

آپ کا تار موصول ہوا میں آپ کے اعتماد و رازداری کا جواب اعتماد سے نہیں دے سکتا میں آپ سے مراسلت یا کسی اور طریقہ سے گفتگو کرنا نہیں چاہتا آپ نے مسلم انڈیا کا اعتماد قطعاً کھو دیا ہے، کیا آپ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ کانگریس کو قومی رنگ دے کر ممالک غیر کو بتلائے فریب کرنے کی غرض سے آپ کو کانگریس کا "شو بوائے" مسلم صدر بنایا گیا ہے۔

آپ نہ مسلمانوں کے نمائندے ہیں نہ ہندوؤں کے، کانگریس ہندو جماعت

ہے اگر آپ میں عزتِ نفس ہے تو فوراً استعفا دیجئے، آپ نے لیگ کے خلاف اب تک وہ سب کیا ہے جو بد سے بدتر آپ کر سکتے تھے آپ واقف ہیں کہ آپ کو مایوسانہ ناکامی ہوئی ہے۔"

اِس تار کی اشاعت سے کانگریسی زعما بالخصوص کانگریسی مسلمان نہایت برہم ہوئے جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق تھا اس کا تو کوئی جواب نہ تھا البتہ مولانا آزاد کو "شو بوائے" سے تعبیر کرنے پر مطاعن کی بوچھار کی گئی اور بیانات کے لئے کانگریسی اخبار وقف ہو گئے۔ لیکن ان بیان دینے والوں اور خفا ہونے والوں نے حقیقتِ نفس الامری کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کر دیا۔

گزشتہ سال گاندھی جی نے مسٹر سیتا رمیّہ کو امیدوار صدارت بنایا تھا جن کے علی الرغم مسٹر بوس کامیاب ہوئے اور گاندھی جی نے اپنے امیدوار کی شکست اپنی شکست تسلیم کی اب ہر لحاظ سے اس سال مسٹر ستیہ رمیّہ کو یہ اعزاز ملنا چاہئے تھا لیکن مولانا کو ترجیح دی گئی اور انھوں نے اپنے انتخاب کو گاندھی جی کی لیڈری اور ان کے پروگرام پر اعتماد کا ووٹ قرار دیا اور گاندھی جی نے یہ اعلان کیا کہ "کانگریس ہندو انجمن نہیں ہے اگر وہ ہندو انجمن ہوتی تو ایک مسلمان عالمِ دین کو نہ منتخب کیا جاتا۔"

کون کہہ سکتا ہے کہ اگر گاندھی جی کی خواہش نہ ہوتی اور باقاعدہ مقابلہ ہوتا تو مولانا منتخب ہو جاتے ایک ڈکٹیٹر نے حکم دیا اور ایک شخص صدر بنا دیا گیا ضابطہ کی خانہ پری کے لئے ریاکارانہ ووٹ لے لئے گئے۔ مزید براں اس "شو بوائے" کی تعریف بعد کے واقعات نے اور زیادہ واضح کر دی۔

وائسرائے سے مولانا کی ملاقات صدر کانگریس کی حیثیت سے طے ہوئی مگر ملتوی کرا دی گئی کیوں کہ اُن پر اس درجہ اعتماد نا ممکن تھا کہ وہ وائسرائے سے کوئی آزادانہ گفتگو کریں پھر اکتوبر میں جب ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن کو بالمشافہ پیش کرنے کا موقع آیا جس کی نسبت یقین تھا کہ خود صدر کانگریس پیش کریں گے تو ڈکٹیٹر کے ہی شانوں پر یہ بارِ عظیم رکھا گیا۔ کیا کسی جمہوری ادارہ میں صدر کے ساتھ یہ برتاؤ ہو سکتا ہے اور کیا کوئی خود دار

صدر آتنی بے اعتمادی گوارا کرسکتا ہے۔

خود مولانا کو علم تھا کہ سابق مذاکرات میں گاندھی جی نے جب اپنی روشنی کے لئے مولانا کو اپنا رفیق بناکر مسٹر جناح سے ملنا چاہا تو انھوں نے مولانا کی موجودگی منظور نہیں کی تو اب ان پر اعتماد کے کون سے تازہ اسباب پیدا ہوگئے تھے کہ تحت اعتماد بصیغۂ راز کوئی گفتگو کی جاسکتی، پھر تار کا مضمون بجائے خود فریبانہ تھا کانگریس کے دائرہ میں رازداری بھی ایک بے حقیقت چیز ثابت ہوچکی تھی۔ مسٹر جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو کی مراسلت جو بصیغۂ راز تھی کانگریس سکریٹریٹ سے بلا اجازت شائع کی گئی اور مرتکب جرم کو کوئی سزا نہ دی گئی جو بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ ہائی کمانڈ بھی قابلِ اعتماد نہیں۔

بلاشبہ مسٹر جناح کے تار میں ایک ایسی صحیح ملامت ہے جو عموماً غداروں کے ساتھ کی جاتی ہے جس کی خود مولانا آزاد نے جب کہ وہ آزاد تھے اس طرح تعلیم دی تھی کہ:۔

اگر حق کی راہ اختیار کی ہے تو پھر مصلحت، پیرایۂ بیان، طرزِ ادا، الفاظِ شہد نما، معنی زہر آلود، اسی قبیل کی تمام باتوں کے لئے نفاق کے سوا اور کوئی لفظ نہیں، سچ کہئے گا تو جھوٹ کو بھی چوٹ لگے گی، اس کو بچانے کی کوشش نہ کیجئے ورنہ آپ کفر سے بھی زیادہ دنیا کے لئے مہلک ہیں۔

نرمی، اور آشتی، حسنِ ادا، اور پیرایۂ بیان، مصلحت بینی، اور مقتضیات زمانہ کے اگر یہی معنی ہیں کہ جو بتلائے جاتے ہیں تو خدا کے لئے ہمیں سمجھائیے کہ پھر نفاق و منافقت کے اور کیا معنی ہیں، اگر ایک بات سچ ہے تو اس کو صاف صاف کہدیجئے اگر کچھ لوگ برے ہیں تو کھول کر ان کی برائی کردیجئے، بری باتوں کے اظہار کے لئے اچھے لفظ کیوں استعمال کئے جائیں، بداعمالوں کو کیا حق حاصل ہے کہ نیک کرداروں کے حقوق کا مطالبہ کریں۔

اگست میں جب کہ وزیر ہند کی تقریر شائع ہوئی تو ایک اور طفلانہ فریب کی چال کھیلی گئی یعنی مسٹر سی راج گوپال اچاریہ نے جو گاندھی جی کے سمدھی اور ہائی کمانڈ میں سب سے زیادہ باثر ہیں اور مدراس کے وزیر اعظم تھے لندن کے اخبار ڈیلی ہیرلڈ کے نامہ نگار کو

دارودھا میں یہ بیان دیا کہ:-

مسٹر ایمرے وزیر ہند کی اس دشواری کے جواب میں جو اقلیتوں کی وجہ سے انھیں درپیش آرہی ہے میں یہ ایک دلیرانہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ اگر ملک معظم کی گورنمنٹ عارضی طور پر فوراً قومی گورنمنٹ قائم کرنے کے لئے رضامند ہوجائے گی تو میں یہ ذمہ داری کرتا ہوں کہ اپنے کانگریسی رفیقانِ کار کو اس امر پر رضامند کرنے کی کوشش کروں گا کہ مسلم لیگ کو وزیر اعظم نامزد کرنے کی دعوت دی جائے اور یہ وزیر اعظم جس طرح مناسب سمجھے قومی گورنمنٹ بنائے اگر یہ دشواری جو ملک معظم کی گورنمنٹ کو پیش آرہی ہے مخلصانہ ہے تو میری اس پیشکش سے وہ رفع ہوجائے گی"۔

مگر راجہ امیر احمد (محمود آباد ممبر ورکنگ کمیٹی مسلم لیگ) نے اس پیشکش کا جواب حسب ذیل بیان کی صورت میں دے کر اس فریب کو جو اس پیشکش میں مضمر تھا نمایاں کر دیا۔ راجہ صاحب نے کہا کہ:-

ہندو کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان جو بنیادی مسائل پیدا ہوکر صاف طور سے منظرِ عام پر آگئے ہیں مسٹر آچ گوپال اچاریہ کی یہ دلیرانہ پیشکش اُن کو اُلجھانے کی ایک اور کوشش ہے، مقصد یہ ہے کہ غیر ممالک، باشندگانِ برطانیہ اور اخبارات غلط فہمی میں مبتلا ہوجائیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ موجودہ دستور فوراً منسوخ کردیا جائے (اس پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے) لیکن بنیادی طور پر ایک قوم کا تصوّر اور مرکز میں وحدانی طرزِ حکومت کا قائم رہنا، گویا کانگریس کا راج ہوا اور ہندو اکثریت کے ساتھ مسلم لیگ کا نامزد کیا ہوا وزیر اعظم ہو مگر وہ اور اس کی وزارت جس کی تشکیل کا اختیار ایک فیاضانہ عطیہ کے طور پر مسلم قوم کا دیا جا رہا ہے اُسی مجلس واضعانِ قانون کو جواب دہ ہوں گے جس میں مستقل ہندو فرقہ وارانہ اکثریت ہوگی وزیر اعظم اور اس کی وزارت کو اُسی مجلس قانون کی اطاعت کرنی پڑیگی

اور اس وزارت کی عمر شاید چند ماہ سے زیادہ نہ ہوگی۔

مگر اس پُر فریب دلیرانہ پیشکش کے باوجود مسلم ہندوستان مسلم لیگ کے اس رزولیوشن پر استقلال سے قائم ہے جو لاہور میں پاس ہوا ہے اور جس کو عرفِ عام میں پاکستان کا رزولیوشن کہتے ہیں۔

گزشتہ ۲۵ سال کی تاریخ شاہد ہے کہ سمجھوتہ کی تمام کوششیں اس لئے ناکام رہیں کہ کانگریس اور ہندو اس بحث کی ابتدا اس بات سے کرتے تھے کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا دعوےٰ یہ رہا کہ وہ جُداگانہ اور آزاد ہستی ہیں اور انھوں نے اس بنیاد پر گفتگو شروع کی کہ وہ ایک قوم ہیں اور ہندوستان کی حکومت اور قومی زندگی میں ان کی حیثیت ہم رُتبہ شریک کی ہونی چاہئے، اس لئے اس خلیج سے عبور کرنا دشوار ہے جو پٹ نہیں سکتی، لہٰذا ہمیں دوستوں کی حیثیت سے الگ ہو کر اس امر پر متفق ہو جانا چاہئے کہ ہمارے درمیان تقسیم ہو جائے، مسلم ہند کے لوگ اپنی وطنی سرزمین میں جہاں جہاں ان کی اکثریت ہے اپنے طور پر رہیں اور اپنی خود مختار حکومت کے مالک ہوں۔

ان فضول سوِل وار کی دھمکیوں سے کیا فائدہ اور یہ تاریک و ہولناک توہمات کیوں پیدا کئے جائیں جبکہ یہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ دوستانہ طور پر باہم تقسیم کر لیں۔

میں خوش ہوں کہ گو آہستہ آہستہ مگر یقین کے ساتھ انگلستان کے ذمہ دار ماہرینِ سیاست پر روشنی نزول کر رہی ہے اور یہ وزیرِ ہند کی اس تازہ تقریر سے واضح ہے جس میں انھوں نے ہز اکسلنسی وائسرائے کے اس بیان کی تشریح کی ہے جو انھوں نے ۸ اگست کو حکومتِ برطانیہ کی طرف سے ہندوستان میں دیا ہے مگر اب بھی بعض ایسے ہیں جو پاکستان کے قیام سے مخالفت کر کے اور متحدہ ہندوستان اور درجہ نو آبادیات کی باتیں کر کے ہندوستان کی صورتِ حال اور گزشتہ پانچ سال کے واقعات سے اپنی قطعی لاعلمی کا ثبوت

دیتے ہیں وہ یہ بالکل نہیں سمجھتے کہ ان کے معنی کانگریس راج اور ہندوؤں کا غلبہ ہے جس کو ہندوستان کے مسلمان کبھی منظور نہیں کریں گے۔"

اس کے بعد مرکز میں قومی حکومت کا مطالبہ بھی ختم ہو گیا اور وائسرائے اور وزیر ہند کے بیانات کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۲۲ر اگست کے جلسہ میں اپنی دوستانہ پیشکش کو ٹھکرا دینے اور ہندوستان کی مکمل قومی آزادی کے حق سے انکار کے مرادف قرار دیتے ہوئے اپنے اس عقیدہ کی تصدیق تصور کیا کہ "ہندوستان سامراجی طاقت کے دائرہ میں رہ کر کام نہیں کر سکتا۔ اسے آزاد و خود مختار قوم کا درجہ حاصل کرنا چاہیے اور یہ درجہ دنیا کے امن و ترقی کے لئے دوسرے ممالک سے قریبی اور دوستانہ تعلقات رکھنے سے باز نہیں رکھتا۔"

اقلیتوں کے متعلق جو کچھ برطانوی حکومت کی جانب سے کہا گیا اس کو ترقی کے راستہ میں ناقابلِ عبور سدِ راہ قرار دیا اور یہ کہ برطانوی حکومت قومی زندگی میں پھوٹ ڈالنے اور اسے قائم رکھنے اور اختلافات بڑھانے کے لئے برابر کام کر رہی ہے۔

نیز یہ کہ ورکنگ کمیٹی اس فیصلہ پر پہونچی ہے کہ "وائسرائے کا بیان نہ صرف جمہوریت کے خلاف ہے جسے برطانوی حکومت اپنا مقصدِ جنگ بتاتی ہے بلکہ وہ ہندوستان کے بہترین مفادوں کے بھی خلاف ہے، ان کی منظوری میں نہ کانگریس حصہ لے سکتی ہے اور نہ عوام کو مشورہ دے سکتی ہے۔

یہ اعلان اور پیشکش نہ صرف کانگریس کے مطالبہ سے بہت کم ہیں بلکہ آزاد متحدہ ہندوستان کی ترقی میں حائل ہوں گے۔"

ساتھ ہی عوام سے مطالبہ کیا گیا کہ عام جلسے کر کے اور کونسلوں کے نمایندوں کے ذریعہ سے برطانوی حکومت کے رویّہ کی مذمت کریں۔

چوں کہ اس دوران میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت چند کانگریسیوں کی گرفتاری ہوئی تھی اس کے خلاف احتجاج کر کے کانگریس کمیٹیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

۳۱ر اگست کو بمقام بمبئی مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا جو ۲ر ستمبر تک
اری رہا اس اجلاس میں تمام مذاکرات و مراسلات اور اعلانات پر غور کے بعد حسب
یل رزدیوشن پاس کیا گیا۔

زدلیوشن | ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے ہز ایکسیلنسی کے اس بیان پر جو
ر اگست ۱۹۴۰ء کو شائع ہوا اور مسٹر ایمرے وزیر ہند کی اس تقریر کو جو انھوں نے
لک معظم کی گورنمنٹ کی طرف سے دارالعوام میں مسئلۂ ہند کی بحث کے دوران میں
۱۴ر اگست ۱۹۴۰ء کو فرمائی اچھی طرح غور کیا ہندوستان کے آئندہ دستور حکومت کے
مسئلہ میں آل انڈیا مسلم لیگ نے مسلمانانِ ہند کی طرف سے جو نقطۂ نظر اور پہلو اختیار
کیا تھا ورکنگ کمیٹی کے خیال میں وائسرائے کے بیان اور وزیر ہند کی اس تقریر سے
حکومت برطانیہ نے اس کی طرف معقول ترقی کی ہے اور کمیٹی اس کو بہ نظرِ اطمینان دیکھتی
ہے کہ ملک معظم کی گورنمنٹ نے مجموعی طور پر عملاً اس کے متعلق صاف تیقن کا وہ مطالبہ
پورا کر دیا جو مسلم لیگ کی طرف سے کیا گیا تھا کہ کوئی آئندہ دستور حکومت خواہ وہ عارضی
ہو یا قطعی حکومت برطانیہ اس وقت تک اختیار نہ کرے جب تک مسلم لیگ اس پر اپنی
رضامندی نہ دیدے اور اسے منظور نہ کرے۔

۲۔ مسلم لیگ یہ ثبت کرتی ہے کہ ہز ایکسیلنسی وائسرائے کے بیان میں اور وزیر ہند
کی تقریر میں قومی زندگی کے اتحاد کے اصول کے متعلق بعض اس قسم کے خیالات ظاہر
کیے گئے ہیں جن کا کوئی وجود نہیں ہے اور تاریخی حیثیت سے خلاف واقعہ اور متضاد
ہیں اس قسم کے خیالات سے مسلمانوں کو بدگمانیاں پیدا ہو سکتی ہیں اس لئے کمیٹی دوبارہ
اس کی تصدیق اور معاملہ کو واضح کر دینا ضروری سمجھتی ہے کہ کمیٹی لاہور کے رزولیشن پر
قائم ہے اور نیز ان بنیادی اصولوں پر جن پر کہ وہ مبنی ہے یعنی جن میں کہ یہ تجویز کیا گیا تھا کہ
ہندوستان کی تقسیم کی جائے اور شمالی و مغربی اور مشرقی علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی
اکثریت ہے آزاد حکومتیں (اسٹیٹس) قائم کی جائیں اور کمیٹی اپنے اس عزمِ مصمم، تہیہ
اور عقیدے کا اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کے آئندہ دستور حکومت کے پیچیدہ اور مشکل

مسئلہ کا واحد حل ہندوستان کی تقسیم ہی میں ہے اور یہ مسرت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ اس کی اصلی اہمیت اور اس مسئلہ کے صحیح پہلو، برطانوی پارلیمنٹ نے اچھی طرح محسوس کر لئے ہیں اور یہ کہ ملک معظم کی گورنمنٹ صورت حالات کی حقیقتوں سے آپ اچھی طرح واقف ہے مسلم لیگ دوبارہ اس کو واضح کرتی ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان خود ایک ہی قوم ہیں اور اپنا حق حکومت خود اختیاری استعمال کریں گے اور اپنے مستقبل کے متعلق تنہا وہی فیصلہ کرنے والے اور حکم ہیں۔

۳۔ ورکنگ کمیٹی اس کا اعتراف کرتی ہے کہ مسلم لیگ نے جو یہ مطالبہ کیا تھا کہ خارجی حملے کا مقابلہ کرنے اور اندرونی امن وامان قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کی اور ایسی دوسری پارٹیوں کی پوری تائید حاصل کرنے کے لئے جو اس کے لئے تیار رہی ہیں اور تیار رہیں کہ پوری ذمہ داری اپنے سر لیں اور ہندوستان کے تحفظ کے لئے اہتمام جنگ کی تمام کوششوں میں پورا پورا حصہ لیں مسلم لیگ کے نمائندوں کو منصب اور اختیار کے ساتھ بحیثیت شرکت کے مرکزی صوبجاتی گورنمنٹوں میں شامل کیا جائے اور ایک وار کونسل قائم کی جائے جس میں والیانِ ملک بھی داخل ہوں تاکہ اس طرح ان کا تعاون بھی حاصل ہو جائے اصولاً منظور کر لیا اس لئے کمیٹی کو مسرت ہے کہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ عارضی طور پر تا اختتامِ جنگ گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کی توسیع اور تمام ہندوستان کی وار ایڈوائزری (مشاورتی جنگی) کونسل کا قیام منظور کر لیا اگرچہ کمیٹی کو اس کا افسوس ہے کہ ملک معظم کی گورنمنٹ نے یہ اعلان کر دیا کہ اس منزل پر ان صوبوں میں وہ غیر سرکاری ایڈوائزروں کا تقرر نہیں کرنا چاہتی جن پر اس وقت گورنر قانون گورنمنٹ ہند کی دفعہ ۹۳ کے ماتحت حکومت کر رہے ہیں مگر کمیٹی یہ دیکھتی ہے کہ وائسرائے کے خط مورخہ ۱۴ر اگست ۱۹۴۰ء میں جو اس مفہوم کی قطعی پیش کش کی گئی ہے کہ وہ مذکورہ بالا اصول کے مطابق گورنمنٹ سے منصب اور اختیار کے ساتھ بحیثیت شریک کے (مسلم لیگ) تعاون کرے نہایت ناقابل اطمینان ہے اور اس سے نہ اس رزولیوشن کی غرض وغایت پوری ہوتی ہے جو کمیٹی نے ۱۶ر جون ۱۹۴۰ء کو پاس کیا اور جو وائسرائے کے پاس صدر کے اسی تاریخ کے مکتوب کے ساتھ بھیج دیا گیا تھا

س سے وہ باتیں پوری ہوتی ہیں جو صدر نے اپنی یادداشت مورخہ یکم جولائی میں لکھی ہیں۔
حالات میں کمیٹی اس کو بہت مشکل سمجھتی ہے کہ بربنائے وجوہ مندرجہ ذیل اس پیشکش پر
درآمد کرے۔
۱۔ نہ صدر سے اس معاملہ میں مشورہ کیا گیا اور نہ کمیٹی سے کہ گورنر جنرل کی کونسل میں ان
روں کی کیا تعداد ہوگی جن کا اضافہ کرنا تجویز کیا گیا ہے۔
۲۔ کمیٹی کو ابھی تک یہ نہیں معلوم ہے کہ پوری ایگزیکٹو کونسل کی دوبارہ تشکیل کس
ہوگی۔
۳۔ کمیٹی کو اس کی کوئی اطلاع نہیں ہے کہ وہ دوسری پارٹیاں کون ہیں جن کے ساتھ
ن کرنے کے لئے مسلم لیگ کو دعوت دی جائے گی۔
۴۔ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ صدر کو اس کی اطلاع نہیں دی گئی ہے کہ ان اضافی
روں کو کیا پورٹ فولیو (محکمے یا صیغے) دئے جائیں گے اس کے سوا کہ توسیع شدہ
یکٹو کونسل کے ارکان کی تعداد گیارہ کے قریب ہوگی، بغیر کسی علم یا اطلاع کے کمیٹی
ے یہ خواہش کی گئی کہ وہ چار انتخاص کا پینل (نامزدگی کرکے فہرست) بھیجے جس میں سے
سرائے دو کو گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت کے لئے منتخب کرلیں گے۔
۵۔ کمیٹی نے پینل کے مجوزہ طریقہ پر غور کیا اور اس کی رائے یہ ہے کہ اس پر بہت سے
راضات وارد ہوتے ہیں یہ مناسب نہیں ہے اور کمیٹی اس کو پسند نہیں کرتی۔
۶۔ وار ایڈوائزری کونسل کے متعلق یہ ہے کہ کمیٹی اس کے دستور سے، اس کی
بل سے اور اس سے کہ وہ کیا کام کرے گی واقف نہیں ہے، اس کے متعلق کمیٹی کو صرف
قدر علم ہے کہ وار ایڈوائزری کمیٹی کے ارکان کی تعداد تقریباً تیس ہوگی اور کمیٹی سے
ہش کی گئی ہے کہ وہ پینل بھیجے جس میں سے چار کا وائسرائے تقرر کردیں گے ان حالات
کمیٹی اس پیشکش کو ناقابل اطمینان تصور کرتی ہے اور وائسرائے سے درخواست کرتی
کہ اس معاملہ پر دوبارہ غور کیا جائے اور صدر کو اختیار دیتی ہے کہ مزید اطلاع حاصل
یں اور وضاحت کرائیں۔

مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا آخری رزدلیوشن وار کمیٹیوں میں شرکت کے متعلق تھا جو ذیل میں درج ہے۔

ورکنگ کمیٹی کا وہ رزدلیوشن جو ۱۶ر جون ۱۹۴۰ء کو بمبئی میں پاس ہوا تھا جس میں بالعموم مسلمانوں سے اور بالخصوص مسلم لیگ کے ممبروں سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ جب تک وائسرائے سے گفت وشنید کے بعد صدر آل انڈیا مسلم لیگ مزید ہدایات دیں وہ وار کمیٹیوں میں شریک نہ ہوں جیسا کہ مسلم لیگ کے دشمنوں نے اس کی تعبیر کی ہے۔ یہ حکومت سے عدم تعاون کی پالیسی نہیں تھی بلکہ اس کے برخلاف حکومت پر یہ اصرار کرنے کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ وہ ایسا طرز عمل اختیار کرے جس سے اہتمام جنگ میں قومی تر اشتراک عمل حاصل ہو سکے۔

دو اشد ضروری نکات پیدا ہو گئے تھے جن کے متعلق کمیٹی گورنمنٹ سے اصرار کر رہی تھی یعنی

۱۔ بغیر مسلم ہندوستان کی منظوری اور رضامندی کے ملک معظم کی گورنمنٹ ہندوستان کے لئے کوئی دستور حکومت وہ عارضی ہو یا قطعی منظور نہیں کرے گی۔

۲۔ مسلمانوں کی حقیقی دلی تائید حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ دستور کی حدود کے اندر مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں میں اسلامی ہند کے قائدین کو شریک کیا جائے ورکنگ کمیٹی یہ مسرت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ اس گفتگو کے نتیجہ میں پہلا مسئلہ ہز ایکسیلنسی وائسرائے کے بیان مورخہ ۸ اگست ۱۹۴۰ء اور مسٹر ایمرے وزیر ہند کی اس تقریر سے طے ہو گیا ہے جو انھوں نے وائسرائے کے بیان کی تشریح و توضیح کے طور پر ۱۴ اگست ۱۹۴۰ء کو پارلیمنٹ میں کی ہے اور کمیٹی اس کو بہ نظر اطمینان دیکھتی ہے کہ گورنمنٹ نے دوسرے نکتہ کا جو اس کے سامنے پیش کیا گیا تھا اصول منظور کر لیا ہے یعنی کامیابی کے ساتھ اہتمام جنگ کے لئے گورنمنٹوں میں منصب اور اختیار کے ساتھ شرکت۔

ان حالات کو پیش نظر رکھ کر ورکنگ کمیٹی ان مسلمانوں کو جن کا یہ خیال ہے کہ وہ صرف وار کمیٹیوں میں شرکت کر کے کوئی مفید خدمت کر سکیں گے آزادی دیتی ہے کہ وہ

وارکمیٹیوں میں شریک ہوں۔

کمیٹی کی رائے یہ ہے کہ گورنمنٹ کو چاہئے کہ صرف اصولاً نہیں بلکہ واقعی مسلمان لیڈروں پر اعتماد کرکے اور بحیثیت ہم مرتبہ حصہ دار کے مرکز اور صوبوں کے انتظام حکومت میں انھیں شریک کرے تاکہ کامیابی کے ساتھ جنگ کا اہتمام کرنے میں اسلامی ہند کا دلی اور حقیقی تعاون حاصل ہو۔"

اس رزولیوشن کو بھی وائسرائے کے پاس روانہ کیا گیا۔ نیز ۲۴ ستمبر کو مسٹر جناح نے بھی ملاقات کی مگر ۲۵ ستمبر کو وائسرائے کا جو جواب موصول ہوا وہ بھی مبہم رہا اور پورے طور پر معاملات صاف نہ ہو سکے۔

۲۵ ستمبر کو وزیر ہند نے ایک اور تقریر کی جو گویا اس وقت تک کے اہم معاملات پر ایک تبصرہ اور برطانوی پالیسی کا ایک واضح بیان تھا انھوں نے نتیجہ جنگ کے متعلق ہندوستانیوں کے خیالات اور اختلافات سیاسی کے باوجود ہندوستانیوں اور برطانویوں میں رشتۂ اتحاد نازی عقائد سیاسی ہندوستانیوں کی برطانیہ کے ساتھ، مادی اور اخلاقی ہمدردی کو بیان کرکے سیاسی جمود اور اہل ہند کی خواہشوں کو فوراً پورا نہ کرسکنے کے متعلق کہا کہ:۔

"اگر ہندوستان متفقہ ملک ہوتا جس میں کہ اکثریت کو پوری قوم کی طرف سے بولنے کا حق منصفانہ ہو سکتا اور اس کے ساتھ اقلیت کی منظوری بھی شامل ہوتی، خواہ بادلِ ناخواستہ ہی کیوں نہ ہو تو یہ زیادہ آسان ہوتا اگر قدرت اور تاریخ نے ہندوستان کی قومی زندگی اور حکومت کے پیچیدہ ڈھانچے نہ بنائے ہوتے تو واقعہ یہ ہے کہ بڑی آسانی تھی۔"

اس کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے متعلق کوششوں کا تذکرہ کرکے کہا کہ:۔

صوبوں میں نظام حکومت کامیابی کے ساتھ جاری رہا اور چند صوبوں میں اب بھی کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ اور کانگریسی وزارتوں کے مستعفی ہو جانے کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بحیثیت مجموعی ہندوستان کے فیڈرل پہلو پر اس کا اطلاق اس بنا پر ناممکن نہیں پایا گیا کہ ہندوستانیوں میں اس بات پر عام

اتفاق تھا کہ نظام حکومت کی دفعات پر برطانیہ کا بہت زیادہ کنٹرول ہے بلکہ وجہ یہ تھی کہ خود ہندوستانیوں میں اس کنٹرول پر سخت اختلاف تھا جو اس نظام سے ایک پردیسی کو حاصل ہوتا ہے۔ کانگریس پارٹی کو اس جمہوریت پر اعتراض ہے جو ایکٹ میں خود مختار ریاستوں کو دی گئی ہے۔ مرکزی لیجسلیچر کی اکثریت کو ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کرنے کا جو حق دیا گیا ہے اس سے ریاستیں بچتی ہیں عظیم مسلم فرقہ اپنی قسمت کا مستقبل ہندو اکثریت کے اختیار کو سونپنا نہیں چاہتا۔

ان میں سے کوئی اعتراض بناوٹی یا ادنیٰ نہیں ہے بلکہ خلوص دل کے ساتھ ان کو محسوس کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی قومی زندگی کے بڑے بڑے اجزا کانگریس، مسلمان، والیانِ ریاست (ان اجزا، اور پارٹیوں کے نمایندوں کا ذکر نہیں جو ہندوؤں کے اندر ہیں اور کانگریس کے مخالف ہیں) —— میں سے ہر ایک اپنا منصفانہ معاملہ رکھتا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ برطانوی حکومت نے آئینی ترقی میں دیر کرنے کے لئے بطور عذر جان بوجھ کر اختلافات کو بڑھایا ہے یا ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کے برعکس آئینی ترقی کی توقع سے یہ اختلافات شدید ہو گئے جو مطلق العنانہ حکومت کے ماتحت دبے ہوئے رہتے ہیں۔ دوسرے اگر برطانوی حکومت ان اختلافات کو نظر انداز کر دے اور تاریخ نے ہندوستان کی جو ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں ان کو بھول کر اوپری دل کے ساتھ کوئی آئینی حل قبول کرے جسے لازمی طور پر ہندوستانی قومی زندگی کے زبردست اور اہم اجزا مسترد کر دیں گے اور نتیجہ میں انتشار اور ہنگامہ ہوگا تو مساوی طور پر یہ بھی غلط ہے۔ ہر نو آبادی کی مثال موجود ہے اور گزشتہ تمام فیڈریشنوں میں ایسا ہی ہوا کہ اتفاق اور رضامندی ہونی چاہیئے۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ جن بڑے بڑے ترکیبی اجزا کو آیندہ مل کر ایک ساتھ رہنا ہے ان کے درمیان مفاہمت ہونی چاہیئے۔ یہ آزاد خود مختار حکومت کی ایک پارلیمنٹری شرط ہے۔

اس کے بعد زمانہ جنگ میں کسی بنیادی تبدیلی کے عدم امکان اور پارلیمنٹری تحقیقات

و مذاکرات کا امکان بتا کر کہا کہ

"اس وقت نئے طریقہ پر جتنی زیادہ تکمیل کے ساتھ یہ کام ہوگا اختتامِ جنگ کے بعد اتنی ہی تیزی سے ہر چیز طے ہو سکتی ہے۔"

پھر وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل میں توسیع کی پیشکش اور آل انڈیا جنگی مشاورتی کونسل کی تجویز کے متعلق کہا کہ:-

یہ صحیح ہے کہ موجودہ آئین کے ماتحت اگزیکٹو کونسل توسیع ہونے کے بعد بھی گورنر جنرل کے ماتحت رہے گی اور عین آئینی معنی میں لیجسلیچر کے سامنے ذمہ دار نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا تو نہ صرف دورانِ جنگ میں حکومت کی ساری بنیاد کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہوگی بلکہ نئی بنیادیں بھی تبدیل کرنی ہوں گی کیونکہ ابھی تک بنیادی سمجھوتہ نہیں ہوا جس کی پہلے ضرورت ہے۔ حال ہی میں کانگریس نے ایک پیشکش میں جو اس نے واپس لے لی ہے تجویز کیا تھا کہ اگر مرکز میں ایسی قومی حکومت قائم کر دی جائے جسے موجودہ لیجسلیچر کے منتخب ممبروں کا اعتماد حاصل ہو تو وہ اس حکومت میں شریک ہو جائے گی مگر اس سے یکبارگی وہ تمام مسئلے چھڑ گئے جن پر ابھی سمجھوتہ ہونا ہے۔

جب تک لیجسلیچر کی ترتیب اور اس کی نوعیت پر سمجھوتہ نہ ہو جائے جو ابھی نہیں ہوا اس وقت تک ایسی حکومت کے بارے میں اتفاق نہیں ہو سکتا جو لیجسلیچر کے سامنے ذمہ دار ہو اور اس کے بتلائے ہوئے انداز پر چلے۔ لارڈ لنلتھگو کی پیشکش سے یہ مشکلات دور ہو جاتی ہیں۔ اگزیکٹو اور لیجسلیچر کے درمیان متحدہ تعاون میں یہ کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ خود اگزیکٹو کے ممبروں کے نتیجہ خیز تعاون کے راستے میں اس سے رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی مگر اس سے کسی کو ناقابل تبدیل پوزیشن حاصل نہیں ہوتی ہے۔ یہ سب کو موقعہ دیتی ہے کہ وہ جنگ جیتنے کے فوری معاملہ کے لئے اکٹھے ہو کر کام کریں اس سے آیندہ آئین کے بنیادی معاملات کو چھیڑتے وقت ان کی پوزیشن اور مطالبوں کو کوئی نقصان نہیں پہونچے گا۔......

موجودہ صورت حالات تو یہ ہے مستقبل کے لئے ہندوستان کو خود سوچنا چاہئے کہ کیا مفاہمت ہو سکتی ہے اور اپنے مسئلوں کا حل کیسے کیا جا سکتا ہے وہ ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے ہر مرحلہ کا حکومت کے رضاکارانہ تعاون پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

میں یقین کرتا ہوں کہ اس اثنا میں سیاسی میدان میں اختلاف ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے اس معاملہ میں وائسرائے کو امداد دینے کی خواہش کو دھندلا نہیں ہونے دیا جائے گا جو اسی طرح ان کا معاملہ ہے۔ جس طرح ہمارا ہے۔ میں پُرخلوص اُمید کے ساتھ لارڈ لنلتھگو کے پچھلے بیان کے آخری الفاظ پیش کرتا ہوں "اس عمل سے نیا رشتۂ اتحاد پیدا ہوگا اور اس طرح وہ راستہ پیدا ہو جائے گا جس پر چل کر ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ میں آزاد اور مساویانہ حصہ حاصل کرے جو تاج شاہی اور برطانوی پارلیمنٹ کا اعلان کردہ اور منظور شدہ مقصد ہے۔

۲۹ ستمبر کو عربک کالج دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس منعقد ہوا، ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن میں کچھ ترمیمات پیش ہوئیں لیکن واپس لے لی گئیں بعض ممبروں نے مسٹر جناح سے درخواست کی کہ ان کے اور وائسرائے کے مابین جو گفت و شنید ہوئی ہے اس میں سے جس قدر مناسب ہے کونسل کی آگاہی کے لئے بیان کی جائے، مسٹر جناح نے اطلاع دی کہ میں وائسرائے کی اجازت سے وہ تمام مراسلت شائع کر رہا ہوں جو میرے اور ان کے درمیان ہوئی کل صبح وہ اخبارات[۱] میں آجائے گی اور مناسب یہ ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد جب کونسل کے ممبر اس کو مطالعہ کر لیں تب جنگ کے متعلق ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن کی توثیق کی جائے۔ مگر ممبروں نے خواہش کی کہ آج ہی رزولیوشن تصدیق کے لئے پیش ہوں اور مسٹر جناح اس مراسلت و گفت و شنید کے متعلق بیان کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے منظور

---

[۱] یہ مراسلت سلسلہ وار درج ہو چکی ہے۔

کرکے تقریر شروع کی اور اس میں کہا کہ:-

ہندوستان میں چار پارٹیاں ہیں یعنی ہندو، مسلمان، والیانِ ملک اور گورنمنٹ برطانیہ انھوں نے کونسل کو متنبہ کیا کہ لفظ تعاون کو ان معنوں میں نہ لیا جائے کہ جب اسے ترک کیا جائے تو اس کے معنی عدم تعاون سمجھے جائیں انھوں نے فرمایا کہ یہاں تعاون اور عدم تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ہم اہتمام جنگ میں مدد ترک کردینگے۔ یہ ہمارے اچھی طرح ذہن نشیں ہے اور اب ہمیں مزید یقین دلانے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ اہتمام جنگ کو تقویت دینے کے لئے ہر کوشش کرنی چاہئے مگر جہاں ہمارے دل میں اس کی پوری طلب ہے کہ اہتمام جنگ میں ہم دل سے اور زیادہ سے زیادہ تعاون کریں ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے بعض باتوں کا ہونا بہت ضروری ہے، حکومت ہم سے یہ چاہتی ہے کہ ہم اپنے خون کا آخری قطرہ تک دیدیں اور اگر ضروری ہو تو آخری پیسہ بھی، یہ بہت بڑا عہد ہے، جہاں ایک مرتبہ ہم نے یہ اتحاد کیا تو پھر برطانیہ اور ہم ساتھ تیریں گے اور ساتھ ہی ڈوبیں گے، یہ اہتمام جنگ کے لئے ایک جنگی معاہدہ ہوگا جس کا مستقبل پر کوئی اثر نہ ہوگا، تمام بڑے مسائل اس وقت سامنے آئیں گے جب ان کے لئے مناسب وقت آئے گا، ہماری تجویز یہ تھی کہ مرکز اور صوبوں میں حقیقی اور دلی تعاون اختیار کے ساتھ کیا جائے، اکتوبر ۱۹۳۹ء سے گفت وشنید شروع ہوئی اور تقریباً ایک سال جاری رہی گورنمنٹ نے کہا کہ وہ مرکز میں اختیار کے ساتھ ہمیں شریک کرنے کے لئے تیار ہے اور بس، وہ یہاں رک گئی، صوبوں کے متعلق کیا ہوگا؟ گورنمنٹ کا جواب یہ ہی کہ اس منزل پر وہ صوبوں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی، ہم صوبوں میں اختیار اس وجہ سے چاہتے تھے کہ ان صوبوں میں جہاں گورنر مشیروں کی مدد سے کام کر رہے ہیں اہتمام جنگ کے لئے جست کریں، جب صوبوں میں غیر سرکاری اڈوائزر مقرر نہ کئے جائیں اور مسلمانوں کو اس میں معقول نمائندگی نہ دی جائے اُس وقت تک آپ پوری پوری تائید کیسے حاصل کرسکتے ہیں۔ جنگی مشاورتی کونسل ابھی تک محض تصور ہی میں ہے ہم اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ اس میں مسلم لیگ کو پانچ نشستیں دی گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں جو اہم باتیں قابل لحاظ ہیں ہم انھیں نہیں بھولے ہیں اس جنگ کی وجہ سے ہم بھی خطرہ میں ہیں اس لئے کوئی غیر ضروری مشکلات پیدا کرنا نہیں چاہتے جنگ کے معاملہ سے ہمارا گہرا تعلق ہے اور ہمارا مقدر برطانیہ کے ساتھ وابستہ ہے ان وجوہ سے ہم نے ایسے مطالبات پیش کئے ہیں جو کم سے کم ہو سکتے تھے مگر ہم انھیں اس سے زیادہ کم نہیں کر سکتے۔

مسٹر جناح نے ان لوگوں کے دلائل کا ذکر کرکے جو یہ چاہتے ہیں کہ وائسرائے کی پیشکش قبول کر لی جائے، فرمایا کہ وہ یہ کہتے ہیں جو کچھ دیا جا رہا ہے اس میں رفتہ رفتہ اور ترقی ہو گی اور اس سلسلہ میں میخ کی مثال پیش کرتے ہیں کہ نوک پر وہ ایک باریک ہوتی ہے، میں اس دلیل کو قبول نہیں کرتا میرا خیال ہے کہ نوک اتنی تیز ہونی چاہئے کہ وہ راستہ بنا سکے مگر اس پیشکش کی نوک کُند ہے جو ٹوٹ جائے گی۔

ہمیں یہ نہیں معلوم کہ وہ پارٹیاں کون ہیں جو واقعی آ رہی ہیں فرض کیجئے کہ کوئی ایسی پارٹی جو اس وقت نہیں آ رہی ہے بعد میں تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائے اور گورنمنٹ اس کو شریک کر لے پھر اس وقت کیا صورت ہو گی؟ میں اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ایسی پارٹی کے آنے کے خلاف نہیں ہوں مگر اس صورت میں غالباً کونسل کے ارکان کی تعداد بڑھا دی جائے گی پھر میری کیا حیثیت ہو گی؟ مسٹر جناح نے فرمایا کہ میں نے اس پر زور دیا کہ اگر دوسری پارٹی بعد میں شریک ہو تو اس کو ان پارٹیوں کی رضامندی سے شریک کیا جائے جو پہلے شریک ہو چکی ہوں مجھے اس بات کا قابل اطمینان جواب نہیں ملا۔

وائسرائے کی پیشکش کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کو گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں دو نشستیں ملیں گی اور پانچ وار کونسل میں، ہمیں نہیں معلوم کہ وائسرائے کی توسیع شدہ کونسل میں کتنی نشستیں ہوں گی ابتدا میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ وہ تقریباً گیارہ ہوں گی، یہ خود ایک مبہم بات تھی مگر بعد میں یہ بھی نہ رہا کہ وہ تقریباً گیارہ ہوں گی وائسرائے نے اپنے آخری خط میں یہ لکھا ہے کہ تعداد ابھی معین نہیں ہے بیشک اگر ہمیں صرف دو آدمیوں

کے لئے نوکری کی ضرورت ہوتی تو یہ بہت اچھی پیشکش تھی اور وہ دو آدمی تو بہت ہی خوش ہوتے جن کو یہ آسامیاں ملتیں مگر میں نے جس بات کے لئے کہا تھا وہ یہ تھی کہ مرکز اور صوبوں کی حکومت میں اختیار ملے، گورنمنٹ کی یہ پیشکش ایسی ہے جیسے ایک شخص دوسرے سے یہ کہے کہ تم میرے ساتھ تجارت میں شریک ہو جاؤ مگر مدد پوری یعنی برابر کی دینی ہوگی اور تمہارا حصہ روپے میں ایک پیسہ ہوگا۔ یہ فریب ہے اور مسلمانوں کی عظیم الشان قوم کے ساتھ مذاق ہے، اس کو ہم کیسے گوارا کر سکتے ہیں گورنمنٹ کے اس طرزِ عمل سے ہم صرف اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ گورنمنٹ کا مزاج اب بھی وہی ہے اور وہ ہمارے ساتھ وہ برتاؤ کرنا چاہتی ہے جو آقا اپنے خادم کے ساتھ کرتا ہے ہم یہ حیثیت گوارا نہیں کر سکتے۔

اس سوال کے جواب میں کہ مسلم لیگ نے پاکستان کے متعلق لاہور کے رزولیوشن کی تعمیل کے لئے کیا کیا۔

مسٹر جناح نے فرمایا کہ دورانِ جنگ میں تو پاکستان قائم نہیں ہو سکتا مگر مجھے پاکستان کی بڑی فکر ہے۔ مسٹر ایمری کی تقریر میری اور وائسرائے کی ملاقات ہی کا نتیجہ ہے، اس سلسلہ میں مسٹر جناح نے اس کا ذکر کیا کہ ڈاکٹر مونجے نے مطالبہ کیا تھا کہ گورنمنٹ پاکستان کی اسکیم کو مسترد کر دے اس پر وائسرائے نے یہ جواب دیا کہ جنگ کے بعد جب نمایندہ مجلس ہندوستان کے آیندہ دستور پر غور کرنے کے لئے بیٹھے گی تو پاکستان کی اسکیم بھی اور اسکیموں کے ساتھ پیش کی جاوے گی۔

ایک دوسرے سوال پر کہ آیا مسٹر جناح نے وائسرائے کے سامنے معین صورت میں گورنر جنرل کی کونسل کے اندر مسلمانوں کی نشستوں کے لئے تناسب کے اعتبار سے مطالبہ کیا یا نہیں۔

مسٹر جناح نے اپنی اس یادداشت کے ایک حصہ کو پڑھ کر سنایا جو انھوں نے وائسرائے کو بھیجی تھی اس میں یہ تھا کہ اگر کانگریس بھی گورنر جنرل کی کونسل میں شرکت کرے گی تو مسلمانوں کو پچاس فیصدی نشستیں دی جائیں گی اور اگر شریک نہ ہوگی تو مسلمانوں کی

اکثریت ہونی چاہئے کیونکہ اس صورت میں تمام ذمہ داری مسلمانوں ہی پر ہوگی۔

مسٹر جناح کی تقریر کے بعد ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ رزولیوشن جو ۲۰ر ستمبر ۱۹۴۰ء کو پاس ہوا تھا باقاعدہ پیش ہوا مسٹر جناح نے اس کا موقعہ دیا کہ ارکانِ کونسل اس پر بحث کریں مگر کونسل نے اس کی ضرورت نہ سمجھی اور بالآخر باتفاق رائے منظور رہوا۔

رزولیوشن

ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس بمبئی منعقدہ ۲ر ستمبر ۱۹۴۰ء میں ہزایکسیلنسی وائسرائے کے خط مورخہ ۱۴ر اگست ۱۹۴۰ء پر غور کرنے کے بعد جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں مجوزہ توسیع کے متعلق معین صورت میں اور وار ایڈوائزری کونسل کے قیام کے متعلق پیشکش پر مشتمل تھا ہزایکسیلنسی وائسرائے سے درخواست کی کہ وہ اس پیشکش پر دوبارہ غور کریں اور صدر آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ اختیار دیا تھا کہ اس سے قبل کہ کمیٹی اس پیشکش کے متعلق کوئی فیصلہ کرے وہ ان مسائل کے متعلق مزید معلومات اور تشریح حاصل کریں جو بمبئی کے رزولیوشنوں میں درج ہیں یہ رزولیوشن جب وائسرائے کو بھیجے گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزایکسیلنسی وائسرائے نے صدر مسلم لیگ کو یہ دعوت دی کہ وہ ان سے ۲۴ر ستمبر کو ملیں اس کے باوجود کہ کمیٹی کی ابتداء سے یہ خواہش ہے کہ اہتمام جنگ اور ہندوستان کے تحفظ میں پوری مدد کی جائے تمام معاملہ پر غور کرنے کے بعد کمیٹی کو افسوس ہے کہ وہ موجودہ پیشکش کو مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر قبول نہیں کر سکتی۔

۱۔ یہ کہ ایگزیکٹو کونسل کی مجوزہ توسیع میں دو ممبروں کے اضافہ سے اور وہ اس صورت میں کہ ممبروں کی مجموعی تعداد اور اضافی ممبروں کی تعداد کا قطعی تعین نہیں کیا گیا ہے مرکزی گورنمنٹ میں نہ حقیقی حصہ ملتا ہے اور نہ معقول۔

۲۔ اس پیشکش میں اس کا اظہار نہیں کیا گیا ہے کہ اگر آئندہ کسی منزل پر کسی دوسری پارٹی نے بھی اہتمام جنگ میں شرکت کرنے کا فیصلہ کر لیا اور گورنمنٹ اس کو ایگزیکٹو کونسل میں شریک کرنے پر رضامند ہو گئی جس سے ایگزیکٹو کونسل میں بہت تغیر و تبدل ہو جائیگا

تو اس صورت میں مسلم لیگ کی حیثیت کیا ہوگی۔

گورنمنٹ ابھی ان صوبوں میں جہاں زیر دفعہ ۹۳ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء گورنروں کی حکومت سے غیر سرکاری مشیر مقرر کرنا نہیں چاہتی مسلم لیگ یہ محسوس کرتی ہے کہ ان صوبوں کے انتظام میں بغیر مسلم لیگ کے نمائندوں کی شرکت کے وہ مسلمانوں کا حقیقی اور موثر تعاون حاصل نہیں کر سکے گی۔

۴۔ یہ کہ مجوزہ جنگی مشاورتی کونسل ابھی محض تصور ہی میں ہے اور اس کے آئین و تشکیل اور عمل کے متعلق کوئی معلومات اس کے سوا حاصل نہیں کہ وہ ۲۰ ممبروں پر مشتمل ہوگی اور اس کے قیام کے مسئلہ پر ایگزیکٹو کونسل کی توسیع کے بعد غور کیا جائے گا۔

۵۔ یہ کہ ۲ستمبر کے رزولیوشن میں جو نکات پیش کئے گئے تھے ان میں سے صرف ایک نامزدگی کے متعلق پورا کیا گیا ہے"۔

اس رزولیوشن کے بعد ایک رزولیوشن یہ منظور ہوا کہ:-

ہندوستان میں متواتر جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان سے یہ معلوم ہوا ہے کہ غالباً جنگ کے شعلے اسلامی ممالک تک پہنچنے والے ہیں اور مصر، فلسطین، شام اور ٹرکی کے خلاف خصوصیت سے حملہ کا اندیشہ ہے لہذا ایک دن منایا جائے گا جس میں ان مسلم ممالک کے متعلق مسلمان اپنے جذبات کا اور فکرمندی کا اظہار کریں اور ان کو جو ان ملکوں کی آزادی پر دست درازی کرنا چاہتے ہیں متنبہ کر دیں کہ اگر اسلامی ممالک پر حملہ کیا گیا تو ہندوستان کے مسلمان ان اسلامی ممالک کی تائید پر مجبور ہوں گے۔

اسی سلسلہ میں دوسرا رزولیوشن نیشنل گارڈ کے ساتھ ہلال احمر کی تنظیم کے متعلق پاس ہوا تاکہ خارجی حملہ کے موقع پر زخمیوں کو طبی امداد پہنچائی جائے۔

۱۵ستمبر کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا بھی اجلاس ہوا جس میں گاندھی جی بھی شریک ہوئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک طویل رزولیوشن پیش کیا جس کا مفاد یہ تھا کہ گاندھی جی کی قیادت کو بھی قربان کرنے کے بعد ہم نے برطانوی حکومت کو جو پیشکش کی اس کو ایسے طریقہ سے نامنظور کر دیا کہ جس سے کوئی شبہ نہیں رہتا کہ وہ ہندوستان کی

آزادی کو تسلیم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی، کانگریس کمیٹی اس پالیسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کر سکتی جو ہندوستان کے حق آزادی سے انکار کرے اور جو رائے عامہ کے آزادانہ اظہار کو دبائے۔

کانگریس گاندھی جی کی قیادت میں عدم تشدد کی پابند ہے اور ان سے درخواست کرتی ہے کہ جو عمل اختیار کیا جانے والا ہے اس میں رہنمائی کریں،

اس کے بعد رزولیوشن میں برطانوی عوام اور دیگر ملکوں کے باشندوں سے ہمدردی کا اظہار اور برطانوی قوم کی بہادری کی تعریف کر کے یقین دلایا گیا کہ کانگریس ان میں برطانوی عوام کی بدخواہی نہیں ہو سکتی اور ایسا قدم اٹھانے سے منع کرتی ہے جس سے اہل برطانیہ کو پریشانی ہو لیکن

اس پابندی سے یہ مطلب نہیں کہ کانگریس اپنی ہستی کو ہی فنا کر دے اور وہ اپنی پالیسی پر جو عدم تشدد پر مبنی ہو آخری درجہ تک کاربند رہنے پر مصر رہے گی مگر اس وقت کوئی ارادہ نہیں کہ اگر پُرامن مدافعت ضروری ہو جائے تو اسے عوام کی آزادی کے تحفظ سے آگے بڑھایا جائے۔

پھر کانگریس کی عدم تشدد کی پالیسی کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں اُن کی نسبت واضح کیا کہ "وہ نہ صرف سوراج کی جد وجہد کے لئے بلکہ جہاں تک اس کا اطلاق آزاد ہندوستان میں ممکن ہو اس پر پورا پورا اعتماد رکھتی ہے"

اسی سلسلہ میں یہ ادعا بھی کیا گیا کہ "آزاد ہندوستان اپنے رسوخ کو استعمال کر کے تمام دُنیا کو غیر مُسلح کرائے گا اور یہ رہنمائی لازمی طور سے بیرونی اور اندرونی معاملات پر منحصر ہو گی لیکن ہندوستانی مملکت اس پالیسی کو موثر بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کریگی"

اس رزولیوشن پر متعدد ترمیمیں پیش ہوئیں لیکن کچھ واپس اور کچھ خارج ہو گئیں آخر میں گاندھی جی نے اعلان کیا کہ:۔

ہم ایک ایسی سلطنت سے جنگ کریں گے جو تشدد پر یقین رکھتی ہے۔ جہاں تک سول نافرمانی کا تعلق ہے مجھ پر چھوڑ دو۔ میں جانتا ہوں کہ سول نافرمانی

کب شروع کی جانی چاہئے۔ میں نے گزشتہ بیس سال سوراج کی تشریح کی کوشش کی مگر آج اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سوراج کا مطلب آزادی رائے ہے یعنی ہم جو محسوس کریں اس کو کھلے بندوں کہہ سکیں اس رزولیوشن میں اس اصول کو مدنظر رکھا گیا ہے ..... برطانیہ محض اس لئے ہماری آزادی نہیں چھین سکتا کہ اس کی آزادی خطرہ میں ہے۔

جمعیت العلمأ نے بھی اپنے اجلاس مجلس عاملہ میں کانگریس کی متابعت میں اسی قسم کا رزولیوشن پاس کر دیا۔ کانگریس کمیٹی کے اس رزولیوشن پر یوں تو بہت سے تبصرے ہوئے لیکن سب سے وقیع تبصرہ مسٹر ایم این رائے کا ہوا جو نہایت قدیم کانگریسی اور سوشیلسٹ گروہ کے لیڈر رہیں انھوں نے کہا کہ :-

"کانگریس کے تازہ رزولیوشن سے رسیاستدانی کا نشان ملتا ہے اور نہ وطن پرستی کا کوئی ثبوت، وہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ اس طرح ہر وا جب موقع پر اڑ بیٹھنے سے آزادی ان کو ایک تحفہ کی طرح ہرگز پیش نہ ہوگی وہ لوگ ایک آسان راہ اختیار کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔"

مسٹر رائے نے جو سخت نکتہ چینی کانگریس پر کی اور پھر جو امداد جنگ میں غیر مشروط شرکت کی ترغیب دلائی اس کی بنا پر ان سے پراونشل کانگریس کمیٹی نے جس کے صدر پنڈت نہرو ہیں جواب طلب کیا اور بالآخر وہ کانگریس سے خارج کئے گئے کیوں کہ انھوں نے جو کچھ محسوس کیا اس کو کھلے بندوں کہہ دیا، جو صرف برطانیہ کے خلاف کانگریس کا ہی مزعومہ حق ہے۔

اس سلسلہ میں مسٹر رائے نے صدر کانگریس کے نام ایک خط بھیجا جو تاریخ کانگریس میں ہی دلچسپ اور معنی خیز نظر نہ آئے گا بلکہ مسلمانوں کے لئے بھی ایک بصیرت رہے گا۔ اس خط میں انھوں نے لکھا کہ :-

میرے خلاف جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ یک طرفہ نامناسب اور غیر منصفانہ ہے ہماری جماعت کے مستقبل کی خاطر ہی اس کی اصلاح ہونی چاہئے اگر ایسا نہیں کیا گیا تو میرے لئے تو اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں رہے گا کہ کانگریس کی مجری

سے مستعفی ہو جاؤں میرے خلاف جو الزام لگایا گیا ہے اس سے ہی یہ ثابت ہو کہ میں نے بہت سے دیگر اعلیٰ کانگریسیوں سے بُرا کام نہیں کیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ انھوں نے لین دین کے طور پر حکومت سے تعاون کا سودا کرنا چاہا تھا۔ اور میں نے فاسسزم کے خلاف جنگ میں غیر مشروط شرکت وامداد کی تلقین کی۔ میں نے کانگریس کے لئے ایک پالیسی پیش کی ہے اور ہر جمہوری جماعت کے ممبر کو ایسا کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ کیا یہ عجیب وغریب بات نہیں کہ کانگریسی لیڈر اپنے لئے جس آزادیٔ تقریر کا حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں اس آزادیٔ تقریر کا حق عام کانگریسیوں کو نہیں دینا چاہتے۔

میرے خلاف یہ اقدام اس وجہ سے عمل میں لایا گیا ہے کہ میں گاندھی جی کے فلسفہ کو اعلیٰ سیاسی دانشمندی نہیں تسلیم کرتا۔ گاندھی ازم سے میری مخالفت کوئی نئی چیز نہیں۔ میں نے براہ راست کانگریس میں شرکت ہی اس اعلان کے ساتھ کی تھی کہ کانگریس کو مفلوج ومعطل کرنے والے گاندھزم کے اثر سے آزاد کراؤں۔ میری سیاسی زندگی اُس وقت سے شروع ہو چکی ہے جبکہ گاندھی کی کانگریس پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ نہ ان لیڈروں کی سیاسی اعتبار سے پیدائش ہی ہوئی تھی جو آج میری حب وطن اور جذبۂ آزادی پر حرف گیری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر میں مسٹر رائے لکھتے ہیں کہ میں امکان بھر کوشش کروں گا کہ وہ بیداری پیدا کروں جو ہندوستانیوں کو کانگریس کی شرمناک روش سے نجات دلائے۔ اگر کانگریسی رہتے ہوئے میں ایسا نہ کر سکا تو اس ہندوستانی کی حیثیت سے ایسا کرونگا جس کے شوق آزادی کو دھونسایا نہیں جا سکتا۔

۱۸ ستمبر کو گاندھی جی نے وائسرائے کو ملاقات کے لئے خط لکھا تا کہ کانگریس کمیٹی کے تازہ رزولیوشن (۱۵ ستمبر) کی صورت میں جو روشنی پیدا ہوئی ہے اس میں تبادلہ خیال کریں ساتھ ہی ملاقات کی بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے یہ یقین بھی دلایا کہ اسی سلسلہ میں بھی بے چینی ہے کہ کسی نہج سے جنگ کے کام میں ملک معظم کی حکومت کو ستانے والی بات نہ ہو، چنانچہ

۲۷، و ۳۰ ستمبر کو یہ پُر شوق ملاقات ہوئی اس ملاقات کے متعلق گاندھی جی نے جو بیان ۵ اکتوبر کو دیا اس میں کہا کہ :-

میں نے وائسرائے کو سمجھایا کہ والیانِ ملک مسلم لیگ، اور اچھوت، یہ تینوں جماعتی یا فرقہ وارانہ مفاد کی نمایندگی کرتے ہیں۔ کانگریس کسی مخصوص جماعت کی نمایندگی نہیں کرتی۔ بلکہ وہ ایک قومی تنظیم ہے، نیز کانگریس کے اعلانات وغیرہ پر توجہ دلا کر کہا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ کانگریس کے مقابلہ پر مسلمانوں کے تحفظِ حقوق کی ضرورت ہے اور یہ کہ والیانِ ریاست برطانوی حکومت کے پیداوار ہیں۔

کانگریس اچھوتوں کا خاص خیال رکھتی ہے اور برطانوی حکومت کی نسبت ان کے حقوق کی زیادہ نگہبان ہے اچھوت جماعتیں بھی اعلیٰ ذات ہندوؤں کی طرح منقسم ہیں کسی بھی ایک اچھوت جماعت کا کوئی ممبر اپنی بے شمار ذاتوں کی نمایندگی کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔

اس وقت آزادی فوری مسئلہ نہیں ہے بلکہ فوری مسئلہ آزادئ تقریر کا ہے کانگریس کا یہ مطالبہ صرف اپنے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے ہے صرف مکمل عدم تشدد کی شرط لازمی ہے،

مگر وائسرائے نے اس ملاقات کے بعد ہی بطور نتیجۂ گفتگو جو خط لکھا، اس میں صاف صاف طور سے بتا دیا کہ :-

> آپ نے جو عمل تجویز کیا ہے وہ نہ صرف ہندوستان میں جنگ کی کوشش میں سدِ راہ ثابت ہوگا بلکہ اس سے برطانوی حکومت کو جنگ جاری رکھنے میں پریشانی ہوگی جس کو کانگریس نہیں چاہتی اور واضح طور پر یہ خود ہندوستان کے مفاد میں اور سب سے زیادہ خاص طور سے جنگ کے اس نازک مرحلہ میں ممکن نہ ہوگا کہ کوششوں میں ایسی مداخلت کی اجازت دی جائے جو اس وسیع آزادی تقریر میں مضمر ہوگی جس کا مطالبہ آپ نے کیا ہے۔

اس صاف جواب سے بقول خود گاندھی جی کے سامنے تاریکی چھا گئی اور اندھیرا ہی اندھیرا ہوگیا، اور وہ بے اختیار کہہ اٹھے کہ کانگریس کو اب مرنا ہے تو اپنے عقیدہ کا اعلان

کرتے ہوئے مرنا چاہئے، یہ بہت ہی افسوس ناک بات ہے کہ صرف مسئلۂ آزادی تقریر پر بھی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔

اس ملاقات سے کچھ پہلے ڈاکٹر امبیدکر مشہور اچھوت لیڈر نے اس شوق ملاقات پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:-

اس نازک وقت میں جبکہ جنگ ایک اہم حیثیت میں ہے گاندھی جی کا وائسرائے کے پاس یہ اجازت طلب کرنے کے لئے جانا کہ ہمیں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کو توڑنے کی اجازت دیدی جائے نہایت ہی دلچسپ اور مضحکہ انگیز ہے اور خاص طور پر اس حال میں جبکہ گورنمنٹ کو تنگ کرنا بھی مقصود نہیں ہے اور عام سول نافرمانی کی نیت بھی نہیں ہے اور نازی حکومت سے ہمدردی بھی نہیں ہے اور انگلستان کی تباہی کے تصور سے طبیعت بھی پریشان ہے ....

گاندھی جی تو ایک سیاسی لیڈر ہیں لیکن ان سے کم سمجھ رکھنے والا انسان بھی یہ مضحکہ انگیز حرکت نہیں کر سکتا۔ لیکن دراصل مقصد یہ نہیں ہے کہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کو توڑنے کی اجازت طلب کی جائے بلکہ رازِ درونِ پردہ "یہ ہے کہ گاندھی جی کی یہ" یاترا صرف اس لئے ہے کہ وائسرائے سے یہ کہا جائے کہ آپ کانگریس کو کچھ دیں یا نہ دیں لیکن اگر آپ نے اختیارات غیر کانگریسی پارٹیوں کے حوالے کئے تو کانگریس سول نافرمانی شروع کر دے گی"۔

اس راز کو بے نقاب کرنے کے بعد ڈاکٹر امبیدکر کہتے ہیں کہ "میری رائے میں سول نافرمانی کا چرچا درحقیقت برطانوی حکومت اور اقلیتوں کے لئے ایک طرح کی دھمکی ہے"۔

اس ضمن میں ایک لبرل لیڈر سر چمن لال سیتلواڈ کا حسب ذیل بیان بھی بہت دلچسپ ہے جو انھوں نے ۷ اکتوبر کو شائع کرایا۔

اگر کانگریس مکمل آزادی یا مرکز میں ذمہ دار حکومت کے مطالبہ پر قایم رہتی تو بہتر ہوتا۔ لیکن جنگ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کی آزادی کا مطالبہ کرنا یہ سمجھنے کے باوجود کہ اس قسم کے پروپیگنڈا سے جنگ کو کامیاب بنانے کی مساعی کو نقصان پہنچے گا اور دشمن کو قوت پہنچے گی۔

یقینی طور پر نہایت افسوسناک ہے۔ ....

وائسرائے سے ہم آخری ملاقات کے بعد گاندھی جی نے وائسرائے کے نام جو خط ارسال کیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ کانگریس نازیوں کی فتح کی اتنی ہی مخالف ہے جتنا کوئی برطانوی ہو سکتا ہے۔ لیکن کانگریس اپنے مسلک عدم تشدد کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی۔ نیز یہ کہ کانگریس اس سے اس درجہ پیوست ہے کہ کانگریس اپنے مسلک کے اعلان کی راہ میں مرجانا قبول کرے گی۔ لیکن اس سے منحرف نہیں ہو سکتی۔ مگر جب جنگ شروع ہوتے ہی گاندھی جی نے یہ اعلان کیا تھا کہ جنگ کو کامیاب بنانے کے لئے ہندوستان غیر مشروط طور پر برطانیہ کی امداد کرے جس کے معنی یہ تھے کہ جنگ میں ہندوستان بھی شامل ہو جائے۔ اس وقت کیا گاندھی جی تھوڑی دیر کے لئے اپنے مسلک کو بھول چکے تھے۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اکثر کانگریسی افراد سچائی اور ایمانداری کے ساتھ عدم تشدد کے معتقد ہیں۔ خود گاندھی جی کہہ چکے ہیں کہ میرے لئے عدم تشدد ایک متبرک مسلک ہے۔ لیکن بہت سے کانگریسی اس پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ پونا کے رزولیوشن کو منظور کر کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے کھلے بندوں اس کا اعلان کر دیا تھا کہ اگر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے اور مرکز میں ذمہ دار حکومت قائم کر دی جائے تو جنگ کو کامیاب بنانے میں کانگریس برطانیہ کی ہر ممکن امداد کرے گی۔ اگر یہ شرائط مان لی جاتیں تو کانگریس کا مسلک عدم تشدد رکھا ہی رہ جاتا۔ اور وہ جنگ میں شرکت کر لیتی۔ یہ پوزیشن اتنی واضح طور پر پیش کی گئی تھی کہ خود گاندھی جی کو یہ اعلان کرنا پڑا تھا کہ اب میں کانگریس کی لیڈری نہیں کر سکتا۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے گاندھی جی سے جدائی کر لی تھی۔

لوگ ابھی تک اس حقیقت کو نہیں بھولے ہیں کہ مختلف صوبوں میں کانگریسی حکومتیں کس طرح آزادئ تقریر کچلتی رہی تھیں۔ بمبئی میں تو دفعہ ۱۴۴ کے احکام نافذ کر کے اخباروں کے لئے ممانعت کر دی گئی تھی کہ کانگریسی حکومت کی انسداد مسکرات اور ٹیکس املاک کی پالیسی پر نکتہ چینی نہ کریں۔ لوگوں پر جب کانگریسی حکومتوں نے گولیاں برسائیں اس وقت عدم تشدد کا مسلک زمین میں گہرا دفن کر دیا گیا تھا۔ اس وقت مدراس کے کانگریسی وزیر اعظم مسٹر راجگوپال آچاریہ نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا تھا کہ باہر والوں نے میرے صوبہ میں گڑبڑ کی تو میں ان کے خلاف طاقت استعمال کروں گا۔ اس لئے لوگوں کو تعجب ہے کہ کانگریس ایک طرف تو یہ کہتی ہے کہ وہ نازیوں کے جیتنے کی اتنی ہی مخالف ہے۔ جتنا کوئی برطانوی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جنگ کے خلاف پروپیگنڈہ کی آزادی بھی طلب کرتی ہے۔

باب ہنیر دہم

حکومت اور سیاسی لیڈروں کے مابین مذاکرات بند ہونے کے بعد گاندھی جی نے انفرادی سول نافرمانی کی مہم کا آغاز کیا۔

پہلے ان آدمیوں کی ایک خاص فہرست تیار کی گئی جو جنگ کے خلاف تقریر کریں یا کم از کم نعرے لگائیں یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ حکام ضلع کو ماقبل اطلاع دیدی جایا کرے۔ چنانچہ ۱۷ اکتوبر کو گاندھی آشرم کے ایک کارکن ونوبا بھاوے نے اس مہم کی ابتدا کی جس کو تین تقریروں کے بعد گرفتار کر کے سزا دی گئی پھر ایک اور شخص روانہ ہوا جو چند فرلانگ کے بعد ہی گرفتار ہو کر سزایاب ہوا اور اس کے بعد ہی گاندھی جی کی خاص منظوری سے مختلف صوبوں میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی اسمبلیوں کے ممبروں سے لے کر خاص خاص افراد کو اجازت دیدی گئی تقریروں، اور نعروں، گرفتاریوں، اور سزاؤں کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا بعض جگہ مظاہروں میں تشدد رونما ہوا بعض مضحکہ خیز واقعات بھی پیش ہوئے لاہور کے سردار سمپورنانند نے مجسٹریٹ کے سامنے اپنے بیان میں کہا کہ انکا از تکاب محض پارٹی ڈسپلن کی مجبوری سے تھا اس لئے ان کو ایک آنہ جرمانہ کی (جو مجسٹریٹ نے خود ادا کیا) اور تابرخاست عدالت قید کی سزا ہوئی اس اظہار صداقت کی بنا پر ان کو کانگریس سے نکالدیا گیا کیوں کہ گاندھی جی کے نزدیک صرف اہنسا پر ہی یقین رکھنا صداقت ہے۔

سردار جی پھر معذرت کے لئے واردھا تک گئے، اور انھوں نے یہ بھی جتا دیا کہ پنجاب میں اہنسا کو ڈسپلن کی ایک چیز سمجھنے کے علاوہ کوئی اس پر اعتقاد نہیں رکھتا مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ پشاور میں ڈاکٹر خاں اور ان کے ایک رفیق کو نعرے لگانے کے بعد پولس نے موٹر میں بٹھا کر اور گھما کر چھوڑ دیا۔ مسز سروجنی نائڈو جیل میں بیمار ہو گئیں اس لئے ان کو رہا کر دیا گیا مگر وہ آرام کرنے کی جگہ براہ راست واردھا گئیں اور گاندھی جی

سے تخلیہ کی ملاقات کی۔

اسی دَوران میں مختلف اطراف سے سیاسی جمود کو توڑنے اور صلح و اتحاد کی تحریکیں بھی پیش ہوئیں اور مختلف بیانات شائع ہوتے رہے، پنڈت مالویہ جنھوں نے بار دو لی میں سول نافرمانی ختم کرائی تھی اب پھر سرگرم عمل ہوئے، وزیر ہند اور وائسرائے کی پے در پے تقریریں بھی ہوئیں۔ ان سب کی رگڑ سے ایک شعلہ بلند ہوا اور اس کی روشنی میں گاندھی جی کو کچھ نظر آیا اور انھوں نے ۲۳ دسمبر سے ۵ جنوری تک سول نافرمانی کی مہم ملتوی کر دی۔[۵]

نومبر میں پنڈت جواہر لال نہرو کو ضلع گورکھپور میں چند تقریروں کے جرم میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت چار سال کی سزا ہوئی جس سے اس مہم کو اور تقویت پہونچی۔ لیکن اس سول نافرمانی کے لئے آزادیٔ تقریر کا مطالبہ تو صرف ایک حیلہ تھا ورنہ مقصد اصلی تو اور ہی تھا جس کو مسٹر جناح نے ۳۰ نومبر کو عربک کالج کی یونین میں تقریر کرتے ہوئے ظاہر کیا۔ انھوں نے پہلے گاندھی جی کے مضمون کی طرف توجہ دلائی جس میں شمال اور مشرق سے پنجابیوں اور گورکھوں کا آکر ہندوستان کو تاخت و تاراج کر دینے کے خطرہ اور برطانوی سیادت کے استقلال کی خواہش ظاہر کی گئی ہے پھر انھوں نے بتایا کہ:-

"یہ صرف حکومت برطانیہ کو اس بات پر مجبور کرنے کے لئے کی جا رہی ہے کہ وہ کانگریس کو ہندوستانیوں کی واحد نمایندہ اور مستند جماعت تسلیم کر لے۔ اخبارات میں شائع ہوا ہے کہ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے گاندھی جی سے ملاقات کے بعد مسلمانوں اور دوسرے غیر کانگریسیوں سے اپیل کی ہے کہ ہماری راہ میں رکاوٹیں نہ ڈالیں، کانگریس کو اس کے طریقہ پر لڑنے دو۔ میں کانگریس ہائی کمانڈ سے جس کے ایک ممبر مسٹر ڈیسائی بھی ہیں اور جو اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر بھی ہیں پوچھتا ہوں کہ ان کی اس جنگ کا کیا مقصد ہے جو وہ حکومت برطانیہ کے خلاف کر رہے ہیں۔

ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ کانگریس کے مقاصد جنگ یہ ہیں کہ حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈالیں

---

[۵] عجب اتفاق ہے کہ دسمبر میں ہی اٹلی کے پوپ نے یورپ کی متحارب طاقتوں سے مذہب کے نام پر اپیل کی کہ وہ ہفتہ کرسمس میں احتراماً لڑائی بند کر دیں۔ جو غیر موثر رہی۔

اور اسے مجبور کریں تاکہ وہ ہمیں دبائے اور مجبور کرے۔ نظرانداز کرے اور بھیڑیوں کے سامنے ڈالدے۔ یہ ہے کانگریس کا مقصد جنگ میں ان سے کہتا ہوں کہ یہ شتر مرغ کی روش کیوں اختیار کررہے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم دھوکے میں آجائیں کانگریس کی ساری جدوجہد ایسی ہے جیسے چمگادڑ کسی کمرے میں گھس جائے اور کبھی اس دیوار سے ٹکرائے اور کبھی اس دیوار سے ٹکرائے چمگادڑ کو یہ بھی نظر نہیں آتا کہ دروازہ کھلا ہے اور باہر نکلنے کا راستہ وہی کانگریس کی پالیسی بالکل ایسی ہی ہے اس وجہ سے ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اس تحریک کو سکونِ خاطر کے ساتھ دیکھتے رہیں ہمیں اس پر سخت پریشانی ہونی چاہئے۔

میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ مہربانی کرکے اس ہولناک صورتِ حال میں آپ ہرگز مبتلا نہ ہوں جس کے پیدا ہونے کی باعث کانگریس ہے لیکن اگر ہم نے کسی وقت یہ دیکھا کہ ہمارے مقاصد خطرے میں ہیں تو پھر یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم تماشائی کی طرح دیکھتے ہی رہیں بلکہ پھر وہی کریں گے جو ہمیں کرنا چاہئے اور ضرورت ہوئی تو دخل بھی دیں گے انھیں یہ ملحوظ رکھنا چاہئے۔"

اس تقریر کے شائع ہونے کے بعد مسٹر ستیا مورتی نے بھی ایک جوابی بیان شائع کیا اور اس میں کہا کہ :-

"کم از کم ۱۹۲۰ء سے کانگریس کا مقصد آزادی حاصل کرنا ہے..... کانگریس نے انتہائی جمہوری نوعیت کی کانسٹیٹیونٹ اسمبلی کا مطالبہ کیا اقلیتوں کے پورے حقوق اس کے ساتھ مشروط ہوں گے۔"

لیکن یہ جمہوری نوعیت کی اسمبلی اور حقوق مشروط کی مہربانی ہی تو مسلمانوں نے اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ تصور کیا ہے۔

علاوہ بریں مسٹر ستیا مورتی نے یوں تو اپنے بیان میں بہت کچھ کھسیانے پن کی باتیں کیں۔ لیکن گاندھی جی کی خواہش سیادتِ برطانیہ اور ان کے پنجابی گورکھے خطرہ کی تردید میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

مسٹر جناح نے جس خیال کو ظاہر کیا ہے وہی خیال خود ہندوؤں کے ان فرقوں

کے دماغوں میں بھی موجود ہے جو اونچی ذات اور برہمنی مظالم کے صدیوں سے نشانہ ہیں اور اب بھی باوجود تمام دعاوی کے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاتا۔

چنانچہ مدراس کی جسٹس پارٹی کے لیڈر مسٹر وی، وی راما سوامی آینگر نے ۱۰ر دسمبر کو ایک پبلک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"مسلمانوں، غیر برہمنوں اور آبادی کے دوسرے بڑے بڑے طبقوں کو کانگریس پر اعتماد نہیں ہے کیوں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کانگریس صرف سرمایہ میں لگانے کے لئے ان کی شرکت چاہتی ہے نفع کو تسلیم کرنا نہیں چاہتی۔

برطانیہ نے جنگ کے بعد درجہ نوآبادیات دینے وعدہ کیا ہے اگر کانگریس تمام اہم گروپوں کے ساتھ سمجھوتہ کرلے تو متحدہ محاذ پیش کیا جاسکتا ہے مگر کانگریس بھٹک رہی ہے اور مسٹر جناح نے یہ ٹھیک کہا ہے کہ ستیا گرہ تحریک کا مقصد یہ ہے کہ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ دوسری پارٹیوں کی رائے کو نظر انداز کردے۔"

کانگریس کے اندر گاندھی جی اور ہائی کمانڈ یعنی ورکنگ کمیٹی کی فسطائیت نے زبردست تفرقہ پیدا کردیا، مسٹر سوبھاش چندر بوس کو جو اخراج کی تادیبی سزادی گئی اس نے کانگریس کے کثیر ممبروں کو بغاوت پر آمادہ کیا اور ایک فارورڈ بلاک بن گیا اس کے بعد ان کے بھائی بابو سرت چندر بوس کی باری آئی ان پر بنگال کانگریس اسمبلی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے کانگریس ہائی کمانڈ اور کانگریس پارلیمنٹری کمیٹی کے احکام کی خلاف ورزی اور بدعنوانیوں کے الزامات قائم کئے گئے اور اکتوبر میں ان کو کانگریس اسمبلی پارٹی سے خارج کیا گیا اس سے قبل بدعنوانیوں کے قصور میں بنگالی صوبہ کانگریس کمیٹی معطل کی جا چکی تھی۔

اسی اثناء میں صدر کانگریس مولانا آزاد نے اپنے مکان پر بعض ممبروں کے معاملات درونیہ پر غور کرنے کے لئے ایک جلسہ منعقد کیا جو عین وقت پر ملتوی کردیا گیا مگر متعدد ممبر وقتِ معینہ پر پہونچے اور باوجود ممانعت کے صدر کے کمرہ میں ہی انھوں نے اجلاس کیا اور سرت چندر بوس کو پھر پارٹی لیڈر منتخب کرلیا، اب صدر نے ان ممبروں سے جواب طلب کرکے سب کو بنگال کانگریس اسمبلی پارٹی سے اخراج کا حکم دیا مگر انھوں نے تعمیل حکم

سے انکار کر دیا اس قضیہ میں سوبھاش بابو کے متعدد بیانات شائع ہوئے جن میں یہ آخری
بیان بھی تھا کہ :-

کانگریس کے مغل اعظم بڑی تیزی سے مضحکہ خیز حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں وہ
اس خبط میں مبتلا ہیں کہ بال گنج سرکلر روڈ میں اپنے کمرے سے تادیبی برق رفتار کارروائیوں
کی بارش کر کے وہ تمام بنگال پر حکومت کر سکتے ہیں اس سے ان کا کیا تعلق کہ وہ جو کچھ کر رہے
ہیں وہ کانگریس کے دستور اور آئین کے تحت بھی ہے یا نہیں اس سے بھی ان کا کیا واسطہ
کہ اپنی قلمی حیثیتوں کی بدولت وہ جلد ہی تمام پبلک کو کانگریس سے خارج کر رہے ہیں وہ
مجھے ان مغل سلاطین کی یاد دلاتے ہیں جو یہ دیکھ کر کہ ان کے گرد شان و حشمت کے مناظر
باقی تھے یہ سمجھتے نہ تھے کہ زمین قدموں سے کھسک چکی ہے اور سلطنت دوسرے کے
ہاتھوں میں چلی گئی ہے میں حیرت میں ہوں کہ ہمارے مولانا کی عقل کون بحال کر سکتا ہے
ورکنگ کمیٹی نے اپنے تمام اختیارات گاندھی جی کو دیدئے ہیں اور اس کے اکثر ممبران
جیل گئے ہیں اس لئے مولانا آزاد کے ہاتھوں میں تو کوئی اختیار باقی ہی نہیں رہا لیکن
فرانس کے شہنشاہ کی طرح اس خیال پر جمے ہوئے ہیں "کہ میں ہی حکومت ہوں" اگر آج کوئی
شخص انفرادی حیثیت میں کانگریس کے نام پر بولنے کا اختیار رکھتا ہے تو صرف گاندھی جی
ہیں مولانا ابوالکلام آزاد نہیں - اگر ورکنگ کمیٹی کام بھی کرتی ہوتی تو بھی نہ تو صدر کو تادیبی
کارروائی عمل میں لانے کا اختیار تھا اور نہ آل انڈیا پارلیمنٹری کمیٹی کو، جب کبھی تادیبی
کارروائی کی جاتی ہوتی تھی تو ورکنگ کمیٹی ہی اجلاس کر کے فیصلہ کرتی تھی - اگر مولانا کو اس
کے متعلق کوئی شبہ ہو تو میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے اس ریزولیوشن
کو دیکھیں جس کی رُو سے پارلیمنٹری سب کمیٹی مقرر کی گئی ہے ""

نومبر میں ضمنی فنانس بل پر کانگریسی ممبروں نے نہایت منطقیانہ، فلسفیانہ، اور رنگینی
بحثیں کیں، کانگریس سے منظوری لئے بغیر ہندوستانی افواج کو بیرونِ ہند بھیجنا، ہندوستان کو
شریک جنگ کرنا، نیشنل گورنمنٹ کا قائم نہ کیا جانا، اہم موضوعات بحث تھے، لیکن حقائق سے گریز تھا -
آخر میں مسلم لیگ پارٹی کی طرف سے مسٹر جناح نے تقریر کی اور ایوان کی توجہ اس

حقیقت پر مبذول کرائی کہ ہندوستان مادی، قانونی اور آئینی طریقہ پر برطانیہ عظمیٰ کے قبضہ و تحت میں ہے اور گورنمنٹ اور خود ہزایکسیلنسی وائسرائے کو جو تاج کے نمایندہ ہیں یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ مجلس واضعان قانون سے مشورہ کریں اور مزید براں اس کے فیصلہ پر عمل کریں کہ جنگ کی جائے یا نہ کی جائے۔

یہ بحث و حجت ایک جھوٹی نمائش اور گمراہی ہے، ملک معظم کی گورنمنٹ نے جو قوت حاکمہ ہے اعلانِ جنگ کیا، ہندوستان نے خواہ پسند کیا یا ناپسند وہ راضی ہے یا ناراض مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان جنگ میں مبتلا ہے۔

اس اظہارِ حقیقت کے بعد سلسلہ تقریر میں انگلستان کی شکست کے نتائج و اثرات اور مسلم لیگ کے رویہ پر روشنی ڈالی اور چوں کہ مسٹر جناح کی ایک تقریر جو جمعۃ الوداع کو ہوئی تھی اور جس کو پریس نے قطع و برید کر کے شائع کیا تھا اور بحث میں اس کا حوالہ دیا گیا تھا اس لئے انھوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:۔

میں نے جمعہ کے روز یعنی عید سے ایک دن قبل یہ کہا تھا کہ:۔

ہم اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ ماضی میں حکومت برطانیہ کے اعمال کچھ ہی رہے ہوں، مگر ہندوستان کے مفاد میں ہمیں چاہئے کہ اس کی تائید کریں اور اس کے ساتھ تعاون کریں کیوں کہ اب ہم ایک کشتی میں سوار ہیں اور اگر جنگ ہندوستان کے ساحلوں تک آئے تو اپنے گھر بار کی حفاظت کے لئے ہمیں چاہئے کہ ہر قسم کی تیاری کریں مسلم لیگ نے ہمیشہ اس کو صاف صاف کہا ہے کہ ہم اس کے لئے آمادہ ہیں کہ اپنے آدمی دیں، خون دیں اور روپیہ دیں لیکن حکومت برطانیہ حقیقی اختیار کے ساتھ ہمارا تعاون نہیں چاہتی"۔۔۔۔ میں ان الفاظ کو پھر دوہراتا ہوں "حقیقی اختیار کے ساتھ!" میں مسٹر جیمس سے عرض کرتا ہوں کہ آیندہ وہ ٹریژری بنچوں (گورنمنٹ) سے یہ خطاب کریں، ۔۔۔۔ (یہ کہہ کر مسٹر جناح نے اپنی جمعۃ الوداع کی تقریر کا یہ آخری حصہ پڑھا) وہ پیشکش جو گورنمنٹ نے کی ہے گورنمنٹ کے اندر حقیقی اختیار میں شرکت کے اعتبار سے محض برائے نام ہے۔ مسلم ہندوستان کو ساتھ لانے کی راہ میں ہمارے لئے یہ دشواری ہے"۔۔۔۔ ان کو (یعنی مسلمانوں کو) حکم نہیں دیا

جا سکتا — کہ وہ اہتمام جنگ میں دل سے تائید کریں۔ شاید گورنمنٹ ہمارے ساتھ معقولیت سے اس لئے پیش نہیں آ رہی ہے کہ وہ کانگریس سے ڈرتی ہے یا یہ بات ہوگی کہ وہ ہم پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔"

اب میں ایک اور وجہ کا اضافہ کرتا ہوں یعنی وہ یہ ہو سکتی ہے جو اس ایوان کے لیڈر نے بیان کی ہے "انگلستان نے اب استحکام حاصل کر لیا ہے اور اب جہاں تک ممکن معلوم ہوتا ہے ہم گورنمنٹ ہند کو نہ اہتمام جنگ سے روک سکتے ہیں اور نہ اس میں اس کو کچھ زیادہ مدد دے سکتے ہیں اور اس لئے اب تعاون کی ضرورت نہیں ہے" اس کے بعد (جمعۃ الوداع کی تقریر میں) میں نے کہا تھا کہ "لیکن یہ سب میرے اندازے ہیں۔ صرف خدا ہی کو معلوم ہے کہ حقیقی وجہ کیا ہے وہ (گورنمنٹ) ہمارے ساتھ اطمینان بخش طریقے پر کیوں پیش نہیں آتی"

جناب یہ روش ہماری ابتداء سے رہی ہے اور یہی آج بھی ہے۔ اب ہم سے کہا گیا ہے کہ ہم فراہمی کے لئے رائے دیں۔ جناب جب تک یہ جنگ جاری ہے اور جب تک گورنمنٹ آف انڈیا کو یہ جنگ کی سعی جاری رکھنی ہے یہ ظاہر ہے کہ آپ بغیر روپے کے کام نہیں چلا سکتے۔ ہمیں اس کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ ابھی صرف چھ کرور کا مطالبہ ہے۔ لیکن ہم نہ یہ جانچ سکتے ہیں اور نہ علم کے ساتھ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس بل کی واقعی کیا ضرورت تھی اور ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کے کوئی ذرائع بھی نہیں ہیں کہ تم اس رقم کو کس طرح صرف کیا کرو گے تم نے کیا پابندیاں اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں۔ تم نے کیا کیا ہے اور تم کیا کرو گے اس میں ہمیں نہ کچھ کہنے کا اختیار ہے نہ بولنے کا، نہ ہماری شرکت ہے نہ ہمارا دخل اور نہ ہماری نگرانی۔ ہمیں بہت سی شکایات ہیں — اُن کی کوئی بنیاد ہو یا نہ ہو — یعنی یہ کہ محکمۂ بہم رسانی (اسباب جنگ) کیوں کر چل رہا ہے، اور کیوں کر کوئی دوسرا محکمہ عمل کر رہا ہے۔ لوگ متعجب ہیں کہ آپ پس پردہ کیا کر رہے ہیں ان کو شبہات ہیں، ان کو بدگمانیاں ہیں۔ میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں، جناب، اگر گورنمنٹ واقعی پُر اخلاص ہے اور دل سے آمادہ ہے اور وہ یہ چاہتی ہے کہ ہمارا دوستی اور تعاون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے تو اِس پُرخطر زمانہ میں باعزت طریقہ پر ہونا چاہئے۔ جیسا کہ مسٹر ابیرمی نے اپنی تقریر میں کہا ہے۔ اگر گورنمنٹ کے پیش نظر

حقیقی طور پر یہ مقصد ہے کہ وہ ایگزیکٹو کونسل کو وسعت دے اور سیاسی انجمنوں کے نمایندوں کو
اس میں شریک کرے تو بہت اچھا ہے، بہت خوب ہے۔ اس سے پبلک کا اعتماد قائم
ہو جائے گا۔ تب آپ دیکھیں گے وہی نمایندے، اور ان میں سے دونوں جو اس ایوان کے
اندر اور اس کے باہر ہیں لوگوں کو آزادی کے ساتھ یہ سمجھائیں گے کہ کیا ہو رہا ہے لیکن اب
گورنمنٹ اور اس کا انتظام ایک بند کتاب ہے جس پر مُہر لگی ہوئی ہے۔

اگر اس بل پر گورنمنٹ کو شکست ہو جانے دی تو ہندوستان کے باہر اس کا کیا اثر ہوگا؟
پہلی بات یہ ہے کہ اگر کانگریس گورنمنٹ کو شکست دینے میں کامیاب ہوگئی تو یہ میرا قصور
نہیں ہے، یہ آپ کے دستور کا قصور ہے، اور آپ ہی نے کانسٹی ٹیوشن بنایا ہے اور اس
کو آئین کی صورت دی ہے۔ اور آپ ہی اس جامد دقیانوسی گورنمنٹ کو بیسیوں برس سے
چلا رہے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے معائب اور محاسن دونوں سے ایک ہی طرح
آپ فائدہ اٹھائیں۔ یہ آپ کا آئین ہے اور یہ آپ ہی کا بنایا ہوا ہے۔ لیکن مجھ سے کہا
جاتا ہے کہ "ہندوستان سے باہر اس کا بُرا اثر ہوگا"، جب آپ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان
کے باہر بُرا اثر ہوگا تو آپ کا اس سے کیا مطلب ہے آپ کس مقام اور کس اثر کے متعلق
کہتے ہیں؟ جناب مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ وہ جو بُرا اثر پیدا کرنا چاہتے
ہیں اُنھوں نے اعداد و شمار سے حساب لگالیا ہے۔ اگر آپ چند رایوں سے جیت بھی
جائیں اور مسلم لیگ ان کی تائید میں رائے بھی دیدے تو اُن کو جو ہندوستان سے باہر ہیں
پہلے ہی علم ہے کہ منتخب ممبروں کی اکثریت اِس مسودے کے خلاف ہے، اور امریکہ میں اور
جرمنی میں وہ کون احمق ہیں جو آپ کے اس آئین سے واقف نہیں ہیں، اور جو اس اسمبلی
کی نوعیت اور تشکیل سے واقف نہیں ہیں؟ وہ کون ہے جو اس پر اس قدر گھبرا جائے گا
اور یہ سمجھے گا کہ آپ اس وجہ سے جنگ ہار جائیں گے کہ یہ فائنس بل یہاں مسترد کردیا گیا؟....

آپ کو یہ ملحوظ رہے کہ میں گورنر جنرل کی کونسل کی توسیع کے اصول سے مطمئن نہیں ہوں۔
لیکن یہاں میرے کامل طور پر مطمئن ہو جانے کا سوال نہیں ہے۔ روپیہ میں ۱۶ آنے کسی کو
نہیں ملیں گے اور یقین کیجئے اِس حالت میں کہ آپ خطرہ میں مبتلا ہیں یہ کسی پارٹی کے لئے

مناسب بھی نہیں ہے کہ وہ حد سے متجاوز مطالبات کرے کیوں کہ یہ نہ صحیح ہے اور نہ معاملہ کی بات ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اس قسم کا ایک لفظ بھی نہیں کہا کہ پہلے مجھے پاکستان دیدو جب میں تمہاری تائید کروں گا۔ میرے یہ دوست جو کانگریس پارٹی میں ہیں خواہ کچھ کہیں مگر آپ یقین کیجئے کہ ہم اس مقصد کے لئے لڑیں گے اور جانیں قربان کریں گے۔ اس معاملہ میں آپ غلطی نہ کریں۔ جمہوریت مر چکی، میری مُراد اس نوعیت کی جمہوریت سے ہے جو مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی چاہتے ہیں۔ ہم تعداد میں کم سہی اور واقعی کم ہیں بھی مگر میں کہتا ہوں اور دھمکی کے طور پر نہیں بلکہ اطلاع کے طور پر کہ اگر ہم چاہیں اور عزم کرلیں تو کانگریس کے مقابلہ میں آپ کو سو درجہ زیادہ پریشان کرسکتے ہیں۔ مگر ہم ایسا کرنا چاہتے نہیں ہیں، اب نہیں۔ آپ کو یہ محسوس کرنا چاہیئے۔

مستقبل؟ مستقبل کو ہم چھوڑ دیں گے کہ وہ خود اپنی تشکیل کرے اور صورت پذیر ہو۔ گورنمنٹ کے مقابلے میں ہمارا طرزِ عمل اور روش یہ ہے۔"

پھر کانگریس کے اس دعوے کی کہ وہ تمام ہندوستان کی نیابت کرتی ہے اور مسلمانوں اور تمام اقلیتوں کی ترجمان ہے تردید کی کہ:-

میں اس ایوان کے فرش پر کھڑا ہوا کہتا ہوں کہ کانگریس ہندو انجمن ہے اور کانگریسی لیڈروں کے پُشت دماغ میں یہ خیال ہمیشہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس اور ہندو راج کے تحت میں آنا چاہیئے، مسلمان اقلیت ہیں اور از رُوے انصاف وہ جس بات کا زیادہ سے زیادہ مطالبہ کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اقلیت کی حیثیت سے ان کو تحفظات دیدیئے جائیں لیکن میں کانگریس اور نیشنلسٹ کانگریس پارٹی کے اشخاص کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے پُشت دماغ میں ہمیشہ یہ بات رہی ہے، اور گزشتہ ۲۵ برس کے اندر اس میں کوئی فرق نہیں آیا کہ وہ ایک جُداگانہ ہستی ہیں .... اور چوں کہ مجھے ٹوکا گیا ہے اس لئے میں اپنے دوستوں کو ایک اور ثبوت دوں گا، مسلمانوں نے سندھ کی علٰحدگی پر کیوں اصرار کیا، آپ یہ جانتے ہیں یا نہیں جانتے آپ یہ جانتے ہیں کہ وہ شخص جو اُس وقت کانگریس کا فدائی تھا، مولانا محمد علی انھوں نے کہا تھا کہ۔

ہم کلکتہ سے کراچی تک ایک شاہراہ چاہتے ہیں

آپ کو یہ یاد ہے یا نہیں پھر یہ کیوں ہوا کہ آپ میں سے بعض نے نہایت شدت کے ساتھ علیحدگی سندھ کی مخالفت کی ...... میں اپنے دوست ستیا مورتی کی تقریر کا حوالہ دیتا ہوں دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں اور ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے گزشتہ مئی میں مسٹر ایمری کی تقریر کے بعد انھوں نے کہا کہ :-

''مسٹر ایمری کی لیاقت اور خلوص کا ثبوت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے کہدیں کہ پاکستان نہیں بنے گا، مشترکہ وزارتیں نہیں قائم ہوں گی کوئی نا ممکن مطالبات نہیں سنے جائیں گے انھیں اپنا معاملہ اکثریت کے ساتھ طے کرنا چاہیے بس وہ ایک مرتبہ یہ کہدیں باقی سب آسان ہو جائے گا''

میرے دوست یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے رحم پر چھوڑ دو .... لیکن اس کے بعد مسٹر ایمری کی ۸ اگست والی تقریر آتی ہے اور وہ مشکل چیز ہے میں یہ نہیں کہتا کہ حکومت برطانیہ اس کے سوا اور کچھ کر سکتی تھی اگر اس نے اس کے سوا اور کچھ کیا ہوتا اگر وہ مسلمانوں کو دبا کر مجبور کرنے میں فریق بنی ہوتی اگر وہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو کانگریس کے حوالہ کرنے میں معاون ہوئی ہوتی تو وہ اس ملک کی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ چھوڑتی جو نہایت ہی شرمناک ہوتا۔ اگر اس نے یہ کیا ہوتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ یہی وہ بات ہے جس پر مجھے کانگریس سے بنیادی اختلاف ہے۔ کانگریس ہندوستان کا استقلال نہیں چاہتی ۔۔۔ اب میں وہ پڑھوں گا جو مسٹر گاندھی نے کہا ہے۔ وہ (کانگریسی) یہ چاہتے ہیں کہ حکومت برطانیہ کی سیادت اور شہنشاہی میں ان کو یہ اختیار مل جائے کہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں پر حاکمانہ استیلا، قائم کرلیں۔ یہ وہی بات ہے جو مسٹر گاندھی خود کہتے ہیں اور یہ بات جسے میں منظور نہیں کر سکتا۔ یہ میرا عقیدہ ہے کہ وہ (کانگریسی اور ہندو) یہی چاہتے ہیں اور یہی اُن کا مقصد اور مطمح نظر ہے۔

وہ مضمون جو مسٹر گاندھی نے ۲۹ راکتوبر کو لکھا ہے اس کا قطعی ثبوت ہے۔ یقیناً مسٹر گاندھی کی تحریرات اور تقریریں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ ان سے آپ کسی تجویز کی تائید مراد

لے سکتے ہیں وہ ڈیلفی کے مندر کی سی پیشین گوئیاں ہوتی ہیں، لیکن مسٹر گاندھی کا مفہوم سمجھنے کے لئے آپ کو چاہیئے کہ ذرا گہرا مطالعہ کریں۔ مسٹر گاندھی نے سال گزشتہ اکتوبر میں وائسرائے کی پیشکش کو مسترد کرنے کے بعد لکھا تھا:- اگر برطانوی ہندوستان سے آج چلے جائیں تو پنجاب سے پنجابی اور مشرق سے گورکھے آکر ہندوستان کو ویران کر دیں۔ اگر وہ دیانتداری کے ساتھ لکھتے تو بجائے پنجابی کے مسلمان کا لفظ یقیناً ہوتا۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں۔ ''اگر ہندوستان میں ان کی (یعنی برطانویوں کی) سیادت قائم رکھنے کا کوئی خواہشمند ہو سکتا ہے تو وہ کانگریس ہی ہے'' ذرا ان الفاظ کی طرف توجہ کیجئے ''انگریزوں کی سیادت قائم رکھنے کا خواہشمند''

اس کے بعد کانگریس کے پے در پے مطالبات اعلانِ آزادی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے ذریعہ وضع دستور کے حق اور مرکز میں عارضی طور پر نیشنل گورنمنٹ کے قیام وغیرہ کے متعلق کہا کہ:-

سب سے پہلے تو میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا قائل نہیں ہوں، کوئی طاقت کسی دوسرے ملک کو محض اعلان کر کے استقلال بخش سکتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر کسی ملک کے باشندوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ غلامی کے جوے کو اتار کر پھینک سکتے ہیں تو کوئی طاقت ان کو غلامی میں مبتلا نہیں رکھ سکتی۔ یہ محض اعلان کا معاملہ نہیں ہے۔ اگر آپ کو کامل آزادی پر اعتقاد ہے تو میں آپ کا احترام کروں گا۔ اپنے توپخانے پر ڈٹے رہئے۔ برطانوی گورنمنٹ سے گفت و شنید کرنے کی کوئی چیز نہیں۔ بالکل نہیں قطعی نہیں۔ حکومت برطانیہ سے یہ التجائیں کرنے سے کیا فائدہ کہ ہمیں کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی دو اور وہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی دستور وضع کرے گی؟ گورنمنٹ برطانیہ کو اس دستور سے کیا سروکار۔ کیا انھیں یہ اعزاز حاصل ہونے کو ہے اس دستور کو جو آپ کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی وضع کرے گی۔ اس کو وہ برطانیہ کی کتاب قانون میں درج کریں۔ کاہے کے لئے؟ ان کا یہاں کچھ کام نہیں ہے۔ اس طرح کیجئے آپ کو پسند ہو آئیں ملک سے اپیل کریں۔ آیئے ملک کا فیصلہ حاصل کریں۔ لیکن آپ کا اگر یہی منشاء ہے، جو میرا ہے کہ فوراً معقول حد تک اختیارات ہمارے حق میں منتقل کر دیئے جائیں۔

اور اس غرض کے لئے برطانوی حکومت اور برطانوی پارلیمنٹ ایک آئین پاس کرکے اپنی کتاب قانون میں درج کریں، اور وہ اختیارات اس ملک کے نمایندوں کے حوالے کر دیئے جائیں تو یہ بات میری سمجھ میں آسکتی ہے۔ پھر گفت وشنید کی ایک بنیاد ہے۔
اگر آپ اپنے رزولیوشن کے پہلے جز کو حذف کردیں اور عارضی طور پر ایسی مرکب حکومت قائم کریں، جو اس مجلس واضعان قانون کو جواب دہ ہو، تو پھر ہمیں اپنے وہ حواس کھونے نہ چاہئیں جن سے تناسب کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں کانگریس پارٹی کے اصحاب سے کہتا ہوں کہ ہم خطرے میں ہیں اس کا جو جی چاہے کہے۔ اب ہم لاپروائی کا اندازہ اختیار نہیں کرسکتے۔
اگر آپ کے پاس واقعی کوئی ایسی عملی تجویز ہے جس کو سب معقول پارٹیاں منظور کرسکیں تو پھر آپ سب صحیح راہ، صحیح طرز کار اور صحیح طریقہ عمل کیوں نہیں اختیار کرتے؟ اس سے کیا فائدہ کہ آپ ان سے (گورنمنٹ سے) خطاب کریں، اس سے کیا فائدہ کہ آپ وہ ڈیلی ہیرلڈ کو بھیجیں وہ فیصلہ نہیں کرسکتے"۔
پھر انھوں نے حکومت کے اعلانات پر بحث کرکے کانگریس پارٹی کو دعوت دی کہ:۔
"ہم اور آپ سر جوڑ کر کیوں نہ بیٹھیں، اگر آپ کوئی عمل تجویز کریں تو ہم ایک متحدہ مطالبہ مسٹر ایمری برٹش پارلیمنٹ یا برٹش قوم کے سامنے پیش کریں۔
ہندوستان کے تمام امراض کا علاج نہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی ہے اور نہ کامل آزادی۔ مجھے شکایت یہ ہے کہ آپ اس مقصد پر بھی مضبوطی سے قائم نہیں ہیں۔ آپ ایمانداری سے اس پر ثابت قدم رہئے۔ میں آپ سے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن میں آپ کی تعریف کرونگا اور آپ کا احترام کروں گا۔ لیکن اگر آپ اس پر بھی قائم نہیں ہیں تو پھر زمین پر اترئے اور عملی آدمی کی طرح معاملات کو سلجھایئے اور جیسا کہ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے کہا، حقیقتوں کا مقابلہ کیجئے، دوسروں کو اس کا موقع نہ دیجئے کہ وہ فائدہ اٹھائیں۔ مانچسٹر گارجین نے باوجود ایک برطانوی اخبار ہونے کے بہت صاف بات کہی ہے:" ہندوستان میں ہماری طاقت اور اقتدار دوسروں کی غلطیوں پر مبنی ہے"۔ صورت حال یہ ہے۔ میں صرف حال کے متعلق گفتگو کر رہا ہوں مستقبل کے متعلق نہیں۔

ایک آخری فقرہ اور بس میں ختم کرتا ہوں۔ ہم اُس چھوٹے سے معصوم بچے کے متعلق جس کو لاکر سامنے رکھا گیا ہے جب ہم گفتگو کرتے ہیں، میری مُراد اس قومی گورنمنٹ کے مطالبے سے ہے جو اس ایوان کے منتخب نمایندوں کو جواب دہ ہوگی، تو یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اس میں بہت بعید معنی مطالب اور مقاصد مضمر ہیں۔ بہت ہی بعید اور دُور رس۔ ان کا صحیح اندازہ اس کی تفصیلات کو بنظر غائر دیکھنے سے ہوتا ہے۔ وزارت بنانے کے لئے دستور میں بنیادی اور عظیم تبدیلیاں ہوں گی اور جب وہ وزارت بن گئی تو وہ مجلس وضعان قانون کے منتخب نمایندوں کو جواب دہ ہوگی۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے اپنی ساری تقریر میں صرف دو باتوں پر زور دیا ہے ''جمہوریت، جمہوریت، جمہوریت اور نیشنل گورنمنٹ''، اس سے کیا فائدہ؟ وہ وزارت کیسی ہی ہو جواب دہ تو وہ اس مجلس وضعان قانون کو ہوگی جس میں دو تہائی ممبروں کی اکثریت مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کے تحت حکم ہے۔ مجھے اُس شخص پر رحم آتا ہے جو اس وزارت میں ہو اور جو کانگریس کے حکم کی تعمیل نہ کرے اور اس کا تابع فرمان نہ ہو''۔

ووٹ کے وقت مسلم لیگ پارٹی غیر جانب دار رہی، اور دو ووٹوں کی مجارٹی سے بِل مسترد ہو گیا مگر پھر ضابطہ کی کارروائی کے بعد وائسرائے کے اختیار خصوصی سے پاس کر دیا گیا۔ ۲۰ نومبر کو وائسرائے نے اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے مشترکہ اجلاس میں اور اسی دن وزیر ہند نے دار العوام میں تقریریں کیں۔

وائسرائے نے دستوری مسئلہ ہند کے سلسلہ میں ۸ اگست کی پیشکش کے متعلق کہا کہ:۔

''اگرچہ ہندوستان کے باہر اس کو فیاضانہ تصور کیا گیا ہے اور خود ہندوستان میں بھی کثیر تعداد نے اس کی حمایت کی ہے لیکن اگزیکٹو کونسل کی توسیع کے معاملہ میں ہندوستانی سیاسی لیڈروں نے اس درجہ اس کو قبول نہیں کیا جس کی اُمید تھی اور جو تجاویز اس کا باعث ہیں وہ آپس میں تصادم پیدا کرنے والی بلکہ ایک دوسرے کو فنا کرنے والی ہیں''۔

وزیر ہند کی تقریر زیادہ مبسوط تھی انھوں نے بھی متذکرہ پیشکش کی تعریف کی اور آیندہ آئین ہند کے سلسلہ بیان میں اپنی تاریخی ذمہ داری و نگرانی کی اہمیت جتاتے

ہوئے کہا کہ :-

اگر ہندوستان کی آزادی کا کل ہی اعلان کر دیا جائے تو بھی ہندوستانیوں کو برطانیہ کی ہندوستانی و برطانوی فوجوں بحری اور ہوائی طاقتوں کے استعمال کو سمجھنے کے لئے کئی سال کا عرصہ درکار ہو گا کیا ایوان اس بات کے لئے تیار ہے کہ اس امر کی ضمانت لئے بغیر کہ ہندوستان ان فوجوں کو بیرونی تعلقات اور اندرونی انتظام میں کس طرح استعمال کرے گا تفویض کر دی جائیں "

کانگریس کی مطلوبہ نیشنل گورنمنٹ کے متعلق کہا کہ :-

اس نیشنل گورنمنٹ کو قائم کرنے کا مطلب ایسی وزارت کا قیام ہوتا جو اس کانگریس کی جماعت عاملہ کے ماتحت ہوتی جس نے صوبوں کے وزراء کو استعفے دینے کی ہدایت کی، ایسی نیشنل گورنمنٹ میں کوئی مسلمان لیڈر کام کرنے کو تیار نہ ہوتا، اس لئے موجودہ وقت میں جبکہ ہم اصولی طور پر کسی معاہدہ کے قریب نہیں پہونچے یہی حال ہو سکتا تھا کہ آئندہ آئین کے متعلق بالکل بے پرواہ ہو کر اور بغیر کسی تنگ خیالی کے وائسرائے کی اگزکٹو کونسل میں شریک ہو جاتے مگر کانگریس نے ان تجاویز کو سرے سے ہی نامنظور کر دیا، اس معاملہ میں کانگریس کا رویہ یہ ہے کہ یا تو سب کچھ لیں گے یا کچھ بھی نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی نہ صرف غیر مشروط آزادی تسلیم کی جائے بلکہ ایسی آزادی جس میں کانگریس کی کانگریسی لائنوں پر حکومت ہو،

اس پوزیشن کو قبول کرنا بلکہ اس کی طرف حرکت کرنا بھی ہندوستان میں نہ ختم ہونیوالی مشکلات پیدا کر دے گا اس سے ہندوستان کو ہندوستان کے اندر سیلف گورنمنٹ بنانے اور متحد کرنے کی تمام اُمیدیں جاتی رہیں گی، ہندوستان کے باقی عناصر نے آئندہ آئین ہند کے متعلق ہماری تمام تجاویز کو عامتہً منظور کر لیا ہے علاوہ ازیں انھوں نے وائسرائے کی اگزکٹو کونسل میں اصول توسیع کو بھی نامنظور نہیں کیا ان سے صرف تفصیلات میں گفت و شنید منقطع ہوئی'

جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے اس لئے گفت و شنید کا سلسلہ ٹوٹا کہ اس نے اگزکٹو کونسل

یں پیش کردہ نشستوں سے زیادہ نشستیں[561] طلب کیں اور کانگریس کے خلاف ضمانت مانگی، یہ مطالبات بہت بڑے اور ناقابل تسلیم ہیں۔

مہاسبھا نے ہندوؤں کی قدامت پسند جماعت ہوتے ہوئے ایسے مطالبات پیش کئے جو مسلم لیگ کے مطالبات کی طرح ناقابل قبول تھے اگرچہ مجھے بعد میں معلوم ہوگیا ہے کہ وہ ان میں تھوڑی بہت ترمیم کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

سلسلہ تقریر میں صورتِ حالات کے سازگار ہونے تک متذکرہ پیشکش کے التوا کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ :-

"اگر ہندوستانی لیڈر آج بھی اپنے باہمی اختلافات ختم کرکے اور آئین کی ترتیبِ عمل کے متعلق کوئی سمجھوتہ کرلیں تو حکومت ان تجاویز کو جامۂ عمل پہنانے تامل نہیں کریگی۔"

ستیاگرہ اور گاندھی جی کے مطالبۂ آزادیٔ تقریر کی نسبت کہا کہ "یہ ایک ایسی تحریک ہے جسے خواہ ہندوستان میں ہو یا دوسرے ملک میں کوئی بھی حکومت برداشت کرنے کو تیار نہیں۔"

اور کہ "اس مرحلہ پر حکومت برطانیہ کسی حالت اور کسی قیمت پر ہندوستان کے متعلق اپنے نظریہ میں تبدیلی کو آمادہ نہیں۔"

آخر میں یہ بھی اعلان کیا کہ "ہم نے صلح کا دروازہ بند نہیں کیا یہ ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلا ہوا ہے۔"

ہندو مسلم مفاہمت میں وائسرائے کی ناکامی کے بعد کچھ عرصہ تک خاموشی رہی لیکن سول نافرمانی کی رفتار بڑھنے کے ساتھ مختلف اطراف سے مفاہمت کے لئے آوازیں بلند ہونے لگیں نومبر میں مسٹر سرینیواس آینگر (سابق صدر کانگریس) نے کانگریس اور مسلم لیگ سے اپیل کی کہ صوبوں اور مرکز میں قومی حکومتیں قائم کی جائیں جو پارٹی پر مبنی نہ ہوں اور لیگ اور کانگریس کو پارٹی مجارٹی کا خیال ترک کردینا چاہیئے۔

بمبئی کے لبرل لیڈر جمنا داس مہتہ اور چند ممتاز لوگوں نے کچھ تجاویز شائع کیں اور یہ رائے ظاہر کی کہ کانگریس کو بے جا دباؤ کی اجازت نہیں دینا چاہیئے کانگریسی صوبوں

میں مخلوط حکومتیں قائم ہوں اور مشیروں کی جگہ وزرا مقرر کئے جائیں ورنہ عام انتخابات ہوں۔
ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو لیبرل لیڈر نے بھی ایک نہایت طویل بیان شائع کیا جس میں اس خواہش کا اظہار اور اس پر اصرار تھا کہ گاندھی جی اور مسٹر جناح کے درمیان فوراً ہی ملاقات ہو اور وہ آزادانہ طریقہ پر وسیع القلبی اور فراخ دلی کے ساتھ ملک کی موجودہ سیاسی صورتِ حالات پر غور کریں اور اس موقع پر مہاسبھا، سکھ اور دلت دپست قوم کے ایک ایک یا دو دو لیڈروں کو مدعو کیا جائے اور مفاہمت کے بعد وائسرائے سے مل کر اس بات کا واضح مطالبہ کیا جائے کہ دورانِ جنگ میں ایک نیشنل گورنمنٹ کی نوعیت کی گورنمنٹ قائم کریں ایک ہندوستانی ڈیفنس ممبر مقرر کیا جائے ہندوستان میں بڑی بڑی صنعتوں کے اور خصوصاً سامانِ جنگ کے کارخانے کھولے جائیں اور صوبوں میں فوراً ہی آئینی حکومتیں بحال کردی جائیں۔" سر سپرو نے اس بیان میں سول نافرمانی اور اس کی سزاؤں سے جو صورت حال پیدا ہوگئی تھی اس پر اظہار رائے کرتے ہوئے کہا کہ:۔
"ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے عام لوگوں کو بے تعلق اور غیر متاثر سمجھنا تنگ نظری ہے اسی طرح یہ عقیدہ بھی ایک مغالطہ اور ملکی مفاد کو اپنے سیاسی عقائد کی دیوی پر قربان کرنا ہے کہ اس موقع پر حکومت برطانیہ کو چیلنج کرکے ملک کو کوئی فائدہ پہونچایا ہے۔" انھوں نے اس امر پر بھی افسوس ظاہر کیا کہ ۸ اگست والی اسکیم پر رائے عامہ کو غور کرنے کا موقع نہیں دیا گیا اور اس طرح معاملات جاری رہے کہ گویا تین یا چار پارٹیوں کے درمیان سودا یا مفاہمت ہے۔
لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ مسٹر رادھا کمود نے بھی ایک اسکیم شائع کی جس میں اختلافات تسلیم کرلینے اور تحفظات کی ضرورت مان لینے کے ساتھ ناقابل تقسیم ہندوستانی قومیت اور مشترکہ ہندوستانی شہریت پر بطور حاصل تجویز پورا زور دیا گیا۔
چونکہ وائسرائے اور وزیر ہند دونوں کے بیانات میں جو ۲۰ نومبر کو ہوئے اور لیگ اور کانگریس کی تقریروں میں مفاہمت اور صلح کا دروازہ کھلے رہنے کا اعلان تھا اس لئے ۹ دسمبر کو مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے بھی دہلی سے ایک بیان شائع کیا کہ اس صورت میں

مسلم لیگ پیش قدمی کرے اور نہ صرف اسی پر اکتفا کیا بلکہ تجاویز کی ترتیب بھی شروع کر دی اور ورکنگ کمیٹی کے انعقاد اجلاس کی بھی درخواست کی مگر در اصل کسی مفاہمت کے لئے نہ تو یہ موزوں وقت تھا اور نہ کانگریس کی صدق دلانہ خواہش تھی۔ اس لئے یہ کوشش بلا نتیجہ رہی۔

مگر ہندو مسلم مفاہمت کا مسئلہ تو متحدہ قومیت کی گرہ لگانے کے بعد ایک لاینحل عقدہ بنا دیا گیا، کہنے سننے میں متحدہ قومیت نہایت خوش آیند ہے لیکن ہندوستان میں تو یہ اس پرند کی طرح ہے جس کا نام ہُما ہے جو لٹریچر میں بہت دلکش جگہ رکھتا ہے اور حقیقت میں وجود سے محروم ہے۔

متحدہ قومیت کے ساتھ دوسرا لفظ جمہوریت کانگریس کے زبان زد ہے مگر عملاً ان الفاظ کی کوئی اصلیت نہیں، یہ تو تاریخی حقائق ہیں کہ مسلمانوں کے آنے سے قبل ہندوستان مختلف حکومتوں اور ذاتوں کے اندر ذاتوں میں منقسم تھا۔ معاشری و تمدنی طریقے تو تقسیم و تفریق کا وہ نمونہ ہیں جو دنیا میں کہیں نظر نہیں آتے انسانی مساوات کا تو وہاں دعوے ہی نہیں ہو سکتا جہاں چلنے کی سڑکیں تک علٰحدہ ہوں اور چھوت چھات ایک مذہبی مسئلہ و عقیدہ ہو، در اصل صدیوں سے اس قوم کے جسم و روح پر ایک راجہ اور ایک مہاتما نے حکومت کی اور آج بھی جب کہ راجائی دور باقی نہیں اور مغربی طرز حکومت نے شعور و جذبہ سیاسی آزادی کا ں کی حد تک پہونچا دیا ہے ایک بڑے حصہ کی روح پر ایک مہاتما کی حکومت ہے، بقول ایک ہندو نوجوان کے (جو ۲۳ دسمبر کو دہلی کے ایک مباحثہ میں کہا) "مہاتما گاندھی کی عظمت کا راز تو اس بات میں ہے کہ ہندوستان میں جو کوئی لنگوٹی باندھے ننگے بدن رہے وہ ہی پجنے لگتا ہے پچھلے دنوں دہلی میں ایک سادھو آیا جو غلیظ کھاتا تھا اور ہزاروں آدمی اس کے درشن کو جاتے تھے۔"

مسلمانوں نے گزشتہ چالیس سال میں جب کبھی اپنی بقائے قومیت کے لئے کوئی سیاسی اقدام کیا فوراً فرقہ واری کے طعنوں کی بوچھار کی گئی، ہندو مسلم اتحاد کی سب سے بڑی مثال ۲۱ تا ۱۹۲۲ء میں ملتی ہے مگر در اصل وہ ایک مہاتمائی سحر تھا جو زیادہ دیر تک قائم نہ رہا

اور یہ مقصد صاف و واضح ہوگیا کہ صرف رام راج کے حصول کی خواہش اس اتحاد کی تہ میں کام کر رہی تھی اور پھر کانگریسی دور وزارت میں اس کا ایک خاکہ بھی سامنے آگیا۔ اب کہ بڑی بڑی قربانیوں اور متاعہائے گراں مایہ برباد کرنے اور ۶۰ سال کے تجربوں کے بعد مسلمانوں کا سیاسی مطمح نظر لاہور کا مشہور رزولیوشن بہ عرف عام پاکستان بنا تو ان کو متحدہ قومیت اور جمہوریت کا دشمن کہہ کہہ کر مطعون کیا جا رہا ہے اور مختلف اطراف سے دام صلح بچھایا جا رہا ہے مگر چہاں الصلح خیر ہے وہاں مرد مؤمن ایک سوراخ سے دوبار نہیں کاٹا جاتا اس لئے اب ایسی صلح کے امکانات ختم ہوگئے جن سے رام راج کے قیام کا امکان ہو اور یہی وجہ تھی کہ یہ تحریکات بے اثر رہیں۔

۱۳ دسمبر کو وزیر ہند نے پھر معاملات ہندوستان کے متعلق ایک دعوت میں تقریر کی جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کو ایک نعرہ کی ایجاد یا تصنیف سے شروع کیا گیا۔

یہ نعرہ انڈیا فرسٹ (مقدم ہندوستان) تھا۔ اس تقریر میں پہلے آج کے ہندوستان کا تاریخی سروے کیا۔ آریوں، مسلمانوں اور انگریزوں کی آمد اور ان کے اثرات کا ذکر کر کے اثرات برطانیہ میں، سیاسی اتحاد، انگلستان کی طرح مضبوط و مستحکم نظم و نسق کی برکات گنائیں، اور انگریزی زبان کی تعریف کی کہ اُس نے ہر طبقہ و مذہب کے ہندوستانیوں کو غور و فکر کے لئے ایک مشترکہ بنیاد قائم کر دی پھر سیاسی تخیل اور حوصلوں کے اعتبار سے ہندوستان و انگلستان کو ایک ہی سیاسی ادارہ کا نمایندہ قرار دے کر کہا کہ:۔

”اگر ایک بار ہندوستان جُداگانہ اور آزاد وحدتوں میں تقسیم ہوگیا تو پھر وہی خلفشار پیدا ہوگا جو کہ زوال سلطنت مغلیہ کے بعد پیدا ہوگیا تھا اور کوئی عنصر بھی اپنے آپ کو بیرونی حملوں سے نہیں بچا سکے گا خواہ وہ براہ خشکی ہوں یا براہ سمندر“

اس کے بعد اپنے خیالات و تصورات کو نئے طریقہ سے ظاہر کیا پہلے انھوں نے اپنے آپ کو ایک کانگریسی یا مہا سبھائی کی حیثیت میں تصور کیا اور کہا کہ:۔

اس جگہ بیٹھ کر میں انڈیا فرسٹ کے کیا معنی سمجھوں گا؟ کیا وہ اس قسم کی چیز نہ ہوگی کہ اگر میں ہندوستان کو اولیت کی جگہ دوں تو کیا مستقبل ہند کے تخیل کے مطابق اپنے مسلمان ہمسایہ کو

ساتھ نہیں ملانا چاہئے جو میری ہی طرح ہندوستان کا لازمی جز ہے ممکن ہے کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ انگلستان کی طرح سیدھی سادھی اکثریت کی بنیاد پر جمہوری نظام قائم اور ایک مضبوط مرکزی دستور نافذ ہو مگر کیا ان ترجیحات کو کسی ایسی مفاہمت کی راہ میں حائل ہونا چاہئے جس کے ماتحت میرا ہمسایہ محسوس کر سکے کہ مستقبل کے ہندوستان میں اس کی قوم کو بھی اسی قدر حقیقی آزادی اور انفرادی و جماعتی اور ثقافتی وحدت کی حیثیت سے نشوونما کا موقع حاصل ہوگا جس قدر کہ میری قوم کو، مجھے مطلق العنانی ناپسند سہی لیکن اس کی وجہ سے کیا مجھے ان ریاستوں کو وحدت ہند اور آزادئ ہند سے خارج کر دینا چاہئے جو وحدت ہند کا جزو لاینفک بھی ہیں اور اپنی خصوصیات کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہندوستانی ہیں۔ اس کی بجائے کیوں نہ ان کا خیر مقدم کیا جائے اور کیوں یہ نہ سمجھا جائے کہ وقت ان میں وہ تبدیلیاں پیدا کر دے گا جو میں ان میں دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ کہ وہ دوسری مثالوں کو دیکھ کر بدل جائیں گے۔"

مسلمان کی پوزیشن اختیار کر کے کہا کہ :۔

"میں مسلمان کی جگہ بیٹھ کر کچھ اس طرح سوچوں گا کہ یہ تو میرے لئے ضروری ہے کہ میں ملت کے لئے یہ حق منواؤں کہ میری قوم ہندوستان کی قومی زندگی میں ایک مستقل عنصر کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ کہ وہ محض ایک تعدادی اقلیت نہیں ہے لیکن کیا مجھے اس بات کا حق حاصل ہے کہ اپنا دعویٰ اس حد تک بڑھاؤں کہ اگر کامل طور پر ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوں تو کوئی سیاسی ترقی نہ ہونے دوں یہ چیز ہم دونوں کے لئے تباہ کن ہوگی۔"

لیکن وزیر ہند نے والیانِ ریاست کی جگہ بیٹھنا پسند نہ کیا اور صرف انڈیا فرسٹ کا ان کی جانب سے مفہوم بیان کر کے اپنے خیالات ظاہر کئے کہ :۔

کیا وہ مفہوم ان باتوں سے ملتا جلتا نہیں ہوگا؟ کیوں کہ مجھے تاج شاہی سے معاہدہ کی وجہ سے محفوظ پوزیشن حاصل ہے اور چوں کہ بخلوص قلب مجھے یقین ہے کہ میری حکومت کے عرصہ کے قائم شدہ طریقے میری رعایا کی بھلائی کے لئے بنائے گئے ہیں لہذا ہندوستان میں قدرتی رہنما ہونے کی حیثیت سے کیا مجھ پر یہ فرض نہیں ہے کہ اپنے اختیارات مطلق کو

بکھو کم کرکے اور اپنی ریاست کے داخلی آئین میں اصلاحات سے میری ریاست مجموعی حالت میں ہندوستان کی سیاسی زندگی سے قریب ہو جائے گی "........ ہندوستان کے ہر عنصر سے یہ تقاضا ہے کہ جامع رواداری اور مفاہمت پیدا کی جائے حقیقی ہندوستان کو جیساکہ وہ آج قائم ہے قبول کیا جائے اور خیالی ہندوستان کو جسے کسی پارٹی نے اپنے پرچم پر عبارت کر لیا ہے فوری طور پر مکمل منوانے کے لئے جو غیر مفاہمانہ اصرار کیا ہے وہ ختم ہو جانا چاہئے "

اس کے بعد ہندوستان و برطانیہ کے تعلق کو مدِنظر رکھ کر ایک انگریز کی حیثیت سے ہندوستان نقدم کے مفہوم کو حیثیت دولت مشترکہ دیتے ہوئے وائسرائے کی پیشکش کو ہی تمام نظریات وتصورات اور معاملات کا واحد حل قرار دیا۔ غرض اس تمام تصوراتی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ (۱) تقسیم ہند خطرہ سے مملو ہے، (۲) کسی ایک فریق کو ایسی ترجیحات نہیں دی جاسکتیں کہ دوسرا فریق اپنی حقیقی آزادی کو خطرہ میں تصور کرے، (۳) ریاستوں کی حیثیت برقرار رہے گی اور وقت خود ان میں تبدیلیاں پیدا کر دے گا۔

مگر تقسیم ہند کو جسے آج بری و بحری حملوں کے اندیشہ سے ناقابل عمل کہا جاتا ہے چند ہی روز پہلے اس طرح قابل عمل تصور کیا گیا تھا کہ:-

> "غالباً ہندوستان کے مستقبل کے آئینی فیصلہ کے لئے ہم کو آزادی و جمہوریت کی مسلّمہ روایتوں سے تجاوز کر کے کوئی جدید طریقہ اختیار کرنا پڑے حتّٰی کہ یہ بھی امکان ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کی حدود میں بھی از سرِ نو تبدیلیاں کرنی پڑیں "

اس تازہ تقریر میں مخالف پروپاگنڈا سے متاثر اور ڈھائی صدی پہلے کے تصورات میں محو ہو کر تبدیل کرنا پڑا، اور اس حقیقت کو تصور سے خارج رکھا کہ زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے اور ہندوستان میں بھی زبردست ترقی پذیر تبدیلی ہو چکی ہے اب وہ ڈھائی سو سال پہلے کی طرف واپس نہیں ہو سکتا اور نہ وہ حالت پیدا ہو سکتی ہے جو مغل سلطنت کے زوال کے وقت بہت زیادہ خود برطانوی قوم نے بھی پیدا کی تھی۔

۱۶ دسمبر کو چیمبر آف کامرس انجمن اتحاد کلکتہ کی دعوت میں وائسرائے نے بھی ایک نہایت طولانی تقریر کی جس میں حال کے سیاسی مذاکرات، مساعیِ جنگ میں ہندوستان کی امداد، ہندوستان کی صنعتی ترقی، آئینی مسائل کو طے کرنے کے لئے سیاسی پارٹیوں کو متحد بنانے کی کوشش اور مرکزی حکومت میں ان کی شرکت کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا اور یہ اُمید ظاہر کی کہ " مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اس حقیقی اختیار و اقتدار پر زیادہ روشنی پڑے گی جو ماہ اگست والی تجاویز کو قبول کرنے سے ہندوستانیوں کو حاصل ہو گا، اور ان سے حصول فوائد کے لئے ہندوستان کی بڑی سیاسی پارٹیاں تیار ہوں گی۔"

سول نافرمانی اور مستقبل کے آئین اور دستوری ترقی کے متعلق کہا کہ:-

" میں صاف طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ یہ حالت ایسی نہیں کہ جو خاموشی سے برداشت کی جا سکتی، میں ہر جائز اعتراض کے لئے اپنے دل میں احترام رکھتا ہوں اور دنیا میں کوئی شخص بھی تشدد کی فوقیت پسند نہیں کرتا اور نہ بلا وجہ اسلحہ سے کام لینا چاہتا ہے مگر مسلح حملہ کا جواب مسلح طور پر بھی دیا جا سکتا ہے خواہ ہم اپنے دل کی گہرائیوں میں جنگ سے کتنی ہی نفرت رکھتے ہوں۔

اس ملک کے متعلق بھی ہم پر ایک فرض عائد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جنگ کی کوششوں میں جن کی پشت پر پورا ہندوستان ہے کوئی روک نہ پیدا کی جا سکے اور یہ کہ مخالفت کرنے والوں کی تقریروں یا اور مخالفت کے آلات سے جو وہ استعمال کرتے ہوں جو روک پیدا ہو اس کے اثر سے ایک سپاہی بھی ایسا نہ ہو جو ضروری اسلحہ اور گولی بارود سے محروم رہ جائے۔ مجھے اس کا بہت افسوس ہے کہ ایسے موقع پر ہم کو ایسی تحریک کا مقابلہ ہے اور میں اس بات کا یقین نہیں کر سکتا کہ اس تحریک کے ساتھ اہلِ ہند کی سچی خواہشیں وابستہ ہیں...

ملک معظم کی گورنمنٹ نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ موجودہ صورتِ حال میں اپنی ذمہ داریوں کو جو ہندوستان کے امن و بہبودی سے وابستہ ہیں کسی دوسرے ہاتھوں میں سپرد نہیں کر سکتی اور ایسی حکومت کے ہاتھوں جس کی نسبت ہندوستان کی قومی زندگی کے ایک بڑے اور طاقتور حصہ کی مخالفت پورے طور پر موجود ہو، مجھے یقین ہے کہ اس بات

کی ضرورت نہیں کہ میں اس کی اہمیت پر زور دوں کہ یہ ضمانت بہت ضروری ہے اور
ایک سکنڈ کے لئے بھی یہ خیال کرنا حماقت ہوگا کہ ہندوستانی مسائل کا حل اقلیتوں کے
مسائل کو نظر انداز کر کے کیا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ مسائل ہندوستان میں بہت اہمیت رکھتے
ہیں) جنگ کے فوراً ہی بعد نئے قانون کو مرتب کرنے کے لئے ملک معظم کی حکومت اس
بات کے لئے تیار تھی کہ ہندوستان کے خصوصی عناصر کے نمایندوں کی ایک جماعت بنائے۔
(ہم اپنی بقا کے لئے اس وقت جد وجہد کر رہے ہیں اور یقیناً ایسی جد وجہد کے اثناء میں
ہم مباحث قانونی کے لئے وقت نہیں نکال سکتے، اور جس دوران میں کہ لڑائی پر ہی ہماری
پوری توجہ مبذول ہے اس میں ایک قانون وضع کرنے کی جو گتھیاں ہیں انھیں نہیں سُلجھا سکتے)

مجھے یہ بات واضح کر دینا چاہئے کہ ملک معظم کی حکومت اور میں اس مسئلہ کے حل کرنے
کے لئے آج بھی اتنے ہی بے چین ہیں اور اس دستوری انجمن کے پورے دور میں ہمیشہ
میری اور ملک معظم کی حکومت کی طرف سے ابتدا ہوئی ہے مگر کسی موقع پر بھی ایسی تعمیری
تجاویز ہمارے سامنے پیش نہیں ہوئیں جو کہ دنیا اور ہندوستان کے موجودہ حالات میں قبول
کی جا سکتیں، ہم نے اپنی بہترین کوششیں ایسے حل کی تلاش میں صرف کیں جو اتنا واضح
اور ممکن ہو کہ عامتہ سب اُس پر متفق ہو سکیں اور ہر ممکن سعی کی کہ متعلقہ پارٹیاں اپنے خاص
دعووں کو جو ایک دوسرے کے خلاف ہوں۔ ترک کر کے ہندوستان کے مفاد میں اس
حل کو قبول کر لیں لیکن ہم کامیاب نہیں ہوئے ....

یہاں کے حالات پس منظر اور اجزا بالکل حکومت متحدہ (انگلستان و آئرلینڈ) کی طرح
نہیں ہیں اس واقعہ کی حقیقت سے انکار حماقت ہوگا کہ ہندوستان کے قانونی مسائل کا
حل تلاش کرتے وقت چند خاص اجزا کی حقیقت کو نہ مانا جائے تا کہ نظریات کا جو اختلاف
ہے ختم کر دیا جائے اور اس کے ساتھ معاشرت اور روایات کے فرق اور مختلف قوموں
اور سیاسی پارٹیوں کے مزاج کو نظر انداز کر دیا جائے ....
یہ واقعہ کہ ہم اِن اہم سیاسی پارٹیوں کے متنازعہ مقاصد کو ابھی تک نہیں سُلجھا سکے۔
(جن کا سُلجھایا جانا اشد ضروری ہے کیوں کہ بغیر اس کے ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر

گامزن نہیں ہو سکتا، ہم کو اپنے مقاصد سے باز نہیں رکھ سکتا، اور ہمارا مقصد ہمارے اعلان کے مطابق یہ ہے کہ :-

ہندوستان کو جس قدر جلد ممکن ہو درجۂ نوآبادیات تک پہونچا دیں اور جو کوشش کہ ہم نے کی ہے اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ہمیں یہ دعوے کرنے کا حق ہے اور ہم یہ دعوے کرتے ہیں اور آج میں یہ دعوے کرتا ہوں کہ ہندوستان کی مختلف پارٹیوں فرقوں اور طبقوں اور سیاسی لیڈروں کا یہ کام تھا اور ہے کہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور مفاہمت کے امکانات تلاش کریں۔"

اس سال کے واقعات میں ایک اہم پیغام بھی قابل الذکر ہے جو ۲۲ر دسمبر کو پارلیمنٹ کی تمام پارٹیوں کے نمایندوں نے متحدہ طور پر ہندوستانیوں کے نام بھیجا جس میں واقعاتِ ہند پر جن کے باعث جمود پیدا ہو گیا اظہار تشویش کر کے غلط فہمی پر مبنی قرار دیا گیا اور ہندوستان کے وسیع اصولوں کی یکسانی بتاتے ہوئے اختلافی مسائل کی نسبت رائے ظاہر کی کہ کوئی بنیادی اختلاف نہیں، اس کے بعد آزادی کے لئے خطرۂ فنا کی طرف خیال رجوع کراتے ہوئے لکھا کہ :-

"برطانوی عوام کا ناقابل فسخ تہیہ ہے کہ ہندوستان کو پوری سیاسی آزادی دی جائے اور یہ کہ وہ اِس عزم سے ، دگرداں نہیں ہو سکتے۔"

ہم محسوس کرتے ہیں کہ جن ہندوستانی لیڈروں نے حال میں انگلستان کا دورہ نہیں کیا ہے انھیں شاید اس کا پورا اندازہ نہیں کہ اس ملک میں یہ خواہش کتنی زیادہ ہے کہ ہندوستان کو بھی دیگر نوآبادیوں کا درجہ حاصل ہو، کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) کا تمام تخیل ہندوستان کی آزادی کا متقاضی ہے ...... اگر ہندوستان میں یہ تنازعہ ہے کہ منزلِ مقصود درجہ نوآبادیات ہونا چاہئے، یا آزادی کامل، تو یہ ہمارے نزدیک صفت کا تنازعہ ہے، پہلے درجہ نوآبادیات کی حیثیت سے اپنی پوری نشوونما کر دا س وقت رسمی طور پر یا ضابطہ کے طور پر آزادی کامل

کے سوال اٹھانے کا موقع ہوگا، اور ہمیں یقین ہے کہ اس وقت آپ یہ سوال نہ اٹھائیں گے، کیوں کہ آپ کو عملاً معلوم ہوگا کہ نہ صرف آپ کی آزادی محفوظ ہے بلکہ اس کے عمل میں لانے کے مواقع بھی زیادہ ہیں اور آپ اپنی خوشی سے برطانوی دولت مشترکہ کے ممبر رہیں گے، ہم یہ بات پہلے بھی کہہ سکتے تھے لیکن آج پرزور طریقہ سے کہتے ہیں کیوں کہ اس وقت انسانی آزادی کا تحفظ آزادی پسند قوموں کے اتحاد میں ہے۔"

اس کے بعد تمام آئینی مسئلہ کی ازسرِ نو جانچ پر زور دیتے ہوئے اس کی ذمہ داری خود ہندوستانیوں پر ڈالی اور تسلیم کیا کہ:-

"بلاشبہ مرکزی سوال فرقہ وارانہ سوال ہے صرف ہندوستان میں ہی یہ مسئلہ درپیش نہیں ہے کہ ایک ہی ملک میں مختلف فرقوں کے لوگوں کا اتحاد کیوں کر ہو یہ دشواری حقیقی اور بنیادی ہے محض خیالی نہیں اور ہم یہ جانتے ہیں کہ بعض تو اپنے آپ سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ آیا یہ سوال ایک حسابی جمہوریت کے ڈھانچہ میں طے ہو سکتا ہے۔"

پھر برطانوی حکومت کی ذمہ داریوں پر خیال رجوع کراتے ہوئے کہا کہ "بلاشبہ ہندوستان کو اپنی جگہ یہ ماننا چاہیئے کہ حکومت برطانیہ کی کچھ ذمہ داریاں اقلیتوں کے متعلق ہیں اور دیسی ریاستوں کے ساتھ کچھ عملی معاہدوں کی پابندیاں ہیں ان ذمہ داریوں کے متعلق ہمیں عزت کے لحاظ سے تردد ہے یہ جیسا کہ ہندوستان میں اکثر کہا جاتا ہے کہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے اصول پر اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کا کوئی بہانہ نہیں"

اس کے ساتھ ہی یہ سوال قائم کیا ہے کہ "کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ہمیں غیر معقول مطالبات کے ذریعہ سمجھوتہ کو روکے رکھنے کے لئے اقلیتوں کی حمایت کرنی چاہیئے" اور دورانِ جنگ میں آئینی مسئلہ کے حل کو ناممکن بتا کر ایک عارضی وہنگامی اسکیم کی ترتیب کو ہی بہترین طریقہ سمجھا یا ہے اور انھیں باتوں کا اعادہ کیا ہے جو وزیر ہند اور وائسرائے کی تقریروں میں ہوتی رہتی ہیں۔

اس میں فرقہ وارانہ لفظ استعمال کرکے کانگریس کو خوش کرنے کے لئے حقیقت سے چشم پوشی کی گئی ہے حالانکہ اب یہ مسائل بین الاقوامی ہیں۔

باب نوزدہم

وزیر ہند اور وائسرائے کی تقریروں کے بعد جو ۱۲ و ۱۶ ر دسمبر کو انگلستان و ہندستان میں ہوئیں ان سے ایک طرف قرار داد لاہور (پاکستان) کے مخالف پروپاگنڈا میں مجنونانہ جوش پیدا ہوگیا اور دوسری طرف بعد جنگ درجہ نو آبادیات عطا کئے جانے کے وعدہ نے دلوں کو اُمیدوں سے معمور کردیا'

دسمبر کے آخری ہفتہ میں متعدد کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور اُن میں پاکستان اور درجۂ نوآبادیات کے مسائل پر ہی زیادہ بحثیں کی گئیں' اور اس درجہ کو منزل مقصود بنا لیا گیا۔

مہاسبھا نے ہندو راج کا نعرہ بلند کیا اور حکومت کو چیلنج کردیا کہ اگر پاکستانی اسکیم کی مخالفت کا اعلان نہ ہوا تو ۳۱ ر مارچ کے بعد ستیہ گرہ شروع کردی جائے گی۔

ڈاکٹر مونجے نے قومیت ہند کے مفہوم کو نہایت صفائی کے ساتھ علی الاعلان جتا دیا کہ "جو مذہبی فرقہ جغرافیائی خطہ میں غالب اکثریت رکھتا ہو اس کی اپنی قومیت ہوتی ہے"۔ مسٹر اینے نے اینٹی (مخالف) پاکستان کانفرنس کی صدارتی تقریر میں کہا کہ:۔

"ان غلط کار بچوں کو یہ خطرناک راستہ اختیار کرنے سے نہیں روکا جاتا' نوجوانوں کے نام اپیل جو ہندوستان کو ہر قسم کے اختلافات سے بالاتر رکھیں گے محض جذبات کی رَو میں بہہ جانے کا ایک ظاہری خوبصورت ڈھونگ ہے ان نوجوانوں کی تربیت علی گڑھ اور عثمانیہ یونیورسٹیوں میں کس طرح ہوسکتی ہے جب کہ ان کو چلانے والے خود فرقہ پرستی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان کے نزدیک اپنے آبائی وطن کی تقدیس کا اس کے سوا اور کوئی احساس نہیں کہ تاوقتیکہ ہندوستان کے تمام باشندے اسلام قبول نہ کرلیں یا کم ازکم اسلامی یونیورسٹی کے تحت گذارہ کرنے کو تیار نہ ہوں'........

یہ امر ذہن نشیں ہونا چاہئے کہ ایشیا کے اسلامی ممالک کی جن میں رُوس کی مسلمان ریاستیں بھی شامل ہیں کنفیڈریشن (فیڈریشنوں کا اتحاد) ایک ہولناک اتحاد ہوگا

جو یورپ کی مغربی تہذیب ہندوستان اور مشرق بعید کے ویدک اور بودھ تمدنوں کے حق میں زبردست خطرہ ثابت ہوگا جو اس خطرہ سے زبردست ہوگا جو آج محوری طاقتیں پیدا کر رہی ہیں اس ناپسندیدہ اتحاد کو روکنے کا موثر ذریعہ ایک ہی ہے اور وہ ہندوستان میں ایک زبردست مرکزی حکومت کا قیام ہے، آیندہ آئین میں یہ بات خاص طور پر مد نظر رکھنی چاہیئے کہ مرکز طاقتور اور جمہوری ہو جو ہماری سرحدوں پر واقع مسلمانی ملکوں کے دلوں میں جذبۂ احترام و خوف پیدا کر سکے امریکن لائنوں پر فیڈریشن کی بات چیت اب ختم ہونی چاہیئے۔

ہندو مورتی پوجک ہیں اس کی ایک شرط یہ ہے کہ پوجا کی مورتی سالم ہو اس کا کوئی حصہ ٹوٹا ہوا نہ ہو ورنہ اس کی پوجا نہیں کی جا سکتی دریں حالات پاکستان کا خیال ہی ہندوؤں کو ناگوار گزرتا ہے۔"

مسٹر ساورکر نے جو مہاسبھائی لیڈروں میں کانگریس اور گاندھی جی کے محبوب لیڈر رہے ہیں مہاسبھا کے اجلاس منعقدہ مدورا میں اہنسا کو مجنونانہ اصول اور موجودہ ستیہ گرہ کو انتخابی چال قرار دے کر ہندوؤں میں فوجی جوش اور ملک کی صنعتی ترقی کی خاطر جنگ کی کوششوں میں حصہ لینے کی ترغیب دی اور بصورت دیگر یہ خوف بھی دلایا کہ مسلمان ان جگہوں پر قبضہ کرلیں گے اور ایسا فرقہ مضبوط ہو جائے گا جو ہندوؤں کی سرزمین پر ہی ان کو غلام بنانے پر تلا ہوا ہے۔

پھر یہ حقیقت بھی ظاہر کی کہ "پین (اتحاد) ہندو" تحریک سے جو روز بروز طاقت پذیر ہے اور ہندو والیان ملک اس سے دلچسپی لے رہے ہیں اس سے ہی ہندوؤں کے مفاد وابستہ ہیں۔"

انڈین لبرل فیڈریشن کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں لارڈ سنہا نے جنگ کے متعلق کانگریس کے رویّہ پر نکتہ چینی کی۔ صدر اجلاس مسٹر چندر داکر نے کانگریس کی بست[۲] سالہ ناکامیوں کا تذکرہ اور درجہ نو آبادیات کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ:-

"ہم جمہوری حکومت کے خواہاں ہیں لیکن ہم نے آزادی کامل کی قسم نہیں کھائی ہے

کیوں کہ ہم برطانی راج کے ماقبل دَور[۵۷۳] میں جانا نہیں چاہتے اور نہ ہم پورب، پچھم، اُتر، دکھن سے حملہ آوروں کا شکار ہونا چاہتے ہیں۔"

"فرقہ وارانہ مسئلہ لکھنؤ کے معاہدہ سے پیدا ہوا۔ لبرلوں کا عقیدہ تو ہندوستان مقدم ہے وہ ہر معاملہ میں اتحاد ہند اور قومیت ہند کے قائل ہیں۔ مسلم سیاسیات کا پاکستانی اسکول تو پھر ہمیں اُس دَور میں واپس لے جانا چاہتا ہے جب کہ لاتعداد جھگڑے تھے، کاوشیں تھیں، باہمی بغض و کینہ تھا اور آئے دن لڑائیاں ہوتی تھیں۔"

رزولیوشنوں میں غیر مشروط امداد جنگ اور ویسٹ منسٹر[۵] قسم کے درجہ نوآبادیات دئے جانے کے اعلان کا اور مرکز میں قومی نوعیت کی حکومت قائم کئے جانے کا مطالبہ کیا گیا جس کے وائسرائے نگراں ہوں اور ایسی پالیسی میں مداخلت نہ کی جائے جس کو انتظامی کونسل اور مرکزی مجلس وضع قانون کی تائید حاصل ہو۔

دیسی عیسائیوں کی کانفرنسوں میں بھی پاکستان کی مخالفت کی گئی کیوں کہ اس پُر آشوب زمانہ میں حکومت کی امداد کا یہ ایک بہترین طریقہ متصور ہوا کہ عام ہندوؤں کی ہم نوائی کی جائے۔ آل انڈیا کرسچین کانفرنس منعقدہ لکھنؤ میں صدر مجلس استقبالیہ کنور سر مہاراج سنگھ سابق ممبر حکومت ہند اور ڈاکٹر ڈی۔ آر رام چندر راؤ نے حکومت پر سخت نکتہ چینی بھی کی اور جنگی امداد میں حصہ لینے کی ترغیب کے ساتھ پاکستان کی مخالفت میں زور بیان صرف کیا۔ کنور سر مہاراج سنگھ نے کہا کہ "ہم ہندوستانی عیسائی ایک مضبوط متحد اور ناقابل تقسیم ہندوستان میں یقین رکھتے ہیں اور ہم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم اپنے ملک کو فرقہ وارانہ مفاد سے بالاتر رکھنے کو تیار ہیں ہم جُداگانہ نیابت ترک کرنے اور خاص حقوق کے مطالبہ

---

[۵] ایسی نوآبادیات کو تمام توانین کا خواہ وہ پارلیمنٹ کے توانین کے خلاف ہی ہوں وضع کرنے کا اختیار ہے اور معاملات و تعلقات خارجہ اور بحری تجارت وغیرہ میں آزادی ہے ان پر پارلیمنٹ کی حکومت نہیں ہوتی صرف بادشاہ کی حکومت ہوتی ہے ان کے گورنر جنرل اور گورنر بادشاہ کے نمائندے ہوتے ہیں نہ کہ بادشاہ کی حکومت کے اور روایتاً ان کا تقرر ہر نوآبادی کی رائے سے ہی ہوتا ہے۔

کو چھوڑنے کے لئے تیار ہیں، پاکستان ایک وحشیانہ نظریہ ہے اور ہم آہنگی و یک جہتی کی ہر اسکیم سے خارج ہے۔"

ڈاکٹر رام چندر راؤ نے تو عام اخلاق کو بھی پس پشت ڈال کر اور قرار داد کو مسخ کر کے کہا کہ:-

مجھے یقین ہے کہ دُنیا کے جمہوری نظریوں کے مطابق بعد جنگ ہندوستان کو اپنا آئین وضع کرنے کا موقع ملے گا اور ہندوستانی عیسائیوں کا اس میں دخل ہوگا۔ مگر عیسائی لیڈرشپ کا دخل اسی حالت میں موثر ہوگا جب کہ وہ مسئلہ آئین کو نظر ایثار سے دیکھیں نہ کہ خود غرضی سے، ہم پُر خلوص ہیں اور اس سرزمین کے حکمرانوں کے خلاف ہتھیار نہیں اُٹھائیں گے، ہم ان کی عزت و احترام کرتے ہیں انھوں نے ہمارے ساتھ جو بھلائی کی ہے اس کے ہم مشکور ہیں مگر ہم اپنے طریقہ پر اپنا مستقبل بنانا چاہتے ہیں برطانیہ کو طاقت سے دست بردار ہو کر ہندوستان کو حقیقی طور پر آزاد ہونے کا موقع دینا چاہیے لیکن ہمیں قوم کو بچانے اور مادرِ وطن کی امداد کرنے کے لئے اپنی انفرادی آزادی، مال اور زندگی کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے مجھے یقین ہے کہ جلد یا بدیر برطانیہ عظمیٰ مطالبۂ ہند کا جواب دے گا اور طاقت و مرتبہ کی مساوات بخشے گا ...... اس مرتبہ ہمیں برطانیہ پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور جو کام ٹھیک ہے وہی کیا جائے بازی جیتنے والے پتے ابھی ہمارے پاس ہیں، ...... جب کہ ہندوستان کو متحد بنانے کی کوشش جاری ہے اس وقت مسٹر جناح ہمارے ملک کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کرنے کی تعجب انگیز تجویز پیش کر رہے ہیں تاکہ اپنے ہم خیال لوگوں کو خوش کر سکیں اقلیتوں کے مفاد کی حمایت کا دعوےٰ تو کرتے ہیں مگر انھوں نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا کہ عیسائیوں یا پارسیوں یا جینیوں یا سکھوں کو وہ کیا حصہ دیں گے، یہ بالکل ایک خود غرضانہ شورش ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ فلاح و بہبود ملک کو خطرہ میں ڈال کر مسلمانوں کو ایک خاص حصۂ ملک میں یک جا کر لیا جائے۔ خیال کیجئے کہ صرف مسلمانوں کے ایک خاص طبقہ کی خوشی اور اطمینان کی خاطر جن کی کہ ذہنیت شکست پسندانہ ہے تمام ملک کے عیسائیوں

کو جنوب ہند کے ایک گمنام گاؤں میں جمع کر دیا جائے گا[۵] پاکستان ایک جنگلی نظریہ ہے جو کسی اچھی اور مربوط اسکیم کے معیار سے بہت دور ہے اور وہ صرف لڑائی میں ہارتے ہوئے لیڈر کا ایسا نعرۂ جنگ ہے جس سے کہ اس کی فوج کے آدمی اس کے چاروں طرف جمع ہو جائیں جس کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں یا تو ہندوؤں کو نیچا دکھا سکیں یا وہ خودکشی کو نہیں مونھ چھپالیں، اگر اس کے حامی اپنی خطرناک مہم کی خصوصیت کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اس کو خالی باتیں نہیں خیال کرتے تو کیا ان کے پاس اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کوئی خاص طریقہ کار یا اسکیم موجود ہے۔

یہ خیال ممکن ہے کہ کچھ ایسے لوگوں کے لئے جن کے مفاد وابستہ ہوں قابل اطمینان ہو مگر بہت سے غریب مسلمانوں کا اپنے ذرائع آمدنی و ملکیت کے یک لخت تباہ ہو جانے سے سخت نقصان ہوگا، مجھے یقین ہے کہ جب مسلمان عوام کو اس غیر معقول اسکیم کے پورے مفہوم کا پتہ چلے گا تو وہ خود اس کے خلاف بغاوت کریں گے۔"

اس سال کی ایک سیاسی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یونیورسٹیوں کے سالانہ جلسہ ہائے تقسیم اسناد کے ایڈرسوں میں سیاست کو نمایاں جگہ دی گئی فرقہ وارانہ اختلافات جنگ کی امداد اور مستقبل ہند خاص موضوع رہا۔

یکم دسمبر کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے کانووکیشن ایڈریس میں ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی نے پنڈت مالویہ کی قومی فوج کو جو اب عملی میدان میں آنے والی تھی یہ نصیحت کی کہ:

"ہندو کلچر اور عقائد کو از سر نو زندہ کرنے سے نہ صرف ہندوستان کی گم شدہ سیاسی آزادی واپس لانے میں مدد ملے گی بلکہ ساری دنیا میں انسانی روح تخیل و عمل کے اعلیٰ مقام پر پہونچ جائے گی۔"

اس کے بعد اہنسا کو ہندوستان کی حقیقی تعلیمات کے خلاف قرار دے کر کہا کہ:-

"فرقہ وارانہ اختلافات نے ایسی نازک کروٹ بدلی ہے کہ مادرِ وطن کے ٹکڑے

---

[۵] ودیا مندر، اور واردھا کی تعلیمی اسکیموں کا مقصد بھی یہی تھا۔

ٹکڑے کرنے کے لئے مجنونانہ مطالبے کئے جارہے ہیں اور آج جس طاقت کے ہاتھ میں قسمتِ ہند ہے وہ مطالبہ کرنے والوں کی پیٹھ ٹھونک رہی ہے۔"

پھر مقام مدورہ ہندو نوجوانوں کی کانفرنس میں ان نوجوانوں کے جلد کمیونزم (اشتمالیت) قبول کر لینے کی بُرائی کرتے ہوئے کہا کہ:-

"وہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ ہندو خود ایک قوم ہیں۔"

عثمانیہ یونیورسٹی میں سر مارس گوئر نے آئینی مسائل کے متعلق بالتخصیص شعبۂ سیاسیات کے طلبا کو دعوتِ غور و فکر دیتے ہوئے کہا کہ:-

"اگر کوئی طریقہ ایسا ہے جس سے کہ کوئی مشکل مسئلہ کبھی حل نہ ہو سکے تو حقیقتوں کو ماننے سے انکار کر دیا جائے ...... کسی نئے آئین کو اسی وقت زندگی حاصل ہو سکتی ہے جب کہ اس کو ان لوگوں کی جو اس کے تحت میں رہیں عام منظوری حاصل ہو، میرے ملک میں پارلیمنٹری نظام حکومت قائم ہونے کے بعد مضبوط اور موثر اگزکٹو (عاملہ) کی تشکیل کا مشکل مسئلہ حل ہو گیا ہے مگر ہندوستان میں مختلف حالات میں ممکن ہے کہ برطانوی نظام اپنی تمام خوبیوں اور بُرائیوں کے ساتھ یہاں لازمی طور پر موثر نہ ہو ظاہر ہے کہ اگر یہ نظام عامۃً منظور نہیں (عامۃً سے میری یہ مُراد ہے کہ وہ محض اکثریت کو شمار کرنے سے قابل قبول نہ ہو) تو پھر ضروری ہے کہ نعم البدل تلاش کیا جائے جس کی رُو سے ایک ایسی اگزکٹو بن جائے جو رائے عامّہ کے سامنے ذمہ دار ہو مگر واضع قوانین کی جماعت اکثریت کے سامنے بایں معنی ذمہ دار ہونا ضروری نہ ہو کہ وہ ہر وقت اس کو عہدہ سے علٰحدہ کر سکتی ہے"........

کیا کوئی ایسا حل نکل سکتا ہے کہ ہندوستان کا اتحاد تو محفوظ رہے لیکن حکومتوں اور علاقوں کی سرحدیں از سرِ نو تقسیم ہو جائیں اس حالت میں بالکل جدید مسائل سیاسی کے پورے سلسلہ پر ان کی خوبیوں اور بُرائیوں کو سامنے رکھ کر غور کی ضرورت ہے۔"

آخر میں سر مارس نے ریاستوں کے مسئلہ کی اہمیت پر بغیر کسی اظہار رائے کے توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ:-

اگر ہمارا طالبعلم ان طریقوں میں سے کسی طریقہ سے بھی حل تلاش نہ کر سکا تو اُسے ایک

امکان سے دوچار ہونا پڑے گا اور یقین ہے کہ وہ حتی الامکان اپنی نظروں سے اس کو دُور رکھنے کی کوشش کرے گا اور وہ کھلے جھگڑہ کا خطرہ ہے جن لوگوں کی رائے وزن رکھتی ہے اگر انھوں نے یہ نہ کہا ہوتا تو میں ایسے امکان کی طرف اشارہ کی جُرأت نہ کرتا اور میں نے خانہ جنگی کا سرسری ذکر کیا ہوتا، میں نے بلا تشدد خانہ جنگی کا ذکر بھی سُنا ہی لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آیا خوفناک مصیبت کی نوعیت کس طرح غیر متشدد ہو سکتی ہے"

۲۱ دسمبر کو مُسلم یونیورسٹی میں سر سلطان احمد بار ایٹ لا و سابق ممبر حکومت ہند (پٹنہ) نے ایڈرس کیا جس کا زیادہ حصہ جنگ اور فرقہ واری کے لئے مخصوص تھا۔

انھوں نے ہٹلر اور مسولینی کو تہذیب نو کے خلاف جنگ کا ملزم قرار دیا جمہوریت کی امداد کے لئے ترغیب دی کانگریس کی موجودہ پالیسی کی مذمت کرتے ہوئے فسطائی حکومت اور موجودہ حکومت کی ماتحتی کا فرق بتایا کہ "اِس وقت تو ہم صرف ایک حکومت کے ماتحت ہیں اور اُس وقت بالکل غلام ہو جائیں گے"

پھر مسلمانوں کے رویّہ کے متعلق اعلان کرتے ہوئے کہ ہم ہر طرح مخالفت کریں گے سمجھایا کہ:-

اگر اسلام کبھی خطرہ میں تھا یا ہے تو وہ آج ہے!

اس کے بعد فرقہ وارانہ پیچیدگی پر زور بیان صَرف کر کے جس کا رُوئے سخن مسلمانوں کی طرف تھا کہا کہ "جن لوگوں سے صحیح رہنمائی کی اُمید تھی وہ غیر معقول عناصر کو ابھار رہے ہیں صاف تو یہ ہے کہ ہند و مسلم تمدن کے اختلافات کو بہت مبالغہ سے پیش کیا گیا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ سمجھوتہ ممکن نہیں"

اس کے بعد انھوں نے بلند آہنگی سے اور اسلام کے تمام اصل الاصول کو فراموش اور ناممکن کو بہت سہل اور ممکن کر کے کہا کہ "افراد اپنے مذہب کو پرائیوٹ زندگی میں پبلک زندگی سے الگ کیوں نہیں رکھ سکتے اور ہندو و مسلمان اپنے مذہب کو سیاسی زندگی سے ممیز کیوں نہیں رکھتے"

انھوں نے مسئلۂ زبان کو بھی اپنی بحث میں شامل کیا کہ "یہ ہندوستان کی متحدہ زبان ہے اس پر پُر فریب حملے کئے گئے اور ایک مصنوعی زبان کا ہندوستانی کے نام پر پروپگنڈا

کیا گیا"، مگر الزام مسلمانوں پر رکھا کہ عربی فارسی کے غیر ضروری الفاظ بھر کر اس کی خوبصورتی میں فرق ڈال دیا۔

آخر میں کہا کہ" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نسلی اور سیاسی اعتبار سے ہم سب ہندوستانی ہیں ایک ہی فضا میں سانس لیتے ہیں ایک ہی زمین جوتتے ہیں ایک ہی قدیم قابلِ فخر تہذیب کے وارث ہیں اور ہم انفرادی طور پر کچھ بھی سوچیں ہماری قسمتیں ایک ساتھ وابستہ ہیں اختلافات جو ہیں سو ہیں مگر بنیادی طور پر ہماری بنیادی زندگی ایک ہے، سیاسی اور معاشرتی نجات اسی میں ہے کہ ہندو مسلمان مل جل کر ایک بہتر ہندوستان بنانے کی کوشش کریں اور کوئی راہِ نجات نہیں اور اگر کوئی اور راہ اختیار کی گئی تو وہ ابتری، بدنظمی، خوں ریزی اور دائمی محکومی کی طرف لے جانے والی ہے۔"

سر سلطان نے یہ ایڈرس پڑھے جانے سے پہلے صبح کے تمام اخبارات میں بھی شائع کرا دیا تھا، اور بلاشبہ کانگریس اور لبرل حلقوں میں بہت کچھ داد و تحسین کا حق بھی حاصل کر لیا نیز اس انقلاب کی بولتی ہوئی تصویر بھی دکھا دی کہ جو شخص کل شام تک خود مسلمانوں کے اندر فرقہ وارانہ مسائل میں حصّہ غالب اور شہرت رکھتا ہو آج صبح وہ اتنا آزاد خیال ہو گیا کہ اس نے اسلام کو جو دنیا میں ایک عملی مذہب ہے اور جو پبلک اور پرائیوٹ لائف دونوں میں یکساں اور زبردست اثر رکھتا ہے ڈھکیل کر صرف خانگی زندگی میں بند کر دیا۔

اسی زمانہ میں ترقی ہندی کے جلسے بھی جا بجا منعقد ہوئے، مدراس میں ڈاکٹر پٹابھائی سیتارمیّہ (بابو سبھاش چندر کے حریف) نے اپنی تقریرِ صدارت میں کہا کہ:-

ایک ایسے زمانہ میں جب کہ بدیسی کپڑا اور بدیسی زبان دونوں ہم پر ایک کابوس کے مانند مسلط رہے ہیں میرے نزدیک جس طرح کھدر ہماری آزادی کی علامت ہے اسی طرح ہندی بھی قومی آزادی کے لئے مُہرِ تصدیق ہے

پونہ میں سمپورنانند سابق وزیر تعلیم یو۔پی کی تقریرِ صدارت میں اردو و شاعری کے ایرانی میلانات و اثرات پر طعن و طنز کرتے ہوئے کہا گیا کہ" ہندی ہندوستان کی آواز ہے اور کوئی شخص قوم کی آواز کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔ ہندی یا وہ ہندوستانی جو

میرے خیال میں یہ ملک کی زندہ زبان بن کر رہے گی۔۔۔۔ وہ قوم کے دل و دماغ کی ترجمان ہو گی۔"

بابو پرشوتم داس ٹنڈن اسپیکر یو پی اسمبلی نے بمبئی کے جلسہ تقسیم اسناد ہندی کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ "ہندی بر روئے استحقاق ہی ہماری قومی زبان نہیں ہے بلکہ اس کی بدولت ہم کو ہندوستان کی ضروری آزادی حاصل ہو گی۔"

مسٹر ایم این رائے نے اس سال ایک نئی جماعت ڈیموکریٹک پیپلس کانفرنس (مجلس جمہوریت عوام) قائم کی اور اسی ہفتہ دسمبر میں بمقام بمبئی اس کی افتتاحی تقریر میں کہا کہ:۔

اگر موجودہ حکومت کی جگہ کانگریسی حکومت نے لے لی تو عوام کی مجلسی و معاشی حالت میں کسی قسم کا فرق نہیں آئے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کی رہنمائی تہذیب نو کے خلاف ایک ردِ عمل ہے کانگریس اپنے افعال سے رجعت پسند اور غلط کار ثابت ہو چکی ہے گاندھی ازم کی ہرگز یہ خواہش نہیں کہ ہندوستان مادی اور روحانی آزادی کے مراحل طے کرے۔

موجودہ آئینی تعطل کے سلجھانے کا سب سے زیادہ انحصار مسلم لیگ پر ہے مسلم لیگ اس کے لئے کوئی قدم نہ اٹھائے تو صوبوں میں وزارتیں بنانے کا گرم جوشانہ خیر مقدم نہیں ہو سکتا، دوسری پارٹیاں مسلم لیگ کے فیصلۂ آخر کے متعلق مذبذب ہیں ہندوستان کو موجودہ آئینی تعطل سے نجات دلانے کی ساری ذمہ داری مسلم لیگ پر ہے۔

آزادی ہند کے لئے جنگ کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ مسلم لیگ سے اپیل کریں کہ وہ بروقت رہنمائی کرے جہاں تک مجلس جمہوریت عوام کا تعلق ہے پاکستان اسکیم کسی قسم کا بھوت نہیں ہے کیونکہ ہماری پارٹی اسے بہت پہلے سمجھ چکی ہے حالات ہندوستان کا یہ تقاضا ہے کہ اسے آزاد جمہوریتوں کی ایک فیڈریشن بنا دیا جائے۔

ہندوستان کے لئے جمہوریت بناتے وقت اس اصول کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس لئے پاکستان کی اسکیم سے کسی شخص کو خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے لیکن سردست اس نے ایک ڈراؤنی صورت اختیار کر لی ہے۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا لیکن میں نے محض اپنی پارٹی کا زاویۂ نگاہ پیش کر دیا ہے تاکہ مسلم لیگ سے تعاون کیا جا سکے

اور ملک و قوم کے مشترکہ دشمن سے مقابلہ ہو سکے ۵۸

اسی طرح ایک ڈنر کے موقع پر جو مسٹر جمنا لال مہتہ نے بمبئی کے ممتاز شہریوں کو دیا تھا، مسٹر ایم این رائے نے کہا کہ "فسطائیت کے خلاف جنگ میں ملک کی پارٹیوں کے اتحاد کی راہ میں پاکستان فوری مسئلہ کی صورت میں حائل نہیں ہے، اگر اس سے مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں تو میں اس کے خلاف ہوں .... میں پاکستان کے متعلق لاہور کے رزولیوشن کو اُس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا جس سے عام طور پر لوگ دیکھتے ہیں، ہندوستان جیسے ملک میں جدید وحدانی طرزِ حکومت کا قیام ناممکن ہے یہاں کوئی نہ کوئی فیڈریشن بنے گا جس میں زبان اور مذہب کی بنیاد پر علاقوں کے اتصال کی گنجائش ہوگی۔

اسی پُرشور مخالفت کے زمانہ میں ۲۵ دسمبر کو صوبہ مسلم لیگ کا اجلاس الہ آباد میں منعقد ہوا، صدر مجلس استقبالیہ مسٹر ظہور احمد اور صدر اجلاس نواب محمد اسمٰعیل خاں نے اپنے خطبات صدارت میں اور دیگر سیاسی زعما نے اپنی تقریروں میں قرار داد لاہور کی پوری طرح توضیح و تشریح کی اور آخر میں متفقہ طور پر حسب ذیل رزولیوشن تمام شبہات و شکوک اور اعتراضات کو ملحوظ رکھ کر پاس کیا گیا۔

رزولیوشن

پراونشل مسلم لیگ صوبہ متحدہ کا یہ سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کی اس تجویز کی جس کو عرفِ عام میں پاکستان کہتے ہیں پُرزور تائید کرتا ہے، یہ تجویز ہندوستان کے سیاسی مسئلہ پر کامل غور و خوض کے بعد منظور کی گئی تھی اور در اصل یہ تجویز ان عمیق اور واقعی و شدید اختلاف کا لازمی نتیجہ ہے جو اس وسیع مملکت میں رہنے والی اقوام کے مذہب و کلچر اور تاریخی روایات میں موجود ہیں۔

آج تیس سال قبل ملکی سیاسیات میں مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ دیگر اقوام سے بالکل علٰحدہ وہ ایک جُدا ملت ہیں تسلیم ہو چکا ہے اور مجالس قانون ساز میں انتخاب جُداگانہ کے ذریعہ اپنے نمایندے بھیجنے کا حق تسلیم کیا جانا اس کی صریح و بدیہی شہادت ہے جس پر دوسری جماعتوں نے ۱۹۱۶ء میں اتفاق کر لیا تھا اس کے علاوہ صوبہ بمبئی سے علٰحدہ کر کے سندھ

کا ایک جدا صوبہ کی حیثیت سے قائم کیا جانا بھی مسلمانوں کے اس مطالبہ کا تمتہ تھا کہ ہندو اور مسلم صوبوں میں توازن قائم کیا جائے اور اب ہندوستان میں مسلم منطقے قائم کئے جانے در اصل اس اصول کا لازمی اور قدرتی نتیجہ ہے جو عرصہ دراز سے تسلیم ہو چکا ہے اور جس حق سے مسلمان عرصہ سے مستفید ہو رہے ہیں۔

ان حقائق کے پیش نظر مسلمانانِ ہند کو مسٹر ایمری وزیر ہند کی اس تقریر سے جو انھوں نے ۱۲ دسمبر ۱۹۴۰ء کو کی علیحدہ منطقے قائم کئے جانے کے مطالبے کے متعلق شدید بدگمانی اور خطرہ پیدا ہو گیا ہے، مسلمانوں کے لئے اسلام سب پر مقدم ہے اور ہندوستان کے مفاد کا سب پر مقدم تصور کرنا مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول ہے۔

مسلمان کسی ایسے عقیدہ اور تصور کو گوارا نہیں کرتا جو اسلامی جذبات و حسیات سے متصادم ہو یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ مسٹر ایمری نے ہندو اکثریت کے زچ کرنے والے طریقۂ کار سے مرعوب ہو کر اس کی دل دہی و دلداری کے خاطر مسلمانوں کے مطالبہ کے متعلق گلفشانی کی ہے۔

لہٰذا یہ اجلاس برٹش گورنمنٹ پر یہ واضح کر دینا ضروری تصور کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش اور طرز عمل سے کہ حالاتِ موجودہ میں اس ملک کے اندر صلح و آشتی کی فضا قائم رکھی جائے غلط معنی لے کر بے جا فائدہ نہ اٹھائے اور اس حقیقت کو فراموش نہ کرے کہ مسلمان اپنی آواز سنوانے کی قدرت رکھتے ہیں مسلمان ہمیشہ سے باعزت صلح کے لئے تیار رہے اور آج بھی ہیں جیسا کہ ابھی حال میں مسٹر جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ نے ظاہر کر دیا ہے مگر وہ اس طرح اپنے مطالبہ پر ضرب نہیں لگنے دیں گے، مسلمانوں نے عزم کر لیا ہے کہ وہ اپنے مطمح نظر کو حاصل کرنے کی خاطر بڑی سی بڑی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ تجویز ہذا وزیر ہند اور مسٹر جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کے پاس بذریعہ تار بھیجی جائے۔"

یکم جنوری ۱۹۴۱ء کو مسٹر جناح نے بھی لندن کے ایک اخباری نمایندہ کے ساتھ ملاقات میں یہ امر واضح کر دیا کہ:-

برٹش گورنمنٹ برٹش پارلیمنٹ اور برٹش پبلک نے اگر کانگریس کے پروپاگنڈا سے متاثر ہوکر یہ سمجھ لیا کہ پاکستان کے متعلق ہندوستانی مسلمانوں کا مطالبہ صرف جوابی سودا بازی کی روح پر مبنی ہے تو سخت غلطی کی مرتکب ہوگی، علاوہ بریں اس مطالبہ کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسلم لیگ کا رویہ مفاہمت کا نہیں یہ امر قابل افسوس ہے کہ وزیر ہند نے ۱۴ اگست کی تقریر کے بعد مشکوک تقریریں شروع کردی ہیں خاص کر ان کی آخری تقریر تو جس میں "مقدم ہندوستان" کا نعرہ لگایا گیا ہے بہت ہی مشکوک ہے ممکن ہے کہ پروپاگنڈا کے لحاظ سے یہ اچھی ثابت ہو لیکن اس سے مسلمانوں کے اعتماد ضائع ہونے کا امکان ہے کیوں کہ انھوں نے اب تک اپنے تنظیمی ادارہ مسلم لیگ کے ذریعہ فراخ دلانہ غیر جانبداری کا رویہ اختیار کر رکھا ہے وزیر ہند کے لئے پروپاگنڈا ایجنسی کا کام کرنا مناسب نہیں کیوں کہ ان کی طرف سے جو اعلان کیا جائے وہ سرکاری نوعیت رکھتا ہے اور اس سے ملک معظم کی حکومت کی پالیسی ظاہر ہوتی ہے۔"

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر رادھا کمود مکرجی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی نے جو ایک اسکیم کے مصنف بھی ہیں ۲ جنوری ۱۹۴۱ء کو مسٹر جناح سے ملاقات میں پاکستان کے متعلق تبادلہ خیالات کیا، جس کو مسٹر جناح نے پریس میں بھی شائع کرا دیا۔

ڈاکٹر موصوف نے سوال کیا کہ "اگر آئین میں تمام فرقوں کی مکمل طور پر کلچرل آزادی کی ضمانت کردی جائے تو کیا آپ کے نقطۂ نظر کے موافق ہوگی۔

جواب۔ جب تک مرکزی حکومت وحدانی قسم کی ہے اس وقت تک یونٹ (جماعت متحدہ) کی آزادی کے متعلق گفتگو بالکل ناممکن ہے اور یہ مسئلہ صرف تمدنی ہی نہیں ہے بلکہ سیاسی، اقتصادی، اور معاشرتی بھی ہے جو صرف ہمارے منشا کے مطابق اپنے اپنے وطن کی سر زمین پر ہی ہوسکتا ہے بشرطیکہ ریاستیں آزاد ہوں جن پر کہ ہندوستان کے کسی مرکز کا کوئی قابو نہو، تحفظات خواہ قانونی ہوں یا کسی اور قسم کے اس وقت تک بالکل بے سود ہیں جبتک کہ مرکز پر ہندوؤں کی فرقہ وارانہ اکثریت موجود ہے تحفظات صرف کاغذ پر رہیں گے اس لئے موجودہ حالات و واقعات کے پیش نظر میں نہ تو اس سے بہتر کوئی بات سمجھتا ہوں

اور نہ اس سے بہتر کسی بات کا خیال کر سکتا ہوں کہ مسلمانوں کو میرے مجوزہ وطنی علاقوں میں علیحدہ کر دیا جائے۔

سوال - کیا یہ آزاد مسلمان ریاستیں دوسری مسلم طاقتوں کے ساتھ مل کر ہندو ہندوستان کے لئے خطرہ نہوں گی۔

جواب - مسلمان ان علیحدہ وطنی علاقوں میں جہاں کہ ان کی اپنی حکومت ہوگی یقیناً بے انتہا بے وقوف ہوں گے اگر وہ دوسری مسلم طاقتوں کو اپنے اوپر حکومت کرنے کی دعوت دیں۔

زمانہ حال میں مشرق قریب (نیر ایسٹ) اور مشرق بعید (فار ایسٹ) کی مسلمان حکومتوں کی ترقی اور تاریخ سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ موجودہ رجحان اپنے ملک کی حکومت کی جانب ہے، لہذا برخلاف اس کے مجھے پورا یقین ہے کہ ہندو ہندوستان مسلم ہندوستان کو نہ صرف ایک ہمسایہ دوست پائیگا، بلکہ وہ ہندوستان کو غیر ملکی حملہ سے بچانے میں بھی بہت معاون ثابت ہوگا اور اس طرح ہندو ہند اور مسلم ہند کے مفاد میں منرو ڈاکٹرین[1] پر عمل ہوگا اور اس لحاظ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شمالی مغربی مسلم آزاد ریاستوں کو ہندوستان کے سرحد کی فوجی چوکی خیال کرنا چاہیئے۔

تھوڑے ہی عرصہ میں پاکستان کی تحریک نہ صرف ہندوستان میں بلکہ انگلستان میں بھی ایک اہم سیاسی موضوع بن گئی اور ایک سال کے اندر اندر مختلف زبانوں

---

[1] ۱۸۲۳ء میں امریکہ کے متعلق روس اور چند دیگر طاقتوں نے ایک پالیسی قرار دینی چاہی تو پریسیڈنٹ منرو نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ:-

"امریکہ کا بر اعظم جو اس وقت تک خود مختار اور آزاد ہے وہ کسی یورپین طاقت کی کسی اسکیم کو برداشت نہیں کر سکتا جس سے وہاں کے باشندے امریکہ میں آکر بسیں ہم اس کرہ ارض پر اپنے خود مختار ہیں امریکہ کا سیاسی نظام متحدہ قوتوں کے نظام سے بالکل مختلف ہے اگر کسی طرح انھوں نے اپنے نظام کو امریکہ میں داخل کرنے کی کوشش کی تو اس سے بہت سے خطرات کا اندیشہ ہے۔"

اس وقت سے ہر موقع پر یہی اصول قائم رہا ہے اور اس کا مقصد یہی ہے کہ امریکہ کے معاملات میں کسی دوسری طاقت کو مداخلت کا کوئی حق نہیں اور نہ وہ کسی کے معاملات میں مداخلت کرنا چاہتا ہے اور یہی اصول امریکہ کی قومی پالیسی ہے جس کو اصول منرو بھی کہتے ہیں۔

میں ایک وسیع لٹریچر فراہم ہو گیا۔

اس عرصہ میں مختلف اسکیمیں بھی شائع ہوتی رہیں جن سے مسلم لیگ کا کوئی دفتری تعلق نہ تھا لیکن مخالفین نے رنگ آمیزی کے ساتھ ان پر اعتراضات ومباحث شروع کر دیے۔ حالانکہ قرارداد لاہور میں صرف ایک بنیادی اصول پیش کیا گیا تھا اور اسکیم مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی کی تاسیس کر دی گئی تھی جو اپنی اسکیم ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کرے گی اور غور وبحث کے بعد مختتم ہو کر منظر پر آئے گی۔

مگر فروری میں بعض اخبارات نے پاکستان کی ایک اسکیم مسلم لیگ کمیٹی کی سفارشات کے عنوانات سے شائع کر دی جس کی مسٹر جناح نے فوراً تردید کی اور لفظ پاکستان کے متعلق بھی قرارداد لاہور کا اعادہ کر کے یہ تشریح کی کہ:-

"بعض لوگوں کے دماغ میں لفظ پاکستان کے استعمال پر کچھ الجھن ہے یہ لفظ اس وجہ سے اب لاہور کے رزولیوشن کا مرادف ہو گیا ہے کہ اس رزولیوشن کو جو اوپر نقل کیا گیا اس ایک لفظ میں بتانا اور اس کا ذکر کرنا آسان ہے، اسی لئے برطانوی اور ہندوستانی اخبارات نے مسلمانوں کے اس مطالبہ کا ذکر کرنے کے لئے جو لاہور کے رزولیوشن میں درج ہے اس لفظ کو اختیار کر لیا ہے مجھے واقعی اس میں کوئی اعتراض نہیں معلوم ہوتا اور میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض لوگ اس رائی کا پہاڑ کیوں بنا رہے ہیں۔"

۲۲ فروری ۱۹۴۱ء کو بمقام دہلی ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی:-

ورکنگ کمیٹی مسٹر ایمری وزیر ہند کے ان تازہ بیانات کو بنظر ناپسندیدگی دیکھتی ہے جو ان کے سابقہ بیانات کے خلاف یہ اثر قائم کرتے ہیں کہ ملک معظم کی گورنمنٹ اب بھی ایسے دستور کے امکانات پر غور کر رہی ہے جو ہندوستان کے اقتصادی اور سیاسی اتحاد پر مبنی ہو اور جن سے مسلمانوں کے دل میں سخت شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ورکنگ

کمیٹی یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہے کہ لفظ ہندوستانی اس سے کہیں زیادہ وسیع تر اقوام پر حاوی ہے جتنی پر کہ لفظ یورپین ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ مسٹر ایمری اپنی اُن تمام ذمہ داریوں کے ساتھ جو بحیثیت وزیر ہند اُن پر عائد ہیں اس قسم کے نعروں کی طرف مائل ہوں جیسے "ہندوستان سب پر مقدم ہے" ہندوستان کے مسلمان اس پر نازاں ہیں کہ وہ ہندوستانی ہیں اور اس پر اُن کا راسخ اعتقاد ہے کہ ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لئے ہے۔ لاہور کا رزولیوشن اسی اسپرٹ میں منظور کیا گیا تھا کیونکہ مسلمانوں کو یقین ہے کہ ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا یہی ایک ایسا حل ہے جس سے اس وسیع براعظم کے تمام عناصر، مفاد اور آبادی کے درمیان امن، اتحاد اور اطمینان قائم ہو سکتا ہے۔

ورکنگ کمیٹی پھر اس کا اعادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے اس رزولیوشن پر قائم ہے جو اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ لاہور میں پاس ہوا تھا۔ اور جس میں اس نے دو بنیادی اصول قائم کر دئے تھے جن پر ہندوستان کا آئندہ دستور مبنی ہونا چاہئے۔ یعنی یہ کہ جغرافیائی حیثیت سے ایسے متصل علاقے جن کی ضرورت کے مطابق ملکی لحاظ سے اس طرح حد بندی کر دی گئی ہو کہ جن علاقوں میں تعداد کے اعتبار سے مسلمانوں کی اکثریت ہے جیسے ہندوستان کے شمالی و مغربی اور مشرقی منطقوں میں وہ خود مختار حکومت قرار دیئے جائیں اور جن کے اجزائے ترکیبی اندرونی طور پر خود مختار اور خود اختیار رہیں۔

علاوہ ازیں دو اور قراردادیں منظور کی گئیں کہ :-

(۱) ہر سال ۲۳ مارچ کو قرارداد پاکستان کے اصولوں کی تشریح کی جایا کرے اور یہ امر ذہن نشین کیا جائے کہ ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا یہی مستقل اور پُر امن حل ہے۔

(۲) ہر تیسرے مہینہ مسلم لیگ کا ہفتہ منایا جائے جس میں صوبوں اور ضلاع کی لیگیں مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام لوگوں کو سمجھائیں اور اس کے ممبر بنائیں اور مسلمانوں کی اقتصادی، معاشرتی، اور تعلیمی ترقی کے لئے تعمیری پروگرام اختیار کیا جائے

۲۲ فروری کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس میں بھی ورکنگ کمیٹی کی قراردادیں منظور کی گئیں، نیز سول نافرمانی کے متعلق کونسل نے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی:-

کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ رائے ہے کہ کانگریس کی سول نامتابعت کا مقصد یہ ہے کہ حکومت برطانیہ پر اس طرح دباؤ ڈال کر اسے وہ روش ترک کرنے پر مجبور کیا جائے جو ہندوستان کے آیندہ دستور کے سلسلے میں اس نے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے متعلق اختیار کی ہے اور نیز اس پر کہ وہ کانگریس کے وہ مطالبات پورے کرے جن سے مسلمانوں کو بنیادی طور پر اختلاف ہے کیونکہ یہ مطالبات مسلمانوں کے اصل مفاد کے لئے مضر ہیں۔

خود مسٹر گاندھی نے اپنے اخبار ہریجن میں وائسرائے کے اس بیان کے بعد جو ۵ نومبر ۱۹۳۹ء کو انھوں نے دیا تھا لکھا ہے کہ "تاوقتیکہ مسلم لیگ کے ساتھ کوئی قابلِ عمل تصفیہ نہ ہو جائے سول نامتابعت کرنا لازماً لیگ کی بھی مخالفت ہو جائیگی"۔

بغیر لیگ سے سمجھوتہ کئے آزادیٔ تقریر کے بہانہ سے سول نامتابعت کرنا اپنے سابقہ بیانات کو منسوخ کرنے اور معاملات کو اُلجھانے کا ایک بدنما طریقہ ہے۔ ابھی چند دن ہوئے کہ (اخبارات میں) یہ بیان کیا گیا کہ مسٹر گاندھی نے مہاسبھا کے سکرٹیری سے حسب ذیل الفاظ میں خطاب کیا "اگر ہندو مہاسبھا اس طرف مائل ہے تو وہ مرکزی گورنمنٹ کی ازسرِنو تنظیم میں شریک ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کہ کانگریس بھی ایسا کرے یہ سوال اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ کانگریس کے مطالبات پورے نہ ہو جائیں"۔

مذکورۂ بالا بیان سے یہ واضح ہے کہ کانگریس حکومت برطانیہ سے اپنے مطالبات پورے کرانے کے لئے لڑ رہی ہے۔ اس لئے مسلم لیگ کی کونسل کو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مسٹر گاندھی جس مقصد کے لئے اور جس نیت سے اس شدت کے ساتھ سِتیہ گرہ کی تحریک چلا رہے ہیں" وہی ہیں جو مسلم لیگ سمجھ رہی ہے اور مسلم لیگ کی کونسل برطانوی گورنمنٹ کی توجہ اس طرف مبذول کرانی چاہتی ہے کہ اگر اس نے کانگریس کو کوئی ایسی

مراعات دیں جن کا مسلمانوں کے مطالبات پر مضر اثر پڑا یا وہ ان کے خلاف ہوئیں تو مسلم لیگ اپنی تمام قوت سے ان کی مخالفت کرے گی اور مسلم لیگ یہ ثبوت کر دینا چاہتی ہے کہ اگر صورت حال اس کی مقتضی ہوئی تو وہ اس ملک کے مسلمانوں کے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لئے جیسی ضرورت ہوگی (ستیہ گرہ کی) اس جدوجہد میں مداخلت کرے گی اور عمل کرے گی۔

اس قرارداد کی تحریک و تائید میں جو تقریریں ہوئیں ان کے سلسلہ میں مسٹر جناح نے بھی ایک مختصر تقریر میں کہا کہ:-

مسٹر گاندھی ہر معاملہ میں اور ہر وقت لوگوں کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ کانگریس کا مطالبہ اصل میں ہندو راج کا مطالبہ ہے۔ مسلمان ہر بالغ کے ووٹ کی شرط کے ساتھ نہ کانسٹی ٹوئینٹ اسمبلی قبول کر سکتے ہیں اور نہ ایسی نیشنل گورنمنٹ جس کا مطالبہ کانگریس نے اپنے پونا کے رزولیوشن میں کیا تھا۔

مسٹر گاندھی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ وہ بغیر مسلمانوں سے سمجھوتہ کئے ہوئے ستیہ گرہ نہیں کریں گے۔ لیکن جب برطانویوں نے کانگریس کے وہ مطالبات منظور نہیں کئے جو ایک کے بعد ایک مسٹر گاندھی اور ان کے لفٹنٹوں نے پیش کئے تو مسٹر گاندھی پہلو بدل کر آزادی تقریر پر آ گئے، زبان سے کہتے ہیں کہ میں حکومت برطانیہ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا مگر واقعی انھوں نے اس دعوے کے ساتھ ستیہ گرہ شروع کر دی کہ ان کو یہ آزادی دی جائے کہ وہ اپنی قوم کو جنگ میں مدد نہ دینے کی تبلیغ کریں۔

کوئی گورنمنٹ جو اس طرح موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو جس طرح کہ اس وقت حکومت برطانیہ ہے اس کو گوارہ نہیں کر سکتی۔ مسٹر گاندھی کا اصل مقصد یہی کہ حکومت برطانیہ کو دبا کر کانگریس کا مطالبہ منظور کرنے پر مجبور کر دیں۔ اگر حکومت برطانیہ یہ مطالبہ مان لے تو یہ ان مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی ہوگی جنھوں نے باوجود اشتعال ایسا غیر جانبدارانہ طرزِ عمل قائم رکھا۔ جو حکومت برطانیہ کے لئے مفید ہے اور جہاں تک جنگ کی سعی کا تعلق ہے حکومت برطانیہ کے لئے کسی قسم کی دشواریاں پیدا نہیں کیں۔ اب

یہ قطعی ہے کہ ایسا حل جو ان سب کے لئے مفید ہو جن کا اس معاملہ سے تعلق ہے صرف مسلم لیگ کی وہ قرارداد لاہور ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ان علاقوں میں آزاد حکومتیں قائم کردی جائیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ کانگریس کے حق میں حکومت برطانیہ کی طرف سے کوئی ایسی رعایت یا مجبورانہ پیشکش جو لاہور کے رزولیوشن کے اصولوں کے خلاف ہو ہم ہرگز منظور نہیں کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ مسٹر گاندھی، لارڈ لنلتھگو، مسٹر ایمری اور مسٹر چرچل اس رزولیوشن پر غور کریں جو آج ہم عمداً اور اخلاص کے ساتھ منظور کر رہے ہیں۔ ہمارے قدم اب اِس جگہ سے واپس نہیں جائیں گے۔

اس قرارداد کے بعد اقتصادی و معاشرتی اصلاح کے متعلق یہ قرارداد منظور کی گئی:۔

(۱) اتحاد باہمی کے طریقہ پر گھریلو حرفتوں کو ترقی دلائی جائے اور مرکزی اسٹور قائم کئے جائیں۔

(۲) گاڑھے کی ترویج کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان شادی و غمی اور عید و بقرعید کے موقعہ پر خصوصیت سے گاڑھا استعمال کریں۔

(۳) تعلیم بالغاں کے لئے شبینہ مدارس قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۴) غیر اسلامی رسوم ترک کرائے جائیں۔

(۵) سودی قرضہ شادی و غمی وغیرہ کے موقعہ پر نہ لیا جائے۔

(۶) منشیات اور جوا وغیرہ بند کرایا جائے۔

(۷) مسلمانوں میں پیشوں کی بنا پر ہندوانہ تخیل کی پیروی میں جو قومیں بن گئی ہیں ان میں صحیح اسلامی برادری اور مساوات کا تخیل پیدا کرایا جائے اور ان سے اتحاد و یک جہتی پیدا کرانے کی تدابیر فوراً عمل میں لائی جائیں اور موجودہ تفریق مٹائی جائے۔

(۸) چھوٹے چھوٹے تنازعات کو طے کرنے کے لئے پنچائیتیں قائم کرائی جائیں اور عدالتوں میں مقدمہ بازی اور اسراف بے جا سے اجتناب کیا جائے۔

(۹) مسلمانوں کو تجارت کی طرف مائل کیا جائے۔

(۱۰) اصلاح دیہات کی ترقی کی کارروائیوں میں پورا پورا حصہ لیا جائے"۔
کانگریسی حکومتوں سے مستعفی ہو جانے کے بعد کئی ہندو مسلم تہوار ہوئے لیکن ان میں نسبتہً بہت امن و امان رہا البتہ بعض مقامات میں جہاں مہاسبھائی تعصب کے ساتھ اقتدار و اثر غالب تھا فسادات رونما ہوئے، عیدالضحیٰ میں کئی جگہ قربانی کی مزاحمت کی گئی اور محرم میں بھی جھگڑا کیا گیا۔
محرم کے فسادات میں جبل پور کا فساد سخت تھا اور چونکہ یہاں مہاسبھائی عنصر کا غلبہ تھا بلا وجہ فائرنگ کی گئی اور سی، پی گورنمنٹ کے پبلسٹی افسر نے محرم کے جلوس اور ان حالات و اسباب کے متعلق جن میں کہ پولس نے فیر کئے ایسی رُوداویں اور خبریں گھڑ کر اخبارات کو فراہم کیں جن سے عامتہً ان مقتولین کی نسبت جو اس آتشباری میں مارے گئے بدظنی پیدا ہو، نیز اخبارات کو ہدایت کی کہ ان خبروں کا ذریعہ بتائے بغیر مشتہر کریں، حکومت نے اس آتشباری کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن بھی قائم کیا مگر تحقیقات سے قبل ہی چیف سکریٹری نے سرکاری بیان شائع کرکے اس میں رائے کا بھی اظہار کردیا،
اگرچہ اس صوبہ میں بھی مشیر حکومت قائم ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ عملاً ہندو حکومت بدستور موجود ہے۔
اس واقعہ کے اور حکومت کے رویّہ کے متعلق بھی کونسل مسلم لیگ نے پرزور مذمت کی۔
سندھ میں تحقیقاتی کمیشن نے مسجد منزل گاہ کی نسبت جو رپورٹ لکھی اس کے نتیجہ میں یہ مسجد مسلمانوں کے سپرد کردی گئی اور انھوں نے نہایت شان کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی لیکن اس صوبہ کا وزارتی قضیہ بدستور جاری رہا اللہ بخش وزارت کے بعد میر بندہ علی خاں کی وزارت قائم ہوئی جس میں چار مسلمان اور دو ہندو تھے صدر کانگریس نے اس کے درہم برہم کرنے کی سخت کوشش کی جس میں ہر قسم کی دسیسہ کاری کی گئی۔ اور بالاخر ہندوؤں اور اللہ بخش اور کانگریس کی متفقہ کوشش سے وزارت کو مستعفی ہونا پڑا۔ یہ قضیہ آئندہ تاریخ کا ایک اہم باب ہوگا۔

اللہ بخش وزارت کے زمانہ میں میونسپل بورڈ میں مخلوط حلقہائے انتخاب کی ترویج کا مسودہ قانون پاس ہو گیا تھا اور لوکل بورڈز کے لئے اسمبلی میں پیش تھا لیکن اس کے متعلق سندھ اور سندھ سے باہر پُرزور مخالفت کی گئی اور وہ ہنوز نافذ نہیں کیا گیا لیکن چوں کہ خطرہ ہنوز موجود ہے اس لئے کونسل نے ایک رزولیوشن کے ذریعہ حکومت کو متنبہ کر دیا اور بصورت دیگر اسمبلی کے ممبروں کو مخالفت پر آمادہ کیا۔

چوں کہ مسٹر ایمری موجودہ وزیر ہند کو ہندوستان سے پیدائشی تعلق ہے اس لئے وہ کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں کھوتے کہ مسائل ہند پر تقریر نہ کریں یا کوئی بیان نہ دیدیں لیکن ہر مرتبہ مطلب و مفہوم ایک ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ "ہندوستان مقدم" کی تقریر کے بعد ۲۳ر جنوری ۱۹۴۱ء کو ایک اخباری انٹرویو کے سلسلہ میں جو بیان دیا اس میں بھی آئندہ دستور اور اس کی ہیئت وضعی وغیرہ کو بتاکر تلقین کی کہ ہندوستان کی جماعتوں کو بہبودی ہند کے لئے متحد ہو جانا چاہئے۔ حکومت کی پیشکش اب بھی موجود ہے اور یہ کہ اگر نازی وفاشی دنیا پر چھا گئے تو ہندوستانیوں کی امیدیں خاک میں مل جائیں گی مگر چوں کہ اب حقائق کی روشنی پر پردہ ڈالا جانا ناممکن ہو گیا ہے اس لئے دبے الفاظ میں ان کے متعلق کچھ نہ کچھ کہنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اسی بیان میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ "موجودہ اختلافات کا ایسا حل تلاش کرنا چاہئے کہ مختلف طبقات ہند اس پر مطمئن ہو جائیں کہ وہ اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے تمدن و اصول کو اپنے اپنے طور پر فروغ دے سکتے ہیں۔"

اس کے بعد ۲۴ر فروری کو پھر تقریر کی جس میں ہندوستان کو دولتِ مشترکہ برطانیہ کا حصہ دار بنانے کے مطمح نظر کو ظاہر کرتے ہوئے اس کے حصول کے سلسلہ میں قانون ہند ۱۹۳۵ء کو ایک بڑا اقدام قرار دیا اور چار صوبوں میں اس کے عملدرآمد کو سراہا اور دیگر صوبوں کے سیاسی جمود کو کانگریس کے غلط دعووں پر مبنی کرتے ہوئے کہا کہ :-

"اس پارٹی نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی فوری اور غیر مشروط آزادی کا دعویٰ کیا بلکہ جمہوریت کے نام پر ہندوستان کی پیچ در پیچ قومی زندگی کے دوسرے اہم عناصر

کے حقوق پر بھی فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی پھر مسلمانوں کی ۹۰ ملین آبادی اور ریاستوں کی مختلف تاریخ پر اظہار رائے کرتے ہوئے اختتام جنگ پر ملک معظم کی حکومت کی طرف سے ہندوستانی خیالات سے متعلق دستور دیئے جانے کے وعدہ کا اعادہ کیا اور اس کی یہ شرط قرار دی کہ یہ اس طرح کا ہوگا جیسے کہ اور وفاقی دستور ہوتے ہیں اور جس کی بنیاد ہندوستان کی قومی زندگی کے اہم عناصر کی بنیاد پر ہوگی"

مسٹر ایمری نے اس تقریر میں کانگریس کے احتجاج کو مساعی جنگ میں خلل انداز بناتے ہوئے اعتراف کیا کہ اس ادارہ میں نازیت اور فسطائیت زور پکڑ رہی ہے۔

کانگریس کی پوری تاریخ اس امر کی علی الاعلان شہادت دیتی ہے کہ اس کا نظریۂ قومیت صرف ہندوؤں اور وہ بھی اعلیٰ ذاتوں تک محدود رہا ہے اور یہ شہادتیں اس تاریخ میں جابجا موجود ہیں۔

مسلمانوں کو اس میں شریک کرنے کی جو کوشش کی گئی وہ مغربی قوموں کو مغربی قومیت کے نقطۂ نظر سے دھوکہ دینے کے لئے تھی انھوں نے اپنی سادہ دلی اور ملک کے فلاح وبہبود اور سیاسی آزادی کے خیال وجذبہ سے اس کے ساتھ اشتراک وتعاون کیا لیکن جیسے جیسے یہ دھوکہ ظاہر ہوتا گیا مسلم سیاسیئین اس سے علیحدہ ہوتے گئے اور جو باقی ہیں وہ صرف چند اغراض کے باعث رفاقت کئے جا رہے ہیں اور جلد یا بدیر اس کا ساتھ چھوڑنے اور اپنی جماعت میں مل جانے پر مجبور رہوں گے۔

ایسے ہی سیاسیئین میں شیخ سراج الدین پراچہ (پنجاب) نے ۲۵ سال تک کانگریس کی وفاداارانہ رفاقت میں جو تجربے حاصل کئے ان کی بنا پر جُدائی اختیار کی جس کا حسب ذیل بیان (مورخہ ۱۲ فروری) میں اعلان کیا ہے کہ:۔

"میں نے ہمیشہ ان کانگریسی رہنماؤں سے زیادہ وفاداری کا ثبوت دیا ہے جنھیں بظاہر اچھوت اُدھار کا دعویٰ ہے لیکن جو عملی طور پر مسلمانوں سے سخت چھوت چھات کا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہ لوگ مسٹر جناح اور ان کی پاکستانی اسکیم کے خلاف شور مچاتے نہیں تھکتے لیکن اس

بات پر غور نہیں کرتے کہ مسٹر جناح کو کن لوگوں کے طرزِ عمل نے یہ رویّہ اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے آپ ان صنعتی اور تجارتی اداروں کو دیکھئے جو کانگریسی رہنماؤں کے ماتحت ہیں آپ کو ان میں ایک مسلمان ملازم بھی نظر نہ آئے گا۔

ان حالات میں یہ سچ ہے کہ ہندو لیڈر محض اس لئے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں کہ اس ہندو انجمن کو ایک "قومی انجمن کی حیثیت" میں پیش کر سکیں، میں نے گاندھی جی کو بھی قوم پرستی کے پردہ میں فرقہ پرستی کے پرچار کی طرف توجہ دلائی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ بہ ایں حالات اب میرے دل میں کانگریس میں رہنے کی کوئی خواہش نہیں، میں یقین کرتا ہوں کہ کانگریس روبہ تنزل ہو کر ایک رجعت پسند اور فرقہ پسند انجمن بن چکی ہے اور اس میں صرف وقار کے خواہشمند اور عہدوں کے بھوکے ہی رہ سکتے ہیں۔"

ضمیمہ

آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن

باوجودیکہ تعلیم وسیاست لازم وملزوم ہیں لیکن ہندوستان کے نظام تعلیم میں طلبا کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی گئی، مگر انجام کار یہ کوشش ناکام ہوئی اور طلبا الگ نہ رہ سکے۔ علی گڑھ کا ایم، اے، او کالج جو مسلمانوں کا ایک زبردست مرکزی ادارہ تھا۔ روزِ اوّل سے ہی سیاسی مرکز اور مسلم طلبا کے لئے سیاسی تربیت کا دراصل ایک گوارہ تھا، اس میں حکام سلطنت کو جو ایڈریس پیش کئے گئے اور ان کے جو جواب[۵] ملے ان سب میں درس سیاسی تھا حکومت کے ساتھ وفاداری اور اس دریائے تعصب پر جو مسلمانوں اور انگریزوں کے دلوں میں بہہ رہا تھا پل باندھنا وقت کی بہت بڑی سیاست تھی،

لیکن سنہ ۱۹۰۰ء میں اردو ہندی کے قضیہ اور سرانٹونی میکڈانلڈ حکمران صوبہ کے رویہ سے ہوا کا رُخ بدلا، اور اب مسلم طلبا نے جن میں ہر حصۂ ہند کے تھے دوسری قسم کی سیاست پر غور کرنا شروع کیا اس کے بعد سنہ ۱۹۰۶ء میں شملہ ڈپوٹیشن کے مراحل نے اس غور وفکر میں اور اضافہ کردیا پھر آل انڈیا مسلم لیگ کی تاسیس کے بعد مارچ سنہ ۱۹۰۷ء میں نواب وقار الملک بانی مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ طلبا کے سامنے مسلم سیاسیات پر مبسوط تقریر کی اور جب دوسرے سال وہ آنریری سکریٹری ہوئے تو یونین کلب کے مباحثہ میں آزادانہ طور پر سیاسی خیالات کے اظہار کی اجازت دیدی۔

اس زمانہ میں چونکہ بنگال کی انقلابی تحریکات میں طلبا بھی شریک کرلئے گئے تھے

---

[۵] کالج کی سیاسی مرکزیت کا اندازہ اس بات سے کرنا چاہیے کہ سنہ ۱۸۹۷ء سرحدی جنگ کے باعث حکومت اور مسلمانانِ ہند کے تعلقات کی نسبت جو خراب افواہیں پھیلی تھیں ان کی تردید کے لئے وائسرائے ہند لارڈ ایلجن اپنا دورہ قطع کرکے علی گڑھ آئے اور جواب ایڈریس میں ان افواہوں کی تردید کی۔

اس لئے اس جماعت پر ہر جگہ کڑی نگرانی ہونے لگی البتہ مسلم طلبا ان تحریکات سے علیحدہ تھے لیکن اس صدی کے دوسرے عشرہ میں طرابلس و بلقان اور مسجد کانپور کے واقعات نے جو ہیجان پیدا کیا اس سے یہ بھی متاثر ہوئے اور علی گڑھ پر سب سے زیادہ اثر تھا، انھوں نے مصیبت زدوں کے لئے ہزاروں روپیہ اپنے کھانے اور ناشتہ کی مدات سے جمع کیا انھوں نے گوشت تک ترک کر دیا اور اس طرح جو بچت ہوئی وہ اس فنڈ میں جمع کی، چونکہ آنریری سکرٹیری کی حمایت حاصل تھی ان کا یہ جوش برابر ترقی کرتا رہا، پچاس ہزار روپیہ کے قریب انھوں نے اس طرح فراہم کر لیا، چار نوجوان ترک تعلیم کر کے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے طبی مشن میں شامل ہو کر ترکی گئے اور بڑے جوش سے ترک مجروحین کی خدمات کیں۔

کوئی شک نہیں کہ ان کے سیاسی خیالات کی اخبار کامریڈ اور اخبار زمیندار نے زبردست نشو و نما کی، اگرچہ پھر حکومت کی طرف سے اس جوش کو فرو کرنے کی مختلف تدابیر کی گئیں لیکن سیاسی خیالات کی جو رَو پیدا ہو چکی تھی برابر ترقی پذیر رہی تا آنکہ ترکِ موالات کا ہنگامہ ہوا اور اس میں بھی ان طلبا نے زبردست حصہ لیا، علی گڑھ کا اثر ہر جگہ مسلم طلبا پر برابر پڑتا رہا اور ان کے سیاسی جذبات ترقی کرتے رہے

سنہ ۱۹۳۵ء میں ہندو طلبا نے ایک تنظیمی وفاقی جمعیت آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے نام سے قائم کی اور کانگریس کے نقشِ قدم پر مسلمان طلبا کو بھی مدعو کیا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں بمقام لکھنؤ اس فیڈریشن کا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت مسٹر محمد علی جناح نے کی۔ علی گڑھ اور چند دیگر مقامات سے مسلم طلبا بھی شریک ہوئے لیکن ان کے ساتھ بیگانگی کا برتاؤ کیا گیا اور انتخابات میں اپنی اکثریت کے زعم میں ایسی کارروائیاں کیں کہ ان طلبا کو اُن کا متعصبانہ رویہ صاف معلوم ہو گیا انھوں نے صدر اجلاس سے شکایت کی۔ جنھوں نے مداخلت کر کے رفع شکایات کرنا چاہا لیکن یہ کوشش غیر موثر رہی اور مسلم طلبا کو بہت جلد محسوس ہو گیا کہ یہ فیڈریشن کانگریس کا ہی بچہ ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ مسلم طلبا کے ذہن و دماغ پر قبضہ کرنا چاہتی ہے اس لئے ان میں بیزاری پیدا ہو گئی۔

اس سے قبل بنگال کے مسلم طلبا میں اتحادی تحریک پیدا ہو چکی تھی اور وہ اس کو ہندوستان گیر بنانا چاہتے تھے لیکن مسلم یونیورسٹی کے ایک سینیر طالب علم مسٹر محمد نعمان (ایم اے، ایل ایل بی) نے جو ہندو اسٹوڈنٹ فیڈریشن میں شریک ہو کر ان کی متعصبانہ کارروائیوں کا تجربہ کر چکے تھے بنگال کے طلبا سے درخواست کی کہ علی گڑھ کی مرکزی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُس کو اس تحریک کا مرکز بنایا جائے، چنانچہ مسلم یونیورسٹی یونین میں یہ تجویز پیش کی گئی مگر چونکہ اس زمانہ میں اس ادارہ پر کانگریسی اثر چھایا ہوا تھا اس تحریک کے خلاف زبردست پروپاگنڈا کیا گیا۔ اخبارات نے بھی زہر افشانی کی نتیجہ میں تجویز مسترد ہو گئی، مگر اس ناکامی نے مسٹر محمد نعمان کی ہمت اور زیادہ بڑھا دی اور باوجود بہت سی رخنہ اندازیوں اور مخالفانہ سرگرمیوں کے جنوری ۱۹۳۷ء میں اس کا پہلا اور ابتدائی اجلاس لکھنو میں منعقد ہوا جس میں کانگریسی ذہنیت کے طلبا نے اور خاص کر ندوۃ العلما اور فرنگی محل کے طلبا نے شریک ہو کر انتشار پیدا کرنے میں پوری قوت صرف کی اور آل انڈیا ہندو اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے عہدہ داروں نے ہر طرح اس کو ناکام بنانے کی کوشش کی، چنانچہ اس کے متعلق بعض خطوط بھی پکڑے گئے جن کو مسٹر محمد نعمان نے اپنی رپورٹ میں بھی نقل کیا ہے، تاہم مسٹر مشیر حسین قدوائی صدر اجلاس اور چودھری اختر حسین ایڈوکیٹ کی حوصلہ افزائی اور امداد سے اجلاس کامیاب ہوا اور مسلم طلبا نے عزم صمیم کے ساتھ تحریک کو آگے بڑھایا'

اب مسلم زعما و سیاسیین کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی، دوسرا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا مسٹر محمد علی جناح نے صدارت کی اور مسٹر عبدالعزیز بار ایٹ لا (بہار) نے افتتاح کیا۔ آنریبل مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے اپنی تقریر سے طلبا کا دل بڑھایا بنگال میں اس تحریک کو بہت کچھ کامیابی مسٹر محمد واثق کی مساعی سے حاصل ہوئی۔

نوجوان راجہ محمود آباد صدر منتخب ہوئے اور تیسرا اجلاس پٹنہ میں اور چوتھا علی گڑھ (مسلم یونیورسٹی) میں ہوا، یونیورسٹی کے طلبا نے اب اس کی اہمیت محسوس کی اور بڑے جوش اور بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ غرض پانچ سال کے اندر سخت مخالفتوں اور مزاحمتوں

کے باوجود اس تحریک نے مستقل صورت اختیار کر لی تقریباً تمام صوبوں میں شاخیں قائم ہوگئیں اور دہلی کو اس کا مرکز قرار دیا گیا۔

یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو پنجاب مسلم اسٹوڈنٹ نے بڑے وسیع پیمانہ پر ایک مخصوص پاکستان کانفرنس منعقد کی جس میں متعدد اراکین وزعمائے لیگ شریک ہوئے اور اجلاس کی صدارت مسٹر جناح نے کی لیکن انھوں نے اپنے خیالات ظاہر کرنے سے قبل طلبا کو مشورہ دیا کہ پہلے وہ اپنے رزولیوشن پیش کر کے آزادانہ بحث کے ساتھ فیصلے کریں۔

چنانچہ انھوں نے ایک رزولیوشن میں قرارداد لاہور کی تائید کی اور دوسرے رزولیوشن سے طے کیا کہ طلبا کا ایک وفد مسلم عوام کو قرارداد پاکستان کے بنیادی اصول سے آگاہ کرنے کے لئے دورے کرے۔

دوسرے دن مسٹر جناح نے خطبۂ صدارت میں اور دیگر مقررین نے اپنی تقریروں میں پاکستان کی اہمیت و ضرورت پر زور دیا اور مختلف سمتوں سے جو اعتراضات اب تک ہوئے تھے اُن کے مدلل جواب دئے گئے۔

مسٹر جناح نے ایک مخصوص دن ہر قوم و ملت کے طلبا سے ملاقات کے لئے وقف کیا اور اس مسئلہ پر تبادلۂ خیالات کر کے اُن کی تشفی کی۔

مردُم شماری

ہندوستان میں پہلی مردُم شماری ۱۸۷۲ء میں ہوئی تھی اور پھر ہر دس سال بعد سلسلہ قائم ہوگیا۔ مگر چالاک ہندو دماغوں نے سیاسی تحریک شروع ہونے کے بعد جب اعداد و شمار کی اہمیت کا اندازہ کیا تو دیگر قوموں کو بھی اپنے اندر جذب کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۳۱ء کی رپورٹ سے صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ سکھوں کا ایک فرقہ سہجداری بہت سی جگہ اور خاص کر شمالی مغربی سرحد اور بلوچستان میں ہندو لکھا گیا۔ بعض دیگر ذاتوں نے ہندو لکھے جانے پر اعتراض کیا مگر مردُم شماری کے نقطۂ نظر سے ہندوؤں میں ہی ان کو شامل کیا گیا۔

۱۸۷۲ء کی مردم شماری میں کُل تعداد ۲۰،۶۱،۶۲،۳۶۰ تھی مگر ساٹھ دیں مردُم شماری میں یہ تعداد ۳۵،۰۵،۲۹،۸۷۷ ہوگئی جس کی تفصیل حسب ذیل تھی۔

ہندو — ۲۳،۹۱،۹۵،۱۴۰ (تئیس کروڑ اکیانوے لاکھ پچانوے ہزار ایکسو چالیس)

مسلمان — ۷،۷۶،۷۰،۵۴۵ (سات کروڑ چھہتر لاکھ ستتر ہزار پانچسو پینتالیس)

سکھ — ۴۳،۳۵،۷۷۱ (تینتالیس لاکھ پینتیس ہزار سات سو اکہتر)

عیسائی — ۶۲،۹۶،۷۸۳ (باسٹھ لاکھ چھیانوے ہزار سات سو تراسی)

جین — ۱۲،۵۲،۱۰۵ (بارہ لاکھ باون ہزار ایکسو پانچ)

بودھ — ۱،۲۷،۸۶،۸۰۶ (ایک کروڑ ستائیس لاکھ چھیاسی ہزار آٹھ سو چھ)

دیگر — ۸۹،۸۵،۴۲۷ (نواسی لاکھ پچاسی ہزار چار سو ستائیس)

اب اس تناسب میں برطانوی بنگال و پنجاب کا تناسب بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ بنگال کی کُل آبادی ۵،۰۱،۱۴،۰۰۲ میں ۲،۱۵،۷۰،۴۰۷ ہندو اور ۲،۷۴،۹۷،۶۲۴ مسلمان تھے۔

رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ بہت سے صوبوں میں مسلمانوں کا تناسب آبادی ہندوؤں سے بڑھا ہوا ہے۔ خاص طور سے پنجاب میں، مگر بخلاف ازیں بنگال میں جبکہ گزشتہ مرتبہ (۱۹۲۱ء) مسلمانوں کی آبادی میں ۲ء۵ فیصد اضافہ ہوا تھا تو ہندو آبادی ۰ء۷ فیصد گھٹ گئی تھی، مگر حال (۱۹۳۱ء) کی مردم شماری سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ہی تناسب سے بڑھ رہے ہیں۔ ہندو ۶ء۷ فیصد اور مسلمان ۹ء۱ فیصد ہیں اور اگر بالغوں کے اعداد دیکھے جائیں تو وہ ہندوؤں سے کم ہیں۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ کس قسم کی چالاکیاں کی گئی ہوں گی۔

پنجاب کی کل آبادی ۲۵۴۰۸۵۳۲ میں ۶۳۲۸۰۵۸۸ ہندو، ۳۰۶۴۱۴۴ سکھ اور ۱۳۳۳۲۴۶۰۴ مسلمان تھے۔

اس کے متعلق رپورٹ میں درج ہے کہ سکھوں کی آبادی کے اضافہ کے تناسب کو جو ۳۳ء۹ ہے قدرتی ترقی نہیں کہا جا سکتا۔ تبدیلی مذہب کا بھی باعث ہے اور اس قسم کی مثالیں بھی ہیں کہ ایک ہی خاندان میں کچھ نے ہندو اور کچھ نے سکھوں کی طرح نشوونما پائی تاکہ حکومت کی ملازمت کے لئے خاندانی مواقع بہتر ہو جائیں۔

اب ۱۹۴۱ء میں تو بہت قبل ایک تنظیم کے ساتھ کام کیا گیا اور ہندوؤں نے بنگال میں تو ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کو بھی غلط کہا۔

مسلمان صرف اس مرتبہ چونکے، بنگال میں خاص طور پر آنریبل مولوی فضل الحق وزیر اعظم نے ایسی شرارتوں کو روکنے کا صاف صاف اعلان کر دیا اور ان کو مجبوراً کہنا پڑا کہ ایک عام سازش کی گئی ہے اور کہ "میں واقف ہوں کہ نتیجہ میں ہندو ۶۰ فیصد اور مسلمان ۴۰ فیصد دکھائے جائیں گے۔"

اسمبلی کے ۱۵ ممبروں نے بھی جس میں پسماندہ اقوام کے بھی تین ممبر تھے اپنا بیان شائع کر کے وزیر اعظم کی تائید کی۔

مردم شماری سے قبل مسلم لیگ اور مسلم ادارات نے مسلمانوں کو ہوشیار کیا، ہدایات دیں اور طریق کار و نگرانی سمجھایا، خوش قسمتی سے یہ ایک ایسا سوال تھا کہ جس میں ہر مسلم ادارہ

نے اتفاق کیا۔

۳ مارچ کو مردم شماری ہوئی وحسب سابق سازشیں پیدا ہوئیں پنجاب و بنگال ان چالاکیوں کے مرکز بنائے گئے۔

پنجاب میں ایک جگہ ۶۰ ہزار جعلی تعداد کے اضافہ کی سازش پکڑی گئی اور مجرم مع جعلی کاغذات کے عین موقع پر گرفتار ہوئے۔

زبان کے مسئلہ نے تو ۱۹۲۱ء سے ہی اہمیت حاصل کرلی تھی اور ۱۹۳۱ء کی رپورٹ میں ہی اردو یا ہندوستانی لکھنا شروع ہوگیا تھا اس مرتبہ صوبہ متحدہ اور بہار میں حکومت نے زبان کے خانہ میں ہندوستانی لکھا جانا قرار دیا اور ہندوؤں نے باقاعدہ ہندی لکھائے جانے کی تنظیم کی، انجمن ترقی اردو و کل ہند نے اس کے متعلق بار بار اور بکثرت ہدایات جاری کیں۔

اب یہ حقیقت کہ مردم شماری میں کبھی صحیح اصول کے ماتحت کام نہیں کیا گیا، کلیتہً بے نقاب ہوچکی ہے مسلمانوں کو اس کی اہمیت کا اس سے پہلے کوئی احساس نہ تھا اور چالاک دماغ دوسری مرتبہ ۱۸۸۱ء سے ہی کام کررہے تھے، چنانچہ اس رپورٹ میں بھی یہ اعتراف موجود ہے کہ:۔

> "ایسے لوگ بھی جو ہندو مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہندو شمار کئے گئے ہیں..... ہر باشندہ جو اپنے عقیدہ کی تصریح نہیں کرسکا یا اس کی تصریح ایسے نام سے کی گئی جو تسلیم شدہ مذہب نہیں یا کسی مذہب کا جز و نہیں وہ ہندو لکھ دیا گیا، یہ قاعدہ اس اصول پر اختیار کیا گیا کہ ہندوستان کے باشندہ کو جب تک کہ وہ کسی دوسرے تسلیم شدہ مذہب سے تعلق نہ رکھتا ہو قطعی ہندو خیال کرلینا چاہیئے"

یہ ہی اصول اب تک جاری رہا ہے۔

تمام شد